مَنۡ یُرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیۡراً یُفَقِّہۡهُ فِی الدِّیۡنِ

اسلامی فقہ

تقریباً دو ہزار سے زائد مسائل کے شرعی جوابات

مولانا مجیب اللہ ندوی

معاشرت و معاملات

فہرست اسلامی فقہ جلد دوم

عنوانات	صفحہ

عنوانات	صفحہ

عنوانات	صفحہ

عنوانات	صفحہ

عنوانات	صفحہ

عنوانات	صفحہ

عنوانات	صفحہ

عنوانات	صفحہ

عنوانات	صفحہ

عنوانات	صفحہ

عنوانات	صفحہ

وصیّت

وراثت

عنوانات	صفحہ

عنوانات	صفحہ

(دیباچہ طبع پنجم)

اسلامی فقہ (جلد ثانی)

اسلامی فقہ آج سے اٹھائیس برس پہلے مکتبہ الحسنات سے پہلی بار چار جلدوں میں شائع ہوئی تھی، پھر دوبارہ بھی اس کے بعد تین حصّوں میں شائع ہوئی، پھر چوتھی بار تینوں جلدوں کو ملاکر ایک ضخیم جلد کردی گئی، اب یہ دو حصّوں میں تاج کمپنی سے شائع ہو رہی ہے۔ پہلے کتاب کی پوری ضخامت سات سو صفحات سے کچھ زیادہ تھی، اب اس کی ضخامت ایک ہزار صفحات سے زیادہ ہو جائے گی۔ پہلا حصّہ عقائد و عبادات پر مشتمل ہے، اور دوسرا حصّہ معاشرتی اور معاملاتی مسائل سے متعلق ہے، اس ایڈیشن میں قضا و شہادت اور حدود و قصاص وغیرہ کا بھی اضافہ کردیا گیا ہے۔

اردو زبان میں فقہی مسائل پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر ان میں عبادات اور نکاح وطلاق کی تفصیل تو ممکن ہے اس سے زیادہ ملے مگر پورے معاشرتی اور معاملاتی مسائل کے بارے میں اتنی تفصیل شاید دوسری کتابوں میں نہ مل سکے، حالانکہ موجودہ دور میں سب سے زیادہ انہی مسائل کی ضرورت ہے، خاص طور پر ان جگہوں پر جہاں اسلامی قانون کے نفاذ کی باتیں کی جارہی ہیں، وہاں پر اس کی سخت ضرورت ہے کہ جدید انداز میں ان مسائل کی تفصیل کردی جائے، اس میں سیکڑوں جدید مسائل کے بارے میں قرآن و سنّت اور فقہ کی جزئیات کی روشنی میں ایک رائے دینے کی کوشش کی گئی ہے، جس میں غلطی کا بھی امکان ہے، اس لئے اہل علم سے گذارش ہے کہ اگر وہ کوئی غلطی محسوس کریں تو راقم الحروف کو مطلع کردیں۔ انشاء اللہ اگر

ان کے دلائل وزنی رہے تو رجوع کر دیا جائے گا۔

معاشرتی اور معاملاتی مسائل میں جا بجا ائمہ اربعہ کے مسلک کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے، اور ساتھ ہی ہر باب میں قرآن کی آیات اور احادیث نبوی نقل کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے، تاکہ ناظرین کے ذہن میں یہ بات بیٹھتی جائے کہ ہمارے فقہائے کرام نے انہی آیات واحادیث کی روشنی میں فقہی مسائل کو مستنبط کیا ہے، اور انھیں ماخذ اور ماخوذ دونوں کا علم ہو جائے بعض سطحی علم رکھنے والے لوگ پورے فقہ کے ذخیرہ کو اور خاص طور پر فقہ حنفی کو صرف رائے اور قیاس کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ ان کو اس سے ممکن ہے اپنی کوتاہ بینی کا احساس ہو جائے۔

انشاء اللہ اس کتاب کا مطالعہ بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دے گا، اور اسلامی شریعت کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو گا جس پر کم وبیش اس میں روشنی نہ ڈال دی گئی ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اسے قبول فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

خادم

مجیب اللہ ندوی

جامعۃ الرشاد۔ اعظم گڈھ

۲۲ صفر ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کے معاشرتی احکام

ایک صالح اور پاکیزہ تہذیب اور ایک اعلیٰ تمدّن کو وجود میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ایک صالح، پاکیزہ اور ایک بلند معاشرہ وجود میں لایا جائے، کیونکہ تہذیب وتمدن کے علامات ونقوش تو کسی معاشرے کے تصورِ حیات اور اس کے ذہنی وعملی قوتوں اور صلاحیتوں کے مظاہر ہوتے ہیں، ان کا وجود بالذات نہیں، بلکہ بالواسطہ ہوتا ہے، چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت بھی ہے، اور حال کا مشاہدہ بھی ہے کہ ایک بگڑے ہوئے معاشرے کے ذریعے ایک فاسد تہذیب اور بگڑا ہوا تمدن ہی وجود میں آتا ہے اور ایک صالح وپاکیزہ معاشرے کے ذریعہ اسی طرح کی تہذیب نشو ونما پاتی ہے اور اسی طرح کا تمدن برگ وبار لاتا ہے، گویا کسی اچھے یا برُے معاشرے کی حیثیت بیج کی ہے اور تہذیب وتمدّن کی حیثیت برگ وبار کی اور ے

گندم از گندم بروید جو ز جو

اب سوال یہ ہے کہ ایک پاکیزہ اور صالح معاشرہ کیسے وجود میں آئے، کہ اس کے ذریعے ایک پاکیزہ وصالح تہذیب وتمدن پیدا ہو، اس سوال کا جواب دوسرے مذاہب اور موجودہ نظامہائے زندگی کیا دیتے ہیں، ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں ہے مگر اسلام نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے، اس وقت اس کی تفصیل ہمیں یہاں پیش کرنی ہے۔

اسلام جس طرح کا معاشرہ تیار کرنا چاہتا ہے، اس میں فکری وذہنی تبدیلی اور تصورِ حیات کی پاکیزگی کیساتھ ہماری مادی زندگی میں اس کی بنیاد خاندان کے وجود اور اس کے تعلقات پر

رکھی گئی ہے، اس کے نزدیک خاندان کا نظام اور اس کے آپس کے تعلقات جتنے زیادہ پاکیزہ اور مضبوط ہوں گے، اتنا ہی زیادہ پاکیزہ اور عمدہ معاشرہ وجود میں آئے گا اور اس کے ذریعہ ایک پاکیزہ تہذیب پیدا ہوگی، یہی وجہ ہے کہ اس نے عقائد، عبادات اور معاملات کے ساتھ خاندانی نظام کو زیادہ سے زیادہ پاکیزہ اور اس کے معاشرتی تعلق کو زیادہ سے زیادہ استوار رکھنے کے لئے بے شمار احکام دیئے ہیں اور ان احکام پر عمل کرنے کو اس نے عبادت کا درجہ دیا ہے، فقہ کی اصطلاح میں ان کو معاشرتی احکام یا قانون مناکحات کہتے ہیں، آج کل اسی کو مسلم پرسنل لاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

معاشرت ومناکحت کے معنی

معاشرت کے لفظی معنیٰ آپس میں مل جل کر رہنے سہنے اور زندگی گذارنے کے ہیں، اور مناکحت کے معنیٰ جوڑنے اور ملانے کے ہیں اور شریعت میں معاشرتی احکام اور قانون مناکحات سے مراد وہ احکام ہیں جن میں آدمی کو رہنے سہنے اور خاندانی تعلقات اور رشتوں کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کا طریقہ بتایا جائے، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ استعمال ہوتے ہیں:۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (نساء) عورتوں کے ساتھ بھلے طریقے سے رہو سہو،

دوسری جگہ ہے:۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ (نساء) عورتوں میں تم کو جو پسند ہوں ان سے نکاح کرو،

معاشرتی احکام کی حیثیت واہمیت

معاشرتی احکام کی دو حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت سے ان کا تعلق عبادات سے ہے، اور دوسری حیثیت سے ان کا تعلق معاملات سے ہے[1]، عبادات سے ان کا تعلق دو

---

[1] فانه معاملة من وجه وعبادة من وجه واما معنى العبادة فيه فان الاشتغال به افضل من التخلى لمحض العبادة لما فيه من حفظ النفس عن الوقوع فى الزنا واما معنى المعاملة لما فيه من المال الذى هو عوض البضع. والايجاب والقبول والشهادة ودخوله تحت القضاء۔ (حاشیہ ہدایہ، رد المحتار ج ۲، کتاب النکاح)

حیثیتوں سے ہے، ایک اس حیثیت سے کہ میاں بیوی کے آپسی تعلقات، اولاد کی تربیت، ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق کی ادائیگی کو قرآن وحدیث میں عبادت کا درجہ اور اجر وثواب کا سبب بتایا گیا ہے، دوسرا اس حیثیت سے ان کا تعلق عبادت سے ہے کہ ان خاندانی تعلقات کے ذریعہ آدمی بے شرمی و بے حیائی سے بچتا ہے، اور بہت سے مواقع پر ظلم وزیادتی سے بچتا ہے اور یہ تعلقات آپسی ہمدردی و بہی خواہی کے جذبہ کو نشو ونما دیتے ہیں اور یہ چیزیں خدا سے اس کے تعلق کو مضبوط کرتی ہیں، اور معاملات سے ان کا تعلق اس لئے ہے کہ ان ہی احکام کے ذریعہ بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائیگی کی ابتدا ہوتی ہے، اور اس میں کچھ مالی لین دین بھی ہوتا ہے۔ مثلاً شوہر کچھ مال عورت کو مہر میں دیتا ہے اور وہ لیتی ہے یا اسے لینے کا حق ہوتا ہے، اس میں بھی بیع وشرا کی طرح ایجاب وقبول ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں اگر کچھ غلطی ہوجائے تو اس کی قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے، یعنی اس کا معاملہ بھی دیوانی قانون کے تحت آتا ہے۔

خاندانی نظام اور سارے رشتوں کی بنیاد نکاح پر ہے

اسلامی تعلیمات سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے خاندان کے وجود اور اس کے نشو ونما کا مدار رشتۂ نکاح یعنی میاں بیوی کے نفسانی تعلق پر رہا ہے، اور یہ تعلق ایسا مضبوط تعلق ہے کہ ایک بار قائم ہونے کے بعد اگر آدمی خود نہ توڑدے تو پھر وہ قیامت تک نہیں ٹوٹتا، فقہاء نے لکھا ہے:-

لَیْسَ لَنَا عِبَادَۃٌ شُرِعَتْ مِنْ عَھْدِ اٰدَمَ اِلَی الْاٰنِ ثُمَّ تَسْتَمِرُّ فِی الْجَنَّۃِ اِلَّا النِّکَاحُ[1] وَالْاِیْمَانُ۔

(درمختار، کتاب النکاح)

جو عبادتیں ہمارے لئے ضروری قرار دی گئی ہیں ان میں کوئی ایسی عبادت نکاح اور ایمان کے علاوہ نہیں ہے جو حضرت آدم سے شروع ہوئی ہو اور پھر جنت تک ساتھ چلی جائے۔

---

[1] یہ اشارہ ہے اس آیت کی طرف جس میں جنتیوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وَزَوَّجْنَاھُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ۔" ان کا جوڑا ہم بڑی بڑی آنکھ والی عورتوں سے لگادیں گے"۔ اور ایمان کے بغیر تو جنت میں جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسلام میں رشتۂ نکاح کی اتنی اہمیت اور فضیلت ہے کہ اگر اس رشتے کو صحیح طور پر قائم کیا جائے اور پھر اس کے حقوق اور اس کی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کیا جائے تو اس کی مشغولیت نفل عبادتوں کی مشغولیت سے زیادہ افضل و احسن ہے :۔

اِنَّ الِاشْتِغَالَ بِہٖ مَعَ اداءِ الفرض والسنن اَفْضَلُ من التَّخَلِّیْ لِنَوَافِلِ الْعِبَادَاتِ۔[1]	اس کی مشغولیت نفل عبادتوں کی مشغولیت سے افضل ہے۔

فقہائے کرام نے یہ بات اس حدیث نبوی کی روشنی میں فرمائی ہے، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

اذا تزوج العبد فقد استکمل نصف الایمان (بیہقی شعب الایمان)	یعنی جب بندہ شادی کرلیتا ہے تو اس کا نصف ایمان بھی مکمل ہو جاتا ہے۔ گویا شادی کے بغیر ایمان کو خطرہ لگا رہتا ہے۔

اسی تعلق کی بنا پر ایک مرد کسی کا باپ، اور کسی کا بیٹا بنتا ہے، کسی کا دادا اور کسی کا پوتا ہوتا ہے، کسی کا ماموں اور کسی کا چچا ہوتا ہے، کسی کا بھائی اور کسی کا بہنوئی ہوتا ہے، اسی تعلق کے ذریعہ ایک عورت کسی کی ماں، کسی کی دادی، کسی کی نانی، کسی کی پھوپھی اور کسی کی چچی ہوتی ہے اور کسی کی بیٹی اور کسی کی بہن بنتی ہے۔ گویا سارے تعلقات نکاح کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں۔ نکاح کے ذریعہ ایک اجنبی اپنا اور ایک بے گانہ یگانہ بن جاتا ہے، ان ہی تعلقات کا نام خاندانی نظام ہے، ان ہی تعلقات سے آدمی مہر و محبت، الفت و مودت، لحاظ و پاس، ادب و تمیز، شرم و حیا، ہمدردی و غم گساری، عفت و پاکبازی سیکھتا ہے، اگر نکاح کی قید کو ہٹا لیا جائے یا نکاح کی قید تو رسمی طور پر باقی رہے، مگر اس کے دوسرے حدود و شرائط کا لحاظ نہ کیا جائے، تو پھر اس کے ذریعہ جو معاشرہ بنے گا، اس میں الفت و محبت، ہمدردی و غم گساری، عفت و پاکبازی، حیا و شرم، خوش خلقی اور

---

[1] بدائع الصنائع، ج ۲ ص ۲۲۹، درمختار، ج ۲ ص ۲۹۸۔

خوش معاملگی کے بجائے ظلم وزیادتی، بے مہری و بے وفائی، بے شرمی و بے حیائی، بدخلقی و بدمعاملگی کا دوردورہ ہوگا، چنانچہ جس ملک میں خاندانی نظام کا رشتہ جس قدر کمزور ہے اس کے معاشرے میں یہ مذموم صفات اسی قدر زیادہ ہیں، ممکن ہے قانونی گرفت کے ذریعہ اس میں تھوڑی بہت روک پیدا کی جاسکے، مگر معاشرے کے افراد کو جب بھی کوئی موقع ملے گا وہ اپنی مذموم صفات کا مظاہرہ ضرور کریں گے، بخلاف اس کے جس معاشرے کے افراد نے ایک بلند تصورِ حیات کے ساتھ ایک صالح اور مضبوط خاندانی نظام میں نشو ونما پائی ہوگی، وہ مذموم و پست صفات کے بجائے پاکیزہ و اعلیٰ صفات ہی کا مظاہرہ کریں گے۔

قانون مناکحات کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن و حدیث میں تفصیل سے اس کے بارے میں احکام دیئے گئے ہیں، تاکہ انسانی تہذیب کی یہ بنیادی اینٹ اپنی جگہ سے کھسکنے نہ پائے، ورنہ یا تو یہ پوری عمارت ہی زمین پر آجائے گی، یا پھر بری بھلی اٹھے گی تو کج اور کمزور ہوگی اور جس کے گرنے کا ہر وقت خطرہ لگا رہے گا۔

قرآن نے سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ سارے انسان ایک جوڑے، آدم و حوّا کے ذریعے پیدا کئے گئے ہیں، اس حیثیت سے سارے انسان بھائی بھائی ہیں، لیکن آدمی جس خاندان یا ماحول میں آنکھ کھولتا ہے، سب سے پہلے اس کا تعلق اسی سے ہوتا ہے اس لئے اس کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اسی قریبی تعلق اور رشتے کو قائم رکھنے کی کوشش کرنا چاہیئے، اگر وہ اس قریبی تعلق اور رشتے کو استوار و قائم نہ رکھ سکا، تو پھر وہ دور کے انسانی رشتے اور تعلق کو قطعی قائم نہیں رکھ سکتا۔ گویا رشتۂ نکاح اور اس کے ذریعے جو خاندان وجود میں آتا ہے، اس کے تعلق کی استواری پوری انسانی برادری کے تعلق کی استواری کی تربیت گاہ ہے، اگر کوئی شخص تعلقات کے جوڑنے اور استوار رکھنے میں یہاں ناکامیاب رہا، یا اس نے یہاں اس کی کوشش نہیں کی تو پھر اس سے باہر آکر بھی وہ صلہ رحمی کے بجائے قطع رحمی کا سبب بنے گا، وہ دلوں کو جوڑنے کے بجائے ان کو توڑے گا، قرآن پاک میں ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ٥

(نساء)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں یعنی اس جوڑے کے ذریعے بہت سے مردوں، اور عورتوں کو پھیلایا اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دیکر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور ارحام (رشتوں) کے حقوق کا لحاظ و پاس رکھو اللہ تمہارا نگراں ہے۔

ان آیتوں کو خطبۂ نکاح کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ تلاوت فرمایا کرتے تھے تاکہ رشتۂ نکاح کی یہ ذمہ داری اور غرض ذہن میں تازہ ہو جاتے کہ یہ رشتہ تعلقات کے جوڑنے کے لئے قائم کیا جا رہا ہے، کاٹنے کے لئے نہیں، اور یہ چھوٹا سا خاندان جو آج وجود میں آرہا ہے، یہ پہلی تجربہ گاہ ہے اگر وہ اس چھوٹے سے کنبہ کا حق ادا نہ کر سکا تو خاندان، اور معاشرہ اور پوری انسانی دنیا کا حق بھی وہ ادا نہ کر سکے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی بتائی ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہاری بیویاں بھی پیدا کیں، اور ان کے ذریعہ پھر نسل چلائی:۔

وَمِنْ اٰيَاتِهٖ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا۔ (روم)

اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً (نحل)

خدا ہی ہے جس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے پیدا کئے اور ان جوڑوں کے ذریعے لڑکے اور پوتے پیدا کئے۔

عورت و مرد کو ایک جنس سے پیدا کرنے ہی کی وجہ سے دونوں میں الفت و محبت پیدا ہوتی ہے، اس لئے یہ خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو نکاح کی مکمل غرض پوری نہیں ہو سکتی تھی، عورت کو مرد کی جنس سے پیدا کرنے کی جو بات کہی گئی ہے اس سے

عورت کی یہ حیثیت بھی بتانی مقصود ہے کہ عورت کوئی کمتر درجہ کی مخلوق نہیں ہے بلکہ وہ مرد ہی کی طرح انسان ہے، مرد، عورت کے حقوق میں جو فرق ہے وہ ذمہ داری کی کمی یا زیادتی کے لحاظ سے ہے، ورنہ انسانی جذبات اور بنیادی ضروریات کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

دنیا کے بعض مذاہب میں تجرد اور سنیاس کو روحانی ترقی کے لئے ضروری سمجھا گیا ہے، اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو اس کی ترقی کے لئے مانع اور اس کے منافی سمجھا گیا ہے، لیکن قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اخلاقی و روحانی اعتبار سے انسانوں میں سب سے اونچے اور بلند لوگ انبیاء و رسل ہوئے ہیں مگر ان کے لئے بھی خدا نے اس تعلق کو ضروری قرار دیا تھا:۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ	تم سے پہلے ہم نے بہت سے رسول بھیجے
وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (رعد)	جن کی بیویاں بھی تھیں اور بچے بھی۔

پھر مسلمانوں کو یہ دعا سکھلائی گئی کہ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ۔ (نور) اے اللہ ہمیں ایسی بیویاں اور اولاد عطا کر جو آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہوں۔

اخلاقی و روحانی ترقی کا مدار تجرد و سنیاس پر نہیں بلکہ ان ذمہ داریوں کے اٹھانے پر ہے جو معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے اس کے اوپر ڈالی جائیں، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، کہ اس تعلق کو استوار رکھنے اور اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس کو علماء نے اس وقت سے زیادہ قیمتی قرار دیا ہے، جس میں ایک آدمی نفل نماز پڑھتا ہو، یا کوئی دوسرا نفل کام کرتا ہو، کیونکہ اس صورت میں آدمی صرف اپنے کو بچاتا اور اپنے ذاتی تعلق کو خدا سے مضبوط کرتا ہے اور اس رشتۂ نکاح کے ذریعے اپنے ساتھ اپنے گھر، اپنے خاندان اور پورے معاشرے کو بچانے اور اس کے تعلق کو خدا سے مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے، علماء فقہ نے لکھا ہے:۔

لِمَا فِيْهِ تَهْذِيْبُ الْاَخْلَاقِ وَ	اس رشتۂ نکاح کے ذریعے اخلاق کی درستگی
تَوْسِعَةُ الْبَاطِنِ بِالتَّحَمُّلِ فِيْ	ہوتی ہے۔ دوسرے بنی نوع انسان کیساتھ

مُعَاشَرَةِ اَبْنَاءِ النَّوْعِ وَتَرْبِيَةِ الْوَلَدِ وَالنَّفَقَةِ عَلَى الْاَقَارِبِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ وَاِعْفَافِ الْحَرَمِ وَنَفْسِهٖ وَدَفْعِ الْفِتْنَةِ عَنْهُ وَعَنْهُنَّ۔

رہنے سہنے میں جو تکلیف آدمی اٹھاتا ہے اس کے ذریعے اس کے باطن میں وسعت اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے مثلاً اولاد کی تربیت کرتا ہے، اپنے اقارب اور کمزوروں کا نان نفقہ پورا کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ اپنی بیوی اور اپنی ذات کو پاک باز رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے اپنی بیوی کو اور اپنی ذات کو کتنے فتنوں سے بچاتا ہے۔

گویا جو آدمی نکاح کے تعلق سے بھاگتا ہے وہ ایک طرف تو زندگی کی ذمے داریوں سے بھاگتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنی فطری عفت وعصمت کو بھی ایک بہت بڑے خطرے میں ڈالتا ہے کیونکہ عفت وعصمت جو انسانیت کی جان ہے اس کی حفاظت تجرد کی زندگی میں بالکل غیر یقینی ہے، نہ جانے کس وقت اس جوہر انسانیت کو آدمی کھو بیٹھے، اسی بنا پر قرآن نے بار بار نکاح کی ترغیب دی ہے حتیٰ کہ اگر کوئی آدمی غریب وفاقہ مست ہو، لیکن اس میں رشد وصلاح کے آثار نظر آتے ہوں تو اس کو اپنی لڑکیاں دے کر رشتۂ نکاح میں باندھ دینا چاہیے، اسی طرح بیوہ عورتوں کو بھی بٹھائے نہ رکھنا چاہیے کیونکہ یہ ان کی فطرت کے ساتھ ظلم ہے۔ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ ترجمہ: "تم میں سے جن لوگوں کی شادی نہ ہوئی ہو ان کا نکاح کر دو اور تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں جو اچھے بھلے ہوں ان کا بھی نکاح کر دو، اگر وہ نادار ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے خوشحال کر دے گا"۔ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ کا جملہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ بعض صحابہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دینی زندگی اور روحانی واخلاقی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ دنیاوی اور مادی علائق سے کنارہ کش ہو جائیں۔ آپ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے اس راہبانہ خیال کو سخت ناپسند فرمایا اور اعلان فرمایا کہ یہ طریقہ نبوت کے خلاف ہے:۔

اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ

نکاح میری سنّت ہے جو شخص اس سے منہ موڑتا اور میرے طریقے سے روگردانی

مِنِّیْ ۔ لہ کرتا ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔

غرض یہ کہ میاں بیوی کے تعلق ہی سے نسل چلتی ہے اور اسی سے خاندان کا نظام ورشتہ پیدا ہوتا ہے، اس لئے یہ جتنا ہی زیادہ پاکیزہ اور مضبوط ہوگا اتنا ہی پاکیزہ اور مضبوط رشتے کا خاندان وجود میں آئے گا، اور جتنا پاکیزہ اور صالح خاندان وجود میں آئے گا، ویسا ہی پاکیزہ معاشرہ بنے گا، اور اس معاشرے کے ذریعے اسی طرح کا پاکیزہ تمدّن ظہور پذیر ہوگا اس لئے اسلام نے اپنی اخلاقی ہدایتوں اور قانونی بندشوں سے پوری کوشش کی ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ زیادہ سے زیادہ پاکیزہ اور مضبوط طریقے پر قائم بھی ہو اور پھر مضبوط اور پاکیزہ طریقے پر قائم بھی رہے، اور جہاں اس تعلق میں پاکیزگی اور مضبوطی نہ پیدا ہو رہی ہو، وہاں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ اس رشتے کو کاٹ دیا جائے کیوں کہ اس کمزور اور غیر پاکیزہ رشتے کو قائم رکھنے سے بہتر ہے کہ اسے کاٹ ہی دیا جائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کمزور اور غیر پاکیزہ رشتے سے جو خاندان وجود میں آئے گا وہ بھی انتہائی کمزور اور غیر پاکیزہ ہوگا۔ اسی لئے حدیث میں نکاح سے پہلے عورت کو ایک نظر دیکھ لینے کی اجازت ہے۔

نکاح ایک مضبوط معاہدہ ہے

جس طرح تمام معاملات میں دو آدمی آپس میں ایک معاہدہ کرتے ہیں، اور معاہدہ کرنے کے بعد دونوں پر اس وقت تک اس کی پابندی ضروری ہوتی ہے، جب تک یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس معاہدے کے باقی رکھنے میں کسی نہ کسی فریق کا کوئی مادی یا اخلاقی نقصان یقینی ہے، اسی طرح اسلامی شریعت نکاح کے تعلق کو بھی ایک مضبوط معاہدہ قرار دیتی ہے، اور

لہ یہ دو حدیثوں کے ٹکڑے ہیں، دوسرا ٹکڑا بخاری اور مسلم وغیرہ میں ہے فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ یہ اُس حدیث کا ٹکڑا ہے جس میں کچھ لوگوں نے اپنی عبادت کو کم سمجھ کر بیوی سے علیحدہ رہنے کی بات کی تو آپ نے فرمایا کہ میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور بیوی بچوں سے بھی تعلق رکھتا ہوں، میری سنّت سے جو ہٹے گا وہ میرا امتّی نہیں ہے، اور پہلا ٹکڑا ابن ماجہ کی روایت کا ہے جس میں آپ نے نکاح کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا النکاح من سنتی فمن لم یعمل بسنتی فلیس منی۔ (ابن ماجہ کتاب النکاح بخاری کتاب النکاح)

اس معاہدے کو اس وقت تک توڑنے کی اجازت نہیں دیتی، جب تک یہ یقین نہ ہوجائے کہ اس کے توڑنے میں اچھائی ہے، اسی لئے وہ اس کو عقدِ نکاح کے لفظ سے تعبیر کرتی ہے، عقد کے معنی گرہ دینے یا باندھنے کے ہیں، یعنی نکاح کے ذریعے میاں بیوی مل کر اور بندھ کر ایک خاندان کی داغ بیل ڈالتے ہیں اور اس کے واسطے سے معاشرے کی اس بنیاد کو استوار کرنے کا معاہدہ کرتے ہیں، جس پر ایک صالح تہذیب اور پاکیزہ تمدّن کے وجود و ظہور کا مدار ہے،[1]

---

[1] وھو عبارۃ عن الایجاب والقبول مع الارتباط الذی حصل بربط أحدھما مع الاٰخر۔
(حاشیہ شرح وقایہ، ج ۲ ص۴)

نکاح کے معنی اور اس کی تعریف نکاح کے لغوی معنی کسی دو چیز کو ملا دینے اور جمع کرنے کے ہوتے ہیں، اسی لئے فقہائے احناف نے نکاح کے حقیقی معنی وطی اور مباشرت کے لئے ہیں، اور عقد سے اس کا اظہار ہوتا ہے ان کا استدلال لغت کے علاوہ قرآن پاک کی اس آیت سے ہے:

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ (آل عمران)

ان عورتوں سے تم نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ دادا نے نکاح کیا ہے مگر جو اس سے پہلے ہو چکا ہو

اس میں نکاح کا لفظ وطی کے معنی میں ہے، اس لئے کہ صرف عقد سے کوئی عورت حرام نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لئے مباشرت ضروری ہے۔

امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ اس کے حقیقی معنی عقد کے ہیں، اور مجازاً اس کا اطلاق وطی پر ہوتا ہے، ان کا استدلال قرآن کی دوسری آیت سے ہے:

وَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ۔ (بقرہ)

اگر مرد تیسری طلاق دیدے تو وہ عورت جب تک دوسرا نکاح نہ کرے تب تک پہلے شوہر کے لئے جائز نہیں ہو سکتی۔

یہاں نکاح کی نسبت عورت کی طرف ہے اور وطی عورت کی طرف سے نہیں ہوتی، مگر احناف کہتے ہیں کہ یہاں بھی یہ وطی کے معنی میں ہے۔ اس لئے کہ رفاعۃ القرظی کی بیوی نے طلاق کے بعد حلالہ مکمل کئے بغیر رجوع
(باقی ص۔ پر)

اسی لئے قرآن نے نکاح کے مقابلے میں سفاح کا لفظ استعمال کیا ہے. کیونکہ جس طرح نکاح کے ذریعے ایک پاکیزہ خاندان اور پاکیزہ معاشرہ وجود میں آتا ہے، اسی طرح سفاح کے ذریعے خاندان کے وجود اور معاشرے کی پاکیزگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد کوئی مضبوط تمدّن برپا نہیں ہو سکتا. [۱]

سفاح کے معنیٰ

سفاح کے لفظی معنی بہانے اور انڈیلنے کے ہیں، اسی سے یہ محاورہ نکلا ہے کہ بَیْنَہُمْ سِفَاحٌ یعنی ان کے درمیان خونریزی ہے، بنو عباس کے پہلے خلیفہ کو سفاح اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے ناحق خونریزی کی تھی، سفیح جوئے کے اس تیر کو کہتے ہیں، جس کا کوئی حصہ نہ ہو گویا سفح کے لفظ میں بے کار جانے، اور بے ضرورت کسی چیز کو بہانے کے معنیٰ پوشیدہ ہیں، اسی لئے زنا کو سفاح کہتے ہیں، کیوں کہ زنا میں آدمی اپنا نطفہ بالکل ضائع کرتا ہے اسی لئے قرآن نے زانی و بدکار مردوں کے لئے

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) کرنا چاہا تو آپؐ نے فرمایا لا حتّی تذوقی عسیلتہ ویذوق عسیلتك (بخاری و مسلم) "جب تک تم ان سے لذت اندوز نہ ہو لو اور وہ تم سے اس وقت نکاح نہیں کر سکتی."

یعنی نکاح کا یہاں بھی مفہوم وطی اور مباشرت ہی ہے. بعض فقہاء نے اسے دونوں میں مشترک مانا ہے. یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے.

نکاح کے لغوی اور شرعی معنی کی جو تفصیل کی گئی ہے، اس کی روشنی میں نکاح کی تعریف میں بھی تھوڑا اختلاف ہے، مگر ساری تعریفوں کا خلاصہ یہ ہے کہ نکاح ایک شرعی معاہدہ کا نام ہے جو دو مسلمان مرد و عورت جائز طریقہ پر اپنی جنسی خواہش کی تکمیل اور عصمت و عزت کی حفاظت کے لئے کرتے ہیں.

(رد المحتار، ج ۲ ص ۲۵۸، شرح وقایہ، ج ۲ ص ۳، الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۴ ص ۲)

[۱] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے اپنی ذات کے بارے میں فرمایا:

وُلِدْتُ من نکاح لا بسفاح. (المغنی ج ۶ ص ۴۴۵)

میری ولادت نکاح کے ذریعہ ہوئی ہے، سفاح کے ذریعہ نہیں.

مُسَافِحِيْنَ اور زانیہ وفاحشہ عورتوں کے لئے مُسَافِحَات کا لفظ استعمال کیا ہے۔[1]

قرآن نے بار بار سفاح سے بچنے کی تاکید کی ہے اور نکاح کے ذریعے احصان کی ترغیب دی ہے مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ، مُحْصِنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ احصان کی تشریح آگے آئے گی۔

معاہدہ کا مقصد

اسلامی شریعت میں نکاح کی حیثیت جو ایک معاہدہ کی قرار دی گئی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اس رشتہ کے سلسلے میں مرد اور عورت کی حیثیت برابر کی ہے اور جس طرح دو آدمی آپس میں خوشی سے خرید و فروخت کا معاہدہ کرتے ہیں، اسی طرح میاں بیوی اپنی مرضی اور خوشی سے ایک ساتھ زندگی گذارنے کا معاہدہ کرتے ہیں۔

رشتۂ نکاح کا یہ تصوّر ہندوؤں کے اس تصور کی نفی کرتا ہے کہ "وہ ایک دھارمک سنسکار یا کنیا دان ہے"۔ جس کے تحت عورت مرد کی غلام بن کر رہ جاتی ہے اور عیسائیوں کے اس طرز عمل کی بھی تردید کرتا ہے کہ یہ ایک عدالتی حق ہے کہ عدالت کے بغیر رشتہ قائم نہیں ہو سکتا، اسی تصوّر کے تحت سول میرج ایکٹ اور اسپیشل میرج ایکٹ کو ہمارے دستور کا جز بنایا گیا ہے، یہ دونوں تصورات اسلامی شریعت سے ٹکراتے ہیں، اس لئے کہ اسلامی شریعت نے انسان کی نفسیات اور فطرت کے پیش نظر اسے خالص مرد و عورت کا مساویانہ حق سمجھا ہے، اس لئے کہ زندگی ان کو گذارنی ہے، اس بنا پر اس میں رضا کا پہلو جتنا غالب ہوگا زندگی اتنی ہی خوشگوار گذرے گی، البتہ اس رضا اور خوشی کو مغربی تہذیب کی طرح اس نے بے لگام نہیں چھوڑا ہے بلکہ اس کو قانونی بندشوں اور اخلاقی قدروں کا پابند بھی کیا ہے، اوپر نکاح اور سفاح کی جو تفصیل کی گئی ہے اس سے بھی اس پابندی کا کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا اور آگے اس کی مزید تفصیل آرہی ہے۔

رشتۂ نکاح فتنہ بھی ہو سکتا ہے

جس طرح سفاح کے ذریعے کوئی صالح معاشرہ پیدا نہیں ہو سکتا، اسی طرح نکاح کا تعلق بھی

---

[1] لسان العرب اور تاج العروس لفظ سفح۔

اگر شریعت کے مقررہ حدود سے تجاوز کر جائے یا اس میں کوئی کوتاہی رونما ہو جائے، تو یہ تعلق بھی آدمی کے لئے ایک فتنہ اور برائی کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ یہ رشتہ عبادت بھی ہے اور معاملہ بھی، اسی لئے اس تعلق میں دونوں کے شرائط کا لحاظ ضروری ہے، عبادت کی روح خدا سے تعلق اور اس کی بندگی ہے، اور معاملہ کی روح بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائیگی، ان کے ساتھ حسن معاملہ اور حسن سلوک ہے، اگر ان دونوں تصورات سے کوئی نکاح خالی ہوگا تو اس کے دو نقصان ہوں گے، ایک نقصان تو دنیا میں ہوگا، دوسرا آخرت میں، دنیا میں نقصان تو یہ ہوگا، کہ اس کے ذریعے کسی صالح اور پاکیزہ خاندان کی بنیاد نہیں پڑ سکتی، جس کا اثر انسانی معاشرے اور تہذیب و تمدّن پر پڑے گا اور آخرت میں یہ نقصان ہوگا، اس کو اس تعلق پر اجر و ثواب کے بجائے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا، اسی لئے قرآن نے بار بار یہ تصوّر ذہن نشین کرایا ہے کہ رشتے، خاندان اور اسکے لوازمات کی ادائیگی فرض کی حیثیت رکھتی ہے مگر اسی کے ساتھ یہ بات بھی ایک مسلمان کے پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ اس رشتہ اور اسکے لوازمات کی محبّت خدا اور خدا کے رسول اور اس کے دین کی محبت پر غالب نہ آ جائے، کیونکہ عبادت کی روح یہ ہے کہ خدا کی محبّت سب پر غالب ہو۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ۔ (توبہ)	اے نبی کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے لڑکے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور تمہارے وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں، اور وہ تجارت جس کے گھاٹے کا تم کو خوف ہے اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو تم کو خدا کے، اس کے رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ محبوب ہیں، تو خدا کے حکم کا انتظار کرو۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ۔ (تغابن)	اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد ہی میں بعض تمہارے دشمن ہیں، تو ان سے بچتے رہو۔

یعنی ان کی حد سے زیادہ محبت تمہارے لئے اسی طرح نقصان رساں ہوتی ہے جسطرح ایک دشمن کی دشمنی۔

انسان کی زندگی میں مذکورہ بالا تمام چیزیں فتنہ بنتی ہیں، مگر اس میں سب سے بڑا فتنہ عورت ہے، مغربی تہذیب کے ہاتھوں سے اس وقت نہ صرف یورپ، امریکہ اور روس میں اسے فتنہ بنا دیا گیا ہے بلکہ یہ فتنہ اب ہمارے آپ کے گھروں میں بھی پہونچ گیا ہے۔

اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں اپنے بعد سب سے بڑا فتنہ مرد کے لئے عورت کو چھوڑ رہا ہوں، اسی فتنے نے بنو اسرائیل کو سب سے زیادہ تباہ کیا تھا[۱]، جس طرح اس رشتے کی محبت کا مقررہ حدود سے تجاوز کر جانا آدمی کے دین و ایمان کے لئے فتنہ ہے، اسی طرح اس کے مقررہ حدود میں کوتاہی دوسرا نقصان اور فتنہ ہے، اسی لئے یہ تاکید بھی کی گئی ہے کہ چونکہ عورت فطرتاً کمزور ہوتی ہے اور مرد کو اس کے اوپر کچھ فطری اور شرعی تفوق بھی حاصل ہے، اس لئے اس کے ساتھ انتہائی عدل وانصاف، نرمی، ملاطفت اور حسنِ سلوک کا معاملہ کیا جائے کیونکہ جو شخص اپنی بیوی سے عدل و انصاف اور حسنِ سلوک نہ کر سکا تو پھر اس سے کیا امید کی جائے کہ اس کے ذریعے جو خاندان وجود میں آئے گا اس میں کوئی اخلاقی خوبی موجود ہوگی، اور جب کوئی خاندان اخلاقی خوبیوں سے خالی ہوگا تو اس سے جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ بھی اس سے خالی ہوگا، قرآن نے نکاح کرنے کی ترغیب ضرور دی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ تاکید کر دی ہے کہ:۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔ ان کے ساتھ معقول و مناسب طریقے پر رہو سہو۔ (بقرہ)

قرآن نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے لیکن اگر کوئی آدمی ان کے درمیان عدل قائم نہ رکھ سکے تو پھر ایک شادی سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے:۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اگر تم کو یہ خوف ہو کہ تم ان کے درمیان

---

[۱] ما ترکت بعدی فتنۃ اضر علی الرجال من النساء۔ (بخاری ج ۲ ص ۷۶۳، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۶۷)

فَوَاحِدَۃً۔ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی نکاح پر اکتفا کرو۔ (نساء)

غرض یہ کہ تجاوز و تقصیر دونوں سے بچ کر اگر یہ تعلق قائم نہ رکھا جائے، تو پھر میاں بیوی کے تعلق میں اعتدال و توازن قائم نہیں رہ سکتا، اور جب یہ اعتدال و توازن قائم نہیں رہے گا تو آدمی یا تو بیوی بچوں کا بندہ ہو کر رہ جائے گا، یا پھر ان کا خدا بننے کی کوشش کرے گا، اور ان دونوں صورتوں میں اس کے ذریعہ وہ صالح معاشرہ نہیں پیدا ہو سکے گا، جس کے لئے اسلام نے اس تعلق کو انتہائی ضروری قرار دیا ہے، اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جب تمہاری لڑکی کا رشتہ کسی ایسے لڑکے سے لگ رہا ہو جس کے دین و اخلاق سے تم مطمئن ہو تو فوراً نکاح کر دو، اگر تم نے ان چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز کو معیار بنایا تو پھر:۔

تَکُوْنُ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ کَبِیْرٌ۔ تو زمین میں ایک فتنہ اور فساد عظیم کھڑا ہو جائے گا۔ (ترمذی)

گویا دین و اخلاق کے علاوہ کوئی اور چیز دیکھنے کی نہیں ہے، کیونکہ ایک صالح خاندان کو وجود میں لانے کے لئے بنیادی صفتیں یہی دو ہیں۔ کفاءت کے بیان میں اس کی مزید تفصیل آ رہی ہے۔ راقم الحروف نے اس پر ایک الگ کتابچہ بھی لکھ دیا ہے۔

واجب، سنّت اور مکروہ اور حرام

قرآن و حدیث کی مذکورہ بالا ہدایات کی روشنی میں فقہاء نے لکھا ہے، کبھی نکاح کرنا واجب ہوتا ہے، کبھی سنّت اور کبھی مکروہ، جب آدمی پر شہوت اتنی غالب ہو جائے کہ اسے گمان غالب ہو کہ وہ شادی نہیں کرے گا تو زنا میں مبتلا ہو جائے گا، اس وقت نکاح کرنا واجب ہے اور عام صورت میں نکاح کرنا سنتِ موکدہ ہے، اگر اسے یہ خوف ہو کہ وہ ممکن ہے کہ بیوی کے ساتھ اچھا سلوک نہ کر سکے تو نکاح کرنا مکروہ ہے اور اسے ظلم و زیادتی کا پورا یقین ہو تو اس کے لئے نکاح کرنا حرام ہے۔ (حاشیہ شرح وقایہ بحوالہ البحر الرائق، کتاب النکاح)۔

نکاح کے مادی و اخلاقی مقاصد اور فوائد

جیساکہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، کہ ایک صالح تہذیب کو پیدا کرنے کے لئے ایک صالح معاشرے کی ضرورت ہے اور معاشرے کی صالحیت کا سارا دارومدار خاندانی نظام کی استواری اور صالحیت پر ہے، اور صالح خاندان کا وجود عقدِ نکاح پر مبنی ہے، لیکن نکاح کے ذریعے ایک صالح اور پاکیزہ خاندان کا وجود اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس نکاح کے ذریعہ وہ مقاصد پورے ہو رہے ہوں، جن کی تکمیل ہی کے لئے مرد و عورت کو اس قید میں جکڑا گیا اور اس رشتے میں باندھا گیا ہے ورنہ ان کی تکمیل کے بغیر بعض صورتوں میں اس قید کو توڑ دینا اور اس رشتے کو کاٹ دینا ہی بہتر بلکہ ضروری ہے، امام سرخسی لکھتے ہیں:۔

لیس المقصود بھذا العقد قضاء الشھوۃ وانما المقصود ما بیناہ من اسباب المصلحۃ ولکن اللہ تعالیٰ علق بہ قضاء الشھوۃ ایضاً لیرغب فیہ المطیع والعاصی المطیع للمعانی الدینیہ والعاصی لقضاء الشھوۃ۔[1]

اس عقد نکاح کا مقصد صرف قضائے شہوت نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصود وہ مصالح ہیں، جن کو ہم بیان کر آئے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ قضائے شہوت کو بھی اس سے وابستہ کر دیا ہے تاکہ اس میں نیک و بد دونوں طرح کے لوگ رغبت رکھیں، فرماں بردار اور نیک آدمی دینی و اخلاقی مقاصد کی تکمیل و تحصیل کے لئے اور نافرمان آدمی قضائے شہوت کے لئے۔

❊ ❊ ❊

نکاح کے بنیادی مقاصد یہ ہیں:۔

(۱) عفت و عصمت کی حفاظت

اسلام کے نزدیک نکاح کا سب سے بڑا مقصد انسان کی اس فطری عفت و عصمت کی حفاظت کرنا ہے، جو ہر انسان کے اندر خواہ مرد ہو یا عورت فطری طور پر موجود ہے،

---

[1] مبسوط سرخسی، ج ۴ ص ۱۹۴۔

اسی کی حفاظت کے لئے اس نے زنا اور متعلقات زنا مثلاً بے پردگی، بے حجابی، بے شرمی کی باتوں اور اجنبی عورتوں اور مردوں کے اختلاط کو حرام قرار دیا ہے، اور مرد و عورت دونوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ دونوں ایک ایسے ضابطے کے ذریعے اپنے فطری تعلق کو قائم کریں اور قائم رکھیں، جس کے ذریعے ان کی عصمت و عفت مجروح ہونے کے بجائے محفوظ و مامون ہو جائے، قرآن نے اسی لئے بدکاری و زنا کو سفاح کے لفظ سے، اور پاک دامانی اور نکاح کو لفظ احصان سے تعبیر کیا ہے، سفاح کے معنی کسی چیز کو بے کار بنانے اور ضائع کرنے کے ہیں اور احصان کے معنی محفوظ کرنے اور حفاظت گاہ بنانے کے ہیں، گویا زنا کے ذریعے ایک مرد اور عورت اپنی فطری عصمت و عفّت کو ضائع کرتے ہیں اور نکاح کے ذریعے اس کو محفوظ کرتے ہیں :-

اُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَالِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ۔ (نساء)

مذکورہ عورتوں کے علاوہ تمام عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں، بشرطیکہ تم ان کو مہر دیکر ان کو قید نکاح میں لانا چاہو آزاد شہوت رانی مقصود نہ ہو۔

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسَافِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذَاتِ اَخْدَانٍ۔ (نساء)

تم ان کے ذمہ داروں کی اجازت سے ان سے نکاح کرو، اور حسبِ استطاعت ان کے مہر ادا کرو، وہ پابند اور پاک دامن بنکر رہیں، اعلانیہ یا چوری چھپے شہوت رانی کرنیوالی نہ ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار نوجوانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ :-

يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَاِنَّهٗ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَاَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَاِنَّهٗ لَهٗ وِجَاءٌ۔ (بخاری و مسلم)

اے نوجوانو! تم میں جو نکاح کی ذمہ داری اٹھانیکی طاقت رکھتا ہے وہ نکاح کرلے اس لئے کہ اس سے نگاہیں نیچی اور شرمگاہیں محفوظ رہیں گی اور جن کو استطاعت نہ ہو وہ روزے رکھیں کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص زنا اور بدکاری سے بچنا، اور اپنی عصمت وعفت کی حفاظت کرنا چاہتا ہے تو اس کو قید نکاح کا پابند ہونا چاہیئے۔

(۲) الفت ومحبّت

نکاح کی دوسری غرض یہ ہے کہ میاں بیوی کا یہ تعلق محض خواہش نفسانی کی تکمیل ہی کا سبب نہ ہو، بلکہ یہ تعلق محبت ومودت کی ایک مضبوط بنیاد ثابت ہو، اس کے ذریعے دونوں کو سکون وراحت میسر ہو، کیونکہ دو آدمیوں کا یہ تعلق اگر سکون وراحت کی فضا نہ بنا سکے، تو پھر اس کے ذریعے نہ تو اچھا خاندان وجود میں آسکے گا اور نہ خدا کے دوسرے بندوں کے وہ حقوق ہی پورے ہو سکتے ہیں جن کے لئے ان دونوں کو ایک رشتہ میں جوڑا گیا ہے، کیونکہ اگر خشت اوّل ہی کج رہے گی تو اس کے اوپر جو تعمیر ہوگی وہ بھی کج ہی ہوگی، خدا تعالیٰ نے میاں بیوی کی الفت ومحبت کو اپنی ایک خاص نشانی قرار دیا ہے:۔

وَمِنْ اٰيَاتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً۔ (روم)	اس کی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اور اس نے تمہارے درمیان الفت ومحبت پیدا کر دی ہے۔
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا۔ (اعراف)	وہی ذات ہے جس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا، تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کر سکے۔

قرآن نے یہاں تین الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مودّت، رحمت، اور سکون، مودت میں ہر طرح کی محبت اور الفت آجاتی ہے اور رحمت کے لفظ میں ہر طرح کی ہمدردی، مہربانی اور غمگساری شامل ہے، اور سکون کے لفظ میں ہر طرح کا سکون خواہ وہ جنسی سکون ہو یا ذہنی وقلبی سکون ہو وہ سب اس میں شامل ہے، قرآن نے ایک لفظ سکون میں فلسفۂ زوجیت کا پورا دفتر سمیٹ کر رکھ دیا ہے، قرآن نے دوسری جگہ اس تعلق کو "لباس" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور اس کے لئے اس سے بہتر تعبیر ممکن

نہیں ہے:۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ (بقرہ)	وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔

لباس کا لفظ بڑا جامع ہے، اس میں دسیوں معنی پوشیدہ ہیں۔ لباس آدمی کے جسم کو چھپاتا ہے، اس کو زینت دیتا ہے، اس کی عزت اور خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے، اس کے جسم کو مضر اثرات سے بچاتا ہے، میاں بیوی کے تعلق کو لباس کہنے کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں کو ایک دوسرے کا پردہ پوش ہونا چاہیئے، ایک دوسرے کی زینت و آرائش ہونا چاہیئے، ان کے جسم و جان میں وہی اتصال ہونا چاہیئے جو لباس اور جسم کے درمیان ہوتا ہے۔ ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و مضرت کا احساس اور اس سے بچانے کا خیال ہونا چاہیئے، حدیث نبوی میں بھی نکاح کو محبت و الفت کا ذریعہ بتایا گیا ہے:۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم، لم تر المتحابین مثل النکاح۔ (ابن ماجہ مشکوٰۃ ص۲۶۵)	میاں بیوی سے زیادہ آپس میں محبت کرنے والا تم کسی اور کو نہ پاؤ گے،

⁂ ⁂ ⁂

(۳) حدود اللہ کا قیام

نکاح کی تیسری غرض یہ ہے کہ یہ تعلق خدا کے مقرر کردہ حدود کو قائم کرنے کا سبب ہو، ان کے توڑنے کا سبب نہ ہو، چنانچہ قانونِ مناکحات کے ہر حکم کے وقت حدود اللہ کے قیام کی تاکید کی گئی ہے:۔

اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللهِ (بقرہ)	یہ کہ دونوں حدود اللہ کو قائم رکھ سکیں۔

نکاح و طلاق کے احکام بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے:۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (بقرہ)	جو لوگ اللہ کے قائم کردہ حدود سے آگے جائیں گے وہ ظالم ہیں۔

اسی وجہ سے مسلمانوں کے لئے کافروں سے رشتہ مناکحت حرام قرار دیا گیا ہے، کیونکہ کافروں سے حدود اللہ کے قیام کی توقع نہیں کی جا سکتی، چنانچہ مشرک اور مشرکہ سے نکاح حرام قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر یہ تم کو بھلے لگیں جب بھی ان سے

نکاح نہ کرو، وَلَوْ اَعْجَبَتْکُمْ اگرچہ مشرک عورت تم کو بھلی لگے، کیونکہ :۔

اُولٰئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ۔ (بقرہ)

یہ مشرک لوگ اپنے عمل سے دوزخ کیطرف بلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم کے ذریعے جنّت و مغفرت کی طرف بلا رہا ہے۔

(۴) اولاد کی کثرت

نکاح کا چوتھا اخلاقی اور مادی مقصد اولاد کی کثرت بھی ہے، یعنی اچھی تعلیم و تربیت کے ساتھ انسانی نسل میں اضافہ ہو تو یہ چیز نہ صرف خاندانی نظام اور معاشرہ کے لئے ایک رحمت ثابت ہوگی، بلکہ اس کے ذریعے ایک اچھی تہذیب اور ایک اچھا تمدن نشو و نما پائے گا، اسی لئے اسلام کی نگاہ میں اولاد کی کثرت انتہائی پسندیدہ چیز ہے، البتہ اگر تعلیم و تربیت نہ ہو تو پھر یہ کثرت بگاڑ کا سبب بن سکتی ہے، اور تعلیم و تربیت کی اس ذمہ داری میں والدین کے ساتھ حکومت کو برابر کا شریک رہنا ضروری ہے۔

شادی کے انتخاب کے سلسلہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں :۔

كان يأمر بالباءة وينهى عن التبتّل ويقول تزوجوا الودود الولود فاني مكاثر بكم الانبياء يوم القيامة۔ (مسند احمد، ابوداؤد)

شادی کرکے اپنی خواہش نفس کی تکمیل کی آپ ترغیب فرماتے تھے اور شادی نہ کرنے کو انتہائی ناپسند فرماتے تھے، آپ فرماتے تھے کہ محبت کرنے والی اور زیادہ بچہ جننے والی عورتوں سے شادی کرو، اس لئے کہ قیامت کے دن تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں مجھے فخر ہوگا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ایک مومن کی دعا یہ ہونی چاہیئے کہ اے اللہ مجھے ایسی اولاد عطا کر جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہو اور آنکھوں کی **ٹھنڈک وہی اولاد** ہی ہوسکتی ہے جس کی تعلیم و تربیت اچھی ہوئی ہو۔

نس بندی

اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اسلامی شریعت مالتھس کے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتی کہ ذرائع پیداوار آبادی کا ساتھ نہیں دے سکتے اس لئے آبادی پر کنٹرول ضروری ہے، اسلامی شریعت آبادی پر کنٹرول کے بجائے ذرائع پیداوار میں زیادہ سے زیادہ وسعت پیدا کرنے پر زور دیتی ہے، اس کا نظریہ ہے کہ:۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (ہود) — کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے اوپر نہ ہو۔

اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

غرض یہ کہ رشتۂ نکاح کے ذریعہ عفت وعصمت کی حفاظت ہونی چاہیے، الفت ومحبت کی فضا پیدا ہونی چاہیئے، حدود اللہ کا قیام ہونا چاہیئے، اچھی اولاد کی خواہش ہونی چاہیئے، اگر اس کے ذریعے یہ مقاصد پورے نہ ہوں تو اس رشتے کو باقی رکھنے سے بہتر ہے کہ اس کو کاٹ کر ایسا رشتہ تلاش کیا جائے جس کے ذریعے یہ مقاصد پورے ہوتے ہوں مگر اس رشتے کے کاٹنے میں بھی معقولیت وانسانیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ بیٹھنا چاہیئے۔

فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ۔ (بقرہ) — یا تو مناسب ومعقول طریقے پر روک رکھا جائے یا پھر عمدگی کے ساتھ جدا کر دیا جائے۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ۔ (طلاق) — ان کو یا تو معقول طریقے پر روک لو یا پھر عمدہ طریقے پر جدا کر دو۔

چنانچہ فقہاء نے اسی وجہ سے لکھا ہے کہ جب مرد یا عورت کو یہ گمان اور خیال ہوا کہ نکاح کے بغیر اس کی عفت وعصمت محفوظ نہ رہ سکے گی تو نکاح واجب ہے، لیکن اگر اس کو عفت وعصمت کے محفوظ نہ رہنے کا یقین ہو جائے تو پھر فرض ہے، اور اگر ان باتوں کا گمان، خیال یا یقین نہ بھی ہو تب بھی نکاح کرنا سنت مؤکدہ ہے" فیاثم بترکہ ویثاب ان نوی تحصینا وولدا" اگر ایسا نہ کرے گا تو گنہ گار ہوگا، اور اگر اپنی عصمت کی حفاظت اور اولاد کی خواہش کے لئے شادی کرے گا تو اجر وثواب کا مستحق ہوگا لیکن

اگر مرد کو یہ خیال یا گمان ہو کہ وہ عورت کے حقوق ادا نہ کر سکے گا تو اس کا نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہے، اور اگر اس کو عدم ادائیگی حقوق کا یقین ہو تو پھر نکاح کرنا حرام ہے[1]۔ (در مختار، ج ۲ ص ۲۶۱)۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ اسلامی قانونِ مناکحت میں جتنی اخلاقی ہدایتیں دی گئی ہیں اور جتنی قانونی قیدیں لگائی گئی ہیں، ان سب کا مقصود یہ ہے کہ اس تعلق کے ذریعے ایک ایسا خاندان اور معاشرہ بن سکے، جس کے افراد میں عفت و پاکبازی ہو، الفت و محبت ہو، ہمدردی و غم گساری ہو، خدا کے حدود و قیود کا لحاظ بھی ہو، اور بندوں کے حقوق کا پورا پورا خیال و پاس بھی، اور یہ مقصود اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب رشتۂ نکاح کے ذریعے میاں بیوی دونوں ان مقاصد کو پورا کرنے کی کوشش کریں، جن کے پورا کرنے ہی کے لئے اسلام نے نکاح کی اجازت بلکہ ترغیب دی ہے۔ آگے عورتوں، مردوں کے حقوق و فرائض کی مزید تشریح کی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ دونوں کو اپنے اندر کون کون سی اخلاقی خوبیاں پیدا کرنی چاہئیں کہ ان میں سے کسی کا شیشۂ دل غبار آلود نہ ہونے پائے، اور یہ رشتہ جنّت کی زندگی کا نمونہ بن سکے۔

رشتۂ نکاح کی فضیلت و اہمیت اور اس کے اخلاقی و قانونی مقاصد بیان کرنے کے بعد اب اسلامی قانونِ مناکحت کا طریقہ اور اس کی قانونی قیدوں اور شرطوں کی مکمل تفصیل پیش کی جاتی ہے، ان کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے۔

نکاح کا قانونی طریقہ

اوپر ذکر آچکا ہے کہ رشتۂ نکاح ایک مضبوط معاہدہ ہے اسی لئے اسے عقدِ نکاح کہتے ہیں، اور قانونی طور پر یہ عقدِ نکاح صرف دو لفظوں سے ہو جاتا ہے، ایک ایجاب، دوسرے قبول، یعنی کسی بالغ عورت نے بالغ مرد سے، یا کسی بالغ مرد نے بالغ عورت سے دو گواہوں کی موجودگی میں براہِ راست کہا یا وکیل کے ذریعے کہلایا کہ میں تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں، اور عورت نے اسے منظور کر لیا تو دونوں میں رشتۂ نکاح قائم ہو گیا، جس نے پہلے خواہش کا اظہار کیا ہے یا

---

[1] ائمہ ثلاثہ بھی اس بارے میں تھوڑے سے جزئی اختلاف کے ساتھ متفق ہیں (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

اس اظہار کی اجازت دی ہے، اس کے الفاظ کو ایجاب، اور جس نے بعد میں منظوری دی ہے اس کے الفاظ کو قبول کہا جاتے گا[1]۔ لیکن یہ دونوں لفظ جو عورت و مرد کی زبان سے نکلے ہیں، وہ کھیل تماشا نہیں، بلکہ ایک عہد کا اظہار اور ایک مضبوط بندھن ہیں، اسی لئے اسلامی شریعت نے ایجاب و قبول کے ساتھ کچھ اور شرطیں اور قیدیں بھی لگادی ہیں، تاکہ دونوں پوری سنجیدگی کے ساتھ سوچ سمجھ کر ان کو اپنی زبان سے ادا کریں اور پھر ان پر قائم رہیں، خطبۂ نکاح میں جو بہت سی ہدایات دی جاتی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا" یعنی تقویٰ کے ساتھ زبان سے جو اقرار کر رہے ہو، اس پر درستگی اور سچائی سے قائم رہنا، نکاح میں ایجاب و قبول کی حیثیت رکن کی ہے[2]۔ یعنی جن کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوگا، جیسے نماز میں رکوع و سجود کہ جن کے بغیر نماز ہوگی ہی نہیں۔ دوسری قیدیں شرط کی حیثیت رکھتی ہیں۔

گواہوں کی موجودگی

(۱) نکاح کے سلسلہ میں یہ ہدایت بھی ہے کہ نکاح کا اعلان ہونا چاہیئے، بہتر یہ ہے کہ نکاح مجمع میں یا مسجد میں کیا جاتے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اعلنو هذا النكاح واجعلوه في المساجد۔ (مشکوٰۃ و ترمذی)	نکاح کا اعلان کرو اور اس کو مسجد میں کیا کرو۔

(۲) ایجاب و قبول کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ یہ خفیہ اور پوشیدہ طور پر نہ ہو، بلکہ کم سے کم دو بالغ مسلمان گواہوں کے سامنے کیا جاتے، اگر دو مرد مسلمان گواہ کسی وجہ سے نہ مل سکیں تو کم سے کم ایک مرد اور دو عورتوں کا ہونا ضروری ہے، اگر ایجاب و قبول کے وقت کوئی مرد نہ ہو، بلکہ صرف عورتیں ہی عورتیں ہوں تو یہ نکاح صحیح نہ ہوگا۔

---

[1] الایجاب هو الاثبات لغةً یسمّٰی به اوّل کلام المتعاقدین وکلام الآخر المرتب علیه یسمّٰی قبولاً۔ (عمدة الرعایہ حاشیہ شرح وقایہ، ج ۲ ص۲)۔

[2] شرح وقایہ، ج ۲ ص۲۔

خواہ دس بیس عورتیں کیوں نہ ہوں، اسی طرح اگر دونوں گواہ یا ان میں سے ایک گواہ نابالغ یا پاگل ہو تو بھی نکاح صحیح نہ ہوگا۔[۱] گواہوں کے لئے چار شرطیں ہیں، وہ عاقل ہوں، بالغ ہوں، آزاد ہوں اور مسلمان ہوں یعنی پاگل نابالغ، غلام یا غیر مسلم کی گواہی معتبر نہیں ہے۔[۲]

(۳) گواہوں کے سلسلے میں ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ دونوں گواہ ایجاب و قبول کے وقت موجود ہوں اور ایجاب وقبول کے الفاظ اپنے کانوں سے سن رہے ہوں[۳] اگر عورت کو گواہ جانتے ہوں تو پھر اس کا نام لے کر یہ کہہ دینا کافی ہے کہ فلاں کا نکاح ہو رہا ہے اور اگر جانتے نہ ہوں تو پھر اس کے باپ یا دادا کا نام لے کر گواہوں کو بتادیا جائے کہ فلاں عورت کا نکاح ہو رہا ہے۔[۴]

(۴) عورت کو مرد کے بارے میں اچھی طرح معلوم ہونا چاہیئے کہ کس مرد سے اس کا نکاح ہو رہا ہے اور مرد کو عورت کے بارے میں اچھی طرح معلوم ہونا چاہیئے کہ کس عورت سے اس کا نکاح ہو رہا ہے، یعنی نام، ولدیت اور سکونت وغیرہ کا اظہار ہونا چاہیئے، اگر ان میں سے کوئی مجلس میں موجود ہو تو اشارہ کر دینا بھی کافی ہے۔[۵]

(۵) ایجاب وقبول کا ایک مجلس میں ہونا بھی ضروری ہے، ایک مجلس میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایجاب وقبول کے درمیان کوئی ایسا کام نہ ہو جس سے یہ محسوس ہو کہ اسے یہ رشتہ منظور نہیں ہے، مثلاً ایجاب کے بعد اس کے ولی یا سرپرست یہ کہیں کہ

---

[۱] ولا ینعقد بشہادۃ امرأتین بغیر رجل۔ (فتاوی ہندیہ، ج ۲ ص ۲۷۶)

[۲] وشرط فی الشہادۃ اربعۃ امور، الحریۃ والعقل والبلوغ والاسلام،

[۳] وحضور حرین أوحر وحرتین مکلفین مسلمین سامعین لفظہما۔ (فتاوی ہندیہ، ج ۲ ص ۲۷۶)

باپ نے اگر خود اجازت لی ہے، تو گواہوں کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ (شامی ج ۲ ص ۲۹۹ بحوالہ فتاوی محمودیہ)

[۴] فان الشہود یعرفونہا کفی ذکر اسمہا وان لم یعرفونہا لابد من ذکر اسمہا واسم ابیہا وجدہا۔ (ردالمحتار، ج ۲ ص ۲۷۴)

[۵] عالمگیری، کتاب النکاح، ج ۱ ص ۲۷۰۔

ابھی قبول نہ کرایا جائے ہم کل مشورہ کے بعد بتائیں گے، تو اگر منظور کر لیا تو دوبارہ ایجاب وقبول کرنا ہوگا۔

(۶) اگر مرد اور عورت خود اپنا نکاح کر رہے ہیں تو اس میں کوئی شرم کی بات نہیں ہے کہ دونوں دو گواہوں کے سامنے خود ایجاب وقبول کرلیں، اس صورت میں ان دونوں کو بھی ایک دوسرے کے الفاظ کا سننا ضروری ہے اور گواہوں کو بھی۔ اگر خود نکاح نہیں کر رہے ہیں، بلکہ عورت کی طرف یا مرد کی طرف سے کوئی دوسرا بحیثیت وکیل نکاح پڑھا رہا ہے، تو اس وکیل کو گواہوں کی موجودگی میں اس مرد یا عورت کی اجازت کو دوسرے کے کانوں تک پہونچا دینا چاہیئے تاکہ قبول کرنے والے کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ کس کو قبول کر رہا ہے[۱]

ایجاب وقبول کے الفاظ ماضی ہوں یا حال

ایجاب وقبول کے الفاظ ماضی ہونے چاہئیں[۲] یعنی اگر مرد اور عورت خود اپنا نکاح پڑھ کر رہے ہیں تو مرد کو اس طرح کہنا چاہیئے کہ میں نے تجھ سے نکاح اتنے مہر پر کیا اور عورت جواب میں کہے کہ میں نے قبول کیا، اسی طرح اگر ایک نے حال کے صیغے سے کہا کہ میں تجھ سے نکاح کرتا ہوں، دوسرے نے کہا میں نے قبول کیا، یا ایک نے کہا کہ میں نے اپنی لڑکی کا نکاح آپ سے کیا اور دوسرے نے کہا کہ میں قبول کرتا ہوں تو یہ بھی صحیح ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ دونوں کے الفاظ ماضی ہوں یا کم سے کم ایک کے الفاظ تو ضرور ماضی ہوں۔ اگر نکاح ولی یا وکیل پڑھا رہے ہوں تو اُن کو بھی ماضی کا صیغہ استعمال کرنا چاہیئے یعنی وکیل یا ولی کو یوں کہنا چاہیئے کہ میں نے فلاں لڑکی کا نکاح اتنے مہر پر تم سے کیا، یا فلاں لڑکی کو تمہارے عقدِ نکاح میں دیا اور اس کے جواب میں لڑکا

---

[۱] عالم گیری، کتاب النکاح، ج ۱ ص ۲۷۔

[۲] وینعقد بایجاب وقبول لفظهما ماض أو ما یعبر بأحدهما عن الماضی والآخر عن المستقبل۔ (شرح وقایہ ج ۲ ص ۶، بہشتی زیور بحوالہ المختصر للبغدادی، ج ۴ ص ۲)۔

کہے کہ میں نے قبول کیا اور اگر پہلے ایجاب لڑکے کی طرف سے ہوا ہے تو لڑکی کو کہنا چاہیئے کہ میں نے قبول کیا، اگر حال کے صیغے سے ہی نکاح پڑھا دیا تو یہ بھی جائز ہے، مگر قصداً ایسا نہ کرنا چاہیئے، لیکن اگر ایجاب و قبول ماضی و حال کے بجائے مستقبل کے الفاظ سے کیا گیا، یعنی یوں کہا گیا کہ میں نکاح کروں گا یا ولی کہے کہ میں فلاں لڑکی یا لڑکے کا نکاح آپ سے کروں گا اور دوسرا کہے کہ میں قبول کرتا ہوں، یا کروں گا تو نکاح صحیح نہ ہوگا[1] اس لئے کہ مستقبل کے صیغے سے کسی بات کی پختگی اور اقرار نہیں سمجھا جاتا ہے، بلکہ اس کی حیثیت وعدہ یا ٹال مٹول کی ہوتی ہے۔

کچھ ضروری مسائل

(۱) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان تمام الفاظ سے نکاح جائز سمجھتے ہیں جن سے ملک عین کا ثبوت ہوتا ہے، جیسے بیع و شرا اور ہبہ کے الفاظ، مگر ائمہ ثلاثہ امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس کے قائل نہیں ہیں، وہ نکاح یا زواج وغیرہ کے الفاظ کا استعمال ضروری سمجھتے ہیں، البتہ ہبہ کے لفظ میں امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کی رائے یکساں ہے، اس لئے کہ قرآن و حدیث میں یہ لفظ اس معنی میں آیا ہے۔

(۲) اس میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ اگر مذاقاً بھی کوئی نکاح قبول کرنے کے لئے کہے اور دوسرا قبول کرلے تو وہ منعقد ہو جائے گا، مثلاً کوئی کہے کہ میں نے آپ کی لڑکی سے نکاح کیا اور باپ اسے قبول کرلے تو نکاح ہو جائے گا، ائمہ نے یہ استدلال اس حدیث سے کیا ہے کہ ”ثلاث جدھن جد وھزلھن جد النکاح والطلاق والرجعۃ“ (ترمذی، ابوداؤد)

(۳) اتحاد مجلس پر تمام ائمہ متفق ہیں، یعنی جب تک مجلس قائم ہے، اس وقت تک ایجاب و قبول ہو سکتا ہے، یعنی ایجاب کے بعد قبول کی تھوڑی تاخیر اس کی صحت میں مانع نہیں ہے، البتہ امام شافعیؒ اتحاد مجلس کے ساتھ ایجاب کے بعد فوراً قبول کرنے

---

[1] لا یصح بمضارعین (ہدایہ حاشیہ، ج ۲ ص ۲۸۵)۔ [2] الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔

کے قائل ہیں، تاخیر صحیح نہیں ہے۔

(۴) ایجاب سے پہلے اگر قبول ہو جائے تو تمام ائمہ اس کی صحت پر متفق ہیں، مثلاً کوئی شخص کسی سے کہے کہ میں نے آپ کی لڑکی کو قبول کیا اور اس نے جواب میں کہا کہ میں نے اس کا نکاح کر دیا تو صحیح ہے۔

(۵) تمام ائمہ متفق ہیں کہ نکاح مؤقت باطل ہے، یعنی پندرہ دن یا ایک مہینے یا ایک سال کے لئے نکاح کرنا ناجائز ہے، یعنی متعہ تمام ائمہ کے یہاں حرام ہے۔

(۶) ایجاب و قبول کے وقت گواہوں کے موجود ہونے کو ائمہ ثلٰثہ ضروری قرار دیتے ہیں، اور امام مالکؒ اسے قبول کے وقت ضروری قرار دیتے ہیں، اور عقد کے وقت مستحب سمجھتے ہیں، ان کا یہ اختلاف اس بنیاد پر ہے کہ یہ حکم شرعی ہے یا اختلاف سے بچنے کے لئے سد ذریعہ کے طور پر ہے، ائمہ ثلاثہ اس کو حکم شرعی سمجھتے ہیں اور امام مالکؒ اختلاف کے رفع کرنے کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔

(۷) امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ شاہد کے عادل ہونے کی شرط لگاتے ہیں، یعنی ظاہری طور پر وہ عادل ہوں، امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر عادل موجود ہو تو اس کی شہادت ضروری ہے ورنہ پھر مستورالحال کی شہادت بھی جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ صحت نکاح کے لئے عدالت کو شرط نہیں قرار دیتے، البتہ انکار کے وقت اسے ضروری قرار دیتے ہیں یعنی ان کے یہاں فاسق کی شہادت سے بھی نکاح صحیح ہو جائے گا، البتہ جب یہ معاملہ عدالت میں جائے گا تو شاہد کے عادل ہونے کی شرط ہو گی (الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۴ ص ۲۵، بدایۃ المجتہد، ج ۲ ص ۱۷)۔

(۸) اگر کوئی گونگا ہو تو اس کا ایجاب یا قبول اس اشارہ کے ذریعہ ہو گا، جس اشارہ سے وہ کوئی چیز قبول کرتا ہے۔ (عالمگیری، ج ۱ ص ۲۷)۔

(۹) ایجاب و قبول میں کوئی ایک حال کے صیغے سے ہو، تو بھی نکاح ہو جائے گا، اور ایجاب امر کے صیغے سے بھی ہو جائے گا، مثلاً ایک مرد نے کسی عورت سے کہا کہ میرا نکاح اپنے سے کر لو، عورت نے کہا کہ میں نے قبول کیا تو نکاح منعقد ہو جائیگا (شرح وقایہ ج ۲ ص ۲)۔

مہر کا ذکر

ایجاب وقبول کے وقت مہر کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، مگر مہر کے ذکر کے بغیر بھی نکاح ہو جاتا ہے، بعد میں اسے مہر مثل دینا ہوگا، مہر کے سلسلے میں بعض اور ضروری مسائل کا ذکر آگے آئے گا۔

تحریر کے ذریعہ ایجاب وقبول

تحریر کے ذریعہ ایجاب وقبول دونوں نہیں ہو سکتے، مگر صرف ایجاب یا قبول ہو سکتا ہے، مثلاً زید نے عمر کو لکھا کہ میں اپنی لڑکی کے ساتھ آپ کا یا آپ کے لڑکے کا نکاح کرنا چاہتا ہوں اگر آپ قبول کریں تو آپ اس تحریر کو میری طرف سے اجازت سمجھیں، اب اگر عمر اس تحریر کے جواب میں اپنی رضامندی کی تحریر لکھ دیتا ہے، تو زید کے تحریری ایجاب اور عمر کے تحریری قبول سے نکاح منعقد نہیں ہو سکتا، عام حالات میں تحریری ایجاب وقبول نہ کرنا چاہیئے، لیکن اگر اس کی کوئی شدید ضرورت پیش آجائے تو پھر اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایجاب کی تحریر جو زید نے عمر کو لکھی ہے دو گواہوں کے سامنے عمر خود یا عمر کے ولی پڑھ کر سنادیں اور پھر ان دو گواہوں کے سامنے عمر اپنی رضامندی کا اظہار زبانی کردے، یعنی یہ کہہ دے کہ مجھے یہ رشتہ منظور ہے، یا میں نے قبول کیا تو نکاح صحیح ہو جائے گا، لیکن ایجاب کی تحریر میں لڑکے یا لڑکی کا پتہ، نشان اور مہر کا تذکرہ ضروری ہے، اب اگر اس قبول کی اطلاع زید کو تحریر کے ذریعہ دے دی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، غرض یہ ہے کہ ایجاب کو یا قبول کو زبانی ہونا ضروری ہے۔ دونوں کو تحریری نہ ہونا چاہیئے، اس صورت میں بھی گواہوں کی موجودگی ضروری ہے[1]، تحریری ایجاب وقبول کے لئے ضروری ہے کہ تحریر لکھنے والا مجلس میں موجود نہ ہو، اگر موجود ہے تو زبان سے ایجاب وقبول کرنا ضروری ہے[2]۔

ٹیلی فون سے نکاح

ٹیلی فون کے ذریعہ ایجاب وقبول صحیح نہیں ہے اگر کوئی شخص کسی کو ٹیلی فون پر وکیل بنادے کہ فلاں سے میرا نکاح کر دیجئے، یا باپ کہے کہ میرے فلاں لڑکے یا فلاں لڑکی کا نکاح آپ کر دیجئے، اب یہ

---

[1] درمختار، ج ۲ ص ۴۳۴، الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۴ ص ۱۵۔ [2] عالمگیری، ج ۱ ص ۲۷۰ و شامی، ج ۲۔

وکیل کی حیثیت سے دو گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول کرادیں تو نکاح صحیح ہو جائے گا، بشرطیکہ گواہ لڑکی یا لڑکے سے واقف ہوں۔

غیر عربی لفظ سے نکاح وطلاق

جن عبادات میں لفظ و معنی دونوں معتبر ہوتے ہیں، جیسے نماز یا تلاوتِ قرآن ان میں تو عربی زبان کا استعمال ضروری ہے، کسی اور زبان میں اس کا ترجمہ کر کے اسے ادا کیا جائے تو جائز نہیں، لیکن نکاح وطلاق یا بیع وشرا میں عربی زبان کا استعمال ضروری نہیں ہے، جس زبان میں اسے ادا کیا جائے وہ صحیح ہو جائے گا۔[1]

وکیل کے ذریعہ نکاح کا طریقہ

جس طرح کوئی بالغ مرد یا عورت خود دو گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول کر سکتے ہیں، اسی طرح کسی وکیل یعنی نمایندے کے ذریعہ بھی نکاح ہو سکتا ہے، لیکن وکیل کے ذریعہ اسی وقت نکاح صحیح ہو سکتا ہے، جب بالغ مرد یا عورت خود اپنی زبان سے اجازت دے، یا نابالغ لڑکے یا لڑکی کا ولی دو گواہوں کے سامنے وکیل کو صراحۃً یہ اجازت دے کہ میری لڑکی یا بہن کا نکاح فلاں سے کر دو، ایک شخص لڑکے اور لڑکی دونوں کا وکیل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ دونوں کا ولی ہو یا دونوں کا وکیل ہو (عالم گیری، ج ۱ ص ۲۹۹)۔

خاموشی ہر صورت میں اجازت نہیں ہے

عام طور پر کنواری لڑکیوں کی خاموشی یا ان کے رونے کو اجازت سمجھا جاتا ہے، ان کی خاموشی اور ان کا رونا یا خاموشی ولی کے لئے تو اجازت ہے[2] مگر وکیل کے لئے یہ اجازت نہیں، وکیل اگر عورت سے ایجاب وقبول کرا رہا ہے، تو یہ ایجاب وقبول اسی وقت صحیح ہوگا، جب عورت اپنی زبان سے صراحۃً

---

[1] شرح وقایہ، ج ۲ ص ۷۔

[2] حدیث میں ہے الایم احق بنفسها من ولیها والبکر تستاذن فی نفسها واذنها صماتها، اس حدیث میں اذنها صماتها کا یہی مفہوم ہے۔ یعنی اس سے بکر مراد ہے۔

گواہوں کے سامنے یہ کہے کہ میں نے اجازت دی، یا منظور ہے[1]

عام طور پر لوگ دو طرح نکاح کراتے ہیں یا تو ولی کسی ایک آدمی کو لڑکی کے پاس بھیج دیتے ہیں اور وہ جاکر کہتا ہے کہ میں بحیثیت وکیل تمہارا نکاح فلاں شخص سے اتنے مہر پر کرنا چاہتا ہوں، تم اجازت دیتی ہو یا اجازت دی؟ عورت خاموش رہتی ہے اور عورتیں زبردستی اس سے ہوں ہاں کرالیتی ہیں۔ اب وہ وکیل باہر آکر یا تو خود لڑکے سے یہ کہتا ہے کہ ان دو گواہوں کے سامنے مجھے فلاں نے وکیل بنایا ہے اور میں آپ کا نکاح پڑھاتا ہوں اور پھر پڑھا دیتا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے، اسے لڑکی سے صراحۃً اجازت لینی چاہئے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وکیل اپنی طرف سے کسی دوسرے کو ایجاب وقبول کرانے کی اجازت دیتا ہے تو اسے اس کا حق نہیں ہے، البتہ اگر دوسرے نے اس کی موجودگی میں کر دیا تو نکاح صحیح ہے۔ اور اگر خود وکیل وہاں موجود نہیں ہے تو نکاح صحیح نہیں ہوگا[2]

اجازت کا صحیح طریقہ

لڑکی اگر نابالغ ہے، تو پھر اس سے اجازت یعنی ایجاب کی ضرورت نہیں ہے، اس کے ولی کی اجازت کافی ہے۔ وہ چاہے خود پڑھائے یا کسی کو وکیل بنا دے دونوں صحیح ہیں۔ لیکن بالغ لڑکی سے اجازت یعنی ایجاب وقبول کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ یا تو وکیل کو وہ صراحۃً نکاح پڑھانے کی اجازت دے، یا پھر ولی اس سے اجازت لے کر خود نکاح پڑھاتے، یا وہ اجازت کے بعد کسی کو اپنا وکیل یا قاضی بنا دے، وکیل کی اجازت میں اس کی خاموشی یا اس کا رونا اجازت سمجھا جائے گا، اسی طرح اگر ولی نے کسی سے کہا کہ

---

[1] فاذا استأذن الولی فسکتت او ضحکت فهو اذن وان فعل هذا غیر الولی لم یکن رضا حتی تتکلم (ہدایہ، ج ۲ ص ۲۹۴)۔

[2] الوکیل بالتزوج لیس له ان یوکل غیره فان فعل فزوجه الثانی بحضرة الاول جاز (فتاوی رحیمیہ، ج ۵ ص ۲۵ بحوالہ فتاوی قاضی خاں)۔

میری طرف سے اجازت لے کر نکاح پڑھا دو اور وہ خود موجود بھی ہے تو اس صورت میں بھی اس کی خاموشی رضا سمجھی جائے گی، کیونکہ اس کا پوچھنا ولی کا پوچھنا سمجھا جائیگا (ہدایہ)

بیوہ یا مطلّقہ کا حکم اگر کسی عورت کی ایک شادی ہوچکی تھی اور وہ بیوہ ہوگئی یا وہ مطلّقہ ہے تو اس سے اجازت خواہ ولی لے یا وکیل لے، اس کی خاموشی رضا نہیں سمجھی جائے گی، اس کو زبان سے صراحۃً کہنا چاہیئے کہ میں نے اجازت دی یا مجھے منظور ہے [1]

لڑکے کا حکم لڑکا اگر بالغ ہے، تو اس کے خاموش رہنے سے نکاح نہیں ہوسکتا اس کو زبانی ایجاب یا قبول کرنا چاہیئے، نابالغ بچے کی طرف سے البتہ ولی ایجاب یا قبول کرسکتا ہے [2]

اوپر نکاح کے ارکان یعنی ایجاب و قبول کا بیان ہوا ہے، مگر ایجاب و قبول کے ساتھ نکاح کے کچھ اور شرائط بھی ہیں، اگر یہ شرائط نہ پائے جائیں گے تو نکاح صحیح نہ ہوگا جس طرح نماز میں ارکان و شرائط کی حیثیت ہے وہی حیثیت ان کی ہے، کچھ شرائط کا ذکر آچکا ہے، یہاں تمام شرائط کا یکجا ذکر کردیا جاتا ہے۔

(۱) نکاح کے وقت دو گواہ موجود ہوں (۲) ایجاب و قبول کرنے والے مرد اور عورت یا ان کے وکیل عاقل بالغ ہوں (۳) نکاح کو کسی خاص مدت کیلئے مخصوص نہ کیا جائے، جیسے متعہ میں ہوتا ہے (۴) عورت محرمات میں نہ ہو (۵) مہر کی ادائیگی کا اقرار کرنا (۶) نابالغ لڑکے یا لڑکی کے نکاح کے وقت ولی موجود ہو۔

نکاح کے گواہوں کے سلسلہ میں اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ان کا مسلمان ہونا شرط ہے، البتہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان کا ثقہ اور عادل ہونا ضروری نہیں ہے [3]

---

[1] ولو استاذن الثیب فلابد رضاھا وکذا اذا بلغھا الخبر (عالمگیری ج ۲ ص ۲۷۹)

[2] وخیار الغلام والثیب لا یبطل بلا رضا صریح او دلالۃ۔ (شرح وقایہ ج ۲ ص ۲۵)

[3] شرح وقایہ ج ۲ ص ۹، ہدایہ ج ۲ ص ۳۸۶۔

ولی کا بیان

ولی ہونے کا کچھ بیان حجر کے سلسلہ میں آئے گا، لیکن حجر میں صرف باپ دادا، یا باپ دادا کے وصی کو ولایت حاصل ہوتی ہے، مگر نکاح میں بہت سے لوگوں کو ولی ہونے کا حق حاصل ہے۔

ولی کی تعریف

وہ عاقل، بالغ شخص جس کی بات یا جس کا حکم دوسرے پر نافذ ہو جائے، وہ ولی ہے، خواہ دوسرا آدمی جس پر یہ حکم نافذ کیا جا رہا ہے وہ اس حکم کو پسند کرے یا نہ کرے (ردالمختار) کوئی نابالغ یا پاگل آدمی کسی کا ولی نہیں بن سکتا۔[1]

حق ولایت دو طرح کا ہوتا ہے، ایک صورت میں ولی کا حکم ماننا ضروری ہے، یعنی اگر اس کا حکم نہ مانا جائے جب بھی وہ نافذ ہو جائے گا، اس کو ولایتِ اجبار کہتے ہیں، اور بعض صورتوں میں ماننا بہتر ہوتا ہے، یعنی نہ مانے تو ولی کا حکم نافذ نہ ہوگا، اس کو ولایتِ مستحبّہ کہتے ہیں۔

بالغ لڑکے اور لڑکیوں پر ولی کو ولایتِ مستحبّہ حاصل ہے ولایتِ اجبار نہیں اور نابالغ لڑکے اور لڑکیوں پر ولایتِ اجبار حاصل ہے۔[2]

ولیوں کی ترتیب

لڑکے اور لڑکی کا ولی سب سے پہلا اس کا باپ ہے، اگر باپ نہ ہو تو دادا، اور دادا نہ ہو تو پردادا، اگر ان میں سے کوئی نہ ہو تو پھر سگا بھائی ولی ہے، اگر سگا بھائی نہ ہو تو پھر سوتیلا یعنی باپ شریک بھائی، اگر یہ نہ ہوں تو پھر بھتیجا، اگر بھتیجے نہ ہوں تو پھر بھتیجے کا لڑکا ولی ہوگا، ان سب کا بالغ ہونا ضروری ہے، اگر بھائی یا بھتیجے موجود نہ ہوں یا موجود ہوں مگر نابالغ ہوں تو پھر سگا چچا ولی ہوگا، اگر سگا چچا نہ ہو تو سوتیلا چچا یعنی باپ کا سوتیلا بھائی، اگر یہ نہ ہوں تو پھر سگے

---

[1] ویشترط فیہ ان یکون عاقلاً بالغًا (حاشیہ شرح وقایہ، ج ۲ ص ۲) ولا ولایۃ لعبد وصغیر ومجنون وکافر (کنز الدقائق ص ۱۱)۔

[2] ولا یجبر بالغۃ ولو بکرا وان ولایۃ الاجبار ثابتۃ علی الصغیرۃ (شرح وقایہ، ج ۲ ص ۲۱)۔

چچا کا لڑکا، پھر سوتیلے چچا کا لڑکا، اگر یہ سب نہ ہوں تو پھر اگر باپ یا دادا کا سگا، یا سوتیلا چچا ہے، تو وہ ولی ہوگا، اگر یہ نہ ہوں تو ان کے لڑکے یعنی باپ کے چچازاد بھائی یا چچازاد چچا ولی ہوں گے۔ اگر مذکورہ بالا لوگوں میں سے کوئی نہ ہو تو پھر ماں ولی ہوگی، ماں نہ ہو تو پھر نانی، پھر دادی، پھر نانا، پھر حقیقی بہن، پھر سوتیلی بہن یعنی باپ شریک بہن، پھر ماں شریک سوتیلے بھائی بہن یعنی جن کے باپ دو ہوں، ماں ایک ہو، پھر پھوپھی، پھر ماموں، پھر خالہ وغیرہ پھر پھوپھی زاد بھائی، ماموں زاد بھائی، پھر خالہ زاد بھائی وغیرہ[۱]

بالغ لڑکے اور لڑکیوں کے نکاح کا حکم

۱. بالغ لڑکے اور لڑکیوں کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ وہ جس معقول مسلمان لڑکی یا لڑکے سے چاہیں، نکاح کرلیں، ولی کی اجازت کی ان کو ضرورت نہیں ہے[۲]، خواہ ولی اس رشتے کو پسند کریں یا نہ کریں، بالغ لڑکے اور لڑکیوں پر ولیوں کو ولایت مستحبہ حاصل ہے، لیکن اگر انھوں نے ایسی بے میل شادی کرلی ہے جس کی وجہ سے ولی ناخوش ہو تو یہ نکاح صحیح نہ ہوگا[۳] بے میل یعنی غیر کفو میں شادی کی تفصیل آگے آتی ہے۔

---

[۱] بہشتی زیور، چوتھا حصہ ص۔ بحوالہ شرح وقایہ و عالمگیری وغیرہ۔

[۲] نفذ نکاح حرۃ مکلفۃ بلا ولی ولا تجبر بالغۃ بالنکاح ومن نکحت غیر کفوء فرق الولی۔

[۳] یہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے اسی کو تمام فقہاء احناف نے اختیار کیا ہے۔

دوسرے ائمہ کے یہاں بغیر ولی کی اجازت کے نکاح جائز نہیں ہے، انھوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے، لا نکاح الا بولی (ترمذی و ابوداؤد) دوسری حدیث ایما امرأۃ نکحت نفسها بغیر اذن ولیها فنکاحها باطل (ترمذی و ابوداؤد) اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں لا تنکح الایم حتی تستامر ولا تنکح البکر حتی تستاذن (بخاری و مسلم) مسلم کی ایک روایت ہے الایم احق بنفسها من ولیها، ان حدیثوں کے علاوہ قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے مثلاً لَا تَحِلُّ لَهُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ اس میں نکاح کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے، ولی کا

(بقیہ حاشیہ ص پر)

۲۔ اگر کسی بالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح ولی نے ان سے پوچھے بغیر کر دیا تو یہ نکاح ان کی مرضی پر موقوف رہے گا، اگر وہ اجازت دیں گے تو نکاح ہو جائے گا، اور اگر وہ اجازت نہ دیں گے اور ناخوشی کا اظہار کریں گے تو نکاح صحیح نہ ہوگا، کنواری لڑکی کا خاموش رہنا رضا اور اجازت سمجھا جائے گا، لیکن لڑکے اور بیوہ یا مطلقہ کا زبان سے اپنی خوشی و رضامندی یا ناخوشی کا اظہار کرنا ضروری ہے، اگر کنواری لڑکی یہ سن کر با آواز بلند رو پڑے تو عام طور پر فقہاء اسے ناخوشی پر محمول کرتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں ہے[1]

(بقیہ حاشیہ صـــ کا)
کوئی ذکر نہیں ہے۔ ——— اوپر جو حدیثیں نقل کی گئی ہیں، ان میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے، مگر تضاد نہیں ہے، بلکہ ان میں تطبیق ممکن ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ کہ جن حدیثوں میں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کو باطل قرار دیا گیا ہے وہ حدیثیں سند کے اعتبار سے اتنی قوی نہیں ہیں جتنی وہ حدیثیں ہیں، جس میں بالغہ کو بغیر ولی کی اجازت کے نکاح کی اجازت دی گئی ہے، دوسری بات یہ کہ ولی سے اجازت والی حدیث کو امام ابو حنیفہؒ نے صغیرہ اور کمزور دماغ یا لونڈی وغیرہ پر محمول کیا ہے اور دوسری احادیث کو بالغہ پر، اس لئے ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ اس طرح دونوں حدیثوں پر عمل ہو جاتا ہے،

کفوء اور غیر کفوء کے سلسلہ میں تفصیل آگے آ رہی ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک برادریوں کی تقسیم کو کفوء کا معیار بنانا صحیح نہیں ہے، بلکہ دین و تقویٰ کے لحاظ سے اس کی تقسیم کرنی چاہئے، جیسا کہ حضانت میں فاجرہ ماں کو بچّہ کی پرورش کا حق نہیں ہے۔

[1] ومعہ رای البکاء مع الصوت، رد للاستیذان۔

(شرح وقایہ، ج ۲ صـــ۲۲)

اس کے بارے میں مولانا عبد الحیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق عرف سے ہے، ہندوستان میں عام طور پر لڑکیاں تیز آواز سے روتی ہیں، مگر وہ گھر چھوڑنے کے غم میں روتی ہیں، نہ کہ ناراضگی سے، اس لئے اسے رَد نہیں سمجھا جائے گا، انھوں نے فتح القدیر سے نقل کیا ہے، والمعول اعتبار قرائن الاحوال فی البکاء والضحک (حاشیہ شرح وقایہ، ج ۲ صـــ۲۲)۔

۳۔ اگر ولی نے بالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح ان کی اجازت کے بغیر کر دیا پھر ولی نے خود یا ان کے بھیجے ہوئے کسی آدمی نے لڑکے یا لڑکی کو یہ خبر دی کہ تمہارا نکاح فلاں سے کر دیا گیا ہے تو اگر یہ لڑکی کنواری ہے تو اس کی خاموشی اجازت سمجھی جائے گی، لیکن اگر یہ لڑکا ہے، یا بیوہ یا مطلّقہ عورت ہے تو ان کا زبان سے اجازت دینا یا اپنی خوشی یا ناخوشی کا اظہار کرنا ضروری ہے[۱] لیکن اگر یہ خبر دینے والا خود ولی یا ولی کا بھیجا ہوا آدمی نہیں ہے، بلکہ ایک تیسرے آدمی نے یہ خبر دی ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ یہ خبر دینے والا ایک دیندار اور معتبر آدمی ہے، یا دو آدمی ہیں تو اس صورت میں کنواری لڑکی کی خاموشی اس کی رضامندی سمجھی جائے گی، دوسرے یہ کہ خبر دینے والا آدمی معتبر نہ ہو، تو پھر کنواری کے خاموش رہنے سے اس کی اجازت نہیں سمجھی جائے گی، بلکہ زبان سے اس کی مرضی معلوم کرنی ضروری ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ غیر معتبر آدمی کی بات کو ناقابلِ التفات سمجھ کر اس نے خاموشی اختیار کی ہو۔

لڑکے کی خاموشی کسی صورت میں رضا نہیں سمجھی جائے گی، بلکہ اس کو زبان سے اپنی رضامندی ظاہر کرنا ضروری ہے[۲]

جس صورت میں لڑکی کو زبان سے اجازت دینا ضروری ہے، اگر اس صورت میں لڑکی خاموش رہی اور اس کا شوہر اس کے پاس آیا اور اس نے مباشرت سے انکار نہیں کیا تو یہ بھی اس کی رضامندی سمجھی جائے گی[۳]

نابالغ لڑکے اور لڑکیوں کا حکم

نابالغ لڑکے اور لڑکیاں نکاح کے معاملے میں خود مختار نہیں ہیں، ان کے ولی ان کا نکاح جہاں چاہیں کر دیں، ان کو رد کرنے کا حق نہیں ہے، ولی کی اجازت کے بغیر نہ تو

---

[۱] زوجها الولی فبلغ الخبر فسکتت فهو اذن (کنز الدقائق صنا)، وان کان المخبر فضولیا شرط فیه العدالة (فتاوی ہندیہ، ج ۱ ص ۲۸۷)۔

[۲] وخیار الغلام والثیب لا یبطل بلا رضا صریح او دلالة (شرح وقایہ، ج ۲ ص ۲۵)۔

[۳] او دلالة کالقبلة واللمس (شامی، ج ۲ ص ۲۱۹)۔

ان کو یہ حق ہے کہ وہ جس سے چاہیں اور جہاں چاہیں نکاح کرلیں، اور نہ ولی کے علاوہ کسی دوسرے آدمی کو حق ہے کہ ان کا نکاح جس سے چاہے کردے، بلکہ ان کا نکاح یا تو ولی کرسکتا ہے، یا ولی سے اجازت لے کر وہ خود کرسکتے ہیں، اگر انھوں نے ولی سے اجازت لئے بغیر یا اس کی مرضی کے بغیر نکاح کرلیا تو یہ نکاح درست نہ ہوگا، اور ولی اس کو رد کرسکتا ہے، اگر وہ نہ مانیں تو ولی کو قانوناً حق ہے کہ ان کا نکاح عدالت سے فسخ کرادے[1]

بالغ ہونے کے بعد کا حکم

اگر کسی نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح باپ یا دادا نے کردیا ہے، تو اب بالغ ہونے کے بعد لڑکے یا لڑکی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس عقدِ نکاح کو توڑ دیں، ان کو باپ دادا کا کیا ہوا نکاح باقی رکھنا پڑے گا، چاہے باپ دادا نے میل میں نکاح کیا ہو یا بے میل نکاح کیا ہو، کم مہر پر نکاح کیا ہو، یا زیادہ مہر پر کیا ہو، ہر صورت میں نکاح ہو جائے گا، یعنی باپ دادا کو اپنے نابالغ لڑکے اور لڑکیوں پر ولایتِ اجبار حاصل ہے[2]۔ لیکن اگر باپ دادا کے علاوہ کسی دوسرے ولی نے ان کا نکاح کیا، تو پھر اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے میل میں کیا ہے، اور مہر بھی زیادہ یا بہت کم نہیں باندھا ہے، تو اس نکاح کا حکم ہے کہ بالغ ہونے کے بعد اگر لڑکے یا لڑکی یا دونوں کو رشتہ ناپسند ہے تو وہ مسلمان حاکم، اور جہاں مسلمان حاکم نہ ہوں تو کسی اسلامی جماعت یعنی کسی اسلامی پنچایت کے پاس درخواست دے کر اس کو فسخ کرا سکتے ہیں[3]، اس کے علاوہ دوسری کوئی صورت علیحدگی کی نہیں ہے۔ یعنی وہ خود علیحدہ نہیں ہوسکتے، دوسری صورت یہ ہے کہ باپ دادا کے علاوہ کسی ولی نے بے میل نکاح کردیا ہو یا مہر بہت زیادہ یا بہت کم رکھ دیا ہو تو اس

---

[1] للولی انکاح الصغیر والصغیرة ولو ثیبا (شرح وقایہ، ج ۲ ص ۲۳)

[2] وللولی انکاح الصغیر والصغیرة ولو ثیبا ان زوجها الاب او الجد۔
(شرح وقایہ، ج ۲ ص ۲۳)

[3] اسلامی جماعت کی تفصیل آگے آئے گی۔

صورت میں وہ نکاح ہوگا ہی نہیں۔ اس لئے دونوں اگر اس رشتے کو پسند کرتے ہیں، تو پھر سے دوبارہ نکاح کر لیں، ورنہ دونوں آزاد ہیں۔

جس صورت میں جوان ہونے کے بعد لڑکی کو اپنا نکاح فسخ کر دینے کا حق حاصل ہے۔ اس میں یہ بات بھی ضروری ہے کہ جوان ہونے کے بعد فوراً ہی وہ اپنی ناخوشی اور ناراضگی کا اظہار کر دیں، اگر انھوں نے اس میں تاخیر کی تو پھر ان کو فسخ کا حق باقی نہیں رہے گا۔[1]

ولایتِ اجبار کے شرائط

اوپر ذکر آچکا ہے کہ نابالغ لڑکے اور لڑکیوں پر باپ دادا کو ولایتِ اجبار حاصل ہے، یعنی اگر وہ غیر کفو میں یا بہت کم مہر پر بالکل بے جوڑ نکاح کر دیں تب بھی ان کا کیا ہوا نکاح لڑکے اور لڑکی بالغ ہونے کے بعد رد نہیں کر سکتے، یعنی وہ اس کے حکم کے ماننے پر مجبور ہیں لیکن ولایتِ اجبار کے لئے چند شرائط ہیں، اگر وہ نہ پائے جائیں گے، تو پھر بالغ ہونے کے بعد لڑکا یا لڑکی باپ دادا کے کئے ہوئے نکاح پر مجبور نہیں ہے۔

(۱) سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ شخص بے باک اور بے غیرت قسم کا نہ ہو کہ اس کو گناہ کرنے میں کوئی عار اور شرم نہ محسوس ہو، اگر ایسا شخص نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح بالکل بے جوڑ جگہ کر دے تو یہ نکاح صحیح نہیں سمجھا جائے گا۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ وہ لالچی قسم کا نہ ہو یعنی اس کے بارے میں اگر یہ بات معلوم ہو کہ وہ لالچی ہے یا یہ معلوم ہو جائے اس نے لالچ میں آکر غلط جگہ شادی کی ہے تو یہ نکاح بھی باطل ہے۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ وہ ہوش و حواس کی حالت میں اپنے نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح کرے، اب اگر نشے کی وجہ سے یا شدید مرض کی وجہ سے یا جنون کی وجہ سے اس کے ہوش و حواس ہی درست نہ ہوں تو یہ نکاح بھی باطل ہو گا یعنی یہ سمجھا جائے گا کہ نکاح ہوا ہی نہیں۔[2]

---

[1] ولا یمتد خیارھا الی آخر المجلس وان جہلت بالخیار (شرح وقایہ، ج ۲ ص ۲۴)۔

[2] واذا کان متھتکا لا ینعقد تزویجھا ایاھا (ردالمحتار، ج ۲ ص ۲۹۵)۔

ولایت اجبار کی وجہ

باپ دادا چونکہ اپنے لڑکے اور لڑکی کے بدخواہ نہیں ہوسکتے اس لئے ان کو ان کے بارے میں اتنا وسیع اختیار دیدیا گیا ہے، لیکن جو آدمی گناہ میں جری ہو جاتا ہے، یا اس کو لالچ گھیر لیتی ہے، یا اس کے ہوش وحواس درست نہیں رہتے تو اس کے قول وعمل کا کوئی اعتبار نہیں ہے، وہ جب اپنا ہی خیر خواہ نہیں ہے تو اپنے لڑکوں کا خیر خواہ کب ہو سکتا ہے، اسی بنا پر باپ دادا کی ولایت اجبار کے سلسلے میں فقہاء نے مذکورہ بالا تین شرطیں لگادی ہیں، اگر ان میں سے کوئی بات پائی جائے گی تو باپ یا دادا کی ولایتِ اجبار ختم ہو جائے گی اور ان کا کیا ہوا کام یا فیصلہ باطل سمجھا جائے گا۔

قریبی ولی کی موجودگی میں دوسرے ولی کے نکاح کرانے کا حکم

ولی قریب کی موجودگی میں کوئی دوسرا دور کا ولی نکاح کر دے تو یہ نکاح قریبی اور اصل ولی کی رضامندی اور اجازت پر موقوف رہے گا، مثلاً کسی لڑکے یا لڑکی کا باپ موجود تھا اور اس کی ماں نے اس کے پوچھے بغیر اپنی مرضی سے نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح کر دیا، یا بھائی موجود تھا اور چچا یا بہن نے نکاح کر دیا تو یہ نکاح اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب اصل ولی یعنی باپ یا بھائی اجازت دے دیں، اگر وہ اجازت نہ دیں تو نکاح فاسد سمجھا جائے گا۔

قریبی ولی کی غیر موجودگی میں دوسرے ولی کب نکاح کرسکتے ہیں

قریبی ولی زندہ ہے، مگر وہ بر وقت موجود نہیں ہے، اور نابالغ لڑکے یا لڑکی کا کوئی مناسب رشتہ لگ گیا ہے، اب اگر اس سے رائے لی جاتی ہے تو اس وقت تک اس رشتے کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں دوسرا قریبی ولی بھی نکاح کر سکتا ہے، مثلاً باپ زندہ ہے، مگر کسی دوسرے ملک میں ہے، یا اس کا کوئی پتہ نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اس کے بعد جو ولی ہو وہ نکاح کر سکتا ہے، لیکن اگر وہ کہیں قریب ہی ہو اور آسانی سے رائے

لی جا سکتی ہو تو پھر کسی دوسرے کا نکاح کرنا اس کی مرضی اور اجازت پر موقوف رہے گا۔[1]

ولی کے بلا وجہ انکار کا حکم

نابالغ لڑکی یا لڑکے کا مناسب رشتہ لگ گیا ہے، لیکن ولی اقرب بلا وجہ یا کسی اپنی ذاتی رنجش کی وجہ سے اجازت نہیں دیتا ہے، تو اس صورت میں اس کے بعد کے ولی قریب اس کا نکاح کر سکتے ہیں۔ (درمختار)

۱۔ اگر کوئی ولی قریب پاگل ہو جائے، یا نابالغ ہو تو پھر ولی بعید کو نکاح کرنا چاہیئے، مثلاً بھائی ہے، مگر نابالغ ہے یا باپ ہے مگر پاگل ہے، تو پھر اس کے بعد جو ولی ہوں گے، وہ نکاح کر سکتے ہیں۔

۲۔ اگر دو برابر کے ولی ہیں، مثلاً دو سگے بھائی ہیں، اور دونوں اپنی نابالغ بہن کا نکاح الگ الگ جگہ کرنا چاہتے ہیں، تو جو پہلے نکاح کر دے گا، اس کا نکاح صحیح ہو جائے گا اور اگر دونوں ایک ہی جگہ کرنا چاہتے ہیں تو دونوں کو ایک دوسرے سے مشورہ کر کے نکاح کرنا چاہیئے، اگر مشورے کئے بغیر کسی نے کر دیا تو دوسرے کی اجازت پر نکاح موقوف رہے گا، اگر دونوں دو الگ جگہ کرنا چاہتے ہیں، اور ایک ہی وقت میں دونوں نے اس کا نکاح دو الگ جگہ کر دیا تو دونوں نکاح باطل سمجھے جائیں گے (درمختار مع حاشیہ طحطاوی)

تحریری نکاح

جس طرح زبانی نکاح صحیح ہے، اسی طرح خط یا تحریر کے ذریعہ بھی نکاح درست ہے، لیکن تحریر ایک طرف اور دوسری طرف سے گواہوں کے سامنے اقرار ضروری ہے، مثلاً احمد شاہدہ کو لکھے یا شاہدہ احمد کو لکھے کہ میں اتنے مہر پر تم سے نکاح کرنا چاہتی ہوں، اب یہ تحریر احمد یا شاہدہ دو گواہوں کو بلا کر انھیں سنا دے اور زبان سے کہے کہ میں قبول کرتی ہوں یا قبول کرتا ہوں تو نکاح ہو جائے گا، اگر دونوں طرف سے تحریر ہو تو نکاح نہیں ہوگا۔[2]

---

[1] وللولی الابعد التزویج بغیبة الاقرب (ای مسافة القصر) درمختار، ج ۲ ص ۳۰۲۔

[2] اذ الکتابة من الطرفین بلا قول لا تکتفی وینعقد النکاح بالخطاب وصورته ان یکتب الیها یخطبها فاذا بلغها الکتاب احضرت الشهود وقرأت علیهم وقالت زوجت نفسی (رد المحتار ۲ ص ۳۶۵)

کفاءت کا بیان

میاں بیوی کے تعلقات کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار اور استوار بنانے اور ان میں زیادہ سے زیادہ محبت و مودت پیدا کرنے کے لئے شریعت نے نکاح میں دوسری قیود کے ساتھ یہ قید بھی لگادی ہے کہ رشتہ قائم کرنے میں دینی، معاشی اور معاشرتی مناسبت کا بھی لحاظ کیا جائے، ورنہ اس رشتہ میں استواری اور خوشگواری پیدا ہونا مشکل ہے، اور جب یہ بات نہ پیدا ہوگی تو پھر نکاح کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اسی مناسبت اور برابری کو اسلامی شریعت میں کفاءت کہتے ہیں، کفاءت کے لفظی معنی برابری کے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کفاءت کا لحاظ فرمایا ہے اور اس کا حکم بھی دیا ہے، حدیث میں ہے کہ "تخیروا لنطفکم وانکحوا الاکفاء" (ابن ماجہ) "اپنے نطفہ کے لئے اچھے رشتہ کا انتخاب کرو اور اپنے برابری والوں میں نکاح کرو"۔ اپنے برابر کی تفصیل بھی آپ نے فرمائی ہے، آپ نے فرمایا کہ اذا اتاکم من ترضون دینہ وخلقہ فزوجوہ الا تفعلوا تکن فی الارض فتنۃ وفساد عریض (ابن ماجہ وترمذی) جب کوئی ایسا رشتہ آجائے جس کے دین و اخلاق سے تم مطمئن ہو تو اس سے نکاح کرلو، ورنہ بڑا فتنہ پیدا ہوگا۔

کفاءت کن کن چیزوں میں ہونی چاہیئے

ائمہ اربعہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو کفاءت میں چھ چیزوں کا لحاظ کرتے ہیں، یعنی اسلام[1]، دیانت[2] و تقویٰ، نسب[3]، مال[4] اور پیشہ[5] اور حریت[6]۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ چار چیزوں میں برابری کا لحاظ کرتے ہیں، دیانت و مال کو اس میں شامل نہیں کرتے، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ پانچ چیزوں کو کفاءت میں داخل کرتے ہیں اور دیانت ہی میں اسلام کو بھی شامل سمجھتے ہیں، مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام اور دیانت کو الگ الگ شمار کیا ہے، اس لئے ان کے یہاں چھ شرطیں ہوگئیں، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے صرف دو چیزوں میں برابری کو ضروری قرار دیا ہے، بقیہ اور چیزوں کے بارے میں برابری ہو یا نہ ہو، دین و دیانت یعنی وہ عقیدۃً بھی مسلمان ہو اور اس میں صلاح ہو یعنی وہ بد اخلاق اور بدکردار

نہ ہو، دوسرے وہ ان عیوب اور امراض سے پاک ہو جن کی بنا پر عورت کو فسخ نکاح کا حق ملتا ہے، مثلاً جذام اور جنون وغیرہ[1] بعض تمدنی اور معاشرتی مصالح کے پیش نظر ائمہ ثلثہ نے دین و اخلاق کے ساتھ دوسری چیزوں میں بھی برابری کا لحاظ کیا ہے[2]، اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بعض اور چیزوں کا جیسا کہ ذکر آئے گا، مثلاً مال اور صحت وغیرہ کا لحاظ کیا ہے، لیکن ان کی رائے میں ایک مسلمان کے لئے اصل چیز دین و تقویٰ ہے اسی سے حقیقی برابری بھی پیدا ہوتی ہے اور اسی سے مناسبت بھی۔ اس لئے ان کے بعد اب دوسری کسی چیز کا لحاظ کرنا ضروری نہیں ہے۔ جہاں تک ائمہ ثلثہ کی رائے کا تعلق ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے اسلام سے ذہنی اور عملی لگاؤ کے مقابلے میں دوسری چیزوں کو زیادہ اہمیت دی ہے، بلکہ انھوں نے دین کے ساتھ بعض دوسری چیزوں کا لحاظ اس لئے کیا ہے کہ تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کا بالکل خیال نہ کیا جائے تو میاں بیوی میں مودت و رحمت کی روح پیدا نہیں ہوگی، ایسا نہیں ہے کہ ائمہ ثلثہ ایک ممتاز صدیقی خاندان کے فاسق و فاجر لڑکے کو دوسرے کسی غیر ممتاز صدیقی یا فاروقی خاندان کے نیک و دین دار لڑکے پر ترجیح دیتے ہوں، بلکہ ان کے نزدیک ایک خاندان میں بھی اسی لڑکے کو ترجیح دی جائے گی، جو دیندار ہو، اور جس کا اخلاق و کردار اچھا ہو۔ کفاءت میں ائمہ ثلثہ نے جن چیزوں کا لحاظ کیا ہے، ہم ان میں سے ہر ایک کی تشریح کرنے کے بعد پھر امام مالکؒ کی رائے اور ان کے دلائل کو تفصیل سے بیان کریں گے۔

۱۔ اسلام یعنی عورت و مرد کے رشتۂ نکاح میں سب سے پہلی جو چیز دیکھی جائیگی وہ یہ ہے کہ دونوں عقیدے کے لحاظ سے مسلمان ہیں یا نہیں، اگر رشتۂ اسلام ان دونوں میں نہیں ہے تو پھر رشتۂ نکاح قائم نہیں ہو سکتا، ایک شخص جو قدیم کافر یا

---

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۴ ص ۵۶ تا ص ۶۱۔

[2] ایضاً۔ ص ۵۹۔ بدایۃ المجتہد ج ۲۔

مشرک ہے، یا مسلمان کے گھر میں پیدا ہوتے ہوئے اس نے اسلامی عقیدہ کا انکار کر دیا ہے، رشتۂ نکاح کے معاملے میں دونوں برابر ہیں، ان سے یہی نہیں کہ رشتۂ نکاح قائم نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ نکاح کے سلسلے میں وکیل اور گواہ بھی نہیں بن سکتے، جن ائمہ نے لفظ اسلام کے بجائے دیانت کا لفظ استعمال کیا ہے، اس سے ان کی مراد دین واخلاق دونوں ہے۔

۲۔ دیانت وتقویٰ میں برابری کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی صرف عقیدے کے اعتبار سے تو مسلمان ہے مگر اس کا عمل اس کے عقیدہ وفکر کے مخالف ہے، تو وہ لڑکی یا لڑکا، اس لڑکی یا لڑکے کے برابر نہیں ہو سکتے، جس کا عقیدہ بھی درست ہو اور عمل بھی، جو ذہنی اعتبار سے بھی مسلمان ہو، اور عملی اعتبار سے بھی۔ چنانچہ صاحب ھدایہ لکھتے ہیں کہ:۔

لانہ من اعلی المفاخر والمرأۃ تعیر بفسق الزوج فوق ما تعیر بضعۃ نسبہ۔ (ج ۲، ص ۳۰۱)	کیوں کہ امانت وتقویٰ سب سے زیادہ عزت وفخر کی چیز ہے اور عورت کے لئے شوہر کے کم نسب ہونے میں اتنے عار اور شرم کی بات نہیں ہے جتنی کہ اس کے فاسق یعنی بدکار وبے عمل ہونے میں۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، ”اگر کوئی شخص نکاح کا پیغام دیتے ہوئے سب سے پہلے عورت کے حسن کے بارے میں سوال کرے اگر اس لحاظ سے اس کی تعریف کی گئی تو اس نے پھر دینداری کے بارے میں سوال کیا، اگر اس کی دینداری کی تعریف کی گئی تو اس نے شادی کی ورنہ رد کر دیا تو یہ رد کرنا دنیا کی خاطر ہوا (منتہی الارادات، ج ۳، ص ۳)۔

مقصد یہ ہے کہ اس نے دین کے بجائے پہلے حسن وخوبصورتی کے بارے میں سوال کیا، پھر دین کے بارے میں پوچھا تو گویا اس نے معیار دین کے بجائے حسن کو قرار دیا، اس لئے عام طور پر فقہاء کفاءت کے سلسلے میں جب دین یا دیانت کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے عملی زندگی میں صلاح وتقویٰ مراد ہوتا ہے، ورنہ دین اسلام تو نکاح کے

لئے شرط ہے، اس کے بغیر تو نکاح ہو ہی نہیں سکتا، ولی کو اعتراض بھی اس کے فاسق و فاجر ہونے کی بنا پر ہو سکتا ہے، اور کلام اسی پہلو سے ہے۔" انما الکلام فی حق اعتراض الأولیاء بعد انعقاد العقد وذالک لا یکون الا فی الدین بمعنی الدیانۃ۔"

(حاشیہ ہدایہ، ج ۲ ص ۳)

غور کیجئے کہ وہ فقہاء جنھوں نے رشتۂ نکاح میں نسب کا لحاظ کیا ہے، انھوں نے بھی اسلام پر عقیدے کے ساتھ اس کے مطابق عمل کو کتنا ضروری قرار دیا ہے، مگر ہندوستانی مسلمانوں میں نسب ہی کی اہمیت باقی رہ گئی ہے اور دین و تقویٰ ان کے نزدیک کوئی قابل لحاظ چیز رہ ہی نہیں گئی ہے۔

۳۔ مال۔ کفو کے سلسلے میں مال کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، یعنی اگر لڑکی کسی مال دار گھر کی ہو تو حتی الامکان اس کا رشتہ کسی مفلس قلاش بے صلاحیت کے ساتھ نہ کرنا چاہیے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک کسی لکھ پتی کا لڑکا نہ ملے اپنی لڑکی اس کو نہ دے، بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے:۔

وَهُوَ اَنْ يَّكُوْنَ مَالِكًا لِّلْمَهْرِ وَالنَّفَقَةِ۔

(ہدایہ، ج ۲ ص ۳)

وہ لڑکا مہر ادا کرنے اور اس کا خرچ چلانے کی قدرت رکھتا ہو تو وہ مالدار لڑکی کا کفو ہو سکتا ہے۔

مالکی فقیہ ابن جزی کہتے ہیں:۔

وَبِالْمَالِ الَّذِیْ یَقْدِرُ بِهٖ وَلَا یُشْتَرَطُ الیسار۔

اتنا مال ہے جس پر وہ قادر ہو خوشحالی مراد نہیں ہے۔

یعنی اگر نکاح کے وقت مہر کی ادائیگی کی صلاحیت اور ایک مہینے تک کا خرچہ اس کے پاس موجود ہے، تو بعض علماء نے ایسے شخص کو مال دار سے مال دار لڑکی کا کفو قرار دیا ہے، اور اگر اس وقت اس کے پاس کچھ نہ ہو، مگر بظاہر اس میں یہ صلاحیت موجود ہے، تو وہ بھی مالدار لڑکی کا ہم کفو ہو سکتا ہے، فتح القدیر میں ہے

اَلصَّحِیْحُ اَنَّهٗ اِذَا کَانَ قَادِرًا

صحیح یہ ہے کہ جب وہ کما کر بیوی کو

عَلَی النَّفَقَةِ عَلٰی طَرِیْقِ الْکَسْبِ۔ (حاشیہ ہدایہ ج ۲ ص ۳۰۱)	کھلانے، پہنانے پر قادر ہو تو وہ اس کا کفو ہے۔

یعنی وہ غریب ہے، مگر پڑھا لکھا ہے، یا زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے، مگر محنت مزدوری کر کے کھا کما سکتا ہے، تو وہ مالدار لڑکی کا کفو ہو سکتا ہے [۱]

۴۔ ایک پیشے کے لوگوں کا عموماً رہن سہن اور طرز معاشرت ایک طرح کا ہوتا ہے، اس لئے اپنے پیشے والے کے یہاں شادی کرنے میں ان کو سہولت ہوتی ہے، اور میاں بیوی میں اس کی وجہ سے مناسبت بھی رہتی ہے، اور بسا اوقات ہم پیشہ ہونیکی وجہ سے معاشی اعتبار سے بھی دونوں کو سہولت ہوتی ہے۔ اس لئے ائمہؒ نے رشتۂ نکاح میں اس کا اعتبار و لحاظ کرنے کی بھی اجازت دی ہے، مگر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ کسی پیشے کے ساتھ ذلّت اور کسی پیشے کے ساتھ عزّت چمٹی ہوئی ہے کہ جہاں کسی نے دو ایک پشت کوئی خاص پیشہ اختیار کیا بس وہ ذلیل ہو گیا۔ اب وہ چاہے

---

[۱] اس سلسلہ میں امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ فقر و غنا کو کفاءت میں دخیل سمجھتے ہیں، مگر امام ابو یوسف فرماتے ہیں:۔

لا یعتبر لأنہ لا ثبات لہ اذ المال غادٍ و رائح۔ (ہدایہ، ج ۲ ص ۳۰۱)	مال کوئی قابل اعتبار چیز نہیں ہے اسلئے کہ وہ آنی جانی چیز ہے۔

امام ابو یوسف کی اس رائے کے بارے میں صاحب وقایہ اور صاحب شرح وقایہ لکھتے ہیں:۔

والقادر علیھا کفوٌ لذات اموال عظیمۃ ھو الصحیح لأن المال غادٍ و رائح فلا یعتبر بعد مہ۔ (ج ۲ ص ۲۹)	مہر و نفقہ پر جو قادر ہو وہ بہت زیادہ مالدار کا کفو ہو سکتا ہے، یہی صحیح مسلک ہے اس لئے کہ مال آنے جانے والی چیز ہے تو اس کا نہ ہونا کوئی قابل اعتبار چیز نہیں ہے

امام ابو حنیفہ اور امام محمدؒ نفقہ اور مہر دونوں پر قدرت ضروری سمجھتے ہیں اور امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ اگر اس کے اندر نان نفقہ چلانے کی قدرت ہے تو وہ مالدار لڑکی کا کفو ہو سکتا ہے، قدرت کی تشریح اوپر آ چکی ہے۔

کتنی ہی خوبیوں کا مالک کیوں نہ ہو جائے، پیشے کی ذلت اس کے ساتھ لگی رہے گی، چنانچہ امام صاحبؒ سے جو روایت زیادہ صحیح طریقے سے مروی ہے، وہ یہی ہے کہ یہ کوئی قابلِ اعتبار چیز نہیں ہے، کیوں کہ :-

اِنَّ الْحِرْفَۃَ لَیْسَ بِلَازِمَۃٍ وَ یُمْکِنُ التَّحَوُّلُ مِنَ الْخَسِّۃِ اِلَی النَّفِیْسَۃِ[۱] (ہدایہ ج ۲ ص ۳۰۱)	پیشہ کسی کے ساتھ ہمیشہ چمٹا نہیں رہتا، بلکہ ایک آدمی معمولی پیشہ چھوڑ کر دوسرا کوئی اچھا کام کر سکتا ہے۔

۵۔ نسب کے شرف اور اس کی فضیلت کا اعتبار شریعت میں ضرور کیا گیا، یعنی اگر کوئی سید یا صدیقی یا فاروقی خاندان اور برادری کا ہے، اور وہ اسی میں نکاح کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ شرف اور فضیلت دائمی نہیں، بلکہ اضافی ہے، یعنی یہ سمجھ لینا کہ اس خاص برادری کے اندر جو پیدا ہو گیا وہ ہمیشہ ذلیل رہے گا، اور ایک دوسرے خاندان کے اندر جو پیدا ہو گیا وہ ہمیشہ اور ہر حال میں معزّز ہی رہے گا، صحیح نہیں ہے، کیونکہ شرعی نقطۂ نظر سے نسب کا یہ شرف اسی وقت تک باقی رہتا ہے، جب تک اس میں شرف و فضیلت کے اوصاف باقی رہیں، عام طور پر ہندوستان و پاکستان میں برادریوں اور خاندانوں کی، پیشے اور معاشرت کے اختلاف کی وجہ سے جو مستقل تقسیمیں ہو گئیں ہیں۔ مثلاً کوئی سیّد ہے، کوئی شیخ ہے، کوئی مغل ہے کوئی پٹھان ہے، کوئی انصاری ہے، کوئی سبزی فروش اور کوئی درزی ہے اور اس تقسیم کو ایک ایسی مستقل چیز سمجھ لیا گیا ہے کہ خواہ دوسری برادری اور خاندان کا کوئی کتنا ہی پڑھا لکھا اور صالح لڑکا ہو، اس کا نکاح دوسری برادری کی لڑکی سے کرنا ننگ و عار سمجھا جاتا ہے، یہ اسلام کی روح کے بالکل منافی ہے اور جن فقہاء نے اس کا اعتبار کیا ہے انھوں نے بھی اس کو کوئی دائمی چیز نہیں سمجھا ہے، چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار میں مذکور ہے کہ اگر چمڑا پکانے والا اپنا پیشہ چھوڑ کر تجارت کرنے لگے تو اگر

---

[۱] امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔

وہ خصوصیات جن کی بنا پر اس کی حیثیت کو کم تر سمجھا جاتا ہے، اس میں باقی نہ رہیں تو پھر وہ کسی بھی تاجر کا کفو ہو سکتا ہے، (ج ۲، صفحہ ۴۹۸) اس سے معلوم ہوا کہ کسی پیشے کی وجہ سے نسب میں ذلت نہیں پیدا ہوتی، بلکہ ان خصوصیات کی وجہ سے ذلت پیدا ہوتی ہے، جو اس پیشے کے ساتھ مخصوص ہو گئی ہیں، مثلاً رہن سہن، بات چیت علم فضل وغیرہ، لیکن اگر کوئی اس پیشے کو ان خصوصیات سے پاک کر دے تو پھر وہ اس کا مصداق قرار نہیں دیا جائے گا، چنانچہ اگر نسب کے اعتبار سے ایک شخص صدیقی ہو مگر جاہل ہو، اور دوسرا پٹھان، درزی یا کوئی اور برادری کا ہو مگر صاحب علم وفضل ہو تو وہ کفو کے اعتبار سے اس صدیقی سے بھی بڑھا ہوا سمجھا جائے گا، صاحب ردّ المختار اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

كَانَ شَرَفُ الْعِلْمِ اَقْوٰى مِنْ شَرَفِ النَّسَبِ بِدَلَالَةِ الْاٰيَة هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (ج ۲ صفحہ ۴۹۸)	علم کا شرف، نسب کے شرف سے زیادہ قوی ہے کیونکہ اس آیت قرآنی سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اہل علم ہیں کیا وہ غیر اہل علم کے برابر ہو سکتے ہیں۔

صاحبِ ردالمختار ان لوگوں کا جنھوں نے فقہ حنفی کی ظاہری روایت کے خلاف علم ودین کے مقابلے میں نسب کو ترجیح دی ہے، جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وَكَيْفَ يَصِحُّ لِاَحَدٍ اَنْ يَّقُوْلَ اَنَّ مِثْلَ اَبِىْ حَنِيْفَة وَالْحَسَنِ الْبَصْرِىِّ وَغَيْرِهِمَا مِمَّنْ لَيْسَ بِعَرَبِىٍّ اِنَّهٗ لَا يَكُوْنُ كُفُوًا لِبِنْتِ قُرَشِىٍّ جَاهِلٍ اَوْ لِبِنْتِ عَرَبِىٍّ بَوَّالٍ عَلٰى عَقِبَيْهِ۔ (ج ۲ صفحہ ۴۹۹)	کیا یہ کہنا کسی طرح بھی صحیح ہو سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور حسن بصریؒ جو عربی النسل نہیں ہیں، وہ کسی جاہل قریشی کی لڑکی کے کفو نہیں ہو سکتے، یا اس غیر مہذب عربی کے کفو نہیں ہو سکتے، جس کو پیشاب کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔

پھر لکھا ہے کہ اسی رائے کو ابن ہمام صاحب فتح القدیر وصاحب النہر وغیرہ نے بھی اختیار کیا ہے، اور پسند کیا ہے۔

ان تصریحات سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جن فقہاء نے نسب، مال اور پیشے کا اعتبار کیا ہے، ان کے نزدیک بھی ان کی حیثیت مستقل نہیں بلکہ اضافی ہے، ہندوستان اور پاکستان وغیرہ میں کام اور پیشہ کی وجہ سے برادریوں اور خاندانوں کی جو مستقل طور پر تقسیم ہو گئی ہے، اور یہ تقسیم مستقل اور دائمی طور پر عزّت اور شرف کا سبب بن گئی ہے وہ اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے، اور اس میں آہستہ آہستہ تبدیلی کی ضرورت ہے، مگر یہ تبدیلی بتدریج ہونی چاہیئے، خاص طور پر دین کے ساتھ مزاج اور طرزِ معاشرت وغیرہ کو یک بیک نظر انداز کر دینے میں دوسرے مفاسد پیدا ہونے کا خطرہ ہے اور اس سے اچھے اور پاکیزہ خاندان کی بنیاد پڑنے کے بجائے اس میں کمزوری آنے کا خطرہ ہے، اس لئے اس تقسیم کو ختم تو ہونا چاہیئے، مگر آہستہ آہستہ۔ بعض بزرگوں نے کفو کے بارے میں جو برادریوں کا لحاظ کیا ہے تو ان کے پیش نظر پیشہ اور معاشرت کی مناسبت رہی ہے اس سے کسی کی توہین مقصود نہیں ہے۔

امام مالکؒ کا نقطۂ نظر

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسلام میں اگر کسی انسان کو شرف و عزّت کا مستحق قرار دیا گیا ہے، تو وہ دین و تقویٰ کے لحاظ سے، محض نسب، مال یا پیشے کی وجہ سے کسی کو صاحبِ عزّت و شرف قرار نہیں دیا گیا ہے[1] قرآن پاک میں ہے:۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (حجرات)	اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تم کو مختلف قوموں اور خاندانوں میں بانٹ دیا تاکہ امتیاز کی وجہ سے ایک دوسرے کو پہچان سکو، اللہ کے یہاں تم میں سے وہی زیادہ معزز و مکرم ہے، جو زیادہ متقی و پرہیز گار ہے۔

---

[1] مزید تفصیل کے لئے بدایۃ المجتہد ج ۲ کتاب النکاح، المغنی اور القوانین الفقہیہ لابن جزی ص ۰۰ دیکھنا چاہیئے راقم نے "مسئلہ کفاءت" والے پمفلٹ میں فقہائے مالکیہ کی عبارتیں نقل کر دی ہیں۔

یعنی جغرافیائی تقسیم کی وجہ سے یا اختلافِ زبان کی وجہ سے، یا تمدن کی ایک بنیادی ضرورت یعنی تقسیم عمل کی وجہ سے جو لوگ مختلف گروہوں اور قبیلوں میں بٹ گئے ہیں، وہ تقسیم محض ایک تعارف کے لئے ہے تاکہ ایک دوسرے کو پہچانا اور اس کی خصوصیات کو معلوم کیا جا سکے۔ اس تعارف ہی کی وجہ سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کون کس کام اور صلاحیت کا مالک ہے اور کون قریب ہے اور کون بعید ہے۔ اور اسی علم کی بنا پر فرائض اور حقوق کی ادائیگی کی ذمے داری ڈالی گئی ہے، ورنہ یہ تقسیم کسی شرف و عزت کا ذریعہ نہیں ہے، نہ مغربی کو مغربی ہونے کی وجہ سے شرف و فوقیت ہے، نہ عربی کو عربی ہونے کی وجہ سے مستقلاً عجمی پر فوقیت حاصل ہے، نہ ایشیائی کو یورپین پر، نہ یورپین کو افریقی پر، نہ گورے کو کالے پر المومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعضٍ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کی قریبی ہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی ہے:۔

اَلنَّاسُ سَوَاسِیَۃٌ کَاَسْنَانِ الْمُشْطِ۔ لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَ اِنَّمَا الْفَضْلُ بِالتَّقْوٰی۔	تمام لوگ انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں، جس طرح کنگھی کے دندانے برابر ہوتے ہیں، کسی عربی کو عربی ہونیکی حیثیت سے کسی عجمی پر فوقیت نہیں ہے، شرف و فضیلت صرف تقویٰ کی وجہ سے ہے۔
(الادب المفرد مشکوٰۃ)	

یہی بات آپ نے اور زیادہ واضح الفاظ میں اپنے آخری حج یعنی حجۃ الوداع کے موقع پر لاکھوں عربیوں اور عجمیوں کے مجمع میں فرمائی تھی:۔

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا اَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ لَا اَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی اَلنَّاسُ مِنْ آدَمَ	اے لوگو! خبردار تمہارا رب ایک ہے اور تم سب کے باپ بھی ایک ہیں، یاد رکھنا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت حاصل ہے اور نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر مگر تقویٰ کی وجہ سے، تمام

وَ آدَمُ مِنْ تُرَاب۔ (ابوداؤد باب الانساب)	انسان آدم کی اولاد ہیں، اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔

یہ تقریر فرما کر آپؐ نے صحابہؓ سے پوچھا اَلَا بَلَّغْتُ کیا میں نے خدا کا پیغام تم تک پہونچا دیا؟ صحابہؓ کے مجمع نے جواب دیا کہ ہاں آپ نے پیغام الٰہی ہم تک پہونچا دیا، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا، جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ باتیں ان لوگوں تک پہونچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں، غور کیجئے کہ آپ نے کتنی اہمیت کے ساتھ یہ بات فرمائی تھی۔

• آپ نے ایک بار فرمایا کہ :۔

اِنَّ آلَ بَنِیْ فُلَانٍ لَیْسُوْا لِیْ اَوْلِیَائِیْ۔ اِنَّ اَوْلِیَائِیَ الْمُتَّقُوْنَ حَیْثُ کَانُوْا وَاَیْنَ کَانُوْا[1]	فلاں قبیلہ و خاندان کے لوگ میرے محبوب اور دوست نہیں ہیں، میرے دوست اور محبوب پرہیزگار لوگ ہیں۔ چاہے وہ جیسے بھی ہوں اور جہاں کہیں بھی بستے ہوں۔

ایک بار آپؐ نے اپنے آبا و اجداد پر فخر پر اپنی ناگواری کا اظہار فرمایا اور آخر میں فرمایا :۔

ان اللہ قد اذھب عنکم عُبّیۃ الجاھلیۃ وفخرھا بالآباء انّما ھو مومن تقی او فاجر شقی الناس کلھم بنو آدم وآدم من تراب۔ (ابوداؤد و ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ ۲ ص۴۱۸)	اللہ تعالیٰ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت کو اور آبا و اجداد پر فخر کو ختم کر دیا ہے، سارے انسان حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ اور حضرت آدم مٹی سے بنائے گئے۔

ایک بار آپؐ نے فرمایا :۔

انسابکم ھذہ لیست بمسبۃ علیٰ احد کلکم بنو آدم طف	تمہارے انساب کسی کے لئے مذمّت کا سبب نہیں ہیں۔ تم میں سے ہر آدمی آدم

---

[1] مشکوٰۃ ص۴۱۹، باب البر والصلہ، آخری دو جملے بخاری و مسلم میں نہیں ہیں۔

الصاع بالصاع لم تملئوہ لیس لاحد فضل الا بدین وتقویٰ۔

(مشکوٰۃ ص۴۱۸، بیہقی)

کی اولاد ہے جن میں کچھ نہ کچھ کمی بیشی ہوتی ہے، جس طرح ایک پیمانہ سے دوسرا پیمانہ بھرا جاتا ہے، تو کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ فضیلت کا معیار صرف دین وتقویٰ ہے۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالۂ عقد میں کئی غیر قریشی بلکہ عجمی خواتین تھیں، حضرت زینب کی شادی حضرت زیدؓ سے کی، اور ان کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کی شادی فاطمہ بنت قیسؓ سے کی، حالانکہ یہ دونوں خاتون قریشی اور یہ دونوں بزرگ غلام یا غیر قریشی تھے۔

ابو ہند صحابی فصد کھولنے کا پیشہ کرتے تھے، یعنی حجام تھے، مگر آپؐ نے بنو بیاضہ سے کہا کہ ان کی شادی اپنی لڑکی سے کر دو، اسی طرح حضرت بلالؓ حبشی کی شادی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، جو ممتاز قریشی خاندان کے فرد تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز دین وتقویٰ ہے، اگر دین وتقویٰ کے ساتھ حسب نسب، حسن وجمال، مال ودولت بھی جمع ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر دین وتقویٰ کے مقابلے میں دوسری چیزوں کو ترجیح نہیں دی جا سکتی، یعنی اگر ایک طرف ایک غریب نادار مگر صاحبِ دین وتقویٰ لڑکا ہو اور دوسری طرف ایک صاحبِ مال ودولت لڑکا ہو، مگر دین وتقویٰ سے عاری ہو، تو ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دولت و وجاہت کے مقابلے میں اس غریب کو ترجیح دے جس کے ساتھ دین وتقویٰ کا اعزاز لگا ہوا ہے، چنانچہ ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

اِنَّ الْمَرْأَۃَ تُنْکَحُ عَلٰی دِیْنِھَا وَمَالِھَا وَجَمَالِھَا فَعَلَیْکَ بِذَاتِ الدِّیْنِ تَرِبَتْ یَدَاکَ۔

(مسلم، ترمذی)

عورت یا تو اپنے دین واخلاق کی خوبی کی بنا پر پسند کی جاتی اور رشتۂ نکاح میں لائی جاتی ہے، یا مال ودولت کی بنا پر یا حسن وجمال کی بنا پر تو تم لازماً دین واخلاق والی عورت کو نکاح کے لئے منتخب کرو۔

آپؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ دین و اخلاق کی بنا پر عورت کو پسند کرتے ہیں اور کچھ لوگ دولت و ثروت اور ظاہری حسن و جمال کی بنا پر، تو آپ نے یہ تاکید فرمائی کہ اوّلیں چیز دین ہے اور تمام مسلمانوں کو پہلے یہی چیز دیکھنی چاہیئے۔ دوسری چیزیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں، مگر دین و اخلاق کے بعد۔ امام مالکؒ کے اس نظریے کے اعتبار سے ایک ہی خاندان کے دو لڑکے، لڑکی غیر کفو ہوسکتے ہیں اور دو برادری اور دو خاندان کے دو لڑکے، لڑکی کفو ہوسکتے ہیں، کیونکہ اگر ایک ہی برادری یا خاندان کی ایک لڑکی ایسے گھرانے کی پروردہ ہو، جس میں دین و اخلاق اور علم و فضل موجود ہو اور اسی خاندان کا ایک لڑکا ہو جس کے والدین اور وہ خود دین و اخلاق اور علم و فضل سے عاری ہوں، تو خاندان کے اشتراک کے باوجود اس لڑکی کے لئے یہ جاہل اور بے اخلاق لڑکا کفو نہیں ہوسکتا اور اس کے برخلاف اگر یہ دونوں دو برادری یا دو خاندان کے ہوں مگر دونوں میں دین و اخلاق اور علم و فضل کے اعتبار سے ہم آہنگی ہو تو دونوں ایک دوسرے کے کفو ہوسکتے ہیں، نتیجے کے اعتبار سے یہی مقصود ائمہ ثلثہ کی رائے کا بھی ہے، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔

لڑکے کا انتخاب

لڑکے کے انتخاب کے سلسلہ میں کئی حدیثیں اوپر گذر چکی ہیں، ایک دوسری حدیث اور ملاحظہ ہو:۔

عن ابی حاتم المزنیؓ قال	ابو حاتم مزنی سے مروی ہے، آپؐ نے فرمایا
قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ	کہ کسی کے دین و اخلاق سے تم مطمئن ہو تو
وسلم اذا خطب احدکم من	پھر اس کا نکاح اپنی لڑکی سے کر دو اگر تم نے
ترضون دینہ وخلقہ فزوجوہ	ایسا نہیں کیا تو زمین میں بڑا فتنہ و فساد
ان لا تفعلوہ تکن فتنۃ	رونما ہوگا۔[1] اس ارشاد نبوی کو سن کر

[1] اس حدیث کی تشریح محدثین نے یہ کی ہے کہ اگر تم دین و اخلاق کے بجائے صاحب دولت و ثروت رشتہ کو ترجیح دو گے تو بہت سے غریب بچوں بچیوں کی شادی نہ ہوسکے گی یا دقت پیدا ہوگی جس کی وجہ سے برائیاں پھیلیں گی اور یہ چیز سرپرستوں کے لئے عار اور عیب کا سبب بنیں گی اور اس کے نتیجے میں طویل فتنہ و فساد ہوگا، امام مالک کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے۔ (مجمع بحار الانوار)

فی الارض وفساد عریض قالوا یارسول اللہ وان کان فیہ قال اذا جاءمن ترضون دینہ وخلقہ فانکحوہ ثلاث مرات۔ (ترمذی ابوداؤد)

صحابہؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! عورت میں کوئی بات[1] ہو جب بھی ہم ایسا ہی کریں، تو آپؐ نے تین بار یہی فرمایا کہ ہاں جب بھی تم ایسا ہی کرو۔

نسب میں باپ کا اعتبار ہوگا

کفارت اور نسب کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ نسب کا اعتبار باپ کی طرف سے ہوتا ہے، ماں کی طرف سے نہیں، یعنی باپ جس خاندان یا جس برادری کا ہوگا لڑکا بھی اسی خاندان یا برادری کا سمجھا جائے گا، جو لوگ نسب کی تلاش میں ددھیال ہی نہیں، ننھیال کے گڑے مُردے بھی اکھاڑتے ہیں وہ غلط کار ہیں، علّامہ ابن قدامہ المغنی میں لکھتے ہیں:۔

والکفاءت معتبر فی الرجل دون المرأۃ فان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاکفوٗلہ وقد تزوج صفیۃ بنت حی بن اخطب وتسری بالاماء وقال من کانت عندہ جاریۃ فعلمہا واحسن تعلیمہا واحسن الیہا ثم اعتقہا وتزوجہا فلہ اجران (متفق علیہ) ولان الولد یشرف بشرف ابیہ

کفارت یعنی برابری مرد کے اعتبار سے ہے نہ کہ عورت کے اعتبار سے، اسلئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب و نسب میں کوئی برابر نہیں، مگر آپ نے عرب کے مختلف قبیلوں سے نکاح فرمایا اور حضرت صفیہ بنت حُیی بن اخطب جو لونڈی تھیں ان سے نکاح فرمایا اور اس سلسلہ میں آپ کا ایک اور ارشاد ہے کہ جس کے پاس کوئی لونڈی ہو اس نے اس کی تعلیم و تربیت کی اور اچھا سلوک کیا، پھر اسے آزاد کرکے نکاح کرلیا تو

---

[1] "کوئی بات" کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ظاہری شکل و صورت بہت اچھی نہ ہو، یا اس کی مالی حالت زیادہ قابل اطمینان نہ ہو۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن غریب کہا ہے اور ابوداؤد نے اپنے مراسیل میں اس کا ذکر کیا ہے یہ مختلف طرق سے مروی ہے اس لئے اس کا ضعف اور غرابت دور ہوجاتی ہے۔

لا بامه فلم يعتبر ذالك في الام۔	اسے دوہرا اجر ملے گا اس لئے کہ لڑکے کی شرافت باپ کی شرافت کی وجہ سے ہے، نہ کہ ماں کی وجہ سے، تو نسب اور کفارت
(المغني ج ۶ ص ۴۸۷)	میں باپ کا اعتبار کیا جائے گا ماں کا نہیں۔

لڑکی کا انتخاب

جس طرح لڑکے کے انتخاب میں آپ نے دین و اخلاق کو ترجیح دی اسی طرح لڑکی کے بارے میں آپ کا ارشاد گرامی حکمتوں سے پُر ہے، آپؐ نے فرمایا:۔

لا تزوجوا النساء لحسنهن فعسیٰ حسنهن ان یردیهن ولا تزوجوا لاموالهن فعسی اموالهن تطغيهن ولكن تزوجوهن على الدين ولامة سوداء ذات دين افضل۔	عورتوں سے رشتہ ان کے حسن و جمال کیوجہ سے نہ کرو ممکن ہے ان کا حسن ان کو کسی برائی اور خرابی کی راہ پر ڈالدے اور ان کی مالداری کی بنا پر رشتہ نہ کرو ہو سکتا ہے کہ ان کا مال ان کو سرکشی اور غرور میں مبتلا
(ابن ماجہ کتاب النکاح)	کر دے، بلکہ دین و اخلاق کی بنیاد پر رشتہ

کرو ایک دیندار بدصورت اور کالی کلوٹی لونڈی بے دین خوبصورت اور مالدار لڑکی سے بہتر ہے۔

ایک حدیث اور ملاحظہ ہو جس میں رشتۂ نکاح کے غلط اور صحیح دونوں مقاصد کا ذکر آپ نے فرمایا ہے:۔

من تزوج امرأة لعزها لم يزده الا ذلا ومن تزوجها لحسنها لم يزده الا دماءة ومن تزوج امرأة لم يردها الا ان يغض بصره ويحصن فرجه ويصل رحمه بارك الله له فيها وبارك	جو شخص کسی عورت کے معزز گھرانے کا ہونے کی وجہ سے شادی کرتا ہے تو اسے ذلت ملتی ہے اور جو حسن و جمال کی وجہ سے شادی کرتا ہے تو حسن ڈھل جانیکے بعد بدصورتی ملتی ہے، جو اس لئے کسی لڑکی سے شادی کرتا ہے کہ اس کی نگاہیں غیر محرم سے محفوظ رہیں گی اور اپنی شرمگاہ کو حرام کاری سے بچائے گا،

لھا فیہ۔ اور رشتہ داروں کا حق ادا کرے گا، تو ایسے
(طبرانی) شخص کو اللہ تعالیٰ لڑکی کے سلسلہ میں طرح طرح
کی برکت دے گا، اور لڑکی کو لڑکے کی طرف سے برکت عطا کرے گا۔

اس حدیث کی روشنی میں علامہ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ:۔

اذا لم تزوج المرأة الا لعزھا اگر کوئی شخص عورت سے اس کی عزت، مال
اومالھا او حسبھا فھو ممنوع یا حسب و نسب کی بنا پر اس سے شادی
شرعاً۔ (مرقات ج ۲ ص۲۰۴) کرتا ہے، تو یہ شرعاً ممنوع ہے۔

گویا دوسرے لفظوں میں یہ نکاح دیانۃً ہی نہیں بلکہ قضاءً بھی ناجائز ہے۔

ان تمام تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رشتۂ نکاح قائم کرنے میں سب سے پہلے لڑکے اور لڑکی اور خاندان کے دین و اخلاق کو دیکھنا چاہیئے، اس کے ساتھ دوسری چیزیں حاصل ہو جائیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، بلکہ اچھی بات ہے مگر دین و اخلاق کو نظر انداز کر کے دوسری چیزوں کو ترجیح دی جائے تو یہ اسلامی شریعت کی روح کے خلاف ہے۔

مہر کا بیان

اوپر نکاح کے وہ ارکان و شرائط بیان کئے گئے ہیں، جن کا خیال کئے بغیر نکاح ہو ہی نہیں سکتا، لیکن ان کے علاوہ نکاح کے لئے بعض چیزیں اور بھی ضروری ہیں۔ جن کو قصداً چھوڑ دینا برا ہے، اور غلطی سے وہ چیزیں چھوٹ گئیں تو ان کی تلافی کرنی ضروری ہے، ان ہی میں ایک مہر بھی ہے، قرآن پاک اور حدیث میں اس کی تاکید آئی ہے۔ قرآن میں مہر کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے، اس میں صَدُقات کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ صدقات، صُدُقَۃٌ کی جمع ہے، صدقہ، صدق سے نکلا ہے اور صدق کے بہت سے معنی ہیں۔ درستگی، سچائی اور دوستی وغیرہ، گویا مہر کو صدقہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ میاں بیوی کی دوستی اور ان کے تعلقات کی درستگی، اور سچائی کی علامت ہے۔ دوسرے اس لئے کہ شوہر اپنے مال کا ایک حصہ عورت کو دیتا ہے اور اسی کو صدقہ کہتے ہیں کہ اپنا مال کسی دوسرے کو خوشی سے دے دیا جائے،

حدیث میں مہر اور صداق کے علاوہ اور بعض دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں، قرآن میں ہے کہ وَاٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مہر مقرر کر کے اپنا نکاح فرمایا ہے، اور حضرت فاطمہ کا نکاح کیا تو حضرت علیؓ سے حضرت فاطمہ کا مہر دلایا۔

مہر کی تعریف

وہ رقم جو مرد کی طرف سے عورت کو اپنی شہوانی خواہش کی تکمیل کے لئے نکاح کے وقت ملتی ہے، یا وہ ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہے اس کو شریعت میں مہر کہتے ہیں[1]۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔ مہر مؤجّل اور مہر معجّل یعنی وہ مہر جو فوراً نکاح کے ساتھ ہی ادا کر دی جائے وہ معجّل ہے۔ معجّل عجلت سے بنا ہے، یعنی وہ چیز جو جلد ادا کی جائے، اور جس کو نکاح کے وقت فوراً ادا نہ کیا جائے، بلکہ اس کی ادائیگی کا وعدہ کر لیا جائے، اس کو مہر موجّل کہتے ہیں، موجّل اجل سے بنا ہے، اجل کے لفظی معنی وقت اور مدّت کے ہیں، اور موجل کے معنی جس کی ادائیگی کے لئے کوئی وقت اور مدّت مقرر کر دی گئی ہو، نکاح میں اس سے مراد ہوتی ہے جو مہر بعد میں ادا کیا جائے۔

مہر ایسی ضروری چیز ہے کہ اگر نکاح کے وقت غلطی سے مہر کا ذکر نہیں کیا گیا تو نکاح تو ہو جائے گا، مگر شوہر کے اوپر وہ قرض رہے گا، اور اسے عورت کو مہر مثل ادا کرنا واجب ہوگا، اسی طرح اگر اس نے عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ ہم کچھ مہر نہیں دیں گے، جب بھی اسے مباشرت کے بعد مہر مثل دینا ہوگا[2] اگر مباشرت کے بعد اس کا انتقال ہو جائے جب بھی اس کو اس کے ترکہ سے مہر مثل ملے گا۔

مہر حیثیت سے زیادہ نہ مقرر کرنا چاہیئے

مہر اتنا ہی مقرر کرنا چاہیئے جتنا شوہر آسانی سے ادا کر سکے، عام طور پر لوگ دو وجہ سے مہر زیادہ مقرر کرتے ہیں، ایک تو اس کو عزّت و فخر کی بات

---

[1] الفقه على المذاهب الاربعة، ج ۴ ص ۹۴ فهو اسم للمال الذی يجب للمرأة فی عقد النکاح فی مقابلة الاستمتاع بها۔

[2] ان تزوجها ولم يسم لها مهرا او تزوجها على ان لا مهر لها فلها مهر مثلها ان دخل بها او مات عنها۔ (ہدایہ ج ۲ ص ۳۰۴)۔

سمجھتے ہیں، دوسرے اس لئے کہ شوہر عورت کو حتی الامکان طلاق نہ دے سکے، حالانکہ یہ دونوں باتیں شرعی اعتبار سے بھی غلط ہیں اور عقلی اعتبار سے بھی، شرعی اعتبار سے تو اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ مہر مقرر کرنے سے منع فرمایا ہے، آپؐ نے فرمایا:-

اِنَّ اَعْظَمَ النِّکَاحِ بَرَکَۃً اَیْسَرُہٗ مَؤُنَۃً۔ (مسند احمد)

اتنا ہی زیادہ نکاح بابرکت ہے جس میں مالی تکلیف و پریشانی جتنی ہی کم ہو۔

خود آپؐ نے اپنا مہر بہت زیادہ مقرر کرنا پسند نہیں فرمایا، حضرت فاطمہؓ کا نکاح آپ نے اس زمانہ کے لحاظ سے بہت تھوڑے روپیوں پر کیا تھا۔

مہر فاطمی کی مقدار

حضرت فاطمہ کا جو مہر مقرر کیا گیا تھا بہت سے لوگ اتباعِ سنّت کے لئے وہی مقرر کرتے ہیں یہ مہر مقرر کرنا اتباع سنّت تو ضرور ہے، لیکن محض اسی مہر کو سنت سمجھنا غلطی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہزار دو ہزار پر بھی اپنا نکاح فرمایا ہے، اور کم پر بھی۔ حضرت فاطمہؓ کا مہر آپ نے پانچ سو درہم مقرّر فرمایا تھا اور ایک درہم ہمارے ہندوستانی وزن سے ¼ تولے سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے مہر فاطمی کی مقدار مولانا مفتی شفیع صاحب نے مالہ ۱۳۱ تولے تین ماشے چاندی مقرر کی ہے۔ یہ حساب مفتی صاحب نے بڑی تحقیق سے لگایا ہے، اس ۱۳۱ تولے تین ماشے چاندی کی جتنی قیمت روپے یا دوسرے سکّوں کے اعتبار سے ہو وہی مقرّر کرنا چاہیئے۔ ۱۹۸۰ء میں اس کی قیمت پانچ ہزار سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

چند ضروری مسائل

۱۳۱ تولہ ۳ ماشہ (ایک کلو ۵ سو ۳۱ گرام) مہر فاطمی پر اگر نکاح کیا جائے تو اگر اسی وقت شوہر ادا کر دیتا ہے تو اس وقت کے بھاؤ سے اس کو دینا ہوگا، اگر اس نے اس وقت اس کو ادا نہ کیا تو جب وہ ادا کرے گا تو اس کو اس وقت کے بھاؤ سے جتنا روپیہ ہوگا ادا کرنا ہوگا۔

(۲) مہر فاطمی پر اصرار کرنا بھی صحیح نہیں ہے، بلکہ حیثیت کے مطابق مہر مقرر کرنا چاہیئے کم حیثیت ہو تو کم مقرر کرے اور زیادہ حیثیت کا ہو تو اس سے زیادہ بھی مقرر کر سکتا ہے، اگر زیادہ ہو تو اسکے ادا کرنے کی حیثیت اور نیت بھی ہونی چاہیئے، صرف اظہار تفاخر نہ ہو۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں عجمیوں کے اثر سے لوگ بہت زیادہ مہر مقرر کرنے لگے تھے، تو آپ نے سخت تنبیہ فرمائی۔ آپؓ نے فرمایا کہ لوگو! مہر مقرر کرنے میں غلو نہ کرو، اگر یہ چیز دنیا میں باعث عزت و افتخار ہوتی یا آخرت میں اس کا کوئی ثواب ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سب سے پہلے اختیار فرماتے، آپ نے اپنی ازواج میں کسی کا مہر نہ تو ساڑھے بارہ اوقیہ[1] سے زیادہ مقرر کیا اور نہ اپنی صاحبزادیوں میں سے کسی کا اس سے زیادہ مہر مقرر کیا۔ (مسلم، ترمذی)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علیؓ کی صاحبزادی ام کلثوم سے نکاح کیا تو کچھ زیادہ مہر مقرر کیا، مگر بعد میں ان کو خیال ہوا کہ زیادہ مہر مقرر کرنے پر پابندی لگا دی جائے، خود فرماتے ہیں: وانا اردت ان انھی عن کثرۃ الصداق فذکرت ھذہ الاٰیۃ اذا اٰتیتم احداھن قنطاراً فلا تاخذوا منہ شیئاً (آل عمران) میں نے زیادہ مہر پر پابندی کا ارادہ کر لیا تھا مگر جب یہ آیت سامنے آئی تو رک گیا اس لئے کہ اس میں قنطاراً کا لفظ آیا ہے جو کثیر رقم پر بولا جاتا ہے، قنطار ستّر رطل کا ہوتا ہے، جس کا وزن ۱۹۸۷ء میں چاندی کے بھاؤ کے اعتبار سے تقریباً دس ہزار روپے ہوتے ہیں۔ (المغنی ج ۶ ص ۶۸۱)

مہر مثل نکاح اور طلاق کے سلسلے میں بعض صورتیں ایسی پیش آتی ہیں جنمیں مہر مثل دینا پڑتا ہے، مثلاً کسی نے نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہیں کیا، تو مہر معاف نہیں ہوگا، بلکہ عورت کو مہر مثل ملے گا۔ مہر مثل سے مراد مہر کی وہ مقدار ہے جو عام طور پر

---

[1] ایک اوقیہ ہمارے وزن سے ساڑھے دس تولہ کا ہوتا ہے، اس حساب سے بارہ اوقیہ کے ایک سو اکتیس تولے چاندی ہوئی۔ عام طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مقدار سے زیادہ مہر مقرر نہیں فرماتے تھے اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے یہ بات فرمائی ہے، ورنہ آپ کے بعض نکاح اس سے زیادہ مہر پر بھی ہوئے ہیں، مثلاً ام حبیبہؓ کا نکاح۔ یہ بات ضرور ہے کہ ام حبیبہؓ کا مہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بلکہ شاہ حبش نجاشیؓ نے مقرر فرمایا تھا۔ [2] ایک روایت میں ہے کہ ایک عورت کے ٹوکنے پر آپ اس سے رک گئے۔

اس کے کنبہ و خاندان میں مقرر ہوتی ہو، خاندان سے مراد ددھیال ہے، ننھیال نہیں، مثلاً اس کی پھوپھی اس کی سگی یا چچا زاد بہنیں یا ددھیال کی دوسری لڑکیاں ۔ اگر ماں خالہ وغیرہ باپ ہی کے خاندان کی ہوں تو ان کے مہر کا بھی اعتبار کیا جائے گا، یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ خاندان کی ہر عورت کا مہر کسی عورت کے لئے مہر مثل نہیں بن سکتا، بلکہ اس عورت کا مہر اس کے لئے مہر مثل ہوگا، جو حسب ذیل صفات میں اس کی مثل ہو، مثلاً اس کی ایک بڑی بہن کا مہر ۵۰۰ روپے مقرر ہو چکا ہے اور یہ چھوٹی جیسی صورت و سیرت کی ہے یا اسی کے قریب قریب وہ بھی تھی یا اس کی کنوارے پن میں شادی ہوئی تھی تو اس کی شادی بھی کنوارے پن میں ہوئی ہو یا یہ جتنی پڑھی لکھی، دین دار اور سلیقہ مند ہے اتنی ہی بڑی بھی تھی ۔ تو اس صورت میں جو بڑی بہن کا مہر ۵۰۰ ہے، وہی چھوٹی بہن کا مہر مثل ہوگا ۔ اگر قریبی رشتہ داروں میں کوئی لڑکی ان صفات کی نہیں ہے تو دور کے رشتہ داروں میں جو لڑکی اس لڑکی کے صفات کی ہوگی اس کا مہر اس کا مہر مثل قرار پائے گا۔[1]

مہر کی کم اور زیادہ مقدار

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث نبوی کی روشنی میں کم سے کم مہر کی مقدار دس درہم یعنی پونے تین بھر ۲ ۳/۴ چاندی (۳۲ گرام) مقرر کی ہے، اب اگر کوئی شخص ایک بھر یا دو بھر چاندی کی قیمت مقرر کرتا ہے تو اس کو لامحالہ پونے تین بھر چاندی کی قیمت دینا پڑے گا، یہ تو مہر کی کم سے کم مقدار تھی، اس سے کم مہر مقرر نہیں کیا سکتا، البتہ زیادہ مہر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، جیسا کہ اوپر قرآن کی آیت گزر چکی ہے، مگر زیادتی میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ مہر اتنا ہی مقرر کیا جائے، جتنا کہ وہ اسی وقت یا مستقبل قریب میں

---

[1] ومهر مثلها يعتبر باخواتها وعماتها وبنات عمها ولا يعتبر بامها وخالتها اذا لم تكونا من قوم ابيها ويعتبر في المهران يتساوى المرأتان في السن والجمال والمال والعقل والدين والبلد والعصر۔ (قدوری ص۱۱۱)

ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، مہر عورت کا حق ہے مگر ادا شوہر کو کرنا ہے، اس لئے اس کا لحاظ بھی ضروری ہے، آگے متعدّد حدیثیں نقل کی جائیں گی، جن سے اندازہ ہو جائے گا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ مرد کی حیثیت کا لحاظ فرمایا ہے، جیسا کہ نفقہ کے سلسلہ میں لحاظ کیا گیا ہے، اگر فخر و غرور یا کسی اور غیر شرعی وجہ کی بنا پر زیادہ مہر مقرر کر دیا، اور دل میں خیال یہ رہا کہ دینا تو ہے نہیں، جتنا چاہو مقرر کر دو تو یہ سخت گناہ ہے یہ عورت کا حق ہے، اور کسی کا حق مارنے کا خیال کرنا بہت بڑا ظلم اور گناہ ہے۔

مہر کے بعض اور ضروری مسائل

(۱) نکاح کے وقت جو مہر مقرر ہو چکا ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ، اگر مرد عورت کے ساتھ ہم بستر ہو چکا ہے، یا دونوں تنہائی میں یکجا ہو چکے ہیں تو پورا مہر دینا پڑے گا۔

(۲) اگر نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہیں کیا گیا، یا مرد نے یہ شرط لگا دی کہ میں کچھ مہر نہ دوں گا، تو دونوں صورتوں میں اگر خلوت صحیحہ ہو چکی ہے، یا مرد کا انتقال ہو گیا ہو، تو عورت مہر مثل پانے کی مستحق ہو گی، اگر عورت کا انتقال ہو جائے تو اس کے ورثہ اسکے مستحق ہوں گے۔ (فتاویٰ ہندیہ)

(۳) اگر کوئی شخص نقد رقم کے بجائے غیر منقولہ جائداد مثلاً مکان، زمین، دوکان یا منقولہ اموال، موٹر، سائیکل، جانور کا مہر مقرر کرے تو وہ کر سکتا ہے، اس کو اب وہ غیر منقولہ جائداد یا منقولہ مال دینا ضروری ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ تعیین کر دینی ضروری ہے کہ وہ کون سی زمین، مکان یا دوکان مہر میں دے رہا ہے۔ اگر اس نے تعیین نہیں کی بلکہ یونہی کہا کہ کوئی زمین یا دوکان یا سواری دوں گا تو اس طرح سے مہر مقرر کرنا صحیح نہ ہو گا، اب اس کے بجائے مہر مثل دینا پڑے گا۔ (ردالمحتار)

شادی کے وقت سونے چاندی کے جو زیورات لڑکے کی طرف سے لڑکی کو دیئے جاتے ہیں، اگر شوہر یا اس کے گھر والے یہ کہہ دیں کہ ہم نے مہر میں دیا ہے تو مہر کی قیمت کے بقدر اس سے مہر ادا ہو جاتے گی، اور اگر کچھ کمی رہ جائے تو وہ نقد کی صورت میں پورا کیا جا سکتا ہے، مگر اس صورت میں شوہر اگر طلاق دیدے تو وہ واپس نہیں لے سکتا، اگر شوہر

کہے کہ میں نے مہر میں دیا ہے، اور عورت کہے کہ یہ ہدیہ ہے تو مرد کی بات مانی جائیگی (کنز الدقائق ص ۱۵۸)
البتہ کھانے پینے کی چیز مہر میں محسوب نہیں ہوگی، یعنی اس کی قیمت نہیں لگائی جائیگی،
اسی طرح مہر کے علاوہ جہیز میں دیئے گئے زیور و سامان وغیرہ کے بارے میں عرف پر فیصلہ
ہوگا، ہمارے دیار میں عموماً طلاق کے بعد ایک دوسرے کا قیمتی سامان واپس کر دینے کا رواج
ہے، اس لئے ان کو واپس کرنا ضروری ہے، البتہ مرد اور عورت کے ہر وقت کے استعمال کی
وہ چیزیں جو خراب ہوتی اور گھٹتی رہتی ہیں ان کا ئی حالت میں واپس کرنا ضروری نہیں ہے مثلاً پہننے
والے کپڑے، جوتے، گھڑی، سائیکل وغیرہ، اگر منگنی کے وقت دیا ہے اور شادی نہیں ہوئی تو جو چیز موجود ہے اسے واپس کرنا ضروری ہے۔

خدمت کو مہر مقرر کرنا

(۴) اگر کسی نے صرف خدمت یا فائدے کو مہر ٹھہرایا تو یہ مہر صحیح نہ ہوگا، مثلاً کسی نے یہ شرط لگائی کہ میں عورت کو قرآن پڑھا دوں گا، حج کرا دوں گا، یا تعلیم کا خرچ برداشت کروں گا، یا اس کی خدمت کے لئے ایک ملازم رکھ دوں گا، تو امام ابو حنیفہ کے یہاں یہ مہر کی تعیین صحیح نہ ہوگی، بلکہ اس کو ان تمام صورتوں میں مہر مثل دینا پڑے گا[1]

---

[1] لزم مہر المثل فی الجمیع عند وطی أو موت (شرح وقایہ ج ۲ ص ۳۵) اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ کا مشہور مسلک یہی ہے کہ پونے تین بھر چاندی ۲ ۳/۴ سے کم مہر مقرر نہیں کی جا سکتی (ہدایہ ج ۲ ص ۳۰۵)۔

مگر دوسرے ائمہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک کوئی خدمت اور کام کو بھی مہر مقرر کیا جا سکتا ہے، ان حضرات کے پیش نظر قرآن پاک کی آیت اور وہ احادیث ہیں جن میں کسی خدمت یا تعلیم وغیرہ کو مہر قرار دیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حضرت شعیب علیہ السلام کے یہاں تشریف لے گئے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ میں اپنی ایک لڑکی کا نکاح آپ سے اس شرط پر کر دینا چاہتا ہوں کہ آپ آٹھ برس تک میرے اجیر کی حیثیت سے کام کریں اور اگر دس پورا کر دیں تو یہ آپ کا احسان ہوگا، انھوں نے منظور کر لیا اور نکاح ہو گیا، گویا یہ آٹھ سالہ خدمت ان کا مہر مقرر ہوا، امام ابن قیم اور علامہ کاسانی وغیرہ نے لکھا ہے کہ ماقبل اسلام شریعت کے کسی حکم کو جبتک صراحۃً منسوخ نہ کر دیا جائے تو وہ باقی رہتا ہے احتج

(بقیہ حاشیہ ص پر)

(۵) اگر کسی مسلمان مرد نے کوئی حرام چیز مہر مقرر کی تو یہ صحیح نہیں ہے، اس کا نکاح درست ہو جائے گا، اور مہر مثل دینا ہوگا۔

(بقیہ حاشیہ صـ کا)

الأئمة الأربعة بشرع من قبلنا ان صح ذالك (الطرق الحكمية صـ٢٥٦، بدائع الصنائع ج ۵ صـ١٧٣)

اس آیت کے علاوہ متعدد احادیث سے بھی پتہ چلتا ہے کہ تعلیم و خدمت کے کام کو بھی مہر مقرر کرنا جائز ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے شادی کرنے کے لئے کہا تو آپ نے فرمایا کہ مہر میں دینے کے لئے کچھ ہے، وہ بولا کہ کچھ نہیں ہے، آپ نے فرمایا کہ هل معك من القرآن کیا کچھ قرآن پاک یاد ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں، آپ نے فرمایا قد زوجتکها بما معك من القرآن جتنا قرآن تمہیں یاد ہے، اس کی تعلیم اپنی بیوی کو دینا اسی خدمت کے صلہ میں تمہارا نکاح اس عورت سے کرتا ہوں (بخاری ومسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب الصداق) جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے احناف کا مشہور مسلک وہی ہے، مگر متاخرین نے دس درہم سے کم اور تعلیم کتاب وغیرہ کو بھی مہر مقرر کرنے کو جائز قرار دیا ہے، مولانا عبدالحئی صاحب نے شرح وقایہ کے حاشیہ میں دس درہم کے عقلی و نقلی دلائل پر بڑی تفصیلی گفتگو کر کے اسے مرجوح قرار دیا ہے، الفقه على المذاهب الأربعه کے مصنف لکھتے ہیں:

اما اذا تزوجها على منافع معنوية كتعليم القرآن والفقه ونحو ذالك من علوم الدين ففيه خلاف وظاهر المذهب لا يجوز ولكن متأخرين من الحنفية قد أفتوا بجواز أخذ الأجرة على تعليم القرآن والعلوم الدينية للضرورة .. والقاعدة أن الذى تصلح على الأجرة يصح جعله مهرا لأن الأجرة مال متقوم يقع فى مقابل المهر۔ (ج ۴ صـ١٠۵)	البتہ اگر کوئی شخص منافع معنویہ کو مہر مقرر کر کے اس پر نکاح کرے جیسے تعلیم قرآن یا فقہ اور علوم دینیہ میں سے کسی اور علم دین کی تعلیم کو مہر مقرر کرے تو اس میں اختلاف ہے، احناف کا ظاہری مذہب عدم جواز کا ہے لیکن متاخرین حنفیہ نے تعلیم قرآن وغیرہ پر اجرت لینے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور قاعدہ کلیہ ہے کہ جو کام اجرت لینے کے لائق ہے اس کو مہر مقرر کرنا بھی صحیح ہے، اس لئے اجرت بھی مہر کے مقابلے میں مال متقوم ہے۔

نکاح شغار

(۶) دو آدمیوں نے اپنے لڑکے یا لڑکی کی شادی اس شرط پر کی کہ دوسرا بھی اپنے لڑکے یا لڑکی کی شادی اس کے لڑکے یا لڑکی یا بہن سے کر دے اور یہ تبادلہ ہی مہر سمجھا جائے گا تو ایسا کرنا گناہ ہے، شریعت میں اس نکاح کو نکاحِ شغار کہا جاتا ہے، اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ اگر اس شرط پر نکاح ہو جائیگا، تو دونوں کو ایک دوسرے کو مہر مثل دینا پڑے گا، مہر سے کوئی فریق بچ نہیں سکتا، نهى النبى صلى الله عليه وسلم عن الشغار (بخاری ومسلم)

(۷) نکاح کے وقت مہر مقرر نہیں کیا گیا، مگر نکاح کے بعد میاں بیوی دونوں نے اپنی خوشی سے جو کچھ مہر مقرر کر لیا، اب یہی مہر واجب ہو گا ("للمفوضة ما فرض لها" شرح وقایہ)

(۸) پانچ سو یا ہزار روپے مہر مقرر تھا اور شوہر نے نکاح کے بعد کہا کہ میں پانچ سو کے بجائے ایک ہزار یا دو ہزار کے بجائے تین ہزار مہر دوں گا، تو اب اس کے اوپر اتنا ہی دینا واجب ہو گیا، اگر یہ نہ دے تو عورت اس سے اس زیادتی کا مطالبہ کر سکتی ہے، اگر وہ ادا نہ کرے گا تو گنہ گار ہو گا، بشرطیکہ وہ بیوی سے مجامعت کر چکا ہے، اسی طرح اگر سو یا ہزار روپے مہر مقرر تھا، عورت نے اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ معاف کر دیا تو اب اتنا حصہ مرد کے سر سے معاف ہو گیا، اب عورت طلاق کے بعد یا غصّے میں آ کر معاف کی ہوئی رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتی، "وان زاد فى المهر بعد العقد لزمته الزيادة ان دخل بها وان حط المهر صح الحط (قدوری ص۱۳۵)۔

(۹) اگر مرد نے ڈرا دھمکا کر یا عورت کو پریشان کر کے مہر معاف کرا لیا تو اس سے کچھ نہیں ہوتا، جو مہر مقرر ہے وہ اس کو دینا پڑے گا۔ مہر عورت کی ملکیت ہے اور اپنی ملکیت کوئی شخص جب تک خوشی سے نہ چھوڑے دوسرا نہیں لے سکتا، حتى لو كان مكرها لم يصح (فتاوىٰ ہندیہ، ج۲ ص۳۰۲)۔

میاں بیوی دونوں بالغ ہیں اور دونوں میں خلوت صحیحہ ہو چکی ہے، مگر شوہر نامرد ہے یا کوئی اور خرابی ہے جس کی وجہ سے وہ مباشرت نہیں کر سکتا تو اس صورت میں اگر مرد نے

طلاق دے دی یا عورت نے فسخ نکاح کرالیا تو پورا مہر ادا کرنا ہوگا۔[1] البتہ اگر دونوں میں سے کوئی نابالغ ہے اور اسی حالت میں دونوں میں فسخ نکاح ہوگیا یا طلاق ہوگئی، تو نصف مہر واجب ہوگا۔

(۱۱) کسی نے اگر بے قاعدہ نکاح کیا اور وہ نکاح فاسد قرار دے دیا گیا اور علیٰحدگی کردی گئی تو اگر مباشرت کرنے کے بعد علیٰحدگی ہوئی ہے تو مہر مثل دینا پڑے گا، لیکن اگر اس نے مباشرت نہیں کی ہے تو اگرچہ دونوں میں خلوت صحیحہ ہو چکی ہو مگر کچھ بھی مہر واجب نہ ہوگا۔

بے قاعدہ نکاح کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کے ارکان و شرائط پورے نہ ہوں، مثلاً دو گواہ نہ رہے ہوں، یا ولی کی موجودگی میں کسی اور نے نکاح کرا دیا ہو، یا کوئی اور خرابی ہو، اور اس خرابی کی وجہ سے یہ نکاح فاسد قرار دے دیا جائے۔[2]

(۱۲) اگر شوہر نے نان نفقہ کے علاوہ بیوی کو کچھ دیا اور یہ خیال کر لیا کہ یہ مہر میں ہے، مثلاً زیور بنوا دیا ضرورت سے زیادہ کپڑے بنوا دیئے، یا کھانے پینے کا سامان ضرورت سے زیادہ دے دیا، یا اس کے نام کوئی جائداد لکھ دی یا اس کے نام نقد روپیہ جمع کر دیا اور دل میں ارادہ کر لیا کہ یہ مہر میں دے رہا ہوں، تو اس نے اس ارادے سے جتنا کچھ دیدیا ہے، وہ سب مہر میں محسوب کر سکتا ہے، خواہ اپنے ارادے کو عورت پر ظاہر کرے یا نہ کرے، اگر عورت یہ کہے کہ تم نے یہ سب مہر میں نہیں دیا ہے، بلکہ تبرّعاً اور بطورِ احسان دیا ہے، اور شوہر کہے کہ نہیں، میں نے یہ سب مہر میں دیا ہے، تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ جو چیزیں

---

[1] و اذا خلا المجبوب بامرأة ثم طلقها فلها کمال المهر (قدوری ص۱۶۲)، کخلوة مجبوب او عنین او خصی (شرح وقایہ، ج ۲ ص۳۸)، ولا تصح خلوة الغلام لا یجامع مثله ولا الخلوة بصغرها لا تجامع مثلها (فتاویٰ ہندیہ، ج ۱ ص۳۵۵)

[2] و فی النکاح الفاسد انما یجب مهر المثل بالوطی لا بغیره۔ (کنز الدقائق ص۱۰۵)

شوہر نے دی ہیں، اگر وہ کھانے پینے کی چیز نہیں ہے تو اس صورت میں عورت کے کہنے کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا، اور شوہر کی بات مانی جائے گی یعنی وہ چیز مہر میں محسوب ہوگی، دوسری صورت یہ ہے کہ جو چیز اس نے دی ہے وہ کھانے پینے کی چیز تھی تو اس صورت میں خواہ وہ چیز کتنی ہی قیمت کی کیوں نہ ہو، اس کی قیمت مہر میں محسوب نہیں کی جاسکتی۔[1]

(۱۳) اگر مہر کی ادائیگی کا وقت مقرر نہیں ہے تو عورت کو ہر وقت اس کے مطالبہ کا حق ہے۔ (عالمگیری، ج ا ص ۳۱۱)۔

قاضی مہر مقرر کر سکتا ہے

قاضی کو اختیار ہے کہ اگر دونوں کسی مہر پر راضی نہ ہوں تو وہ اپنی طرف سے مہر مقرر کر دے (البحر الرائق ج ۳ ص ۱۵۹ بحوالہ علم الفقہ)۔

خلوتِ صحیحہ کی تعریف

اوپر بار بار خلوتِ صحیحہ کا ذکر آیا ہے، اور آئندہ طلاق کے بیان میں بھی اس کا ذکر آئے گا، اس لئے یہاں اسکی تشریح کر دی جاتی ہے تاکہ جب خلوتِ صحیحہ کا نام آئے تو اس کی صورت وکیفیت سمجھ میں آجائے۔

مرد اور عورت دونوں بالغ ہوں اور ان کو ایسی تنہائی ویکجائی کا موقع مل جائے، جس میں مباشرت اور جماع کرنے میں ان کے لئے کوئی حسی، طبعی یا شرعی مانع نہ ہو تو اس تنہائی ویکجائی کو خلوتِ صحیحہ یعنی پوری تنہائی کہیں گے، خواہ دونوں میں مباشرت وجماع ہو یا نہ ہو، اور اگر کوئی حسی، طبعی یا شرعی مانع ہو تو خلوتِ صحیحہ نہ ہوگی، بلکہ اس یکجائی کو خلوتِ فاسدہ یعنی ادھوری یکجائی وتنہائی کہیں گے۔

---

[1] ومن بعث الى امرأته شيئاً وقالت هو هدية وقال هو من المهر فالقول له فی غير الهيا للاكل كالحلوة۔

(کنز الدقائق ص ۱۰۰)

موانع مباشرت وہ حسی، طبعی یا شرعی موانع جن کی بنا پر یکجائی وتنہائی کے باوجود خلوتِ صحیحہ نہیں ہوتی، یہ ہیں مثلاً مرد یا عورت میں سے کوئی ایسا بیمار تھا کہ مباشرت ممکن نہیں تھی، یا وہاں قریب وپاس میں کوئی تیسرا آدمی موجود ہے اور اسکی نظر ان پر پڑ سکتی ہے، خواہ وہ آدمی سوتا ہی کیوں نہ ہو، یا دونوں میں سے کوئی حج کا احرام باندھے ہوئے تھا، یا ان میں سے کوئی رمضان کے روزے رکھے ہوتے تھا یا عورت حیض کی حالت میں تھی یا دونوں میں کوئی نابالغ ہے تو ان تمام صورتوں کی یکجائی وتنہائی خلوتِ صحیحہ نہیں، خلوتِ فاسدہ کہی جائے گی[1]۔

محارِم یعنی وہ مرد عورت جن سے نکاح کرنا حرام ہے

جن مردوں اور عورتوں کا آپس میں نکاح حرام ہے، ان کی دو صورتیں ہیں، ایک حرمتِ ابد یعنی وہ جس سے کبھی نکاح درست نہ ہو، دوسرے حرمت موقّت یعنی کسی عارضی سبب سے نکاح حرام ہو، اور جب وہ سبب دور ہو جائے تو نکاح جائز ہوگا، حرمتِ ابدی کی تین صورتیں ہوتی ہیں (۱) نسب وقرابت کے ذریعہ (۲) سسرالی رشتہ کے ذریعہ (۳) رضاعت کے ذریعہ۔ موقت جیسے ایک بہن کا ہوتے ہوئے اسی کی دوسری بہن کو نکاح میں لانا۔

نسب وقرابت کے ذریعہ حرمت قرآن وحدیث میں حرمت موبد کے تحت مذکورہ تین قسم کی عورتیں اور مرد آتے ہیں، ان عورتوں اور مردوں کا نکاح آپس میں حرام قرار دیا گیا ہے، کوئی مسلمان مرد یا عورت ان سے نکاح نہیں کر سکتی، ایسے لوگوں کو شریعت میں محارِم کہا جاتا ہے، یعنی جن کے رشتے کے احترام کی وجہ سے ان سے نکاح حرام ہے۔

---

[1] وان کان احدھما مریضاً او صائماً فی رمضان او محرما بحج او عمرۃ او کانت حائضا فلیست بخلوۃ صحیحۃ۔

(شرح وقایۃ، ج ۲ ص ۳۸)

۱۔ جن سے نسبی تعلق کی وجہ سے نکاح حرام ہے

نسبی تعلق کی وجہ سے جن عورتوں سے ایک مرد نکاح نہیں کرسکتا، یا اس مرد سے یہ عورتیں نکاح نہیں کرسکتیں، وہ سات طرح کی ہیں، ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھانجی، بھتیجی۔ قرآن میں ہے:۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ۔ (نساء، ۴)	حرام کی گئی ہیں تم پر تمہاری مائیں، تمہاری بہنیں، تمہاری لڑکیاں، تمہاری پھوپھیاں تمہاری خالائیں، تمہاری بھتیجیاں اور تمہاری بھانجیاں۔

اب ان میں سے ہر ایک کے تعلق کی تفصیل کی جاتی ہے[۱]

ماں سے مراد محض اپنی حقیقی ماں ہی نہیں ہے، بلکہ اپنے باپ یا ماں کی ماں یعنی نانی اور دادی یا ان کے اوپر، پرنانی و پردادی اور ان کے اوپر جو ہوں وہ سب ہی حرام ہیں، اسی طرح وہ سوتیلی ماں بھی اس میں داخل ہے، جس سے باپ نے مباشرت کرلی ہو، قرآن نے دوسری جگہ اس کی وضاحت بھی کردی ہے، وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاءُكُمْ ان عورتوں سے تم نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ یا دادا، اور نانا، پرنانا نے نکاح کرلیا ہے۔

لڑکی میں محض وہی لڑکی مراد نہیں ہے، جو اس کے نطفے سے پیدا ہوئی ہے، بلکہ سوتیلی لڑکیاں بھی حرام ہیں اسی طرح اپنے لڑکے اور لڑکی کی بیٹیاں یعنی پوتیاں، نواسیاں اور ان سے جو بچے ہوں، یہ سب حرام ہیں۔ اسی طرح اگر زنا سے کوئی لڑکی پیدا ہوئی تو وہ بھی حرام ہے، اور زانیہ کی ماں بھی اس پر حرام ہے[۲]

بہن سے بھی مراد حقیقی اور سوتیلی سب بہنیں ہیں، یعنی جو ایک ماں باپ سے ہوں، یا دونوں کے باپ تو دو ہوں، مگر ماں ایک ہو، یا دونوں کے باپ ایک ہوں اور ماں دو

---

[۱] حرم علی المتزوج ذکرا کان او انثی اصلہ وفرعہ علا او نزل (رد المحتار ج ۲ ص ۳۸۰)۔

[۲] حرم علی المتزوج بنت اخیہ واختہ ولو من زنا۔ (در مختار)

ہوں، البتہ اگر دونوں کے باپ بھی دو ہوں اور ماں بھی دو ہوں تو یہ آپس میں بھائی بہن نہیں ہیں، ان میں شادی ہو سکتی ہے۔

پھوپھی اور خالہ سے مراد صرف حقیقی پھوپھی اور خالہ ہی نہیں ہیں، بلکہ سوتیلی خالہ، اور پھوپھی بھی اس میں شامل ہیں، یعنی باپ کی حقیقی بہن بھی حرام ہے اور سوتیلی بہن بھی، اسی طرح ماں کی حقیقی بہن بھی حرام ہے[1] اور سوتیلی بہن بھی۔ اگر دور کے رشتے کی خالہ، یا پھوپھی ہوں تو نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اپنے حقیقی پھوپھا یا خالو سے، پھوپھی یا خالہ کے انتقال کے بعد نکاح کر سکتی ہے۔

بھتیجی یا بھانجی سے مراد اپنے بھائی بہن کی لڑکیاں بھی ہیں، اور بھتیجی اور بھانجی کی لڑکیاں اور پوتیاں اور ان کے نیچے جو ہیں وہ سب حرام ہیں، کوئی عورت اپنے پھوپھا اور خالو سے پھوپھی یا خالہ کے انتقال کے بعد نکاح کرنا چاہے تو یہ نکاح جائز ہے، لیکن چچا اور ماموں سے کسی وقت بھی نکاح جائز نہیں ہے۔

۲۔ جن سے مصاہرت یعنی سسرالی رشتے کی وجہ سے نکاح حرام ہے

قرآن میں ساس اور بہوؤں کے بارے میں ہے:۔

وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ (نساء)	تمہاری بیویوں کی مائیں (یعنی ساس یا خوشدامن) اور تمہارے حقیقی وصُلبی لڑکوں کی بیویاں (یعنی بہویں) تمہارے لئے حرام کی گئی ہیں۔

جس طرح ساس اور داماد سے نکاح حرام ہے، اسی طرح ساس کی ماں اور نانی سے نکاح حرام ہے اور جس طرح لڑکے کی بیوی یعنی بہو سے نکاح نہیں ہو سکتا، اسی طرح اپنے پوتے اور نواسے کی بیوی سے شادی کرنا بھی حرام ہے، یہ سب بہویں شامل ہیں۔

مصاہرت یعنی سسرالی رشتے تین طرح سے قائم ہوتے ہیں، دو طریقے تو اس میں حلال

---

[1] حرم عمته وخالته (رد المختار)

ہیں اور ایک حرام ہے، مگر اس سے بھی رشتۂ مصاہرت قائم ہو جاتا ہے، ان تینوں صورتوں میں ایک عورت کے ماں باپ اور ان کے اوپر کے تمام لوگ حرام ہو جاتے ہیں، اسی کو شریعت میں حرمتِ مُصاہرت کہتے ہیں۔

(۱) حرمتِ مُصاہرت کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی عورت سے نکاح کیا اور اس سے مباشرت کرلی، تو اب اس کی ماں، نانی اور دادی ان سب سے نکاح حرام ہوگیا اور اس مرد کے باپ دادا اس عورت کے لئے حرام ہو گئے، کیونکہ اب یہ ان کی بہو ہوگئی۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ اپنی منکوحہ بیوی سے مباشرت نہیں کی، مگر اس کو خواہشِ نفسانی کے ساتھ ہاتھ لگایا تو اب اس عورت کو طلاق بھی دے دے تو اس کی ماں اور نانی وغیرہ اس کے لئے جائز نہیں ہوسکتیں، اسی طرح اس مرد کے باپ کا نکاح اس عورت سے نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ بہو ہوگئی۔

(۳) تیسری ناجائز اور حرام صورت یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت سے اس نے زنا کیا یا اس کو شہوت سے ہاتھ لگایا، یا بوسہ دیا تو یہ دونوں فعل حرام ہیں، مگر اس حرام فعل کی وجہ سے اب اس عورت کی ماں وغیرہ اس مرد کے لئے اور مرد کا باپ اس عورت کے لئے حرام ہو جائیں گے، اگر اس فعل قبیح کی ابتداء مرد کے بجائے عورت کی طرف سے ہو جب بھی اس کی ماں اس مرد کے لئے اور مرد کا باپ اس عورت کے لئے حرام ہو گیا[1] امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورت سے زنا کرنے اور لپٹا لینے یا بوسہ وغیرہ دینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، ہندوستان کے بعض علماء ابتلائے عام کی وجہ سے اسی کو اختیار کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ راقم الحروف کے نزدیک محرمات کے سلسلہ میں ابتلائے عام کی بات صحیح نہیں ہے گو یہ اجتہادی مسئلہ ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ رشتۂ مصاہرت ایک نعمتِ خداوندی ہے، تو وہ کسی محظور و ممنوع کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتی، مگر امام موصوف کی نگاہ سے یہ پہلو پوشیدہ رہا کہ بہت سے

---

[1] فان نظرت المرأة الی ذکر الرجل او لمست بشهوة او قبلت بشهوة تعلقت به حرمة المصاهرة (عالمگیری، ج ۳ ص ۲۸۲)، من زنی بامرأة حرمت علیه امها وبنتها (قدوری ص ۱۲۵).

کام جو محظور رہیں مگران پر حکم شرعی کا نفاذ ہوتا ہے، مثلاً حیض میں طلاق دینا منع ہے مگر طلاق پڑ جائے گی، مسجد میں غسل کرنا ممنوع ہے، غسل ایک نعمت ہے، مگر ممنوع کے ساتھ مل گیا، پھر بھی غسل کا حکم اس پر جاری ہو گا، اسی طرح ایک مجلس میں طلاق کا، مسئلہ ہے کہ معصیت ہوتے ہوتے حکم کا وقوع ہوگا۔

ابتلائے عام کی بنا پر کسی برائی میں سہولت دی جائے، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، اگر ایسا ہے تو پھر لہو ولعب کی تمام چیزوں مثلاً سینما، ویڈیو کی بلو فلم کو جائز قرار دینا پڑے گا، اس لئے کہ اب ابتلائے عام ہے اس لئے سہولت ہونی چاہیئے، شریعت نے معصیت کے ساتھ ذرائع معصیت سے بھی روکا ہے، اس لئے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بالغ نظری کی وجہ سے لمس اور نظر کو اس حکم میں داخل کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ زنا کا پیش خیمہ ہے۔

عورت کا مشتہاۃ ہونا ضروری ہے

ان تینوں طریقوں میں سے کوئی ایک طریقہ بھی پایا گیا تو رشتۂ مصاہرت قائم ہو جاتا ہے، لیکن اس میں ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ وہ عورت جس سے اس نے مباشرت کی ہے، یا زنا کیا ہے، یا شہوت سے ہاتھ لگایا ہے، اس کی عمر اتنی ہو کہ اس سے خواہشِ نفسانی پوری کی جا سکے اس کا اندازہ فقہاء نے نو برس کیا ہے، یعنی اگر عورت کی عمر نو برس یا اس سے زیادہ ہو تو حرمتِ مصاہرت قائم ہوگی، اور اگر اس سے کم ہو تو پھر حرمتِ مصاہرت قائم نہیں ہوگی۔

۳۔ وہ عورتیں جو ایک ساتھ ایک شخص کے نکاح میں نہیں رہ سکتیں

یہ بھی حرمتِ موقت کی صورت ہے، اسلام نے بیک وقت چار شادیوں کی اجازت دی ہے، یعنی ایک مرد بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتا ہے، لیکن عورتوں کے آپس میں بعض ایسے رشتے ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے ان میں سے دو عورتوں کو آپ ایک ساتھ نکاح میں نہیں رکھ سکتے، ایک ہی کو رکھ سکتے ہیں، البتہ ایک کے انتقال کے بعد دوسرے سے نکاح ہو سکتا ہے، مثلاً بیوی کے زندہ ہوتے ہوئے اس کی بہن یعنی سالی سے شادی نہیں ہو سکتی، لیکن اگر بیوی کا انتقال ہو جائے تو سالی سے

نکاح ہو سکتا ہے، قرآن میں ہے:۔

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ۔ (نساء)	اور یہ کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ جمع کرو یہ حرام ہے۔

اس آیت کی تشریح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض عورتوں کو بھی اس حکم میں داخل کیا ہے، مثلاً آپؐ نے فرمایا کہ ایک عورت اور اس کی خالہ یا پھوپھی کو ایک ساتھ نکاح میں جمع نہ کرو، یعنی رشتہ اور سن میں جو چھوٹی ہو اسے بڑی کے ساتھ جمع نہ کرو، اس کی ایک علت تو یہ ہے کہ چھوٹی بڑی عمر کی دو عورتوں کو جمع کرنے میں بہت سی جذباتی اور نفسیاتی الجھنیں پیدا ہوں گی، اور پھر حیا و شرم کے لحاظ سے بھی یہ بات مناسب نہیں ہے، اس کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس سے شادی کا جو مقصدِ اوّلین ہے، یعنی صلہ رحمی وہ نہ پیدا ہو گی، بلکہ یہ چیز قطعِ رحم کا سبب ہو گی، کیونکہ سوکنوں میں عام طور پر رقابت ہوتی ہے اور یہ رقابت اس قریبی رشتے میں خوشگواری پیدا کرنے کے بجائے ناگواری پیدا کرے گی۔[1] (مرقاۃ)

قرآن اور سنّتِ نبوی کی روشنی میں فقہاء نے اس کا ایک خاص اصول مقرر کر دیا ہے، فقہاء کا اصول یہ ہے کہ:۔

لَا یُجْمَعُ بَیْنَ اِمْرَاتَیْنِ لَوْ کَانَتْ اَحَدُھُمَا رَجُلًا لَمْ یَجُزْ لَہٗ اَنْ یَّتَزَوَّجَ بِالْاُخْرٰی۔ (ہدایہ)	ایسی دو عورتوں کو ایک ساتھ عقدِ نکاح میں نہیں لایا جا سکتا کہ اگر ان میں سے ایک کو مرد فرض کریں تو دوسری عورت سے اس کا نکاح جائز نہ ہو۔

مثلاً اگر دو سگی یا رضاعی بہنیں ہوں اور ان میں سے ایک کو مرد فرض کر لیں تو دونوں میں بھائی بہن کا رشتہ قائم ہو جائے گا، اور ظاہر ہے کہ بھائی بہن میں شادی نہیں ہو سکتی اسلئے

---

[1] نھی ان تنکح المرأۃ علی عمتھا والعمۃ علی بنت اخیھا والمرأۃ علی خالتھا والخالۃ علی بنت اختھا لا تنکح الصغری علی الکبری ولا الکبری علی الصغری۔

(ترمذی، ابوداؤد اور مشکوٰۃ ص۲۷۳)

ایسے رشتوں کی دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے، اسی طرح ان عورتوں کو جن میں پھوپھی اور بھتیجی کا یا بھانجی اور خالہ کا رشتہ ہے، ساتھ جمع نہیں کر سکتے، کیونکہ اگر بھتیجی یا بھانجی کو مرد فرض کریں، تو پھوپھی اور بھتیجے کا رشتہ ہوگا اور اگر بھانجی کو مرد فرض کریں تو بھانجے اور خالہ کا رشتہ ہوگا اور اگر خالہ کو مرد فرض کریں تو ماموں اور بھانجی کا رشتہ پیدا ہوگا، اور ان سب رشتوں میں نکاح حرام ہے، اس لئے ان کو ایک ساتھ نکاح میں نہیں رکھا جا سکتا۔

اگر ان میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے، یا کسی ایک کو طلاق مل جائے تو پھر دوسری سے نکاح ہو سکتا ہے، مثلاً ایک عورت سے شادی کی اور اس کا انتقال ہو گیا تو اب اس کی سگی بہن سے، خالہ سے، پھوپھی سے جس سے چاہے نکاح کر سکتا ہے مگر طلاق کی صورت میں عدت گزر جانے کے بعد ہی دوسری عورت سے شادی ہو سکتی ہے، پہلے نہیں۔

۴۔ چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح حرام ہے

قرآن وسنت میں ایک مسلمان کو بیک وقت چار بیویوں کو عقد نکاح میں رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، اب چار کی موجودگی میں کوئی شخص کسی پانچویں عورت سے شادی کرنا چاہے، تو اس کے لئے پانچویں عورت سے نکاح کرنا قطعی حرام ہے اگر ایسا کرے گا، تو یہ نکاح نہیں زنا ہوگا، قرآن مجید میں ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ (نساء) اگر بیک وقت پانچ عورتوں سے نکاح کرے گا تو سارے نکاح باطل ہو نگے۔

متعہ

اسی طرح اگر کسی عورت سے ایک مقررہ مدت کے لئے نکاح کیا گیا تو یہ بھی حرام ہے، مثلاً کسی نے ایک عورت سے ایک ماہ، ایک سال یا دو چار یا دس برس کی قید لگا کر نکاح کیا تو یہ نکاح حرام ہوگا، اگر اس عورت سے مباشرت کرے گا، تو اس پر زنا کا الزام لگایا جائے گا اور اگر اسلامی حکومت ہوگی، تو اس کو وہی سزا ملے گی جو زانی کو ملتی ہے اس کو شریعت میں متعہ کہتے ہیں، ابتدائے اسلام میں اس پر پابندی نہیں تھی، مگر بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حرام ہونے کا اعلان فرما دیا اور یہ اعلان آپ نے کئی بار فرمایا، ہمارے ملک کا شیعہ فرقہ اس کو صحیح سمجھتا ہے چونکہ یہ عیاشی کا ذریعہ ہے، اس لئے بہت سے امراء نے اسی وجہ سے شیعیت اختیار کر لی۔ النکاح الموقت باطل (ہدایہ ص ۲۹۳)

۵ جن سے اختلافِ مذہب کی وجہ سے نکاح حرام ہے

یہ بھی حرمتِ موقت کی صورت ہے، ایک مسلمان عورت یا ایک مسلمان مرد کا نکاح کسی دوسرے مذہب کے مرد یا عورت سے نہیں ہو سکتا، قرآن وحدیث میں اہلِ کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے، مگر ان کو بھی اپنی لڑکیاں دینا حرام ہے، مگر مشرک قوموں کی لڑکیاں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں ان کو عقدِ نکاح میں لینا بھی حرام اور مشرک مردوں کو اپنی لڑکیاں دینا بھی حرام ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا۔ (بقرہ)

مشرکہ عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور نہ اپنی عورتوں کو اس وقت تک مشرک مردوں کے نکاح میں دو یہانتک کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔

اہلِ کتاب کون لوگ ہیں؟

اہلِ کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں، جو کسی الہامی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں، جس کی تصدیق قرآن نے کر دی ہے۔ مثلاً توراۃ، انجیل، زبور وغیرہ، ان کتابوں پر ایمان رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے منزّل من اللہ ہونے کا بھی یقین رکھتے ہوں، اور خدا اور رسالت پر بھی ان کو پورا یقین ہو۔

عام طور پر آج کل کے یہود و نصاریٰ یا حضرت داؤدؑ کے پیرو جو توراۃ یا انجیل یا زبور کو ایک مقدس کتاب مانتے ہیں نہ تو ان کا یقین خدا پر ہوتا ہے اور نہ رسول پر بلکہ وہ تو عقیدتاً ملحد اور کافر ہوتے ہیں، یا ان پر شرک غالب ہوتا ہے، یا کم از کم خدا اور رسول پر ان کا یقین مشکوک ہوتا ہے، اس لئے ایسے اہلِ کتاب کی لڑکیاں جب تک اسلام قبول نہ کرلیں ان سے نکاح کرنا بہتر نہیں ہے، مگر چونکہ قرآن نے اجازت دی ہے، اس لئے اس کو قطعی حرام بھی قرار نہیں دیا جا سکتا، قرآن نے ان کے ساتھ نکاح کرنے میں دو باتوں کی قید لگا دی ہے ایک یہ کہ وہ واقعی اہلِ کتاب ہوں، دوسری یہ کہ وہ عورتیں پاک دامن ہوں، جہاں یہ دونوں

شرطیں نہ پائی جائیں گی، یا ان کے نہ پائے جانے کا گمان غالب ہوگا، ان سے نکاح کی اجازت نہیں دی جاسکتی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ عہد نبویؐ اور عہد خلفاءِ راشدین میں اس کی مثال بھی موجود ہے کہ بعض صحابہؓ نے کتابیہ عورتوں سے نکاح کیا بھی، اور اس کی مثال بھی موجود ہے کہ آپ نے اور خلفاءِ راشدین نے اس سے بعض صحابہ کو روکا بھی، کیونکہ نکاح کا جو اولین مقصد ہے کہ اس کے ذریعے ایک اچھا خاندان پیدا ہو' وہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب میاں بیوی میں الفت و محبّت ہو، اور دونوں کے تعلقات پاک بازی پر مبنی ہوں چنانچہ کعب بن مالکؓ نے ایک کتابیہ سے نکاح کرنا چاہا تو آپؐ نے فرمایا کہ اِنَّکَ لَا تُحصِنُکَ وہ تمہیں پاکباز نہیں بنا سکے گی، گویا جہاں یہ شرط نہ پائی جائے گی وہاں اس سے روکا جائے گا، اسی طرح حضرت عمرؓ نے حضرت حذیفہؓ کو جو اس وقت عراق کے امیر تھے اس سے منع کیا، اور روکنے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ کہیں تم بدکار عورتوں پر نہ جا پڑو۔ "لَا تُوْقِعُوْ عَلَی الْمُوْمِسَاتِ"[1]
حضرت علیؓ نجران کے عیسائیوں سے نکاح کرنے کو اس لئے منع فرماتے تھے کہ ان پر ایمان کے بجائے شرک غالب تھا۔

غرض یہ کہ جب تک یہ دونوں شرطیں یقینی طور پر نہ پائی جائیں ان سے نکاح نہ کرنا چاہیئے۔

اس طرح اگر میاں بیوی میں کوئی شخص خدانخواستہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرلے' یا وہ خدا کا انکار کردے تو پھر ایسے میاں بیوی کا رشتہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے' اب ان میں سے جو مسلمان ہو وہ فوراً اپنے کو دوسرے علیحدہ کرلے' بہت سے صحابہؓ نے اپنی عورتوں کو اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ مسلمان نہیں ہوئی تھیں بہت سی صحابیاتؓ نے اپنے شوہروں سے اس لئے علیحدگی اختیار کرلی کہ ان کے شوہر اسلام قبول کرنے پر

---

[1] امام محمد نے کتاب الآثار میں حضرت عمرؓ کا قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اہل کتاب لڑکیوں سے نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہے ص۱۵۶، ابن قدامہ نے المغنی میں لکھا ہے، فالاولی ان لا یتزوج کتابیۃ لان عمر رضی اللہ عنہ قال للذین تزوجوا من نساء اھل الکتاب طلقوھن فطلقوھن۔ (ج ۷، ص ۵۹۰)

راضی نہیں ہوئے، اور وہ مسلمان ہوچکی تھیں۔

نومسلم کا نکاح

اگر کوئی کافر، ملحد یا مشرک میاں بیوی ساتھ ہی مسلمان ہو جائیں تو اب ان کو نکاح کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ان کا پہلا نکاح ہی کافی ہے، چاہے وہ جس مذہب کے مطابق ہوا ہو۔

کمیونیزم کے پرستار اور قادیانی

موجودہ دور میں کمیونیزم کے اثر سے بے شمار نوجوان ملحد ہو گئے ہیں، اگر وہ واقعی خدا کے منکر ہیں اور آخرت پر ان کو یقین نہیں ہے، اور وہ اسے اسلام سے اچھا ایک مستقل نظام زندگی سمجھتے ہیں تو ایسے ملحدوں سے مسلمان لڑکی یا اگر عورت ہے تو لڑکے کا نکاح جائز نہیں ہے، اسی طرح قادیانی مرد یا عورت سے نکاح جائز نہیں ہے، اس لئے کہ وہ ختم نبوت کے قائل نہیں ہیں۔ پوری امت نے ان کے کفر کا فتویٰ دے دیا ہے۔

شیعہ لڑکے اور لڑکی کا نکاح

شیعہ لڑکے یا لڑکی کا نکاح کسی سنی لڑکے یا لڑکی سے جائز نہیں، نعوذ باللہ وہ قرآن کی تحریف کے قائل ہیں اور اماموں کا درجہ نبیوں کے برابر مانتے ہیں، وہ چار صحابہ کے علاوہ سب کو مرتد قرار دیتے ہیں، ان کے اوپر تبرا کرتے ہیں اور لعنت و ملامت اور گالی کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔

۶۔ جو عورتیں کسی کے نکاح میں ہونے کی وجہ سے حرام ہیں

یہ حرمتِ موقت کی صورت ہے،

جو عورتیں کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں، خواہ وہ کافر کے نکاح میں ہوں یا مسلمان کے نکاح میں، ان سے نکاح کرنا حرام ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دے، یا اس کا انتقال ہو جائے، تو موت کی یا طلاق کی عدت میں بھی کوئی شخص اس سے نکاح نہیں کر سکتا، طلاق کی عدّت تین حیض ہے، اور موت کی عدت چار مہینے دس دن۔ قرآن میں ہے "وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ" اور بیاہی عورتیں بھی حرام ہیں۔

۷- وہ عورتیں یا مرد جو رضاعت کی وجہ سے حرام ہیں

عربی زبان میں رضاعت دودھ پلانے کو کہتے ہیں، جو عورتیں کسی بچے کو دودھ پلا دیں، اسلامی شریعت ان کو ماں کا درجہ دیتی ہے یعنی اسکا اور اس کے لڑکے اور قریبی رشتے داروں کا وہی درجہ مقرر کرتی ہے، جو ماں کا اور ایک ماں کے لڑکے، لڑکیوں اور رشتے داروں کا ہوتا ہے، دودھ پلانے والی عورت کو مُرضِعہ اور دودھ پینے والے بچے کو رَضیع اور بچی کو رَضیعہ کہتے ہیں۔ قرآن میں رضاعت کے بارے میں کہا گیا ہے :-

وَاُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِيْ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ۔ (نساء)	تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے، اور تمہاری رضاعی بہنیں تمہارے اوپر حرام کی گئی ہیں۔

اس حکم قرآنی کی روشنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول مقرر فرمایا ہے :-

يُحَرَّمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يُحَرَّمُ مِنَ الْوِلَادَةِ (بخاری)	جتنے رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہیں وہ رضاعت یعنی دودھ پلانے کی وجہ سے بھی حرام ہیں۔

قرآن وسنت کی اس اصولی ہدایت کی روشنی میں فقہاء نے جو مسائل مستنبط کئے ہیں، وہ یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

رضاعت کی مدّت اور اس کا حکم

رضاعت یعنی بچے کو دودھ پلانے کی مدّت دو برس ہے، یعنی خواہ بچے کو ماں خود دودھ پلائے یا کوئی دوسری عورت دودھ پلائے، دو برس سے زیادہ بچے کو دودھ پلانا حرام ہے[۱]، جو عورت اس بچے یا بچی کو دو برس کے اندر دودھ پلا دے گی وہ اس کی ماں تسلیم کر لی جائے گی اور اس کے لڑکے لڑکیاں اس دودھ پینے والے بچے یا بچی کے بھائی بہن ہو جائیں گے، اب اس بچے

---

[۱] اجمعوا أن مدة الرضاع فی استحقاق أجرة الرضاع مقدر بحولین (فتاویٰ ہندیہ ج۲ ص۳۵۷)۔

سے نہ تو اس عورت کا نکاح ہو سکتا ہے، اور نہ اس کے لڑکے اور لڑکیوں سے اور نہ اس کے ان قریبی رشتے داروں سے جن کا ذکر نسب کے سلسلے میں آچکا ہے۔ غرض یہ کہ رضاعت کا رشتہ اس وقت قائم ہو گا، جب بچے نے کسی عورت کا دودھ دو برس کے اندر پی لیا ہو، خواہ دو برس تک مسلسل پیا ہو، یا ایک بار صرف دودھ کے چند قطرے ہی اس کے حلق میں کیوں نہ چلے گئے ہوں سب کا حکم برابر ہے، اگر بچہ کھانے پینے لگے اور دو برس سے پہلے دودھ چھوٹ جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اگر بچّے نے عورت کی چھاتی سے منہ لگا کر نہیں پیا، بلکہ کسی عورت نے اپنا دودھ نکال کر اس کے منہ میں ڈال دیا حتیٰ کہ اگر اس کے منہ کے بجائے ناک میں بھی دودھ ڈال دیا جب بھی رضاعت کا رشتہ قائم ہو جائے گا، خواہ چند قطرے ہی کیوں نہ ڈالے گئے ہوں۔[1]

منہ اور ناک کے علاوہ کسی اور ذریعے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی

(۱) اگر منہ اور ناک کے علاوہ کسی اور راستے سے مثلاً پیشاب یا پاخانے کے مقام سے یا کسی اور طریقے سے مثلاً انجکشن کے ذریعے سے اگر کسی عورت کا دودھ اس کے معدے یا دماغ میں پہونچ جائے تو اس سے رشتۂ رضاعت قائم نہ ہو گا۔[2]

(۲) اگر کسی عورت کا دودھ پانی یا دوا میں ملا کر کسی بچے کو پلایا گیا تو اگر پانی یا دوا زیادہ تھی اور دودھ کم تھا تو اس سے رضاعت ثابت نہیں ہو گی، لیکن اگر دودھ کی مقدار زیادہ تھی اور پانی یا دوا کی مقدار کم تھی تو رضاعت ثابت ہو جاتے گی۔

اسی طرح اگر عورت کا دودھ بکری یا گائے کے دودھ میں ملا کر پلایا گیا تو اس کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر بکری یا گائے کا دودھ زیادہ تھا، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، لیکن اگر عورت

---

[1] وکما یحصل الرضاع بالمص من الثدی یثبت بالصب والصعوط (فتاوی ہندیہ ج ۲ ص ۲۵۸)

[2] ولا یثبت بالاقطار فی الأذن والمحقنة والإحلیل والدبر .... وان وصل الی الجوف۔ (عالمگیری ج ۲ ص ۳۵)

کا دودھ زیادہ تھا تو وہ عورت اس بچے کی رضاعی ماں ہوگئی اور اس کے بچے اس کے رضاعی بھائی بہن ہوگئے اور ان کا نکاح آپس میں درست نہیں ہے۔[۱]

عورت کا دودھ دوا میں ڈالنا یا ملانا درست نہیں ہے، اگر کسی دوا میں ملا دیا گیا، تو اب اس کا کھانا اور لگانا حرام ہے، اسی طرح کان اور آنکھ میں بھی عورت کا دودھ ڈالنا جائز نہیں ہے۔

اگر کسی کنواری لڑکی کو جس کی عمر نو برس یا نو برس سے زیادہ دس گیارہ برس ہے، اور اسے دودھ نکل آئے اور کوئی بچہ پی لے تو یہ لڑکی اس بچے کی رضاعی ماں ہو جائے گی اور اس کے تمام رشتے اس کے لئے حرام ہو جائیں گے، نو برس سے کم کا کوئی اعتبار نہیں۔[۲]

رضاعت کا ثبوت

(۱) کسی احمق بالغ مرد نے کسی بالغ عورت کا دودھ پی لیا، یا بے اختیار بیوی کا دودھ شوہر کے منہ میں چلا گیا، تو اس سے رضاعت ثابت نہ ہوگی، کیونکہ ڈھائی برس کی عمر کے بعد دودھ پینے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی، مگر قصداً بالغ مرد کو عورت کا دودھ پینا حرام ہے اور سخت گناہ ہے۔[۳]

(۲) ایک عورت اگر یہ کہتی ہے کہ میں نے فلاں بچے کو دودھ پلایا ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا مرد یا عورت اس کے دودھ پلانے کو نہیں کہتا تو تنہا عورت کے کہنے سے رضاعت ثابت نہ ہوگی، بلکہ رضاعت کے ثبوت کے لئے ضروری ہے کہ دودھ پلانے والی عورت کے علاوہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اس کی گواہی دیں کہ ہاں اس عورت نے اس بچے کو دودھ پلایا ہے، اگر دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہی نہ دیں تو رضاعت ثابت نہ ہوگی، اور اس سے اور اس کی لڑکی لڑکے اور رشتے داروں سے اس کا نکاح حرام نہ ہوگا، لیکن اگر اس صحیح اور شرعی طریقے سے اس کا ثبوت نہ مل سکے، مگر محض اس عورت ہی کے کہنے سے یا

---

[۱] ولو خلط لبن المرأة بالماء او بالدواء او بلبن البهيمة فالعبرة للغالب (عالمگیری ج۲ ص۳۵۹)۔

[۲] ولو ان صبية لم تبلغ تسع سنين لنزل بها اللبن فارضعت به لم يتعلق التحريم (عالمگیری ج۲ ص۳۴۳)۔

[۳] واذا مضت مدة الرضاع لم يتعلق بالرضاع تحريم (عالمگیری ج۲ ص۳۴۳)۔

کسی ایک مرد یا محض دو چار عورتوں کے کہنے سے دل میں یہ شک پڑ جاتے کہ یہ ممکن ہے کہ ان کا کہنا صحیح ہو تو اس صورت میں شرعًا اس کی رضاعت ثابت نہ ہوگی، لیکن احتیاطًا اس سے اور اس کے بال بچوں سے نکاح کا رشتہ قائم کرنا بہتر نہیں ہے بلا وجہ شک میں پڑنے سے کیا فائدہ[1]؟

اوپر ذکر آچکا ہے کہ جو رشتے نسب سے حرام ہیں، وہ رضاعت کے ذریعہ بھی حرام ہو جاتے ہیں، مگر پھر بھی اس کی مزید تفصیل کر دی جاتی ہے کہ کون کون سے رشتے رضاعت کی وجہ سے نکاح کے لئے حرام ہو جاتے ہیں۔

(۱) جس عورت کا دودھ کسی لڑکے یا لڑکی نے پی لیا وہ عورت اس کی ماں ہو گئی، اور اس کا موجودہ شوہر اس کا باپ ہو گیا، اور اس عورت کے جتنے لڑکے لڑکیاں ہوں گی، چاہے موجودہ شوہر سے ہوں یا دوسرے شوہر سے ہوں سب اس کے بھائی بہن ہو جائیں گے اور اسی طرح اس عورت کے بھائی اس بچے کے ماموں اور باپ اس کے نانا اور اس کی بہن خالہ ہو جائے گی، جس طرح حقیقی ماں کے بھائی، بہن اور باپ، ماموں، خالہ اور نانا ہو جاتے ہیں اور اسی طرح اس دودھ پلانے والی عورت کے شوہر کے بھائی اس بچے کے چچا اور اس کی بہن پھوپھی اور اس کے ماں باپ اس کے دادی دادا ہو جائیں گے جس طرح اس کے حقیقی باپ کے بھائی بہن اور باپ دادا، چچا، پھوپھی، دادی، دادا ہو جاتے ہیں، اس کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے۔ مثلاً شاہدہ اور عباس میاں بیوی ہیں، شاہدہ کا دودھ خالد کے لڑکے عامر نے پی لیا تو اب شاہدہ اور عباس دونوں عامر کے رضاعی ماں باپ ہوں گے، اور ان کے جتنے لڑکے لڑکیاں ہوں گے وہ سب عامر کے بھائی بہن ہوں گے، اب ان میں سے کسی کا نکاح عامر سے نہیں ہو سکتا، اسی طرح عباس کے بھائی بہن، ماں باپ، اور

---

[1] ولا تقبل فی الرضاع شهادة منفردات وانما یثبت بشهادة رجلین اورجل وامرأتین، (قدوری ص۱۰۱) امام شافعیؒ کے یہاں صرف چار عورتوں کی گواہی سے بھی رضاعت ثابت ہو جاتی ہے، چونکہ اس کا تعلق عورتوں سے ہے اس لئے انھوں نے یہ رائے دی ہے۔

شاہدہ کے ماں باپ بھائی بہن عامر کے اسی طرح ماموں، نانا، خالہ، چچا، پھوپھی اور دادا، دادی ہوں گے اور ان سے نکاح حرام ہوگا، جس طرح حقیقی بہن، بھائی اور ماموں، بھانجی، نانا، نواسی، اور دادی میں نکاح حرام ہوتا ہے۔

اگر خالد کی لڑکی سلمیٰ نے اور حامد کے لڑکے قادر نے خالدہ کا دودھ پیا تو اب سلمیٰ اور قادر دونوں رضاعی بھائی بہن ہوگئے، ان دونوں میں نکاح نہیں ہوسکتا، خواہ دونوں نے ایک ہی زمانہ میں خالدہ کا دودھ پیا ہو، یا ایک نے پہلے پیا ہو اور دوسرے نے برس دو برس کے بعد پیا، دونوں کا ایک حکم ہے۔

رضیع کے حقیقی بھائی بہن کا حکم

رضیع یعنی جس لڑکے نے دودھ پیا ہے اس کا نکاح تو مرضِعہ یعنی دودھ پلانے والی عورت اور اس کے شوہر یا اس کے خونی رشتے داروں سے جائز نہ ہوگا، لیکن رضیع یعنی دودھ پینے والے لڑکے کے دوسرے حقیقی، سوتیلے یا رضاعی بھائی بہن سے مرضعہ کے لڑکے لڑکیوں کی شادی ہوسکتی ہے۔

(۱) مثلاً طارق، خالد اور راشدہ حقیقی بھائی بہن ہیں اور خالد نے صفیہ کا دودھ پیا تو اب خالد سے صفیہ کا اور صفیہ کے تمام بچوں کا نکاح حرام ہے، مگر خالد کے بھائی طارق اور اس کی بہن راشدہ کا نکاح صفیہ کے لڑکے لڑکیوں سے ہوسکتا ہے، یا صفیہ کے شوہر سے راشدہ کا نکاح ہوسکتا ہے، اسی طرح صفیہ کا نکاح راشدہ کے باپ سے ہوسکتا ہے[1]

(۲) اسی طرح خالد کے دو سوتیلے یا رضاعی بھائی بہن ہیں اور خالد نے اسماء کا دودھ پیا تو اب اسماء کے لڑکوں اور لڑکیوں سے تو خالد کا نکاح نہیں ہوسکتا، مگر خالد کے جو سوتیلے اور رضاعی بھائی بہن ہیں ان سے اسماء کے لڑکوں کا نکاح ہوسکتا ہے، اور خود اسماء کا نکاح خالد کے رضاعی بھائی بہن سے ہوسکتا ہے۔

(۳) اسی طرح رضیع کے لڑکے لڑکیاں مرضِعہ کے لئے اور مرضِعہ کے شوہر کے لئے حرام

---

[1] ویجوز لہ ان یتزوج بام حقدتہ وبجدتہ ولدہ من الرضاع وکذا ام اخت ابنہ (عالمگیری ص ۳۴۴ ج ۱)۔

ہیں، کیونکہ رضیع کے بچے مرضعہ کے اور مرضعہ کے شوہر کے پوتے پوتیاں ہو گئے، اسی طرح رضیع کی بیوی مرضعہ کے شوہر کے لئے حرام ہے، کیونکہ یہ اس کی بہو ہوتی اور بہو سے نکاح حرام ہے اور رضیعہ کا شوہر مرضعہ کے لئے حرام ہے، کیونکہ یہ مرضعہ کا داماد ہوا اور داماد سے شادی حرام ہے۔

رضاعت کے رشتے کا قاعدہ کلّیہ اس فارسی شعر میں بتادیا گیا ہے، اس کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیئے ؎

از جانب شیر دہ ہمہ خویش اند — واز جناب شیر خوارہ زوجان وفروع

مرضعہ یعنی دودھ پلانے والی اور اس کے شوہر کے تمام قریبی رشتے دار رضیع کے لئے حرام ہیں اور رضیع کے بال بچے اور رضیع کی بیوی اور رضیعہ کا شوہر مرضعہ اور مرضعہ کے شوہر کے لئے حرام ہیں۔

بعض اور ضروری مسائل

(۱) کسی دوسرے کے لڑکے کو بغیر شوہر کی اجازت کے، بیوی کو دودھ نہ پلانا چاہیئے، البتہ اگر کوئی بچّہ بھوک سے تڑپ رہا ہو اور اس کی ماں موجود نہ ہو یا اس کے دودھ نہ ہوتا ہو، ایسی حالت میں بغیر اجازت بھی دودھ پلادینا چاہیئے[1]

(۲) کسی ایک ہی جانور کا دودھ دو لڑکے پیئیں تو اس سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

نوٹ:۔ دودھ پلانا کس کا حق ہے اور دودھ پلانے والی عورت کو کتنی اجرت ملنی چاہیئے، اور بعض دوسرے مسائل کا تذکرہ آگے آئے گا۔

زانی اور زانیہ کے نکاح کا حکم

اگر کوئی عورت بیوہ ہو یا مطلّقہ ہو، یا حاملہ ہو تو اس کو عدّت ختم ہونے سے پہلے نکاح کرنا حرام ہے، بیوہ کے لئے عدّت چار مہینے دس دن، مطلّقہ کے لئے تین حیض ہے، اور حاملہ کی عدت

---

[1] ویکرہ للمرأۃ ان ترضع صبیا بلا اذن زوجہا الا اخافت ہلاکہ۔

(ردالمحتار، ص ۵۵۶ ج ۲)

بچے کی پیدائش ہے، یعنی اس کے بعد وہ نکاح کرسکتی ہے، لیکن اگر کسی بدبخت عورت یا مرد نے زنا کر لیا تو اب اگر ان دونوں میں نکاح ہو تو ان کے لئے عدت ضروری نہیں ہے، اور اگر حمل رہ جائے تو حمل کی حالت میں بھی نکاح ہو سکتا ہے، البتہ اگر زانیہ کو زنا سے حمل رہ گیا ہے مگر اس کا نکاح زانی کے بجائے کسی دوسرے آدمی سے طے ہو گیا تو حمل کی حالت میں نکاح تو دوسرے سے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ زانیہ کے لئے عدّت نہیں ہے، لیکن چونکہ حمل اس کو دوسرے آدمی سے ہے اس لئے ہونے والے شوہر کو اس سے مباشرت نہ کرنا چاہیئے، کیوں کہ زنا کے نطفے اور اس کے نطفے میں اختلاط نہ ہونے پائے، لیکن اگر زانی ہی سے نکاح ہوا ہے تو اس کے لئے یہ قید بھی نہیں ہے، کیونکہ نطفہ اسی کا ہے[1]

نکاح کا مسنون اور غیر مسنون طریقہ

شادی بیاہ کا موقع ایک خوشی و مسرّت کا موقع ہوتا ہے، لیکن اسلام میں کوئی خوشی و مسرت احساس ذمہ داری سے خالی نہیں ہے، یعنی خوشی و مسرت اپنے ساتھ بہت سی دنیاوی اور دینی ذمہ داریاں لاتی ہے، اس لئے رشتۂ نکاح کے قائم کرنے سے پہلے اور قائم کرتے وقت خوشی و مسرت کا ایسا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے جو اس کی ذمہ داریوں اور اسلامی روح کے منافی یا اس کو ٹھیس لگانے والا ہو یا ایک عارضی خوشی، ایک دائمی رنج وغم کا سبب بن جائے۔ یہ شادی خانہ آبادی ہو، خانہ بربادی کا پیش خیمہ نہ ہو، نکاح کے سلسلے میں اوپر جو ہدایتیں دی گئی ہیں اگر آپ ان کا لحاظ نہ کریں گے تو نہ تو اخلاقاً و دیانتہً عقد نکاح قائم ہوگا اور نہ قانوناً اس کی کوئی حیثیت ہوگی، لیکن آگے جو ہدایتیں دی جائینگی، ان کی عدم رعایت سے قانونی طور پر تو عقد نکاح قائم ہو جائے گا لیکن اخلاقاً و دیانتہً ان کی رعایت نہ کرنا بہت برا اور گناہ ہے، کیونکہ اس سے معاشی نقصان بھی ہوتا ہے، اور معاشرہ میں ایک ایسا جذبۂ اسراف پیدا ہوتا ہے، جو معاشرتی عیوب اور فساد کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے، اور جو کام کسی برائی اور فساد کا سبب ہو وہ بھی اسلام میں مطلق حرام نہ بھی

---

[1] وحبلی من زنا صح نکاحها ولا توطأ حتی تضع حمله۔ (شرح وقایہ، ج ۲ ص ۲۰)

مگر اسے مکروہ تحریمی ضروری قرار دیا گیا ہے، چنانچہ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رشتۂ نکاح کو زیادہ پسند فرمایا ہے، جو آدمی کے لئے معاشی اور معاشرتی حیثیت سے کم سے کم پریشان کن اور کم سے کم بار ثابت ہو، کیونکہ جس رشتۂ نکاح کے معاشرتی اور معاشی تقاضے جتنے ہی زیادہ پریشان کن اور بار ثابت ہوں گے، اس رشتہ کے ذریعہ معاشرے کی وہ اسلامی اور اخلاقی ذمہ داریاں اتنی ہی کم پوری ہوں گی، جن کی تکمیل ہی رشتۂ نکاح کی جان ہے، آپؐ کا ارشاد گرامی ملاحظہ ہو:۔

اِنَّ أَعْظَمَ النِّکَاحِ بَرَکَۃً اَیْسَرُہٗ مَؤُنَۃً۔ (مسند احمد) سب سے زیادہ مبارک نکاح وہ ہے جو کم سے کم مادی پریشانی اور بار کا سبب ہو۔

آپؐ نے اسی بنا پر ان عورتوں کو عقد نکاح میں لینے کی زیادہ ترغیب دی ہے، جن کے ذریعہ آدمی پر کم سے کم مادی بار پڑتا ہو، اور اس کے تقاضے اور فرمائشیں کم سے کم ہوں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "علیکم بالابکار فإنھن أعذب أفواھا وانتق أرحامًا وأرضی بالیسر۔" (ابن ماجہ، کتاب النکاح)

کنواری لڑکیوں سے شادی کرو، یہ زیادہ شیریں زبان ہوتی ہیں، ان سے اولاد زیادہ ہوتی ہے، اور یہ تھوڑی سی چیز پر قناعت کر لیتی ہیں۔ اسی بنا پر آپؐ نے فرمایا کہ جس لڑکے کے دین واخلاق سے اطمینان ہو جائے، اس سے اپنی لڑکیوں کا نکاح کر دو، اگر ایسا نہ کرو گے، تو

تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِیْضٌ۔ (مشکوٰۃ، ترمذی) زمین میں ایک فتنۂ عظیم اور بہت بڑا فساد برپا ہو جائے گا۔

گویہ ہدایتیں جو آگے دی جا رہی ہیں خالص اخلاقی ہیں، یعنی ہر مسلمان کے جذبۂ ایمانی سے یہ توقع قائم کر کے یہ ہدایتیں دی گئی ہیں کہ وہ ان کے خلاف نہ کرے گا، لیکن اگر کوئی شخص ان کی خلاف ورزی کرتا ہے، تو قانونی طور پر اس کے عقد نکاح پر تو اس کا کوئی اثر نہیں پڑیگا، مگر یہ اخلاقی ہدایت کی عدم رعایت ایک معاشرتی فساد اور فتنہ کا سبب ہوتی ہے، اس لئے اسلامی حکومت معاشرے کے ہر فرد کو ان کی رعایت پر مجبور کر سکتی ہے، اور ان کا لحاظ نہ کرنے والوں کو سزا بھی دے سکتی ہے، لیکن بہرحال قانونی طور پر عقد نکاح نہیں توڑ سکتی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ ارشادات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی ہوگی کہ شادی بیاہ کی تقریب کو نہایت ہی سادہ، کم خرچ اور اخلاقی حدود کا پابند بنانا چاہیئے اور میاں بیوی کو اپنی مادی اور معاشی ضرورتوں کو محدود رکھنا چاہیئے، ورنہ جس کی معاشی، معاشرتی اور مادی خواہشات کا دائرہ جتنا ہی وسیع ہوگا، اس کے دین واخلاق کا دائرہ اتنا ہی سمٹے گا، یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے، بلکہ ہم آپ دن رات اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جس گھر میں جتنی زیادہ خواہشات کی محبت اور پیروی ہوتی ہے وہاں خدا اور اس کے رسول کی محبت اور پیروی اتنی ہی کم ہوتی ہے، اور جس گھر میں دن رات معاشی اور معاشرتی معیار کو بلند اور جدید سے جدید تر بنانے کی کوشش ہوتی ہے، وہاں دین کا کوئی معیار تو ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو انتہائی پست اور بے کشش ہوتا ہے، اس میں مستثنائی مثالیں بھی ہیں، مگر حکم چند افراد کو سامنے رکھ کر نہیں لگایا جاتا، بلکہ اکثریت کو سامنے رکھ کر لگایا جاتا ہے، اور اکثریت کا حال وہی ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے۔

شادی بیاہ کی رسوم

ان ہدایات کو ذہن نشین کرنے کے بعد پھر ان رسم ورواج پر ایک نظر ڈالئے جو مسلمانوں میں اس وقت عام طور پر رائج ہوگئی ہیں، ان رسموں کی پابندی نے ہزاروں مسلمان گھرانوں کو ایک سخت مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے، کتنے لڑکے اور لڑکیوں کی آدھی عمر گذر جاتی ہے، مگر ان کی شادی صرف اس لئے نہیں ہو پاتی کہ رسم ورواج اور جہیز کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ان کے والدین اور سرپرستوں کے پاس ذرائع نہیں ہیں، اسی کی وجہ سے ہزاروں مسلمان مقروض ہو جاتے ہیں، ان ہی مسلمانوں میں کتنے ہیں جو کپڑوں کی تیاری میں اور دعوت میں اپنی استطاعت سے زیادہ کا اہتمام کرتے ہیں، باجے، گاجے، اور آتشبازی میں، رت جگے اور دکھاوے کی دوسری باتوں میں ہزاروں لاکھوں روپے برباد کر ڈالتے ہیں، مسلمان لڑکے والے عملاً اسی طرح اپنے لڑکوں کی تلک چڑھواتے ہیں جس طرح ہندوؤں میں رواج ہے، لیکن اگر ان سے کہا جائے کہ یہی روپیہ کسی کارِ خیر میں لگا دیں جس میں کوئی نام ونمود اور دکھاوا نہ ہو تو اتنا روپیہ تو درکنار اس کا سواں حصّہ بھی وہ دینے کے لئے تیار نہ ہوں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ رسم ورواج کی پابندی اور دکھاوے میں ان کی خواہشات

کی تسکین ہوتی ہے اور نام ونمود کی لذّت ملتی ہے، اس لئے وہ ہر پریشانی کو خوشی سے برداشت کرتے ہیں، لیکن کاش مسلمان یہ سوچتے کہ اپنی خواہشات کی تسکین اور نام ونمود کی موہوم لذت کے لئے وہ اپنے سر جو پریشانی مول لے رہے ہیں، اس کی وجہ سے وہ اپنی دنیا و آخرت بھی خراب کرتے ہیں اور معاشرے میں بھی ایک فتنۂ کبیر اور فساد عظیم کی بنیاد ڈال دیتے ہیں، ایک طرف مذکورہ ارشاداتِ نبوی پر غور فرمائیے جن میں رشتۂ نکاح کے انتخاب میں دین واخلاق کا لحاظ نہ کرنے کو فتنہ وفساد کا پیش خیمہ قرار دیا گیا ہے' اور کم خرچ رشتۂ نکاح کی ترغیب دی گئی ہے، دوسری طرف موجودہ معاشرتی فساد پر نظر ڈالئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ یہ سب ہمارے ہاتھوں کی کمائی ہے۔

بارات اور نوید

لڑکے والوں کی طرف سے جو اس وقت لڑکی کے گھر پر دھوم دھام سے بارات لے جانے کا رواج ہوگیا ہے وہ بالکل سنّت کے خلاف ہے اور اس میں سراسر ہندوؤں کی مشابہت ہے' اسی طرح شادی بیاہ کے موقع پر اعزّہ واقارب جو نوید کی نقد رقم اور کپڑے وغیرہ "چوک وماجا" کے نام سے دیتے ہیں، ان کی حیثیت حقیقت میں قرض کی ہوتی ہے، تحفہ کی نہیں۔ تحفہ کی حیثیت ہوتی تو اگر دوسرا آدمی نوید وغیرہ نہ کرتا تو اس کی شکایت نہ ہوتی، لیکن یہ سب بدلہ کی غرض سے دیا اور لیا جاتا ہے' اسی لئے اس کا لوٹانا ضروری سمجھا جاتا ہے، خاص طور پر عورتیں تو اپنے قریبی اعزّہ واقارب کے یہاں بغیر نوید یا سلامی یا کوئی چیز لئے ہوتے جا ہی نہیں سکتیں، یہ سراسر رسم ورواج ہے' اس میں ہدیہ وتحفہ کا کوئی جذبہ سرے سے نہیں ہوتا، اس لئے یہ سب لینا دینا درست نہیں۔

شادی میں گانا بجانا

بعض حدیثوں سے شادی بیاہ کے موقع پر دف بجانے اور اچھے اشعار پڑھنے کا ثبوت ہے' مگر جس طرح عورتیں عہدِ نبوی میں مسجدوں میں جایا کرتی تھیں مگر بعد میں صحابہؓ نے فتنہ کے ڈر سے ان کا جانا بند کر دیا، حضرت عائشہؓ خود فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر حیات ہوتے تو وہ اس وقت جو حالات ہوگئے ہیں، ان کی بنا پر ان کا مسجدوں میں جانا بند کر دیتے، بالکل اسی طرح اس وقت گانا بجانا جس طرح زندگی میں داخل ہوگیا ہے، اس کی بنا پر اس سے پرہیز کرنا انتہائی ضروری ہے، عمومی طور پر فقہاء نے

گانے بجانے کو حرام قرار دیا ہے، مگر شادی کے موقع پر دف بجانے اور گا کر اشعار پڑھنے کی اجازت ہے، لیکن فتنہ کے خوف سے اس کو بھی عمومی حکم میں داخل کرنا زیادہ مناسب ہے، اور اب دف کون بجاتا ہے، اب تو ریکارڈنگ ہوتی ہے وہ بھی لاؤڈ اسپیکر لگا کر۔ یوں لڑکی کی رخصتی یا مبارکباد کے اشعار پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، مگر سہرے میں جو مبالغہ آمیز اشعار پڑھے جاتے ہیں، وہ تو سراسر لغویات کا مجموعہ ہوتے ہیں، اس لئے اس سے گریز کرنا چاہیئے، پھر سہرا باندھنا خود سنت کے خلاف ہے تو سہرا پڑھنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

شادی کے موقع پر جہیز

شادی بیاہ کے موقع پر لڑکی اور لڑکے کو ضروریاتِ زندگی کی چیزیں دی جا سکتی ہیں، مگر موجودہ دور میں مسلمانوں کے اندر قیمتی جہیز دینے کا جو رواج ہو گیا ہے، اس نے نہ صرف لڑکیوں کی شادی میں دقتیں پیدا کر دی ہیں، بلکہ معاشرہ کا مزاج اتنا بگڑ گیا ہے کہ اب اس نے بالکل ہندوؤں کے تلک اور مطالبہ کی شکل اختیار کر لی ہے اس لئے اس میں سخت تبدیلی کی ضرورت ہے، جہیز میں وہ سامان دیئے جائیں جو متوسط زندگی میں استعمال کے لئے ضروری ہوں، اس سے زائد اسراف بے جا اور نمود و نمائش ہے، قیمتی جہیز یا اسکے مطالبہ کا کوئی ثبوت عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ بلکہ بہت بعد تک میں نہیں تھا، یہ چیز زمینداری اور ہندوؤں کے اثر سے پیدا ہوئی ہے، اس لئے اس سے سخت پرہیز کی ضرورت ہے، یہ معاشرہ کے لئے ایک فتنہ کی چیز بن گئی ہے۔

شادی کے موقع پر لڑکی والا جہیز میں جو سامان دیتا ہے، وہ سامان لڑکی کی ملکیت ہوتا ہے، یا لڑکے کی ملکیت؟ یہ سوال عموماً اس وقت پیدا ہوتا ہے جب میاں بیوی میں اختلاف اور علاحدگی کی نوبت آتی ہے، اور عام طور پر دونوں طرف سے اپنے اپنے سامانوں کا مطالبہ ہوتا ہے، اور اب عرف یہی ہو گیا ہے۔

فقہ کی بعض جزئیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ لڑکی والا جو استعمالی یا غیر استعمالی سامان جہیز میں دیتا ہے، وہ اپنی لڑکی کو دیتا ہے، البتہ ان سامانوں کی نوعیت جدا ہوتی ہے، جو خالص روزمرہ کے استعمال کے لئے ہوتا ہے، وہ لڑکی والا اپنے داماد کو دیتا ہے، مثلاً کپڑا، گھڑی وغیرہ، اسی طرح زیور وغیرہ جو خالص عورتوں کے استعمال کی چیزیں ہیں، وہ باپ ماں اپنی

لڑکی کو دیتے ہیں، البتہ اس میں قیمتی سامان کا مسئلہ پیچیدہ ہے، جیسے سائیکل، موٹر سائیکل، اسکوٹر، کار یا قیمتی فرنیچر وغیرہ، ان میں سے کچھ چیزیں عام طور پر شوہر استعمال کرتا ہے، اور کچھ چیزیں مشترکہ استعمال کی ہوتی ہیں، اور کچھ صرف لڑکی کے استعمال کی ہوتی ہیں، راقم الحروف کے خیال میں لڑکے کے استعمال سے وہ چیزیں اس کی ملکیت نہیں ہو جائیں گی، بلکہ وہ بدستور لڑکی کی ملکیت رہیں گی، لڑکے والوں کو علیحدگی کی صورت میں ان سامانوں کو روکنے کا کوئی حق نہیں ہے، الا یہ کہ ان میں سے کچھ چیزیں استعمال سے خراب ہوں تو ان کا مطالبہ لڑکی والوں کو نہیں کرنا چاہیے، اسی طرح لڑکے والے لڑکی کو کچھ استعمالی کپڑے، گھڑی وغیرہ دیتے ہیں اس میں بھی وہی صورت ہے، غرض یہ کہ ہر وقت کے استعمال کے کپڑے اور گھڑی وغیرہ کا مطالبہ نہ تو شوہر کو بیوی سے کرنا چاہیے اور نہ بیوی کو شوہر سے، البتہ جس طرح مشترکہ استعمال کے سامان یا قیمتی سامان لڑکی کی ملکیت سمجھے جائیں گے، اسی طرح لڑکے والوں کو قیمتی کپڑے بشرطیکہ وہ محفوظ ہوں اور زیور وغیرہ واپس لینے کا حق ہے، اسی طرح شوہر کے استعمال کی معمولی چیزیں یا جو چیزیں خراب ہو چکی ہیں ان کی واپسی نہیں ہونی چاہیے، مگر قیمتی سامان یا جو چیزیں محفوظ ہوں وہ سب واپس لینے کا لڑکی یا اس کے گھر والوں کو حق ہے مگر وہ اسی حالت میں واپس ہوں گی جس حالت میں اس وقت وہ موجود ہیں، مثلاً اسکوٹر لڑکے نے کچھ دن استعمال کیا اور پھر علیحدگی کی نوبت آ گئی تو اسی حالت میں اسے واپس لے لینا چاہیے، نئے اسکوٹر یا سائیکل کا مطالبہ صحیح نہیں ہے، فتاویٰ عالمگیری کی اس عبارت سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے:-

امرأۃ دفعت متاعًا لها الی الزوج وقالت این را فروش و درکتخدائی خرچ کن ففعل هل علیه قیمته لها نعم کذا فی فتاوی الخجندی	ایک عورت نے شوہر کو کچھ سامان دیا، اور کہا کہ اسے فروخت کر کے اس کی قیمت شادی میں خرچ کرو، اس نے ایسا ہی کیا تو کیا تو کیا یہ عورت کے روپے مرد کے ذمہ باقی

رہیں گے؟ ہاں ایسا ہی ہے، فتاوی خجندی میں اسی طرح فتویٰ دینے کا حکم ہے" (عالمگیری ج ۲ ص ۳۲۷)۔

اس عبارت سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔ وکذا یسترد ما بعث هدیة وهو قائم دون الهالك (فتاوی محمودیہ ج ۳)

مسنون طریقۂ نکاح

اب ہم مسنون طریقۂ نکاح کی پوری تفصیل بیان کرتے ہیں، اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

شادی کا پیغام دینا

منگنی یا شادی کی نسبت لگانے کو عربی میں خِطبہ کہتے ہیں، شریعت نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ جس عورت سے کسی مرد کی یا جس مرد سے کسی عورت کی نسبت لگائی جا رہی ہے، ان کی شکل وصورت، مال و دولت، خاندان اور دین و اخلاق کے بارے میں ان کے سرپرست یا خود لڑکے لڑکی معلومات فراہم کرلیں، تاکہ بعد میں افسوس نہ ہو یا ان چیزوں کا اثر تعلقات پر نہ پڑے، لڑکوں کے بارے میں تو معلومات حاصل کرنا آسان ہے، مگر لڑکیوں کے بارے میں البتہ معلومات فراہم کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے، اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ چند عورتوں کو بھیج کر ان کی صورت وسیرت کے بارے میں دریافت کر لیا جائے، مگر یہ خیال رہنا چاہیئے کہ اصل ترجیح کا سبب شکل وصورت مال و دولت کو نہیں، دین و اخلاق کو بنانا چاہیئے، اگر دین و اخلاق کے ساتھ شکل وصورت بھی جمع ہو جائے یعنی ایک طرف دین و اخلاق سے عاری حسین وجمیل یا صاحب مال و دولت لڑکا یا لڑکی ہو، اور دوسری طرف ایک غریب اور معمولی شکل وصورت کی لڑکی یا لڑکا ہو تو جو دین و اخلاق میں بڑھا ہوا ہو اسی کو ترجیح دینا چاہیئے گو کہ قانوناً دین و اخلاق سے عاری لڑکوں یا لڑکیوں سے شادی کرنا منع نہیں ہے، مگر چونکہ دین اخلاق کے حامل ہی لڑکے یا لڑکی ایک اچھے خاندان کو وجود میں لاسکتے ہیں، اس لئے ایک مسلمان کے ایمان و اسلام کا اخلاقی تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنی ذاتی ونفسانی خواہشات کے مقابلے میں اجتماعی صلاح وفلاح کو سامنے رکھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ چار صفات میں سے کسی نہ کسی صفت کی بنا پر ایک مرد کسی عورت سے نکاح کرتا ہے، ایک تو اس کے حسن وجمال کی وجہ سے، دوسرے مال و دولت کی وجہ سے، تیسرے اس کی خاندانی وجاہت کی وجہ سے، چوتھے اس کے دین داخلاق کی وجہ سے، لیکن آخر میں آپ نے متعدد صحابہ سے یہی فرمایا کہ:۔

فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ۔ (بخاری ومسلم)

تم دیندار وبا اخلاق عورت کا انتخاب کرکے کامیابی حاصل کرو (ورنہ تم بھلائی سے محروم رہوگے)

آپ نے دین دار عورت کے انتخاب کے سلسلے میں ظفر کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جس کے معنیٰ کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کے ہیں، اصل کامیابی حسن وجمال اور مال و دولت کی عارضی لذّت میں نہیں ہے، بلکہ دین واخلاق کی دائمی شیرینی میں ہے، اس کے خلاف کرنے والا گویا رشتۂ نکاح کی حقیقی کامیابی اور بھلائی سے خود بھی محروم ہو گا، اور معاشرے کو بھی محروم کرے گا چنانچہ تَرِبَتْ يَدَاكَ کی تشریح میں علماء نے لکھا ہے صِرْتَ مَحْرُوْمًا فِي الْخَيْرِ تو بھلائی سے محروم رہے گا۔

آپؐ نے فرمایا کہ پوری دنیا دولت مستعجل ہے اور اس کی ہر چیز میں ایک عارضی اور زائل ہو جانے والی لذت ہے، لیکن اس عارضی اور زائل ہونے والی چیزوں میں سب سے بہتر چیز نیک و صالح بیوی ہے۔ اَلدُّنْيَا كُلُّهَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ۔

آپؐ نے عرب کی تمام عورتوں میں قریش کی عورتوں کو سب سے بہتر قرار دیا ہے لیکن اس کی وجہ خاندانی وجاہت، مال و دولت اور حسن وجمال نہیں ہے، بلکہ آپ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی:-

اَحْنَاهُ عَلٰى وَلَدِهٖ فِىْ صِغَرِهٖ وَ	وہ چھوٹے بچوں پر شفیق ہوتی ہیں، اور
اَرْعَاهُ عَلٰى زَوْجٍ فِىْ ذَاتِ يَدِهٖ۔	شوہر کی ہر چیز کی حفاظت کرتی ہیں۔

(بخاری ومسلم)

قرآن میں کہا گیا ہے کہ اگر صالح اور نیک غلام و لونڈی بھی مل جائیں تو ان سے اپنے لڑکے اور لڑکیوں کا نکاح کرنے میں تکلف نہ کرو اور نہ یہ خیال کرو کہ وہ قلاّش اور مفلس ہیں، "اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ"۔ نہ تو مال و دولت دائمی چیز ہے اور نہ فقر و فاقہ۔ خدا تعالیٰ اپنے فضل سے جب چاہے ایک مفلس کو غنی و مالدار بنا سکتا ہے اس لئے یہ چیز رشتۂ نکاح قائم کرنے میں مانع نہ ہونی چاہیئے۔

صحیح رائے دینا نیکی کا کام ہے

اگر کوئی شخص کسی لڑکے یا لڑکی کے بارے میں کسی سے مشورہ کرتا ہے تو جس سے مشورہ کیا جا رہا ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ لڑکے یا لڑکی کے بارے میں صحیح صحیح معلومات فراہم کرے، اس میں

کوتاہی نہ کرے، حدیث میں ہے:۔

اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ — جس سے مشورہ کیا جاتا ہے، وہ امین ہوتا ہے۔ (الادب المفرد)

یعنی جس طرح امین امانت کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو اصلی حالت میں مالک کے پاس پہونچا دیتا ہے، اسی طرح جس سے مشورہ کیا جائے وہ صحیح صحیح مشورہ بھی دے، اور اگر راز دارانہ مشورہ ہو تو اس راز کی حفاظت بھی کرے، اگر لڑکے یا لڑکی میں کوئی عیب و ہنر ہو تو اسے صاف صاف ظاہر کر دے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ شادی کے سلسلے میں جس سے مشورہ کیا جائے وہ اگر اس لڑکے یا لڑکی کے واقعی عیوب کی پردہ دری کرے گا تو یہ چیز غیبت نہیں کہی جائے گی۔

پیغام پر پیغام دینا جائز نہیں

اگر ایک مسلمان اپنی یا اپنے لڑکے کی نسبت کی بات چیت کہیں کر رہا ہے تو جب تک وہ جواب نہ دے، دوسرے کسی مسلمان کو اس جگہ پیغام نہ دینا چاہیئے، اسی طرح اگر کسی لڑکے سے کسی لڑکی کی نسبت طے ہو رہی ہے تو جب تک اس کی بات چیت ختم نہ ہو جائے، دوسرے کسی لڑکے والے کو یہ نہ چاہیئے کہ وہ بیچ میں کود پڑے، اور اس کو کاٹ کر اپنے لڑکے کے لئے پیغام دے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

لَا يَخْطُبُ الرَّجُلُ عَلٰى خِطْبَةِ اَخِيْهِ حَتّٰى يَنْكِحَ اَوْ يَتْرُكَ۔ (بخاری)

ایک آدمی اپنے کسی بھائی کے پیغام پر اسوقت تک پیغام نہ دے یہاں تک کہ وہ نکاح کرلے یا اس کی بات چیت ختم ہو جائے۔

نسبت لگانے کے سلسلے میں انتہائی سادگی کا خیال رہنا چاہیئے، خواہ مخواہ نسبت لگانے میں فضول خرچی نہ کرنی چاہیئے، نسبت کے طے کرنے کے سلسلے میں جو منگنی بڑے کی رسم مسلمانوں میں رواج پا گئی ہے، اس کی پابندی میں ان کا دنیاوی نقصان بھی ہے، اور آخرت میں بھی ان کو اس کا عذاب بھگتنا پڑے گا، مثلاً بات چیت طے ہونے کے بعد منگنی کی رسم ادا کی جاتی ہے یعنی لڑکے والے مٹھائی بھیجتے ہیں، اور لڑکی والے اس کے بدلے میں کچھ سبزی پھل اور نقد روپے دیتے ہیں، یہ رسم عموماً یو۔پی کے مشرقی اضلاع میں رائج ہے، دوسری جگہوں پر دوسری قسم کی

رسمیں جاری ہیں، ان میں بعض مکروہ تنزیہی، بعض مکروہ تحریمی اور بعض حرام ہیں۔

موجودہ دور میں جدید تعلیم کے اثر نے مسلم نوجوانوں اور ان کے والدین کا مزاج ایسا بگاڑ دیا ہے کہ جس طرح ہندوؤں میں تلک چڑھانے کا رواج ہے، اسی طرح مسلمان بھی لڑکی والے سے باقاعدہ روپے پیسے یا جائداد اور جہیز کا معاملہ کرتے ہیں، غور فرمائیے کہ اسوۂ نبوی سے تو یہ ثابت ہے کہ مال و دولت دیکھ کر تم شادی نہ کرو، بلکہ دین و اخلاق دیکھ کر شادی کرو، ورنہ فتنہ وفساد برپا ہوگا، اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس فتنہ وفساد کے منبع و ماخذ ہی کو معیارِ انتخاب بنائے ہوئے ہیں، لڑکوں کی طرف سے اس سے بڑھ کر زیادتی تو یہ ہے کہ جس لڑکے نے ایک بی، اے یا ایم، اے کی ڈگری حاصل کرلی یا ایک الٹی سیدھی خدمت گاری (ملازمت) اس کو مل گئی، اس کا دماغ اتنا خراب ہو جاتا ہے کہ وہ اب لڑکی کے بارے میں بھی یہی خواہش رکھتا ہے کہ وہ بھی دین و اخلاق کی تمام حدیں پھاند کر اسی کی طرح بی، اے یا ایم، اے ہو جائے، اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ مسلمان عورتیں جن کی وجہ سے دین و مذہب کی تعلیم اور اسلامی اخلاق وکردار کی جو تھوڑی بہت قدریں محفوظ رہ گئی تھیں وہ بھی رخصت ہونے لگی ہیں کیونکہ اب دیندار مسلمان تک اپنی لڑکیوں کو دینی تعلیم اور اسلامی تربیت دینے کے بجائے انگریزی، ہندی تعلیم و تربیت دے رہے ہیں یا وہ دینے پر مجبور ہیں، اگر کچھ دن یہی صورت رہی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی پوری ہو کر رہے گی، کہ معاشرہ فتنہ وفساد سے بھر جائے گا بلکہ یہ کسی قدر پوری ہو رہی ہے۔

جو لوگ اونچی تعلیم ہی کو لڑکی کے انتخاب کے لئے معیار سمجھتے ہیں، وہ غالباً دو وجہ سے ایسا چاہتے ہیں، ایک تو اس لئے کہ عورت بھی ملازمت وغیرہ کر کے ان کی معاشی ذمہ داری کے بار کو ہلکا کردے ایسے لوگ تھوڑے ہیں، دوسرے اس لئے ایسا چاہتے ہیں کہ ان کے علمی ذوق کی تسکین کے لئے ضروری ہے کہ بیوی بھی ان کی ہم مذاق ہو، اس میں شک نہیں کہ ان دونوں خواہشوں کے پورے ہو جانے میں کچھ مادی فائدے بھی حاصل ہو جاتے ہوں گے اور ایسی خواہش رکھنے والوں کے جذبات کی کچھ نہ کچھ تسکین بھی ہو جاتی ہوگی۔ لیکن اس تھوڑے مادی فائدے اور ایک عارضی تسکین کے جذبات میں جو بے شمار اخلاقی معاشرتی نقصانات

اور گھریلو بے اطمینانیاں پوشیدہ ہیں، ان کی موجودگی میں نہ تو کوئی اچھا خاندان ہی وجود میں آسکتا ہے، اور نہ قرآن کی زبان میں داخلی طور پر میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے "لباس" یعنی وجہ سکون بن سکتے ہیں، غور کیجئے کہ جو عورت اور مرد دن بھر دفتر یا کارخانہ میں رہیں گے اور دونوں شام کے وقت تھک کر گھر آئیں گے، تو دونوں یا تو نوکر کے ذریعہ اپنے چائے، پانی اور کھانے کا انتظام کرائیں گے، یا پھر عورت کے ذمے یہ کام بھی ہوگا، دوسری صورت میں عورت پر بھی ظلم ہوگا اور مرد پر بھی، عورت پر اس لئے کہ مرد اگر دن بھر کام کرنے کے بعد تھک سکتا ہے، تو عورت جو فطرتاً مرد سے زیادہ کمزور ہوتی ہے اور زیادہ تھک جائے گی، اور جب وہ تھکی ہوئی ہوگی تو اس وقت اس سے دوسرا کام لینا اس کے اوپر ظلم ہے، اور مرد کے اوپر ظلم یہ ہے کہ دفتر اور گھر دونوں جگہوں میں پسی ہوئی عورت ایک طرف تو مرد کے لئے سکون و آرام کا سامان نہ بن سکے گی، دوسری طرف بہت جلد اس کی صحت بھی جواب دے دے گی، پھر بچوں کی تربیت اور حمل کی حالت میں خود اس کی دیکھ بھال اور آرام و سکون وغیرہ کا معاملہ بہت ہی اہم ہے، روس میں حاملہ عورت کو صرف تین مہینے کی چھٹی ملتی ہے، غور کیجئے کہ ایک حاملہ عورت جس کے لئے کم سے کم تین مہینے ولادت سے پہلے اور دو مہینے ولادت کے بعد آرام انتہائی ضروری ہے، اس کے اوپر یہ کتنا بڑا ظلم ہے، پھر عفت و عصمت کا جو معیار اسلام نے قائم کیا ہے، وہ اس صورت میں کبھی بھی قائم نہیں رہ سکتا، اور کرایے کی تربیت سے بچوں کے اندر وہ اخلاقی صفات مثلاً ہمدردی، لحاظ پاس، اور خاندانی تعلقات کے جذبات کا احترام کیسے پیدا ہوسکتا ہے، جو ماں کی گود میں بغیر کسی محنت و مشقت کے پیدا ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ ان دونوں خواہشوں کو موجودہ طریقے پر پورا کرنے میں غیر معمولی معاشرتی اور اخلاقی نقصانات ہیں، جہاں تک معاشی فائدے کا تعلق ہے، جائز حدود میں عورت کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے، اسلامی شریعت اس سے بالکلیہ نہیں روکتی، مگر اس کے ساتھ دو باتیں ذہن نشین کرلینی ضروری ہیں، ایک یہ کہ اسلامی شریعت معاش کی اصل ذمہ داری مرد کے کاندھے پر رکھتی ہے، اس لئے مرد کو اس ذمہ داری سے بھاگنا یا اپنے تعیشات کی تکمیل کے لئے ایسا کرنا انتہائی شرمناک بات ہے، دوسرے یہ کہ عورت کے ذریعے

معاشی فائدے گھر کے اندر رکھ کر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ غلط قسم کی عزت و شرافت کو آڑ نہ بنایا جائے، موجودہ دور میں گھریلو صنعتوں کی اتنی بہتات ہو گئی ہے کہ اگر ان کو اپنایا جائے تو ان کے ذریعے معاشی فائدہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، اور عورت کو اور اپنے گھر کو ان نقصانات سے بھی بچایا جا سکتا ہے، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، جو مسلمان مرد عورتوں کو اپنے جذبات کی تسکین کے لئے گھر سے باہر نکالنا اور جدید تعلیم سے آراستہ دیکھنا چاہتے ہیں، انھیں ان قوموں سے سبق لینا چاہیئے، جنھوں نے عورتوں کو گھروں سے نکال کر اسکول و کالج میں داخل کیا اور دفتر و سیاست کی کرسی پر بٹھایا تو اس غیر فطری کوشش کے نتائج ان کے سامنے کیا ظاہر ہو رہے ہیں، ان ممالک میں جرائم کی کثرت دیکھ کر بڑے بڑے روشن دماغ اب عورتوں کے مسئلے پر اس حیثیت سے غور کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ان کا دائرۂ عمل گھر ہونا چاہیئے، یا دفتر و سیاست کا وسیع میدان۔ یہاں صرف اس مسئلے کی طرف اشارہ کر کے اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ تفصیل کا موقع نہیں ہے، ورنہ بیسیوں دلائل اور واقعات سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ عورتوں کو گھر کی مالکہ بنانے کے بجائے جن لوگوں نے ان کو گھر کے باہر کے اجتماعی کاموں میں لگانے کی کوشش کی ہے انھوں نے اجتماعی طور پر اس کا کچھ اچھا اور میٹھا پھل نہیں کھایا ہے[1]

نسبت کے بعد

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ نسبت کے طے کرنے میں اہتمام کرنا، شرائط لگانا انتہائی ناپسندیدہ بات ہے، بلکہ اس مرحلے کو نہایت سادگی، اور بغیر کسی خرچ اور شرائط کے طے کرنا چاہیئے، اسلامی شریعت نے مردوں اور عورتوں کے جو حقوق و فرائض مقرر کئے ہیں وہ خود ہی اتنے کافی ہیں، اور انسانی فطرت کے اتنے مطابق ہیں کہ ان کے بعد مزید کسی شرط کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، ان حقوق و فرائض کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

غرض یہ کہ نسبت طے ہو جانے کے بعد فوراً کوئی تاریخ یا وقت نکاح کے لئے مقرر کر دینا چاہیئے، اور پھر تاریخ یا وقت پر دونوں کا نکاح نہایت ہی سادگی کے ساتھ کر دینا چاہیئے۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے راقم الحروف کا کتابچہ "عورت و انتظام"۔

نکاح کا موجودہ طریقہ

نکاح پڑھانے کے لئے لڑکی کے گھر پر بارات لے جانے کی جو رسم ہے وہ بھی ایک غیر اسلامی اور انتہائی بری رسم ہے، یہ رسم بھی ہندوستان کے مسلمانوں میں ہندوؤں کے اثر سے آئی ہے، پھر اس کے ساتھ نوشے کو عمدہ سے عمدہ لباس پہنا کر، سہرا وغیرہ باندھ کر کسی سواری پر سوار کر کے لڑکی کے دروازے پر لے جاتے ہیں، خواہ لڑکے اور لڑکی کا گھر ایک جگہ یا ایک ہی محلّہ میں کیوں نہ ہو، یہ تمام رسمیں انتہائی غلط، فضول اور مکروہ ہیں، اسی طرح اس موقع پر لڑکی والے لڑکے کے لئے اور لڑکے والے لڑکی کے لئے دو چار جوڑے کپڑے بنوانا انتہائی ضروری سمجھتے ہیں، اگر بغیر کسی دِقّت کے کپڑے اور سامان کا انتظام کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن رسماً ایسا کرنا گناہ ہے، بعض جگہ باجا گاجا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ رسم مکروہ نہیں بلکہ حرام ہے، پھر نکاح کے وقت نوشے کے ہاتھ میں ایک سونے کی انگوٹھی بھی پہنائی جاتی ہے، مرد کے لئے سونے کا استعمال حرام ہے، اس لئے اس سے گریز کرنا چاہیئے۔

نکاح جس طرح لڑکی کے گھر پر ہو سکتا ہے، اسی طرح لڑکے کے گھر پر بھی ہو سکتا ہے، کسی ایک ہی صورت کو ضروری سمجھ لینا بھی غلط ہے۔ بلکہ سنّت یہ ہے کہ لڑکے کے گھر پر نکاح کیا جائے۔

اعلان

اوپر ذکر آچکا ہے کہ اگر کوئی بالغ عورت کسی بالغ مرد سے یا کوئی بالغ مرد کسی بالغ عورت سے دو گواہوں کی موجودگی میں اپنا نکاح خود پڑھا لے تو نکاح ہو جائے گا، نہ تو کسی وکیل یا قاضی کی ضرورت ہے اور نہ ولی کی، لیکن ایسا کرنا مناسب نہیں ہے، بلکہ جو نکاح کیا جائے، وہ اعلان کے ساتھ کیا جائے۔ یعنی نکاح، خفیہ یا دو چار آدمیوں کے سامنے نہ کیا جائے، بلکہ اس طرح کیا جائے کہ اس بستی یا محلّے کے زیادہ سے زیادہ لوگ اس کو جان جائیں، مگر اس کے لئے کھانے کی دعوت کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس اعلان کی صورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ یہ اختیار فرماتے تھے کہ کسی نماز کے بعد مسجد میں محلے کے نمازیوں کے سامنے یا جمعہ کے دن جامع مسجد میں پوری بستی کے لوگوں کے سامنے نکاح پڑھا دیا کرتے تھے، اس صورت میں اعلان بھی ہو جاتا تھا، اور وہ بے جا اہتمام کی زحمت سے بھی بچ جاتے تھے، آپؐ نے فرمایا ہے:۔

"نکاح اعلان کرکے کرو اور اس کی بہترین جگہ مسجد ہے"۔ (ترمذی)

اس اعلان کی غرض یہ ہے کہ مرد اور عورت کے ہر قسم کے خفیہ تعلقات کی جڑ کٹ جائے، آپ نے اسی لئے اس موقع پر دَف بجانے اور لڑکیوں کو بغیر ڈھول باجے کے اچھے اور پاکیزہ اشعار گانے کی بھی اجازت دی ہے۔

دَف وہ باجا ہے جس کے ایک طرف چلنی کی طرح چمڑا منڈھا ہوا ہو اور دوسری طرف کا حصّہ کھلا ہوا ہوتا ہے، یعنی ایسا باجا ہے، جس سے صرف اعلان ہو جاتا ہے، اس کے ذریعہ نہ تو سماعت کو کوئی لذّت ملتی ہے، اور نہ برے جذبات آدمی کے دماغ میں پرورش پاتے ہیں۔

لڑکیوں کے گانے میں بھی یہی بات آپ نے ملحوظ رکھی ہے، ایک بار شادی کے موقع پر کچھ لڑکیاں غزوۂ بدر کے شہداء کے مرثیے گا رہی تھیں ان ہی میں سے ایک لڑکی نے یہ مصرع پڑھا وَفِینَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ ہمارے درمیان ایک نبی ہے جو کل کی بات جانتا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ پہلے جو اشعار گا رہی تھیں وہی گاؤ، مقصد یہ تھا کہ ایسے اشعار پڑھو جس سے جذبۂ جہاد یا جذبۂ عمل تازہ ہو، بے مقصد یا بے فائدہ اشعار پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

غور کیجئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف اظہار خوشی کا موقع بھی دیا ہے، دوسری طرف اس کے حدود بھی بتا دیئے ہیں۔

نکاح کے لئے بلاوا اپنے یا اپنے لڑکے کے نکاح کے موقع پر اپنے قریبی اعزّا اور دوستوں کو بلا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کے نکاح کے موقع پر حضرت انسؓ کو بھیجا کہ جاؤ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، زبیرؓ اور انصارؓ کے کچھ لوگوں کو بلا لاؤ۔ جب یہ لوگ آگئے تو آپؐ نے ان کے سامنے حضرت فاطمہ کا نکاح حضرت علیؓ سے کیا، لیکن بلاوے کو ضروری سمجھنا اور اس کے لئے بے جا زحمت اٹھانا انتہائی غلط اور ناپسندیدہ ہے، آپ نے جس سادگی اور زحمت کے بغیر لوگوں کو بلایا اور نکاح کر دیا اسی طرح کرنا چاہیئے، لیکن موجودہ زمانے میں تو جو بلاتا ہے وہ بھی اپنے آپ کو سخت زحمت میں ڈال کر بلاتا ہے اور جو لوگ بلائے جاتے ہیں وہ بھی شدید زحمت میں مبتلا ہوتے ہیں، کیوں کہ بلانے والے کے لئے بھی کچھ کرنا ضروری ہوتا ہے اور آنے والوں کے لئے بھی کچھ کرنا ضروری ہوتا ہے،

اگر کوئی بغیر کچھ خرچ کیے چلا جائے تو سخت شکایت ہوتی ہے، یہ انتہائی غلط رسم اور غریب اعزہ پر ایک بہت بڑا ظلم ہے۔

اجازت ولی کو خود لینی چاہیے

نکاح پڑھاتے وقت بہتر یہ ہے کہ اگر لڑکی بالغ ہے، تو اس کا ولی خود اس سے دو گواہوں کے سامنے ان الفاظ کے ساتھ اجازت لے کہ "میں تمہارا نکاح فلاں لڑکے سے اتنے مہر معجل یا موجل پر پڑھانا چاہتا ہوں، تم اجازت دیتی ہو یا تم نے اجازت دی"، لڑکے کا محض نام لینے سے اگر لڑکی اچھی طرح اس کو نہ سمجھ سکے، تو اس کے باپ کا نام اور پورا پتہ اور خاندان بتا کر تعارف کرا دینا چاہیے، تاکہ لڑکی اچھی طرح سمجھ لے کہ کون اور کیسا آدمی ہے، اگر ولی نے بالغ لڑکی سے اجازت لی ہے، تو اگر لڑکی کنواری ہے تو اس کی خاموشی یا آنسو بہا دینا، یا ہاں، ہوں کر دینا اجازت سمجھی جائیگی، لیکن اگر اس کی ایک شادی بلوغ کی حالت میں پہلے ہو چکی ہے تو پھر اس کو صاف الفاظ میں کہہ دینا چاہیئے کہ مجھے منظور ہے، میں اجازت دیتی ہوں، اگر لڑکی نابالغ ہے تو پھر ولی کو اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے، ولی خود اپنی صواب دید سے نکاح پڑھا دے۔

وکیل کی اجازت

(۱) اگر ولی خود اجازت نہ لینے جائے، بلکہ وہ کسی آدمی کو وکیل بنا کر بھیجے کہ تم اجازت لے کر نکاح پڑھا دو تو وکیل کو بھی دو گواہوں کے سامنے انہی مذکورہ الفاظ کے ساتھ اجازت لینی چاہیئے جن سے ولی نے لی ہے، البتہ جب وکیل اجازت لے تو بالغ لڑکی کو صاف صاف کہنا چاہیئے کہ مجھے یہ منظور ہے، صرف خاموشی یا رونا کافی نہیں ہے[1]، اگر اسے باپ نے بھیجا ہے تو خاموشی بھی رضا سمجھی جائے گی۔

(۲) اجازت کے الفاظ کو ولی یا وکیل کے ساتھ گواہوں کو بھی سننا چاہیئے۔

ضروری ہدایت

اجازت کے وقت عورتیں وہاں موجود رہتی ہیں، بعض وقت ان میں سے کوئی کہہ دیتا ہے کہ ہاں منظور ہے یا یوں ہی شور کر دیتی ہیں، لڑکی نے ہاں کر دی ایسا کرنا صحیح نہیں ہے، اس سے نکاح نہیں ہوتا۔ اس میں شرم کی بات

---

[1] ولو استاذن غیر ولی اقرب فرضاها بالقول (شرح وقایہ، ج ۲ ص ۲۲)

نہیں ہے، صراحتاً لڑکی کو اجازت دینی چاہیئے، یا انکار کر دینا چاہیئے، یہ دو چار دن کا نہیں اس کی پوری زندگی کا معاملہ ہوتا ہے۔

یہ تو اس صورت میں ہے، جب لڑکی سے پہلے اجازت لی جائے، لیکن اگر کہیں ایسی صورت ہو کہ پہلے لڑکے سے اجازت لینی پڑے، یعنی ایجاب پہلے لڑکے سے کرایا جائے اور قبول لڑکی سے۔ تو اس صورت میں لڑکے سے صریح الفاظ کے ساتھ اجازت لینی ضروری ہے، اس کی خاموشی کا کوئی اعتبار نہیں ہے، خواہ اس کا باپ ہی کیوں نہ اس سے اجازت لے، البتہ اگر لڑکا نابالغ اور ناسمجھ ہے تو صرف ولی کی اجازت کافی ہے۔

قبول اب جس طرح دو گواہوں کے سامنے اجازت لی گئی ہے، اسی طرح دو گواہوں کی موجودگی میں قبول بھی ہونا چاہیئے، قبول کا طریقہ یہ ہے کہ لڑکے یا لڑکی سے یہ کہا جائے کہ میں فلاں لڑکے یا لڑکی کا نکاح اتنے مہر پر تمہارے ساتھ کر دیا، تم نے اسے قبول کیا، اب اس کے جواب میں بالغ لڑکے یا لڑکی کو صاف الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ میں نے قبول کیا، عام طور پر جو الفاظ مروّج ہیں ان کا کہنا بھی مناسب ہے، یعنی میں نے فلاں لڑکی یا لڑکے کو اتنے مہر پر تمہارے عقد نکاح میں دیا، تم نے قبول کیا؟ اب اس کے جواب میں وہ کہے کہ میں نے قبول کیا۔

عام طور پر دو تین بار لوگ ایجاب و قبول کراتے ہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ایک ہی بار کافی ہے۔

مہر کا ذکر کرتے وقت یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ یہ مہر معجّل ہے، یعنی فوراً ادا ہوگا، یا مؤجل ہے، یعنی بعد میں ادا ہوگا، اسی کے ساتھ سکّے کا بھی نام لینا چاہیئے کہ اتنے روپے یا اتنا زیور یا اتنے بھر چاندی، یا اتنے دینار، یا اتنے روبل، یا اتنے ڈالر ہوگا۔

ایجاب و قبول لڑکی یا لڑکے میں سے جس سے پہلے اجازت لی جائے اس کو ایجاب کہتے ہیں اور جس سے بعد میں قبول کرایا جائے اسے قبول کہتے ہیں[1]، ان مسائل کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔

---

[1] الایجاب اول کلام احد المتعاقدین وکلام الآخر یترتب علیہ یسمی قبولا۔ (عمدۃ الرعایہ ص۴ ج۲)

آج سے کچھ برس پہلے عام طور پر ایجاب وقبول سے پہلے لڑکوں کو کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت پڑھا دیا جاتا تھا۔ اب یہ رواج بہت کم ہو گیا ہے لیکن میرے خیال میں اس نیک رواج کو باقی رکھنا چاہیئے، کیونکہ تعلیم کے عام ہو جانے کے باوجود مسلمان نوجوان توحید و رسالت کے تصوّر سے بالکل ناواقف ہوتے جا رہے ہیں، اس طرح اس مبارک موقع پر تجدید کلمہ کا موقع مل جائے گا، حدیث میں آتا ہے کہ کلمۂ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے ذریعے اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہو۔ اس حدیث نبوی پر عمل کرنے کا یہ بہت اچھا موقع ہوتا ہے، کیونکہ نکاح کے ذریعے میاں بیوی ایک نئی زندگی شروع کرتے ہیں، اس لئے زندگی کے اس نئے موڑ پر ایمان کی تجدید سے ان کی زندگی میں ایک تازگی پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ چیز دونوں کے تعلقات کی خوش گواری کا سبب بھی ہو سکتی ہے، اور نکاح کے بعد انھیں جس سمت جانا ہے اس کی نشان دہی بھی ہو جاتی ہے۔

خطبۂ نکاح اجازت کے بعد قبول سے پہلے یا قبول کے بعد کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر نکاح کا خطبہ دینا بھی سنّت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو خطبۂ نکاح دیا کرتے تھے وہ حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے، وہ یہ ہے:۔

اِنَّ الْحَمْدُ لِلّٰہِ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِیِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ (ترمذی، ابوداؤد)	ہر طرح کی تعریف اللہ کے لئے ہے اسی سے ہم مدد مانگتے ہیں اور اسی سے مغفرت چاہتے ہیں اور اپنے نفس کی تمام شرارتوں سے اور اپنے برے اعمال سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں جس کو اللہ ہدایت دے دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود اور مالک نہیں ہے۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے، اور اس کے رسول ہیں۔

اس کے ساتھ ہی قرآن کی یہ آیتیں بھی آپ تلاوت فرماتے تھے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ۔ (آل عمران)	اے ایمان والو! اللہ سے اس طرح ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں موت آئے تو ایمان و اسلام پر آئے۔
يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا۔ (نساء)	اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان (حضرت آدم) سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کی بیوی کو پیدا کیا اور ان دونوں کے ذریعے بے شمار مرد اور عورتوں کو پھیلایا اور اس اللہ کے احکام کا لحاظ و پاس رکھو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور ارحام

(رشتوں) کا خیال و پاس رکھو۔ بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے تمام کاموں کی نگرانی کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا۔ (احزاب)	اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور جب بات کرو تو سیدھی، سچّی اور معتدل بات کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال کو درست کر کے انھیں قبول کرلے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور جو اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت

کرے گا وہ بہت بڑی کامیابی سے ہم کنار ہوگا۔

اس کے بعد یہ حدیث نبوی بھی پڑھ لی جائے تو بہتر ہے:۔

اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي [1]	نکاح میری سنت ہے جو اس سے گریز کریگا وہ میرا امتی نہیں ہے۔

---

[1] ابن ماجہ یہ دو حدیثوں کے دو ٹکڑے ہیں جنھیں ایک کر دیا گیا ہے۔

اِنَّ اَعْظَمَ النِّکَاحِ بَرَکَۃً اَیْسَرُہٗ مَئُوْنَۃً۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

سب سے بابرکت نکاح وہ ہے جس میں کم پریشانی اور کم خرچ ہو۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ خطبہ پڑھنے کے بعد یذکر حاجتہ کچھ ضروری باتوں کا ذکر فرماتے تھے، یعنی موقع ومحل کے لحاظ سے مزید باتیں کہنی سنت ہے۔

قرآن کی ان چند آیات اور ارشادات نبوی کا نکاح کے موقع پر پڑھنا انتہائی برمحل ہے، کیونکہ ان میں اجمالی طور پر ان تمام حقوق و فرائض کو بیان کردیا گیا ہے، جو نکاح کے بعد ایک جوڑے کے اوپر اسلام ڈالتا ہے، اور ان سے ان کی ادائیگی کی توقع رکھتا ہے، جن کی کچھ تفصیل اوپر آچکی ہے اور کچھ آئے گی[1]

دُعا

اگر ایجاب وقبول سے پہلے خطبہ دیا گیا ہے، تو اس کے بعد ایجاب وقبول کرانا چاہیئے اور پھر دعا مانگنی چاہیئے، اور اگر ایجاب وقبول کے بعد خطبہ دیا گیا ہے، تو فوراً کھڑے کھڑے یا بیٹھ کر دعا مانگنی چاہیئے، نکاح کی دُعامیں دنیاوی ترقی اور بال بچے کی دعا کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا ہے، چنانچہ حضرت علیؓ کے بھائی حضرت عقیلؓ کی شادی ہوئی تو لوگوں نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا بِالرِّفَاءِ وَالْبَنِیْنَ" دونوں میں میل ملاپ رہے، اور بچّے والے ہوں۔ آپ نے سنا تو فرمایا کہ یہ دعا نہ دو، بلکہ یہ دُعادو:۔

اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَھُمْ وَبَارِكْ عَلَیْھِمْ۔ (ابوداؤد، ترمذی)

اے اللہ! ان کو برکت دے اور ان کے اوپر اپنا فضل فرما۔

آپ کا خود معمول تھا کہ آپ ان الفاظ سے شادی کرنے والے کو مبارکباد دیتے تھے، بَارَكَ اللّٰہُ لَكَ وَبَارَكَ عَلَیْكَ وَجَمَعَ بَیْنَکُمَا فِیْ خَیْرٍ (بخاری، مسلم) آپ کا آخری جملہ کہ دونوں کی یکجائی بھلائی میں اور بھلائی کے لئے ہو بڑی معنویت رکھتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شادی کے بعد مبارکباد دینی اور دعا کرنی سنّت ہے۔

---

[1] اس کی پوری تفصیل راقم الحروف نے خطبۂ نکاح والے کتابچہ میں کر دیا ہے۔

دعا کے بعد خُرما وغیرہ لٹانے کا دستور ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر مسجد میں اگر نکاح ہو تو مسجد کے آداب کا خیال رکھنا چاہیئے۔

دعوتِ ولیمہ

نکاح کے بعد لڑکی کی طرف سے تو کسی طرح کی دعوت وغیرہ کا اہتمام کرنا غیر مسنون طریقہ ہے، البتہ جو دو چار آدمی نکاح پڑھانے کی غرض سے جائیں، ان کی خاطر مدارت کر دینی چاہیئے، نہ تو عام لوگوں کو کھانے پر مدعو کرنا چاہیئے، اور نہ زیادہ بارات بلانا چاہیئے، البتّہ نکاح کی شرکت کے لئے لوگوں کو بُلایا جا سکتا ہے، مگر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ بلاوا بھی بغیر زحمت و تکلیف کے ہونا چاہیئے اس دستور کو اپنی سوسائٹی سے ختم کرنا بہت ہی ضروری ہے، اس سے غریب آدمی سخت پریشانی میں پڑ جاتا ہے، اگر نہ بھی پڑے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے ایسا نہیں کیا ہے، تو پھر ہم کو بھی ان کی اطاعت و محبت میں ایسا نہ کرنا چاہیئے۔

البتہ نکاح کے بعد جب لڑکی لڑکے کے گھر یعنی سسرال رخصت ہو کر آجائے، تو اسی وقت یا دونوں میں جب مباشرت ہو جائے، اس وقت اپنی حیثیت کے مطابق دعوت کرنا اور لوگوں کو بلانا صحیح ہے، اس دعوت کو شریعت میں دعوتِ ولیمہ کہا جاتا ہے، دعوتِ ولیمہ سنّت ہے، مگر یہ دعوت اسی وقت سنّت رہے گی جب اپنی حیثیت کے مطابق ہو، اور اس کی وجہ سے دعوت کرنے والے یا اس کے بیوی بچوں کو تکلیف کا اندیشہ نہ ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد نکاح فرمائے، مگر صرف دو موقع پر یعنی حضرت زینبؓ اور حضرت صفیہؓ کے نکاح میں دعوتِ ولیمہ دی مگر اس دعوت میں کھانا کیا تھا وہ بھی ملاحظہ کر لیجئے، حضرت زینبؓ کی شادی میں آپؐ نے ایک بکری ذبح کر کے اس کا گوشت پکوایا اور سب کو کھلوایا، اور حضرت صفیہؓ کے نکاح میں ولیمہ کی کیفیت حضرت انسؓ کی زبانی سنئے جو اس ولیمہ کے داعی تھے، وہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ کے نکاح کے بعد آپ نے جو دعوتِ ولیمہ دی:-

مَا کَانَ فِیْھَا مِنْ خُبْزٍ وَّلَا لَحْمٍ	اس میں نہ تو روٹی تھی اور نہ گوشت تھا،
وَمَا کَانَ فِیْھَا اِلَّا اَنْ اَمَرَ بِالْاَنْطَاعِ	بلکہ اس میں یہ کیا گیا کہ چمڑے کے دسترخوان

فَبُسِطَتْ فَاُلْقِيَ عَلَيْهَا التَّمْرُ وَالْاَقِطُ وَالسَّمْنُ۔ (بخاری ومسلم)

بچھا دیئے گئے اور ان پر کھجوریں کچھ پنیر[1] اور کچھ گھی یا مسکہ رکھ دیا گیا اور لوگوں نے اسے کھایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ دعوتِ ولیمہ میں وہی ہونا چاہیئے جو آدمی کو آسانی سے میسر ہو جائے ایک صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی شادی ہوئی تو آپؐ نے فرمایا:۔

اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ (مشکوٰۃ) اگر ایک بکری ہو تو اسی کا ولیمہ کرو۔

مقصد یہ تھا کہ اس موقع پر اپنے اعزّہ واقارب اور احباب کی ضیافت کرنا مناسب ہے، لیکن جو کچھ موجود ہو بس اسی کی ضیافت ہونی چاہیئے، اگر تمہارے پاس ایک بکری ہو تو اسی کو ذبح کر کے اس کا گوشت لوگوں کو کھلا دو لیکن اس کے لئے خواہ مخواہ پریشانی اٹھانا نہ چاہیئے، اس وقت لوگوں کا حال یہ ہے کہ تحریری نوید میں ماحضر کی دعوت دیتے ہیں، لیکن وہ ماحضر نہیں ہوتا، بلکہ سراسر ماغاب ہوتا ہے، یعنی ایسی چیزیں اس کھانے میں ہوتی ہیں، جو اس بے چارے کو سال میں مشکل سے ایک دو دن نصیب ہوتی ہوں گی، اسی بنا پر آپؐ نے فرمایا ہے کہ رخصتی کے بعد پہلے دن ولیمہ سب سے بہتر ہے، دوسرے دن بھی کوئی مضائقہ نہیں، اور تیسرے دن کا ولیمہ صرف نام ونمود کے لئے ہے (ابوداؤد) مقصد یہ ہے کہ آدمی جتنی جلدی کرے گا کم اہتمام کرے گا، اور جتنی دیر لگائے گا اتنا ہی زیادہ اہتمام کرے گا، اور اس کا مقصد سوائے نام ونمود کے اور کیا ہو سکتا ہے، اور نام ونمود کی جو مذمت شریعت میں آئی ہے اس سے ہر مسلمان واقف ہے، نام ونمود یا اور دکھاوے سے بڑی سے بڑی عبادت ثواب کے بجائے عذاب کا سبب بن جاتی ہے۔

دعوتِ ولیمہ میں کن لوگوں کو بلانا چاہیئے

عام طور پر لوگ شادی بیاہ میں اپنے مالدار ممتاز اعزّہ واحباب، بڑے بڑے عہدے داروں، امراء اور ممتاز لوگوں کو بلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس میں

---

[1] پنیر اونٹ کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے، اور اس کا مزہ نمکین ہوتا ہے۔

اپنا ایک غیر معمولی اعزاز محسوس کرتے ہیں، اور غریب اعزّہ و احباب کو عام طور پر بلاتے نہیں، اور اگر کسی دباؤ، ضرورت یا لحاظ کی بنا پر شریک کر لیتے ہیں، یا وہ خود شریک ہو جاتے ہیں، تو ان کو ایک تکدر محسوس ہوتا ہے اور اپنے دامنِ اعزاز پر ان کی شرکت کو ایک داغ سمجھتے ہیں، اور جو لوگ عہدے داروں اور ممتاز لوگوں کو نہیں بلاتے یا نہیں بلا پاتے ان میں بھی اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جن کے دل میں یہ خواہش تو چٹکی لیتی رہتی ہے کہ کاش یہ یہ لوگ کسی وقت غریب خانے پر آجاتے مگر یہ بے چارے یا تو یہ سوچ کر نہیں بلاتے کہ انکی شایانِ شان خاطر مدارات وہ نہ کر سکیں گے یا یہ سوچتے ہیں کہ وہ آئیں گے نہیں مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو ان مواقع پر غیر متعلق ممتاز لوگوں کے بجائے اپنے غریب اعزّہ، احباب اور پڑوسیوں کو خوشی سے بلاتے ہوں اور ان کی شرکت سے ان کو خوشی بھی محسوس ہوتی ہو، ایک طرف مسلمانوں کے موجودہ طرزِ عمل کو ملاحظہ کیجئے اور دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو ملاحظہ کیجئے، آپ نے فرمایا:۔

شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ يُدْعىٰ لَهَا الْاَغْنِيَاءُ وَ يُتْرَكُ الْفُقَرَاءُ۔ (بخاری ومسلم)	سب سے ناپسندیدہ کھانا اس دعوتِ ولیمہ کا ہے جس میں مالدار لوگ بلائے جائیں اور غربا و محتاج چھوڑ دیئے جائیں۔

پھر آپؐ نے فرمایا کہ اس سے بھی بڑا جرم یہ ہے:۔

شَرُّ الطَّعَامِ الْوَلِيْمَةِ يُمْنَعُهَا مَنْ يَّأْتِيْهَا وَ يُدْعىٰ مَنْ يَّأْبَاهَا۔ (مسلم)	سب سے برا کھانا وہ ہے جس میں ان لوگوں کو تو روکا جائے جو آنا چاہتے ہوں اور ان لوگوں کو بلایا جائے جو آنے میں تکلیف محسوس کرتے ہوں یا آنا نہ چاہتے ہوں۔

دعوت میں شریک ہونا چاہیئے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص دعوت دے تو اس کی دعوت میں شریک ہونا چاہیئے، بشرطیکہ اس میں کوئی غیر اسلامی بات نہ ہو، آپ نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی کو دعوت دی اور اس نے اس کی دعوت رد کر دی تو اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی

کی، آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص نفل روزے سے ہو، اور کوئی اس کو بلائے، تو اس کو جانا چاہیئے، اور پھر جا کر کھانے سے معذرت کر دینی چاہیئے کہ میں روزے سے ہوں، امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے یہاں دعوتِ ولیمہ کرنا واجب ہے، اور امام شافعی فرضِ کفایہ اور امام احمد مستحب کہتے ہیں۔ (المغنی ج ۷، ص۲)

جہاں کوئی غیر اسلامی بات ہو

البتہ جس دعوت میں حرام افعال کا ارتکاب ہو رہا ہو، مثلاً باجا بج رہا ہو، یا ریکارڈنگ ہو رہی ہو، یا رقص و سرود ہو، یا کھانے میں کوئی حرام چیز مثلاً شراب رکھی ہوئی ہو، تو فوراً دعوت سے اٹھ جانا چاہیئے، اور اگر پہلے سے معلوم ہو تو جانا ہی نہ چاہیئے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے کی دعوت دی، آپ گھر کے اندر تشریف لائے، تو دیکھا کہ گھر کے پردے میں چند تصویریں ہیں، آپ اسی وقت واپس تشریف لے گئے اور کھانا تناول نہیں فرمایا۔ (ابن ماجہ)

آپ نے فرمایا کہ جو شخص توحید و آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس کو چاہیئے کہ وہ اس دعوت میں شرکت نہ کرے جس میں شراب کا دور چل رہا ہو۔ (مسند احمد)

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ شادی بیاہ کی تقریب میں یہی نہیں کہ آدمی کو خود اپنے گھر پر غیر اسلامی اور گناہ کی باتوں سے بچنا چاہیئے، بلکہ ایسی تقریبوں میں شریک بھی نہ ہونا چاہیئے، جن میں کوئی منکر یعنی غیر اسلامی کام ہو رہا ہو۔

ختنہ اور عقیقہ کی دعوت کا حکم

شادی کے علاوہ بھی اگر کوئی شخص اپنے احباب یا اعزّہ کو کھانے پر بلاتا ہے، یا ان کے پاس ہدیہ بھیجتا ہے تو اس سے آپس میں محبّت بڑھتی ہے، اس لئے ایسا کرنا چاہیئے، آپ نے فرمایا ہے کہ تَہَادَوْا تَحَابُّوْا "ہدیہ بھیجو اس سے محبّت بڑھے گی"۔

اسی طرح اگر لڑکے کے عقیقے یا ختنہ کے موقع پر بغیر کسی اہتمام کے بے تکلف اپنے اعزّہ و احباب اور پڑوسیوں کو کھانے کی دعوت دے دی جائے، تو کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن اگر اس کے لئے اپنے اعزّہ و احباب کو دور سے بلایا جائے اور وہ لوگ لڑکے کے لئے کپڑا

اور تحفہ وغیرہ لے آئیں، حجّام کی کٹوری میں روپیہ ڈالیں تو یہ سب باتیں خرافات اور سنّت کے سراسر خلاف ہیں۔ اسی بنا پر صحابہؓ عقیقہ وختنہ کی دعوتوں میں شرکت سے پرہیز کرتے تھے کہ کہیں یہ رواج نہ بن جاتے، حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن ابی العاصؓ کو ایک بار ایک ختنہ کی دعوت میں بلایا گیا تو آپ نے جانے سے انکار کر دیا، اور فرمایا کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ تو ختنوں میں شرکت کرتے اور نہ اس کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا جاتا تھا[1]

اگر دو جگہ سے ایک ہی وقت میں دعوت آجائے تو جس کی دعوت پہلے آئے، اس کے یہاں جانا چاہیئے، اس میں تعلقات کے قرب و بُعد کا خیال نہ ہونا چاہیئے، البتہ اگر دونوں نے ساتھ دعوت دی ہے، تو جس سے زیادہ قرب اور تعلق ہو اس کے وہاں جانا چاہیئے۔

دعوت میں بلائے بغیر چلا جانا ایک بے غیرتی اور بے حیائی کی بات ہے، اس لئے جو لوگ کسی دعوت میں بغیر بلائے جاتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی سخت مذمّت کی ہے، آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص بغیر بلائے کسی دعوت میں چلا جاتا ہے، وہ چور بن کر جاتا ہے اور غاصب بن کر ڈاکہ ڈال کر واپس ہوتا ہے (ابوداؤد) ایسے ہی اشخاص کو طفیلی کہا جاتا ہے۔

شب زفاف کا مسنون طریقہ

عام طور پر شب زفاف یعنی شادی کی پہلی رات کو عورتیں لڑکی کو مرد کے کمرے تک لے جا کر پہونچاتی ہیں۔ یہ طریقہ عہد نبوی میں بھی تھا، جس وقت میاں بیوی میں پہلی یکجائی ہو تو مرد کو مباشرت سے پہلے چاہیئے کہ پہلے اپنی بیوی کی پیشانی کو پکڑ کر یہ دعا پڑھے:۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُكَ مِنْ خَیْرِھَا وَخَیْرِ مَا جَعَلْتَھَا عَلَیْهِ	اے اللہ! میں تجھ سے اس کی بھلائی چاہتا ہوں، اور خاص طور پر جو بھلائی تو نے

---

[1] وَدعوۃ الختان لا یعرفھا المتقدمون۔ ابن قدامہ نے المغنی میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ صحابہ کا یہ بیان ہے کہ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ختنہ وغیرہ کی تقریب میں نہیں جاتے تھے، چونکہ دعوت قبول کرنے کا آپ نے عمومی حکم دیا ہے، اس لئے اس میں جانا مستحب ہے، والاجابۃ الیھا مستحبۃ غیر واجبۃ ھذا قول مالک والشافعی وابی حنیفۃ واصحابہ (ج۷، ص۱۱)

وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا جَبَلْتَهَا عَلَيْهِ۔ (ابن ماجہ وابوداؤد)

اس کی فطرت میں رکھی ہے، اور اس کے شر سے پناہ چاہتا ہوں اور خاص طور پر اس شر سے جو اس کی فطرت میں ہے۔

پھر اس کے بعد جب مباشرت کا ارادہ ہو تو اس وقت یہ دعا پڑھ کر مباشرت کرنی چاہئے:۔

بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا۔ (بخاری ومسلم)

اللہ کے نام سے، اے اللہ! تم ہم دونوں کو شیطان سے محفوظ اور دور رکھ! اور جو اولاد تو دے اس کو بھی اس کے مکائد سے محفوظ رکھ۔

غور کیجئے کہ یہ انسان کے لئے انتہائی خوشی اور بے تکلفی کا موقع ہوتا ہے، لیکن اس موقع پر بھی آدمی کو جو دعا بتائی گئی ہے اور جو ہدایتیں کی گئی ہیں، ان میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ آدمی اپنے مرتبۂ انسانیت سے نیچے نہ گرنے پائے، جہاں تک جنسی جذبے کا تعلق ہے اس جذبے میں انسان اور حیوان دونوں برابر ہیں، مگر اس جذبے کی تسکین میں دونوں کی راہیں جدا ہوتی ہیں، کوئی مہذب اور معقول انسان یورپ والوں کی طرح حیوان کی طرح مکان وزمان اور شرم وحیا کی قیود سے آزاد ہو کر اپنے اس جذبے کی تسکین کرنا پسند نہیں کرتا، اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی خواہش نفسانی پوری کرنے کے لئے بیوی کے پاس جائے تو اس کو جامہ ولباس سے اس طرح بے نیاز نہیں ہو جانا چاہئے جس طرح بکری بکرے ہوتے ہیں۔ (ابن ماجہ)

آپؐ نے فرمایا کہ فرشتے دو وقت آدمی سے جدا ہوتے ہیں۔ ایک پاخانے کے وقت، دوسرے مباشرت کے وقت۔

فَاسْتَحْيُوْهُمْ وَاَكْرِمُوْهُمْ۔ تم ان سے شرمایا کرو اور ان کا لحاظ کیا کرو۔

شوہر اور بیوی کے حقوق وفرائض

اسلامی شریعت میں جس طرح رشتۂ نکاح کے قائم کرنے کے لئے تفصیل سے قانونی اور اخلاقی ہدایتیں دی گئی ہیں، اسی طرح رشتۂ نکاح کے قائم ہونے کے بعد اس کو خوشگوار

اور استوار رکھنے کے لئے بھی اصولی طور پر شوہر و بیوی دونوں کے حقوق و فرائض کی نشاندہی کردی گئی ہے، اور ان میں سے ہر ایک کے عمل و اختیار کا دائرہ بھی متعین کر دیا گیا ہے، اور حقوق و فرائض کی نشاندہی اور دائرۂ عمل و اختیار کی تعیین اور ہر ہر موقع کے لئے ہدایتیں اس لئے دی گئی ہیں کہ یہی ایک ایسا رشتہ ہے جو باشعور ہونے کے بعد ایک مرد اور ایک عورت کو اتنی لمبی مدت تک باندھے رکھتا ہے، اور اس رشتے کے ذریعے مرد و عورت میں اتنا ہی قرب ہو جاتا ہے جتنا قرب خون اور گوشت کا ہوتا ہے، لیکن یہ رشتہ اپنی طوالت اور قرب ہی کی وجہ سے اپنے اندر بڑی نزاکت بھی رکھتا ہے، اگر مرد و عورت دونوں اس کو قائم اور استوار رکھنے کے لئے مسلسل کوشش نہ کریں، اور ہر ایک اپنے اپنے دائرۂ اختیار و عمل کا لحاظ و پاس نہ کرے تو یا تو یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا، یا اگر ٹوٹا نہیں تو اس کا بندھن اتنا کمزور ہو جائے گا کہ اس کے ذریعے وہ مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے، جن کے لئے یہ گرہ لگائی گئی ہے اور ان میں سے کوئی صورت بھی پسندیدہ نہیں ہے۔

اسلامی شریعت میں مرد اور عورت کی حیثیت

میاں بیوی کے حقوق و فرائض کی تفصیل سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مرد اور عورت کی حیثیت پر روشنی ڈال دی جائے کیونکہ ان کی اصلی حیثیت معلوم کئے بغیر ان کے حقوق و فرائض کی حیثیت اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہو سکتی۔

مرد قوّام ہے

دنیا کا چھوٹا یا بڑا کوئی کام بھی اس کے نظم و نسق کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو اس کا اصل ذمہ دار قرار دیا جائے، اور دوسرے اس کی معیت میں کام کریں، اگر کسی کام کے لئے کوئی ذمہ دار نہ قرار دیا جائے، بلکہ جتنے کام کرنے والے ہیں، ان سب کو مساویانہ حقوق دے دیئے جائیں تو پھر دنیا کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی انجام نہیں پا سکتا، ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر، کالج میں پرنسپل، کارخانے میں منیجر، گھر میں ایک مالک اسی لئے بنایا جاتا ہے کہ اس کے نظم و انتظام کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے، اگر ایک کام کے کئی نگراں اور ذمے دار بنا دیئے جائیں تو پھر اس کام میں خلل پڑے گا، مثلاً اگر ایک اسکول کے تمام ماسٹر، ایک کالج کے تمام لکچرر، ایک کارخانے

کے تمام کارکن اور ایک گھر کے تمام افراد ذمے دار اور نگراں ہو جائیں تو پھر اس اسکول، کالج، کارخانے کا نظم ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ رشتہٴ مناکحت کے ذریعے ایک نئے خاندان کی داغ بیل پڑتی ہے، اور خاندان کی داغ بیل ہی پر معاشرہ اور تہذیب وتمدن کی ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے، اس لئے ایسے بنیادی اور اہم کام کے لئے کسی کو اصل ذمے دار اور نگراں قرار نہ دیا جائے، تو پھر اس میں انتشار و بدنظمی پیدا ہونی ضروری ہے، اور جب اس میں انتشار و بدنظمی پیدا ہوگی تو رشتہٴ مناکحت کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

مرد فطری طور پر عورت کے مقابلہ میں اپنے قوائے جسمانی اور ذہنی اعتبار سے فوقیت رکھتا ہے، اس میں کچھ مستثنیات بھی ہوتے ہیں کہ ایک عورت جسمانی اور دماغی حیثیت سے ایک مرد سے آگے نکل جائے مگر مجموعی طور پر دونوں کی فطری صلاحیتیں جدا جدا ہیں، پھر عورت کے ساتھ طبعی آزار مثلاً حیض، حمل، بچہ کی پیدائش وغیرہ ایسے موانع ہیں، جن کی وجہ سے وہ محنت اس سے ممکن نہیں ہے جو ایک نگراں کے لئے چاہیئے۔

اب سوال یہ ہے کہ مرد اور عورت میں کس کو اس ذمے داری کا منصب دیا جائے، اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے، اس لئے عورت و مرد کی مخصوص فطرت کے پیش نظر اس نے یہ درجہ مرد کو عطا کیا ہے، موجودہ دور میں مرد و عورت کی مساوات کی جو کوشش کی جا رہی ہے اسلامی شریعت کی رو سے یہ ایک غیر فطری کوشش ہے، اور واقعہ بھی ہے کہ یہ غیر فطری نظریہ جن قوموں نے پیش کیا ہے وہ بھی مکمل طور پر ایک دن بھی اس پر عمل نہ کر سکیں، کیونکہ عورت کی مخصوص جبلت اور اس کے فطری اعمال و خواص اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور جہاں ان کو کچھ توڑنے یا موڑنے کی کوشش کی گئی ہے، وہاں فائدہ کے مقابلے میں نقصانات زیادہ ہوئے ہیں، جن قوموں نے مساوات کی دھن میں عورت کو گھر سے نکال کر دفتر، پارک اور میدان سیاست میں پہونچایا ہے، اس کا نتیجہ ان کے سامنے جو کچھ ظاہر ہوا ہے اس کی تصویر ایک مشہور امریکی پروفیسر نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:-

"اب ہم کھانا ہوٹلوں اور ریسٹوران میں کھاتے ہیں۔ ہماری روٹی بیکری

سے آتی ہے، کپڑے لانڈری میں دھلتے ہیں، اگلے وقتوں میں تفریح کے لئے لوگ خاندانوں کی طرف رجوع کرتے تھے، لیکن اب اس کے لئے سینماؤں، تھیٹروں اور کلبوں کا رخ کرتے ہیں، پہلے خاندان ہماری دلچسپی کا مرکز تھا اور خاندانی زندگی ہی میں سکون و آسائش تلاش کی جاتی تھی، مگر اب خاندان کے افراد بکھر گئے اور اگر کچھ مل کر بھی رہتے ہیں تو ان کا مقصد ہی فوت ہوگیا ہے، ہمارے گھر، ہمارے آرام و استراحت کی جگہ نہیں رہے، جہاں بہرحال ہم رات گزارتے ہوں۔ (ترجمان القرآن اپریل ۱۹۵۷ء)

آزادیٔ نسواں اور مساوات مرد وزن کا جو نعرہ مغربی تہذیب نے دیا تھا، اب یہ بخار بڑی حد تک اترنے لگا ہے، مسز جونی رینج ایک امریکی خاتون ہیں جو نفسیات اور جنسیات کی بہت بڑی ماہر تسلیم کی جاتی ہیں، انھوں نے نئی دہلی میں جنسیات کے موضوع پر منعقدہ ایک کانفرنس میں امریکی سوسائٹی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"امریکی سوسائٹی سیاسی، اقتصادی اور جنسی اعتبار سے اب تیزی کے ساتھ ماضی کی روایات کی طرف لوٹ رہی ہے، مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب امریکی عورت اپنی قدیم روایات کے مطابق گھر کی چہار دیواری میں بند ہوکر خود کو بچوں اور گھر کی دیکھ بھال تک محدود کرلے گی۔"

(سہ روزہ "دعوت" ۱۳ر نومبر ۱۹۸۵ء)

اور بہت سے مغربی مصنفین اب عورت، مرد کی فطرت کو سمجھنے لگے ہیں اور اب مساوات مرد وزن کے جذباتی فلسفہ سے توبہ کرنے لگے ہیں، پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی لکھتے ہیں:۔

"ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ دنیا میں تنزلی کے دور عام طور پر وہی رہے ہیں، جب عورت گھر کی چار دیواری کو چھوڑ کر باہر نکلی ہے، قدیم تاریخ میں پانچویں صدی قبل مسیح کا ایران ترقی کے معراج پر پہونچا ہوا تھا، لیکن اس دور میں عورت گھر کی زینت تھی مگر سکندر کے بعد جس زمانے میں شہری ریاستیں روبہ زوال تھیں، اس وقت بھی ایک ایسی ہی آزادی نسواں تحریک شروع ہوگئی تھی،

جیسی آج ہمارے زمانہ میں ہے۔" (عورت اسلامی معاشرہ میں ص۳۷)

ان بیانات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے مرد اور عورت کے لئے جو دائرۂ کار مقرر کیا ہے وہ دونوں کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اور ان کو ان کی فطرت کے خلاف لے چلنے میں انسانی معاشرہ کو نقصان پہونچا ہے اور پہونچ رہا ہے۔

قرآن میں مرد کو قوامیّت کا درجہ دیتے ہوئے عورت پر اس کے اس فطری تفوق کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے جس کی بنا پر عورت کے بجائے اس کو یہ مرتبہ عطا ہوا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاۤءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ (نساء)	مردوں کو عورتوں کے اوپر قوام یعنی نگراں اس لئے بنایا گیا ہے کہ فطری طور پر اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔

قرآن پاک نے اس افضلیت کی تفصیل اس لئے نہیں کی ہے کہ ہر انسان اسے خود سمجھ سکتا ہے، اس لئے کہ جس طرح جسم کے اعضاء میں بعض عضو زیادہ کارآمد ہیں، اور بعض کم مگر اس افضلیت کی وجہ سے کسی کا درجہ گھٹتا نہیں، بلکہ اپنے اپنے دائرۂ کار میں ہر ایک افضل ہے، اسی طرح مرد اپنے دائرۂ کار میں افضل ہے۔ اور عورت اپنے دائرۂ کار میں۔ جو لوگ اس آیت سے عورت کی توہین کا پہلو نکالتے ہیں وہ عورتوں کو مغالطہ میں ڈالتے ہیں۔

قوّام کے معنی

قوام محافظ نگراں اور خبر گیری کرنے والے کو کہتے ہیں، اور نگراں اور خبر گیری کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اس کے اوپر جس کی وہ خبر گیری کر رہا ہے، کچھ امتیاز حاصل ہو، مگر امتیاز کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت کی حیثیت ایک لونڈی کی اور مرد کی حیثیت آقا کی ہو، بلکہ بنیادی حقوق میں دونوں برابر ہیں۔ یہ تفوق اور مرتبۂ قوامیّت مرد کو بعض ایسی ذمہ داریوں کی بنا پر دیا گیا ہے، جنھیں مرد کی مخصوص فطرت کے پیش نظر اسلام ان کی انجام دہی اسی پر ڈالتا ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ سے ظاہر کیا گیا ہے، ورنہ جہاں مرد کے تفوق کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ عورتوں کے بنیادی حقوق ان پر اسی طرح ہیں، جس طرح ان کے اوپر مردوں کے حقوق ہیں:۔

وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ	اور قاعدہ شرعی کے مطابق عورتوں کا حق

بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ) مردوں پر اسی طرح ہے جس طرح مردوں کا حق عورتوں پر ہے اور مردوں کا کچھ مرتبہ ان سے زیادہ ہے"

اس مختصر سے جملہ میں قرآن پاک نے مردوں اور عورتوں کے تمام حقوق و فرائض کو جس طرح بیان کر دیا ہے وہ قرآن کا ایک معجزہ ہے۔ اور مردوں کو جو عورتوں پر فضیلت دی ہے، اس سے اس کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔

عورتوں کے حقوق یا مردوں کے فرائض

مردوں کے اوپر عورتوں کے حسب ذیل حقوق ہیں، یا دوسرے الفاظ میں اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ قوام اور ذمے دار ہونے کی حیثیت سے مردوں کے حسب ذیل فرائض ہیں، اس لئے کہ عورتوں کے جو حقوق ہیں وہی مردوں کے فرائض ہیں اور جو مردوں کے حقوق ہیں، وہی عورتوں کے فرائض ہیں۔

۱۔ مہر

قوّام ہونے کی حیثیت سے شوہر کا پہلا فرض مہر کی ادائگی ہے۔ اوپر مہر کا ذکر تفصیل سے آچکا ہے، اس کا بھی کہ رشتۂ نکاح قائم کرتے وقت جن باتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے، ان میں ایک مہر بھی ہے، یہ مہر مرد کو نکاح ہی کے وقت ادا کر دینا چاہیئے، اگر اس وقت ادا نہ کرے تو اس کے لئے عورت سے مہلت لینی چاہیئے، یہ ایسا حق ہے کہ اگر نکاح کے وقت اس کا ذکر نہ آئے، جب بھی شریعت نے مرد کے اوپر اس کی ادائگی ضروری قرار دی ہے، اگر عورت اس کو ادائگی کی مہلت دے دے تو اس مہلت کے بعد اسے فوراً ادا کر دینا چاہیئے ورنہ عورت کو یہ حق ہوگا کہ وہ اس کو مباشرت سے روک دے، اس حق سے عہدہ برآ ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اسے ادا کر دے، دوسرے یہ کہ عورت اپنی خوشی سے یا اس کے حق سے زیادہ سلوک کے عوض میں معاف کر دے[۱]۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مرد نے عورت پر دباؤ ڈال کر مہر معاف کرا لیا ہے تو اخلاقاً و قانوناً اس معافی کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اگر کسی وجہ سے میاں بیوی میں نباہ نہ ہو سکے، اور دونوں میں علاحدگی ہو جائے، تو مرد کو یہ حق نہیں ہے کہ مہر میں

---

[۱] ولابد صحۃ حطها من الرضا حتی لو کانت مکرھۃ لم یصح (عالم گیری، ج۲، ص۳۰)

ادا کی ہوئی رقم عورت سے واپس لے لے۔

۲۔ نفقہ شوہر کا دوسرا ضروری فرض یا عورت کا دوسرا حق نفقہ ہے، نفقہ کے معنی وہ چیز جو آدمی خرچ کرے، یعنی قوام ہونے کی حیثیت سے مرد کا فرض ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے روٹی کپڑے اور دوسری ضروریاتِ زندگی کا سامان کرے، مرد کی قوامیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس کی قوامیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ کچھ اپنی کمائی عورت کے اوپر صرف کرتا ہے۔ وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ یہاں مال سے مراد مہر کی رقم بھی ہے، اور روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ بھی ہے۔

نفقہ کا معیار (۱) نفقہ اگرچہ عورت کا حق ہے، مگر اس کی ذمے داری چونکہ شوہر کے اوپر ہے اس لئے اس کی حیثیت اور آمدنی کے لحاظ ہی سے یہ ذمے داری اس پر ڈالی جائے گی، لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ اس سلسلے میں عورت کی حیثیت، مرضی، اور خواہش کا لحاظ بالکل نہ کیا جائے، بلکہ اس کا خیال بھی شوہر کو کرنا پڑے گا۔

قرآن میں نفقہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے:۔

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ۔	فارغ البال آدمی کو (بیوی بچوں پر) اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہیئے اور جو تنگ حال ہو اس کو بھی چاہیئے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرے (بخل نہ کرے)
(طلاق)	
عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ۔	خوش حال پر اس کی وسعت کے مطابق نفقہ ہے، اور مفلس پر اس کی استطاعت کے مطابق ہے۔
(بقرہ)	

یہ احکام گو طلاق کے مواقع کے ہیں مگر ان کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اگر طلاق یعنی اس رشتے کے کٹ جانے کے بعد بھی مرد کو اپنی حیثیت کے لحاظ سے پورا کرنا ضروری ہے تو پھر نکاح یعنی اس رشتے کے قیام کے وقت بدرجۂ اولیٰ ضروری ہونا چاہیئے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ! عورتوں کے اوپر ہمارے

کیا حقوق ہیں"؟ فرمایا:۔

اَنْ تُطْعِمَهَا اِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوْهَا اِذَا اكْتَسَيْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا تُقَبِّحْ وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِي الْبَيْتِ۔ (مسند احمد، ابن ماجہ)	جب تم کھاؤ تو ان کو بھی کھلاؤ اور جب تم پہنو تو ان کو بھی پہناؤ اور ان کے منہ پر نہ مارو ان کی شکل وصورت اور ان کے کام کاج میں عیب نہ نکالو اور برا بھلا نہ کہو اور اگر کچھ ناگواری ہو جائے تو گھر کے اندر اس کی خواب گاہ اپنے

سے علاحدہ کر دو (یعنی ناراضگی اتنی طویل نہ ہو جائے کہ وہ گھر کے باہر میکے وغیرہ جانے پر مجبور ہو۔

آپ نے اپنے آخری حج میں جو خطبہ دیا تھا اس میں بہت سی باتوں کے ساتھ فرمایا تھا، وَاِنَّ لَهُنَّ عَلَيْكُمْ نَفَقَتُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ان کے کھانے پہننے اور کپڑے کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہے، قرآن وحدیث کی انہی ہدایات کی روشنی میں فقہاء نے حسب ذیل احکام مستنبط کئے ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ہر حال میں شوہر کی حیثیت اور اس آمدنی کو نفقہ کا معیار قرار دیا ہے، ان کا استدلال قرآن کی اس آیت سے ہے "علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ (البقرہ) مگر امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے درمیان کی راہ اختیار کی ہے وہ یہ کہ اصل لحاظ تو مرد کی آمدنی ہی کا کیا جائے گا۔ مگر عورت کی حیثیت بالکل نظر انداز نہیں کی جائے گی۔ قرآن وحدیث کی مذکورہ آیتوں اور روایتوں سے بھی اس رائے کی زیادہ تائید ہوتی ہے[1] اس لئے جس طرح نفقہ میں مرد کا خیال کیا جاتا ہے اسی طرح مہر میں عورت کی حیثیت کا خیال کیا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ دونوں کا لحاظ ضروری ہے، شیخ ابن قدامہ اس رائے کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "ان نص الکتاب یقتضی تقدیرھا بحال الزوج وتقدیرھا بنصف مھر المثل یوجب اعتبارھا بحال المرأۃ"۔ (المغنی، ج ۶ ص ۱۷۵)

---

[1] تجب النفقۃ بقدر حالھما ففی الموسرین نفقۃ الیسار وفی المعسرین نفقۃ العسار (شرح وقایہ، ج ۲ ص ۱۷۱)

ضروری مسائل

(۱) اگر مرد مالدار ہو، یا اس کی آمدنی اچھی خاصی ہو، اور عورت بھی مالدار گھرانے کی ہو تو مرد کو اپنی حیثیت اور اس کے معیار زندگی کا خیال کر کے نفقہ دینا پڑے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ عورت اپنے گھر تو اچھا کھاتی اور اچھا پہنتی ہو، اور شوہر بھی اس حیثیت کا ہو کہ اس کے معیار کے مطابق خرچ دے سکتا ہو، مگر بخل کی وجہ سے موٹا جھوٹا کھلاتا پہناتا ہو، اگر وہ ایسا کرتا ہے تو عورت اس سے قانوناً اپنے معیار کا کھانا کپڑا طلب کر سکتی ہے۔

(۲) اگر مرد خوش حال ہو، یا اس کی آمدنی خوش حال جیسی ہو مگر عورت کسی غریب گھرانے کی ہو تو مرد کو عورت کی حیثیت کے مطابق نہیں بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق نان و نفقہ دینا چاہیے۔[۱] شوہر بخل کی وجہ سے اس کی غربت سے فائدہ اٹھا کر اگر اس کو غربت و تکلیف میں رکھنا چاہے تو عورت قانوناً اس سے زائد کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

(۳) اگر مرد غریب اور تنگ حال ہے اور عورت بھی غریب گھر کی ہے تو پھر مرد کو اپنی حیثیت کے مطابق ہی روٹی، کپڑا دینا چاہیے۔ عورت اس کی حیثیت سے زیادہ نہیں مانگ سکتی۔ ونفقۃ[۲] المعسرین نفقۃ العسار۔ تنگ دست اپنی تنگ دستی کے اعتبار سے خرچ دے گا۔

(۴) اگر کوئی مرد غریب ہو مگر عورت مالدار اور خوش حال گھرانے کی ہو تو مرد کو اپنی حیثیت کے ساتھ اس کی حیثیت کا لحاظ کر کے نفقہ دینا چاہیے۔ مگر خود عورت کا اخلاقی فرض

---

[۱] وان کانت المرأۃ معسرۃ والزوج موسر فنفقتھا دون نفقۃ الموسرات وفوق نفقۃ المعسرات۔ (حاشیہ شرح وقایہ، ج ۲ ص ۱۷۲)

[۲] علی الموسع قدرہ وعلی المعسر قدرہ، عسر اور یسر یعنی محتاج وغنی کا معیار صدقۂ فطر اور قربانی کا وجوب اور عدم وجوب ہے نہ کہ زکوٰۃ کے نصاب کا مالک ہونا۔ والغنی الذی تجب بہ صدقۃ الفطر والاضحیۃ وتحرم بہ علی صاحبہ أخذ الصدقۃ ھو أن یملک ما یساوی مأتی درھم فاضلا عن حاجتہ الاصلیۃ۔ (عمدۃ الرعایۃ، شرح وقایۃ ص ۱۷۳ ج ۲)

ہے کہ وہ مرد سے اس کی حیثیت سے زیادہ نفقہ طلب نہ کرے، ورنہ یا تو وہ خرچ سے مجبور ہوکر حرام ذریعۂ آمدنی تلاش کرے گا یا پھر دونوں کے تعلقات خراب ہوجائیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے ہمیشہ تنگی سے بسر کی۔ لیکن ایک بار جب فتوحات وغیرہ کے ذریعے آپ کے پاس کافی مال آنے لگا تو انھوں نے بھی اپنے نفقہ میں زیادتی کی خواہش کی، مگر یہ خواہش نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ناگوار ہوئی، اور خدائے تعالیٰ کو بھی۔ چنانچہ قرآن میں ان کو سخت تنبیہ کی گئی:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۞ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ أَجْرًا عَظِيمًا۔ (احزاب)	اے نبی اپنی ازواج سے کہہ دیجئے کہ اگر تم کو دنیا کی زندگی اور اس کی زینت زیادہ پسند ہے، اور تم وہی چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ کپڑا وغیرہ دے دوں، پھر تم کو عمدہ طریقے سے اپنے سے علیحدہ کردوں اور اگر تم خدا اور اس کے رسول اور آخرت کی طلبگار ہو تو اللہ تعالیٰ نے نیکوکار عورتوں کے لئے بہت بڑا اجر رکھا ہے۔

چنانچہ اس تنبیہ کے بعد انھوں نے پھر کبھی نفقے کی زیادتی کا مطالبہ نہیں کیا، اس آئینے میں ہر مسلمان عورت کو اپنا چہرہ دیکھنا چاہیئے، مگر جیسا کہ ذکر آیا ہے کہ شوہر کو اپنی حیثیت کے مطابق اس کا خرچ دینا چاہیئے۔ اس میں بخل سے کام نہ لینا چاہیئے، جیسا کہ قرآن پاک کی آیت سے واضح ہوچکا ہے۔

(۵) آرائش وزیبائش کی وہ چیزیں جو عورتوں کی صحت وصفائی کے لئے ضروری ہیں، وہ بھی نفقے میں داخل ہیں اور ان کا فراہم کرنا بھی مرد کے لئے ضروری ہے مثلاً تیل، کنگھی، صابون، غسل اور وضو کا پانی وغیرہ، البتہ جو چیزیں محض آرائش وزیبائش کی ہوں اور ان سے کوئی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو، مثلاً پان، تمباکو، پاؤڈر، لپسٹک وغیرہ، ان کا فراہم کرنا مرد پر ضروری نہیں ہے۔

(۶) اگر عورت ایسے گھر کی ہے جہاں لوگ اپنے ہاتھ سے کام کاج نہیں کرتے، بلکہ نوکر چاکر کرتے ہیں، یا عورت اتنی کمزور یا مریض ہے جس کی وجہ سے اس سے گھر کا کام کاج نہیں ہوتا تو شوہر ایسی عورت کو کام کاج پر مجبور نہیں کر سکتا، بلکہ اس کو بغیر کام کئے ہوئے بٹھا کر روٹی کپڑا دینا پڑے گا۔

اگر ایسی عورت اپنے ذاتی کام کے لئے یا گھر کے کام کاج کے لئے ملازم کا مطالبہ کرے تو شوہر اگر خوش حال ہے تو اس کو ملازم رکھنا پڑے گا اور ایک ملازم کا خرچ اس کو دینا پڑے گا۔[۱] لیکن اگر شوہر کی آمدنی میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ وہ ملازم رکھ سکے، یا وہ عورت جو اپنے میکے میں اپنے ہاتھ سے کام کاج کرتی تھی تو پھر عورت کو شوہر کے گھر کے اندر بھی کام کاج خود اپنے ہاتھ سے کرنا پڑے گا، اور مرد کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ باہر کا کام خود کرے، مثلاً سودا سلف، جنس، لکڑی، اور پانی وغیرہ گھر میں لا دے، اگر مرد یہ چیزیں فراہم نہیں کرے تو عورت پر اس کی کوئی ذمے داری نہیں ہے۔[۲]

بعض علمائے فقہ نے لکھا ہے کہ کپڑے کی دُھلائی مرد کے اوپر واجب نہیں ہے بلکہ اس کو صرف پانی اور صابون فراہم کر دینا ضروری ہے عورت اپنے ہاتھ سے اپنا کپڑا دھولے، اگر مرد دُھلائی دیتا ہے تو یہ اس کا احسان ہے، یعنی یہ عورت کا قانونی حق نہیں ہے لیکن راقم کے خیال میں یہ مرد کا احسان اس صورت میں تو ہو سکتا ہے، جب اس کے اندر اس کی ادائگی کی استطاعت نہ ہو، اور پھر بھی وہ دیتا ہو، یا عورت اپنے گھر اس کی عادی رہی ہو، لیکن شوہر اپنے گھر میں اس کو اپنے ہاتھ سے کپڑا دھونے نہیں دیتا بلکہ دھوبی سے دھلواتا ہے، لیکن

---

[۱] ولا تفرض لأكثر من نفقة واحد۔ (ھدایہ۔ ج ۲ ص ۴۱۹)

[۲] امتنعت امرأة من الطحن والخبز ان كانت ممن لا تخدم اوكان بها علة فعليه ان يأتيها بطعام فيها والا فان كانت ممن تخدم نفسها وتقدر على ذلك لا يجب عليه ولا يجوز لها اخذ الأجرة على ذلك لوجوبه عليها ديانةً۔

(شامی، ج ۱ ص ۸۹۸ بحوالہ بہشتی زیور)

جب مرد میں استطاعت ہو، یا عورت اس کام کی عادی نہ ہو تو اس کو کپڑے کی دھلائی بطورِ حق ملنا چاہیئے۔ جب مرد کی وسعت اور عورت کی حیثیت کا خیال کر کے اس کو خادم مل سکتا ہے، تو صحت وصفائی کی دوسری چیزیں بطورِ استحقاق کیوں نہ ملنی چاہئیں۔ البتہ اگر عورت اس کا بار مرد پر نہ ڈالے تو اس کا یہ احسان ہے اور اس تعلق کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے صرف قانونی تعلق نہ رکھیں، بلکہ اخلاقی تعلق بھی رکھیں یعنی ایک دوسرے کی تکلیف و آرام کا خیال رکھیں۔

(۷) اسی طرح بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ دوا علاج کا خرچ شوہر کے اوپر واجب نہیں ہے، بلکہ اس کے اوپر صرف نان نفقہ واجب ہے، اگر وہ دوا علاج کرتا ہے تو یہ اس کا احسان ہے۔ اس مسئلے میں بھی راقم کی رائے یہ ہے کہ دوا علاج خاص طور پر اس زمانے میں انسان کی اس سے کم بنیادی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ تیل، کنگھی اور صابن وغیرہ ہے، جب عورت کے جسم کی صحت وصفائی کے لئے ان چیزوں کے فراہم کرنے کو فقہاء نے واجب لکھا ہے، تو پھر دوا علاج کیوں نہ واجب ہو۔ پھر فقہاء یہ بھی لکھتے ہیں کہ بالغ لڑکوں کا نفقہ باپ پر واجب نہیں ہے، لیکن اگر کوئی بالغ لڑکا بیمار پڑ جائے تو پھر اس کا نان نفقہ باپ پر ضروری ہو جاتا ہے، اور پھر یہ تو لڑکا ہے، فقہاء نے مضارب کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کو علاج کا خرچ بھی ملے گا، کیونکہ بغیر اس کے مضارب کا کام وہ نہیں کر سکتا تو عورت سے جو فوائد متعلق ہیں ان کا لحاظ کر کے اس کے دوا علاج کا خرچ مرد پر ضروری کیوں نہ قرار دیا جائے، اگر عورت اس کا بار خود شوہر پر نہ ڈالے تو یہ عورت کا احسان کیوں نہ سمجھا جائے۔ اس کے علاوہ مرض کی اور اس کے دوا علاج کی جو اہمیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوتی ہے، اس کی روشنی میں بھی یہ عورت کا ایک ضروری حق قرار دیا جانا چاہیئے۔

اسی طرح بچہ جننے کے وقت دائی وغیرہ کی فیس کے بارے میں فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کو وہ برداشت کرے گا جو اس کو بلائے گا یعنی اگر بیوی خود بلائے گی تو وہی برداشت کرے گی، اور اگر شوہر بلائے گا تو وہ برداشت کرے گا، راقم کے خیال ناقص میں اس کو بھی ہر حال میں مرد ہی کی ذمہ داری ہونی چاہیئے، کیونکہ جب بچہ اس کا ہے، جب اسی پر اس کے

دودھ پلوانے کی اجرت اور اس کا نفقہ واجب ہے، تو پھر ولادت کے وقت کے تمام اخراجات اس پر کیوں نہ واجب ہوں جب کہ یہ ایسا نازک موقع ہوتا ہے کہ اس وقت کی ذرا سی بے احتیاطی سے زچہ اور بچہ دونوں کی جان خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، در مختار کے اس جزیہ پر ابن عابدین نے جو لکھا ہے اوپر لکھی گئی تمام صورتوں پر اس کا اطلاق کرنا چاہیئے۔ والاظهر لی ترجيح الأول لأن نفع القابلة معظمه يعود الى الولد فيكون على أبيه (ردالمحتار ج ۱ ص۸۹۳) اس لئے کہ بیوی کے دوا علاج کا سارا فائدہ شوہر کو پہونچے گا بلکہ پوری امت کو پہونچے گا۔ اگر درست رہے گی تو گھر کا نظم و انتظام بھی درست رکھے گی اور جو اولاد ہوگی، تندرست ہوگی، جس سے نہ صرف باپ کو بلکہ پورے معاشرہ کو فائدہ پہونچے گا اور پھر یہ کتنی تکلیف دہ بات ہوگی کہ ہم اس کی صحت کی حالت میں اس سے فائدہ اٹھائیں اور دوا علاج کے لئے اسے بے سہارا چھوڑ دیں، یا اس کے والدین کے سر ذمہ داری ڈال دیں، فقہاء نے جس زمانے میں یہ رائے دی تھی اس زمانے میں نہ تو اتنے پیچیدہ امراض پیدا ہوتے تھے اور نہ دوا علاج ضروریاتِ زندگی میں داخل ہوا تھا۔ اس لئے اس شرعی مسئلہ کا تعلق عرف اور حالات سے ہے، ظاہر ہے کہ اس وقت حالات بدل چکے ہیں۔

(۸) لڑکی بالغ ہے مگر ابھی اس کی رخصتی نہیں ہوتی ہے، یعنی وہ ابھی میکہ میں ہے، تب بھی وہ نان نفقے کی مستحق ہے۔ البتہ شوہر اگر رخصت کرانا چاہتا ہے، مگر اس کے گھر والے رخصت نہیں کرتے ہیں یا وہ خود نہیں آرہی ہے، تو پھر اس پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہے[1]

(۹) اگر لڑکی نابالغ ہے اور اپنے میکے میں ہے، شوہر کے گھر نہیں آتی ہے تو پھر اس کا نان نفقہ مرد پر واجب نہیں ہے، اگر وہ اخلاقاً دے، تو اس کا احسان ہوگا۔ البتہ اگر شوہر نے اپنے گھر بلا لیا، تو اس کا روٹی، کپڑا اس کے ذمے واجب ہے۔

---

[1] وإن امتنعت من تسليم نفسها حتى يعطيها مهرها فلها النفقة وإن نشزت فلا نفقة لها حتى تعود الى منزله۔

(هدايه ج ۲ ص۴۱۷)

(۱۰) اگر بیوی بالغ ہے، مگر شوہر ابھی نابالغ ہے تو عورت کو نان نفقہ ملے گا۔[1]

(۱۱) اگر کوئی عورت شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے میکے یا اپنے اعزّہ کے گھر چلی جائے تو جتنے دن وہاں رہے گی۔ اس کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہے، البتہ اگر اجازت سے جائے تو پھر بدستور اس کو نفقہ ملے گا۔[2]

(۱۲) اگر شوہر قدرت کے باوجود اپنی حیثیت، یا عورت کی حیثیت سے کم خرچ دیتا ہے، جس سے عورت کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں تو اگر وہ اپنی یا بچوں کی ضرورت سے بالکل مجبور ہوجائے تو وہ شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے اپنی ضرورت پوری کرسکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی صورت میں حضرت ابوسفیان کی بیوی ہندہ کو اس کی اجازت دی تھی، مگر یہ شرط لگادی تھی کہ خُذِی مَا یَکْفِیْكِ وَوَلَدِكِ بِالْمَعْرُوْفِ اچھی نیت سے اتنا لے سکتی ہو جتنا تمہاری اور تمہارے بچوّں کی ضرورت کے لئے کافی ہو۔

(۱۳) شوہر نے ایک مہینے کا خرچ عورت کو دے دیا، عورت نے اس میں سے کچھ بچالیا تو یہ عورت کا حق ہے، مرد نہ تو اس کو لے سکتا ہے، اور نہ آئندہ اس کے نفقے میں کمی کرسکتا ہے، لیکن اگر عورت نے خرچ کرنے میں اتنی کنجوسی کی۔ ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی صحت پر برا اثر پڑا، اور دُبلی ہوگئی، یا اس کا رنگ روغن ڈھل گیا، تو پھر شوہر کو یہ قانونی حق ہے کہ وہ اس کو اس سے منع کرے کیونکہ عورت کا حسن وجمال اور اس کی ظاہری کشش شوہر کا ضروری حق ہے، اس کو وہ قصداً ضائع نہیں کرسکتی۔ (درمختار)

(۱۴) اگر مہینہ بھر کا خرچ ۱۵، ۲۰ دن میں فضول خرچی سے اڑا ڈالتی ہے، یا اس کی بے توجہی کی وجہ سے وہ چوری ہوجاتا ہے، تو شوہر پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ (درمختار)

---

[1] وإن کانت صغیرة لا یستمتع بها فنفقته لها وان سلمت الیه نفسها وان کان الزوج صغیر لا یقدر علی الوطئ والإمرأة کبیرة فلها النفقة من ماله (قدوری ۱۹۰)

[2] والا فإن طالبها بالنفقة وامتنعت عنها لا لحق شرعی فهی ناشزة تسقط نفقتها۔ (فتح القدیر، حاشیه شرح وقایه، ج ۲ ص ۱۷۲)

(۱۵) شوہر کے ذمہ مہر باقی ہے اور عورت مطالبہ کرتی ہے اور شوہر نہیں دیتا تو اگر وہ اپنے والدین کے گھر رہے جب بھی نان نفقہ شوہر کو دینا ہوگا[۱]

(۱۶) اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو نفقہ نہ دے اس کی بنا پر عورت شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے یا خلع کا دعویٰ کرے اور شوہر طلاق دے دے یا مسلمان حاکم یا شرعی پنچایت اس کے فسخ کا فیصلہ کر دے تو عورت گذشتہ زمانہ کے نفقہ کا مطالبہ نہیں کر سکتی ہے[۲]

۳۔ سُکنیٰ

سُکنیٰ کا لفظ سکون سے نکلا ہے، یعنی گھر میں پہونچ کر آدمی چونکہ سکون محسوس کرتا ہے، اس لئے اس کو سکون کی جگہ کہتے ہیں۔ مرد کا تیسرا فرض یا بیوی کا تیسرا حق یہی ہے۔ یعنی مرد کو عورت کی اور اپنی حیثیت کے مطابق ایک گھر بھی دینا ہوگا۔ نفقہ یعنی روٹی کپڑے کی طرح سُکنیٰ بھی عورت کا ایسا حق ہے کہ طلاق کے بعد اختتام عدت تک عورت کو شوہر اس سے محروم نہیں کر سکتا، قرآن میں ہے:۔

اَسْکِنُوْھُنَّ مِنْ حَیْثُ سَکَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِکُمْ۔ (طلاق)	ان کو اپنے مقدور بھر وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو۔

ایک مسلمان عورت کے لئے اس کی اتنی اہمیت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد دوسرا کام یہ کیا کہ ازواج مطہرات کے سر چھپانے کے لئے مکان کی تعمیر فرمائی، حتیٰ کہ آپ نے طلاق پانے والی عورتوں کو بھی عدت تک نفقہ و سُکنیٰ دلایا۔

گھر کیسا ہونا چاہیئے؟ اس کی تفصیل فقہاء نے یہ بیان کی ہے:۔

(۱) بیوی کو حتی الامکان شوہر کے گھر کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیئے تاکہ خواہ مخواہ مرد کو اس کی وجہ سے دردِ سر مول نہ لینا پڑے لیکن اس کے باوجود مناسب یہ

---

[۱] وان امتنعت من تسلیم نفسها حتی یعطیها مهرها فلها النفقة (هدایہ ج ۲ ص ۴۱۷)

[۲] (قوله والنفقة لا تصیر دینا) أی اذا لم ینفق علیها بأن غاب عنها او کان حاضر فامتنع فلا یطالب بها بل تسقط بمضی المدة۔ (رد المحتار مع الشامی، ج ۲ ص ۹۰۶)

ہے کہ شوہر خود یا اس کے گھر والے عورت کے لئے گھر کا ایک گوشہ یا ایک کمرہ مخصوص کر دیں، تاکہ وہ اپنی چیزیں ایک جگہ حفاظت سے رکھ سکے، اور میاں بیوی وہاں بے تکلفی سے رہ سکیں؛ اور گھر کے دوسرے لوگوں سے اس سلسلے میں کوئی اختلاف کی نوبت نہ آئے۔

(۲) اگر عورت سب کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اور اپنے لئے ایک علاحدہ گھر کا مطالبہ کرتی ہے تو مرد کے لئے اس کو ایک علاحدہ کمرہ یا کم سے کم گھر کا کوئی گوشہ اس کے لئے مخصوص کر دینا ضروری ہے جس کو وہ بند کر سکے یا جہاں وہ حفاظت سے اپنا سامان بھی رکھ سکے اور میاں بیوی لیٹ بیٹھ بھی سکیں۔ جو جگہ یا کمرہ اس نے اس کے لئے مخصوص کر دیا ہے اس میں عورت جسے چاہے آنے دے اور جسے چاہے نہ آنے دے[1]۔ اس کے علاوہ دوسری چیزیں مثلاً غسل خانہ، پاخانہ اور باورچی خانہ الگ دینا ضروری نہیں ہے، لیکن یہ اس صورت کا حکم ہے، جب شوہر معمولی حیثیت کا ہو، لیکن اگر شوہر مالدار ہے، تو اس کو ایسا گھر دینا چاہیئے جس میں اس کی ضرورت کی تمام چیزیں ہوں، مثلاً غسل خانہ، پاخانہ، باورچی خانہ وغیرہ۔ (ردالمحتار شرح درمختار)

والدین اور دوسرے اعزّہ کا نفقہ

شوہر کے فرائض کے سلسلے میں ذکر آچکا ہے اور اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی کہ بیوی کے ساتھ اپنے بچوں کی پرورش کا انتظام بھی اس کے اوپر ضروری ہے۔ اگر بیوی بچوں کے ساتھ اس کے ساتھ والدین بھی ہیں اور غریب ہیں، تو ان کے اخراجات کی ذمہ داری بھی اس کے اوپر ہے، اسی حکم میں دادا، دادی اور نانا، نانی بھی شامل ہیں۔ قرآن پاک میں اور حدیث میں ان کے حقوق کے بارے میں جو احکام آئے ہیں، اس کی روشنی میں فقہاء نے لکھا ہے کہ لڑکے پر اپنے والدین اور ان سے اوپر جو لوگ ہیں سب کے خرچ کی ذمہ داری ہے، نفقۃ الآباء واجبۃ علی ابناءھم وان علوا، لڑکا یہ نہیں کہہ سکتا کہ باپ یا ماں خود

---

[1] یجب سکناھا فی بیت لیس فیہ أحد من أھلہ ولو ولدہ من غیرھا الا برضاھا۔
(شرح وقایہ ج ۲ ص ۷۶)

کما کر اپنے اخراجات پورے کریں۔ البتہ لڑکے کو کما کر ان کو کھلانا چاہیئے۔ ولا یلزم الأب بالتکسب لما یلزم الابن۔ باپ کو کمانا ضروری نہیں ہے، البتہ لڑکا اگر یہ کہے کہ ہمارے والدین غریب نہیں ہیں۔ ان کو کھلانا پلانا ضروری نہیں ہے، تو اس کو شہادت سے ثابت کرنا ہوگا کہ واقعی وہ غریب نہیں ہیں۔ اگر وہ ثابت نہ کر سکے تو باپ کی بات مانی جائے گی، اگر کسی کے لڑکا لڑکی دونوں خوش حال ہوں تو دونوں پر برابر ان کے اخراجات کی ذمہ داری ہو گی :۔

فاذا کان للأب ابن و بنت	اگر کسی کا لڑکا اور لڑکی دونوں خوش حال
موسرین قسمت نفقة بینهما	ہوں تو دونوں برابر برابر ان کے اخراجات
بالتسویة (الفقه علی المذاهب الاربعة ج ۴ ص ۵۸۸)	کے ذمہ دار ہوں گے۔

اگر والدین کافر ہوں اور وہ تنگ دست ہوں تو بھی ان کا نفقہ واجب ہے، قرآن پاک میں ہے۔ وصاحبهما فی الدنیا معروفا ان کے ساتھ دنیا میں عمدہ طریقہ سے پیش آؤ، اسی طرح دوسرے خونی رشتہ داروں اور اعزّہ کے احکام ہیں۔ ان میں وراثت کی بنیاد پر نہیں بلکہ رشتہ کے قرب و بعد کی بنیاد پر اخراجات کی ذمہ داری ہو گی :۔

والحاصل أنه یقدم الأقرب فالأقرب	خلاصہ یہ کہ اقرب فالاقرب کے اصول پر
الی الأصول والفروع ثم بعد	اخراجات کی ذمہ داری ڈالی جائے گی۔ پھر
ذلك ینظر الی الحواشی فیقدم	اس کے بعد دور کے رشتہ داروں کی
الوارث۔	ذمہ داری ہو گی، اور ان میں مقدم وارث
(الفقه علی المذاهب الاربعه)	ہوں گے۔

۴۔ حسن سلوک

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، عورت و مرد کا تعلق محض ایک کاروباری تعلق نہیں ہے، بلکہ ان دونوں میں وہی تعلق ہوتا ہے، جو جسم و جان اور خون و گوشت میں ہوتا ہے، اس لئے ان کو جو حقوق دیئے گئے ہیں، ان کی ادائیگی محض رسمی طور پر نہ ہونی چاہیئے۔ بلکہ ان کی ادائیگی ایک عبادت اور انتہائی پسندیدہ کام سمجھ کر کرنی چاہیئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مسلمان ایک دینار جو فی سبیل اللہ خرچ کرتا ہے، اور

ایک دینار جو اپنے اہل و عیال پر صرف کرتا ہے، دونوں کا اجر برابر ہے۔ (مسلم)

آپؐ نے اسی بنا پر بیوی کے حسنِ سلوک کی سخت تاکید کی ہے۔ حسنِ سلوک کا مطلب صرف اتنا نہیں ہے کہ اس کو روٹی، کپڑا، مکان اور دوسری مادّی ضروریات زندگی فراہم کر دی جائیں، کیونکہ یہ تو ایسے قانونی حقوق ہیں جنھیں اسے بہر حال ادا ہی کرنا ہوگا، خواہ خوشی سے ادا کرے یا بجبر، لیکن اس نازک رشتے کی پاکیزگی، لطافت اور اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ کیا جائے، رہنے، سہنے، کھانے پینے میں مساوات برتی جائے، بات چیت میں نرمی اور ملاطفت ملحوظ رکھی جائے، اس کو بات بات میں ٹوکا اور ڈانٹا نہ جائے، اس کی غلطی اور نقصان سے درگذر کیا جائے۔ اس سے کام لینے میں اس کی کمزور اور نازک فطرت کا لحاظ کیا جائے، قرآن میں بار بار معروف طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے:۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (نساء)	اور عورتوں کے ساتھ حسن و خوبی کے ساتھ رہو اگر ان کو تم کسی وجہ سے ناپسند کرتے ہو تو ممکن ہے کہ ایک چیز جو تمہیں ناپسند ہو اس میں خدائے تعالیٰ نے تمہارے لئے بہت سی بھلائیاں اور فائدے رکھ دیئے ہوں۔

اس آیت میں دو ہدایتیں دی گئی ہیں، ایک تو معروف طریقہ پر رہنے سہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ معروف کا مفہوم بہت ہی وسیع ہے، اس میں ہر طرح کی قانونی اور اخلاقی خوبیاں اور بھلائیاں آجاتی ہیں، اس کی پوری تفصیل آگے ارشادات نبوی میں آتی ہے، دوسرے یہ کہ ایک آدمی اپنی بیوی کے ساتھ معاملہ کرنے میں معروف طریقے سے اس وقت ہٹتا ہے جب اس کو یا تو بیوی کی ظاہری خصوصیات پسند نہ ہوں، یا پھر اس کی باطنی خصوصیات مثلاً مزاج یا سیرت و کردار میں کوئی خرابی پاتا ہو، یا اس نے اپنے ذہن میں عورت کی صورت و سیرت کا جو بلند معیار بنایا تھا، وہ اس معیار سے کچھ فروتر نظر آتی ہو، تو ایسے لوگوں کے بارے میں یہ انتہائی حکیمانہ بات کہی گئی ہے کہ وہ اوّل وہلہ ہی میں ان کی

اختیاری یا غیر اختیاری کمزوریوں کی وجہ سے ان سے نفرت نہ کرنے لگیں بلکہ ان کو ذرا صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے، ہو سکتا ہے کہ ایک عورت جس کی شکل و صورت رفتار و گفتار اور ناز و انداز اس کو پسند نہ ہو، مگر اس کا باطن بہت اچھا ہو مثلاً وہ انتہائی فرمانبردار اور کفایت شعار ہو، صابر و شاکر ہو، ہنر مند و سلیقہ مند ہو، بخلاف اس کے ہو سکتا ہے کہ ایک عورت اپنے حسن و جمال کے اعتبار سے اس کے معیار پر پوری اترتی ہو، لیکن سیرت و کردار اور اخلاق و معاملات میں بالکل صفر ہو۔ اس لئے ظاہری حسن و جمال سے محروم بیوی کی طرف سے نفرت و حقارت پیدا کرنے میں جلدی نہ کرنی چاہیئے، بلکہ صبر سے کام لینا چاہیئے، شکل و صورت اس کے اختیار کی چیز نہیں ہے۔ پھر حسن و جمال کی کشش عارضی ہوتی ہے، اور اخلاق و کردار کی کشش دائمی ہوتی ہے، اور دن بدن بڑھتی رہتی ہے۔

معروف اور غیر معروف طریقۂ معاشرت یا حسن سلوک کی پوری تفصیل حدیثِ نبوی میں ملے گی۔ چند حدیثیں یہاں نقل کی جاتی ہیں، آپ نے فرمایا:۔

خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ (ترمذی) — تم میں سب سے اچھا وہ شخص ہے، جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا ہو۔

"اپنے بارے میں آپ نے فرمایا کہ میں بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ تم میں سب سے بہتر ہوں"

آپؐ نے فرمایا:۔

خِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَائِھِمْ۔ (مسند احمد، ترمذی) — تم میں بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر ہیں۔

بیوی کے معاملے میں صبر و ضبط سے کام لینے کی جو ہدایت قرآن میں دی گئی ہے، آپ نے اس کی تفسیر میں فرمایا:۔

لَا یَفْرِکُ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَۃً اِنْ کَرِہَ مِنْھَا خُلُقًا رَضِیَ مِنْھَا اٰخَرَ۔ (مسلم) — مسلمان کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ اپنی بیوی میں کوئی برائی یا خلاف مرضی بات دیکھ کر اس سے نفرت کرنے لگے۔ اگر اس کو اپنی بیوی کی ایک

عادت ناپسند معلوم ہوتی ہے تو اس کی دوسری عادت
اسے پسند بھی آسکتی ہے۔

عورتیں چونکہ فطرتاً کمزور ہوتی ہیں، اس لئے ان کی طبیعت میں عام طور پر ضد اور ہٹ دھرمی ہوتی ہے، اور یہ کمزور آدمی کا خاصہ ہوتا ہے، اس لئے جب کبھی عورت سے کسی کمزوری کا ظہور ہو، تو اس کے دور کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ان کے ساتھ سختی و درشتی سے کام لیا جائے، بلکہ ان کو سمجھا بجھا کر اسے دور کرنا چاہیئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تشبیہ دے کر عورت کی اس فطری کمزوری کو سمجھایا اور اس کے دور کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ آپ نے فرمایا:-

اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ فَاِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ فَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهٗ كَسَرْتَهٗ وَاِنْ تَرَكْتَهٗ لَمْ يَزَلْ اَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ۔

(بخاری و مسلم)

عورت کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، عورت کی پیدائش پسلی سے ہوتی ہے اس لئے وہ اسی کے مانند کج ہے، اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو وہ ٹوٹ جائے گی، اور اگر تم اسی ٹیڑھے پن کے ساتھ اس سے کام لوگے، تو اچھا نتیجہ برآمد ہوگا، تو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

اس لطیف تشبیہ کو وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے، جو لوگ عربی نہیں جانتے، صرف انگریزی کے ترجمہ سے قرآن و حدیث کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اپنی ناسمجھی کی بنا پر اس پر اعتراض کرتے ہیں۔

۵۔ ظلم و زیادتی اور ایذا رسانی

اسی حسن سلوک کا تقاضا ہے کہ ان کے اوپر ظلم و زیادتی نہ کی جائے، ان کو ایذا، اور تکلیف نہ دی جائے، مثلاً ان کو بلا وجہ مارا نہ جائے، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے، ان کی دل شکنی نہ کی جائے، ان کے اوپر طعن و تشنیع نہ کی جائے، انھیں اپنے اعزّہ و اقربا، سے ملنے سے روکا نہ جائے، ان کی مادی ضرورتوں کے ساتھ ان کی نفسیاتی خواہشوں کے پورا کرنے کا بھی خیال کیا جائے، قرآن نے ظلم و زیادتی سے باز رہنے کا حکم اپنی منکوحہ عورتوں ہی کے بارے میں

نہیں بلکہ مطلقہ عورتوں کے بارے میں بھی دیا ہے:۔

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذَالِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ۔ (بقرہ)

ان کے اوپر زیادتی کرنے اور ایذا پہنچانے کے لئے ان کو نہ روک رکھو، اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا۔

۶۔ دینی کاموں کی وجہ سے عورت کی حق تلفی

بعض لوگ دین کے غلط تصوّر کی بنا پر نماز، روزہ یا دین کے کام میں ایسا منہمک ہوجاتے ہیں کہ عورتوں کے مادی اور جنسی حقوق سے ان کی توجہ بالکل ہٹ جاتی ہے، ایسا کرنا ثواب نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بے سہارا بندۂ خدا کی حق تلفی ہے اور حق تلفی بہرحال گناہ ہے، ایک بڑے ممتاز صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ ہر وقت نماز روزے میں لگے رہتے تھے، اور بیوی کی طرف ان کی کوئی توجہ نہیں تھی، آپؐ کو اطلاع ملی، تو آپؐ نے بلاکر تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ:۔

وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (مشکوٰۃ)

تمہاری بیوی کا بھی تمہارے اوپر حق ہے۔

حضرت عمرؓ چار پانچ ماہ کے بعد فوجیوں کو میدانِ جہاد سے اس لئے گھر واپس کردیا کرتے تھے کہ وہ اپنے حق زوجیت ادا کرسکیں۔

۷۔ بیویوں کے درمیان عدل

اسلام بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کی بنا پر ایک مرد کو بیک وقت چار عورتوں کو اپنے حبالۂ عقد میں لانے کی اجازت دیتا ہے، اگر کوئی شخص ایک سے زائد شادی کرتا ہے تو اس کو ان کے درمیان عدل قائم رکھنا ضروری ہوگا، اگر وہ عدل قائم نہ رکھ سکے تو پھر اس کو ایک سے زیادہ شادی کرنے سے روک دیا جاسکتا ہے، قرآن میں چار شادیوں کی اجازت دینے کے بعد یہ ہدایت دی گئی ہے:۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ (نساء)

اگر تم کو یہ خوف ہو کہ تم ان میں اعتدال قائم نہ رکھ سکو گے تو پھر ایک بیوی یا باندی پر اکتفا کرو۔

جو لوگ اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل ہی کے لئے شادی پر شادی کرنا چاہتے ہیں، ظاہر ہے وہ تو ہر اعتبار سے نئی آنے والی عورت کی طرف جھک جائیں گے، اور جو لوگ کسی ضرورت کی بنا پر دو یا کئی شادیاں کرتے ہیں وہ حقوق کی ادائیگی میں تو نہیں جھکتے، مگر میلانِ قلب کے اعتبار سے ضرور جھک جاتے ہیں۔ بہر حال کوئی وجہ ہو اگر وہ عدل قائم نہ کرسکیں تو ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ :-

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ۔ (نساء)	تمہاری خواہش کے باوجود یہ ممکن نہیں ہے کہ تم بیویوں کے درمیان عدل قائم کرسکو تو تم کم سے کم حقوق کی ادائیگی میں تو ایک کی طرف ایسا نہ جھک جاؤ کہ دوسری عورت کو بالکل معلق چھوڑ دو یعنی نہ اس کا شمار منکوحہ عورت میں ہو، نہ مطلقہ میں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دینی اور سیاسی مصالح کے تحت متعدد شادیاں فرمائیں، اور ان میں ہمیشہ عدل کو ملحوظ رکھا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے :-

كَانَ يُقَسِّمُ بَيْنَ النِّسَاءِ۔	آپ سب کی باری مقرر فرمادیا کرتے تھے، اور اسی کے مطابق آمد و رفت فرماتے تھے۔

اس عدل کے باوجود آپؐ یہ دعا فرماتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِي فِيمَا أَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِي فِيمَا تَمْلِكُ وَلَا أَمْلِكُ (ابوداؤد) یہ تقسیم میں نے اپنے اختیار سے کی ہے تو اس چیز میں جس پر تیرا قابو ہے میرا قابو نہیں ہے، اس پر میری ملامت نہ کرنا۔

اگر کسی ایک عورت کی محبت اس کی ظاہری یا باطنی خصوصیت کی بنا پر دل میں زیادہ ہو جائے تو اس پر انسان کا بس نہیں ہے، اور یہ عدل کے خلاف نہیں، اسی طرح صحبت کرنے میں بھی برابری ضروری نہیں ہے[1] اسی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں بیان فرمایا ہے،

---

[1] ومما یجب علی الأزواج للنساء العدل والتسویۃ فیما یملکہ لا فیما لا یملکہ [illegible] الحب والجماع۔ (فتاوی عالمگیری، ج ۲ ص ۳۰۲)

لیکن اوپر جن حقوق کا ذکر کیا گیا ہے، اور آئندہ جو حقوق بیان کئے جائیں گے، ان میں اگر کوئی شخص کمی کرتا ہے تو پھر وہ اخلاق اور قانون دونوں کی نظر میں مجرم ہے، آپ نے فرمایا کہ جس کے حبالۂ عقد میں دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں عدل نہ کرے تو قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کے بدن کا ایک حصہ بالکل بے کار ہو گا۔ (ترمذی)

(۱) تمام بیویوں کو ایک ہی حیثیت کا کپڑا، کھانا، زیور اور مکان دینا چاہیئے، خواہ نئی ہو یا پرانی، کنواری ہو یا بیوہ[1]۔ اگر کسی عورت کو اس نے کچھ زیادہ نفقہ وسکنیٰ دیا، یا ایک کو اچھی حیثیت کا نفقہ وسکنیٰ دیا اور ایک کو کم تر حیثیت کا تو جس کو کم تر حیثیت کا نفقہ وسکنیٰ دیا ہے، وہ دعویٰ کر کے قانونی طور پر اسی حیثیت کا نفقہ وسکنیٰ لے سکتی ہے۔

(۲) اگر ایک رات ایک عورت کے پاس گزارے تو دوسری رات دوسری عورت کے پاس گزارے، البتہ دن میں اس کو اختیار ہے کہ وہ جس عورت کے یہاں چاہے رہے، دن میں برابری ضروری نہیں ہے، لیکن اگر کوئی ایسا آدمی ہے جو دن میں گھر رہتا ہے اور رات میں کوئی کام کرتا ہے تو پھر اس کو رات کے بجائے دن میں برابری کرنی چاہیئے۔

(۳) اگر ایک عورت کے یہاں سرِ شام ہی پہنچ جاتا ہے اور دوسری کے یہاں دس گیارہ بجے رات کو جاتا ہے تو یہ عدل کے خلاف ہے، اس کو گناہ ہو گا۔

(۴) عورت سے مباشرت میں برابری ضروری نہیں ہے۔

(۵) شوہر بیمار ہو یا اچھا، رات کے وقت اس کو باری کے مطابق ہی رہنا چاہیئے۔ البتہ اگر کوئی عورت اس حالت میں اپنی باری دوسری کو دے دے تو پھر اس کو اختیار ہے، کہ جس کے یہاں چاہے رہے۔

شوہر کو یہ حق ہے کہ باری چاہے ایک ایک دن کی مقرر کر دے یا دو دو، چار دن یا مہینہ مہینہ کی مقرر کرے۔

---

[1] فیسوی بین الجدیدة والقدیمة والبکر والثیب والصحیحة والمریضة۔

(فتاوی عالمگیری، ج ۲ ص ۳۰۴)

(۷) اگر کسی بیوی سے اس کو محبّت زیادہ ہے، تو اس پر کوئی ملامت نہیں کی جاسکتی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ انسان کے قبضے کی چیز نہیں ہے، خدا دل جس کی طرف چاہتا ہے، پھیر دیتا ہے۔

(۸) سفر میں برابری ضروری نہیں ہے، جس کو چاہے اپنے ساتھ لے جائے، بہتر ہے کہ قرعہ ڈال لے[1]۔ سفر سے مراد کسی دینی یا دنیاوی ضرورت کی بنا پر عارضی طور پر دو چار دن یا دس بیس دن کے لئے کہیں جانا پڑے، مستقل طور پر جو لوگ ملازمت وغیرہ پر رہتے ہیں، ان کا وہی حکم ہے، جو اوپر مذکور ہوا۔

۸۔ بیوی بچّوں کی علمی و دینی تربیت

اوپر اس حدیث نبوی کا ذکر آچکا ہے، جس میں آپؐ نے ہدایت کی ہے کہ رشتۂ نکاح کے قائم کرنے میں لڑکے اور لڑکی کی ظاہری خوبیوں ہی کو وجہ ترجیح نہ بنایا جائے، بلکہ ترجیح کی بنیا دیں دین و اخلاق کو بنانا چاہیئے، ورنہ فساد عظیم برپا ہوگا، یہ حدیث اس کے علاوہ بعض اور احادیث اور قرآن کی بہت سی آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرد کے اوپر بحیثیت نگران و ذمے دار یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی بچوں کی دینی و اخلاقی تربیت بھی کرتا رہے، قرآن میں ہے:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا۔ (تحریم)

اے مسلمانو! اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح عام مسلمانوں کو دین کی باتیں بتاتے تھے، اسی طرح گھر میں اپنی ازواجِ مطہرات کو دین و حکمت کی باتیں بتاتے رہتے تھے، چنانچہ ازواجِ مطہرات کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ

اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیتیں

---

[1] وله أن يسافر ببعض نسائه دون البعض الأولى أن يقرع بينهن تطيبا لقلوبهن۔

(عالمگیری، ج ۲ ص ۳۵۵)

مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ۔ پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو۔ (احزاب)

حضرت مالک بن حویرثؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم چند نوجوانان اسلام لانے کے بعد خدمت نبوی میں حصول تعلیم کے لئے حاضر ہوئے اور آپ کی خدمت میں بیس دن رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی نرم خو اور رحم دل تھے، آپ کو بیس دن کے بعد یہ خیال ہوا کہ ہم لوگ گھر واپس جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے دریافت فرمایا کہ گھر میں کس کو چھوڑ آتے ہیں، جب ہم نے بتایا تو آپ نے فرمایا:۔

اِرْجِعُوْا اِلٰی اَھْلِیْکُمْ فَاَقِیْمُوْا فِیْھِمْ وَعَلِّمُوْھُمْ وَمُرُوْھُمْ۔ اپنے اہل و عیال میں واپس جاؤ اور ان ہی میں رہو سہو اور ان کو (علم دین) سکھاؤ اور ان کو نماز روزہ اور نیکی کا حکم دو۔ (بخاری و مسلم)

اس کے علاوہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو عام احکام قرآن و حدیث میں آتے ہیں، ان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آدمی کو باہر کی فکر سے پہلے گھر کی فکر کرنی چاہیئے، اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے اپنے قریبی لوگوں میں تبلیغ کا حکم دیا گیا تھا:۔

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ۔ اپنے کنبے و خاندان والوں کو انجام سے باخبر کر دو۔

بعض فقہاء نے اسی بنا پر لکھا ہے کہ اگر شوہر بیوی کو نماز کی تاکید کرتا ہے، اور وہ نماز نہیں پڑھتی، تو وہ طلاق دے سکتا ہے۔ اگرچہ وہ مہر دینے پر قادر نہ ہو (عالمگیری) دینی تربیت کی اسی اہمیت کے پیش نظر بعض ائمہ نے یہ اجازت بھی دی ہے کہ اگر کوئی آدمی عورت کا مہر مقرر کرے کہ ہم اس کو قرآن پڑھائیں گے تو اس سے بھی نکاح ہو جائے گا، گو اس کو نقد مہر بھی دینا پڑے گا۔

مگر بیوی کی اصلاح و تربیت میں ان احکام کو سامنے رکھنا چاہیئے جو اصلاح و تربیت کے سلسلے میں دیئے گئے ہیں، یعنی یہ اصلاح و تربیت، حکمت و موعظت اور موقع و محل کے ساتھ ہو، اس سے خالی نہ ہو، اس سلسلے میں وہ حدیث نبوی بھی سامنے رہنی چاہیئے، جس میں کہا گیا ہے کہ عورت کی اصلاح میں اس کی فطری کمزوری اور کجی کو ملحوظ رکھا جائے،

ورنہ وہ درست ہونے کے بجائے ٹوٹ جائے گی۔

بچّوں کی تعلیم وتربیت

اولاد کی تعلیم و تربیت باپ اور ماں دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے، مگر اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری باپ پر ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

من ولد له ولد فليحسن إسمه وأدبه فاذا ابلغ ولم يزوجه فاصاب اثما فانما اثمه على ابيه ۔ (مشکوٰۃ ص۲۷۱)	جس کا کوئی لڑکا ہو تو اس کا اچھا نام رکھنا چاہیئے اور اچھی طرح ادب سکھانا چاہیئے اور جب وہ بالغ ہو جائے اور اس کی شادی نہیں کی جس کی وجہ سے وہ کسی گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اس گناہ کی ذمہ داری اس کے باپ پر ہو گی۔

اسی طرح لڑکی کے بارے میں آپؐ نے توراۃ کے حوالہ سے فرمایا کہ لڑکی بارہ برس کی ہو جائے اور اس کی شادی باپ نے نہیں کی اور وہ کسی گناہ میں مبتلا ہو گئی تو اس کی ذمہ داری باپ پر ہو گی۔ (مشکوٰۃ ص۲۷۱)

مرد کے اوپر اپنے بیوی بچوں کی تعلیم و تربیت کی صرف اخلاقی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ یہ شرعی اور قانونی ذمہ داری ہے، قرآن پاک میں ہے، قوا انفسکم واھلیکم نارًا۔ (تحریم) اپنے کو اور اپنے بال بچّوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اس آیت کے نزول کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اپنے کو دوزخ سے بچانے کی بات تو سمجھ میں آگئی (کہ ہم گناہوں سے بچیں اور نیک کام کریں) مگر اہل وعیال کو کس طرح جہنم سے بچائیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں سے منع کیا ہے، اپنے ساتھ ان کو بھی اس کا حکم دو تو یہ چیز ان کو جہنم کی آگ سے بچائے گی (روح المعانی) اس میں ان کے ساتھ سختی کرنے کا پہلو بھی نکلتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ لا ترفع عصاك عن أهلك۔ (الادب المفرد)

لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت دو وجہ سے زیادہ ضروری ہوتی ہے،

ایک تو یہ کہ وہ قدرے مجبور رہتی ہیں، دوسرے اس لئے کہ آئندہ زندگی میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری انہی پر ہوتی ہے، اگر یہ درست رہیں گی تو اولاد درست رہے گی، قرآن نے اپنے کو جہنم سے بچانے کا جو حکم دیا ہے، لڑکی کے سلسلے میں اس کی تفصیل اس حدیث نبوی سے ہوتی ہے، آپؐ نے فرمایا:۔

من كانت لها ابنة فأدبها	جس کے کوئی لڑکی ہو اس نے اسے اچھی سے
فأحسن أدبها وعلمها فأحسن	اچھی تربیت دی اور ادب وتمیز سکھائی
تعليمها فأوسع عليها من نعم	اور پھر اچھی سے اچھی تعلیم دی پھر جو اللہ
الله التي أسبغ عليه كانت	نے اس کو نعمتیں دے رکھی ہیں اپنی وسعت
منعة وسترا من النّار۔	کے مطابق اس پر خوشدلی سے خرچ کیا تو
(الادب المفرد)	وہ اس کے لئے دوزخ سے پردہ بن جائیگی۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر میں اولاد کے درمیان عطیہ دینے میں ترجیح دینا پسند کرتا تو لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کو ترجیح دیتا۔ (کنز العمال)

ایک اچھے باپ کا اپنی اولاد کو سب سے بڑا عطیہ اچھی تعلیم وتربیت ہے ما نحل والد ولده من نحل افضل من أدب حسن (ترمذی) کسی باپ کا اپنے بچے یا بچی کے لئے سب سے بہتر عطیہ ان کی اچھی تعلیم وتربیت ہے۔ ایک حدیث میں ہے، اكرموا اولادكم وأحسنوا أدبهم (ابن ماجہ) اپنی اولاد کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ کرو اور ان کی اچھی تعلیم وتربیت کرو۔

حکومت کی ذمہ داری

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ تعلیم وتربیت کی اصلاً ذمہ داری تو باپ پر ہے مگر اس ذمہ داری میں حکومت کو شریک رہنا بھی ضروری ہے، بلکہ اس صورت میں جبکہ والدین نادار ہوں تو بچّوں کی تعلیم وتربیت کی پوری ذمہ داری حکومت کی ہے، آگے معاملات کے بیان میں اس کی تفصیل آئیگی۔

۹۔ خلع وتفریق

اگر کوئی مرد اپنے فرائض انجام نہیں دیتا تو عورت کو یہ حق ہے کہ وہ اس مرد سے صلح ومصالحت کے ذریعہ اپنے حقوق لینے کی

کوشش کرے، اگر صلح و مصالحت سے بات نہ بن سکے تو پھر وہ قانونی طور پر اسے حاصل کرے، اور اگر اس سے بھی وہ مطمئن نہ ہو، تو پھر اس کو حق ہے کہ وہ اس سے خلع و تفریق کرالے، خلع و تفریق کی تفصیل آگے آئے گی۔

عورتوں کے فرائض اور مردوں کے حقوق

اس سے پہلے مردوں کے فرائض اور عورتوں کے حقوق کی تفصیل کی گئی تھی، اب عورتوں کے فرائض اور مردوں کے حقوق کی تفصیل کی جاتی ہے۔ اسلامی شریعت نے عورتوں کے فرائض یا ان کے اوپر مردوں کے حقوق مندرجہ ذیل مقرر کئے ہیں:

(۱) بیوی کا سب سے پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کرے، عفت و عصمت کی حفاظت میں صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی آبرو کی حفاظت کرے، بلکہ جو چیزیں اس کی آبرو کو کسی درجے میں داغدار بناتی ہوں وہ ان کا ارتکاب بھی نہ کرے، مثلاً پردہ کرے، کسی نامحرم مرد سے بلا ضرورت بات چیت نہ کرے، شوہر کے علاوہ کسی محرم کے سامنے بھی چہرہ اور ہاتھ کے علاوہ سر، سینہ اور دوسرے اعضا کو کھلا نہ رکھے، بغیر اجازت گھر سے باہر نہ جائے۔ قرآن میں عورتوں کے بارے میں کئی جگہ کہا گیا ہے:-

حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ۔ (نساء)

نیک عورتیں وہ ہیں جو شوہر کی غیر موجودگی میں اللہ کی توفیق سے اپنی عزت و آبرو اور شوہر کی ہر چیز کی حفاظت کرتی ہیں۔

نیک عورت کی ایک خاص صفت قرآن پاک نے محصنات بیان کی ہے، حصن کے معنی قلعہ کے ہوتے ہیں، یعنی اچھی عورتیں اپنی عصمت و عفت کے لئے قلعہ کے مانند ہوتی ہیں کہ اس پر کوئی ہاتھ نہ ڈال سکے۔

(۲) عورت کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے مال کی حفاظت کرے، اوپر جو آیت نقل کی گئی ہے، اس میں عزت و آبرو کی حفاظت کے ساتھ مال کی حفاظت بھی

شامل ہے، حدیث نبویؐ میں بھی عصمت و عفت کی حفاظت اور مال کی حفاظت دونوں کے بارے میں سخت تاکید آئی ہے۔ آپ نے ایک صالح عورت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:۔

وَلَا تُخَالِفُهُ فِي نَفْسِهَا وَمَالِهٖ بِمَا يَكْرَهُ۔ (نسائی و بیہقی)	جس چیز کو شوہر اس کے نفس اور اپنے مال کے بارے میں ناپسند کرتا ہے، اس کے خلاف وہ نہ کرے۔

آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص چار چیزیں پا جائے وہ دنیا کی سب سے بڑی دولت پا گیا، ایک شکر گذار قلب، دوسرا اللہ کو یاد کرنے والی زبان، تیسرے ایسا جسم جو آزمائش کے وقت صابر ہے، چوتھے زَوْجَةٌ لَا تَبْغِيهِ خَوْنًا فِي نَفْسِهَا وَلَا فِي مَالِهٖ (بیہقی شعب الایمان) ایسی عورت جو اپنے نفس (عزت و آبرو) اور شوہر کے مال میں خیانت نہ کرے۔

مال کی حفاظت یہ بھی ہے کہ گھر کی کوئی چیز شوہر کی اجازت کے بغیر کسی کو نہ دے حتّٰی کہ اگر وہ کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر صدقہ کر دے، تو اس کا ثواب شوہر کو اور عذاب عورت کو ہوگا، اور شوہر کو اس سے باز پُرس کرنے اور اس چیز کو یا اس کی قیمت کو واپس لینے کا حق ہوگا۔

(۳) عورت کا تیسرا فرض یہ ہے کہ عورت ہر نیک کام اور حق بات میں شوہر کی اطاعت کرے، قرآن میں ہے:۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ۔ (نساء)	نیک عورتیں وہ ہیں جو فرمانبردار ہوتی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تقویٰ کے بعد آدمی کے لئے، اللہ کی سب سے بڑی نعمت صالح عورت ہے اور صالح عورت وہ ہے کہ شوہر جو اس سے کہے اسے وہ مانے اور جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے، اور اگر شوہر قسم کھا کر یعنی اس کے اعتماد پر کوئی بات کہہ دے تو وہ اسے پورا کر دے، اور جب وہ گھر میں نہ ہو تو اپنے نفس کی اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔ (ابن ماجہ)

آپؐ نے فرمایا کہ جو عورت نماز روزے کی پابندی کے ساتھ اپنی عزّت و عصمت

کی حفاظت کرے اور شوہر کی فرماں برداری کرے، تو (اس کا یہ مرتبہ ہے کہ) وہ قیامت کے دن جنت کے جس دروازے سے چاہے اس میں چلی جائے۔ (مشکوٰۃ)

شوہر کی اطاعت کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) شوہر کی اطاعت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر نہ تو اس کو نفل نمازیں پڑھنی چاہئیں اور نہ نفل روزے رکھنا چاہئیں، اور نہ فرض نماز بہت لمبی اور دیر تک پڑھنی چاہیئے۔ حدیث میں آتا ہے کہ صفوان بن معطّل کی بیوی خدمتِ نبوی میں آئیں، اور بولیں کہ میرے شوہر مجھے نماز پڑھنے پر مارتے ہیں، روزہ رکھتی ہوں تو تڑوا دیتے ہیں، اور خود فجر کی نماز سورج نکلنے کے بعد پڑھتے ہیں۔ اتفاق سے صفوان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھے، آپؐ نے ان سے حقیقتِ حال دریافت کی، تو بولے کہ ان کا یہ کہنا کہ میں مارتا ہوں، تو ان کا حال یہ ہے کہ یہ جب نماز شروع کرتی ہیں تو دو دو بڑی بڑی سورتیں ایک ایک رکعت میں پڑھتی ہیں اور میں نے بار بار ان سے منع کیا مگر یہ نہیں مانتیں، اس لئے میں اس پر ان کو مارتا ہوں۔ آپ نے خاتون سے فرمایا کہ اگر ایک چھوٹی سورۃ یا آیت پڑھ لی جائے تب بھی نماز ہو جاتی ہے، پھر صفوان نے کہا کہ ان کا یہ کہنا کہ میں روزے تڑوا دیتا ہوں تو یہ جب نفل روزے شروع کرتی ہیں تو رکھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ اور میں ایک نوجوان آدمی ہوں اپنے اوپر قابو نہیں پاتا اس لئے ایسا کرتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ کوئی عورت نفل روزہ بغیر شوہر کی اجازت کے نہ رکھے، اور اپنی نماز کی تاخیر کے بارے میں یہ عذر پیش کیا کہ ہم لوگ رات کو دیر تک محنت مزدوری کرتے ہیں، اس لئے اٹھنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

(۲) عورت کتنے ہی ضروری کام میں کیوں نہ لگی ہوئی ہو جب شوہر اسے بلائے تو اس کی طرف متوجہ ہو جانا اور اس کے پاس پہونچ جانا چاہیئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

إِذَا دَعَا الرَّجُلُ زَوْجَتَهُ لِحَاجَتِهِ فَلْتَأْتِهِ وَإِنْ كَانَتْ عَلَى التَّنُّوْرِ۔ (ترمذی)

اگر شوہر اپنی بیوی کو ضرورت پوری کرنے کے لئے بلائے تو فوراً اس کے پاس چلی جائے۔ خواہ وہ چولھے پر ہی کیوں نہ بیٹھی ہو۔

ضرورت سے بلانے کا مطلب ہر طرح کی ضرورت ہے، مگر یہاں خاص طور پر جنسی ضرورت مراد ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ یہ اطاعت محض امرِ حق اور بھلے کام میں ہونی چاہیئے، اگر کوئی شوہر اس کو برائی کا حکم دے، یا برے کام کے لئے مجبور کرے، تو اس کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔ مثلاً بے پردہ رہنے کے لئے کہے، سینما دکھانے لے جائے، دوستوں سے ملاقات کے لئے مجبور کرے، فرض نماز یا فرض روزے سے روکے، بے حیائی کے لئے مجبور کرے، تو ایسے تمام بُرے کام کرنے سے اس کو صاف صاف انکار کر دینا چاہیئے خواہ شوہر خوش ہو یا ناخوش۔ اسکے تعلقات اس سے اچھے رہیں یا بُرے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔ — خدا کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کرنی چاہیئے۔

۴ ضروریات زندگی کی طلب میں اعتدال

عورت کا یہ بھی فرض ہے کہ شوہر کی حیثیت اور اس کی آمدنی کا خیال کر کے اپنی ضروریات پوری کرائے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ ازواج مطہرات نے تعیش و آرام کے لئے نہیں، بلکہ اپنی ضروریات کے لئے کچھ زیادہ نفقہ طلب کیا، تو ان کو سخت تنبیہ کی گئی، اسی بنا پر عورتوں کو بے ضرورت تزئین و آرائش سے منع کیا گیا ہے، تاکہ ان میں بے جا طلب نہ پیدا ہو۔ عہد نبوی میں عورتیں اپنے سر کے بالوں کو خوبصورت بنانے کے لئے کچھ خارجی بال لگا لیا کرتی تھیں، اس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا۔ فَاِنَّهٗ زُوْرٌ تَزِيْدُهٗ فِيْهِ (نسائی) یہ ایک طرح کا فریب ہے، آپ نے اسی بنا پر گُدنے گُدوانے اور اپنے چہرے کے روئیں صاف کرنے اس کی حد سے زیادہ تراش خراش کرنے، دانتوں کو رگڑ رگڑ کر چمکانے سے منع فرمایا ہے۔ (مسند احمد)

اوپر ایک حدیث کا ذکر آچکا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ سب سے مبارک رشتۂ نکاح وہ ہے جس میں آدمی کو کم سے کم اخراجات کی پریشانی اٹھانی پڑے' (احمد) پھر حدیث میں

ایسی عورت سے نکاح کی ترغیب دی گئی ہے جو دین و اخلاق کے ساتھ کم سے کم ضروریاتِ زندگی پر راضی ہو جائے۔

۵۔ احسان شناسی

عورت کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ احسان شناس بنیں، عورتوں کی ایک بڑی اور عام کمزوری احسان ناشناسی بھی ہے۔ یعنی اگر ان کے ساتھ زندگی بھر سلوک کرتے رہیئے، اور ایک دو بار ذرّہ برابر بدسلوکی کر دیجئے، تو پھر ساری زندگی کے سلوک کو بھلا کر صرف اس کی ایک بدسلوکی کو یاد رکھیں گی۔ اور وقت بے وقت اس کو دُہراتی رہیں گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ناشکری کی وجہ سے عورتیں زیادہ تر دوزخ میں ڈالی جائیں گی۔ اس کی وجہ آپؐ نے فرمائی کہ عورتیں سب سے زیادہ ناشکری کرتی ہیں۔ يَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَةَ۔ یہ (عورتیں) اپنے شوہروں کی ناشکری کرتی رہتی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو شوہر کے ساتھ احسان شناسی اور شکرگذاری کا رویّہ اختیار کرنا چاہیئے۔ یعنی وہ محنت مزدوری کر کے جو کچھ اسے دیتا ہے، اس کو خدا کا شکر ادا کر کے خندہ پیشانی سے قبول کر لینا چاہیئے، البتہ اگر وہ اپنی حیثیت سے کم دیتا ہے، یا اپنے کھانے پینے کے پیچھے اس کی پرواہ نہیں کرتا تو اس کو بولنے کا حق ہے، اور یہ بولنا احسان ناشناسی نہیں ہوگی۔

۶۔ رضاعت

دوسرے فرائض کے ساتھ عورت کا بحیثیت ماں ایک فرض اپنے بچے کو دودھ پلانا بھی ہے، گو بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ ماں کے ذمّے سے یہ فرض ہٹ جاتا ہے مگر یہ ذمّے داری ہے ماں ہی کی ہی قرآن میں اس فرض کے احکام کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے:۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ	اور مائیں پورے دو سال تک اپنے بچوں
حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ	کو دودھ پلایا کریں یہ بات اس کے لئے ہے
الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُنَّ	جو پوری مدّت دودھ پلوانا چاہے اور باپ
رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ	کے اوپر قاعدے کے مطابق ان مرضعہ ماؤں
لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا	کا کھانا کپڑا ہے، ہر شخص کو اس کی برداشت

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ۔

(بقرہ)

کے مطابق ہی حکم دیا جاتا ہے نہ تو کسی ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف پہونچائی جائے اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے۔ اور اگر باپ نہ ہو تو اسی طرح ورثہ کو کرنا چاہیئے۔ اگر دونوں آپس کی رضامندی اور مشورے سے وقت سے پہلے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر تم کسی دوسری عورت سے اپنے بچوں کو دودھ پلوانا چاہتے ہو تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے، بشرطیکہ تم حسب دستور ان کو معقول اجرت دے دو۔

ان آیات کی روشنی میں فقہاء نے حسب ذیل احکام مستنبط کئے ہیں۔

دودھ پلانا کب واجب ہے اور کب مستحب

بعض صورتوں میں ماں پر دودھ پلانا واجب ہے اور بعض صورتوں میں مستحب۔ دونوں صورتوں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

(۱) اگر باپ کم حیثیت ہے، تو ماں کے اوپر دودھ پلانا واجب ہے[۱]۔ جیسا کہ قرآن کے پہلے ٹکڑے والوالدات یرضعن اولادھن میں کہا گیا ہے، حتیٰ کہ اگر اس کو طلاق ملجائے تو عدت بھر بغیر اجرت کے اس کو دودھ پلانا چاہیئے۔ (تفسیر مظہری)

(۲) اسی طرح اگر بچہ ماں کے علاوہ کسی کا دودھ نہیں پیتا، تو بھی عورت پر بچے کو دودھ پلانا واجب ہے۔

واجب کا حکم

جن صورتوں میں ماں کو دودھ پلانا واجب ہے، ان میں عورت نہ تو اجرت مانگ سکتی ہے، اور نہ اس خدمت سے انکار کر سکتی ہے، نان نفقہ ہی

---

[۱] فان لم یکن للأب ولا للولد الصغیر مال تجبر الأم علی الارضاع عند الکل۔
(خانیہ بر عالمگیری ص۵۵ ج ۲)

اس کی اجرت ہے اگر اس سے زیادہ مطالبہ کرے گی تو گناہ گار ہوگی، اور اس کو دودھ پلانے پر قانوناً مجبور کیا جائے گا، کیونکہ ماں اگر دودھ نہ پلائے گی، تو باپ کو خواہ مخواہ ایک زحمت اٹھانی پڑے گی اور قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ (بقرہ) یعنی باپ اپنے لڑکے کی وجہ سے زحمت و مشقت میں نہیں ڈالا جا سکتا۔

جن صورتوں میں واجب نہیں ہے

ان صورتوں میں دُودھ پلانا واجب نہیں ہے، (۱) اگر مرد مالدار ہے اور وہ کسی عورت کو اجرت پر رکھ کر دودھ پلوا سکتا ہے تو اس صورت میں اگر ماں دودھ پلانے سے انکار کرتی ہے، تو اس کو اس کا حق ہے۔

(۲) اگر ماں مریض ہے، یا بہت کمزور ہے، تو باپ کا فرض ہے کہ وہ ماں سے دودھ نہ پلوائے، ورنہ عورت کی صحت کو نقصان پہونچے گا، اور قرآن میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا ماں اپنے بچے کی وجہ سے کسی مشقت میں نہیں ڈالی جا سکتی۔

جس صورت میں ماں دودھ پلانے سے معذور ہے، یا معذور تو نہیں ہے مگر باپ باحیثیت ہے اور وہ دودھ نہیں پلاتی ہے تو اس صورت میں نہ تو وہ گنہ گار ہوگی اور نہ باپ اس کو دودھ پلانے پر مجبور کر سکتا ہے، نہ عورت پر قانونی دباؤ ڈال سکتا ہے، لیکن جب ماں کو کوئی مرض یا مجبوری نہیں ہے، تو صرف زحمت سے بچنے کے لئے یا شوہر کی خوش حالی سے فائدہ اٹھانے کے لئے بچے کو دودھ نہ پلانا بڑی بے مروّتی کی بات ہے۔ کیونکہ یہ عورت کا فرض ہے، گو شوہر کی خوش حالی کی صورت میں اس پر قانوناً پابندی نہیں ہے، مگر یہ کچھ اچھی بات نہیں ہے کہ ماں اپنے بچے کے ساتھ اتنی محبّت بھی نہ رکھے کہ اس کو اپنے دودھ تک سے بھی محروم کر دے پھر اس لئے بھی ایسا نہ کرنا چاہیئے کہ دودھ کا اثر صرف بچے کے جسم ہی پر نہیں بلکہ اس کے اخلاق و کردار پر بھی پڑتا ہے، اس لئے وہ جس طرح کی عورت کا دودھ پیئے گا ایسا ہی اس کا اخلاق و کردار ہوگا اور اس معیار کی عورت ملنا آسان نہیں ہے، اس لئے ماں ہی زیادہ بہتر ہے۔

دیگر مسائل

اگر ماں کا دودھ بچے کو نقصان کرتا ہے، یا ماں کی دینی و اخلاقی حالت اچھی نہیں ہے، تو باپ کا فرض ہے کہ وہ اس کے بجائے کسی ایسی عورت

سے دودھ پلوائے، جس کا دودھ بچے کے جسم کے لئے بھی مفید ہو، اور اس کے دین و اخلاق پر بھی کوئی برا اثر نہ پڑے۔

(۲) بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ماں بچے کو دودھ پلانا چاہتی ہے اور اس کا دودھ بچے کی صحت کے لئے مضر بھی نہیں ہے، مگر باپ اپنی کسی جذباتی خواہش کی بنا پر ماں کو اس سے روکتا ہے تو باپ کو ایسا نہ کرنا چاہیئے۔ لَا تُضَارَّ وَالِدَۃٌ بِوَلَدِھَا میں اس کی ممانعت بھی ہے۔

(۳) کسی دوسرے کے لڑکے کو شوہر کی اجازت کے بغیر عورت کو دودھ نہ پلانا چاہیئے،[۱] البتہ کسی بچہ کی جان بچانے کے لئے بے اجازت بھی پلا سکتی ہے۔

رضاعت کی مدّت رضاعت کی مدت دو برس ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔ وَالْوَالِدَاتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَۃَ۔[۲] مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں ــ یہ بات اس کے لئے ہے جو اس کی تکمیل چاہتا ہو۔

ماں باپ کا مشورہ اگر ماں باپ دونوں مشورے سے بچے کو ماں کے بجائے کسی اور سے دودھ پلوائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَکُمْ۔ میں اسی کی طرف اشارہ ہے، اسی طرح اگر وہ

---

[۱] ویکرہ للمرأۃ ان ترضع صبیاً بلا اذن زوجھا الا اذا خافت ھلاکہ۔ (شامی ج ۲ ص۵۵)

[۲] دوسرے ائمہ کا بھی یہی مسلک ہے، فقہ حنفی کی کتابوں میں عام طور پر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ لکھا ہوا ہے کہ مدت رضاعت ڈھائی برس ہے، مگر یہ رائے قرآن کی اس صریح آیت اور احادیث کی روشنی میں صحیح نہیں ہے، اور ان کی اس رائے کے سلسلہ میں قرآن کی آیت وحملہ وفصالہ ثلاثون شھرا، اور بعض احادیث سے جو استدلال کیا جاتا ہے ان کے بارے میں مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلیؒ نے لکھا ہے کہ فکل ما استدلوا لاثبات مذھب ابی حنیفۃ باطل (شرح وقایہ ج ۲ ص۶۴) اسی بنا پر صاحبین نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

آپس کے مشورے سے دو سال پہلے ہی بچے کو دودھ چھڑا دیں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، جیسا کہ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا (بقرہ ۵) سے معلوم ہوتا ہے۔

رضاعت کی اُجرت

(۱) اگر کوئی اجنبی عورت کسی بچے کو دودھ پلاتی ہے اور اس کی اجرت مانگتی ہے، تو بچے کے باپ یا ورثہ کا فرض ہے کہ وہ اس کو کھانا کپڑا یا نقد دے کر اس سے دودھ پلوائیں۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّا اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ میں اسی طرف اشارہ ہے، یعنی اگر تم کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانا چاہو تو اس کو بھلے طریقہ سے اس کی اجرت دے لو تب دودھ پلواؤ۔

(۲) ماں جب تک اس شوہر کے نکاح میں ہے، جس کا یہ لڑکا ہے تو اس کو نفقے کے علاوہ شوہر سے دودھ پلانے کی الگ سے اجرت مانگنے کا حق نہیں ہے۔

(۳) ایک ماں اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی مگر کسی وجہ سے شوہر نے طلاق دے دی، تو اب عدّت تک عورت کو بلا کسی اجرت کے دودھ پلانا پڑے گا، کیونکہ عدت بھر شوہر پر اس کا نان نفقہ واجب ہے، مگر عدت گزر جانے کے بعد وہ اجرت طلب کر سکتی ہے، اور باپ کو دینی پڑے گی۔

اگر باپ بچے کی مطلقہ ماں سے عدت کے بعد دودھ نہیں پلواتا بلکہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلواتا ہے، تو اگر ماں اجرت طلب کرتی تھی اور دوسری عورت مفت میں دودھ پلا رہی ہے تب تو باپ کو اسی عورت سے دودھ پلوانا چاہیئے، لیکن اگر یہ عورت بھی اجرت لیتی ہے، تو اگر یہ اجرت مطلقہ ماں کی اجرت سے کم ہے، تو اس صورت میں بھی باپ دوسری عورت سے دودھ پلوا سکتا ہے، لیکن اگر دونوں کی اجرت برابر ہے، یا دوسری عورت کی اجرت زیادہ ہے تو پھر باپ کے لئے ضروری ہے کہ اس بچے کو اس کی مطلقہ ماں سے دودھ پلوائے اور اجرت دے۔

رضاعت کا ثبوت

(۱) اگر رضاعت کے سلسلے میں اختلاف ہو جائے تو دو مردوں یا ایک مرد دو عورتوں کی گواہی سے وہ ثابت ہو جائے گی، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ چار عورتوں کی گواہی کو بھی صحیح سمجھتے ہیں[1]

۶۔ حضانت یعنی بچے کی پرورش

بچے کی پرورش کرنے کو عربی میں حضانت کہتے ہیں۔ شوہر و بیوی کے فرائض کے سلسلے میں دونوں کا ایک اہم فرض بچہ کی پرورش بھی ہے۔ گویہ دونوں کا مشترکہ حق ہے یعنی بچے کی پرورش دونوں کو مل جل کر کرنا چاہیئے۔ اوپر دودھ پلانے کے سلسلہ میں جو ماں باپ کے حقوق کی تفصیل کی گئی ہے وہ بھی اسی حضانت ہی کی ایک شاخ ہے، بچے کی ابتدائی پرورش ہی پر اس کی ساری زندگی کی اچھائی اور برائی کا دارو مدار ہے، اس لئے اس فرض کے سلسلہ میں ماں باپ کو غفلت نہ کرنی چاہیئے، ورنہ دنیا میں بھی اس کے برے نتائج سامنے آئیں گے، اور آخرت میں بھی اس کی باز پرس ہو گی۔

مگر چار پانچ برس کی مدّت تک بچہ کا تعلق سب سے زیادہ ماں سے ہوتا ہے، اس لئے اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری اسی کے اوپر ہے، آپ نے قریش کی عورتوں کی تعریف کرتے ہوتے فرمایا کہ صالح نساء قریش أحناه على ولد فی صغره وأرعاه على زوج فی ذات یده۔ (بخاری ومسلم، مشکوٰۃ ص۲۶۷) یعنی قریش کی سب سے نیک عورت وہ ہے جو اپنے بچے پر بچپن میں سب سے زیادہ شفیق اور اپنے شوہر کے مال کی محافظ ہو۔

بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی اہمیت

بچے کی پرورش کی ذمہ داری کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ماں باپ اس کی جسمانی پرورش اور نشوونما کا سامان فراہم کر دیں، بلکہ اس کی

---

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۴ ص۲۷۶، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح مالی معاملات میں شہادت معتبر ہے، اسی طرح اس میں بھی معتبر ہے۔

جسمانی نشو ونما کے ساتھ اس کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح اور اس کی تعلیم و تربیت بھی ان کے اوپر واجب ہے، دونوں طرح کی تربیتوں کی شریعت میں تاکید آتی ہے، خاص طور پر ان کی دینی اصلاح اور تعلیم و تربیت پر قرآن پاک اور حدیث نبوی میں بہت زور دیا گیا ہے اوپر اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔

جسمانی پرورش کے احکام

قرآن کے حکم کے مطابق ماں کا فرض ہے کہ بچے کو پیدا ہوتے ہی دودھ پلانا شروع کر دے، اور اگر وہ معذور ہو یا باپ کو استطاعت ہو یا دونوں راضی ہوں تو وہ دوسری عورت سے بھی دودھ پلوا سکتے ہیں، اگر کوئی ماں باپ ایسے ظالم ہوں کہ وہ اس فرض کو نہ انجام دیں تو وہ سخت گنہ گار ہوں گے، اگر ماں باپ کا انتقال ہو چکا ہو یا وہ معذور ہوں تو اس کی پرورش نانا، نانی اور دادا، دادی کریں گے۔ اور اگر نانا، نانی یا دادا، دادی وغیرہ کوئی نہ ہو تو دوسرے قریبی رشتہ داروں کو اس کی پرورش کرنا ضروری ہے، اگر کوئی قریبی رشتہ دار نہ ہو تو خاندان کے لوگ اس کی پرورش کریں، ماں باپ یا رشتہ داروں میں سے کوئی اگر اس بچے کی پرورش نہ کرے تو ایسے بچے کی پرورش کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر ہوگی، پہلے وہ ماں باپ یا رشتہ داروں کو اس کی پرورش کرنے پر مجبور کرے گی۔ اگر کسی وجہ سے وہ معذور ہوں گے تو اس کا خرچ حکومت خود برداشت کرے گی۔

بچوں کی پرورش اور تربیت کے سلسلے میں لوگ عموماً لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کا زیادہ خیال کرتے ہیں، اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر لڑکیوں کی پرورش کی تاکید کی ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

من کانت لہ انثیٰ فلم یئدھا	جس کے کوئی لڑکی ہو اور اس نے اس کو
ولم یھنھا ولم یؤثر ولدہ علیھا	زندہ درگور نہیں کیا اور لڑکوں کو اس پر
یعنی الذکور أدخلہ اللہ الجنۃ۔	ترجیح نہیں دی تو اللہ تعالیٰ اس کو جنّت
(ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الشفقۃ ص۴۲۳)	میں داخل کرے گا۔

دوسری حدیث میں۔ یہی فضیلت اور حکم بہنوں کے بارے میں بھی ہے:۔

من عال ثلث بنات او مثلهن من الأخوات فأدبهن ورحمهن حتیٰ یغنیهن الله أوجب الله له الجنة۔

جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی۔ یا اسی طرح تین بہنوں کی، پس ان کو ادب سکھایا اور ان پر شفقت کی، یہانتک کہ اللہ تعالیٰ اس کو ان سے بے نیاز کر دے تو اس شخص کے لئے جنت واجب ہوگئی۔

ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ حکم دو لڑکیوں کا بھی ہے، آپؐ نے فرمایا کہ ہاں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ایک کے بارے میں سوال کرتا تو ایک کے بارے میں بھی آپ یہی فرماتے[۱] (شرح السنہ)

---

[۱] اس سلسلہ میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر لڑکا ہے تو تین شرطوں کے ساتھ اس کا نفقہ باپ پر واجب ہے، (۱) ایک شرط یہ ہے کہ خود اس لڑکے کے نام کوئی جائداد یا روپیہ پیسہ نہ ہو، (۲) دوسری شرط یہ ہے کہ لڑکا نابالغ ہو، اگر لڑکا بالغ ہے اور اس کو کوئی جسمانی معذوری نہیں ہے، تو لڑکے کو خود محنت و مزدوری کر کے اپنے اخراجات کی ذمہ داری اٹھانی ضروری ہے، لیکن اگر کوئی جسمانی معذوری ہو، یا اس کے پاس کوئی مال نہ ہو تو جب تک زندہ رہے باپ پر اس کے خرچ کی پوری ذمے داری ہے، اس کے ساتھ باپ کو یہ اختیار رہے کہ اپنے نابالغ لڑکے سے کوئی کام کرائے اور اس سے اس کے اخراجات پورا کرائے۔ الاّیہ کہ لڑکا مستقل طور سے دین کی تعلیم حاصل کر رہا ہو تو وہ بالغ ہو یا نابالغ اس کے اخراجات کی ذمہ داری باپ پر ہے۔ باپ کو یہ حق نہیں کہ اس کو طلب علم سے روک دے، (۳) تیسری شرط یہ ہے کہ وہ آزاد ہو غلام نہ ہو۔

یہ لڑکے کا حکم تھا، اگر لڑکی ہو تو دو شرطوں کے ساتھ لڑکی خواہ بالغ ہو یا نابالغ اس کے اخراجات کی ذمہ داری باپ پر ہے، (۱) پہلی شرط یہ ہے کہ لڑکی کے نام کوئی جائداد نہ ہو اور نہ بینک وغیرہ میں کوئی روپیہ ہو، اگر وہ صاحب جائداد ہو گی تو اسی سے اس کا خرچ پورا کیا جائے گا، لیکن اگر اس کے پاس کوئی جائداد نہ ہو تو باپ کو یہ حق نہیں ہو گا لڑکے کی طرح لڑکی سے بھی کوئی کام کرائے اور

(بقیہ حاشیہ صـ پر)

بچّوں کی پرورش کی اہمیت کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے دودھ چھوڑنے کے بعد ہر بچّے کا وظیفہ مقرر کردیا تھا، بعد میں جب ان کو علم ہوا کہ مائیں وقت سے اس لئے پہلے دودھ چھڑا دیتی ہیں کہ ان کو وظیفہ مل جاتے تو پھر آپ نے پیدا ہوتے ہی ہر بچے کا وظیفہ مقرر کردیا۔

بچے کی پرورش کی مدت

لڑکے کی پرورش کی مدت سات برس ہے، اور لڑکی کی پرورش کی مدت نو برس ہے، اس مدت تک پرورش کی نگرانی ماں کے ذمہ ہوگی، اور ماں اور بچہ دونوں کا خرچ باپ کو برداشت کرنا ہوگا اور

(بقیہ حاشیہ صـ کا)

اس کی کمائی سے اس کا خرچ پورا کرے۔ البتہ باپ اگر لڑکی کو کوئی کام سیکھنے کے لئے لگادے، مثلاً سلائی، کڑھائی یا بنائی وغیرہ تو اس سیکھنے کی حالت میں اگر اس کو کچھ پیسہ مل جائے تو باپ اس کو اس کے اوپر خرچ کرسکتا ہے، یعنی وہ خدمت کراکے یا محنت و مزدوری کراکے اس سے کمائی نہ کرائے۔

(۲) لڑکی کے سلسلہ میں بھی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ آزاد ہو، لونڈی نہ ہو، اگر باپ، ان شرائط کے ساتھ بچوں اور بچیوں کا خرچ پورا نہ کرے تو اسلامی حکومت کا قاضی اسے قید تک کرسکتا ہے۔

فاذا کان الأب موسرو امتنع عن النفقة حبس فی نفقتھم۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الأربعۃ، ج ۴ صـ ۵۸۶)	اگر باپ خوش حال ہو، اور اولاد کا نفقہ نہ دے، تو اسے اس جرم میں قید کیا جاسکتا ہے۔

اگر باپ نہ ہو تو دادا اور پھر ماں پر اس کی ذمے داری آتی ہے۔ ائمہ ثلاثہ بھی قریب قریب ان شرائط میں متفق ہیں۔ البتہ امام احمد بن حنبل لڑکے کے موسر یعنی صاحب مال ہونے کے سلسلے میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

ویساً رھم یکون بقدرتھم علی الکسب والانفاق علی انفسھم أو یکون لھم مال۔ (ایضاً صـ ۵۸۸)	ان کے صاحب حیثیت ہونے میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کو کمانے اور خرچ کرنے کی قدرت ہو، یا پھر کوئی مال، یا جائیداد اس کے ہو۔

یہ ماں کا ایسا حق ہے کہ اگر اس کو طلاق مل چکی ہو جب بھی بچے کو سات برس تک اور بچی کو نو برس تک اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور باپ سے اس کے اخراجات لے سکتی ہے۔ باپ اس بچے کو نہیں لے سکتا، البتہ اگر طلاق کے بعد ماں خود خوشی سے بچے کو حوالہ کر دے، یا وہ اجنبی جگہ نکاح کر لے تو پھر باپ کو اس کی پرورش کرنی ہوگی۔ اور وہ اس کی مطلقہ ماں کو پرورش کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت آئی اور اس نے کہا یا رسول اللہ! یہ میرا بچہ ہے، جو میرے پیٹ میں پلا ہے، میری چھاتی کا دودھ پیتا ہے، اور جس کے لئے میری گود آرام گاہ ہے، اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے، اور میرے اس لخت جگر کو مجھ سے جدا کر لینا چاہتا ہے۔ آپ نے اس کی داستان غم سنا کر فرمایا کہ أنت احق به مالم تنكحى۔ تم اس وقت تک اس کی زیادہ مستحق ہو، جب تک تم دوسرا نکاح نہ کرلو۔ (ابو داؤد)

اگر عورت خدا نخواستہ مرتد ہو جائے یعنی اپنا دین بدل دے تو بچے کو اس کی پرورش اور نگرانی میں نہیں دیا جا سکتا، اسی طرح اگر وہ بد اخلاق و بدکردار ہو یعنی اس میں ایسے اخلاقی عیوب ہوں مثلاً زنا، چوری، گانا، بجانا وغیرہ جن کی موجودگی میں بچے کے دین و اخلاق کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی عورت کی نگرانی اور گود میں بچے کو نہیں دیا جا سکتا۔ صاحب در مختار فاجرہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

يضيع الولد به كزنا وغناء وسرقة[2] (ج ۲ ص ۶۳۳)	ایسے عیوب مثلاً زنا، گانا، بجانا اور چوری جس سے بچہ برباد ہو جائے۔

---

[1] وبنكاح غير محرم يسقط حقها۔ (شرح وقایہ، ج ۲ ص ۱۶۹)۔

[2] ابن عابدین اس مسئلہ پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ والحاصل ان الحاضنة ان كانت فاسقة فسقاً يلزم منه ضياع الولد عندها سقط حقها (ج ۲ ص ۶۳۴) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جو عورت تارک صلاۃ ہو، اس کی پرورش میں بھی بچہ کو نہیں دیا جا سکتا۔

پھر لکھتے ہیں کہ عام طور پر "فاجرہ" کا لفظ فقہائے احناف مطلقاً لکھتے ہیں، اس سے وہ عورت بھی مراد لی جاسکتی ہے، جو مستقلاً تارک نماز ہو اور یہی مسلک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔

بعض علماء نے یضیع الولد کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر کوئی ایسی عورت ہے جو نماز روزے میں اتنی مشغول ہے کہ اپنے بچے کی پرورش کا اس کو مطلقاً خیال نہ رہتا ہو تو ایسی عورت کی نگرانی میں بھی بچہ کو نہیں دیا جاسکتا، مگر اس سلسلہ میں فقہائے احناف نے اس رائے کو زیادہ پسند کیا ہے کہ اگر ماں کا اخلاق و کردار اچھا نہیں ہے جب بھی اس وقت تک بچے کو اس کے پاس رکھا جائے جب تک وہ بچہ سمجھ دار نہ ہو جائے، سمجھ دار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ماں کی حرکات و سکنات کا عملاً اثر نہ لینے لگے۔ یہی حکم فاجر مرد کا بھی ہے، "شرح وقایہ" میں ہے۔ ولا فاسق ماجن[1] یعنی جس طرح فاجرہ عورت کی نگرانی میں بچہ کو نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح غیر ذمہ دار فاسق فاجر مرد کی نگرانی میں بھی بچہ کو نہیں دیا جاسکتا۔

ان تمام تفصیلات کا خلاصہ یہ ہوا کہ بچے کی جسمانی پرورش دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے، اسی طرح دینی و اخلاقی تربیت بھی دونوں کی مشترکہ ذمے داری ہے مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

اگر ماں مطلقہ ہے اور اس نے کسی ایسے شخص سے نکاح کر لیا جس سے بچے کا کوئی نسبی تعلق نہیں ہے، تو اب اس کا حق پرورش جاتا رہا، البتہ اگر اس نے بچے کے کسی قریبی اعزہ ہی میں سے کسی سے نکاح کر لیا ہے تو پھر اس کا حق اپنی جگہ پر باقی رہے گا، پہلی صورت میں اس لئے اجازت نہیں دی گئی کہ اس کے موجودہ شوہر کو بچے سے کوئی خاص مناسبت نہیں ہوگی بلکہ وہ بار محسوس کرے گا اور اس کا اثر ماں کے اوپر یہ پڑے گا کہ وہ بچے کی دیکھ بھال اچھی طرح نہ کر سکے گی، دوسری صورت میں اس لئے اجازت دی گئی ہے کہ چونکہ اس کا شوہر بھی بچے سے تعلق رکھتا ہے، اور یہ تو ماں ہی ہے، اس لئے اس کی دیکھ بھال سے

---

[1] لو کان احد ممن له حق الحضانة فاسقاً لا تدفع الصبية اليه وان کان محرماً لها۔ ج ۲ ص ۱۶۹

دونوں کو دلچسپی ہوگی۔

ماں کے بعد پرورش کا حق

ماں اگر پرورش کرنے کی اہل نہ ہو یعنی فاسقہ یا فاجرہ ہو یا اس نے انکار کر دیا ہو یا اس نے کسی اجنبی سے نکاح کر لیا ہو تو اس کے بعد اس کی ماں یعنی بچے کی نانی کو پرورش کا حق ہے۔ اگر نانی نہ ہو تو پر نانی، اور یہ بھی نہ ہوں تو دادی کو، پھر حقیقی بہن کو، پھر ماں جائی اور سوتیلی بہن کو، پھر خالہ کو، پھر پھوپھی کو پرورش کرنی ہوگی۔

ان میں سے جس کی پرورش میں بچہ دیا جائے گا انہی شرائط کے ساتھ دیا جائے گا، جن کا ذکر اوپر ہوا، یعنی جس کا دین و اخلاق اچھا ہوگا اسی کو پرورش کے لئے دیا جائے گا۔ فرض کیجئے کہ بچے کی دو خالائیں ہوں یا دو پھوپھیاں ہوں تو جو خالہ یا پھوپھی زیادہ پرہیز گار ہوگی، اسی کو پرورش کے لئے دیا جائے گا۔

باپ کے بعد خرچ کی ذمہ داری

جب تک باپ موجود ہے، بالغ ہونے سے پہلے بچے اور بچی کے اخراجات کی ذمہ داری باپ کے اوپر واجب ہے[1]۔ لیکن اگر بچے کے نام پر کوئی جائیداد یا نقد روپیہ ہے تو اسی سے اس کی پرورش کا خرچ لیا جائے گا، باپ کے اوپر ان کا خرچ واجب نہیں رہے گا، اگر بچہ یا بچی بالغ ہو جائیں اور وہ کمانے سے معذور ہوں تو اس صورت میں بھی ان کا خرچ باپ پر واجب ہے۔ لیکن اگر معذور نہ ہوں تو بچہ کو کمانے کے لئے وہ مجبور کر سکتا ہے، مگر بچی کو مجبور نہیں کر سکتا[2]، البتہ مجبوری کی حالت میں ماں باپ دونوں پر نفقہ واجب ہے، اور لڑکی کا

---

[1] ونفقة الصغير واجبة على أبيه وان خالفه في دينه (ہدایہ ج ۲ ص ۴۲۵) ۔ انما تجب النفقة على الأب اذا لم يكن للصغير مال (ایضاً)۔

[2] وتجب نفقة الابنة البالغة والابن الزمن على أبويه أثلاثاً۔ (ھدایہ، ج ۲ ص ۴۲۶)

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ ظاہر روایت میں وراثت کے اعتبار سے ماں پر نفقہ نہیں ہے، بلکہ ہر صورت میں باپ ہی پر ہے، اس لئے کہ قرآن پاک میں وعلی المولود له رزقهن وكسوتهن ہے، یعنی ولد کی نسبت سے بیوی کے نفقہ کا ذکر ہے، اس لئے اس کا نفقہ بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

ہر حال میں واجب ہے، یہی حکم بیوی کا بھی ہے۔

اگر باپ کا انتقال ہو جائے اور اس بچہ یا بچی کے نام کوئی جائیداد یا روپیہ نہیں ہے، تو پھر بچے کی پرورش ان قریبی رشتہ داروں کے ذمہ ہے، جو اس کے وارث ہو سکتے ہیں، اور ہر ایک پر میراث کے اعتبار سے خرچ کی ذمہ داری ہوگی۔ مثلاً اس کا دادا بھی زندہ ہے اور ماں بھی تو دو حصے کا خرچ دادا کو دینا پڑے گا اور ایک حصہ ماں کو۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے دوسرے ورثہ پر اس کی ذمہ داری ڈالی جائے گی[1] اسی طرح دوسرے رشتہ داروں کے نفقہ کی ذمہ داری بھی وراثت کے اعتبار سے ہے[2]۔

گو یہاں اولاد کی پرورش کا بیان کرنا مقصود ہے، لیکن اس مناسبت سے خاندان کے دوسرے افراد کے نان ونفقہ کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے۔

اگر کسی کے والدین اور دادا، دادی وغیرہ مفلس ہوں تو ان کے خرچ کی ذمہ داری بھی بیٹے اور پوتے پر واجب ہے، خواہ وہ مسلمان نہ ہوں[3] یہی حکم بیوی کا بھی ہے، لڑکا یا پوتا باپ یا دادا کو کمانے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا، اس لئے کہ حدیث میں ہے" أنت ومالك لأبيك، تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کا ہے۔ غرض یہ کہ اصول وفروغ یعنی باپ، بیٹے اور دادا پوتے وغیرہ میں نفقہ کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ہے۔ اس سلسلہ میں تھوڑے اختلاف کے ساتھ ائمہ اربعہ کا مسلک بھی یہی ہے[4]۔

تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں کچھ اور باتیں

بچے کی جسمانی پرورش اور صحت کی دیکھ بھال کے ساتھ اس کی

---

[1] وفي غير الوالد يعتبر قدر الميراث (ہدایہ، ج ۲ ص ۴۲۷)

[2] ونفقة كل ذي رحم محرم على قدر الارث ويجبر عليه (شرح وقایہ ج ۲ ص ۱۸۲)

[3] وعلى الرجل أن ينفق على أبويه واجداده وجداته اذا كانوا فقراء وان خالفوه في دينه (ہدایہ ج ۲ ص ۴۲۵) ولا يشارك الولد في نفقة أبويه أحد۔ (ج ۲ ط ۴۲۶)

[4] تفصیل کے لئے الفقه على المذاهب الأربعة (ج ۴ ص ۵۸۵-۹) ملاحظہ ہو۔

ذہنی واخلاقی تربیت بھی سب سے پہلے ماں اور اس کے باپ کے ذمہ ہے، اگر انھوں نے اس کے جسم کی پرورش کی اور اس کے باطن کی تربیت نہ کی تو ایک طرف انھوں نے رشتۂ زوجیت کے ایک بڑے حق کی ادائیگی میں کوتاہی کی اور دوسری طرف معاشرہ میں صلاح پیدا کرنے کے بجائے فساد کا ایک مستقل بیج بو دیا، کیونکہ جس بچے کی ذہنی و اخلاقی تربیت نہیں کی جائے گی تو اس سے یہی امید کی جاسکتی ہے کہ بڑا ہو کر وہ اپنے بال بچوں کے لئے، اپنے خاندان اور پھر پورے معاشرے کے لئے دینی اور اخلاقی حیثیت سے مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہو۔ گویا ایک لڑکے کی تعلیم و تربیت ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک خاندان اور ایک معاشرہ کی تعلیم و تربیت دینے کے مرادف ہے۔ اس میں کوتاہی برتنے کے معنی یہ ہیں کہ ایک خاندان اور پورے معاشرہ کو برباد کیا جارہا ہے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے جن کاموں کو صدقۂ جاریہ قرار دیا ہے ان میں ایک ولد صالح بھی ہے کیونکہ اس کی نیکی سے اس کو، اس کے بال بچوں کو، خاندان کو، اور پھر سوسائٹی کو فائدہ پہونچے گا۔ اور پھر یہ سلسلہ پھیلتا ہی چلا جائے گا اور نہ جانے یہ فیض کب تک جاری رہے گا۔ تعلیم و تربیت کی کچھ تفصیل شوہر کے فرائض کے سلسلہ میں آچکی ہے، مگر چونکہ وہ میاں بیوی دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے، اس لئے قدرے مزید تفصیل کی جارہی ہے، اپنے بال بچوں کی تعلیم و تربیت کی اس اہمیت کے پیش نظر قرآن پاک نے عام مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا۔ (تحریم)

اے مسلمانو! تم اپنی ذات کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

اس چھوٹے سے فقرے میں تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کو نہایت جامع طور پر بیان کردیا گیا ہے۔ غور کیجئے حکم یہاں آگ سے بچانے کے لئے دیا گیا ہے، جس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔ ایک مسلمان کو اپنے بال بچوں کو ایسی ہی تعلیم، اور ایسی ہی تربیت دینی چاہیئے جو ان کو عذابِ دوزخ سے بچا سکے، اور جو تعلیم ان کو دوزخ کی آگ سے نہ بچا سکے، وہ تعلیم نہ تو تعلیم ہے اور نہ وہ تربیت، تربیت ہے۔ اگر کوئی مسلمان اپنے بچے کو ایسی تعلیم و تربیت دیتا ہے جو اس کو دوزخ میں لے جانے والی ہو، پھر وہ نہ تو اپنے

ایمان کے تقاضے کو پورا کر سکتا ہے اور نہ باپ اور سرپرست ہونے کی حیثیت سے اپنی اس ذمہ داری کو پورا کر سکتا ہے۔ جو اس پر عائد کی گئی ہے، اوپر حضرت عمرؓ کا قول ہم نقل کر چکے ہیں۔ اور یہ معلوم ہے کہ ہر شخص سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ[1]۔ تم میں سے ہر شخص نگراں ہے اور اس کی نگرانی میں جو چیز ہے اس کے بارے میں اس سے باز پرس ہوگا۔

دینی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں قرآن و حدیث میں بے شمار ہدایتیں دی گئی ہیں، مگر یہ تفصیل کا موقع نہیں ہے اس لئے چند حدیثیں اور نقل کر کے اس بحث کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گذر چکا ہے کہ نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے، آپ کا ایک دوسرا ارشاد ہے، جس میں آپؐ نے بچے کی ایک تنبیہ کو ایک صاع صدقہ سے بہتر قرار دیا ہے:۔

لَأَنْ يُّؤَدِّبَ الرَّجُلُ وَلَدَهٗ خَيْرٌ لَهٗ مِنْ أَنْ يَّتَصَدَّقَ بِصَاعٍ۔	آدمی اپنے بچے کو کوئی ادب و تمیز کی بات سکھائے تو یہ ایک صاع (ساڑھے تین سیر غلہ یا میوہ) صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔
(ترمذی)	

لوگ بچوں کے لئے روپیہ پیسہ جمع کرتے ہیں۔ ان کے لئے جائیدادیں اکٹھا کرتے ہیں، ان کو مادی حیثیت سے خوش حال بنانے کے لئے وہ سب کچھ کرتے ہیں، جو ان کے بس میں ہوتا ہے، بلکہ اس میں حرام، حلال کی بھی فکر نہیں کرتے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بچے کے لئے سب سے بہتر عطیہ اور سب سے بہتر ہدیہ و تحفہ ان کی تعلیم و تربیت ہے:۔

مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدَهٗ مِنْ نُحْلٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ۔	کسی باپ کا اپنے بچے کے لئے اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں ہے کہ وہ اس کو اچھی اور عمدہ تعلیم و تربیت دے۔
(ترمذی)	

---

[1] راقم الحروف کے خیال میں یہ باز پرس اصلاً تو قیامت میں ہوگی مگر اسلامی حکومت یا معاشرہ یا خاندان کو اس باز پرس کا قانونی طور پر حق حاصل ہونا چاہیئے۔

بچے ایک خاص عمر تک ماں کی نگرانی ہی میں رہتے ہیں، اس لئے خاص طور پر عورت کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے :۔

المرأة راعية على بيت بعلها وولده وهي مسئولة عنهم۔ (ابوداؤد، ج ۲ ص ۴۰۶)	عورت اپنے شوہر کے گھر کی اور اس کے بچوں کی ذمہ دار ہوتی ہے، اس کے بارے میں اس سے پوچھ بھی ہوگی۔

یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ عام اسلامی احکام اور خاص طور پر بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں جہاں صرف مردوں کو مخاطب کیا گیا ہے، وہاں ضمناً و تبعاً عورتیں بھی داخل ہوتی ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ "فتح الباری" میں لکھتے ہیں :۔

حكم المرأة حكم الرجل كما هو مطرد في جل الأحكام حيث يدخلن مع الرجال بالتبعية الا ما خصه الدليل۔ (فتح الباری، ج ا ص ۱۹۱)	جو حکم مردوں کے لئے ہوتا ہے وہی عورتوں کے لئے بھی ہے جیسا کہ بیشتر احکام میں عام قاعدہ ہے کہ عورتیں بھی ان میں مردوں کے ساتھ داخل ہوتی ہیں۔ الّا یہ کہ کسی خاص دلیل سے معلوم ہو جائے کہ یہ حکم فلاں صنف کے لئے مخصوص ہے۔

عملی تعلیم و تربیت

آپؐ نے صرف نظری طور پر ہی تعلیم و تربیت دینے کا حکم نہیں دیا ہے، بلکہ یہ تاکید بھی کی ہے، عملاً بھی ان کو اسی کے مطابق بناؤ، اور اگر ضرورت ہو تو ان کو اس کے لئے سخت تنبیہ بھی کرو۔ آپؐ نے فرمایا کہ :۔

بچے جب سات برس کے ہو جائیں تو ان کو نماز کا حکم دو اور جب دس برس کے ہو جائیں تو ان کو مار کر نماز پڑھاؤ، اور ان کے بستر سے علاحدہ کر دو[1] بستر سے علاحدہ کرنے کا حکم کتنی اخلاقی و معاشرتی حکمتوں پر مبنی ہے، اس کا اندازہ ہر بچے والا کر سکتا ہے۔

---

[1] مروا أولادكم بالصلوة وهم أبناء سبع سنين واضربوهم عليها وهم ابناء عشر سنين وفرقوا بينهم في المضاجع۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ ص ۵۸)

بچوں کے سلسلہ میں کچھ خاص ہدایتیں

جس وقت بچہ پیدا ہو تو (۱) اس کے کان میں اذان دی جائے (۲) اور کسی نیک آدمی سے تحنیک کرائی جائے، یعنی وہ کوئی میٹھی چیز منہ میں چبا کر اس کو چٹا دیں (۳) اس کا اچھا نام رکھا جائے (۴) ساتویں دن بچہ کا عقیقہ کر دیا جائے اور سر کا بال اتار کر اس کے بقدر چاندی صدقہ کر دی جائے یا اس کی قیمت غریبوں میں تقسیم کر دی جائے۔

تنبیہ و تادیب

اگر کوئی عورت تعلیم و تربیت کے یہ مذکورہ فرائض انجام نہیں دیتی ہے یا اپنی عزت و آبرو کی حفاظت نہیں کرتی، یا گھر کے اندر کا نظام درست نہیں رکھتی یا ان میں کوتاہی کرتی ہے تو وہ رشتۂ نکاح کو کمزور کر رہی ہے، ایسی صورت میں نہ تو گھر کا نظم و انتظام درست رہ سکتا ہے اور نہ ایک پاکیزہ اور اچھا خاندان بن سکتا ہے، چونکہ بحیثیت قوام، گھر کے نظم و انتظام اور اس کی دیکھ بھال اور درستگی کی اصل ذمہ داری مرد کے اوپر ہے، اور ہر ذمہ دار آدمی کو نظم و انتظام درست رکھنے کے لئے کبھی نہ کبھی سختی بھی کرنی پڑتی ہے، اسی حکمت کے پیشِ نظر اسلامی شریعت نے شوہر کو ضرورت کے وقت بیوی کی تنبیہ و تادیب کرنے کی اجازت دی ہے، اور اگر تنبیہ و تادیب سے بھی وہ نہیں مانتی تو پھر اس کو ہلکی مار مارنے، اس سے ایلا کرنے اور پھر بدرجۂ مجبوری طلاق دینے کی اجازت بھی دی ہے۔

جس طرح عورتوں کو شوہروں کی ناشکری سے بچنا چاہیئے، اسی طرح مردوں کو خواہ مخواہ عورتوں پر ہر وقت اپنی برتائی کا حق جتانا نہ چاہیئے۔ بلکہ ان کو تنبیہ و تادیب کا حربہ اس وقت استعمال کرنا چاہیئے جب ان سے "نشوز" یعنی نافرمانی پائی جائے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا۔

(نساء)

جن عورتوں سے تم نشوز یعنی بدماغی اور نافرمانی دیکھو تو پہلے ان کو سمجھاؤ، بجھاؤ پھر ان کی خوابگاہوں میں ان سے علاحدہ رہو اور اس کے بعد ان کو مارو، اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں تو پھر ان پر سختی کرنے کی راہ تلاش نہ کرو۔

نشوز کے معنی اٹھ جانے کے بھی ہیں اور بلند جگہ کو بھی نشز کہتے ہیں۔ یعنی رشتۂ نکاح کا جو احترام اور لحاظ و پاس ہے، وہ عورت کے دل سے اٹھ جائے اور اس میں بد دماغی اور سرکشی پیدا ہو جائے اور کوئی بھلی بات نہ مانے۔ چنانچہ یہ آیت معاً اس آیت کے بعد ہے، جس میں عورت کے فرائض کا ذکر کیا گیا ہے:۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ۔ (نساء) — صالح عورتیں وہ ہیں جو شوہر کی فرمانبردار ان کے غیب کی حفاظت کرنے والی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نشوز سے مراد شوہر کی نافرمانی اور ان فرائض کی عدم ادائگی ہے، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، حتیٰ کہ بعض مفسرین نے ان کی نظر کی بے احتیاطی کو بھی اس میں داخل کر دیا ہے، اب اگر کوئی عورت اپنی عزت و آبرو کی، شوہر کے گھر بار اور مال و متاع کی حفاظت نہیں کرتی، یا معروف یعنی جو کام شریعت کے خلاف نہیں ہے، اس میں اس کی اطاعت نہیں کرتی تو وہ ناشزہ ہے، اس کو تنبیہ و تادیب کی جا سکتی ہے۔

تنبیہ و تادیب کی صورتیں

اوپر کی آیت میں تادیب و تنبیہ کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں (۱) پہلے ان کو نرمی اور ملاطفت سے سمجھایا جائے، اگر سمجھانے بجھانے سے مان جائیں تو خیر ورنہ (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے ترکِ مباشرت کر لی جائے۔ ترکِ مباشرت کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آدمی دو چار دن روٹھ جائے، اور ان کے ساتھ سونا بیٹھنا اور جنسی تعلق چھوڑ دے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ایلا کرے۔ ایلا کی تعریف آگے آتی ہے۔ یہ حربے عورتوں کی فطرت کے عین مطابق ہیں، اگر عورت کی فطرت میں کچھ بھی سلامت روی ہے تو مرد کی نظرِ التفات ہٹ جانے کے ساتھ ہی وہ اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر لے گی (۳) لیکن کوئی عورت اس سے بھی نہ مانے تو تیسرا اور آخری حربہ یہ ہے کہ تم اس کو مار پیٹ کی ہلکی سزا بھی دے سکتے ہو۔

مگر عورت کو ہر غلطی پر زد و کوب کرنا انتہائی گناہ ہے، بلکہ جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ بالکل آخری حربہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے استعمال میں زیادتی کرے گا تو پھر اس سے قانونی بازپرس بھی کی جا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی اس آخری

اجازت کے استعمال کرنے کی جو تفسیر کی ہے، اس کو اگر نظر انداز کر دیا گیا تو پھر ایک غلطی کی جگہ دوسری غلطی اور ایک ظلم کی جگہ دوسرا ظلم ہوگا۔ آپؐ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں عورتوں کے بارے میں جو اعلان فرمایا تھا اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے:۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَنْ لَا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُونَهُ فَإِنْ فَعَلْنَ فَاضْرِبُوهُنَّ غَيْرَ مُبَرِّحٍ وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔

عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو تم نے ان کو اللہ کے عہد کے تحت اپنے قبضہ میں لیا ہے اور ان کی شرمگاہ تمہارے لئے اللہ کے حکم کے تحت جائز ہوتی ہے، تمہارا ان کے اوپر حق ہے کہ ان سے اختلاط نہ رکھیں، جن کو تم ناپسند کرتے ہو۔ اگر وہ ایسا کرتی ہیں تو ان کو معمولی مار مار سکتے ہو، اور ان کا تمہارے اوپر رزق اور کپڑے کا حق ہے معروف کے ساتھ۔

(مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص۲۲۵ کتاب الحج)

"لا یوطین فرشکم" یعنی بستر روندنے سے مراد یہ ہے کہ ایسے لوگ گھر میں نہ آئیں، جن کو شوہر ناپسند کرتا ہے، یا ان کی طرف سے شوہر کے دل میں کوئی شک وشبہ ہے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ اگر وہ بھلائی میں تمہاری اطاعت نہ کریں، تو ان کو معمولی مار مار سکتے ہو۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اگر وہ کھلی بے حیائی پر اتر آئیں، تب یہ صورت اختیار کرنی چاہیئے یعنی مار پیٹ کی اجازت کے ساتھ دو شرطیں لگی ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کسی بھلے اور معروف کام میں اطاعت نہ کریں۔ دوسری یہ کہ مار معمولی ہو، اسی بنا پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ مسواک وغیرہ جیسی چھوٹی چیز سے مارنا چاہیئے تاکہ اس کو سخت چوٹ نہ آئے، (تفسیر طبری) ظاہر ہے کہ مسواک سے مارنے کا مطلب یہ ہے کہ ذرا سخت قسم کی تنبیہ بھی ہو جائے اور اس کو شدید چوٹ بھی نہ آئے، ورنہ اسلامی شریعت نے جب جانوروں کو بھی سخت مار پیٹ کی اجازت نہیں دی ہے تو صنفِ لطیف کے بارے میں وہ ایسی اجازت کیسے دے سکتی ہے؟

زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو بات بات پر لوگ مارتے تھے۔ آپ نے یہ کیفیت دیکھی تو

اس سے بالکل ہی روک دیا۔ فرمایا کہ "خدا کی بندیوں کو مارا نہ کرو"، لیکن جب اس کے نتیجے میں عورتوں کی طرف سے زیادہ بے باکی اور دلیری شروع ہوگئی تو قرآن نے اور اس کی روشنی میں آپؐ نے معمولی مار پیٹ کی اجازت دی، اس اجازت کے بعد مردوں کی طرف سے پھر کچھ زیادتی شروع ہوتی تو عورتیں خدمتِ نبوی میں شکایتیں لے کر آنے لگیں۔ آپ نے یہ کیفیت دیکھی تو سخت تنبیہ فرمائی، آپ نے فرمایا کہ:۔

لَقَدْ طَافَ بِآلِ مُحَمَّدٍ نِسَاءٌ	آلِ محمد کے گھر کے گرد بہت سی عورتیں چکر
كَثِيْرٌ يَشْكُوْنَ أَزْوَاجَهُنَّ لَيْسَ	کاٹتی رہتی ہیں جو اپنے شوہروں کی شکایتیں
أُولٰئِكَ بِخِيَارِكُمْ۔	لے کر آتی ہیں۔ اپنی بیویوں سے بدسلوکیاں
(ابوداؤد)	کرنے والے بھلے لوگ نہیں ہیں۔

ایک صحابیہ نے آپ سے اپنے نکاح کے بارے میں مشورہ کیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا، تو آپ نے فرمایا کہ اس سے نکاح نہ کرو، وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارتا (مسلم) یعنی معمولی معمولی باتوں پر مار پیٹ کرتا ہے، قرآن نے مارنے کی جو اجازت دی ہے مذکورہ ارشاداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس اجازت کی کیا حد ہے اس کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔

ایلاء تنبیہ و تادیب کے سلسلے میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ عورتوں سے کچھ دنوں کے لئے جنسی تعلقات منقطع کر لینے کی اجازت بھی شریعت نے دی ہے۔ یہی انقطاع اگر چار مہینے کے لئے کر لیا جائے تو پھر اس کو شریعت میں ایلاء کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِسَائِهِمْ	جو لوگ قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیویوں کے
تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوْا	پاس نہ جانے کی ان کے لئے چار ماہ کی
فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ وَإِنْ عَزَمُوا	مہلت ہے اگر وہ اس مدت میں قسم توڑ کر
الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔	رجوع کر لیں تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا
(بقرہ ۲۸)	اور بخشنے والا ہے اور اگر انھوں نے اس قسم

سے طلاق ہی دینے کا پختہ ارادہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو سنتا اور ان کے ارادے کو جانتا ہے۔

ایلاء کی تعریف

ایلاء کے لفظی معنی قسم کھانے کے ہیں، لیکن شریعت میں بیوی سے مباشرت نہ کرنے کی قسم کھا لینے کو ایلاء کہتے ہیں۔ (شرح وقایہ)

اس قسم کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کی ذات یا اس کے صفات کی قسم کھا کر کہے کہ میں اس سے قربت و مباشرت نہ کروں گا، دوسری صورت یہ ہے کہ خدا کی ذات و صفات کی قسم نہ کھائے، بلکہ اس کو کسی چیز پر معلق کر دے، یعنی یہ کہے کہ میں اگر صحبت کروں تو مجھ پر حج واجب ہے، یا اتنے روزے مجھ پر ضروری ہیں، یا اس کو طلاق ہے تو ان دونوں صورتوں میں ایلاء ہو جائے گا۔

ایلاء کی قسمیں

ایلاء کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ قسم کھا کر یا بغیر قسم کھائے ہوتے یہ کہا کہ میں اپنی بیوی سے چار مہینے یا پانچ مہینے یا سال دو سال تک مباشرت وصحبت نہ کروں گا تو ایلاء موقت ہو گا، کیونکہ اس نے اس کی ایک مدّت مقرر کر دی ہے، دوسرے قسم کھا کر یا بغیر قسم کھائے ہوتے اس طرح کہا کہ میں کبھی بھی تجھ سے صحبت وجماع نہ کروں گا، تو بھی ایلاء ہو گیا، اور اس ایلاء کو ایلاء مؤبّد کہتے ہیں، یعنی ہمیشہ باقی رہنے والا ایلاء[۱]

• جب کوئی خدا کی قسم کھا کر ایلاء کرے گا، تو خواہ موقّت ایلاء کیا ہو یا مؤبّد دونوں صورتوں میں ایلاء ہو جائے گا، یعنی اگر وہ چار مہینے کے اندر اس سے صحبت کرے گا اس کو قسم کا کفارہ دینا پڑے گا اور ایلاء ختم ہو جائے گا، اور اگر اس نے چار مہینے کے اندر بیوی سے مباشرت وصحبت نہیں کی تو پھر ایک طلاق بائن پڑ جائے گی، یعنی دونوں کا رشتۂ نکاح ٹوٹ گیا اگر وہ دونوں پھر میاں بیوی بن کر رہنا چاہتے ہیں تو دونوں کو پھر سے نکاح کرنا ہو گا، قسم کے کفّارہ اور طلاق باین کا حکم آگے آتا ہے۔

موقت اور موبد دونوں ایلاء کا عام حکم یہ ہے کہ اگر شوہر نے غصے میں یا بطور تنبیہ ایسا کہہ دیا تھا تو اس کو چاہیئے کہ چار ماہ کے اندر اندر بیوی سے مباشرت کر لے، اور اپنی قسم کو

---

[۱] شرح وقایہ، ج۲ ص۱۱۹۔

توڑ ڈالے اور قسم کا کفّارہ ادا کر دے، اگر اس نے چار ماہ تک ایسا نہ کیا تو ایک طلاق بائن پڑ جائے گی۔ موقت اور موبدّ ایلا میں صرف اتنا فرق ہے کہ موقت ایلاء میں اگر شوہر چار مہینے کے بعد صحبت نہ کرے اور طلاق پڑ جائے، اور پھر دوبارہ اس سے نکاح ہو اور اس کے بعد وہ اگر چار چھ مہینے یا سال دو سال بھی صحبت نہ کرے، تو دوبارہ اس عورت پر طلاق نہیں پڑے گی، لیکن موبدّ ایلاء میں یعنی یہ قسم کھالی کہ میں کبھی بھی اس سے صحبت نہ کروں گا اور چار ماہ صحبت نہ کی تو چار ماہ گذرنے کے بعد اس کو طلاق باین پڑ گئی اب اگر اس نے دوبارہ اس سے نکاح کر کے اپنی بیوی بنالیا اور پھر اس نے چار ماہ تک بغیر کچھ کہے سنے اس سے صحبت نہ کی تو دوبارہ طلاق پڑ جائے گی، اس بار بھی وہ نکاح پڑھا کر رکھ سکتا ہے، لیکن اگر دوبارہ نکاح پڑھانے کے بعد پھر اس نے چار ماہ صحبت نہ کی، تو پھر تیسری طلاق پڑ جائے گی، اب بغیر حلالے کے وہ نہیں رکھ سکتا ہے[1]

اگر خدا کی قسم کھا کر نہیں بلکہ یوں کہا کہ میں اگر صحبت کروں تو مجھ پر فلاں کام ضروری ہے، مثلاً یہ کہا کہ ایک ماہ روزہ رکھوں گا، یا حج کروں گا، یا ایک سو روپیہ صدقہ کروں گا، تو اس صورت میں اگر اس نے چار مہینے کے اندر صحبت کی تو پھر جو کام کرنے کو کہا ہے، وہ کرنا ضروری ہوگا، قسم کا کفارہ نہ ہوگا، کیونکہ اس نے کام کرنے ہی پر اس کی صحبت کو معلق رکھا تھا، اس لئے اس کا کفارہ اس کام کی تکمیل ہی ہے۔ اگر اس نے چار مہینے تک صحبت نہ کی تو پھر چار ماہ جس دن پورے ہوں گے اسی دن طلاقِ باین پڑ جائے گی، اب اگر اس کو پھر یہ رشتہ رکھنا منظور ہے تو نئے سرے سے نکاح پڑھائے۔ ایلاء کے صحیح ہونے کے لئے بعض اور ضروری شرطیں ہیں۔

چار ماہ سے کم کی قسم یا تعلیق پر ایلاء نہیں ہے

(۱) ایلاء جب ہی ہوگا، جب چار ماہ یا اس سے زیادہ کی قسم کھائی۔ اگر کسی نے چار ماہ سے کم کی قسم کھائی تو اس سے ایلا نہ ہوگا[2]۔ اب جتنے دن

---

[1] وان کان حلف علی الأبد فالیمین باقیۃ۔ (قدوری ص۱۷۹)

[2] فلا ایلاء لو حلف علی أقل منھا أی اربعۃ اشھر۔ (شرح وقایہ، ج۲ ص۱۱۹)

کی قسم کھائی ہے، اس سے پہلے مباشرت کرے گا تو قسم کا کفارہ دینا پڑے گا، اور اگر اتنی مدت تک صحبت نہ کی تو پھر ایلاء نہ ہو گا اور نہ قسم کا کفارہ ہو گا، مثلاً کسی نے تین مہینے تک مباشرت نہ کرنے کی قسم کھائی تو اگر تین مہینے سے پہلے مباشرت کرے گا تو قسم توڑنے کا کفارہ دینا ہوگا، اور اگر تین ماہ کے بعد اس نے مباشرت کی تو نہ ایلاء ہو گا اور نہ قسم کا کفارہ دینا ہو گا۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ ایلاء کرنے والا عاقل بالغ ہو۔

(۳) یہ بھی شرط ہے کہ کسی جگہ کی تعیین نہ کرے ورنہ ایلاء نہ ہو گا۔

(۴) یہ بھی شرط ہے کہ صحبت کے ساتھ کسی اور چیز کو نہ ملائے۔ مثلاً یہ کہے کہ میں تجھ سے مباشرت کروں اور بوسہ لوں یا تجھ سے کوئی کام لوں تو تجھ کو طلاق ہے، تو اس سے ایلاء نہ ہو گا۔

(۵) اگر صریح الفاظ میں ایلاء نہیں کیا بلکہ گول مول الفاظ میں کیا تو اس کے ارادہ و نیت پر موقوف رہے گا۔ مثلاً کسی نے کہا کہ خدا کی قسم تو مجھ پر حرام ہے، تو اس سے اگر اس نے ایلاء کی نیت کی ہے تو ایلاء ہو گا ورنہ طلاق پڑ جائے گی۔

طلاق کا بیان

طلاق کے ذریعہ علیحدگی

اوپر رشتۂ نکاح کو قائم کرنے اور پھر اس کو باقی رکھنے کے لئے جو قانونی اور اخلاقی ہدایتیں دی گئی ہیں، اگر عورت و مرد دونوں یا ان میں سے کوئی ایک ان کا لحاظ نہیں کرتا ہے، یا دونوں کے جو حقوق و فرائض مقرر کئے گئے ہیں، ان میں سے کوئی ایک یا دونوں ان کو ادا نہیں کرتے یا ان کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ یا ان میں سے کوئی کسی کی حق تلفی کرتا ہے جس کی وجہ سے دونوں میں کوئی عارضی اختلاف رونما ہو جاتا ہے یا کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے، تو اس کے لئے شریعت نے حکم دیا ہے کہ دونوں صلح و مصالحت کے ذریعے اپنا اختلاف اور کشیدگی دور کرلیں۔

قرآن میں اس کا یہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ جب میاں بیوی میں کسی اختلاف کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو دونوں خود یا ان کے سرپرست یا جن کی بات دونوں مانتے ہوں، وہ دو آدمیوں کے سامنے اس معاملے کو رکھ دیں، جس کی بنا پر اختلاف پیدا ہوا ہے، اور یہ دونوں آدمی جو فیصلہ کر دیں خواہ وہ کسی کے خلاف پڑے یا موافق اس کو دونوں مان لیں۔ یہ دو آدمی جو حَکم و ثالث بنائے جائیں۔ ان میں ایک عورت کا نمائندہ ہونا چاہیئے، اور دوسرا مرد کی طرف کا۔

قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا	اگر تم دونوں میں شدید اختلاف کا خوف
فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَکَمًا	ہو تو اس کو نہ بڑھنے دینے کی صورت
مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا	یہ ہے کہ، ایک ثالث و پنچ مرد کی طرف سے
یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ کَانَ	اور ایک، عورت کی طرف سے بھیجا جائے،

عَلِیۡمًا خَبِیۡرًا۔ (نساء) اگر یہ دونوں اختلاف دور کرنا اور واقعی اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ دونوں میں ضرور موافقت کی صورت پیدا کر دے گا، اور اللہ علیم خبیر ہے۔

لیکن جیسا کہ قرآن نے اشارہ کیا ہے، یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں آدمی جو ثالث مقرر کئے گئے ہیں، دونوں فیصلہ کرنے کے اہل ہوں اور واقعی ان کا مقصد دونوں میں صلح و مصالحت کرانا ہو، اور پھر خود میاں بیوی بھی ان دونوں کی باتیں مانیں، تب یہ اختلاف دور ہو سکتا ہے۔ یعنی خدا کی توفیق اسی وقت شاملِ حال ہو گی، جب مذکورہ طریقے سے اس کی کوشش کی جاتے گی۔

اگر اس کوشش کے بعد بھی دونوں میں صلح و صفائی نہ ہو سکے، اور دونوں کا اختلاف اور کشیدگی ایسی مستقل نفرت و عداوت کی صورت اختیار کر لے کہ اب نباہ ممکن نہ ہو۔ یا کسی فریق کی بے توجہی، حق تلفی، ایذا رسانی، دوسرے فریق کی برداشت سے باہر ہو جائے اور گمان غالب ہو کہ اگر اس رشتے کو نہ کاٹا گیا تو پھر دوسرے معاشرتی معائب یا برائیاں پیدا ہو جائیں گی، تو پھر اس صورت میں عورت کو خلع و تفریق کے ذریعے، مرد کی قوامیت سے نکل جانے کا اور مرد کو طلاق کے ذریعے، عورت کی ذمے داری سے سبکدوش ہو جانے کا حق دیا گیا ہے۔

طلاق کے لفظی معنی بندھن کھولنے کے ہیں، اور شریعت میں اس گرہ اور بندھن (عقد) کے کھول دینے کو طلاق کہتے ہیں، جو نکاح کے ذریعہ لگائی گئی تھی، گویا جو گرہ رشتۂ نکاح کے ذریعہ لگائی گئی تھی، وہ طلاق کے ذریعہ کھول دی جائے[1]۔ قرآن پاک میں طلاق کی اجازت کا ذکر متعدد آیتوں میں آیا ہے، مثلاً:۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمۡسَاكٌ طلاق دو بار ہے اس کے بعد یا تو رجعت

---

[1] وھو لغۃً رفع القید و شرعًا رفع قید النکاح۔ بلفظ مخصوص۔ (عمدۃ الرعایۃ حاشیہ شرح وقایہ)

بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ۔ (بقرہ)

کرکے روک رکھنا ہے یا خوش اسلوبی سے مہر وغیرہ دے کر چھوڑ دینا ہے۔

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ۔ (طلاق)

اے نبی اور مسلمانوں جب طلاق دو تو طہریں دو۔

طلاق پسندیدہ چیز نہیں ہے

مرد کو یہ اختیار ضرور دیا گیا ہے کہ جب وہ چاہے طلاق دے کر رشتۂ نکاح کی ذمے داری سے نکل سکتا ہے لیکن اس اختیار کے باوجود قرآن و حدیث میں عقد زوجیت کو کھولنے اور اس رشتۂ نکاح کو کاٹنے سے پہلے بار بار غور کرنے اور اس فیصلے سے پہلے تعلقات کو استوار کرنے کی ترغیب دی ہے، کیونکہ :۔

فَاِنْ کَرِھْتُمُوْھُنَّ فَعَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّیَجْعَلَ اللّٰہُ فِیْہِ خَیْرًا کَثِیْرًا۔ (نساء)

تم جس عورت کو ناپسند کرتے ہو ممکن ہے کہ تمہیں اس عورت کی کوئی چیز ناپسند ہو اور خدا نے اس میں بہت سی بھلائیاں رکھی ہوں۔

مقصد یہ ہے کہ اگر بیوی کی کچھ عادتیں یا شکل وصورت تمہیں ناپسند ہے جس کی بنا پر تم اسے ناپسند کرتے ہو، اور طلاق دے رہے ہو تو یہ بھی سوچ لینا چاہیئے کہ اس کے اندر کچھ ایسی خوبیاں بھی ہو سکتی ہیں، جو ممکن ہے دوسری عورت میں نہ ہوں۔

اسلامی شریعت نے مرد کو طلاق کی اجازت اور اختیار ضرور دیا ہے، مگر یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے اس لئے اس اختیار کو آخری چارۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہیئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :۔

اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی اَلطَّلَاقُ۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ قابل نفرت چیز طلاق ہے۔

آپ نے فرمایا کہ نکاح کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ :۔

فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الذَّوَّاقِیْنَ وَالذَّوَّاقَاتِ۔ (مشکوٰۃ، طبرانی) — اللہ تعالیٰ بہت زیادہ مزہ چکھنے والوں اور چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا۔

یعنی طلاق کسی مجبوری سے دی جا سکتی ہے مگر اس کا مقصد تجدید لذت نہ ہونا چاہیئے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جب تک عورتوں کی کھلی ہوئی بے حیائی نہ دیکھو طلاق نہ دو، ایک حدیث میں ہے کہ جو عورت بغیر سبب کے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے اس پر جنّت کی خوشبو حرام ہے۔ (صحاح خمسہ، المنتقی ج ۲ ص ۵۷۶) حدیث میں آتا ہے کہ شیطان یعنی ابلیس روزانہ اپنا پایۂ تخت پانی کے اوپر بچھاتا ہے، اور اپنے ماتحت شیاطین کو لوگوں کو بہکانے اور بھلائی سے ہٹانے کے لئے بھیجتا ہے۔ چنانچہ جب تمام شیاطین اپنا کام کر کے واپس آتے ہیں تو ہر ایک اس کے سامنے اپنا اپنا کارنامہ بیان کرتا ہے، یعنی اپنی فتنہ سامانی کا ذکر کرتا ہے، تو ابلیس کہتا ہے کہ تم لوگوں نے کوئی بڑا کام نہیں کیا، تو پھر ایک شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے فلاں میاں بیوی میں جدائی کرا دی، یہ سن کر شیطان اس کو گلے سے لگا لیتا ہے، اور کہتا ہے، "نعم انت" یعنی ہاں تم نے البتّہ ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ (مسلم)

طلاق خدا اور رسول کو اس لئے ناپسند، اور شیطان کو اس لئے پسند ہے کہ اس رشتے کے کٹ جانے کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ دو آدمی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے، بلکہ اس کی وجہ سے نہ جانے کتنے رشتے کٹ جاتے ہیں، اور خاندان اور معاشرے میں بغض و عداوت کی ایک مستقل بنیاد پڑ جاتی ہے، کتنے نئے نئے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں، گویا یہ طلاق ایک گھر کا نہیں بلکہ پورے معاشرے کا مسئلہ بن جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک رشتۂ نکاح کی وجہ سے میاں بیوی کے کتنے اعزّہ اقارب ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے ہیں، ان میں مہر و محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ کتنے بے گانے یگانے ہو جاتے ہیں۔ طلاق کے ذریعہ یہ سب باتیں یہی نہیں کہ یک لخت ختم ہو جاتی ہیں، بلکہ اب مہر و محبت کے بجائے بغض و عداوت کی بنیاد پڑ جاتی ہے، ان کی یگانگت بے گانگی سے بدل جاتی ہے، پھر دونوں کی شادی کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اگر بچے ہوں تو پھر ان کی پرورش

اور دیکھ بھال کا مسئلہ ہوتا ہے، غرض یہ کہ ایک طلاق کے ذریعے نہ جانے خاندان معاشرے میں کتنے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اس کی پاکیزگی اور صالحیت کو کتنا دھکا لگتا ہے' ظاہر ہے کہ ایسا دور رس فتنہ خدا اور رسول کو ناپسند اور شیطان کو پسند ہونا ہی چاہیئے۔

اسی بنا پر طلاق کا جو طریقہ اسلامی شریعت نے مقرر کیا ہے' اس میں اس کی پوری رعایت رکھی ہے کہ آدمی کو بار بار اس فیصلے پر غور کرنے کا موقع ملے۔

طلاق کی قسمیں اور ان کا حکم

طلاق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک طلاق رجعی، یعنی وہ طلاق جس میں نکاح بالکل ٹوٹتا نہیں۔ طلاق رجعی کی صورت میں اگر طلاق دینے والے کو اپنے اس فعل پر ندامت ہے تو وہ دوبارہ ایک خاص وقت تک بے نکاح کے بھی عورت کو اپنے عقد میں رکھ سکتا ہے۔ دوسرے طلاق بائن جس میں نکاح بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ طلاق بائن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک طلاق بائن وہ ہے جس میں تجدیدِ نکاح یعنی دوبارہ نکاح پڑھانے کے بعد آدمی پھر اسے اپنی بیوی بنا سکتا ہے۔ اور دوسری جس میں حلالہ کئے بغیر دوبارہ نکاح کر کے بھی اس کو اپنے نکاح میں نہیں لے سکتا۔ عام طور پر فقہاء طلاق بائن کی پہلی قسم کو طلاق بائن اور دوسری قسم کو طلاق مغلّظہ کہتے ہیں۔ (ہدایہ ج ۲ ص ۳۷۴)

جن الفاظ سے طلاق دی جاتی ہے، وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک صریح اور دوسرے کنایہ[1]

صریح الفاظ

صریح الفاظ سے مراد یہ ہے کہ ایسے صاف صاف الفاظ میں طلاق دی جائے کہ ان کے معنیٰ اس زبان میں سوائے طلاق کے اور کچھ نہ لئے جا سکیں مثلاً بیوی سے کہا کہ میں نے تجھ کو طلاق دی یا تجھ کو طلاق ہے، یا میں تجھے طلاق دیتا ہوں' یا تو مطلقہ ہے یا میں نے تجھ کو چھوڑ دیا۔ یہ سب الفاظ صریح شمار ہوں گے، یعنی ان الفاظ کے کہتے ہی طلاق پڑ جائے گی، خواہ وہ طلاق کی نیت کرے یا نہ کرے۔ خواہ سنجیدگی سے طلاق کے

---

[1] واتفق الجمهور علی ان الفاظ المطلقة صنفان صريح وكناية بداية المجتهد ج ۲ ص ۶۱۔

الفاظ کہے یا مذاق سے۔ ہر صورت میں طلاق پڑ جائے گی[1] اور کنایہ سے مراد یہ ہے کہ ایسے گول مول الفاظ سے طلاق دی گئی کہ جن سے طلاق بھی مراد لی جاسکتی ہے، اور ان سے دوسرے معنی بھی نکل سکتے ہیں۔ مثلاً تم سے کوئی مطلب نہیں' یا تم اپنا راستہ لو وغیرہ۔

صریح کا حکم

صریح الفاظ سے جو طلاق دی جاتی ہے اس کی تین قسمیں ہیں اور ہر ایک کا حکم علاحدہ ہے۔ ایک صورت میں طلاق رجعی پڑے گی، یعنی دوبارہ بغیر نکاح کئے ہوئے اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے۔ دوسری صورت میں طلاق بائن پڑے گی، یعنی نکاح کر کے اس کو دوبارہ اپنی بیوی بنا سکتا ہے، اور تیسری صورت میں طلاق مغلّظہ پڑیگی، یعنی حلالہ کئے بغیر اس سے نکاح نہیں ہوسکتا۔

طلاق رجعی کی صورت

جب کسی عورت کو صریح الفاظ میں ایک یا دو طلاق دی گئی اور پھر عدت کے اندر طلاق دینے والے کو اپنے فعل پر پشیمانی ہوئی اور پھر اس کے دل میں اپنا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے کی خواہش پیدا ہوئی، تو وہ بغیر نکاح کئے اس کو اپنی بیوی بنا سکتا ہے۔ یعنی رجعت کر سکتا ہے' خواہ بیوی راضی ہو یا نہ ہو۔

طلاق رجعی کب بائن ہوجاتی ہے

اگر ایک یا دو صریح طلاق دینے کے بعد عدّت بھر اس نے رجعت نہیں کی تو اب عدت یعنی تین حیض کی مدت گزر جانے کے بعد اگر عورت کو ایک طلاق دی گئی ہے، تو ایک طلاق بائن پڑ جائے گی اور دو طلاق دی ہے، تو دو طلاق بائن پڑ جاتے گی یعنی اب اگر وہ اس کو اپنے عقد نکاح میں لینا چاہتا ہے' تو دوبارہ نکاح کر کے اس کو اپنی بیوی بنا سکتا ہے۔ نکاح میں دونوں کی رضامندی پھر سے ضروری ہے' اگر شوہر محض اپنی مرضی سے

---

[1] حدیث میں ہے کہ ثلاث جدُّھن جد وھزلھن جدُّ النکاح والطلاق والرجعۃ۔

(صحاح خمسہ بحوالہ المنتقی ج ۲ ص ۶۰۴)

نکاح کرنا چاہے تو نہ ہوگا۔[1]

طلاقِ مغلّظہ اگر اس نے ایک دو طلاق کے بجائے تین طلاقیں دے دی ہیں تو اب نہ تو رجعت کر سکتا ہے، اور نہ نیا نکاح کر کے اس کو رکھ سکتا ہے، بلکہ اب اس سے دوبارہ رشتۂ نکاح استوار کرنے کی ایک ہی صورت ہے، وہ ہے حلالہ۔ حلالے کا بیان آگے آتا ہے۔

کنایہ کا حکم یہ تو صریح الفاظ کی طلاق کا حکم تھا، اگر کسی نے صریح الفاظ کے بجائے گول مول اور اشارہ کنایہ میں طلاق دی، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ایک طلاق دی اور نیّت بھی ایک ہی کی کی، تو ایک طلاق بائن پڑ جائے گی اور اگر دو طلاق کنایہ میں دی، اور نیت بھی دو ہی کی کی تھی، تو دو طلاق بائن ہوں گی، دو طلاق بائن تک وہ پھر نکاح کر کے اس کو دوبارہ اپنے عقد نکاح میں لا سکتا ہے، لیکن اگر اس نے تین طلاق بائن دے دیں تو جس طرح تین صریح طلاق سے طلاق مغلّظہ پڑ جاتی ہے، اسی طرح تین کنایہ سے بھی طلاقِ مغلظہ پڑ جائے گی، اب دوبارہ نکاح کر کے بھی اس کو اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔

کنایہ سے طلاقِ رجعی نہیں ہوتی غرض یہ کہ کنایہ و اشارہ سے جو طلاق دی جائے گی تو اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو طلاقِ بائن پڑے گی، یا طلاق مغلظہ۔ طلاق رجعی کنایہ کے ذریعے نہیں ہوتی۔

کنایہ کے الفاظ کنایہ سے مراد یہ ہے کہ ایسے الفاظ سے طلاق دی جائے جو اس زبان میں طلاق ہی کیلئے مخصوص نہ ہوں یا جن کا مطلب طلاق بھی ہو سکتا ہے، اور ان کا مفہوم بیزاری اور غصے کا اظہار بھی نکل سکتا ہے، مثلاً کسی نے کہا کہ

---

[1] واذا طلق الرجل امرأته تطليقة رجعية او تطليقتين فله أن يراجعها فى عدتها رضيت بذلك اولم ترض واذا كان الطلاق بائنا دون الثلث فله ان يزوجها فى العدة وبعد انقضاءها وان كان الطلاق ثلاثا لم تحل له حتى تنكح زوجاً غيره۔ (هدايه ج ۲ ص ۳۷۴)

اب تجھ سے کوئی واسطہ نہیں، میرے ساتھ اب تیرا نباہ نہ ہوگا، میرے گھر سے نکل جا، اپنے میکے میں جاکے رہ، وغیرہ۔ ان الفاظ سے اگر طلاق دینے والے نے طلاق کی نیت کی ہے، تو طلاق بائن پڑ جائے گی، اور اگر اس نے کہا کہ اس سے ہماری نیت طلاق کی نہیں تھی، تو طلاق نہیں پڑے گی، گویا الفاظ کنایہ میں طلاق واقع ہونے یا نہ ہونے کا دارو مدار طلاق دینے والے کی نیت پر ہے، اگر اس نے طلاق کی نیت سے وہ الفاظ کہے تھے، مگر پوچھنے پر اس نے انکار کیا تو قانوناً تو طلاق واقع نہ ہوگی، مگر یہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ جھوٹ بولے گا تو حقیقتاً اس عورت سے اب اس کا تعلق بغیر نکاح کے ہوگا اور بغیر نکاح کئے کسی عورت سے تعلق رکھنا حرام ہے۔ جس کا گناہ اس کے سر پر زندگی بھر ہوتا رہے گا، اور اس سے جو اولاد ہوگی وہ بھی اس کی جائز اولاد نہ ہوگی۔

قرینہ اگر کوئی شخص گول مول لفظ کہنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ میں نے طلاق کی نیت نہیں کی تھی تو اس کے اس کہنے کا اعتبار اس وقت کیا جائے گا جب دوسرے قرائن موجود نہ ہوں۔ اگر کسی قرینے یا دلالت حال سے معلوم ہو جائے کہ یہ جھوٹ کہتا ہے تو طلاق بائن سمجھ لی جائے گی[۱] اور اس کو بیوی سے علاحدگی کا حکم دے دیا جائے گا۔

دلالت حال اور قرینے کا مطلب یہ ہے کہ جس موقع پر وہ الفاظ کہے گئے ہیں، اس میں طلاق کے علاوہ کوئی دوسرا مطلب نکلتا ہی نہ ہو، مثلاً میاں، بیوی میں طلاق کا ذکر تھا، اور اس نے بیوی سے کہا کہ اچھا تو آپ اپنا بستر اٹھائیے اور اپنے میکے جائیے، اب میرے گھر نہ آئیے گا، یا بیوی نے غصے میں کہا کہ تمہارے ساتھ میرا نباہ نہیں ہو سکتا، تم مجھے طلاق دے دو، یا مجھے چھوڑ دو، اس کے جواب میں شوہر نے کہا کہ اچھا تو میں نے چھوڑ دیا، یا تم کو آزاد کر دیا، تو ان صورتوں میں وہ نیت کرے یا نہ کرے ایک طلاق بائن پڑ جائے گی[۲] (درمختار، شرح وقایہ ج ۲ ص ۸۲)

---

[۱] الکنایۃ عند الفقھاء ما لم یوضع لہ واحتملہ غیرہ فلا تطلق الا بنیۃ او دلالۃ الحال وھی حالۃ مذاکرۃ الطلاق والغضب۔ (درمختار، ج ۲ ص ۲۲۲)

[۲] بعض الفاظ میں دلالت حال کے باوجود نیت کی ضرورت ہوتی ہے ان میں مفتی حضرات کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

کنایہ کے بعض اور الفاظ

کنایہ کے بعض اور الفاظ یہاں لکھ دیئے جاتے ہیں مثلاً میرا گھر خالی کرو، دور رہو، اپنا راستہ لو، اپنا منہ کالا کرو، چلتی بنو، تو میرے کام کی نہیں، اپنے میکے جا کر رہو، میرا گھر چھوڑ دو، تو عمر بھر میرے لائق نہیں، میں نے تجھے آزاد کر دیا۔ میں نے تجھے تیرے والدین کے حوالے کیا، میں تجھ سے بیزار ہوں، ان تمام الفاظ سے طلاق کا مفہوم بھی نکلتا ہے اور غصّے کا اظہار تنبیہ و تادیب اور طنز و تشنیع کا مفہوم بھی نکلتا ہے اس لئے اس طرح کے الفاظ میں نیت کے بغیر طلاق نہ پڑے گی، بشرطیکہ قرینے سے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اس کا ارادہ طلاق ہی دینے کا تھا[1]

طلاق مغلّظہ کے الفاظ

طلاق مغلظہ دو طرح کے الفاظ سے پڑتی ہے، ایک تو بیوی سے کہا کہ میں نے تم کو تین طلاقیں دیں، دوسرے تین بار لفظ طلاق دُہرایا مثلاً یوں کہا کہ میں نے تجھ کو طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی، یا ایک طلاق آج دی اور دوسری و تیسری کل، یا دو چار دن کے بعد یا ایک ماہ کے بعد دی۔ ہر صورت میں جب تین طلاق دے گا تو تین طلاقیں پڑ جائیں گی۔

اگر تین طلاقیں کنایہ یعنی گول مول الفاظ میں دی جائیں یا صریح الفاظ میں تین ہی پڑیں گی۔ البتہ کنایہ میں تین طلاق کا تعین نیت دریافت کرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے، لیکن تین طلاق کنایہ دینے کے بعد کہے کہ میں نے صرف ایک طلاق کی نیت کی تھی، تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہ تین ہی طلاق مانی جائیں گی، البتہ اگر کسی نے اس طرح کہا کہ تجھ کو طلاق، طلاق، طلاق، تو اگر اس سے اس کی نیت تین طلاق دینے کی نہیں تھی، بلکہ صرف تاکید کرنی مقصود تھی تو دیانۃً تو ایک ہی طلاق ہو گی، مگر قاضی یا مفتی فتویٰ تین ہی طلاق

---

[1] فقال مالك واصحابه الصريح هو لفظ الطلاق فقط وما عدا ذالك كناية وهي عنده على ضربين ظاهرة ومحتملة وبه قال ابوحنيفه وقال الشافعي الفاظ الطلاق الصريحة ثلاث الطلاق والفراق والسراح وهي المذكورة في القرآن۔

(كتاب الطلاق بداية المجتهد)

کا دے گا، صدق دیانۃ وفی القضاء طلقت ثلاثًا (فتاوی عالمگیری، ج۲ ص۵) مگر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے دار العلوم دیوبند کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ اس سے ایک ہی طلاق رجعی پڑے گی، مگر کسی فقیہہ کی کوئی رائے نقل نہیں کی ہے اس لئے اس حدیث کے پیش نظر ثلث جدھن جدٌ وھزلھن جد النکاح والطلاق والرجعۃ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق کو اجماعًا تین طلاق تسلیم کیا گیا ہے، گو اس نے تجھ کو طلاق کا لفظ ایک ہی بار کہا ہے، پھر طلاق طلاق لفظ دہرایا ہے، مگر بعد کے لفظ طلاق کو جملہ پر محمول کیا جائے گا کیونکہ اگر یہ راستہ کھولا گیا، تو اس غیر ذمہ دارانہ دور میں کتنے لوگ جھوٹ بول کر حرام کاری کا دروازہ کھول لیں گے۔

کس کی طلاق واقع ہو گی اور کس کی نہیں

(۱) طلاق کے لئے یہ شرط ہے کہ طلاق دینے والا عاقل بالغ ہو، اگر کسی نابالغ یا پاگل، یا سوئے ہوئے آدمی نے طلاق دے دی تو طلاق واقع نہ ہو گی۔

(۲) اگر کسی نے نشے کی حالت میں طلاق دی، جب بھی طلاق پڑ جائے گی۔

(۳) ایسا مریض جس کے ہوش و حواس باقی نہ ہوں۔ مثلاً کسی کو سرسام ہو گیا ہے یا کوئی اور مرض جس میں اس کا ہوش و حواس باقی نہ ہو تو اس کی طلاق واقع نہ ہو گی کیونکہ اس وقت وہ عاقل نہیں ہے[۱]

اگر کسی مریض نے بیماری کی حالت میں طلاق دے دی، تو طلاق واقع ہو جائے گی، البتہ اگر وہ اسی مرض میں جس میں طلاق دی ہے، عدت گزرنے سے پہلے مر گیا تو عورت میراث پائے گی، اور اگر عدت گزر گئی، اس کے بعد مرا، تو پھر وہ میراث نہیں پائے گی، اسی طرح اگر عدت کے اندر وہ اچھا ہو گیا اور دوبارہ بیمار پڑا، اور عدت کے اندر ہی مر گیا، تو بھی عورت میراث نہ پائے گی۔ پہلی صورت میں یعنی عدت میں اس لئے میراث دلائی جائے گی کہ ہو سکتا ہے کہ زندگی سے مایوس ہو کر اس نے اس کو میراث سے محروم ہی کرنے کے لئے طلاق دی ہو،

---

[۱] کل طلاق جائز الا طلاق المعتوہ (المغلوب علی عقلہ)۔ ترمذی۔ ویقع طلاق کل زوج اذا کان عاقلا بالغا ولا یقع طلاق الصبی والمجنون والنائم۔ (ھدایہ، ج۲ ص۳۳۵)

اور دوسری صورت میں اس لئے میراث نہیں پائے گی کہ اتنے زمانہ پہلے طلاق دینے کا مطلب یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ واقعی اسی نیت سے اس نے طلاق دی ہے[1]

کوئی شخص صریح الفاظ میں طلاق خواہ ہنسی مذاق سے دے، یا سنجیدگی سے، ہر صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی، البتہ اگر اشارے اور کنایہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں، تو نیت کے بغیر طلاق نہ پڑے گی۔ تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

رجعت کا طریقہ

اوپر طلاق رجعی کا ذکر آچکا ہے، اب یہاں رجعت کے طریقے اور اس کے بعض دوسرے مسائل بیان کئے جاتے ہیں۔

اگر کسی نے ایک دو رجعی طلاق دی تو اس کو رجعت یعنی اپنا فیصلہ واپس لے لینے کا حق دیا گیا ہے، خواہ عورت اس کے لئے راضی ہو یا نہ ہو، طلاق رجعی میں عورت کی رضامندی کا لحاظ اس لئے نہیں کیا گیا ہے کہ اس میں رشتۂ نکاح بالکل ٹوٹ نہیں جاتا محض کمزور ہو جاتا ہے[2]

رجعت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کم سے کم دو آدمیوں کے سامنے یہ کہے کہ میں نے طلاق دی تھی، لیکن اب میں نادم ہوں اور پھر طلاق سے رجوع کرتا ہوں، یا میں دوبارہ اپنے نکاح میں لیتا ہوں، یا پھر اپنی بیوی بناتا ہوں۔ ان سب الفاظ سے رجعت ہو جائے گی۔ اب دونوں جیسے پہلے میاں بیوی تھے ویسے ہی رہیں گے، اگر تنہائی میں بھی رجعت کر لی جائے تو رجعت ہو جائے گی، لیکن مسنون طریقہ یہ ہے کہ[3] دو چار آدمیوں کے سامنے ایسا کیا جائے، کیونکہ جب اس کو دو چار آدمی جان جائیں گے، تو دوبارہ مرد کو اس طرح قدم اٹھانے میں جھجک محسوس ہوگی، اور عورت کے دل میں بھی شرمندگی سے بچنے کے لئے اپنے طرزِ عمل کے سدھارنے کا خیال پیدا ہوگا اور اگر خدانخواستہ پھر کوئی اختلاف رونما ہوگا تو یہ آدمی اس معاملے کے گواہ بھی ہو سکیں گے۔

اگر زبان سے رجعت کے الفاظ نہیں کہے، بلکہ تنہائی میں عورت سے مباشرت کر لی، یا

---

[1] ھدایہ ج ۲ ص ۳۷۳۔

[2] ھدایہ ج ۲ ص ۳۷۴ فلہ أن یراجع رضیت بذلک أو لم ترض۔

[3] ویستحب أن یشھد علی الرجعۃ شاھدین فان لم یشھد صحت الرجعۃ۔ (ہدایہ ج ۲ ص ۳۷۴)

بوس وکنار کرلیا تو اس سے بھی رجعت ہو جائے گی، مگر بہتر طریقہ وہی ہے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

مطلقہ رجعی کو کیا کرنا چاہیئے

جب کسی عورت کا شوہر اس کو رجعی طلاق دے تو خواہ قصور مرد کا ہو یا خود اس کا، عورت کو چاہیئے کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے تعلقات میں اور زیادہ کشیدگی پیدا ہو، بلکہ اس کو ایسا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے کہ جس سے یہ خلیج وسیع ہونے کے بجائے پٹ جائے، اور یہ رشتہ بالکل کٹ جانے کے بجائے پھر سے جڑ جائے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ عورت کے لئے مستحب ہے کہ وہ اس زمانے میں زیادہ بناؤ سنگھار کرکے رہے اور اسی لئے یہ بھی حکم ہے کہ عورت طلاقِ رجعی میں شوہر ہی کے گھر میں رہے، اور ایسا طرز عمل اختیار کرے جس سے دوبارہ شوہر اس کی طرف مائل ہو جائے[1] یہ حکم عدت تک کا ہے، عدت گزرنے کے بعد اب اس کو شوہر کے گھر سے چلا جانا چاہیئے، اور شوہر سے پردہ کرنا چاہیئے۔

طلاق رجعی میں مرد کو کیا چاہیئے؟

اسی طرح اس حالت میں مرد کو بھی باربار اپنے فیصلے پر غور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ایک پرانے رشتے کو کاٹ کر، دوسرا نیا رشتہ قائم کرنے میں ممکن ہے اس کا نفس کچھ لذت محسوس کرے، لیکن اس لذتِ نفس کا نتیجہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی خواہش کے مطابق ہی نکلے، اس لئے ایک نیا تجربہ کرنے اور ایک نیا خطرہ مول لینے کے بجائے اسی پرانے رشتے کی کمزوریوں کو دور کرکے اسے پھر سے استوار کرنے کی خواہش کرنی چاہیئے، اور اگر اس نے بالکل تہیّہ کرلیا ہے کہ یہ رشتہ اسے منظور نہیں ہے، تو پھر اس کو اپنا طرز عمل بیوی کے ساتھ ایسا رکھنا چاہیئے، جیسا کہ غیر عورت کے ساتھ ہوتا ہے، یعنی گھر میں جائے تو اطلاع دے کر جائے اور اس کے چہرے اور ہاتھ کے علاوہ کسی چیز پر نظر نہ ڈالے، یہ حکم تو عدت کے اندر کا ہے۔ عدت کے بعد عورت کو فوراً شوہر کا گھر چھوڑ دینا چاہیئے، اور اس سے اس طرح

---

[1] والمطلقة الرجعية تتزين فی العدة۔ (کنز الدقائق ص۱۲۶)

پردہ کرنا چاہیئے جس طرح غیر مرد سے کیا جاتا ہے۔ اور مرد کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔

عدّت تک اور عدّت کے بعد

(۱) طلاق رجعی میں عدت تک تو عورت کو شوہر کے گھر میں رہنے کا حق ہے، لیکن عدت گزر جانے کے بعد اب عورت کو شوہر کا گھر چھوڑ دینا چاہیئے، اب یہ طلاق رجعی طلاق بائن ہو گئی۔ اب اگر عدّت گزر جانے کے بعد مرد یہ چاہتا ہے، یا مرد و عورت دونوں چاہتے ہیں کہ پھر دونوں میں رشتۂ نکاح قائم ہو جائے تو پھر جس طرح شروع میں نکاح ہوا تھا، اسی طرح اب دوبارہ دو گواہوں کے سامنے دونوں نکاح کر کے پھر میاں بیوی بن سکتے ہیں۔ عدت کے بعد رجعت نہیں ہو سکتی۔ ایک طلاق دینے کے بعد ابھی عدت گذرنے نہیں پائی تھی کہ دوسری یا تیسری طلاق دے دی تو جتنی طلاقیں دی ہیں وہ سب پڑ جائیں گی، لیکن اگر عدت گزر جائے اور اس کے بعد دوسری یا تیسری طلاق دے تو یہ طلاقیں نہیں پڑیں گی۔ کیونکہ طلاق نکاح کی حالت میں دی جا سکتی ہے، اور عدت کے بعد عورت اس کے نکاح سے نکل چکی تو پھر اب اس کا طلاق دینا بے کار ہے۔

رجعت اس عورت سے ہو سکتی ہے، جس سے وہ مباشرت کر چکا ہے، اور جس عورت سے مباشرت نہ کی ہو چاہے خلوت صحیحہ ہو چکی ہو، اس کو ایک طلاق چاہے صریح الفاظ ہی میں کیوں نہ دی جائے ایک طلاق بائن پڑے گی[۱] یہ ایک طرح کی سزا ہے، اس لئے کہ جس عورت سے ابھی سابقہ ہی نہیں پڑا تھا تو اس کو طلاق دینے کے معنی ایک طرح کا ظلم ہے، اور اس ظلم کی یہی سزا ہے کہ رجعت کا موقع اسے نہ دیا جائے۔

مطلقہ بائنہ و مغلظہ کو کیا کرنا چاہیئے

جس عورت کو طلاق بائن یا مغلّظہ مل جائے، اس کو طلاق ملتے ہی شوہر سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر کے غیر مردوں کی طرح پردہ شروع کر دینا چاہیئے، البتہ عدت بھر اسی کے گھر رہنا چاہیئے اور عدت بھر اس کا نان نفقہ شوہر کے ذمے ہو گا، اور عدت میں

---

[۱] ان طلق غیر الموطوءۃ وقعن ثلاثا وإن فرق بائنت بواحدۃ۔ (کنز الدقائق ص۱۲۰)

اس کو بناؤ سنگھار کر کے نہ رہنا چاہیئے، بلکہ اس کے رشتے کے کٹ جانے کے غم میں بہت ہی معمولی طرح سے رہنا چاہیئے۔

طلاق کے الفاظ

جس طرح نکاح میں ایجاب و قبول ماضی کے صیغوں سے ہوتا ہے، یا حال کے صیغوں سے ہوتا ہے۔ اسی طرح طلاق بھی یا تو ماضی کے صیغے سے ہوگی یا حال کے۔ مثلاً کسی نے کہا کہ میں نے طلاق دی یا طلاق دیتا ہوں، تو جتنی طلاق دی ہے طلاق پڑ جائے گی، لیکن اگر یہ کہا کہ میں طلاق دوں گا، تو چاہے جتنی بار کہے طلاق نہیں پڑے گی۔

طلاق کا صحیح طریقہ

طلاق دینے کے تین طریقے ہیں، گو طلاق تینوں طریقوں سے پڑ جاتی ہے، لیکن دو طریقے سنت کے موافق ہیں۔ اور تیسرا طریقہ سنت کے خلاف ہے، اور سنت کے خلاف کام کرنے کی وجہ سے اس کو گناہ ہوگا، اور سزا کے طور پر اس کی طلاق مان بھی لی جائے گی، اصطلاح میں پہلے طریقے کو طلاق احسن اور دوسرے طریقے کو طلاق حسن اور تیسرے طریقے کو طلاق بدعی کہتے ہیں۔

سنت کے موافق ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ طلاق دینا کوئی پسندیدہ کام ہے، بلکہ یہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے، اس طریقے سے طلاق دینے میں اس کو غلط طرزِ عمل اختیار کرنے کا گناہ نہ ہوگا۔

طلاق احسن

ایک آدمی اگر طلاق دینا چاہتا ہے، تو اس کا سب سے اچھا (احسن) طریقہ یہ ہے کہ ایک ساتھ تین طلاق نہ دے ڈالے بلکہ صرف ایک طلاق رجعی دے اور ان ایام میں دے جن سے عورت حیض سے پاک رہتی ہے (یعنی طہر میں)، اور پھر یہ بھی شرط ہے کہ پاکی کے ایام میں اس سے مجامعت نہ کی ہو، اب ایک طلاق دینے کے بعد اس عورت کو عدت تک اپنے حال پر چھوڑ دے، یعنی جب تک تین حیض عورت کو نہ آجائیں، یا اگر وہ حاملہ ہے، تو جب تک ولادت نہ ہو جائے اس وقت تک اب اس کو نہ تو دوسری طلاق دے اور نہ اس سے کوئی تعلق رکھے۔ اب جوں ہی عدت ختم ہوگی، عورت کو ایک طلاق بائن پڑ جائے گی، اب وہ عورت اس کے لئے حرام ہو گی، مگر اب بھی یہ گنجائش باقی ہے کہ عورت جب تک دوسرے کسی

آدمی سے نکاح نہ کرلے، یہ دوبارہ نکاح کرکے اس کو اپنے نکاح میں لے سکتا ہے۔

اس طریقے کو سب سے بہتر طریقہ اسی لئے کہا گیا ہے کہ اس صورت میں آدمی کو تقریباً دو تین مہینے کا موقع مل جاتا ہے کہ وہ عورت کے طرز عمل اور اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکے، اگر چاہے تو عدت کے اندر رجعت کرلے اور نہیں کرتا تو عدت کے بعد گو وہ عورت اس پر حرام ہو گئی، مگر اب بھی اتنی گنجائش باقی ہے کہ اگر دونوں کو اس رشتے کے کٹ جانے پر پشیمانی ہے اور پھر اس کو دوبارہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو آپس کی رضامندی سے کر سکتے ہیں۔ صاحب ہدایہ نے اسی بنا پر لکھا ہے:۔

لِاَنَّہٗ اَبْعَدُ مِنَ النَّدَامَۃِ وَاَقَلُّ ضَرَرًا بِالْمَرْأَۃِ۔ (ج ۲ ص ۳۳۳)	کیونکہ اس میں ندامت و پشیمانی کی تلافی کا بھی کافی موقع ملتا ہے، اور عورت کو تکلیف سے بچانے کی آسان صورت بھی یہی ہے۔

طلاق حسن

طلاق حسن یعنی طلاق کا دوسرا صحیح طریقہ یہ ہے کہ بالغ عورت کو، ایک طلاق طہر یعنی پاکی کے زمانے میں دے، پھر دوسرے حیض کے بعد دوسری پاکی کا انتظار کرے اور اس میں دوسری طلاق دے، اور اگر اس کے بعد بھی وہ اپنے فیصلے پر قائم رہے، تو پھر تیسری طلاق دے، اب اس کے بعد عورت اس پر بالکل حرام ہو گئی، اس میں بھی یہ شرط ہے کہ اس مدت میں عورت کے ساتھ مجامعت نہ کرے اور نہ اس کے قریب جائے۔ البتہ اگر رجعت کرنا چاہے تو پھر کر سکتا ہے، اس صورت میں مرد کو کم سے کم دو مہینے کا موقع مل جاتا ہے، جن میں وہ اپنا فیصلہ بدل سکتا ہے، اسی طرح عورت کو بھی موقع ہے کہ وہ مرد کو رجعت پر راضی کرلے، اگر لڑکی نابالغ ہے یا کوئی عورت اتنی بوڑھی ہو گئی ہے کہ جسے حیض نہ آتا ہو تو ان کا حکم یہ ہے کہ ان کو ہر مہینے میں ایک طلاق دے۔ •

یکبارگی تین طلاق، طلاقِ بدعت ہے

طلاق بدعت یہ ہے کہ یکبارگی دو یا تین طلاقیں دے، مثلاً یہ کہے کہ تجھے دو یا تین طلاقیں ہیں یا دو بار اس طرح کہ تجھے طلاق ہے، طلاق ہے، یا تین بار کہے کہ تجھے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی، یا حیض کی حالت میں طلاق دی، یا اس پاکی کے زمانے میں طلاق دی جس میں

اس سے مباشرت کر چکا ہے، تو ان سب صورتوں میں طلاق تو پڑ جائے گی، لیکن چونکہ اس نے طلاق دینے کا طریقہ غلط اختیار کیا اس لئے اس کو گناہ ہوگا، اور یہ طلاق غلط طریقے سے دیئے جانے کے باوجود پڑ جائے گی[۱]۔ اس لئے کہ ہر مرد کو تین طلاق دینے کا اختیار ہے، اب وہ اپنے اختیار کو صحیح طریقے پر استعمال کرے، یا غلط طریقے پر اس کے عمل کا اثر تو بہر حال پڑنا ہی چاہیئے، اس کی مثال یوں سمجھیئے کہ کوئی شخص کرتا، ٹوپی، شیروانی سیدھے پہننے کے بجائے الٹے پہن لے، اور اسی حالت میں نماز پڑھ لے، تو اس کی نماز ہو جائے گی اور اس کو ننگا نہیں کہا جائے گا، یعنی اس کے الٹا اور سیدھا کپڑا پہن کر نماز پڑھنے میں قانونا کوئی فرق نہیں ہوگا، البتہ الٹا کپڑا پہن کر نماز پڑھنے والے کو بے تمیز یا بے شعور کہا جائے گا، اور اگر اس نے قصداً ایسا کیا ہے، تو اس کو ثواب بھی کم ملے گا، لیکن ان دونوں صورتوں کے عمل کا اثر برابر اور یکساں ہوگا، یعنی دونوں صورتوں میں اس کے سر سے فرض ادا ہو جائے گا، اس کی کچھ شرعی مثالیں بھی ہیں، مثلاً کوئی آدمی جب ظہار کرتا ہے، یعنی اپنی بیوی کو ماں یا بہن کے مانند قرار دیتا ہے تو قرآن نے اس کو "قول زور" جھوٹی بات کہا ہے، مگر اس کے باوجود ظہار ہو جائے گا، اور اگر اس نے طلاق کی نیت کی ہے تو طلاق پڑ جائے گی، ورنہ اسے کفارہ ادا کرنا ہوگا، یعنی گناہ کا کام ہوتے ہوئے حکم شرعی کا ترتب اس پر ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حیض میں طلاق دیا، حیض میں طلاق دینا منع ہے، مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رجعت کا حکم دیا، ظاہر ہے اگر طلاق نہ پڑتی تو پھر رجعت کا حکم آپ کیسے دیتے، اگر کوئی وضو میں کلی کرنا یا ناک میں پانی ڈالنا بھول جائے تو یہ سنت کے خلاف ضرور ہے مگر نماز ہو جائے گی، حالتِ حیض میں عورت کو حج کے لئے جانا منع ہے مگر حج ہو جاتا ہے، آبِ زمزم سے استنجا کرنا مکروہ ہے، مگر استنجا ہو جاتا ہے، مسجد میں غسل کرنا حرام ہے مگر غسل ہو جاتا ہے، زنا کرنا حرام ہے، مگر اس سے حرمت مصاہرت قائم ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ایک مجلس میں تین طلاق دینا طریقۂ سنت کے خلاف ہے، مگر اس کا وقوع

---

[۱] حاشیہ شرح وقایہ ج ۲ ص۶۹۔

ہو جائے گا۔ یہی جمہور امت اور ائمہ اربعہ کی رائے ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق کو تین قرار دیا (دارقطنی) اس کو حضرت عمرؓ نے قانونی حیثیت دیدی، اور کسی صحابی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی، گویا اس پر اجماع ہو گیا، شیخ عبدالرحمٰن الجزیری الفقہ علی المذاہب الاربعۃ میں لکھتے ہیں :-

فمثل هذا يقع لكنه يأثم	اس طرح طلاق دینے سے طلاق پڑ جائیگی
هو المنقول عن جمهور الصحابة	مگر طلاق دینے والا گنہ گار ہوگا۔ یہی جمہور
و التابعين و المجتهدين و	صحابہ وتابعین اور مجتہدین کی رائے ہے
يحسب عليه الطلاق البدعي	اور اس کا شمار طلاق بدعی میں ہوگا طلاقِ
سواء كان واحدا أو أكثر	بدعی چاہے ایک ہو یا اس سے زیادہ
باتفاق الأئمة الأربعة و	پڑ جائے گی۔ اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق
خالفهم بعض الشواذ الذين	ہے، بعض لوگوں نے جو اس کے خلاف
لا يعول على آرائهم۔	رائے دی ہے ان کی رائے قابلِ اعتنا نہیں
(ج ۴ ص ۳۰۲)	ہے اور نہ اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے تک یہ ایک طلاق سمجھی جاتی تھی، وہ اجماعِ امّت کے خلاف ہے، حال میں علمائے عرب نے اس سلسلہ میں جو فتویٰ دیا ہے، وہ نیچے نقل کیا جارہا ہے۔

علماء عرب کا فتویٰ

سعودی حکومت کی طرف سے ایک مجلس "اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء" کے نام سے قائم ہے، جس میں پورے ملک کے ممتاز علماء شریک ہیں، جس کے تحت وہ مختلف مسائل پر اپنا آخری اور متفقہ فیصلہ دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑی لمبی بحث (جو ۱۰۰ صفحہ پر پھیلی ہوئی ہے) کرنے کے بعد اپنا یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں عہد نبوی میں تین ہی سمجھی جاتی رہی ہیں، اور اسی پر ہمیشہ تعامل رہا ہے، اسی کو حضرت عمرؓ نے قانونی شکل دے دی، پھر چند افراد کو چھوڑ کر پوری امت اس پر عمل کرتی رہی اور آج تک کر رہی ہے،

تمام روایتوں پر بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:۔

القول بوقوع الطلاق الثلاث	ایک ساتھ تین طلاق دینے سے تینوں واقع
بلفظ واحد ثلاثا۔	ہوجاتی ہیں۔

(مجلۃ البحوث الاسلامیۃ، المجلد الاول، العدد الثالث، رجب شعبان رمضان ۱۳۹۷ ص ۱۶۵)

اس مسئلہ پر راقم الحروف نے بھی "اجتہاد اور تبدیلیٔ احکام" والی کتاب میں آج سے تیس برس پہلے اس مسئلہ کی پوری تفصیل کر دی ہے۔ مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری نے بھی فتاوی رحیمیہ کی پانچویں جلد میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

غیر مدخولہ کا حکم

نو برس سے کم عمر لڑکی۔ یا ایسی لڑکی جو نو برس سے زیادہ عمر کی ہے، یا بالغ ہے مگر شوہر نے اس سے مجامعت نہیں کی ہے، اگرچہ دونوں میں خلوتِ صحیحہ ہوچکی ہو، اس عورت کو شریعت میں غیر مدخولہ کہتے ہیں، اس کے اور مدخولہ عورت کے احکام میں کچھ فرق ہے۔

(۱) ایک فرق تو یہ ہے کہ غیر مدخولہ کو طلاق صریح الفاظ میں دی جائے، یا کنایہ واشارہ میں، طلاق بائن پڑے گی، رجعی نہیں پڑے گی، اب اگر ایک دے گا تو ایک پڑے گی، اور تین دے گا تو تین پڑے گی۔

(۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ غیر مدخولہ عورت کے لئے عدت نہیں ہے، یعنی وہ طلاق پاتے ہی دوسرے آدمی سے نکاح کر سکتی ہے۔

(۳) تیسرا فرق یہ ہے کہ اگر اس کو ایک طلاق دی ہے تو اب اس کو دوسری یا تیسری طلاق دینے کا حق نہیں ہے۔

(۴) چوتھا فرق یہ ہے کہ غیر مدخولہ کو تین طلاقیں اسی وقت پڑ سکتی ہیں، جب وہ یکبارگی یہ کہہ دے کہ میں نے تین طلاقیں دیں، اگر اس نے یکبارگی تین عدد کے ساتھ تین طلاقیں نہیں دی تو تین طلاق نہیں پڑے گی، مثلاً اس نے کہا کہ تجھ کو طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی تو پہلی بار جونہی اس کی زبان سے لفظ طلاق نکلا اس کو بائن طلاق پڑ گئی، اب دوسری اور تیسری جو طلاق دی وہ لغو سمجھی جائے گی، بخلاف اگر وہ مدخولہ یعنی ایسی عورت جس سے مباشرت

کر چکا ہے، اس کو ایک کے بعد دوسری تیسری طلاق بھی دے سکتا ہے اور طلاق کے بعد اس کو عدت بھی گزارنی ہوگی، اس کو چاہیے کہ ایک ساتھ تین طلاق دے یا تین لفظوں میں تین طلاق دے، جتنی دے گا پڑ جائے گی۔

متعۃ الطلاق اگر نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ آیا ہو اور خلوتِ صحیحہ سے پہلے طلاق ہو جائے اس کو متعۃ الطلاق دینا ہوگا۔

متاع طلاق اس صورت میں واجب ہوگا جب مہر کا ذکر نہ ہو اور خلوتِ صحیحہ سے پہلے طلاق ہو جائے، متاع کی کئی اور صورتیں ہیں، جن میں متاع واجب نہیں مستحب ہوگا، مثلاً (۱) مہر مقرر ہو چکا تھا اور خلوتِ صحیحہ سے پہلے طلاق ہو گئی، (۲) مہر مقرر نہیں ہوا اور خلوتِ صحیحہ کے بعد طلاق دی گئی، (۳) مہر مقرر ہو چکا تھا اور طلاق خلوتِ صحیحہ کے بعد دی گئی تو ان شکلوں میں متعہ واجب نہیں بلکہ مستحب ہوگا۔[1]

خلاصہ یہ کہ پہلی صورت میں صرف متاع ہی دینا واجب ہے، اور بقیہ صورتوں میں مہر کے ساتھ متاع دینا مستحب ہے، مثلاً پہلی صورت میں نصف مہر دینا ہوگا، دوسری صورت میں مہر مثل دینا ہوگا، اور تیسری صورت میں پورا مہر دینا ہوگا یعنی ان صورتوں میں شوہر اپنی مرضی پر ہے چاہے متاع زیادہ دے یا کم۔

متعہ یا متاع اوپر ذکر آچکا ہے کہ اگر نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ ہو تو اسے متاع دینا واجب ہے، یہ متاعِ طلاق کپڑے بھی ہو سکتے ہیں، دوسری اشیاء اور نقد رقم بھی، متاع اصل میں تھوڑی چیز کو کہتے ہیں، اور ایسی چیز جو بہت دنوں تک باقی نہ رہے۔ ہندوستان کی عدالتیں جو اس وقت متعہ کے لئے بڑی بڑی رقم کا فیصلہ کرتی ہیں وہ سراسر شریعت کے خلاف ہے۔

طلاق معلّق کا حکم اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو فلاں کام کرے گی، تو تجھ کو طلاق ہے، تو اب وہ عورت جب بھی وہ کام کرے گی اس کو طلاق پڑ جائے گی۔[2] اس کو شریعت میں تعلیق نکاح یعنی طلاق کو کسی دوسرے کام پر معلّق رکھنا یا کوئی شرط

---

[1] رد المحتار باب المہر، ج ۲ ص ۴۶۲۔ [2] و اذا أضافه الی شرط وقع عقیب الشرط مثل أن یقول لامرأته انت طالق ان انت دخلت الدار۔ (قدوری ص ۱۷۱)

لگا دینا کہتے ہیں، اس کے لئے چند باتیں ضروری ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ جو شرط لگائی جائے وہ محال نہ ہو، مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ جب آسمان زمین پر آجائے گا تو تجھ کو طلاق، یا اونٹ سوئی کے ناکے سے نکل جائے، تو تجھ کو طلاق ہے، تو اس کا یہ کلام لغو ہو جائے گا، اس سے طلاق نہیں ہوگی۔

(۲) دوسرے یہ کہ وہ شرط جو لگائی ہے اس کا موقع و محل موجود ہو۔ مثلاً اس نے کہا کہ اگر تو فلاں آدمی سے بات چیت کرلے تو تجھ کو طلاق ہے، تو جب اس آدمی سے بات چیت کرے گی طلاق پڑے گی۔ لیکن اگر وہ آدمی مرجائے تو پھر اب طلاق نہیں پڑے گی، کیونکہ جس پر شرط کو معلق کیا ہے، وہ موجود ہی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر اس نے کہا کہ تو فلاں گھر میں جائے گی تو تجھ کو طلاق ہے، اب وہ گھر گر گیا تو اب طلاق واقع نہ ہوگی، خواہ وہ دوبارہ کیوں نہ بنالیا گیا ہو۔

بعض اور مسائل

(۱) اگر کسی نے کہا کہ تو اگر فلاں کے گھر جائے گی، تو طلاق ہے، اب جب بھی عورت اس کے گھر جائے گی تو ایک طلاق رجعی پڑ جائے گی، اگر اس نے کوئی گول مول لفظ طلاق کی نیت سے کہا تو اس سے ایک طلاق بائن پڑ جائے گی۔

(۲) شرط لگا کر جتنی طلاق دے گا پڑ جائے گی، مثلاً یہ کہا کہ تو اگر اپنے میکے جائے، تو تجھ کو دو یا تین طلاق ہے تو جتنی دیگا پڑ جائے گی۔

(۳) اگر کسی نے کہا کہ فلاں کام کرے گی تو طلاق ہے، اس نے وہ کام کیا اور طلاق پڑ گئی، پھر شوہر نے اس سے رجعت کرلی، یا نکاح کر کے پھر اپنے نکاح میں لے لیا اور اس عورت نے پھر دوبارہ وہی کام کیا، جس کی بنا پر اس نے طلاق دی تھی تو اب دوبارہ کرنے سے اس کو طلاق نہیں پڑے گی، لیکن اگر اس نے یوں کہا کہ جب جب یا جب بھی تو فلاں کام کرے گی تو تجھ کو طلاق ہے، تو رجعت و نکاح کے بعد بھی دوبارہ کرے گی تو دو طلاق، اور تیسری بار کرے گی تو تین طلاقیں پڑ جائیں گی۔

طلاق میں نیابت

خود آدمی زبان سے طلاق نہ دے بلکہ دوسرے کو اس کا نائب بنادے اور وہ طلاق دے دے تو طلاق پڑ جائے گی، اس کی تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کسی کے ذریعے طلاق کی خبر بیوی تک پہونچادے، یا خط بھیج دے،

یادوسرے کسی کو طلاق کا وکیل بنادے، مخبر اور وکیل میں فرق یہ ہے کہ مخبر وہ الفاظ عورت تک پہونچا تا ہے جو مرد نے کہا ہے اور وکیل اپنی عبارت میں طلاق دیتا ہے۔ تیسری صورت تفویض کی ہے، تفویض اور وکیل میں فرق یہ ہے کہ وکیل مؤکل کی مرضی کے مطابق عمل کرتا ہے، اور تفویض میں جن کو طلاق تفویض کی گئی ہے، وہ اپنی مرضی سے کام کرتا ہے۔

تفویض یعنی عورت کو طلاق کا اختیار دینا

کسی مرد نے اپنے طلاق دینے کا اختیار خود اپنی بیوی کو دے دیا تو یہ حق اس کو حاصل ہے، اس کو تفویض طلاق کہتے ہیں، مثلاً یہ کہا کہ تم کو طلاق لے لینے کا اختیار دیتا ہوں، یا تمہارے اوپر طلاق کا معاملہ ڈالتا ہوں، تو اگر عورت فوراً یہ کہہ دے کہ میں نے ایک یا دو طلاق بائن لے لی تو جیسے ہی طلاق کا ذکر کرے گی پڑ جائے گی، لیکن اگر اس نے اسی مجلس میں نہیں کہا بلکہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی، یا دوسرا کام کرنے لگی تو اب یہ اختیار بالکل باطل ہو گیا، البتہ اگر اس طرح کہا ہو کہ تو جب چاہے یا جس وقت چاہے طلاق لے لے، تو پھر اس کو ہمیشہ اختیار رہے گا کہ جب چاہے طلاق لے کر علاحدہ ہو جائے[1]

تحریری طور پر بھی عورت کے سرپرست یا خود شوہر تفویض طلاق کر سکتا ہے، عورتوں کو مردوں کے مظالم اور حق تلفیوں سے بعض رکھنے کی یہ ایک بہت اچھی شکل ہے، اس کی مزید تفصیل اس بیان کے آخر میں آئے گی۔

اگر کسی نے انگلی کے اشارے سے کہا کہ تجھ کو طلاق ہے تو جتنی انگلیوں سے اشارہ کرے گا، اتنی طلاق پڑ جائے گی، اشارے کے وقت جو انگلیاں کھلی ہوں گی، ان کا اعتبار کیا جائے گا، بند انگلیوں کا نہیں۔

اگر کسی نے زبانی طلاق نہ دی، بلکہ تحریری طور پر طلاق کی اطلاع عورت کو دے دی، تو بھی طلاق ہو جائے گی، تحریر میں جتنی طلاقیں لکھے گا پڑ جائیں گی۔

---

[1] واذا قال لامرأته اختاری ینوی بذلك الطلاق أو قال لها طلقی نفسك فلها أن تطلق نفسها ما دامت فی مجلسها۔ (هدایه ج ۲ ص ۳۵۶)

اگر کسی کے سامنے شوہر نے یہ کہا کہ میں نے اپنی عورت کو طلاق دے دی تم میری بیوی کو اس کی زبانی یا تحریری اطلاع دے دو تو وہ آدمی بیوی کو اطلاع دے یا نہ دے، اس کو لکھے یا نہ لکھے، اس کے کہتے ہی فوراً بیوی کو طلاق پڑ جائے گی[1]

باپ کے کہنے سے طلاق

اگر کوئی باپ اپنے لڑکے کو طلاق دینے پر مجبور کرے، تو اگر اسے بیوی سے کوئی شکایت نہیں ہے تو لڑکے پر طلاق دینا ضروری نہیں ہے، طلاق شریعت میں ناپسندیدہ سمجھی گئی ہے اور حکم ہے کہ لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق، اللہ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔

طلاق کے لئے گواہوں کا ہونا ضروری نہیں

اگر کوئی مرد زبانی یا تحریری طلاق دے اور اس پر کوئی گواہ نہ بنائے تو طلاق پڑ جائے گی، گواہوں کا ہونا ضروری نہیں ہے، جب عورت کو معلوم ہو جائے تو وہ فوراً شوہر سے علاحدہ ہو جائے اور اسے صحبت نہ کرنے دے، المرأة كالقاضی، عورت کی حیثیت قاضی کی ہے۔ وہ خود فیصلہ کر سکتی ہے۔

البتہ اگر وہ انکار کرے تو اس وقت اس کو گواہ پیش کرنا ضروری ہوگا[2]

طلاق کے وقت بیوی کا سامنے نہ ہونا

طلاق واقع ہونے کے لئے عورت کا سامنے ہونا، طلاق کے الفاظ کا سننا، یا عورت کا نام لے کر طلاق دینا ضروری نہیں ہے، مگر جس موقع و محل سے دلالت حال، اس نے طلاق کا لفظ اپنی زبان سے نکالا، اگر اس سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد طلاق ہی دینا تھا تو جتنی طلاق دے گا، وہ سب پڑ جائے گی، اگر قرینہ سے معلوم ہو کہ اس کی زبان سے ایسے ہی وہ الفاظ نکل گئے تھے، تو طلاق واقع نہ ہوگی[3]

مہر کے عوض طلاق

اگر صریح طلاق مہر کے عوض دی جائے تو اس سے طلاق بائن پڑ جاتی ہے، جس میں رجعت نہیں ہے، یعنی مرد یہ کہے کہ میں نے

---

[1] فتاوی رحیمیہ ج ۲ ص ۱۲۸۔
[2] شامی بحوالہ رحیمیہ ج ۵ ص ۳۰۴۔ [3] فتاوی رحیمیہ ج ۵ ص ۳۰۵۔

مہر کے عوض تجھ کو طلاق دی[۱]

زبردستی طلاق

اگر کوئی طلاق زبان سے کہلائے تو طلاق پڑ جائے گی، لیکن اگر زبردستی تحریر میں لکھالے اور وہ زبان سے کچھ نہ کہے تو طلاق واقع نہ ہوگی[۲]

بدکار عورت کو طلاق

اگر کسی کی بیوی سے غلطی سے زنا کا صدور ہو جائے، اور وہ دیکھ لے تو اس کو طلاق دینا ضروری نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ آئندہ شوہر کے ساتھ وفاداری کے ساتھ رہنے کا عدہ کرے، حدیث میں ہے کہ ایک صحابی کی بیوی سے ایسی غلطی ہوگئی تو انھوں نے آپؐ سے ذکر کیا، آپؐ نے فرمایا کہ طلاق دے دو، انھوں نے کہا کہ وہ مجھے پسند ہے، تو آپؐ نے فرمایا کہ اچھا رکھ سکتے ہو[۳]

خواب آور گولی کھا کر طلاق دینا

اگر کوئی نشہ آور یا خواب گولی کھا کر طلاق دے، تو طلاق ہو جائے گی[۴]

نسبندی سے عورت کو تفریق کا حق

نسبندی سے محض قوت تولید یعنی بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے، جماع کی صلاحیت باقی رہتی ہے، اس لئے عورت کی تفریق نہ ہو سکے گی، البتہ اگر وہ چاہے تو خلع کرا سکتی ہے[۵]

---

[۱] یقع بائناً لأنه بعوض (شامی ج۲ ص...) [۲] ان المراد الاکراہ بالتلفظ بالطلاق فلو أکرہ أن یکتب طلاق إمرأته فکتب لا تطلق لأن الکتابة أقیمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا (مطلب فی الاکراہ علی التوکیل بالطلاق) (رد المحتار بحوالہ فتاوی رحیمیہ ج۳ ص۱۴۱)

[۳] قال انی أحبها قال استمتع بها۔ اسی بنا پر فقہاء نے لکھا ہے کہ لا یجب علی الزوج تطلیق الفاجرة۔ شوہر پر بدکار بیوی کو طلاق دینا واجب نہیں ہے۔

[۴] وان طلاق البنجی واقع (فتاوی رحیمیہ ج۵ ص۳۲۱) بھنگ پینے والے کی طلاق واقع ہو جائے گی۔

[۵] ولو لم یکن له ماء و یجامع فلا ینزل لا یکون لها حق الخصومة۔

(عالمگیری ج۲، باب ص۱۵۶،۱۵۷)

عدّت کا بیان

عدّت کے لفظی معنیٰ شمار کرنے کے ہیں اور شریعت میں اس مدتِ انتظار کو کہتے ہیں جو نکاح کے ختم ہونے کے بعد شریعت نے مقرر کی ہے، اس کی کئی صورتیں ہیں، سب کا بیان نیچے کیا جاتا ہے۔

طلاق پا جانے یا شوہر کے انتقال کے بعد ایک مدت تک دوسرے نکاح سے عورت کے رکے رہنے اور سوگ منانے کو عدت کہتے ہیں، عدت دو طرح کی ہوتی ہے، ایک طلاق کی عدّت، دوسرے موت کی عدّت۔ طلاق کی عدّت کی کئی صورتیں ہیں۔

(۱) طلاق کی عدت

اگر کسی عورت کو طلاق مل گئی ہو، تو اس کی عدت تین حیض ہے، یعنی اس کو تین حیض جب تک نہ آجائیں۔ نہ تو وہ دوسرے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے، اور نہ تو اس گھر سے جس میں اس کو طلاق ملی ہے، بغیر کسی مجبوری کے باہر نکل سکتی ہے، قرآن میں ہے:۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ[۱] (بقرہ)	مطلقہ عورتیں تین حیض کے گذرنے تک نکاح وغیرہ سے رکی رہیں۔

طلاق کی عدت میں اس کو کس طرح رہنا چاہیئے۔

---

[۱] قروءٌ، قرءٌ کی جمع ہے، صحابہ اور ائمہ میں سے امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے اس سے حیض ہی مراد لیا ہے، اور امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے طہر مراد لیا ہے یعنی پاکی کا زمانہ۔ ابن قدامہ نے المغنی میں بہت سی حدیثیں نقل کر کے اس رائے کو مدلل کیا ہے۔

جس عورت کو ایک یا دو طلاق رجعی ملی ہو اور وہ بالغ ہو اور حیض کا سلسلہ بند نہ ہوگیا ہو، تو اس کو جیسا کہ اوپر کی آیت سے معلوم ہوا تین حیض تک نہ تو کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرنا چاہیئے، اور نہ اس کو اس گھر سے جس میں طلاق ملی ہے، نکل کر دوسرے کسی کے گھر جانا چاہیئے، البتہ جس عورت کو طلاق رجعی ملی ہے، اس کو بناؤ سنگھار کرنے کی اجازت ہے، تاکہ شوہر راغب ہوکر رجعت کرلے۔ قرآن میں ہے، وَلَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ۔ (طلاق)

طلاق رجعی کی طرح، طلاق بائن اور طلاق مغلّظہ کی عدت بھی تین حیض ہے، اس کو بھی نہ تو عدت بھر کسی سے نکاح کرنا چاہیئے، اور نہ عدت بھر گھر سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر جانا چاہیئے، ان دو باتوں کے ساتھ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ بناؤ سنگھار نہ کرے۔ یہ تینوں چیزیں ایسی عورت کے اوپر حرام ہیں۔

جس عورت کو طلاق بائن دی گئی ہو، وہ اسی شوہر سے عدت کے اندر بھی نکاح کرسکتی ہے، لیکن دوسرے کسی سے اگر عدت کے اندر نکاح کرے گی تو سخت گناہ بھی ہوگا اور نکاح بھی نہ ہوگا۔[۱]

(۲) جن عورتوں کو حیض نہ آتا ہو

جن عورتوں کو نابالغ ہونے کی وجہ سے ابھی حیض نہ آیا ہو، یا بڑھاپے یا کسی مرض کی وجہ سے حیض کا آنا بند ہوچکا ہو، ان کی عدت تین مہینے ہے، قرآن میں ہے:-

وَاللّٰٓئِیْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّاللّٰٓئِیْ لَمْ يَحِضْنَ۔ (طلاق)	اور تمہاری بیویوں میں سے جن عورتوں کو حیض آنا بند ہوگیا ہو ان کے بارے میں اگر شبہ ہو تو ان کی اور جن لڑکیوں کو ابھی حیض نہ آیا ہو ان کی عدت تین مہینے ہے۔

(۳) موت کی عدّت

تین دن سے زیادہ کسی کے مرنے کا غم کرنا، سوگ منانا اور تیل کنگھی وغیرہ چھوڑ دینا درست نہیں ہے، بلکہ ایسا کرنا حرام ہے،

---

[۱] ينكح مبانته بما دون الثلث فی العدة او بعدها بالاجماع منع فيها لاشتباه النسب۔ (درمختار۔ بہشتی زیور)

لیکن شوہر کا رشتہ ایسا نازک اور پائدار رشتہ ہوتا ہے کہ اس کے کٹ جانے کی اتنی اہمیت ہے کہ عورت کو کئی مہینے تک غم کرنے اور سوگ منانے کی اجازت دی گئی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

لَا یَحِلُّ لِامْرَأَۃٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ تُحِدَّ عَلٰی مَیِّتٍ فَوْقَ ثَلٰثٍ اِلَّا عَلٰی زَوْجٍ اَرْبَعَۃَ اَشْھُرٍ وَّعَشْرًا۔ (بخاری ومسلم)

کسی مسلمان عورت کے لئے جو توحید و آخرت پر ایمان رکھتی ہے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی مردے پر تین دن سے زیادہ رنج وغم کا اظہار کرے لیکن اپنے شوہر کی موت پر وہ (چار مہینے دس دن تک) ایسا کر سکتی ہے۔

رشتۂ زوجیت دو طرح سے کٹتا ہے

شوہر کا رشتہ بیوی سے دو طرح سے کٹتا ہے، ایک طلاق کے ذریعے، دوسرے موت کے ذریعے۔ طلاق کی عدت کا حکم اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اب موت کی عدت کا حکم بیان کیا جاتا ہے۔

اگر کسی عورت کا شوہر مر جائے، اور وہ حاملہ نہ ہو تو اس کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔ قرآن میں ہے :۔

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِھِنَّ اَرْبَعَۃَ اَشْھُرٍ وَّعَشْرًا۔ (بقرہ)

جو لوگ تم میں سے انتقال کر جاتے ہیں، اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جاتے ہیں وہ بیویاں چار مہینے دس دن تک اپنے کو نکاح وغیرہ سے روکے رکھیں۔

قرآن میں چار مہینے دس دن اپنے کو روکے رکھنے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نکاح نہ کریں اور نہ شوہر والی عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار کریں اور نہ گھر سے باہر جائیں، گویا اس مدت میں ہر طرح کی دل چسپی اور شوقینی سے باز رہیں۔

مطلقہ عورت یا جس کا شوہر مر گیا ہے، اس کے اظہار غم کرنے، سوگ منانے اور بناؤ سنگھار نہ کرنے کا جو ذکر قرآن وحدیث میں ہے اسی سے فقہائے یہ احکام مستنبط کئے ہیں۔

(۱) جس عورت کا شوہر مر گیا ہے، اسے چار مہینے دس دن، اور جس عورت کو طلاق بائن

مل چکی ہے، اس کو تین حیض تک بغیر کسی مجبوری کے نہ تو اس گھر سے باہر جانا چاہیئے، جس میں اسے طلاق ملی ہے، یا شوہر کا انتقال ہوا ہے، اور نہ عدت تک نکاح کرنا چاہیئے، اگر وہ گھر سے باہر گئی تو عدت کا خرچ نہیں ملے گا۔[1] اور نہ شوہر والی عورتوں کی طرح زیبائش و آرائش کے ساتھ رہنا چاہیئے، مثلاً نہ ان کو گہنا زیور پہننا چاہیئے، نہ خوشبو لگانا چاہیئے، نہ سر میں تیل ڈالنا چاہیئے، نہ کنگھی کر کے مانگ نکالنی چاہیئے، نہ سرمہ، ٹیکا لگانا چاہیئے، نہ پان کھانا چاہیئے اور نہ عمدہ اور شوخ کپڑے پہننے چاہئیں۔ یہ سب باتیں حرام ہیں۔[2] مطلقہ بائنہ کو عدت بھر شوہر سے پردہ کرنا بھی ضروری ہے۔[3] البتہ اگر اسے طلاق رجعی ملی ہے تو وہ بناؤ سنگھار کر سکتی ہے تاکہ شوہر اس کی طرف مائل ہو جائے۔[4]

(۲) اگر سر میں درد ہو یا جوئیں پڑ جائیں، تو سر میں تیل ڈالنے اور کنگھی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر خوشبودار تیل نہ لگانا چاہیئے، اسی طرح اگر پان نہ کھانے یا سرمہ نہ لگانے کی وجہ سے دانت یا آنکھ میں درد یا تکلیف محسوس ہو تو پان کھا لینے اور سرمہ لگانے میں کوئی حرج نہیں۔[5]

(۳) اسی طرح کوئی شدید ضرورت پیش آ جائے، تو وہ گھر سے باہر دوسری جگہ جا سکتی ہے، لیکن نکاح کسی حالت میں نہیں کر سکتی۔ (شرح وقایہ)

(۴) نہانے دھونے، بدن اور کپڑوں کو صاف ستھرا رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

---

[1] وإن نشزت فلا نفقة لها حتى تعود الى منزله (هدايه ج ۲ ص ۴۱۸)

[2] وتحدّ معتدة البائن والموت كبيرة مسلمة بترك الزينة ولبس المزعفر والمعصفر والحناء والطيب والدهن والكحل الا بعذر۔ (شرح وقایہ ج ۲ ص ۱۴۰)

[3] ولا بد من سترة بينهما في البائن۔ (شرح وقایہ ج ۲ ص ۱۵۳)

[4] والمطلقة الرجعية تتزين يعنى لزوجها اذا كانت الرجعة مرجوة لانها حلال للزوج لان النكاح قائم بينهما۔ (كنز الدقائق ص ۱۳۶)

[5] الا بعذر۔ (شرح وقایہ ج ۲ ص ۱۴۰)

(۵) سوگ کرنا بالغ عورت پر واجب ہے، نابالغ لڑکی پر واجب نہیں ہے، البتہ عدت بھر نہ تو نابالغ لڑکی کا نکاح کرنا چاہیئے اور نہ اس کو گھر سے باہر جانے دینا چاہیئے۔ (بہشتی زیور)

(۶) سوگ اور غم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مستقل طور پر چیختی چلّاتی یا آنسو بہاتی رہے، یا ماتمی لباس پہن کر ہر وقت سینہ کوبی کرتے رہے، یہ سب ناجائز و حرام ہے، اسی طرح ہر سال موت کی برسی منانا اور اس میں کھانا کھلانا، مجمع کرنا، عرس کرنا، چادر چڑھانا یہ سب ناجائز ہے۔ یہ اظہارِ غم نہیں ہے، بلکہ گناہ ہے۔

شوہر کے علاوہ اپنے کسی اور عزیز رشتہ دار پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں، بشرطیکہ شوہر منع نہ کرے، اگر وہ منع کرے تو یہ بھی جائز نہیں ہے۔ (ولزوج منعھا)

عدّت کا مقصد

عدت کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ یہ اہمیت ذہن نشین ہو جائے کہ رشتۂ نکاح کا توڑنا یا ٹوٹ جانا بڑی اہم بات ہے۔ دوسرے یہ بات معلوم ہو جائے کہ اس شوہر سے اس کو حمل تو نہیں ہے۔ اور دو تین مہینے میں یہ بات عیاں ہو جائے گی۔[1]

(۴) حاملہ کی عدّت

جس عورت کو طلاق بائن یا مغلظہ مل چکی ہے، یا اس کا شوہر انتقال کر گیا ہے، اور اس کو اس شوہر سے حمل ہے تو اس حاملہ کی عدت وضعِ حمل ہے، یعنی جب تک بچہ پیدا نہ ہو جائے وہ نہ تو نکاح کر سکتی ہے، نہ گھر کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر جا سکتی ہے، اس کو بھی اس طرح سوگ کرنا چاہیئے، جس طرح اوپر بیان کیا گیا ہے:۔

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ۔ (طلاق)

اور حاملہ عورتوں کی عدت وضعِ حمل ہے۔

(۵) زانیہ کی عدّت

(۱) اگر کوئی بدبخت عورت و مرد زنا کر بیٹھیں اور عورت کو حمل رہ جائے، تو اگر اس زانیہ سے اس زانی کا نکاح ہو تو حمل کی حالت

---

[1] لأن العدة وجبت للتعرف من براءة الرحم في الفرقة الطارئة على النكاح وهذا يتحقق فيها۔ (هدايه ج ۲ ص ۴۰۳، المغني ج ۷ ص ۴۴۸)

میں بھی یہ دونوں نکاح کر سکتے ہیں، کیونکہ جب انھوں نے نکاح جیسی اہم قید کی پرواہ نہیں کی اور وہ فعل کر بیٹھے جو نکاح کے بعد کرنا چاہیئے، تو پھر ان کو جلد سے جلد نکاح کر لینے کی اجازت دیدینا ہی مناسب ہے، کیونکہ ایسے بے حیا جو نکاح کی قید کو توڑ سکتے ہیں، وہ عدت کی پرواہ کب کریں گے بلکہ مزید گناہ کریں گے، اس لئے ان کو جلد سے جلد گناہ سے بچانے کی یہی صورت ہے کہ عدّت کی قید ان سے ہٹا کر جلد سے جلد ان کو گناہ سے بچا لیا جائے۔

یہی حکم اس عورت کا بھی ہے، جس کے شوہر نے زنا کے ارتکاب کی وجہ سے اس کو طلاق دے دی ہے، اور یہی حکم اس عورت کا بھی ہے جو طلاق پانے کے بعد زنا کی مرتکب ہوتی ہے۔

(۲) لیکن اگر کسی زانیہ حاملہ عورت کا نکاح زانی کے بجائے کسی دوسرے سے کرنا ہو، تو حمل کی حالت میں اس کا نکاح دوسرے شخص سے بھی ہو سکتا ہے، البتہ زانی اس سے حمل کی حالت میں مباشرت بھی کر سکتا ہے، اور دوسرا آدمی وضع حمل سے پہلے مباشرت نہیں کر سکتا، کیونکہ اسلامی شریعت یہ پسند نہیں کرتی کہ جس رَحم میں ایک آدمی کا نطفہ پڑ چکا ہے، اس میں دوسرے کسی کا اسی کے ساتھ پڑے، اس میں عورت کے رَحم کا احترام بھی ملحوظ ہے، اور یہ بات بھی ہے کہ لڑکے کا نسب مشتبہ نہ ہونے پائے[۱]۔ ایلاء کا بیان اوپر آچکا ہے اور لعان، ظہار اور خلع کا بیان آگے آرہا ہے ان سب کی عدت کا بیان وہیں ہو گا۔

عدّت میں نکاح کا پیغام

عدت کی حالت میں نکاح کے پیغام کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ شوہر کی موت ہو چکی ہے، یا اس کو طلاق مغلظہ مل چکی ہے، تو اس عورت سے صراحۃً نکاح کا پیغام دینا حرام ہے، البتہ اشارہ وکنایہ سے نکاح کا پیغام دیا جا سکتا ہے، لیکن وہ مطلقہ عورت جسے طلاق رجعی یا طلاق بائن ملی ہے، اس کو عدّت کے اندر اشارہ وکنایہ سے بھی نکاح کا پیغام دینا حرام ہے، کیونکہ عدت میں پہلے شوہر کو رجعت کر کے یا نکاح کر کے پھر اپنے حبالۂ عقد میں واپس لے لینے کا موقع باقی ہے تو جب تک یہ موقع باقی ہے،

---

[۱] شرح النقایہ ج ۲ ص۷ در مختار مع شامی ج ۲ ص۴۱۰ ۔ زانی سے زانیہ حالتِ حمل میں نکاح کے بارے میں ائمہ کی دو رائیں ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے خواہ حمل ہو یا نہ ہو، عدت کی ضرورت نہیں ہے اور امام ابو یوسفؒ اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ عدّت کے اندر نکاح جائز نہیں، امام مالکؒ عدت کی قید نکاح کے لئے نہیں بلکہ حد کے جاری کرنے کے لئے لگاتے ہیں۔ (المغنی ج ۶ ص۶۰۱ الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۴ ص۵۱۵)

دوسرے کو اس کے ختم کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے اور نکاح کا پیغام دینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے درمیان جو ذرا سا رشتۂ تعلق باقی رہ گیا ہے وہ بھی ختم کر دیا جائے۔

قرآن میں ہے کہ:-

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّكَاحِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ۔ (بقرہ)

جن عورتوں کے شوہر مر چکے ہیں، ان سے عدت کے اندر اگر تم اشارہ و کنایہ میں پیغام نکاح دو یا اپنے دل میں یہ خواہش پوشیدہ رکھو تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے، اللہ کو معلوم ہے کہ ان عورتوں کا ذکر تم ضرور کرو گے، لیکن خفیہ طور پر نکاح کا معاملہ بالکل طے نہ کرلو، مگر یہ کہ کوئی بھلی بات کہہ دو اور اس وقت تک ان سے نکاح کر لینے کا قصد نہ کرو جب تک کہ عدت ختم نہ ہو جائے۔

قول معروف یعنی بھلی بات کہنے سے مطلب یہ ہے کہ عورت کو بغیر کسی نام لئے نکاح پر ابھارا جائے، یا اپنے نکاح کا ارادہ ظاہر کر دیا جائے، مگر یہ نہ کہا جائے کہ تم سے ہم، یا فلاں نکاح کرنا چاہتے ہیں، یا اس طرح کہا جائے کہ میں نکاح کرنا چاہتا ہوں، مگر ایسی ایسی صفات کی عورت ہونا چاہیئے، اور وہ صفات اس عورت میں موجود ہوں، غرض یہ کہ یہ صراحت بالکل نہ ہو[1]

(۱) اوپر ذکر آچکا ہے کہ حیض کی حالت میں طلاق دینا گناہ ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس کا ارتکاب کر بیٹھے، یعنی حیض کی حالت میں طلاق دے بیٹھے تو پھر اس کی عدت میں وہ حیض شمار نہ ہوگا جس میں اس نے طلاق دی ہے، بلکہ اب اس کے بعد سے تین حیض عدت میں شمار کئے جائیں گے۔

(۲) کسی عورت کو طلاق رجعی ملی، اور ابھی عدت پوری نہیں ہوئی تھی کہ شوہر کا انتقال ہوگیا، تو اب اس کو اس وقت سے موت کی عدت پوری کرنی چاہیئے، اب طلاق کی عدت کا کوئی اعتبار

---

[1] ولا تخطب معتدۃ الا تعریضاً۔ (شرح وقایہ ج ۲ ص ۱۵۳)

نہیں ہے لیکن اگر طلاق بائن یا مغلظہ دی ہے، اور اس کے بعد مر گیا ہے تو موت کی عدت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ وہ محض طلاق ہی کی عدت پوری کرے، کیونکہ طلاق رجعی کی صورت میں رشتۂ نکاح بالکل ٹوٹا نہیں تھا، اس لئے اس رشتے کے احترام میں اسے اظہار غم کرنا چاہیئے، لیکن دوسری صورت میں چونکہ رشتۂ نکاح ٹوٹ چکا ہے، اس لئے اب اس کی موت اور زندگی دونوں اس کے لئے یکساں ہیں۔

(۳) اسقاط حمل

اسقاط حمل سے عدت ختم ہو جاتی ہے۔ (فتوی رحیمیہ ج ۲ ص ۱۴۷)

(۴) نومسلمہ کی عدّت

اگر کوئی عورت اسلام قبول کرے تو اس کو تین حیض عدت گذار کے پھر کسی مسلمان سے نکاح کرنا چاہیئے، اگر عدت کے اندر اس کا شوہر اسلام قبول کرلے تو پھر اس کو نکاح کی ضرورت نہیں ہے، وہ اس کی بیوی ہے (ردالمحتار کتاب الطلاق)

(۵) عدت میں اختلاف

اگر عدت کے بارے میں شوہر اور بیوی میں اختلاف ہو جائے تو اگر ساٹھ دن گذر چکے ہیں تو عورت سے حلف لیا جائے گا، اگر وہ حلف سے کہہ دے کہ تین حیض گذر چکے ہیں تو اس کی بات مان لی جائے گی [۱]

حلالہ

اوپر بار بار ذکر آیا ہے کہ جس عورت کو طلاق مغلظہ مل جائے اس عورت کو اگر یہ شوہر پھر اپنے رشتۂ نکاح میں لینا چاہتا ہے تو اس کی ایک صورت ہے اور وہ ہے حلالہ۔

حلالہ کی صورت یہ ہے کہ وہ عورت طلاق کے بعد عدت گزارے اور پھر اپنی مرضی سے کسی سے نکاح کرے اور نکاح کے بعد وہ مرد اس سے مباشرت بھی کرلے، اب اس مباشرت و مجامعت کے بعد اگر وہ مرد اپنی مرضی سے اس کو طلاق دے دیتا ہے یا اس کا انتقال ہو جاتا ہے تو اب طلاق یا موت کی عدّت گزارنے کے بعد اب وہ اس پہلے شوہر سے پھر نکاح کرسکتی ہے۔ قرآن میں

---

[۱] حالفت مضت عدتی وکذبھا الزوج قبل قولھا مع حلفھا و الا لا۔

(شامی بحوالہ فتاوی رحیمیہ)

اس کا حکم ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ۔ (بقرہ ۵)

تو اگر کوئی تیسری طلاق دے دے تو یہ عورت اس کے بعد اس کے لئے حلال نہیں رہے گی۔ یہاں تک کوئی دوسرا شوہر اس سے نکاح کرے اور پھر جماع کے بعد اس کو طلاق دیدے تو اگر دوسرے شوہر نے طلاق دے دی، تو اب ان دونوں کے لئے یہ اجازت ہے کہ یہ پھر سے نکاح کر کے میاں بیوی بن جائیں بشرطیکہ دونوں کو اس بات کا یقین ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان حدود کو قائم رکھیں گے جو نکاح کے سلسلے میں بتا دیئے گئے ہیں۔

اپنی مطلقہ عورت کو دوبارہ نکاح میں لینے کے لئے ان آیات میں چند شرطیں لگا دی گئی ہیں :۔

(۱) ایک یہ کہ دوسرے شوہر سے نکاح کرلے۔

(۲) دوسری یہ کہ وہ دوسرا شوہر اپنی مرضی سے پھر طلاق دے۔

(۳) تیسری ضروری شرط یہ لگائی گئی ہے کہ دوسرے شوہر کی طلاق کے بعد اگر یہ دونوں پھر رشتۂ نکاح قائم کرنا چاہتے ہیں تو دونوں پہلے یہ سوچ لیں کہ وہ ان حقوق و فرائض کے ادا کرنے میں پھر تو کوتاہی نہ کریں گے، جس کی وجہ سے دونوں میں اختلاف پیدا ہوا تھا اور اس اختلاف کے نتیجے میں طلاق ہوئی تھی، ان شرائط کی روشنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مزید ہدایتیں دی ہیں۔ مثلاً آپؐ نے فرمایا کہ جب تک دوسرا شوہر مباشرت نہ کرلے اسوقت تک پہلے سے نکاح جائز نہیں ہو گا۔

طلاق کی شرط لگا کر حلالہ کرنا سخت گناہ ہے

اوپر ذکر آچکا ہے کہ نکاح میں کوئی شرط لگانا حرام ہے، چنانچہ حلالے کے سلسلے میں سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ دوسرے شوہر سے اگر مطلقہ عورت نکاح کرے تو وہ خود یا اس کے سرپرست یا خود نکاح کرنے والا یہ شرط نہ لگائے کہ وہ طلاق ضرور ہی دے دیگا، بلکہ یہ نکاح اسی طرح ہونا چاہیئے جس طرح نکاح ہوتا ہے اور اس کے بعد طلاق اسی ضرورت کی بنا پر دینا چاہیئے جس کی بنا پر طلاق دینے کی اجازت دی گئی ہے، اگر کوئی شخص شرط لگا کر نکاح

کرے گا اور پھر حلالے کے لئے طلاق دے دے گا تو اس کو سخت گناہ ہوگا اور حلالہ کرانے والا اور کرنے والا دونوں لعنت کے مستحق ہوں گے، گو حلالہ کے بعد پہلے شوہر سے نکاح جائز ہو جائے گا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح حلالہ کرنے والے اور جس کے لئے حلالہ کیا جائے دونوں پر سخت لعنت کی ہے۔ حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت عقبہ بن نافع اور متعدد صحابہ سے مروی ہے کہ "لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المحلل والمحلل له"۔ (ابن ماجہ، کتاب النکاح ص ۱۴۰، ابوداؤد)

حضرت عمرؓ کے عہد میں اس طرح کی بے احتیاطی شروع ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ جو مرد عورت طلاق دینے کی شرط لگا کر حلالے کے لئے نکاح کریں گے، میں ایسے میاں بیوی کو رجم کردوں گا"[1]

اتنی سختی برتنے کی وجہ یہ تھی کہ اس سے رشتۂ نکاح کا احترام اور اس کا فائدہ ہی ختم ہو جاتا ہے، اس لئے اس سلسلہ میں چند باتوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے:۔

(۱) پہلے شوہر کے لئے یہ عورت اسی وقت حلال ہو سکتی ہے جب طلاق کے بعد طلاق کی عدت اس نے گذار لی ہو اور پھر اس کے بعد دوسرے شوہر سے بغیر کسی شرط اور دباؤ کے نکاح کیا ہو۔

(۲) دوسرے شوہر نے نکاح کے بعد اس سے صحبت اور مباشرت بھی کر لی ہو اگر شوہر نامرد ہے یا بغیر مباشرت وجماع کئے ہوتے مر گیا تو یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہو سکتی۔

(۳) دوسرے شوہر کی طلاق کے بعد پھر عورت نے طلاق کی عدت پوری کر لی ہو اور اس کے بعد پہلے شوہر سے نیا نکاح کیا ہو[2]

ثبوتِ نسب اسلامی شریعت کا قاعدہ ہے کہ جب تک کوئی مجبوری نہ ہو جائے اس وقت تک کسی بچہ کے نسب کی نفی نہیں کرنی چاہیئے، یعنی یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ یہ لڑکا یا لڑکی فلاں کی نہیں ہے بلکہ دوسرے

---

[1] المغنی ج ۶ ص ۶۴۸۔

[2] وان کان الطلاق ثلاثا فی الحرة لم تحل له حتی تنکح زوجا غیره نکاحا صحیحا ویدخل بها ثم یطلقها او یموت عنها۔ (ج ۱ ص ۴۷۳)

کے نطفہ سے ہے۔

ثبوتِ نسب

(۱) شریعت نے ثبوتِ نسب کے لئے کم سے کم مدت چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ دو برس مقرر کی ہے، یعنی اگر نکاح کے بعد کسی عورت کو چھ ماہ کے بعد ہی لڑکا پیدا ہو جائے تو اس کا نسب ثابت سمجھا جائے گا، یعنی اس کو اسی شوہر کا لڑکا سمجھا جائے گا جس نے چھ ماہ پہلے نکاح کیا ہے، اسی طرح اگر کسی عورت کو طلاق مل چکی ہے یا اس کا شوہر مر گیا ہے اور اس نے دو برس تک نکاح نہیں کیا اور ڈیڑھ دو برس کے اندر لڑکا پیدا ہوا تو وہ لڑکا ثابت النسب سمجھا جائے گا، یعنی ایسے لڑکے کو ولد الحرام نہیں کہیں گے جو لوگ فوراً عورت کے اخلاق وکیرکٹر پر شبہ کرنے لگتے ہیں، اور لڑکے کو نطفۂ حرام قرار دے دیتے ہیں وہ بہت گناہ کرتے ہیں۔ شریعت نے اس کی سخت ممانعت کی ہے[۱]۔

ایک بار ایک اعرابی آپؐ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میری بیوی کے ایک کالے رنگ کا بچہ پیدا ہوا ہے، میں نے اس کو اپنا لڑکا کہنے سے انکار کر دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے پاس اونٹ ہیں تو اس نے کہا ہاں، آپؐ نے دریافت فرمایا وہ کس رنگ کے ہیں؟ اس نے کہا سرخ، پھر آپؐ نے دریافت فرمایا کہ کچھ خاکستری رنگ کے ہیں، اس نے کہا ہاں، آپؐ نے فرمایا کہ یہ دو رنگ کیسے ہوئے؟ اس کی نسل میں کوئی اس رنگ کا رہا ہوگا، آپؐ نے فرمایا کہ تو اس لڑکے کے کالے ہونے میں اسی اصل کا دخل ہے۔ "ولم یرخص فی الانتفاء منہ" آپؐ نے اس کے نسب سے انکار کرنے کی اجازت نہیں دی۔ (بخاری ومسلم)

ابن قدامہ نے المغنی میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر چھ مہینے کے اندر بچہ پیدا ہو تو اس کا نسب ثابت سمجھا جائے گا۔ لأن النسب یحتاط لاثباتہ لا لنفیہ[۲]۔

(۱) اگر کسی عورت کو چھ ماہ سے پہلے صحیح وسالم لڑکا پیدا ہو جائے یا دو برس کے بعد پیدا ہو تو پھر

---

[۱] والحکم فیہ انما یثبت النسب من غیر دعوۃ ولا ینتفی بمجرد النفی وانما ینتفی باللعان (عالمگیری ج ۲، ص ۵۲۶) اس میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔

[۲] المغنی ج ۷، ص ۴۱۸۔

عورت کو زانیہ اور بچے کو ولد الحرام قرار دیا جا سکتا ہے [1]

لعان

لعان کا لفظ لعنت سے نکلا ہے، اس میں میاں بیوی دونوں قسم کھا کر ایک دوسرے پر لعنت کرتے ہیں، اس لئے اسے لعان کہتے ہیں، اور لعنت کے اصلی معنی اللہ کی رحمت سے دور کر دینے کے ہیں، گویا وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم جھوٹے ہیں تو اللہ کی رحمت سے دور ہو جائیں، عورت اور مرد کے درمیان تفریق کا ایک سبب لعان بھی ہے، اپنی عورت پر بغیر کسی تحقیق کے زنا کی تہمت لگانا اور اس کے دامن عصمت کو داغ دار بنانا سخت گناہ ہے، لیکن اگر کسی کو اپنی بیوی کے بارے میں زنا کا قوی شبہ ہو، یا جو اولاد پیدا ہوئی ہے اس کے بارے میں یہ شبہ ہو کہ اس کے نطفے سے نہیں ہے، اور وہ کہتا ہے کہ عورت نے زنا کیا ہے لیکن کوئی گواہی پیش نہیں کرتا، اور عورت زنا سے انکار کرتی ہے تو اگر عورت اسلامی حکومت کے سامنے یہ دعویٰ کرے کہ میرا شوہر مجھ پر تہمت لگاتا ہے تو قاضی یا حاکم دونوں سے چار چار بار قسم لے گا اور ایک ایک بار دونوں سے لعنت کرائے گا اور قسم لینے اور لعنت کرانے کے بعد دونوں میں تفریق کرا دے گا، اسی قسم لینے اور لعنت کرانے کو شریعت میں لعان کہتے ہیں، لعان کا حکم اس وقت ہے جب مرد اپنی بیوی پر تہمت لگائے اور اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی شہادت نہ ہو، اگر کوئی اجنبی آدمی کسی عورت پر زنا کا الزام لگائے اور چار گواہ نہ ہوں تو اس پر حد قذف یعنی تہمت کی حد جاری کی جائے گی، یعنی اس کو اسّی کوڑے مارے جائیں گے اور اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سب سے پہلے ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی تھی، اور انہی کے بارے میں لعان کی آیتیں نازل ہوئیں، اور آپ نے تفریق کرا دی۔

لعان کا طریقہ یہ ہے کہ چار بار مرد خدا کی قسم کھا کر کہے کہ میں نے جو کچھ اس کے بارے میں کہا ہے وہ بالکل سچ کہا ہے، پھر پانچویں بار کہے کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو، اس کے بعد عورت چار بار خدا کی قسم کھا کر کہے کہ اس نے میرے اوپر جو تہمت لگائی ہے وہ جھوٹی ہے، میں بالکل پاک دامن ہوں، اور پانچویں بار کہے کہ اگر وہ تہمت لگانے میں سچا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب ہو، قرآن

---

[1] اکثر مدۃ الحمل سنتان وأقلها ستۃ أشہر اجماعًا (درمختار، ج ۲ ص ۲۶۱)

میں صراحتاً اس کا طریقہ یہی بتایا گیا ہے:۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ وَيَدْرَءُ عَنْهَا الْعَذَابَ أَن تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ وَالْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللَّهِ عَلَيْهَا إِن كَانَ مِنَ الصَّادِقِينَ۔ (نور)

جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں اور اس کے اوپر ان کے علاوہ دوسرے گواہ بھی نہیں تو تہمت لگانے والے کی شہادت یہی ہے کہ وہ چار بار خدا کی قسم کھا کر کہہ دے کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے اور پانچویں بار کہے کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت اور اسی طرح عورت کے دامن سے یہ داغ اسی وقت دھل سکتا ہے کہ وہ بھی چار بار خدا کی قسم کھا کر کہے کہ یہ مرد جھوٹا ہے اور پانچویں بار کہے کہ اگر مرد سچا ہو تو مجھ پر خدا کا غضب ہو۔

لعان کی فرضیت میں تمام ائمہ اربعہ متفق ہیں، صرف بعض جزئیات میں تھوڑا سا اختلاف ہے، مثلاً امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ لعان کی ابتداء لازماً مرد سے کی جائے[1]، اس لئے کہ تہمت اسی نے لگائی ہے، امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ سنت تو یہی ہے مگر ایسا کرنا واجب نہیں ہے، اگر عورت سے لعان کی ابتداء کر دی جائے تو بھی لعان صحیح ہو جائے گا، اس لئے کہ قرآن پاک میں مرد کے بعد عورت کا ذکر واو عطف کے ساتھ ہے اور اس میں ترتیب لازم نہیں ہے[2]

لعان کے شرائط یہ ہیں:۔

(۱) دونوں عاقل بالغ ہوں اور ان کی گواہی معتبر ہو، (۲) عورت جرم سے انکار کرتی ہو، (۳) تہمت

---

[1] الفقہ علی المذاہب الأربعة ج ۵ ص ۱۰۵ شکوٰۃ۔ [2] امام ابوحنیفہؒ کا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں آپ نے قرآن پاک کے عمومی حکم میں تخصیص فرمادی ہے أربع من النساء لا ملاعنة بينهن اليهودية والنصرانية تحت المسلم والحرة تحت المملوك والمملوكة تحت الحر (ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۸۸) ان کے نزدیک والذین یرمون ازواجھم کے عمومی حکم کے تحت ہر مرد اور عورت لعان کے قابل ہے، (الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۵ ص ۱۰۵)

لگانے والا اس کا شوہر ہو اور وہ اس سے پہلے زنا کی تہمت میں سزا نہ پا چکا ہو، یا اس کا یہی مشغلہ نہ ہو۔ (۴) شوہر نے گواہ نہ پیش کئے ہوں، عورت اسلامی حکومت کے سامنے دعویٰ کرے، اگر ان میں سے کوئی بات نہ ہوگی تو لعان نہیں ہوگا[1]

انکار کی صورت میں

اگر مرد تہمت لگانے کے بعد لعان کرنے سے انکار کرے تو امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک اس پر حدِ قذف لگائی جائے گی، یعنی اسّی کوڑے اسے لگائے جائیں گے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ہلال بن امیہ سے آپ نے فرمایا "البینۃ و الاحد"۔ اگر مرد لعان کرے اور عورت اس سے انکار کرے تو اس پر حدِ زنا جاری ہوگی، اور اگر اقرار کرے جب بھی حدِ زنا جاری ہوگی[2]

حنفیہ کے نزدیک اگر مرد انکار کرے تو اسے قید کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ لعان کرنے پر مجبور ہو جائے، اس لئے کہ قرآن کے حکم کے مطابق لعان کرنا اس پر واجب ہے، اگر وہ لعان نہیں کرتا ہے تو اپنے کو جھوٹا کہے، اس صورت میں اس پر حدِ قذف جاری کی جائے گی، اس لئے کہ جب اس نے اپنے کو الزام میں جھوٹا ثابت کیا تو لعان کی صورت ختم ہو گئی اور جھوٹی تہمت کی وجہ سے حدِ قذف جاری ہوگی، اسی طرح عورت اگر انکار کرے تو اس کو بھی قید کر دیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ یا تو لعان کرے یا شوہر کے الزام کی تصدیق کرے، اگر لعان نہیں کرتی اور تصدیق کرتی ہے تو اس پر حدِ زنا اس وقت جاری ہوگی جب وہ چار بار اس کا اقرار کرے کہ ہم سے زنا کا صدور ہوا ہے[3]

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عدّت بھر نفقہ اور سکنیٰ دونوں کی مستحق ہوگی اور ائمہ ثلاثہؒ کے یہاں کسی چیز کی مستحق نہیں ہوگی[4]

---

[1] شرح وقایہ ج ۲ ص ۱۳۷۔

[2] الفقہ علی المذاہب الأربعہ ج ۵ ص ۱۰۸۔

[3] ایضاً، شرح وقایہ۔

[4] ایضاً۔

لڑکے کا نسب لعان کے بعد جو بچہ پیدا ہو گیا یا ہو چکا ہے اس کا نسب ماں سے چلے گا، باپ سے نہیں، یعنی وہ ماں کا وارث ہو گا، اور ماں اس کی وارث ہو گی، ہلال بن امیہ کی حدیث سے یہی ثابت ہوتا ہے[۱]

لعان کے بعد جو بچہ پیدا ہوا اس کو ولدالزنا نہیں کہنا چاہیئے، اگر کوئی کہے گا تو اس پر حدِ قذف جاری ہو گی۔ ایک روایت میں ہے کہ "وقضیٰ أن لا یدعیٰ ولدھا لأبٍ ولا یرمیٰ ولدھا ومن رماھا او رمیٰ ولدھا فعلیہ الحد" [۲] آپ نے فیصلہ کیا کہ جو اس لڑکے کو حرامی کہے گا اس پر حد قذف جاری ہو گی۔

ظہار ظہار کا لفظ ظہر سے نکلا ہے جس کے معنیٰ پیٹھ کے ہیں، جب یہ کہا جاتا ہے کہ تو میرے لئے میری ماں کی پیٹھ کے مانند ہے، تو گویا اس نے اس کے پورے وجود کے مثل قرار دے دیا، اپنی بیوی کو کسی ایسی عورت سے جس سے ہمیشہ اس کا نکاح حرام ہے، تشبیہ دینے یا اس کے برابر کہنے کو شریعت میں ظہار کہتے ہیں، مثلاً کسی نے اپنی بیوی سے کہا کہ تو میرے لئے میری ماں کے مثل حرام ہے یا میری بہن کے مثل حرام ہے، یا میری بیٹی یا پھوپھی کے مانند حرام ہے، یا ان کی پیٹھ کے مثل ہے، تو اس کی نیت طلاق دینے کی نہ ہو تو ظہا ہو گیا، یعنی اب یہ عورت سے اس وقت تک مباشرت نہیں کر سکتا جب تک کہ ظہار کا کفارہ نہ ادا کر دے۔ اس کفارے کے علاوہ اس کو گناہ الگ سے ہوا۔

قرآن نے ظہار اور اس کے کفّارے کا ذکر تفصیل سے کیا ہے:۔

اَلَّذِیۡنَ یُظَاھِرُوۡنَ مِنۡ نِّسَآءِھِمۡ	جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر
ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا قَالُوۡا فَتَحۡرِیۡرُ	اپنی کہی ہوئی بات کی تلافی کرنا چاہتے ہیں تو
رَقَبَۃٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّتَمَآسَّا	قبل اس کے کہ ایک دوسرے سے ملیں ان کے
ذٰلِکُمۡ تُوۡعَظُوۡنَ بِہٖ وَاللّٰہُ بِمَا	ذمے ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا ہے اور
تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ہ فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ	اس کفارے کے ذریعہ تم کو تنبیہ کی جاتی ہے،
فَصِیَامُ شَھۡرَیۡنِ مُتَتَابِعَیۡنِ مِنۡ	اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی خبر رکھتا ہے،

---

[۱] شرح وقایہ ج ۲ ص ۱۳۹۔

[۲] الفقہ علی المذاہب الأربعہ ج ۵ ص ۱۰۵۔

قَبۡلِ اَنۡ یَّتَمَاسَّا فَمَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ فَاِطۡعَامُ سِتِّیۡنَ مِسۡکِیۡنًا۔

(مجادلہ)

اگر کسی کو یہ میسر نہ ہو تو مباشرت اور میل جول سے پہلے دو ماہ پے در پے روزے رکھنا ہے اور جس سے یہ بھی نہ ہو سکے اس کے ذمے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔

اگر کفّارہ دینے سے پہلے اس نے صحبت کرلی تو گناہگار ہوا۔ گناہ کا توبہ بھی کرے اور کفّارہ بھی ادا کرے۔

عورت کو محرمات سے تشبیہ دینے کی بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں بغیر نیت کے بھی ظہار ہوتا ہے، لیکن عام طور پر جو الفاظ کہے جاتے ہیں اسے ظہار اسی وقت ہوگا جب وہ ظہار کی نیت سے وہ لفظ کہے، اگر وہ یوں ہی فضول بک گیا، یا اس نے احتراماً یہ لفظ کہا تو کچھ نہیں ہوا، اور اگر طلاق کی نیت سے کہے گا تو ایک طلاق بائن پڑ جائے گی، مثلاً کسی نے کہا کہ تو میری ماں کے مثل ہے، یا میری بہن یا بیٹی کے مثل ہے، تو اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں کہ جس طرح میں ان کی عزّت کرتا ہوں تیری بھی کروں گا دوسرے یہ کہ اس نے اس لفظ کو یوں ہی زبان سے نکال دیا، کوئی مقصد نہیں تھا، تیسرے یہ کہ اس نے ان الفاظ سے اشارتاً طلاق دی، چوتھے یہ کہ اب اس سے مباشرت و مجامعت نہ کروں گا، تو چونکہ ان الفاظ کے کئی مطلب نکل سکتے ہیں، اس لئے کہنے والے سے دریافت کیا جائے گا کہ اس کا مطلب کیا تھا، اگر اس نے پہلے دو مطلب مراد لئے ہیں تو اس کہنے کا گناہ تو ہوگا، مگر قانوناً اس کی کوئی دنیاوی سزا شریعت نے مقرر نہیں کی ہے، اور اگر تیسرا مطلب مراد لیا ہے تو ایک طلاق بائن پڑ جائے گی، اور اگر چوتھا مطلب لیا ہے تو ظہار ہو گیا اب عورت سے اسی وقت مباشرت کر سکتا ہے جب کہ ظہار کا کفارہ ادا کر دے۔ اگر بغیر کفارہ ادا کئے مباشرت کرے گا تو سخت گناہ ہوگا، خود عورت کو بھی چاہیئے کہ ایسی حالت میں اس کو اپنے قریب نہ آنے دے[1]

عورت ظہار کی حالت میں ہو تو اس سے بات چیت کرنا حرام نہیں ہے، مگر مباشرت اور اس کے لوازمات سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

---

[1] شرح وقایہ ج ۲ ص ۱۳۰۔

جیساکہ قرآن میں بیان کیا گیاہے کہ ظہار کا کفارہ بھی وہی ہے، جو روزے کا کفارہ ہے، یعنی دو ماہ مسلسل روزے رکھے، اگر ایک روزہ بھی بیچ میں چھوٹ جائے گا، تو پھر سے روزہ شروع کرنا پڑے گا، اگر کوئی روزہ نہیں رکھ سکتا تو پھر ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت ایک دن کھانا کھلائے، یا ساٹھ دن تک ایک مسکین کو دونوں وقت کھانا کھلائے، یا صدقۂ فطر کے برابر یعنی پونے دو سیر گیہوں یا ساڑھے تین سیر جو یا ان کی قیمت ساٹھ مسکینوں کو دے دے، یا ایک مسکین کو ساٹھ دن تک دیتا رہے، ایک ہی دن ایک مسکین کو ساٹھ دن کا غلّہ نہ دینا چاہیئے۔

(۱) اگر کسی نے ماں یا بہن کے مثل یا برابر نہیں کہا بلکہ یوں کہا کہ تو میری ماں ہے یا میری بہن ہے، یعنی مثل، طرح، مانند اور برابر کا لفظ نہیں کہا تو گو ظہار نہیں ہوگا، مگر ایسا کہنا گناہ ہے اور مکروہ تحریمی ہے[۱]

اگر کسی نے کہا کہ تو میرے لئے ایک سال تک یا چھ ماہ تک میری ماں کے مانند ہے، تو اگر اس سے پہلے اس سے صحبت کرے گا تو ظہار کا کفارہ دینا پڑے گا اور اگر اس مدت کے بعد اس سے مباشرت کرے تو اس کے اوپر کچھ نہیں ہے[۲]

خُلع

جس طرح مرد کو طلاق دے کر عورت سے اپنا رشتہ نکاح کاٹ لینے کی اجازت ہے اسی طرح عورت کو خلع کے ذریعے مرد سے پیچھا چھڑانے کی اجازت شریعت نے دی ہے، اوپر علیحدگی اور تفریق کی وہ صورتیں بیان کی گئی ہیں، جو مرد کی جانب سے ہوں، اب وہ صورتیں بیان کی جائیں گی جن میں علیحدگی اور تفریق کا مطالبہ عورت کی جانب سے ہوگا، طلاق اور خلع میں فرق یہ ہے کہ طلاق بغیر کسی معاوضہ کے ہوتا ہے اور خلع میں عورت کو کچھ دینا پڑتا ہے۔

خلع کے لفظی معنی اتار دینے کے ہیں چنانچہ جو شخص اپنے جسم سے کپڑے اتار ڈالتا ہے، اس کو

---

[۱] ولو قال انت أمی لا یکون مظاهرا وینبغی ان یکون مکروها ومثله ان یقول یا ابنتی ویا اختی ونحوه (عالمگیری ج ا ص ۵۴۲) [۲] ولو ظاهر مؤقتا بأن قال انت علی کظهر امی الیوم او الشهر او السنة یصیر مظاهرا فی الحال فاذا مضی ذالک الوقت بطل۔
(فتاوی قاضی خان، عالمگیری ج ا ص ۵۰۶)

عربی میں "خَلَعَ ثَوْبَہٗ عَنْ بَدَنِہٖ" بولتے ہیں اور شریعت میں کچھ روپیہ پیسہ دے کر یا مہر معاف کر کے عورت کا مرد سے رشتۂ نکاح کاٹ لینے یا اس کی قوامیّت کی قید سے نکل جانے کو خلع کہتے ہیں۔[1]

خلع کب کرنا چاہیئے

قرآن و حدیث میں خلع کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ اگر عورت کسی مصیبت اور تکلیف میں ہو اور مرد سے پیچھا چھڑانے کی کوئی اور سبیل نہ ہو، تو پھر وہ کچھ دے دلا کر اس سے اپنا پیچھا چھڑا لے۔ مگر جن شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی گئی ہے، اگر ان کا لحاظ کئے بغیر کوئی عورت محض لذت اندوزی کے لئے مرد کو اخلاقی یا قانونی طور پر اس پر مجبور کرتی ہے، تو وہ اپنے سر بہت بڑا گناہ مول لیتی ہے، کیونکہ اس کا اثر معاشرے اور ماحول پر بھی برا پڑے گا، اور آخرت میں بھی اس کو اس لذت کا عذاب بھگتنا پڑے گا، آج کل نئی تعلیم کے اثر سے پڑھی لکھی عورتوں میں جو یہ وبا پھیل گئی ہے کہ وہ اپنے شوہروں کے خلاف غیر ضروری شکایتیں کر کے اپنی گلو خلاصی نہیں بلکہ تجدید لذت کرتی رہتی ہیں، یہ اسلام میں سخت ناپسندیدہ بات ہے، عورت کو مرد کے ظلم سے بچانے اور دونوں کو فطری مساوات دینے کے لئے جو مذکورہ ہدایتیں دی گئی ہیں انھیں سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے عورت کو مظلومیت سے بچانے کے لئے کتنی کوشش کی ہے، لیکن اس کے باوجود کوئی مرد عورت کی حق تلفی کرتا ہے، تو ایسی مصیبت زدہ عورت کے لئے اسلامی شریعت کا دامن تنگ نہیں ہے، بلکہ اس نے اس کو تکلیف سے بچانے کے لئے اپنا دامن بہت وسیع کر دیا ہے، اس کی وسعت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ اس نے خلع کی بھی اجازت دی ہے، اگر شوہر خلع پر راضی نہ ہو تو تفریق کی بعض اور صورتیں بھی اس نے پیدا کی ہیں، جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

مگر جس طرح مرد کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ طلاق اور تفریق کا اختیار بالکل مجبوری کی حالت میں استعمال کرے، اسی طرح عورت کو بھی یہ ہدایت دی گئی ہے کہ یہ قدم اس کو

---

[1] ھو ازالۃ ملک النکاح المتوقفۃ علی قبولھا أو فی معناہ (شرح وقایہ ج ۲ ص ۱۲۹)

اسی وقت اٹھانا چاہیئے جب کہ واقعی اس کی کوئی دینی، اخلاقی یا معاشی حق تلفی ہورہی ہو، یا اس پر کوئی ناقابل برداشت معاشرتی ظلم ہورہا ہو، یا وہ اپنے جنسی جذبات کی عدم تسکین کی بنا پر سخت ذہنی کوفت میں ہو، جس کی طرف فَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ لَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گذر چکا ہے۔ جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ:۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الذَّوَّاقِيْنَ وَالذَّوَّاقَاتِ۔ — اللہ تعالیٰ مزہ چکھنے والے مردوں اور مزہ چکھنے والی عورتوں کو پسند نہیں کرتا۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ خلع طلب کرنے والی عورتیں منافق ہیں (نسائی بحوالہ مشکوٰۃ) یعنی اتنا قریبی تعلق ہونے کے باوجود اس کے دل میں شوہر کی کوئی محبت نہ پیدا ہوسکی، اور اس کا ظاہر و باطن ایک نہ ہوسکا یہی نفاق ہے۔

آپؐ نے فرمایا:۔

أَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا طَلَاقًا فِي غَيْرِ مَا بَأْسٍ فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ۔ (ترمذی، ابوداؤد) — جس عورت نے بغیر کسی شدید تکلیف یا خاص وجہ کے طلاق مانگی اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔

آپؐ نے فرمایا:۔

اَلْمُخْتَلِعَاتُ هُنَّ الْمُنَافِقَاتُ۔ (ترمذی) — جو عورتیں بغیر کسی تکلیف یا ضرورت کے خواہ مخواہ خلع چاہتی ہیں وہ حقیقۃً منافق ہیں۔

مختلعات کا لفظ جس مصدر سے بنا ہے اس میں کسی کام کو بہ تکلّف کرنے کا مفہوم شامل ہوتا ہے، یعنی ایسی عورتیں جن کو خلع کی ضرورت نہیں ہے، اگر وہ خلع چاہیں گی تو ان کو خواہ مخواہ کوئی نہ کوئی سبب اور بہانہ تلاش کرنا پڑے گا۔

قرآن نے چند لفظوں میں خلع کے حدود و شرائط بتا دیئے ہیں جن کی پابندی نہ ہونے کی صورت میں ایک عورت خلع کرسکتی ہے:۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا — اور تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ جو کچھ

اٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْئًا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَنْ لَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ (بقرہ ع)

تم نے اپنی بیویوں کو دے دیا ہے اس میں سے کچھ بھی واپس لے لو، لیکن اگر میاں بیوی کو یہ خوف ہو کہ وہ زوجیت کے حقوق و فرائض کے ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے، تو جب تم لوگوں کو اس کا خوف ہو کہ تم قانون زوجیت کا لحاظ و پاس نہ کر سکو گے تو پھر اس صورت میں تم دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورت کچھ دے دلاکر اپنی جان چھڑائے یعنی عورت کو کچھ دینے اور مرد کو لینے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس آیت سے حسب ذیل ہدایتیں ملتی ہیں:۔

۱۔ عورت کو خلع اسی حالت میں طلب کرنا چاہیئے، جب یہ خوف ہو کہ رشتۂ نکاح کے قائم رکھنے کے لئے خدا نے جو احکام دیئے ہیں ان کی پابندی ناممکن ہوگئی ہے۔ فَلَا جُنَاحَ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ خلع ایک بری چیز ہے، لیکن جب حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہو تو اس کی اجازت ہے، کیونکہ اس رشتے سے اگر یہ اہم مقصد پورا نہ ہو، تو پھر اس کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک صحابیہ نے اپنے شوہر ثابت بن قیس کے خلاف خلع کی درخواست دی تو آپ نے وجہ دریافت کی تو انھوں نے کہا:۔

اَکْرَہُ الْکُفْرَ فِی الْاِسْلَامِ (بخاری و ترمذی) یعنی اسلام لانے کے بعد مجھے کفر کا خوف ہے۔

یعنی طبعی طور پر مجھے شوہر سے جو نفرت ہے، اس کی موجودگی میں اگر میں ان کے ساتھ رہی تو مجھے خوف ہے کہ کہیں ان احکام اور حقوق و فرائض میں کوتاہی نہ ہو جائے اور وہ حقوق زوجیت قائم نہ رکھ سکوں جو خدا اور رسول نے عورت کے لئے مقرر کئے ہیں اور اسلام کے بعد خدا اور اس کے رسول کے احکام کی نافرمانی کفر ہے، اس لئے میں اس سے بچنا چاہتی ہوں، کفر کا لفظ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ صحابیہ کی یہ غیرت ایمانی ہے کہ بعض احکام کی نافرمانی کو انھوں نے کفر قرار دیا۔ حالانکہ یہ حقیقی کفر نہیں ہے۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ عورت کو اس کے بدلے میں کچھ مال دینا چاہیئے مہر میں جو مال ملا ہے، وہ اسی کو واپس کر دے، یا اس کے بقدر الگ سے شوہر کو کچھ دے (فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ میں اسی طرف اشارہ ہے)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب خلع کا مذکورۂ بالا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے عورت سے کہا کہ تم وہ باغ واپس کر دو جو تمہارے شوہر نے تمہیں مہر میں دیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے واپس کر کے خلع لے لیا[1]

شوہر کو کب اور کتنا مال لینا چاہیئے

اس سلسلہ میں فقہاء نے یہ قید بھی لگائی ہے کہ اگر واقعی مرد کا کوئی قصور تھا جس سے عاجز آ کر عورت نے خلع کی درخواست دی ہے تو ایسی عورت سے خلع کے بدلے میں مرد کو کچھ مال لینا مکروہ تحریمی ہے[2]۔ اگر لے گا تو گنہ گار ہوگا، اور اگر عورت ہی کی غلطی تھی جب بھی مرد کو اس سے زیادہ نہ لینا چاہیئے، جتنا اس نے مہر میں یا اور کسی طرح سے اس کو دیا ہے۔ اگر لے لیا ہے تو گناہ نہیں ہوگا۔ اور اگر دونوں ایک دوسرے کو قصور وار ٹھہراتے ہیں تو نہ تو عورت کو خلع لینے میں گناہ ہوگا اور نہ مرد کو کچھ مال لینے میں مگر اس صورت میں بھی مال مہر سے زیادہ وصول کرنا مکروہ ہے۔

۳ ۔ تیسری شرط یہ ہے کہ دونوں راضی ہوں۔ اگر عورت کچھ دے دلا کر اس سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی ہے، مگر مرد راضی نہیں ہے، تو خلع نہیں ہو سکتا۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی رضامندی چاہیئے۔

اگر مرد راضی نہ ہو تو عورت کو یہ قانونی حق قرآن نے دیا ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے سامنے یا ایک صالح جماعت مسلمین کے سامنے دعویٰ کر کے خلع لے لے[3]

---

[1] وکانت الحدیقۃ صداقھا أعطاھا ثابت کما فی روایۃ ابی داؤد (شرح وقایہ حاشیہ ج ۲ ص ۱۱۳)

[2] وکرہ أخذہ ان نشز و أخذ الفضل ان نشزت أی أخذ الفضل علی ما رفع الیھا من المھر (شرح وقایہ ج ۲ ص ۱۱۴)

قرآن کی اس آیت کا اطلاق اس صورت پر ہے جب مرد کی زیادتی کی وجہ سے خلع کرائے وَإِنْ أَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا (نساء)

[3] قرآن کی اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے فان خفتم ای علمتم أو ظننتم أیھا الحکام ان لا یقیما حدود اللہ أی حقوق الزوجیۃ فلا جناح علیھما أی فلا إثم علی الزوجین فیما افتدت بہ۔ (شرح وقایہ حاشیہ ج ۲ ص ۱۱۳)

خلع کا حکم

(۱) جب عورت نے مرد سے کہا کہ میں اپنا مہر معاف کرتی ہوں، یا اتنا روپیہ آپ کو دیتی ہوں یا آپ کی دی ہوئی فلاں چیز یا فلاں رقم یا فلاں جائداد واپس کرتی ہوں، آپ مجھ سے خلع کر لیجئے، یا میری جان چھوڑ دیجئے۔ تو اگر مرد نے اسی وقت قبول کر لیا، تو خلع ہو گیا، یعنی عورت کو فوراً ایک طلاق بائن پڑ گئی[1]۔ اب عورت کو وہ رقم دینی پڑے گی، جس کا اس نے وعدہ کیا ہے، اور شوہر کو عدت بھر نان نفقہ اور گھر دینا پڑے گا اور عدت کے بعد وہ جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔

(۲) اگر مہر شوہر نے نہیں دیا ہے مگر اس کے علاوہ کوئی رقم دینے کا وعدہ عورت نے کیا، تو وہ رقم اس کو دینی پڑے گی اور مہر بھی معاف ہو گیا یعنی خلع میں مہر بغیر ذکر کئے ہوئے بھی معاف ہو جاتا ہے، مگر مرد کو مہر کے علاوہ کوئی رقم لینی نہ چاہیئے۔ ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے گو خلع ہو جائے گا۔

(۳) اگر عورت کے بجائے مرد نے کہا کہ اگر مجھے اتنا روپیہ دے دو تو میں تم کو چھوڑ دوں گا، عورت نے کہا کہ میں نے قبول کر لیا، تو اب خلع ہو گیا —— اب عورت کو اتنے روپے دینے پڑیں گے، اگر عورت کا مہر مرد کے ذمے باقی ہے تو اس صورت میں مہر کا مطالبہ عورت نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ خلع کی وجہ سے معاف ہو گیا، البتہ اگر مرد نے یہ کہا ہوتا کہ تم معاف کر دو تو میں تم سے خلع کر لیتا ہوں، تو پھر عورت کو کچھ دینا نہ پڑتا، کیونکہ عورت نے مہر معاف کر کے مال دینے کی شرط پوری کر دی۔

(۴) اگر خلع کے وقت مال کا سرے سے ذکر نہیں ہوا اور دونوں نے خلع کر لیا، تو دونوں کے اوپر جو مالی حقوق ہیں وہ معاف ہو گئے، مثلاً اگر عورت مہر پا چکی ہے، یا شوہر نے اسے کوئی رقم دی ہے، تو وہ سب معاف ہو گئی اب شوہر اس سے واپس نہیں لے سکتا، یا عورت نے کچھ دے رکھا ہے، یا اس کا مہر باقی ہے، تو واپس نہیں لے سکتی[2] البتہ عدت بھر عورت کو نان نفقہ

---

[1] وھو طلاق بائن (شرح وقایہ ج ۲ ص ۱۱۳)

[2] ویسقط الخلع کل حق لکل واحد منھما علی الآخر مما یتعلق بالنکاح فلا یسقط ما لا یتعلق

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۶)

اور سکنیٰ ملے گا۔

(۵) اگر عورت شوہر سے کہے کہ مجھے چھوڑ دیجئے میں عدت بھر نان نفقے اور سکنے کا مطالبہ نہیں کروں گی، تو خلع ہو گیا اور شوہر پر ان چیزوں کی ذمہ داری باقی نہیں رہے گی۔

(۶) اگر مرد طلاق دینے میں اپنی بدنامی سمجھتا ہے، یا کسی اور وجہ سے عورت کے اوپر دباؤ ڈال کر اس کو خلع پر مجبور کرتا ہے تو اب عورت کے اوپر کوئی مالی ذمہ داری نہیں ہے، اگر شوہر نے مہر نہیں ادا کیا ہے تو مہر معاف نہیں ہوا، اس کو ادا کرنا پڑے گا، کیونکہ خلع میں مال اسی وقت واجب ہوتا ہے جب عورت خوشی سے اسے منظور کر لے[1]

(۷) اوپر ذکر آچکا ہے کہ اگر مرد کا قصور ہے تو اس صورت میں اگر عورت کچھ مال دے بھی تب بھی مرد کو نہ لینا چاہیئے، کیونکہ یہ عورت کے اوپر اس کا مزید ظلم ہوگا، لیکن اگر عورت کا قصور ہے، اور پھر بھی وہ خلع چاہتی ہے تو اس صورت میں بھی مرد کو اس رقم سے زیادہ کچھ نہ لینا چاہیئے جو اس نے مہر میں یا کسی اور طرح سے دی ہے۔

(۸) اگر عورت یا مرد نے خلع نہیں کیا، یعنی ایسا لفظ نہیں کہا، جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ یہ خلع ہے بلکہ دونوں میں سے کسی نے کچھ مال یا جائداد کے بدلے میں طلاق مانگی، تو اگر دونوں راضی ہو گئے تو ایک طلاق بائن پڑ گئی، خلع میں اور اس میں صرف اتنا فرق ہے کہ مرد نے جتنے روپے کے عوض میں طلاق دینے کا وعدہ کیا ہے، عورت کو دینے پڑیں گے، اور جس طرح خلع میں اس رقم کے ساتھ عورت کا مہر خود بخود معاف ہو جاتا تھا، اس صورت میں معاف نہیں ہوگا، بلکہ عورت مہر کا مطالبہ کر سکتی ہے، البتہ اگر مہر کی معافی پر طلاق دی تھی تو پھر عورت مطالبہ نہیں کر سکتی[2]

(۹) نابالغ بچے، پاگل یا بے ہوش کو خلع کرنے کا اختیار نہیں، البتہ نشہ کی حالت میں یا جبراً خلع ہو جائے گا[3]

(بقیہ صـ کا) بالنکاح کثمن ما اشترت من الزوج ویسقط مایتعلق بالنکاح کالمهر والنفقة الماضیة أمانفقة العدة فلا تسقط الا بالذکر کذا فی الذخیرة والمهر یسقط من غیر ذکره (شرح وقایہ ج ۲ صـ ۱۱۹)

[1] وان کره الزوج علیه تطلق بلا مال لان الرضا شرط لزوم المال وسقوطه (شامی ج ۲ صـ ۷۷۰)

[2] ولو بالطلاق علی مال طلاق بائن (در مختار صـ ۲۵ ج ۱) [3] خلع السکران والمکره جائز عندنا و خلع الصبی باطل والمعتوه والمغمی علیه من المرض بمنزلة الصبی فی ذالك (عالمگیری ج ۱ صـ ۵۰۸)

کچھ جدید معاشرتی مسائل

خون چڑھانے کا مسئلہ

موجودہ دور میں آپریشن کے وقت یا انتہائی کمزوری کے وقت ایک انسان کے بدن کا خون دوسرے کے بدن میں چڑھانے کا عام رواج ہوگیا ہے، اس لئے علماء کے سامنے یہ مسئلہ اس حیثیت سے آتا ہے کہ (۱) کیا ایک انسان کے بدن کا خون لے کر دوسرے کے بدن میں چڑھانا جائز ہے یا نہیں (۲) اگر جائز ہے تو بلا معاوضہ اس کا لینا جائز ہے یا معاوضہ دے کر بھی جائز ہے (۳) کیا اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کے خون میں کوئی فرق ہے یا نہیں ؟

ان سوالوں کے جواب میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم نے علماء کے مشورے سے جواہر الفقہ میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

پہلے سوال کے سلسلے میں مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ خون بدن سے نکلنے کے بعد نجس اور ناپاک ہوجاتا ہے اور نجس چیز کا کسی دوسرے کے جسم میں داخل کرنا حرام ہے۔ اور اس لئے بھی کہ یہ انسان کے جسم کا ایک حصہ ہے اور انسانی جسم کی تکریم اور حرمت کا تقاضا ہے کہ اس کے کسی حصہ کو اس طرح استعمال نہ کیا جائے، مگر شدید ضرورت اور علاج و معالجہ کے لئے حرام اور نجس چیزوں سے علاج کی شریعت نے اجازت دی ہے، جیساکہ قرآن کریم میں مضطر کے لئے سور کا گوشت کھانے کی اجازت ہے (البقرہ) اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب عرینہ کو اونٹ کا پیشاب پینے کی اجازت دی تھی (بخاری) اور حضرت عرفجہ کو سونے کی ناک لگانے کی اجازت فرمائی (ترمذی، ابوداؤد) حالانکہ سور کا گوشت اور پیشاب مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے حرام ہے اور سونے کا استعمال مردوں کے لئے حرام ہے،

کتاب وسنت کی انہی ہدایات کی روشنی میں فقہاء نے ضرورت شدید کے وقت حرام ونجس چیز سے علاج کی اجازت دی ہے، اس لئے خون کا لینا دینا خواہ معاوضہ سے ہو یا بلا معاوضہ جائز ہے، جیسے عورت کے دودھ کو فقہاء نے دوا علاج کے لئے استعمال کی اجازت دی ہے، حالانکہ بچہ کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے اس کا استعمال حرام ہے:۔

ولا بأس بان یسعط الرجل بلبن المرأۃ ویشتریہ للدوا۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۱۳)

اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ علاج کے لئے عورت کا دودھ مرد کی ناک کے ذریعہ ٹپکا دیا جائے اور علاج کی ضرورت کے لئے وہ خریدا بھی جا سکتا ہے۔

البتہ اس کے ساتھ دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ خون نہ دینے میں جان کا خطرہ ہو، دوسرے یہ کہ جان کا خطرہ تو نہ ہو مگر ڈاکٹروں کے رائے میں اس کے علاوہ علاج کی کوئی صورت نہ ہو، اور خون نہ دینے کی وجہ سے صحت کے جلد بحال ہونے یا زخم کے بھرنے یا آپریشن کے کامیاب ہونے کا گمان غالب ہو اور نہ دینے کی صورت میں مریض کو شدید تکلیف ہونے کا گمان غالب ہو۔

اس سلسلہ میں فتوی عالمگیری کا یہ جزیہ راہنمائی کرتا ہے:۔

یجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتۃ للتداوی اذا خبرہ طبیب مسلم ان شفاءہ فیہ ولم یجد من المباح ما یقوم مقامہ فان قال طبیب یتعجل شفاءك فیہ وجھان۔ (ج ۴ ص ۱۹۲)

بیمار کے لئے بغرض علاج خون یا پیشاب کا پینا یا کھانا جائز ہے، بشرطیکہ جب کوئی مسلمان ڈاکٹر یا حکیم اس کا فیصلہ کرے گا، اس کے بغیر شفا ممکن نہیں ہے اور مباح چیزوں میں کوئی چیز اس کا بدل نہ ہو اگر طبیب کہے کہ اس سے جلد شفا ہو جائے گی۔ تو اس میں دو صورتیں ہیں۔

"فیہ وجھان" کی کوئی تشریح نہیں کی گئی ہے، غالباً بعض فقہاء عدم جواز کی طرف بھی گئے ہیں، اس لئے فتاوی کے مرتبین نے اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔

خون کی خرید و فروخت

دوسرا سوال یہ کہ خون کی خرید و فروخت کرنا صحیح ہے یا نہیں، تو جس طرح ضرورت شدید کے تحت خون چڑھانا جائز ہے، اسی طرح شدید ضرورت کے وقت اس کی خرید و فروخت بھی جائز ہے، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ عورت کا دودھ کسی دوسرے کو پینا ناجائز ہے، مگر دوا کے لئے اس کا چڑھانا، پینا اور خریدنا جائز ہے، اسی طرح خون کی خرید و فروخت اور اس کا استعمال بھی جائز ہے۔

خون کا فرق

تیسرا سوال مسلم وغیر مسلم کے خون کے فرق کا ہے، یعنی ایک غیر مسلم کے بدن کا خون کسی مسلم کے جسم میں اور کسی مسلمان کا خون کسی غیر مسلم کے جسم میں چڑھایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو جس طرح فقہاء نے بدکردار عورت سے خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو بچہ کو دودھ پلوانے کو مکروہ لکھا ہے تاکہ اس کے دودھ کا اثر بچہ کے اخلاق وکردار پر نہ پڑے، راقم الحروف کے خیال میں بالکل اسی طرح خون کا معاملہ بھی ہے، ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق خون میں بھی اسی طرح سے فرق ہوتا ہے، اس لئے اس کا حکم کفر و ایمان کی بنیاد پر نہیں بلکہ خراب اچھی غذا اور اچھے اور برے کردار کی بنا پر کرنا چاہیئے، ایک صاف ستھری باکردار زندگی گذارنے والے کے جسم میں ایک عام بازاری قسم کے آدمی کے جسم کا خون نہیں لگ سکتا، خون میں کئی گروپ ہوتے ہیں، مثلاً اے گروپ اور بی گروپ وغیرہ، اے گروپ کا خون عام طور پر اہل علم اور اچھے کردار کے لوگوں ہی کے جسم میں ہوتا ہے، اور بی گروپ کا خون عام انسانوں کے جسم میں ہوتا ہے۔ راقم الحروف کو اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ ۱۹۷۱ء میں سنگاپور میں غسل خانے میں پھسل گیا اور بائیں ران کی ہڈی ٹوٹ گئی اسپتال میں داخل کیا گیا اور دوسرے دن آپریشن ہونے والا تھا مگر آپریشن نہیں ہوا شام کو ملاقات کے وقت اپنے ہمدرد ملنے آئے تو ان کے ذریعہ اس کے وجہ دریافت کی گئی تو بتایا گیا کہ آپ کے جسم میں اے گروپ کا خون ہے۔ اسپتال میں دوسرے گروپ کا خون تو بہت ہے۔ مگر اس گروپ کا خون صرف ایک بوتل ہے۔ اور ضرورت دو بوتل کی ہے۔ چنانچہ ریڈیو ٹیلی ویژن سے اس گروپ کے خون دینے کا اعلان ہوا، چنانچہ دوسرے دن اس گروپ کا خون ملا، اور پھر آپریشن ہوا اور یہ خون دینے والے زیادہ تر غیر مسلم تھے، اس لئے کسی اچھے مسلمان کا خون نہ مل سکے تو دوسرے لوگوں کے خون سے فائدہ اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ جان کے خطرے کے

وقت تو خون دینے میں خواہ معاوضہ سے ہو یا بلا معاوضہ کوئی حرج نہیں ہے، مگر صحت کے بحال ہونے کے لئے اس کے استعمال میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، اس لئے حتی الامکان اس سے بچا جائے تو بہتر ہے، بہر حال اس میں ایک ماہر مسلمان ڈاکٹر ہی کی رائے معتبر ہوگی، اگر وہ کہتا ہے تو پھر استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

نلکی زادہ

موجودہ تہذیب نے جو حیا سوز طریقے ایجاد کئے ہیں ان میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی مرد کا مادہ منویہ ٹیوب کے ذریعہ لے کر کسی عورت کے رحم میں داخل کر دیا جائے اور اس سے بچہ کی پیدائش ہو جائے۔ عملاً اس وقت ایسا ہو رہا ہے تو اس طریقہ کار اور ایسے بچہ کا کیا حکم ہے؟

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس طریقہ کو از قبیل زنا شمار کیا جائے گا اور جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اس فعل سے بذریعہ قانون روکنا اس کا فرض ہے، مادہ منویہ دینے والے اور جس عورت کے رحم میں یہ داخل کیا جائے اس پر حد زنا تو نہیں جاری کی جاسکتی مگر یہ فعل حرام ہے، اس لئے اس پر تعزیر ہوگی اور ایسا بچہ ولد الزنا قرار پائے گا، ساتھ ہی اس کو عملی جامہ پہنانے والے ڈاکٹر بھی تعزیر کے مستحق ہوں گے۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ کے مرتب کی اس عبارت سے اس پر روشنی پڑتی ہے:۔

اتفق الائمہ علی ان من وطی امراۃ اجنبیۃ فیما دون الفرج بان اولج ذکرہ فی مغابن بطنہا ونحوہ بعیدا عن القبل والدبر لایقام علیہ الحد لانہ اتی فعلا منکرا یحرمہ الشرع لانہ من الاسباب التی توقع فی الزنا ومن زنا امراۃ میتۃ لا یقام علیہ الحد انما یعزر لانہ وطی	اس بات پر تمام ائمہ متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی اجنبی عورت سے فرج سے باہر وطی کرے یعنی اپنا عضو تناسل اس کے پیٹ کی سلوٹوں یا دوسرے مقام میں قبل و دبر کے علاوہ داخل کرے تو اس پر حد زنا جاری نہیں ہوگی، بلکہ تعزیر ہوگی، اس لئے کہ اس نے ایسا کام کیا ہے جس کو شریعت نے حرام کیا ہے اور یہ ان اسباب میں ہے، جو زنا تک لے جانے والے ہیں، اسی طرح جو

لذة ناقصة فلا يقام عليه الحد۔ (ج ۵ ص۱۰۱)	کسی مردہ عورت سے زنا کرے تو اس پر بھی حد جاری نہیں ہوگی مگر تعزیراً اس کو

سزا دی جائے گی اس لئے کہ اس میں اسے ناقص لذت حاصل ہوتی ہے، اس لئے حد جاری نہیں ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنا مادۂ منویہ غلط محل میں ضائع کرتا ہے یا ایسے طریقہ سے استعمال کرتا ہے جس میں قضائے شہوت کی پوری لذت کے بجائے ناقص لذت حاصل ہوتی ہے وہ بھی شریعت میں حرام ہے مگر اس لذت ناقصہ کی وجہ سے اس پر حد کے بجائے تعزیر کی جائے گی۔

ظاہر ہے کہ ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ مرد کے مادۂ منویہ کا لینا اور عورت کے رحم میں داخل کرنا یہ محرکات زنا میں سے بھی ہے اور ناقص لذت بھی پائی جاتی ہے۔ اس لئے یہ بھی حرام ہے اور اس پر تعزیر ہوگی۔

البتہ یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ ثبوت نسب کے اعتبار سے اس پر اولاد کے احکام جاری ہوں گے، اور اگر جاری ہوں گے تو نسب کی نسبت اور اس کے نفقہ اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اس شخص پر ہوگی جس کا یہ نطفہ ہے، یا ماں پر ہوگی۔

اگر کوئی مادۂ منویہ حرام طریقہ سے یا لذت ناقصہ کے ذریعہ کسی عورت کے رحم میں آتا ہے اور پھر حمل قرار پاکر بچہ پیدا ہوتا ہے تو ایسے بچہ کو لاوارث نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ شریعت میں اس کا نسب مرد یا عورت سے جوڑنا ضروری ہے، جس طرح زنا میں اور لعان میں بچّہ کی نسبت ماں کی طرف کی جاتی ہے۔

ثبوت نسب کے سلسلہ میں فقہ کے بعض جزیوں سے راہنمائی ہوتی ہے، فتاویٰ عالمگیری میں یہ جزیہ موجود ہے:۔

البكر اذا جومعت فيما دون الفرج فجعلت بان دخل الماء في فرجها فلما قرب اوان ولادتها	کنواری لڑکی کی شرم گاہ کے باہر ہم بستری کی جائے پھر منی اس کے رحم میں داخل ہو جائے اور اس سے وہ حاملہ ہو جائے

تزال عن رتقها ببيضة و بحرف	تو انڈے یا درہم کے کونوں سے اس کا کنوارپن
درهم۔ (ج ۴ ص ۶۱۴)	چاک کر دیا جاتے۔

اس کی ایک اور نظیر یہ ہے کہ اگر بچہ عورت کی چھاتی سے دودھ نہ پیئے مگر اس کا دودھ نکال کر اس کو ناک کے ذریعہ پیٹ میں پہونچا دیا جائے تو حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی۔

امام محمد کے نزدیک حقنہ کے ذریعہ بھی پہونچا دیا جائے تو بھی حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے، جیسا کہ فتاوی عالمگیری میں ہے:-

كما يحصل الرضاع بالمص	حرمت رضاعت جس طرح عورت کی چھاتی
من الثدي يحصل بالصب	سے چوسنے اور پینے سے ہوتی ہے، اسی
والسعوط والوجور كذا في	طرح حلق میں دودھ قطرہ قطرہ ٹپکا دینے
فتاوى قاضي خان وعند محمد	سے بھی ہو جاتی ہے، امام محمد کے نزدیک
يثبت بالحقنة۔	حقنہ کے ذریعہ دودھ چڑھا دینے سے بھی
(ج ۲ ص ۳۴۴)	حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔

غرض یہ کہ یہ حیا سوز طریقہ از قبیل زنا ہے، اس لئے کہ زنا میں بھی ایک مرد کا نطفہ اپنے محل میں نہیں جاتا یعنی بیوی کے بجائے اجنبیہ کے رحم میں جاتا ہے، یہاں بھی ایسا ہی ہے، مگر قضاء شہوت کی لذت پوری اس میں نہیں ہوتی ہے، بلکہ لذت ناقصہ بلکہ لذت فاسدہ ہوتی ہے، اس لئے زنا کا پورا حکم اس پر نہیں لگایا جاتا ہے، البتہ یہ مسئلہ کہ اس کا نسب کس سے ثابت ہوگا، اگر اس پہلو سے دیکھا جائے کہ زنا کی پوری تعریف اس پر صادق نہیں آتی کیونکہ زنا میں ایک مرد اور ایک عورت براہ راست خواہش نفسانی پوری کرتے اور لذت اندوز ہوتے ہیں اس میں یہ بات نہیں پائی جاتی، اس لئے اگر نطفہ کا لحاظ کیا جائے تو مرد سے نسب ثابت ہونا چاہیئے اور اگر اسے از قبیل زنا شمار کیا جائے تو ماں سے نطفہ ثابت ہوگا، جیسا کہ زنا اور لعان وغیرہ میں ہوتا ہے۔

راقم الحروف کی حقیر رائے یہ ہے کہ چونکہ یہ نطفہ دوسرے کا ہے۔ اس لئے اس کو زنا نہیں بلکہ از قبیل زنا تو شمار کرنا چاہیئے، مگر نسب کی نسبت ماں کی طرف نہیں ہونی چاہیئے بلکہ جس کا

مادۂ منویہ ہے اس کی طرف ہونی چاہیئے۔ لعان میں چونکہ مرد اپنے نطفہ سے انکار کرتا ہے[1] اس لئے اس کا نسب ماں سے جوڑ دیا جاتا ہے، اور اس صورت میں انکار کی کوئی صورت نہیں، اس لئے اس بچے کا نسب باپ سے ہونا چاہیئے اور اس پر اولاد کے احکام جاری ہونے چاہئیں، یہ حکم اس وقت ہے جب غیر مرد کا نطفہ ٹسٹ ٹیوب سے غیر عورت میں پہونچایا جائے لیکن کسی شرعی سبب سے شوہر کا نطفہ بیوی کے رحم میں پہونچایا جائے تو اس کے بارے میں علماءِ عرب نے جواز کا فتویٰ دیا ہے مگر یہ حیا سوز طریقہ بھی کسی شرعی مجبوری میں جائز ہونا چاہیئے۔

اعضا کی تبدیلی اور پیوند کاری

اس دور میں سرجری نے غیر معمولی ترقی حاصل کرلی ہے، اس ترقی کا نتیجہ ہے کہ ایک انسان کا اگر کوئی عضو بے کار ہو جاتے تو وہ کسی دوسرے انسان کے اس عضو کو ڈاکٹر لگا کر اسے درست کر دیتے ہیں، یعنی کسی کی آنکھ کسی کا دل کسی کا پھیپھڑا کسی دوسرے کے جسم میں وہ لگا کر اسے آنکھ والا دل والا پھیپھڑے والا بنا دیتے ہیں، عموماً یہ اعضاء ان لوگوں کے ہوتے ہیں، جو مرتے وقت اپنی رضامندی سے رضاکارانہ دیدیتے ہیں، یا وہ لاوارث مرنے والوں کے اعضاء ہوتے ہیں، مگراب اعضاء کی تبدیلی کی جگہ پلاسٹک سرجری لیتی جارہی ہے جہاں تک پلاسٹک سرجری کا تعلق ہے اس کی حیثیت تو ویسی ہی ہے جیسے مصنوعی ناک کی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے حضرت عرفجہ جن کی ناک جنگ میں کٹ گئی تھی تو آپ نے چاندی کی ناک لگوانے کی اجازت دی اور جب اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تو سونے کی ناک لگوانے کی اجازت دی اس لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اسی طرح جانوروں اور حیوانوں کے اعضاء کسی انسان کو لگا دیئے جائیں تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، اس لئے کہ جانور کا گوشت کھانا اور خریدنا دونوں جائز ہے انسان کے سلسلے میں مولانا مفتی شفیع احمد صاحب مرحوم

---

[1] ینبغی نسبہ ویلحقہ بامہ ای یلحق القاضی ذالک الولد بالام علی ما ھو الحکم فی اولاد الزنا کذالک فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ولد ھلال بن امیۃ۔

قاضی اس کا نسب مرد کے بجائے عورت سے جوڑ دے گا جیسا کہ ولد الزنا میں شریعت کا حکم ہے، یہی فیصلہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال بن امیہ کے بچے کے سلسلہ میں فرمایا کہ عورت پر۔

(شرح وقایہ متن وحاشیہ ج ۲، ص ۳۹۸)

نے علماء کرام کے مشورے سے جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صورت ناجائز ہے، اس کے جائز نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل انسان کے اعضاء کی حرمت اور تکریم ہے، یعنی اگر انسان کا کوئی عضو کٹ کر جسم سے علاحدہ ہو جائے تو اس کو نہ تو فروخت کیا جا سکتا ہے اور نہ بیکار چیز کی طرح اِدھر اُدھر پھینک دیا جا سکتا ہے، اور نہ اس کو ایک مضطر آدمی کھا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے فقہاء کرام کو کہ انھوں نے ہر ممکنہ صورتوں کے لئے رہنمائی کر دی ہے فتاوی عالمگیری میں ہے:۔

مضطر لم یجد میتة وخاف الھلاك فقال له رجل اقطع یدی کلھا او قال اقطع منی قطعة وکلھا لا یسعه ان یفعل ذالك ولا یصح امرهٗ به کما لا یصح للمضطر ان یقطع قطعة من نفسه فیاکل۔	بھوک سے نڈھال آدمی اگر مردار جانور بھی کھانے کو نہ پائے اور اسے موت کا خوف ہو، ایسی حالت میں ایک شخص کہے کہ میرا ہاتھ کاٹو اور اس کا گوشت کھاؤ تو مضطر کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے اور اس کو یہ بات کہنی نہ چاہیئے تھی جس طرح وہ خود جسم کا گوشت کاٹ کر
(ج ۵ ص ۳۱۰ بحوالہ جواہر الفقہ ج ۱ ص ۴۹)	نہیں کھا سکتا اسی طرح یہ بھی نہیں کھا سکتا۔

لیکن اس مسئلہ میں مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم کا رجحان جواز کی طرف معلوم ہوتا ہے مرحوم نے جواز کے پہلو کے لئے جو دلیل دی اس سے جواز ثابت نہیں ہوتا انھوں نے لکھا ہے:۔

"یہ شبہ کہ انسان کے اجزاء کا استعمال ناجائز ہے اس لئے وارد نہ ہونا چاہیئے کہ استعمال کی جو صورت مستلزم اہانت ہو وہ ناجائز ہے اور جس میں اہانت نہ ہو، تو بضرورت استعمال ناجائز نہیں ہے جیسے رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک کو پانی سے دھو کر وہ پانی مریض پر چھڑکایا پلایا جاتا تھا۔"

اس صورت کا جس کا ذکر مفتی صاحب نے کیا ہے اس میں اور زیر بحث صورت میں جس میں ایک عضو کو قصداً کاٹ کر پھر دوسری جگہ لگایا جاتا ہے میں فرق ہے۔ پہلی صورت میں اصل عضو میں کوئی فرق نہیں آیا ہے بلکہ باقی رہتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھایا گیا ہے لیکن زیر بحث مسئلہ میں اصل عضو میں فرق آیا ہے، پھر کسی کے سر پہ ہاتھ پھیرنے سے یا زبان سے دعا پڑھ کر

پھونک دینے سے فائدہ ہو جانا اور اس کے ہاتھ کی انگلی اور زبان کاٹ کر کسی کے جسم میں لگا دینے میں ظاہر ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اسی طرح فقہ شافعی کی کتاب شرح المہذب میں جو جزیہ ہے جس سے حالت اضطرار یا شدید مرض کی حالت میں اپنے جسم کا گوشت کاٹنے اور کھانے کی اجازت معلوم ہوتی ہے، اور اس کا تعلق زیادہ سے زیادہ اس کی ذات سے ہے نہ کہ دوسرے کے اعضاء کے استعمال سے۔

(شرح المہذب ج ۹ ص ۴۱)

اس مسئلہ میں غور کرتے وقت اس کے بعض واقعاتی اور اخلاقی پہلو پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ واقعاتی پہلو کا مطلب یہ ہے کہ اعضاء کی تبدیلی کے ذریعہ جو فائدہ پیش نظر ہوتا ہے وہ بہر حال یقینی نہیں ہے، بہت سے لوگوں کی آنکھیں بدلی گئیں مگر بینائی نہیں آئی، پھیپھڑا اور دل بدن میں لگایا گیا مگر اس میں حرکت نہیں آئی، تو ایسی غیر یقینی چیز کے لئے انسانی اعضاء کی حرمت کو ختم کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

اعضاء کا کاروبار

اس کا اخلاقی پہلو جس کی طرف مفتی شفیع صاحب مرحوم نے توجہ دلائی ہے، وہ بھی قابل لحاظ ہے، یعنی اگر یہ طریقہ عام ہو جاتے تو پیسے والے اپنی عیش پرستی کے لئے نہ جانے کتنے غریبوں بلکہ ان کے بچوں کی زندگی سے کھیل سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج مغربی ملکوں میں عمومی طور پر اس کے کاروبار اور تبدیلی اعضاء کے دوسرے معاملات پر پابندیاں عائد ہیں۔ پھر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ پلاسٹک سرجری کے بعد اس کی اہمیت کم بھی ہو گئی ہے، اس لئے اس کو جائز نہ ہونا چاہیئے، بلکہ قانوناً اس پر پابندی ہونی چاہیئے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کسر عظم المیت ککسر عظم الحی" (ابوداؤد، ج ۲ ص ۱۰۲) امام سرخسی لکھتے ہیں" لا یجوز تداوی بشیٔ من الآدمی الحی کذالك لا یجوز تداوی بعظم المیت اکراماً کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

(شرح السیر الکبیر، ج ۱ ص ۹)

غرض یہ کہ اعضائے انسانی کی تبدیلی اور ان کا کاروبار کرنا قانونی اور اخلاقی دونوں پہلو سے ناجائز ہے۔

جنسی خواہش کی تکمیل میں مصنوعی اعضاء کا استعمال

مغربی تہذیب نے انسان کو تھوڑی بہت ظاہری تمدنی چمک دمک ضرور دی ہے، مگر اس کے ساتھ اس نے اس کی بہت سی قیمتی متاع کو اس سے چھین لیا ہے، خاص طور پر انسان کی اخلاقی سطح کو اس نے حیوانی سطح سے بھی نیچے گرا دیا ہے، انھیں میں ایک جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے مصنوعی اعضاءٓ کا استعمال بھی ہے۔ مغرب میں اس کا استعمال تو ہوتا ہی ہے، اب مشرق میں بھی یہ وبا پھیلنے لگی ہے۔ اسلامی شریعت نے انسان کی جنسی خواہش کی تکمیل کی نہ صرف ترغیب دی ہے بلکہ اس کا فطری طریقہ بھی بتلا دیا ہے، تاکہ اس کی فطری خواہش بھی پوری ہو جائے، اور نسلِ انسانی کے بقاء کے لئے توالد و تناسل کا سلسلہ بھی بند نہ ہونے پائے، اس طریقہ کے خلاف جو صورت بھی اختیار کی جائے گی وہ نہ صرف شرعی حیثیت سے غلط ہوگی بلکہ عام انسانی اخلاقی اور انسانی نسل کے تحفظ کے لحاظ سے بھی وہ قابل مذمت ہوگی، اس کا فطری طریقہ یہ ہے کہ میاں بیوی معاہدۂ نکاح کے ذریعہ اکٹھا ہوں اور فطری طور پر ایک دوسرے سے لذت اندوز ہو کر اپنی شہوت پوری کریں، اگر کوئی بدبخت آدمی عورت سے جو اس کا محل ہے وہ فرج کے بجائے دبر سے اپنی خواہش پوری کرنے لگے تو وہ ملعون ہے۔ ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں لکھا ہے" اصحابنا یحرمون ذالك و ینھون اشد النھی" احناف اس کو حرام سمجھتے ہیں اور شدت کے ساتھ اس سے روکتے ہیں، اور قرآن پاک کی آیت" فأتوا حرثکم انی شئتم" کے تحت انھوں نے لکھا ہے کہ عورت کو کھیتی اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ جس طرح کھیت سے غلہ یا پھل وغیرہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح عورت سے اولاد پیدا ہوتی ہے، اور ظاہر ہے اس کا محل فرج ہے نہ کہ دبر گویا اس کے خلاف کرنا نص قرآنی کے خلاف ہے۔

پھر حدیث میں صراحۃً ذکر ہے، تین صحابی حضرت خذیمہ بن ثابت، حضرت ابو ہریرہ، اور علی بن طلق سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا" لا تاتوا النساء فی ادبارھن" (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۵ ص ۱۴۶)

اب اگر کوئی مرد کسی دوسرے مرد کے ساتھ یا کسی اور طریقہ سے اپنی خواہش نفسانی

کی تکمیل کرتا ہے، تو وہ حیوان کی سطح سے نیچے گر جاتا ہے، اس لئے کہ چار پائے اور پرندے بھی اپنی ہی صنف کے ساتھ ایسا نہیں کرتے کہ نر نر سے یا مادہ مادہ سے لطف اندوز ہو، اس لئے شریعت نے لواطت اور استمنا بالید سے نہ صرف منع کیا ہے، بلکہ ایسا جرم کرنے والے کو قتل کر دینے کا حکم دیا ہے۔

لیکن مغربی تہذیب نے انسان کو اتنا گرا دیا ہے کہ مغربی ملکوں میں اب قانوناً ہم جنسی کوئی جرم نہیں رہ گئی ہے، انھوں نے مصنوعی اعضاء کے ذریعہ جنسی خواہش کی تکمیل کے بیشمار غیر فطری راستے ہموار کر دیئے ہیں اور انھیں میں سے ایک مصنوعی اعضاء کا استعمال بھی ہے یعنی عورت مرد کا مصنوعی عضو تناسل اپنی شرمگاہ میں داخل کر لیتی ہے۔ اور مرد عورت کی مصنوعی شرمگاہ سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

اس طریقہ سے نہ صرف انسان کے مادۂ منویہ کا زیاں ہوتا ہے بلکہ جو انسانی نسل اس مادۂ منویہ سے پیدا ہو سکتی تھی اسے وہ ضائع کر دیتا ہے۔ نکاح کے ذریعہ سے میاں بیوی سے لذت یاب ہونے اور اپنی خواہش کے تکمیل کا جو فطری طریقہ اسلامی شریعت نے مقرر کیا ہے، اس کی روشنی میں مصنوعی اعضاء کا استعمال ناجائز ہے، اسلامی حکومت کو اگر اس پر لواطت کی سزا نہیں تو استمنا بالید یا جانوروں سے قضائے شہوت کے پوری کرنے کے دائرہ میں لاکر تعزیر مقرر کرنی چاہیئے، جیسے کوئی شخص کسی حیوان سے اپنی خواہش کی تکمیل کرے تو اس پر حد تو جاری نہیں کی جائے گی مگر تعزیر ضروری ہوگی۔ ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ کسی جانور کے ساتھ قضائے شہوت فعل حرام اور انتہائی قابلِ مذمت ہے اور اس پر حد یا تعزیر جاری ہونی چاہیئے۔

فقہاء احناف اس میں حد زنا کے تو قائل نہیں ہیں مگر تعزیر ضروری سمجھتے ہیں، حد کے وہ اس لئے قائل نہیں ہیں کہ قرآن وسنت میں اس پر حد جاری کرنے کا حکم موجود نہیں ہے، مالکی فقہاء کہتے ہیں کہ اس پر حد زنا جاری ہوگی، اگر وہ کنوارا ہے تو سو کوڑا اور اگر شادی شدہ ہے رجم۔ شوافع فقہاء بھی قریب قریب اسی طرح کے سزا کے قائل ہیں یا تو حد یا تعزیر کے حنابلہ بھی اس میں حد کے قائل نہیں ہیں البتہ کچھ فقہاء لواطت کی حد کے قائل ہیں اور کچھ فقہاء صرف تعزیر کے۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:۔

اربعة یصبحون فی غضب اللّٰہ ویمسون فی سخط اللّٰہ قلت من ھم یارسول اللّٰہ المشبھون من الرجال بالنساء والمشبھات من النساء بالرجال والذی یاتی البھیمة والذی یاتی الرجال۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۵ ص۱۴۵)

(المنتقیٰ ج ۲ ص۷۱۷)

چار آدمی اللہ کے غضب میں صبح کرتے اور اللہ کے غصہ میں شام کرتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا یہ کون لوگ ہیں یارسول اللہ آپ نے فرمایا جو مرد عورتوں کی صورت بناتے یا ان کی چال ڈھال اختیار کرتے ہیں اور عورتیں جو مردوں کی نقل کرتی ہیں اور جو جانوروں سے وطی کرتا ہے یا لواطت کرتا ہے۔

غرض یہ کہ قضاء شہوت کے فطری طریقہ کو چھوڑ کر جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے گا وہ شریعت میں جرم قرار پائے گا اور اس پر تعزیر جاری کی جائے گی۔

اسقاط حمل نسبندی اور نرودھ کا استعمال

مغربی تہذیب کے پیدا کردہ مسائل میں ایک مسئلہ آبادی پر کنٹرول کا بھی ہے، فرانس کے فلسفی مالتھس نے سب سے پہلے دنیا کی آبادی کا یہ بھیانک نقشہ پیش کیا کہ آبادی سلسلہ ہندسیہ ۲۔۴۔۸۔۱۶ کے اعتبار سے بڑھتی ہے، اور ذرائع پیداوار سلسلۂ حسابیہ ۲۔۴۔۶۔۸ کے اعتبار سے بڑھتی ہے، اس لئے اگر آبادی پر کنٹرول نہ کیا جائے گا، تو آبادی اتنی بڑھ جائے گی کہ پیداوار پوری نہیں پڑے گی، اور پھر آدمی کو فاقہ کی نوبت آجائے گی اور بچے اگر بہت زیادہ ہو گئے تو ان کی اچھی پرورش اور تعلیم و تربیت نہ ہو سکے گی[1]، اس لئے ضرورت ہے کہ دنیا کو آبادی کی کثرت سے روکا جائے، چنانچہ اسی مغربی نظریہ کے تحت ہماری حکومت نسبندی اسقاط حمل اور مانع حمل دواؤں اور نرودھ وغیرہ استعمال کے طریقوں کو نہ صرف رائج کر رہی ہے بلکہ روپیہ پیسہ کا لالچ دے کر اور کسی حد تک جبر کے ذریعہ لوگوں کو مجبور کیا جا رہا ہے، اس کوشش کے نتیجے میں آہستہ آہستہ عوام کا اور خاص طور پر ہندو عورتوں کا یہ مزاج بنتا جا رہا ہے کہ

---

[1] تفصیل کے لئے راقم الحروف کی کتاب "اسلامی قانون اجرت" کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

بچوں کی کثرت واقعی ایک مصیبت ہے اوران ذرائع سے وہ بچوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت کے خرخشہ سے بچ جاتیں گی اس لئے وہ خوشی کے ساتھ تیزی سے ان کا استعمال کرنے لگی ہیں۔

بحمداللہ مسلمانوں میں چند مغرب زدہ لوگوں کو چھوڑ کر اس طرح کا کوئی عمومی مزاج نہیں بن سکا ہے، مگر مسلم معاشرہ میں جس تیزی سے اختلاط ہورہا ہے اور مصنوعی معیار زندگی بڑھ رہا ہے، اس سے یہ خطرہ ہے کہ یہ وبا ان کے مردوں اور عورتوں میں بھی نہ پھیل جائے۔ اور وہ بھی قتل اولاد کے جرم کا ارتکاب کرنے لگیں، اب ان میں سے ہر ایک کے بارے میں شرعی حکم کی تھوڑی سی تفصیل کی جارہی ہے۔

نس بندی

ضبط ولادت کی بہت صورتوں میں ایک صورت نسبندی ہے، جس میں آپریشن کے ذریعہ مرد یا عورت کی قوت تولید ختم کردی جاتی ہے مگر قوتِ جماع باقی رہتی ہے جس سے وہ اپنی شہوت تو پوری کرلیتے ہیں، صرف بچہ کی پیدائش کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے، قوت تولید ختم کرنے کی ایک قدیم صورت تو وہ تھی کہ مرد اپنے کو خصّی بنالیتا تھا یعنی فوطے کی دونوں گوڑیاں نکلوالیتا تھا جیساکہ جانوروں کے سلسلہ میں یہ عمل رائج ہے، جس سے قوت تولید کے ساتھ قوت جماع بھی ختم ہوجاتی تھی، اس کو اسلام نے قطعی حرام قرار دیا ہے۔

جیساکہ بعض صحابہ نے اس کا ارادہ کیا تو آپ نے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔[1] لیکن نسبندی میں چونکہ قوتِ جماع باقی رہتی ہے، اس لئے اس پر بھی وہی حکم لگایا جائے یا اس کی یہ نوعیت جائز قرار دی جائے۔ یہ مسئلہ بہت دنوں سے زیر غور ہے۔ کچھ لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں مگر راقم الحروف کے نزدیک یہ بالکل ناجائز ہے، اس کے دلائل یہ ہیں، عام فقہاء دیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ کسی کے زخمی کرنے سے کسی کا کوئی عضو بیکار ہوجائے تو اس میں یا تو قصاص ہوگا یا پھر دیت، الفقہ علی المذاہب الاربعۃ کے مرتب الجنایۃ علی الاطراف کے تحت

---

[1] عن سعد بن ابی وقاص قال ردّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی عثمان بن مظعون التبتل ولو اذن لہ لاختصینا۔ (المنتقی ج ۲ ص ۴۹۳ بحوالہ بخاری ومسلم)

لکھتے ہیں اگر کوئی شخص انسان کے کسی عضو کو ضائع کر دے، تو اس کے بدلے میں اس کا عضو بھی ضائع کیا جائے گا۔ بشرطیکہ اس عضو سے جو فائدہ اس کو پہونچ رہا تھا وہ بالکل نہ پہونچے، اگر کچھ فائدہ پہونچ رہا ہے تو اسی اعتبار سے دیت ہوگی، اگر کوئی شخص کسی کا اعضاء تناسل یا اس کا حشفہ کاٹ دے تو کچھ لوگ پوری دیت کے قائل ہیں اور اکثر فقہاء اس میں تاوان کے قائل ہیں:۔

عند اکثر الفقهاء إن فی ذکر الخصی والعنین حکومة۔	اکثر فقہاء کے نزدیک اختصاء کرنے والے کے اندر گو جماع کی قوت نہیں رہ جاتی

اسی طرح عنین کا عضو تناسل گو بے کار ہو جاتا ہے لیکن اگر اس کے عضو تناسل کو زخمی کر دے یا کاٹ دے تو حاکم اس پر تاوان عائد کرے گا۔

پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

لأن ذکر الخصی سلیم وھو قادر علی الایلاج وانما الفائت الایلاد والعنة عیب فی غیر الذکر لان الشھوة فی القلب والمنی فی الصلب ولیس الذکر بمحل لواحد منھا؟ فکان سلیم من العیب والحشفة کالذکر[1] (ج ۵ ص ۳۲۶)	جو شخص اپنے کو خصی بنا لیتا ہے اور وہ اپنے عضو تناسل کو فرج میں داخل کرنے کی قدرت رکھتا ہے جو کمی ہوتی ہے وہ یہ کہ اولاد پیدا نہیں ہوگی اس طرح نامرد ہونا عیب ہے مگر دوسری چیزوں میں اس لئے کہ شہوت قلب میں ہوتی ہے اور عضو تناسل ان دونوں میں سے کسی کا محل نہیں ہے وہ نقص سے پاک سمجھا جائے گا یہی حکم حشفہ کا بھی ہے۔

کسی عضو کو شل کر دینے کے سلسلہ میں صاحب اقناع لکھتے ہیں:۔

---

[1] یہ حکم اس مرسل روایت کی بنا پر لگایا گیا ہے جو سعید بن المسیب اور امام زہری سے مروی ہے کہ ابوداؤد اور نسائی سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا کہ فی النفس دیة وفی اللسان دیة وفی الحارن دیة۔

(الفقه علی المذاھب الاربعه ج ۵ ص ۳۲۶)

فی العضو الاشل وھو الذی ذھبت منفعتہ من الید والرجل والذکر والثدی ولسان الاخرس والعین القائمۃ فی موضعھا۔

(ج ۴ ص ۲۲۸)

کسی عضو کے شل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا جو کام ہے یا جو فائدہ اس سے ہوتا ہے وہ نہ ہو (مثلاً ہاتھ سے پکڑنے کا کام پیر سے چلنے کا عضو تناسل سے قضاء شہوت کا اور چھاتی سے دودھ پینے کا) اور گونگے کی زبان یا نابینا کی شکل آنکھ کو مجروح کرنا بھی حرام ہے)

انسان کے ایسے اعضاء جن سے پوری منفعت حاصل نہیں ہوتی ہے یا وہ شل ہو گیا ہے ان کو بھی کوئی زخمی کر دے یا کاٹ دے تو اس پر تاوان ہوگا۔

بعض لوگ یہ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں کہ حدیث میں اختصاء (خصی بنانے) سے روکا گیا ہے، جس میں قوت جماع اور قوت تولید دونوں ختم ہو جاتی ہے، مگر نس بندی میں صرف قوت تولید ہی ختم ہوتی ہے، قوت جماع باقی رہتی ہے اس لئے اس پر وہ حکم نہیں لگایا جا سکتا لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ کسی بھی فطری قوت کا ختم کر دینا یا کسی عضو کا کاٹ دینا یا زخمی کر دینا خواہ دوسرا کوئی کرے یا خود وہ آدمی اپنے عضو کے ساتھ ایسا کرے تو یہ شریعت کے نزدیک جرم (جنایت) ہے اور اس کی سزا ہے۔ اب اگر کسی عضو کی پوری منفعت ضائع ہو جائے تو بڑا جرم ہوگا اور اگر کچھ باقی رہے اور کچھ ضائع ہو جائے تو اسی اعتبار سے جرم شمار ہوگا جیسا کہ اوپر فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہو چکا ہے کہ جس قدر منفعت میں کمی ہوگی اس کے بقدر دیت یا تاوان میں کمی ہوگی، مگر بہر حال اس کے جرم ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے:۔

بدائع الصنائع میں ہے کہ وہ صورتیں جن میں مکمل دیت واجب ہوتی ہے، ان میں دو باتوں پر غور کرنا ہے، ایک سبب اور دوسرا شرط، دیت کے واجب ہونے کا سبب اس نفع سے محرومی ہے جو کسی عضو کا مقصود بہ ہوتا ہے، نفع کا فقدان اور محروم ہونا دو صورتوں میں ہوگا، ایک تو یہ کہ اس عضو ہی کو جسم سے علاحدہ کر دیا جائے، دوسرے یہ کہ عضو تو باقی رہے لیکن اس سے جو کام لیا جانا مقصود ہے وہ اس کام کے لائق نہ رہے، آگے علامہ کاسانیؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس زمرے میں یہ صورت بھی آتی ہے کہ کسی کا آلہ تناسل تو باقی رہے اور توالد وتناسل کی قوت برباد کردی جاتے۔

یہ علامہ کاسانیؒ کی رائے ہے جسے جدید فقہی مسائل کے مرتب نے نقل کی ہے یہ سوء اتفاق ہے کہ اس کی عربی عبارت پر راقم الحروف کی نظر نہ پڑسکی، ہم نے مرتب پر اعتماد کرکے ان کی رائے نقل کی ہے۔

ان تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ نس بندی مرد کی ہو یا عورت کی اس کی وجہ سے ان کی ذرت تولید مستقل طور سے ختم کردی جاتی ہے اور کسی عضو انسانی کی افادیت کو مستقل طور پر ختم کردینا قرآن وسنت کی رو سے ایک غیر شرعی فعل ہے، اور اس کے ناجائز ہونے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے، اس لئے نسبندی اور ضبط ولادت کی دوسری تمام صورتیں قرآن کی اس آیت کے تحت قتل نفس شمار ہوں گی، آگے ہم امام ابن تیمیہ کی رائے نقل کریں گے:۔

لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ۔	فاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور تم کو بھی دے رہے ہیں۔

اس آیت سے پہلے یہ معنی خیز جملہ بھی ہے:۔

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (اعراف)	کھلے اور چھپے فواحش کے قریب نہ جاؤ۔

یعنی وہ فواحش جو کھلے ہوئے ہوتے ہیں جیسے نسبندی وغیرہ اور جو چھپے ہوتے ہیں، جیسے عزل وغیرہ ان کے قریب نہ جاؤ۔ یہاں قرآن پاک نے فواحش کا لفظ زنا اور محرکات زنا کے معنی میں استعمال کیا ہے، لیکن ضبط ولادت کی صورتوں کی وجہ سے زنا کا چھپانا آسان ہوگیا ہے، اس لئے یہ بھی اس حکم میں داخل ہیں، اوپر کی تفصیلات کے تحت وہ تمام صورتیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور تحدید نسل کی اور بھی جو صورتیں آیندہ ایجاد ہوں گی وہ سب آگئیں اور وہ سب کسی فطری قوت کے ضائع کرنے کے زمرہ میں شمار کی جائیں گی۔

حدیث میں ہے کہ گناہوں سے بچنے اور خدا کی عبادت میں مصروف رہنے کے لئے

بعض صحابہ نے خصی ہونے کی خواہش ظاہر کی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے اجازت نہیں دی اور قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت فرمائی :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا	اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تمہارے
طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا	لئے حلال کر دی ہیں ان پاکیزہ چیزوں کو حرام
تَعْتَدُوْا۔ (مائدہ۔ بخاری شریف ج ۲ ص ۵۹)	مت کرو اور حد سے آگے نہ بڑھو۔

لوپ اور نرودھ کا استعمال

ضبط ولادت کی ایک صورت نرودھ اور لوپ کا استعمال بھی ہے یعنی مرد عورت اپنی نفسانی خواہشات بھی پوری کرلیں اور عورت کو حمل بھی قرار نہ پائے۔ اس حمل کو روکنے کے لئے جھلی دار ربر کی تھیلیاں بنادی جاتی ہیں، ایک تو وہ جھلی دار تھیلی ہوتی ہے جسے مرد اپنے عضو مخصوص پر پہنا لیتا ہے، اس کو نرودھ کہتے ہیں، اور دوسری وہ جسے عورت اپنے رحم کے منہ پر ڈال لیتی ہے اسے لوپ کہتے ہیں، دونوں کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ دونوں اپنی خواہش نفسانی پوری بھی کرلیں اور مادۂ منویہ رحم میں نہ داخل ہو جس سے اولاد پیدا نہ ہو سکے، عام طور پر اس کی صورت عزل کی ہوتی ہے، جو قدیم زمانے سے رائج ہے، اور خود عہد نبوی میں اس کی مثالیں ملتی ہیں، بعض حضرات اس کو عزل پر محمول کر کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں اور بعض لوگ کراہت تحریمی کے قائل ہیں۔

عزل کے سلسلے میں اباحت اور کراہت دونوں طرح کی احادیث ہیں۔ مثلاً حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ :۔

كنا نعزل على عهد رسول الله	ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے
صلى الله عليه وسلم والقرآن ينزل	میں عزل کرتے تھے اور نزول قرآن کا سلسلہ
(بخاری بحوالہ المنتقی ج ۲ ص ۵۶۱)	جاری تھا۔

مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی ممنوع چیز ہوتی تو اس کے بارے میں قرآن کی کوئی آیت ضرور نازل ہوتی ہے، مگر چونکہ ایسا نہیں ہوا اس لئے ایسا کرنا صحیح ہے، اس مفہوم کی اور بھی احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے جب آپ سے عزل کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا:۔

إعزل عنها إن شئت فانه سياتي	جاؤ عزل کرو مگر اس کے بعد فرمایا جو اولاد

ما قدر لها۔ (مسلم، ابو داؤد وغیرہ) مقدر میں ہے وہ ہو کر رہے گی۔

دوسری روایات وہ ہیں جن میں آپ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے بلکہ الوأد الخفی یعنی خفیہ طور پر زندہ درگور کرنا قرار دیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر کچھ لونڈیاں ہاتھ آئیں اور عورتوں سے جدا رہتے ہوتے زیادہ مدت گذر جانے کی وجہ سے قضائے شہوت کی خواہش ہوئی تو انھوں نے ان لونڈیوں کے بارے میں حضورؐ سے عزل کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا:۔

لا علیکم أن تفعلوا ما کتب اللہ خلق نسمة ھی کائنة الی یوم القیامة الا ھی کائنة۔ (مسلم ج ۲ کتاب النکاح باب العزل ص ۴۶۳)	تمہیں ایسا نہ کرنا چاہیئے اس لئے تم اولاد کے نہ ہونے کے لئے ایسا کرتے ہو اللہ تعالیٰ جس جان کو پیدا کرنا چاہے گا وہ تمہاری اس حرکت کے بعد بھی پیدا کر دے گا اور ضرور پیدا کر دیگا“

یعنی عزل کرنے کے وقت ایک آدھ قطرہ مادۂ منویہ اندر گیا تو اس سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے، بخاری شریف میں ”أو انکم تفعلون“ کا لفظ وارد ہوا ہے۔ جس سے تعجب کا اظہار ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ آپ نے تعجب سے فرمایا کیا تم لوگ ایسا کرتے ہو؟ اور پھر اس میں ثلاث مرات کا لفظ بھی ہے یعنی آپ نے تین بار آخری جملہ کی تکرار فرما کر اپنی ناگواری کا اظہار فرمایا، حضرت ابو سعید خدری کی ایک دوسری روایت ہے کہ عزل کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا انت تخلقه وانت ترزقه کیا تم ہی اس کو پیدا کرتے ہو یا تم ہی اس کو رزق دیتے ہو یعنی آپ نے اس پر اپنی ناگواری کا اظہار کیا کہ بچہ کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے خوف سے تم عزل کرتے ہو، تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بچے کا رزق تمہارے ہاتھ میں نہیں، بلکہ خدا تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ ایک حدیث ایک صحابیہ حضرت جزامہ بنت وہب اخت عکاشہ سے مروی ہے، جسے حضرت عائشہ نے روایت کیا ہے:۔

قالت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اناس فسألوہ عن العزل۔	میں چند آدمیوں کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی، تو لوگوں نے عزل کے بارے میں سوال کیا۔

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذالک الواد الخفی وھی (قولہ تعالیٰ) اذا الموٴدة سئلت بای ذنب قتلت (تکویر)

آپ نے فرمایا کہ یہ خفیہ زندہ در گور کرنا ہے اور یہ آیت تلاوت فرمائی "جب زندہ در گور بچی سے سوال کیا جائے گا کہ وہ کس گناہ میں قتل کی گئی۔

دونوں طرح کی احادیث نقل کرنے کے بعد امام نودی نے جو کچھ لکھا وہ یہ ہے :-

العزل ھو ان یجامع فاذا قارب الانزال نزع وانزل خارج الفرج وھو مکروہ عندنا فی کل حال لانہ طریق الی قطع النسل ولھذا جاء فی الحدیث الآخر تسمیتہ الواد الخفی لانہ قطع طریق الولادة کما یقتل المولود بالوأد۔

(مسلم مع نودی ج ۲ ص۴۶۳ ہندوستانی)

عزل یہ ہے کہ مرد عورت سے مجامعت کرے اور جب انزال کا وقت ہو تو عضو تناسل باہر نکال کر فرج سے باہر منی خارج کرے یہ ہمارے نزدیک ہر حال میں مکروہ تحریمی ہے، اس لئے کہ یہ قطع النسل کا طریقہ ہے، اس لئے دوسری حدیث میں اسے واد خفی کہا گیا ہے یعنی پوشیدہ طور پر زندہ در گور کرنا ہے اس لئے یہ ولادت کے طریق کو قطع کرنا ہے جیسا کہ زندہ در گور کرنے کی وجہ سے بچہ قتل کیا جاتا ہے۔

امام ابن القیم تمام روایات اور فقہاء کی رایوں کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

فیمن اباحہ مطلقا احتج بما ذکرنا من الاحادیث وبان حق المراة فی ذوق العسیلة لا فی الانزال ومن حرمہ مطلقا احتج بما رواہ مسلم فی صحیحہ من حدیث عائشہ عن جزامة بنت وھب اخت عکاشہ قالوا ھذا ناسخ لاخبار الاباحة۔

بعض لوگوں نے عزل کو مطلق مباح کہا ہے، اور انھوں نے ان احادیث سے استدلال کیا ہے جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں اس لئے کہ عورت کا حق مرد سے لذت یاب ہونا ہے، نہ کہ انزال بعض لوگوں نے اس کو مطلقاً حرام کہا ہے، انھوں نے حضرت عائشہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے جسے مسلم نے اپنی صحیح میں جزامہ بنت وہب سے روایت کی ہے، اور کہا ہے کہ

یہ حرمت والی حدیث اباحت والی حدیث کو منسوخ کرتی ہے۔

اوپر حضرت جابر کی جو روایت نقل کی گئی ہے، اس میں ہے کہ قرآن کے نزول کا سلسلہ جاری تھا، اور ہم لوگ عزل کرتے تھے۔ حضرت جابر کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ چیز ناپسندیدہ ہوتی تو قرآن کی آیت اس کے بارے میں ضرور نازل ہوتی۔ حضرت جابر کی اس رائے کے جواب میں کہا گیا ہے کہ قرآن کی آیت تو اس بارے میں نازل نہیں ہوئی، مگر جس پر قرآن نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، انھوں نے تو ایسے کو الواد الخفی اور المودۃ الصغریٰ یعنی چھوٹے پیمانے کا زندہ درگور کرنا قرار دیا ہے پھر اس میں یہ ذکر بھی نہیں ہے کہ حضورؐ کو علم ہوا اور آپؐ نے منع نہیں فرمایا (زاد المعاد ج ۴ ص ۱۶)

قابلِ غور

بحث محض اتنی نہیں ہے کہ موجودہ دور کے مانع حمل طریقے اور قدیم طریقۂ عزل کے سلسلہ میں دونوں میں فرق ہے یا یکسانیت ہے؟ اگر اسے مباح ہی تسلیم کر لیا جائے تو میں اسے مباح کہنے والوں ہی سے پوچھتا ہوں کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا یہ بھی عزل کی طرح ایک انفرادی فعل ہے کہ جس کا جی چاہے کرے یا نہ کرے یا اس کے پیچھے اباحیت پسندی کا ایک فلسفہ ایک تحریک اور معاشی و علمی ترقی کا ایک خواب ہے، اس لئے اس پر اس حیثیت سے بھی غور کرنا چاہیئے اور دینی و اخلاقی روح کے پیش نظر بھی غور کرنا چاہیئے، بعض خاص حالت میں آپ نے اگر عزل کی اجازت دی ہے تو اس پر اپنی ناگواری کا اظہار بھی فرمایا ہے۔ پھر اگر اسے مباح مان بھی لیا جائے تو اس کو ترغیب و ترہیب کے ذریعہ واجب و ضروری قرار دیا جائے یا کرنیوالوں کو انعام دیا جائے اور نہ کرنے والوں کو نااہل اور سزا کا مستحق اور قابل ملامت قرار دیا جائے، تو شریعت میں اس کا حکم کیا ہے؟ اس پہلو سے بھی اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے، البتہ کسی عورت کے لئے مزید پیدائش میں جان کا خطرہ ہو تو اس کو مباح قرار دیا جا سکتا ہے، مگر رزق کی تنگی کے خوف سے ایسا کرنا خدا کی رزاقیت پر ایک مومن کو جو یقین ہوتا ہے، اسے یہ چیز نہ صرف کمزور کرتی ہے بلکہ اس کی ایمانی اور اخلاقی حس کو ختم کر دیتی ہے، اس لئے اس کے مکروہ تحریمی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

اسقاط حمل اور مانع حمل دوائیں

آبادی کی کثرت کو روکنے کے جو طریقے موجودہ دور میں رائج ہیں ان میں ایک اسقاط حمل اور

مانع حمل دوائوں کا استعمال بھی ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ یا تو حمل قرار نہ پائے یا پائے تو اس کو اسقاط کے ذریعہ ضائع کر دیا جائے، عام طور پر فقہاء لکھتے ہیں کہ ایک سو ۱۲۰ بیس دن سے پہلے اسقاط کراہت تحریمی کے ساتھ جائز ہے اور ایک سو بیس دن کے بعد حرام ہے[1]، بعض صحابہ سے بھی اس طرح کی مدت کا بیان نقل کیا جاتا ہے، گویا ان کے خیال میں ایک سو بیس دن سے قبل بچے میں جان نہیں پڑتی، اس لئے اسقاط حمل قتل اولاد کے مرادف نہیں ہے، گو اس صورت میں امکان قتل ہے، اس لئے فقہاء اس کو مکروہ تحریمی کہتے ہیں، مگر اس مدت کے بعد قتل کے مرادف ہے اس لئے حرام ہے۔

مگر اس سلسلہ میں چند باتیں عرض ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ایک تجرباتی اور مشاہداتی چیز ہے، قدیم فقہاء نے اپنے تجربات سے یہ بات لکھی تھی کہ جنین میں جان چار مہینے کے بعد پڑتی ہے مگر موجودہ تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ مرد کے خصیوں کے اندر بنے ہوئے نطفہ (منی) میں اگر خوردبین سے دیکھا جائے تو اس میں سیکڑوں خلیہ کی جسامت والے جرثومے نظر آئیں گے جن کو (SPERMETOZOF) اسپرمیٹوزوا کہتے ہیں، اس لئے نطفہ خواہ چند دن کا ہو یا چند ماہ کا اس کے زندہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا ہے البتہ زندگی کے مدارج جدا جدا ہوتے ہیں کبھی وہ بچہ منی کی صورت میں ہوتا ہے، کبھی جما ہوا خون اور کبھی گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے۔

چنانچہ امام سرخسی نے اسی بنا پر لکھا ہے :۔

ثم الماء فی الرحم مالم یفسد	پھر منی رحم میں جب تک خراب نہ ہو جائے
فھو معد للحیاۃ فجعل کالحی	اس وقت تک اس میں زندگی کی صلاحیت
فی ایجاب الضمان باتلافہ	باقی رہتی ہے، اس لئے اسے ضائع کرنے کی
کما تجعل بیض الصید فی ایجاب	صورت میں اسے ایک زندہ شخص تصور کر کے
الجزاء علیہ بکسرۃ ۔ (ج ۲۶ ص ۸۷)	اس پر تاوان واجب ہوگا جیسے حالت احرام

میں کوئی حاجی شکار کا انڈا توڑ دے اس پر وہی تاوان واجب ہوگا جو ایک شکار کے مار ڈالنے کا ہوتا ہے۔

---

[1] رد المحتار، ج ۵ ص ۲۷۹۔

امام سرخسی نے اس سلسلہ میں ایک حدیث نقل کی ہے۔ وہ مسلم اور نسائی میں باب القسامہ میں ہے اور امام بخاری نے اسے کتاب الدیات میں نقل کیا ہے، یہ روایت حضرت ابوہریرہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ دونوں حضرات سے مروی ہے:۔

ان ابا هريرة قال اقتتلت امرأتان من هذيل فرمت احداهما الاخرى بحجر فقتلها وما فی بطنها فاختصموا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان دية جنينها غرة عبد او وليدة وقضى بدية المرأة على عاقلتها وورثها ولدها ومن معهم فقال حمل بن نابغة الهذلی یارسول الله۔

كيف اغرم من لا شرب ولا اكل ولا استهل مثل ذالك بطل فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم انما هذا من اخوان الكهان من اجل سجعه الذى سجع۔

(مسلم ج ۲ ص ۶۲ باب القسامہ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ ہذیل کی دو عورتیں (سوکنیں) آپس میں لڑ گئیں ایک نے پتھر سے دوسری کو مارا جس سے وہ مر گئی اور اس کے پیٹ میں جو بچہ تھا، وہ بھی مر گیا، رسول اللہ صلعم کی خدمت میں جب یہ معاملہ پیش ہوا تو آپؐ نے حمل کے ضائع کرنے کی دیت ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرنے کی مقرر فرمائی اور عورت کی دیت اس کے خاندان والوں اور اس کے ورثہ پر اور اس کے لڑکے اور جو اس کے ساتھ تھے ان کے ذمہ ڈال دی۔

اس فیصلہ پر حمل بن نابغہ بولے کہ ایک ایسے بچے کے بارے میں یہ تاوان کیسے برداشت کروں جو نہ چیخا رویا اور نہ کھایا پیا اس طرح کے معاملہ میں تو کوئی تاوان نہ ہونا چاہیے۔ یہ بیکار چیز کے مثل ہے، انھوں نے یہ بات بڑی مسجع عبارت میں کہی اس لئے آپ نے ناپسند فرمایا۔

اس حدیث کی روشنی میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے کہ مقتولہ اور جنین دونوں کی دیت قاتل سے لی جائے گی، یا دونوں عاقلہ پر واجب ہوگی، مگر حدیث میں آپؐ نے بچہ اور عورت دونوں کی سزا یعنی دیت الگ الگ تجویز فرمائی، اس لئے امام مالکؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور امام شافعیؒ اور

احمد بن حنبل دونوں عاقلہ پر ڈالتے ہیں، امام سرخسی نے لکھا ہے کہ قیاس کا تقاضا تھا کہ اس سے قصاص لیا جائے، مگر اس حدیث نبوی کی بنا پر ہم نے قیاس ترک کر دیا، اور دیت واجب قرار دی۔

اس تفصیل سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ نطفہ برباد کرنے والا ہر عمل شریعت میں ممنوع ہے، اگر نطفہ میں جان پڑنے کی صلاحیت موجود ہے تو اس کا ضائع کرنا گویا قتل کے مرادف ہے، حضورؐ نے ایک بھلے چنگے انسان یا صحیح سالم بچہ کے قتل سے حمل کو ضائع کرنے کو کم درجہ کا جرم قرار دیا ہے، اس لئے بعض فقہاء اس کو حرام کے بجائے مکروہ تحریمی کہتے ہیں، مگر اس کی ممنوعیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مکروہ تحریمی حرام کے قریب ہے۔

ان کا حکم

اس تفصیل سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ نطفہ کو برباد کرنے والا ہر عمل ممنوع ہے خواہ آپریشن کے ذریعہ ہو یا اسقاط کے ذریعہ ہو یا دوا وغیرہ کے ذریعہ ہو، یا مار پیٹ کے ذریعہ وہ ضائع ہو جائے، ظاہر ہے کہ جب نطفہ کو برباد کرنا ناجائز اور فوجداری جرم ہے، تو پھر حمل خواہ چند دن کا ہو یا چند ماہ کا ہو اس کا اسقاط بدرجۂ اولیٰ ناجائز اور حرام ہو گا۔

علامہ شامی نے یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ زندگی کے آثار ایک سو بیس (۱۲۰) دن کے بعد ظاہر ہوتے ہیں ایک اور جزیہ نقل کیا ہے جس سے اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے:۔

وفی الشمنی ولو القت مضغة	شمنی میں ہے کہ اگر اس نے نطفہ کو گوشت
ولم یتبین شیٔ من خلقه	کے لوتھڑے کی شکل میں گرا دیا اور ابھی بچہ
فشهدت ثقات من القوابل	کی صورت گری نہیں ہوئی اور زندگی کے
انه مبدأ خلق آدمی ولو بقی	آثار نمایاں نہیں تھے تو اگر قابل اعتماد
لتصور فلا غرة و تجب منه	لیڈی ڈاکٹر یا دائیاں یہ بتائیں کہ اس میں
عندنا حکومة۔	زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے،
(ج ۵ ص ۳۷۹)	اور اگر وہ باقی رہتا تو وہ انسان کی صورت

اختیار کر لیتا تو اس میں غرہ نہیں ہے بلکہ تاوان ہے، یعنی حکومت کا ذمہ دار جو جرمانہ چاہے کر سکتا ہے۔

راقم الحروف نے اوپر عرض کیا ہے کہ یہ ایک تجرباتی چیز ہے، اگر ماہر لیڈی ڈاکٹر یا دائی زندگی کے آثار پائے جانے کی تصدیق کردے تو وہ زندہ تصور کیا جائے گا جیساکہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ موجودہ تحقیق میں زندگی کے آثار شروع ہی سے پائے جاتے ہیں، اس لئے مانع حمل دواؤں اور اسقاط کے ذریعہ نطفہ کا بھی برباد کرنا اور ضائع کرنا ناجائز ہوگا۔

فقہ کے دو ایک جزیے سے اس پر مزید روشنی پڑتی ہے، اس سلسلے میں امام ابن تیمیہ سے کسی نے اسقاط کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا:-

اسقاط الحمل حرام باجماع المسلمين وهو من الوأد الذى قال الله تعالىٰ واذا الموؤدة سئلت بأى ذنب قتلت وقد قال تعالىٰ لا تقتلوا اولادكم خشية املاق ولو قدر ان الشخص اسقط الحمل خطأً مثل ان يضرب المرأة خطاء فتسقط فعليه غرة عبد او امة بنص النبى ﷺ[1] واتفاق الائمة وتكون قيمة الغرة بقدر عشر دية الام عند جمهور العلماء كمالك والشافعى واحمد وكذالك كفارة القتل عند جمهور الفقهاء واذا تعمد الاسقاط فانه يعاقب على ذالك عقوبة تردعه عن

اسقاط حمل کے حرام ہونے میں پوری امت کا اتفاق ہے وہ اللہ کے ارشاد کے مطابق زندہ درگور کرنے اور قتل اولاد کے مرادف ہے (جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے) اگر اندازہ ہو کہ ایک شخص کی غلطی سے اسقاط حمل ہوگیا مثلاً کسی حاملہ عورت کو مارا گو اس کا ارادہ حمل ضائع کرنے کا نہ تھا مگر حمل ضائع ہوگیا تو اس کو ایک غلام یا لونڈی آزاد کرنا ہوگا جیساکہ حدیث نبوی میں ہے، اور ائمہ کا اس پر اتفاق ہے اور اگر قیمت ادا کرے تو اس کی قیمت جمہور فقہا امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک دیت کی قیمت ۱/۱۰ ہے اور اگر اس نے قصداً اسقاط کرایا ہے تو اس کو ایسی سزا دی جائے گی کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس سے باز آجائے، اسقاط کا ارتکاب اس کے دین

---

[1] اوپر حدیث گذر چکی ہے۔

ذالك وذالك مما یقدح فی دینه   اور ثقاہت دونوں کو مجروح کر دیتا ہے۔
وعل التبه[1]

جدید فقہی مسائل کے مرتب نے فتاویٰ قاضی خاں کی جو رائے نقل کی ہے اس سے بھی اس مسئلہ پر ایک اور پہلو سے روشنی پڑتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں اسقاط حمل اگر زندگی پیدا ہونے کے بعد ہو تو اس کے حرام ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے، لیکن اگر زندگی کے ظہور سے پہلے ہی اسقاط کرایا جائے تب بھی یہ ناجائز ہے، اس لئے کہ جب تک روح نہ پیدا ہو جائے حمل عورت ہی کے بدن کا حصہ اور اس کا جز تصور کیا جائے گا، جس طرح کسی کا قتل یا اس کے عضو کا کاٹنا درست نہیں ہے اسی طرح اپنے جسم کے کسی حصے کو کاٹ کر پھینکنا بھی حرام ہے[2]

جدید طبی تحقیقات کے تحت اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ زندگی کے آثار ہر مرحلہ میں بلکہ قطرۂ منی کے رحم میں داخل ہوتے ہی پیدا ہو جاتے ہیں، اس لئے فقہائے کرام کی ان تفصیلات کو بھی جدید تحقیقات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اسقاط حمل شدید مجبوری کے علاوہ کسی مرحلہ میں جائز نہیں ہے شدید مجبوری کی ایک ہی صورت ہے کہ عورت دائم المریض ہو یا اتنی کمزور ہو کہ قابل اعتماد ڈاکٹر یہ کہہ دیں کہ اگر حمل باقی رہا تو اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ کسی دوسری صورت میں جائز نہیں ہے۔

بچہ پیدا نہ ہوتا ہو تو آپریشن کے ذریعہ کاٹ کر نکالنا

اگر عورت کے پیٹ میں بچہ زندہ ہو اور پیدائش نہ ہو رہی ہو تو آپریشن کے ذریعہ اگر بچہ پیدا ہو سکے تو آپریشن کر کے بچہ پیدا کرایا جا سکتا ہے، لیکن اگر ڈاکٹر کہیں کہ اگر بچہ زندہ حالت میں پیدا کرایا جائے گا تو ماں کی زندگی کو خطرہ ہے اس لئے بچہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نکال لیا جائے تو زندہ بچہ کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، کیا ضروری ہے کہ ماں اس صورت میں یقینی طور پر زندہ رہ جائے، اس لئے

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۴ ص۱۸۲ قدیم ایڈیشن باب دیات النفس وغیرہا۔

[2] فتاویٰ قاضی خاں کتاب الحظر والاباحۃ۔

بچہ کی زندگی ختم کر کے ماں کی زندگی بچانا صحیح نہیں ہے، حتی الامکان دونوں کی زندگی بچانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر بچہ پیٹ میں مر جائے اور ماں زندہ ہو اور انجکشن دوا سے باہر نہ آرہا ہو تو آپریشن کر کے وہ نکالا جا سکتا ہے، اس لئے کہ ماں کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ یقینی ہے[1]۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر فقہائے احناف کو کہ انھوں نے ہر ممکن صورت کا حکم بیان کر دیا ہے۔

---

[1] حامل ماتت وولدها حی یضطرب شق بطنها من الایسر ویخرج ولدها ولو بالعکس وخیف علی الام قطع واخرج لو میتاً ولو کان حیاً لا یجوز تقطیعه لان موت الام موهوم فلا یجوز قتل آدمی حی لامر موهوم (رد المحتار، ج ۱ ص ۸۴۰)

پوسٹ مارٹم

زندہ انسان کے جسم کی چیر پھاڑ کا طریقہ شرعی حدود کے اندر تو بہت قدیم ہے، مگر انسان کے مرنے کے بعد خاص طور پر جب وہ کسی حادثہ کا شکار ہو جائے، یا وہ قتل کر دیا جائے تو موجودہ دور میں حادثہ کا یا قتل کا سبب دریافت کرنے کے لیے یا زخم کی یہ حیثیت کہ وہ کسی تیز دھار آلہ سے لگا ہے یا گولی یا گنڈاسے یا دونوں سے زخم لگا ہے معلوم کرنے کے لیے پوسٹ مارٹم کا ڈیڑھ صدی سے رواج ہو گیا ہے تعجب ہوتا ہے کہ بہت دنوں تک علماء نے اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں کوئی واضح حکم نہیں دیا، غالباً سب سے پہلے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں انفرادی طور پر یہ فتویٰ دیا، اس کے بعد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے زیادہ تحقیقی انداز میں اس پر لکھا، راقم الحروف کو علم نہیں کہ عرب علماء میں سے بھی کسی نے اس پر کچھ لکھا ہے یا نہیں، دو سال پہلے پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت پر ایک مضمون ڈاکٹر عبدالواحد صاحب استاذ جامعہ مدینہ لاہور کا مجلہ منہاج سہ ماہی میں شائع ہوا، یہ مضمون فقہ کے ساتھ جدید تحقیقی روشنی میں لکھا گیا ہے، ان تمام کو سامنے رکھ کر اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے، تاکہ اس مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی پڑ جائے۔

پوسٹ مارٹم کے معنی اور اس کا دائرۂ کار

پوسٹ مارٹم لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "موت کے بعد" کے ہیں۔ اس کا مقصد ہوتا ہے کہ موت کا سبب اور موت کی مدت معلوم کی جائے

پوسٹ مارٹم میں جسم کے ظاہری اعضاء کے علاوہ تین اندرونی حصے کو کھول کر ان کی جانچ ہوتی ہے، پیٹ، سینہ اور کھوپڑی۔

پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کو صرف اتنا ہی لکھنا نہیں ہوتا کہ کن کن اعضاء کو زخم لگا ہے، بلکہ یہ بھی لکھنا ہوتا ہے کہ فلاں فلاں اعضاء اور اندرونی حصہ صحیح حالت میں ہے یا نہیں

ظاہری معائنہ

پوسٹ مارٹم میں ظاہری معائنہ کے علاوہ اندرونی معائنہ بھی

أو خروج دم من أذنه أو عينه وجد فی محله (در مختار ج ۵ ص ۴۴۳)	ہو یا مار کا نشان ہو، یا گلا گھونٹنے کے آثار ہوں یا اس کے کان یا آنکھ سے خون نکلا ہو، اگر وہ کسی محلہ میں پائی جائے۔

اس صورت میں دیت یا قسامت کا حکم اس پر لگایا جائے گا، لیکن یہ علامتیں نہ ہوں تو پھر اس کے بارے میں صاحب در مختار کہتے ہیں:

ولاقسامة ولا دية فی میت لا أثربه لأنه لیس بقتیل، لأن القتیل عرفا هو فائت الحیاة بسبب مباشرة الحیّ و انه مات حتف أنفه و الغرامة تتبع فعل العبد او سیل دم من فمه أو أنفه أو دبره اوذکره لأن الدم یخرج منها عادة۔ (ص ۴۴۴)	کوئی قسامت، کوئی دیت اس میت کے لیے نہ ہوگی جس پر کسی قسم کی چوٹ کا نشان نہ ہو، کیونکہ یہ مقتول نہیں سمجھا جا سکتا، اس لیے کہ عام طور پر عرف میں مقتول وہ شخص قرار پاتا ہے جو کسی زندہ انسان کے فعل کی وجہ سے مرا ہو، جب ایسا نہ ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اپنی فطری موت سے مرا ہے، اور تاوان بندے کے فعل کے تابع ہے، یا خون اس کے منھ، ناک، یا پیشاب پاخانہ کی جگہ سے نکلا ہو، جہاں سے عادۃً خون نکلتا ہے تو بھی مقتول نہ سمجھا جائیگا۔

علامہ شامی اسی پر لکھتے ہیں:

هذا إذا نزل من الرأس فإن علا من الجوف فقتیل	یہ جب خون سر کی طرف آیا ہو، اگر پیٹ سے اوپر گیا ہو تو وہ قتیل سمجھا جائیگا۔

اسی طرح جنین کے بارے میں لکھتے ہیں:

وماتم خلقة الکبیر	اگر کوئی ساقط شدہ بچہ کسی محلہ یا بستی میں

وجد تام الخلقة سقط به أثر الضرب وجب القسامة والدية.

پایا، جس کی جسمانی ساخت مکمل ہو چکی ہو اور اس کے جسم پر چوٹ کے نشانات ہوں تو قسامت یا دیت واجب ہوگی

ان عبارتوں سے ایک بات معلوم ہوئی کہ وہ مقتول ہے یا اپنی فطری موت سے مرا ہے، یا اس کے جسم کا کوئی حصہ بے کار کر دیا گیا ہے، اس کا فیصلہ پوسٹ مارٹم کے ظاہری معائنہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے، فقہاء نے بھی اپنے وقت کے تجربے کے اعتبار سے یہ حکم لگایا ہے، اس لیے ظاہری معائنہ شرعی اعتبار سے صحیح بلکہ بعض صورتوں میں ضروری ہے۔
دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جب پوسٹ مارٹم سے ظاہری اسباب اس کے قتل ہونے کے مل جائیں اسی پر شرعی فیصلہ کر دیا جائے گا، دوسرے احتمالات کی وجہ سے اسے ملتوی نہیں کیا جائے گا، البتہ مسلمان عورت کے ظاہری معائنہ کے لیے بھی کسی غیر محرم مرد کو اس کی اجازت شرعاً نہیں دی جا سکتی، اس کے لیے کسی عورت کا ہونا ضروری ہے، اب رہا مرد کے جسم کا اندرونی معائنہ تو اس بارے میں شریعت نے انسانی جسم کو زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی جو احترام بخشا ہے اس کے پیش نظر اس کی اجازت دینا ذرا دشوار ہے، اس سلسلہ میں مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم نے جو باتیں لکھی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) مسلمان میت کی نعش کا احترام مثل زندہ کے احترام کے بلکہ بعض صورتوں میں اس سے بھی زیادہ لازم ہے۔

(۲) مسلمان میت اگر عورت ہے تو اس کے پردے اور ستر کے احکام زندگی کے احکام سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں، یعنی اس کا شوہر بھی اس کے ننگے جسم کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

(۳) عورت کی برہنہ میت غیر محرم کے ہاتھوں میں جانا تو درکنار اس کی نظر کے نیچے بھی نہیں جا سکتی

(۴) پوسٹ مارٹم کی بہت سی صورتیں شرعی ضرورت کے بغیر واقع ہوتی ہیں، جو

ناجائز ہیں، اور اگر کوئی خاص شرعی ضرورت کے ماتحت جائز بھی ہو جائیں تاہم اس میں شرعی احکام متعلقہ ستر و احترام میت کا التزام ضروری ہوگا، اس میں شبہ نہیں کہ میت کے جسم کو پھاڑنا چیرنا اس کے احترام کے منافی ہے، اور جب تک کوئی ایسی قوی وجہ نہ ہو کہ اس بے حرمتی کو نظر انداز کیا جاسکے چیر پھاڑ مباح نہیں ہو سکتی، اور احترام میت یہاں تک ہے کہ میدان جنگ میں کافروں کی نعش کے مُثلہ کرنے کی اجازت نہیں۔

(کفایۃ المفتی ج ۳ کتاب الجنائز)

فقہاء کی بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ کسی ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اس کے احترام کو عارضی طور پر نظر انداز کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم نے بھی اشارہ کیا ہے، اسی احترام کی وجہ سے حدیث نبوی میں مُثلہ کرنے سے منع کیا گیا ہے، فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

ولا تكسر عظام اليهود إذا وجدت في قبورهم، لأن حرمة عظامهم كحرمة عظام المسلم لانه حرم ايذاءه في حياته تجب صيانته عن الكسر بعد موته.	اگر یہود کی ہڈیاں قبرستان میں پائی جائیں تو ان کو توڑنے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے کہ ان ہڈیوں کا احترام بھی اسی طرح کیا جائے گا جیسے مسلمانوں کا، کیونکہ جب زندگی میں تکلیف پہونچانے کی اجازت نہیں ہے تو موت کے بعد بھی ضروری ہے

البتہ ضرورت شدیدہ کے وقت اس کی اجازت فقہاء نے دی ہے:

إمرأة ماتت واضطرب الولد في بطنها وغلب على رأيهم أنه حيّ يشق بطنها، اما لو ابتلع لؤلؤة او مالا لإنسان ثم مات ولا مال له ففي التجنيس أنه	اگر عورت مر جائے، اس کے پیٹ میں بچہ حرکت کر رہا ہو، اور غالب گمان ہو کہ وہ زندہ ہے تو اس کا پیٹ چاک کر کے لڑکے کو نکالا جائے گا، اور اگر وہ کسی کا موتی یا کسی کا مال نگل جائے تو تجنیس میں ہے کہ اس کا پیٹ چاک نہیں کیا جائیگا،

لایشق بطنه وفرق بينه	اوران دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے
وبين المسئلة الاولى أن	کہ پہلی صورت میں میت کے احترام کو
هناك ابطال حق الميت	اس لیے نظر انداز کیا گیا ہے کہ ایک زندہ
لصيانة حرمة الحيّ	انسان کی زندگی کی حفاظت مقصود ہے،
فيجوز وهناك ابطال	برخلاف دوسری صورت کے کہ اسمیں
حرمة الأعلى وهو	اعلیٰ انسان کی حرمت کو پامال کر کے ادنیٰ
الادنى لصيانة الأدنى	سی مال کی حفاظت مقصود ہے۔ اس
وهو المال بناءً على	بنا پر کہ مردہ کا احترام زندہ کے احترام
أن حرمة الميت كحرمة	کے مثل ہے تو اگر وہ زندگی میں اسے
الحي ولا يشق بطنه	نگل جاتا تو اس کا پیٹ چاک نہیں
حيا ولو ابتلع ذلك	کیا جاتا تو پھر مرنے کے بعد بھی نہیں
...	کیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں امام محمد سے بھی یہی منقول ہے، مگر بعض فقہاء دوسری صورت میں بھی پیٹ چاک کرنے کو جائز کہتے ہیں، جن میں ابن ہمام اور جرجانی وغیرہ ہیں، اس مسئلہ کے سلسلہ میں اختلاف اس اصول کی بنا پر ہے کہ الضرورات تبيح المحذورات (ضرورت شدید کی وجہ سے ممنوع چیزیں مباح ہو جاتی ہیں) اب جن حضرات نے پہلی صورت کو ضرورت شدیدہ سمجھا ہے انھوں نے اس میں اجازت دی ہے، اور دوسری صورت کو انھوں نے نادر الوقوع اور جان و مال کے احترام میں موازنہ کر کے اسے ضرورت شدیدہ قرار نہیں دیا ہے، دوسرے حضرات نے دوسری صورت کو بھی ضرورت شدیدہ میں داخل کر دیا، اس لیے ضرورت کے اندازہ میں فرق ہوا ہے، اور فقہ کا اصول ہے کہ ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها۔ (جو چیز ضرورت شدیدہ کی بنا پر جائز کی گئی ہے اسکا استعمال ضرورت کے بقدر ہی ہوگا۔

اس لیے اگر ظاہری معائنہ سے ہی قتل یا زخم کا پتہ مل جائے تو اندرونی معائنہ

کی ضرورت نہیں ہے۔

خلاصہ اوپر کی تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ پوسٹ مارٹم دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے: (۱) ظاہری جسم کا معائنہ (۲) اندرونی جسم کا معائنہ۔ ظاہری معائنہ اگر ستر عورت کا لحاظ کر کے کیا جائے تو شرعی نقطۂ نظر سے جائز ہے، اندرونی معائنہ شدید شرعی ضرورت کی بنا پر کیا جا سکتا ہے، وہ بھی ضرورت بھر۔

عورت کے جسم کا ظاہری معائنہ ہو یا اندرونی، مرد اسے نہیں کر سکتا، اس کو عورت ہی کر سکتی ہے، جہاں یہ ممکن نہ ہو اور ضرورت شدیدہ ہو تو اس کی اجازت دی جا سکتی ہے مگر بقدر ضرورت۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تفریق

یعنی مرد یا عورت کے کسی عیب یا ظلم و زیادتی یا کسی مجبوری کے تحت قاضی کے ذریعہ علیحدگی۔

اسلامی شریعت نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں، اور مرد کے ذمے اس کے جو فرائض مقرر کئے ہیں اگر ان میں وہ کوتاہی کرتا ہے، یا اس کی ادائیگی کی اس میں صلاحیت نہیں ہے، ایسی صورت میں اگر عورت یہ چاہتی ہے کہ وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرے، تو خلع کے علاوہ دونوں میں علیحدگی کی بعض اور صورتیں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر شوہر میں عورت کی جنسی خواہش پوری کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، اس کی کئی صورتیں ہیں، مثلاً وہ پیدائشی طور پر نامرد ہے، یا اس نے اپنی قوت غلط کاری کی وجہ سے ضائع کر دی ہے، یا مقطوع الذکر ہے، یا اس میں جنسی خواہش پوری کرنے کی صلاحیت تو ہے مگر وہ کسی ایسے مہلک یا گھناؤنے مرض میں مبتلا ہے، جس کی وجہ سے عورت اس کو پسند نہیں کرتی، مثلاً شوہر بالکل پاگل ہو گیا ہے، یا اس کو کوڑھ یا برص ہے، یا مرد کو سوزاک یا آتشک ہے، یا اس میں کوئی عیب تو نہیں ہے، مگر اس سے بیوی کی معاشی یا جنسی ضرورت پوری نہیں ہو رہی ہے، مثلاً کسی کا شوہر لاپتہ ہے اور بیوی کی کھوج خبر نہیں لے رہا ہے یا وہ موجود تو ہے مگر عورت کے روٹی کپڑے کا خیال نہیں کرتا، یا اتنا غریب ہے کہ اس میں نان نفقے کی صلاحیت ہی نہیں ہے تو ان صورتوں میں اسلامی شریعت نے عورت کو یہ اختیار دیا ہے کہ اگر وہ ایسے شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو اسلامی حکومت کے قاضی کے یہاں درخواست دے، اور جہاں یہ صورت موجود نہ ہو، وہاں وہ چند ذمے دار اور دیندار مسلمانوں یعنی کسی اسلامی جماعت یا شرعی پنچایت کے سامنے اپنا معاملہ پیش کر کے رہائی حاصل

کرلے، اسی طرح اگر عورت کو جنون ہو جائے، یا اس کے اندام نہانی میں ایسا مرض ہو، جس سے مباشرت نہ کی جا سکتی ہو، یا ایسا متعدی مرض ہو، مثلاً آتشک سوزاک وغیرہ، جس سے مرد کے اس مرض میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو مرد قاضی کے پاس یا ذمے دار اور دیندار مسلمانوں کے پاس درخواست دے کر اس سے گلو خلاصی کر سکتا ہے۔

بعض اصطلاحیں اس بیان میں بعض اصطلاحیں آئیں گی، جن کی تشریح یہاں کر دی جاتی ہے، تاکہ جب ان کا ذکر آئے تو سمجھنے میں دقّت نہ ہو۔

عِنّین وہ شخص جو عضو مخصوص ہونے کے باوجود جماع پر قادر نہ ہو، خواہ یہ حالت پیدائشی ہو یا کسی مرض کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو یا کمزوری کی وجہ سے یا بڑھاپے کی وجہ سے۔ اگر کوئی ایسا شخص ہے جو بعض عورتوں سے جماع کرنے پر قادر ہو، اور بعض سے نہیں، تو جن سے وہ جماع نہیں کر سکتا، ان کے حق میں وہ عنّین سمجھا جائے گا۔

مجبوب وہ شخص جس کا عضو مخصوص موجود ہی نہ ہو، یا اس نے خود کٹوا دیا ہو۔

متعنّت متعنّت کے معنی ہیں "ظلم کرنے والا" اور شریعت میں اس کو متعنّت کہتے ہیں جو قدرت کے باوجود عورت کے روٹی، کپڑے اور ضروریات کا خیال نہ کرتا ہو۔

مفقود الخبر وہ شوہر جو شادی کرنے کے بعد بالکل لاپتہ ہو گیا ہو نہ اس کی زندگی کا علم ہو نہ موت کا۔ مفقود کے لفظی معنی ہیں وہ چیز جو گم ہو گئی ہو اور ملتی ہی نہ ہو۔

غیر مفقود الخبر وہ شوہر جو لاپتہ نہ ہو، مگر بیوی کے پاس نہ آتا ہو اور نہ اس کے نان نفقے کی خبر لیتا ہو۔

وہ عیوب جن کی بنا پر فسخ نکاح جائز ہے عام طور پر جن عیوب کی بنا پر خیار فسخ وعدم خیار فسخ کا حکم ائمہ لگاتے ہیں، ان کی تعداد تیرہ ۱۳ تک پہونچتی ہے۔

وہ عیوب جو دونوں میں مشترک ہیں (۱) جذام (کوڑھ) (۲) برص (سفید داغ) (۳) جنون (پاگل پن) (۴) اور عَذیطہ (قضائے شہوت کے

وقت پاخانہ ہو جانا) یہ عیوب عورت اور مرد دونوں کو ہو سکتے ہیں، اس میں خنثیٰ مشکل کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔

وہ عیوب جو مردوں کے لئے خاص ہیں

(۱) اَلْجُبُّ (جس کے آلہ تناسل نہ ہو، یا کٹا ہوا ہو (۲) اَلْعِنَّۃ (نامردی) (۳) خصی یعنی جس کی دونوں کوڑیاں نہ ہوں (۴) اَلْمُعْتَرَضْ یعنی جس کا آلہ تناسل کسی مرض یا کسی غلط کاری کی وجہ سے کھڑا نہ ہو۔

وہ عیوب جو عورتوں کے لئے خاص ہیں

(۱) اَلرَّتَقُ یعنی عورت کی فرج اتنی تنگ ہو کہ اس سے جماع ممکن نہ ہو، کسی غدود کی وجہ سے یا ہڈی کی وجہ سے۔ (۲) قَرَن، جس میں عورت کی شرمگاہ میں ہڈی نکل آتی ہے جس سے جماع ممکن نہیں ہوتا (۳) عَفَل، یہ بھی اسی طرح کا ایک مرض ہوتا ہے، جس میں شرمگاہ میں گوشت آجاتا ہے، (۴) اِفْضَاء یعنی آلہ تناسل کا راستہ پیشاب یا پاخانہ کے راستہ سے مل جائے (۵) بَخَر یعنی شرمگاہ میں بدبو کا پیدا ہو جانا۔ عنّین اور مجبوب اور خصی سے فسخ نکاح کے سلسلے میں تو ائمہ اربعہ متفق الرائے ہیں[۱]، لیکن اور چیزوں کے بارے میں ان کے درمیان اختلاف ہے۔

امام ابو حنیفہ اور امام یوسف رحمۃ اللہ علیہما کی رائے یہ ہے کہ اگر بیوی میں مذکورہ امراض میں سے کوئی مرض ہے، تو اس کی وجہ سے مرد کو نکاح فسخ کرانے کا اختیار نہیں ہے، کیونکہ جب اس کو طلاق کا اختیار ہے تو اس کو کیا ضرورت ہے، اسی طرح اگر مرد میں کوئی عیب یا مرض مثلاً جنون، جذام یا برص وغیرہ ہے تو ان کی رائے میں عورت کو بھی فسخ نکاح کا اختیار نہیں ہے، چاہے نکاح سے پہلے تھا یا بعد میں پیدا ہوا ہو بشرطیکہ اسے پہلے علم نہ رہا ہو، یا وہ اس عیب کے باوجود راضی ہو چکی ہو، البتہ اگر نامرد ہے یا اس کا آلہ تناسل ہے ہی نہیں تو عورت کو فسخ کا حق ہے، مگر امام ابو حنیفہؒ کے ممتاز شاگرد امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جذام، برص اور جنون جیسے امراض میں بھی عورت کو یہ حق ہے کہ وہ اپنا نکاح فسخ کرالے، کیونکہ جس طرح کی تکلیف اس کو مرد کی نامردی اور مجبوب ہونے

---

[۱] المغنی لابن قدامہ ج ۶ ص ۶۵ المیزان شعرانی۔

کی صورت میں تھی اور اس کو فسخِ نکاح کی اجازت دی گئی ہے، اسی طرح کی تکلیف اس کو ان امراض کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے تو جب سبب مشترک ہے تو پھر ان صورتوں میں بھی کیوں نہ فسخ نکاح کا اختیار دیا جائے۔ امام محمدؒ کے الفاظ صاحب ہدایہ کے بیان کے مطابق یہ ہیں:۔

لَهَا الْخِيَارُ دَفْعًا لِلضَّرَرِ عَنْهَا كَمَا فِي الْجُبِّ وَالْعِنَّةِ۔ (ج ۲، ص ۴۰۲)	ان امراض میں اس کی تکلیف رفع کرنے کے لئے فسخ نکاح کا حق اسی طرح ہے جس طرح شوہر کے آلۂ تناسل نہ ہونے یا نامرد ہونے کی صورت میں ہے۔

البتہ مرد کو یہ حق وہ بھی اس لئے نہیں دیتے کہ اس کو ہر وقت طلاق دینے کا اختیار ہے، اور اس میں اس کے لئے کوئی قانونی دقت بھی نہیں ہے۔ (بخلاف جانبہ لأنہ متمکن من رفع الضرر بالطلاق۔ ہدایہ)

امام شافعیؒ برص، جنون اور ایسے تمام امراض میں جو مانعِ مباشرت ہوں، ان میں تفریق کی اجازت دیتے ہیں اور بقیہ امراض میں نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ عنین[1] اور مجبوب[2] کے علاوہ مفقود[3]، متعنت[4]، مجنون[5]، مجذوم[6] اور مبروص سے بھی فسخ نکاح کی اجازت دیتے ہیں اور ایسے امراض میں جو متعدی اور گھناؤنے ہوں، مثلاً آتشک، سوزاک وغیرہ، یا عورت کی ایسی[9] خرابی ہو جو مانع مباشرت ہو خیار فسخ کی اجازت دیتے ہیں، جیسے قرن، فتق وغیرہ، گویا وہ مذکورہ بالا تمام امراض میں وہ فسخ نکاح کی اجازت دیتے ہیں۔ [1]

اسی طرح امام احمد بھی ان عیوب کی بنا پر خیار فسخ کی اجازت اس شرط کے ساتھ دیتے ہیں کہ مرد یا عورت کو نکاح سے پہلے ان کا علم نہ ہو، اگر علم کے باوجود انھوں نے نکاح کر لیا ہے تو فسخ کی اجازت نہیں ہے، اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ مطلقاً۔ چاہے اس کا علم رہا ہو یا نہ رہا ہو خیار فسخ کی اجازت دیتے ہیں۔ [2]

---

[2] المیزان شعرانی اور رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمہ والمغنی لابن قدامہ، ج ۶ ص ۵۲ - ۶۵۱۔

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۴ ص ۱۸۱۔

اوپر ائمہ اربعہ کے مسلک کا جو ذکر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کتنی وسعت ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مرد کو عورت کے کسی عیب کی بنا پر خیار فسخ کی اجازت اس لئے نہیں دیتے کہ وہ چاہے تو طلاق دے سکتا ہے، لیکن عورت کو مرد کے دو عیب یا تین مرض کی بنا پر یہ اختیار دیتے ہیں، ایک عنین ہونا، دوسرے مجبوب ہونا، تیسرے خصی ہونا، مگر ان کے شاگرد امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بعض آثار صحابہ کی بنا پر جنون، برص اور جذام کی صورت میں بھی عورت کو فسخ نکاح کی اجازت دیتے ہیں، اسی طرح ان کے بعد بعض دوسرے ائمہ احناف نے بھی اپنے اپنے زمانے میں مصلحت و ضرورت کے ماتحت ہمیشہ دوسرے ائمہ کے مسلک پر فتویٰ دیا ہے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ائمہ ثلاثہ تمام عیوب میں خیارِ فسخ نکاح کے قائل ہیں[1] اور امام ابو حنیفہؒ تین امراض جُبؒ، عِنّہؒ اور اختصاء کے علاوہ کسی مرض میں خیار یا فسخ کے قائل نہیں ہیں، خواہ وہ مرض نکاح کے بعد ہو یا پہلے سے موجود ہو، ائمہ ثلاثہ حضرت عمرؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ اور حضرت جابرؓ کے آثار و اقوال کی بنا پر اس کے قائل ہیں[2] اور امام ابو حنیفہؒ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے اثر کی بنا پر اس کے قائل نہیں، حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ "لا ترد الحرۃ بعیب"، آزاد عورت کسی عیب کی وجہ سے لوٹائی نہیں جا سکتی۔ اسی طرح حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ "لا ینفسخ النکاح بعیب"۔ کسی عیب کی وجہ سے نکاح فسخ نہیں ہو سکتا، ان کا اصول ہے کہ "النکاح لا یقبل الفسخ بعد التمام" البتہ نکاح کی تکمیل سے پہلے اسے خیار رہے۔

بظاہر امام ابو حنیفہؒ کے مسلک میں عورت کے لئے شدید تکلیف نظر آتی ہے، اس لئے کہ شدید تکلیف کے باوجود اس کو شوہر سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، لیکن ذرا نظر غائر

---

[1] الفقہ علی المذاہب الأربعۃ ج ۴ ص ۱۸۱، المالکیۃ قالوا العیوب التی یفسخ بہا النکاح ثلاثۃ عشر عیباً۔ آگے ذکر آئے گا کہ فسخ اور طلاق میں کیا فرق ہے، امام ابو حنیفہ تین امراض کے علاوہ کسی میں فسخ کے قائل نہیں ہیں، اس کی وجہ کا ذکر آگے آرہا ہے۔

[2] ان خیار الفسخ یثبت لکل واحد من الزوجین بعیب یجدہ فی صاحبہ فی الجملۃ۔ (المغنی ج ۶ ص ۶۵۰)

سے دیکھا جائے تو امام ابو حنیفہؒ کا مسلک دینی و اخلاقی لحاظ سے انتہائی فطری نظر آئے گا، اس لئے کہ یہ میاں بیوی کا تعلق ایک دو دن کا تعلق نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا بندھن ہے جس میں پوری زندگی دونوں بندھے رہنے کا اقرار کرتے ہیں "ھن لباس لکم و انتم لباس لھن وعاشروھن بالمعروف"۔ وہ ایک دوسرے کی عزت و عصمت کے پردہ پوش ہوتے ہیں، اس مضبوط اور پاکیزہ رشتہ کے احترام کا تقاضا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی خوشی و رنج اور صحت و مرض میں نہ صرف ساتھ رہیں بلکہ اپنے جسم و جان کی بازی لگا کر ایک دوسرے کی مدد کریں، ذراسی تکلیف یا مصیبت میں ایک دوسرے سے کٹنے کی کوشش نہ کریں، اسی بنا پر طلاق کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابغض المباحات فرمایا ہے، یعنی مباح چیزوں اور کاموں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ کام۔

نکاح کے ان احکام کا مخاطب اہلِ ایمان ہیں اور یہ تعلق جو ان کے دین کا تقاضا ہے، تو پھر کسی میں ذراسا عیب پیدا ہو جانے کی صورت میں علیحدگی اختیار کرنا یقیناً قابلِ مذمت ہے جیسا کہ آج کل مغربی ملکوں میں ہے کہ اگر کسی کے پسینے میں یا دانت میں بدبو پیدا ہو گئی یا شوہر نے کتے کو بغل میں لٹانے سے منع کر دیا تو عورت کی طرف سے طلاق کا مطالبہ ہونے لگتا ہے، اسی طرح عورت کی ذراسی خرابی کی بنا پر اس سے چھٹکارا حاصل کر لینا فیشن ہو گیا ہے۔

البتہ ان امراض میں جن میں مرد حق زوجیت ادا ہی نہ کر سکے یا عورت کا رکھنا اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے تو تو پھر مجبوراً عورت کو خلع کے ذریعہ فسخ نکاح کی اور مرد کو طلاق کے ذریعہ علیحدگی کی اجازت ہے، پھر اس میں بھی قرآن کی ہدایت "فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ"۔ کی روح باقی رہے، یعنی ان کو علاج کا موقع دیا جائے، اگر اس کا مرض درست ہو جائے تو پھر ان کو فسخ نکاح کی اجازت نہیں، البتہ نہ ہونے کی صورت میں اجازت ہے، اگر اس کو نکاح سے پہلے عیب کا علم تھا اور عورت راضی ہو گئی تو اب اسے فسخ کی اجازت نہیں ہے، اس پر تقریباً تمام ائمہ متفق ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ نے یہ رائے قرآن کی عمومی ہدایت اور آثار صحابہ کی روشنی میں قائم کی ہے مگر جن صحابہ نے اس کے خلاف رائے قائم کی ہے جسے ائمہ ثلاثہ نے اختیار کیا ہے، بعض حالات میں اس کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، شیخ ابن قدامہ اس کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ایسا عیب جو جماع میں مانع ہو، اس میں خیار ثابت ہے، جیسے جُب اور عنہ، پھر اس سوال کا کہ برص، جذام اور جنون تو مانع جماع نہیں ہیں، پھر آپ ان عیوب میں کیوں فسخ کا اختیار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ امراض مانع مباشرت اس طور پر ہیں کہ مجذوم یا مبروص و مجنون کے مرض سے آدمی سے فطری طور پر نفرت کرتا ہے اور اس کے قریب جانا اور اس کو چھونا پسند نہیں کرتا۔

ویخاف التعدی الی نفسہ ونسلہ والمجنون یخاف منہ الجنایۃ فصار کالمانع الحسی۔

آدمی اپنی ذات اور اپنی نسل میں اس کے متعدی ہونے سے ڈرتا ہے، اسی طرح پاگل سے بھی ڈرتا ہے، نہ جانے وہ کیا حرکت کر بیٹھے تو یہ چیزیں حسّی طور پر جماع میں مانع ہیں۔

پھر آگے مزید تفصیل کرتے ہوتے لکھتے ہیں:۔

وانما اختص الفسخ بھذہ العیوب لانھا تمنع الاستمتاع المقصود بالنکاح فان الجذام والبرص یثیران نفرۃ فی النفس تمنع قربانہ ویخشی تعدیہ الی النفس والنسل فیمنع الاستمتاع والجنون یثیر نفرۃ ویخشی ضررہ والجب والرتق[1] یتعذر معہ الوطی والفتق یمنع لذۃ الوطی وفائدتہ وکذالک العفل علی قول من فسرہ بالرغوۃ (ص۶۵۲)

فسخ ان عیوب کے ساتھ اس لئے مخصوص ہے کہ نکاح کا بنیادی مقصد عورت سے قضائے شہوت کا پورا کرنا ہوتا ہے اور یہ عیوب اس میں مانع بنتے ہیں۔ مثلاً جذام اور برص سے طبیعت میں فطری طور پر ایک تنفر ہوتا ہے جو ان کے قریب جانے سے روکتا ہے اور اپنی ذات اور نسل میں ان کے متعدی ہونے کا خوف بھی لاحق رہتا ہے تو آدمی ایسی عورت سے قضائے شہوت سے رکتا ہے، اسی طرح مجنون شخص سے ایک تنفر ہوتا ہے اور اس سے اذیت پہونچنے کا خوف لاحق رہتا ہے اسی طرح عضو تناسل کا نہ ہونا اور عورتوں کی شرمگاہ کے امراض بھی قضائے شہوت میں مانع ہوتے ہیں۔

---

[1] الرتق أن یکون الفرج مسدودا یعنی أن یکون ملتصقا لا یدخل الذکر فیہ والقرن والعفل لحم ینبت فی الفرج فیسد فھما فی معنی الرتق الا انھما نوع آخر واما الفتق فھو انخراق ما بین مجری البول ومجری المنی (ج ۶ ص۶۵۱)

عورت کے امراض کے سلسلہ میں فسخ نکاح کی بات اس لئے وزنی نہیں ہے کہ مرد کو تو ہر وقت طلاق دینے کا حق ہوتا ہے، جیساکہ امام صاحب فرماتے ہیں، پھر ان کے لئے فسخ کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی، زیادہ سے زیادہ اس کی اہمیت اس حیثیت سے ہے کہ مرد کو طلاق کا اخلاقی جواز مل جاتا ہے اور عنداللہ اور عندالناس قابل ملامت نہیں ہوسکتا۔

البتہ مردوں کے ان امراض کے بارے میں جنھیں قروح فروج کہتے ہیں، عورت کو فسخ کا حق ملنا چاہیئے، جیساکہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مجبوب اور عنین کے علاوہ جذام اور برص میں تفریق کی اجازت دی ہے تو سوزاک اور آتشک جو اس سے زیادہ متعدی اور مہلک امراض ہیں، اسی طرح دوسرے نئے امراض ہیں، ان میں علماء کو فسخ نکاح کی اجازت کے بارے میں سوچنا چاہیئے، البتہ جس طرح عنین کے علاج کے لئے ایک مدت مقرر کی جاتی ہے، اسی طرح ان امراض کے ماہر ڈاکٹروں کے مشورہ سے ان کے لئے بھی ایک مدت مقرر کرنی چاہیئے، اگر اس مدت میں اچھا ہو جائے تو پھر فسخ کی اجازت نہیں دی جائے گی، ورنہ پھر توالد و تناسل ہی سے وہ محروم رہے گا، یا پھر جو اولاد ہوگی وہ اپاہج ہوگی۔ شیخ محمد بن قدامہ متوفی ۶۲۰ھ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

وقال ابو بکر و ابو حفص اذا کان	شیخ ابوبکر اور شیخ حفص کی رائے یہ ہے کہ اگر
احدهما لا یستمسك بوله ولا	ان میں سے کسی کا پیشاب یا پاخانہ رکتا ہی نہ
خلاءه فللآخر الخيار وقال	ہو تو دوسرے کو خیار فسخ ہے، شیخ ابوالخطاب
ابو الخطاب ويتخرج على ذالك	نے اسی پر اس شخص کو قیاس کیا ہے، جس کو
من به الباسور والناسور	بواسیر یا ناسور ہو جائے، اور عورت کی شرمگاہ
والقروح السيالة فى الفروج	میں جو رسنے والے زخم ہو جاتے ہیں اس سے
لأنها تثير نفرة و تتعدى نجاستها	فطری طور پر نفرت پیدا ہوتی ہے، اور ان کی
وتسمى من لا يحبس نجوها الشريج	نجاست متعدی ہوتی ہے ایسے آدمی کو
ومن لا يحبس بولها المشولة و	شریج کہتے ہیں اور جس کا پیشاب نہ رکتا ہو،
مثلها من الرجال الأفلين	اسے مشولہ کہتے ہیں اور مردوں میں یہ امراض
(ج ۶ ص ۶۵۲)	ہوں تو اسے آفلین کہتے ہیں ۔

اس تفصیل سے قدرے آتشک اور سوزاک جیسے گھناؤنے امراض پر روشنی پڑتی ہے، یہ ایسے امراض ہیں کہ اگر مرد کو ہو جاتے اور عورت سے جماع کرے تو اس کو ہو جاتے اور اگر عورت کو ہو اور مرد اس سے جماع کرے تو اس کو ہو جاتے، پھر ایسے آدمی کو یا تو اولاد ہوگی ہی نہیں، اور اگر ہوگی تو اپاہج۔ اس لئے اگر یہ مرض علاج سے اچھا نہیں ہوتا ہے تو عورت کو فسخ نکاح کی اور مرد کو طلاق دینے کی اجازت شریعت کے منشائے نکاح کے عین مطابق ہے۔

عیوب کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے پیش نظر احترامِ زوجیت کا جو پہلو تھا، اسے علامہ عبدالرحمٰن الجزیری مرحوم نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے:۔

وهذه الأحكام انما هي للمؤمنين الذين يعملون بدينهم فإذا أهمل أحدهما دينه كان هو الملوم وكان من اللازم الحتم ان تنظر الى قدسية علاقة الزوجية واحترامها متى وقعت على أى حال ومع ذالك فإذا فرض أن زوجين عاشا معا فى أدل أمرهما سليمين ورزقا بأولاد ثم نزلت بأحدهما مصيبة مرض أو عيب كهذا فهل من المعقول أن يفارقه السليم رغم أنفه ؟ أظن أن الجواب لا، وما ذالك الا لإحترام علاقة الزوجية وهى حاصلة بالعقد لا

یہ احکام ان مومنین کے لئے ہیں جو شریعت پر عمل پیرا ہوں، اگر میاں بیوی میں سے کوئی دین سے غفلت برتتا ہو تو وہ قابلِ ملامت ہے، اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ رشتۂ زوجیت کے احترام و تقدس کو مدِ نظر رکھا جائے، خواہ وہ کسی حال میں واقع ہو، نیز اس کے ساتھ اگر فرض کر لیا جائے کہ دونوں میاں بیوی نے شروع میں صحیح و سلامت زندگی گذاری، اور اولاد کی نعمت بھی پائی پھر ان دونوں میں سے کوئی اس قسم کے کسی مرض یا عیب میں مبتلا ہو گیا تو کیا یہ معقول بات ہوگی کہ شوہر یا بیوی اس حالت میں اس سے مفارقت اختیار کرلے ؟ میرے خیال میں جواب نفی میں ہوگا اور ظاہر ہے کہ ایسا صرف رشتۂ زوجیت کے احترام کی وجہ سے ہے تو معلوم

محالہ ۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۴ ص ۱۸۱) ہوا کہ عقد کا باقی رہنا یہ مقصود اصلی ہے۔

پھر انھوں نے لکھا ہے کہ اگر کوئی سوال کرے کہ احترام زوجیت کا اگر یہی مطلب ہے تو پھر طلاق کے ذریعہ بھی عورت کو علیحدہ نہیں کرنا چاہیئے، اس سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :-

ان الطلاق قد شرع فی الاسلام لاغراض اجتماعیۃ ھامۃ ضروریۃ ھامۃ وقد یکون واجبا کما اذا قام بین الزوجین شقاق تقطعت بہ علائق الزوجیۃ وحلت محلھا الکراھۃ والنفرۃ ولم یتمکن المصلحون من ازالتھا فان الدواء لمثل ھذہ الحالۃ الطلاق والا انقلبت الزوجیۃ الی عکس الغرض المطلوب فانھا ما شرعت الا للجمع بین صدیقین تنشأ بینھما مودۃ ورحمۃ لا للجمع بین عدوین لا یستطیع أحدھما ان ینظر الی الآخر۔ (ایضاً ص ۱۸۱)

اسلام میں بہت سے اہم اجتماعی اور معاشرتی اغراض کے لئے طلاق کی اجازت دی گئی ہے اور وہ کبھی واجب ہو جاتی ہے، مثلاً جب میاں بیوی میں دشمنی پیدا ہو جائے، جس سے زوجیت کے تعلقات منقطع ہو جائیں دونوں کے دلوں میں کراہت و نفرت گھر کر لے، اور صلح کرنے والے بھی اس نفرت کا ازالہ نہ کر سکیں تو ایسے حالات میں طلاق ہی کارگر ہو سکتی ہے ورنہ زوجیت کا جو مقصد ہے اس کا الٹا نتیجہ برآمد ہوگا، اس لئے کہ رشتۂ زوجیت کی اہمیت صرف اس لئے ہے کہ اس کے ذریعہ دو دوست اکٹھے ہوں اور ان کے درمیان انس و محبت کی نشو و نما ہو نہ کہ اس کے ذریعہ دو دشمن کو جمع کر دیا جائے جو ایک دوسرے کی طرف دیکھنا گوارا نہ کرتے ہوں،

نفقہ نہ ادا کرنے کی صورت میں فسخ

علمائے احناف نے اس شوہر کے بارے میں جو اپنی بیوی کے نفقے پر بیماری پیری یا غربت کی وجہ سے قادر نہیں ہے، لکھا ہے کہ ایسے شوہر کی بیوی کو خیار فسخ نہیں دیا جا سکتا، عورت کو چاہیئے کہ وہ مرد کے نام سے قرض لے کر اپنا نان نفقہ پورا کرے، اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے

شرح وقایہ کے مصنف لکھتے ہیں :-

وَاَصْحَابُنَا لَمَّا شَاهَدُوْا ضَرُوْرَةَ النَّاسِ اِلَى التَّفْرِيْقِ لِاَنَّ رَفْعَ الْحَاجَةِ الدَّائِمَةِ لَا يَتَيَسَّرُ بِالْاِسْتِدَانَةِ وَالظَّاهِرُ لَا تَجِدُ مَنْ يُّقْرِضُهَا وَغِنَى الزَّوْجِ فِي الْحَالِ اَمْرٌ مُتَوَهَّمٌ اِسْتَحْسَنُوْا اَنْ يَنْصِبَ الْقَاضِيَ تَابِعًا شَافِعِيَّ الْمَذْهَبِ يفرق مِنْهُمَا ۔ (ج ۲ ص ۱۷۴)	فقہائے احناف نے جب دیکھا کہ نفقے کی دائمی ضرورت محض قرض کے بھروسے پر پوری نہیں ہوسکتی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ عورت قرض کے لئے ایسے آدمی کو کہاں تلاش کرتی پھرے گی جو اس کو قرض دیتا رہے اور پھر اس صورت میں جب شوہر کی خوش حالی اور ادائیگی مشتبہ ہو تو ایسی صورت میں انھوں نے یہ بہتر سمجھا کہ جہاں حنفی قاضی ہو وہاں وہ ایک شافعی المذہب قاضی مقرر کرکے اس معاملے کو اس کے سپرد کردے اور دونوں میں تفریق کرا دے۔

اسی طرح علامہ شامی وغیرہ نے مفقود الخبر کے بارے میں امام مالکؒ کے مسلک پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے، گویا یہ مسئلہ اب فقہ حنفی کا جز بن گیا ہے۔

اسی ضرورت کی بنا پر سابق ریاست بھوپال کے شعبۂ قضا کی طرف سے علماء کی نگرانی میں ۱۹۳۱ء میں تحفظ حقوق زوجین کے نام سے ایک ضابطہ شائع کیا گیا جس میں حنفی مسلک کی رعایت کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک کی روشنی میں عورت کو شوہر کے ظلم، حق تلفی اور مرض وعیب سے بچانے کے لئے حق تفریق دیا گیا۔

اسی ضرورت کے پیش نظر مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نگرانی میں مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم اور دوسرے ممتاز علماء کی مدد سے چند رسالے مرتب کرائے جن میں فقہ حنفی کے بجائے دوسرے ائمہ کے مسلک کے مطابق عورت و مرد کے درمیان تفریق کی اجازت دی گئی ہے یہ رسالے "الحلیۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ" المختارات فی مھمات التفریق والخیارات" المرقومات للمظلومات کے نام سے چھپ گئے ہیں، اور پورے ہندوستان میں اس پر عمل درآمد

ہے۔

غرض کہنا یہ ہے کہ ضرورت شدیدہ کے وقت عورت کو جنسی اور معاشی تکلیف اور ذہنی کوفت سے بچانے کے لئے علمائے متاخرین احناف نے ہمیشہ دوسرے ائمہ کے مسلک کے مطابق فتوے دیئے ہیں اور ان پر عمل درآمد کیا ہے۔ اس لئے جن امراض کی بنا پر امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے تفریق اور خیار فسخ کی اجازت دی ہے، ان پر بھی علماء کو غور کرنا چاہیئے اگر جذام اور برص کی بنا پر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے تفریق کی اجازت دی ہے، تو پھر جب مردان سے بھی اہم امراض مثلاً آتشک اور سوزاک میں مبتلا ہو تو کیوں نہ تفریق کی اجازت دی جائے۔ قروح فرج یعنی شرمگاہ کے زخم اور اس کی خرابی کا جو ذکر فقہاء کرتے ہیں تو اس کو عمومیت ہی پر محمول کرنا چاہیئے۔ بشرطیکہ تفریق کے شرائط پائے جائیں، اور یہ امراض لاعلاج ہو جائیں، البتہ اگر علاج سے یہ ٹھیک ہو جائیں تو پھر عورت کو خیار فسخ نہ ہونا چاہیئے، تفصیل آگے آرہی ہے' البتہ عورت کے عیوب میں جیسا کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں۔ مرد کو خیار فسخ کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ اس کو جب طلاق کا اختیار شریعت نے دے رکھا ہے تو اس کے لئے مزید کوئی صورت پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب ہم الحلیۃ الناجزہ، ضابطہ حقوق زوجین اور فقہ کی دوسری کتابوں سے تفریق اور خیار فسخ کے اختیار کی مختصراً تفصیل کرتے ہیں۔

تفویض طلاق

اوپر تفویض طلاق کا ذکر مختصراً آچکا ہے، الحلیۃ الناجزہ کے مرتبین نے فقہ حنفی کی روشنی میں عورت کو شوہر کے ظلم، زیادتی اور حق تلفی سے بچانے کی ایک صورت اسی تفویض طلاق کے ذریعے پیدا کی ہے، یعنی نکاح کے پہلے عورت یا اس کا ولی یا وکیل، شوہر سے یا اس کے ولی یا وکیل سے کم سے کم دو گواہوں کی موجودگی میں ایک ایسی تحریر لے لے جس میں یہ ذکر ہو کہ اگر مذکورۂ بالا شرعی حقوق میں سے کسی حق کو میں نہ ادا کروں یا اپنے فرائض میں کوتاہی کروں تو عورت کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنے اوپر ایک طلاق بائن واقع کر لے، اور میرے عقد نکاح سے نکل جائے، اس تحریر میں کچھ موٹے موٹے شرعی حقوق و فرائض کا ذکر کر دیا جائے۔

اس تحریر سے یہ فائدہ ہوگا کہ عورت پر جب زیادتی ہوگی یا کوئی شدید دینی و معاشرتی ضرورت

مجبور کرے گی تو وہ طلاق لے کر مرد سے علیحدہ ہو جائے گی، لیکن جس طرح طلاق کا اختیار ہونے کی وجہ سے مرد کی زیادتی کا خطرہ ہے، اسی طرح جب اس سے کمزور جنس یعنی عورت کو یہ اختیار سپرد کر دیا جائے گا، تو بڑے فتنہ کا بھی خوف ہے، اس لئے علماء نے اس کے لئے چند شرطیں لگا دی ہیں۔

۱۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ اس تحریر میں ایسے الفاظ نہ لکھے جائیں، جن سے عورت کو مطلق اختیار مل جائے کہ وہ جب چاہے اور جس وقت چاہے طلاق دے دے، بلکہ اس کے لئے چند شرائط مقرر کر دیئے جائیں، مثلاً تحریر میں اس کو اختیار ہوگا کہ جب چاہے کا لفظ نہ لکھا جائے بلکہ کسی وقت یا اسی وقت چاہے تو اپنے اوپر طلاق بائن کر لے الفاظ لکھے جائیں۔[1]

۲۔ دوسرے یہ کہ دونوں طرف سے کم سے کم ۵، ۱۰ آدمی اس تحریر پر گواہ بنا لئے جائیں اور جب اس کی ضرورت پیش آئے، تو ان میں سے کم سے کم دو آدمی جن میں ایک شوہر کی طرف کا آدمی بھی ہو، یہ تسلیم کر لیں کہ ہاں واقعی عورت کو شدید تکلیف ہے، اگر دو آدمی بھی اس کو تسلیم نہ کریں گے تو پھر عورت کو اختیار نہ ہوگا۔

۳۔ شوہر سے جو تحریر لی جائے گی اس میں عورت کے حقوق اور مرد کے فرائض کا ذکر ضرور کیا جائے لیکن اس میں کسی ایسے حق کا یا کسی ایسے فرض کا ذکر نہ کیا جائے، جس کا ذکر شریعت میں کوئی درجہ نہیں ہے یا وہ شریعت میں حرام یا مکروہ ہے۔

۴۔ اگر یہ تحریر نکاح سے پہلے لکھی جائے تو اس میں یہ تذکرہ ضرور ہونا چاہیئے کہ اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں، اور ان شرائط مذکورہ کی خلاف ورزی کروں تو اس کو ایک طلاق بائن واقع کرنے کا حق ہوگا، اگر یہ تحریر ایجاب قبول کے وقت لکھی جائے تو اس میں ماضی یا حال کے الفاظ استعمال ہونے چاہئیں، یعنی میں نے اس عورت سے اس شرط پر نکاح کیا یا کرتا ہوں کہ اگر میں شرائطِ مذکور کا پابند نہ ہوں اور دو آدمی اس عدم پابندی کی تصدیق کریں تو مسماۃ فلاں کو اختیار ہوگا کہ اسی وقت یا پھر کسی وقت چاہے تو اپنے اوپر طلاق بائن واقع کر کے رشتۂ نکاح سے الگ ہو جائے۔

---

[1] ان قال لها طلقی متی شئت فلها أن تطلقها فی المجلس وبعدہ ولها المشیة مرة واحدة وکذا قوله ماشئت واذا ماشئت وقال کلما شئت کان ذالك لها أبدا حتی یقع ثلاثا (فتاوی ہندیہ ج ۲ ص ۸۶-۸۷، باب تفویض الطلاق)

عورت کو شوہر کی طرف سے طلاق کا اختیار مل جانے کے بعد دعویٰ وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ گواہوں میں سے دو آدمی جب شوہر کی زیادتی تسلیم کرلیں تو وہ طلاق لے کر علیحدہ ہوسکتی اور عدت کے بعد دوسرے سے نکاح کرسکتی ہے، یعنی وہ یہ کہے کہ میں اپنے اوپر طلاق بائن واقع کرکے اپنے شوہر فلاں سے علیحدہ ہوتی ہوں یا ہوگئی۔

جیساکہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ مرد کو طلاق دینے میں بڑے غور وفکر اور مشورے سے کام لینا چاہیئے کیونکہ یہ رشتہ محض ایک مذاق اور جنسی و نفسانی کھیل نہیں ہے، بلکہ یہ دنیا کا مضبوط ترین رشتہ ہے، اسی طرح عورت کو یہ اختیار مل جانے کے بعد بھی اس کو اور اس کے بہی خواہوں کو اس اختیار کو کام میں لانے سے پہلے پوری سنجیدگی سے عورت کے طرز عمل پر غور کرلینا چاہیئے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مرد کی زیادتی خود عورت ہی کے طرز عمل کا نتیجہ ہے، اگر ایسا ہے تو پھر اس کا گذر دوسرے شوہر کے پاس بھی نہیں ہوسکتا، اور اگر واقعی مرد کی حق تلفی اور زیادتی ان کو نظر آئے جب بھی اس رشتے کو کاٹنے سے پہلے ایک بار پھر سوچ لینا چاہیئے کہ کہیں ایسا رشتہ بھی نہ ملے۔

ہدایت مرد کو شرائط کے لکھنے میں علماء اور قانون دانوں سے مشورہ کرلینا چاہیئے اور عورت اور اس کے گھر والے بھی اس اختیار کے استعمال میں عجلت سے کام نہ لیں بلکہ سنجیدہ لوگوں اور اہل علم سے مشورہ کرلیں۔ اوپر عقد نکاح کی اہمیت کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اسے اچھی طرح ذہن میں رکھیں، ورنہ ہوسکتا ہے کہ عجلت میں عورت کے لئے یہ بے تعلقی دنیا میں بھی اس سے زیادہ تکلیف کا سبب بن جائے اور آخرت میں بھی وہ اور گھر والے لعنت کے مستحق قرار پائیں۔

۲۔ متعنّت جو شخص باوجود استطاعت کے بیوی کا نان نفقہ اور اس کی جنسی خواہش یا ضروری اخراجات پورے نہیں کرتا ہے، اس کو شریعت میں متعنت کہتے ہیں، اگر ایسے شخص سے اس کی بیوی رہائی چاہتی ہے تو فقہ حنفی میں تو اس کی گنجائش نہیں ہے، لیکن فقہ مالکی میں اس کی صورت یہ ہے کہ جہاں اسلامی حکومت ہو وہاں حکومت کے متعلقہ ذمے داروں کے پاس اور جہاں اسلامی حکومت نہ ہو وہاں مسلمانوں کی ایک جماعت کے سامنے عورت دعویٰ کرکے فسخ نکاح کرالے، مسلمانوں کی یہ جماعت کیسی ہونی چاہیئے، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

متعنت کی بیوی اگر اس کے ظلم وتشدد سے عاجز آگئی ہے اور اس سے رہائی چاہتی ہے، تو

اس کو چند باتوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ملحوظ رہنی چاہیئے کہ عورت اسی وقت یہ مطالعہ کرے جب اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ معاش موجود نہ ہو، یا کوئی دوسرا سرپرست نہ ہو، بغیر شدید معاشی مجبوری کے اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔

۲۔ دوسری بات یہ ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ اگر وہ خود یا اس کا کوئی دوسرا سرپرست معاش کا انتظام تو کر دیتا ہے، لیکن شوہر سے علیحدگی میں اس کے گناہ میں مبتلا ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے تو مجبوری کی بنا پر اس کو خیار فسخ حاصل ہے۔

۳۔ عورت اپنا معاملہ مسلمان حاکم یا کسی اسلامی جماعت کے سامنے پیش کرے اور وہ حاکم، یا اسلامی جماعت کے افراد گواہی و شہادت لے کر اس معاملے کی پوری تحقیق کریں اور پھر اس کے بعد شوہر سے کہا جائے کہ تم یا تو طلاق دو ورنہ ہم تفریق کرا دیں گے۔ اگر وہ طلاق پر راضی نہ ہو تو تفریق کرا دی جائے۔ اس میں اب شوہر کو مہلت دینے کی ضرورت نہیں ہے[1]۔ تفریق کی صورت میں اس کو ایک طلاق رجعی پڑ جائے گی۔

اگر تفریق کے بعد شوہر اپنی حق تلفی سے باز آجائے، اور نفقے کی ادائیگی اور جنسی تعلقات پر راضی ہو جائے، تو پھر یہ عورت اس کے عقد نکاح میں واپس ہو سکتی ہے، یا نہیں، اس کی دو صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ عدت ختم ہونے سے پہلے وہ نفقہ دینے پر آمادہ ہو اور حق تلفی سے باز آجائے تو وہ اس عورت سے رجوع کر سکتا ہے، لیکن علماء نے لکھا ہے کہ اس صورت میں بھی بہتر یہ ہے کہ تجدید نکاح کر لیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عدت کے بعد وہ ندامت کا اظہار کرے، اور عورت کی حق تلفی سے باز آنے کا وعدہ کرے تو اب اس عورت کو عقد نکاح میں لینے کی دوسری کوئی صورت اس کے

---

[1] الحلیۃ الناجزہ کے مولفین نے یہی لکھا ہے، مگر تحفظ حقوق زوجین سابق ریاست بھوپال میں اس کے لئے تین ماہ کی مہلت مقرر کی گئی ہے، اگر اس مدت میں وہ روش بدل لیتا ہے تو پھر عورت کو خیار فسخ نہیں دیا جائے گا اور اگر نہیں بدلتا ہے تو تین ماہ کے ختم ہوتے ہی تفریق کرا دی جائے گی، یہی صورت زیادہ مناسب ہے۔

علاوہ نہیں ہے کہ خود عورت دوبارہ اس سے نکاح کرنے پر راضی ہو جائے تو تجدید نکاح کے بعد پھر وہ میاں بیوی بن سکتے ہیں۔

۳۔ شوہر کا افلاس

یہ تو وہ صورت تھی جب شوہر باوجود استطاعت کے بیوی کا نان نفقہ نہ دیتا ہو، یا اس کی کوئی حق تلفی کرتا ہو اس کے علاوہ ایک صورت یہ ہے کہ اس میں نان نفقہ دینے کی صلاحیت ہی نہ ہو، تو جس طرح متعنّت سے پیچھا چھڑانے کی اسلامی شریعت میں گنجائش موجود ہے، اسی طرح ایسے شوہر سے بھی عورت کو نجات مل سکتی ہے جو عورت کے دوسرے حقوق تو ادا کرتا ہے، لیکن کسی معذوری کی وجہ سے یا ذریعہ آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے عورت کا نفقہ پورا نہیں کر پاتا ہے، لیکن جس طرح متعنّت کی بیوی کو اپنا یہ حق شدید مجبوری کی حالت میں استعمال کرنا چاہیئے، اسی طرح اس عورت کو بھی جس کی مادی ضرورت بے چارہ شوہر شدید مجبوری کی بنا پر پوری نہیں کر پاتا ہے، اپنا اختیار انتہائی مجبوری کی حالت میں استعمال کرنا چاہیئے یہ اجازت ائمہ ثلاثہ کی رائے کی روشنی میں دی گئی ہے، ورنہ فقہ حنفی میں تفریق کی گنجائش نہیں ہے۔ ائمہ ثلاثہ نے کچھ شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے:

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ فی الحال کھانا پینا دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور بظاہر مستقبل میں بھی اس کی امید نہیں ہے۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ عقد نکاح کے وقت عورت کو اس کی مفلسی کا علم نہ رہا ہو، اگر ہو تو پھر فسخ کی اجازت نہیں ہے۔

۳۔ اس کو قاضی یا اسلامی جماعت اپنی صواب دید سے موقع دے گی کہ اس مدت میں ممکن ہے کہ اس کی معاشی پریشانی دور ہو جائے، اگر نہ ہوئی تو تفریق ہو سکتی ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۴ ص ۵۸۱)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے متعنت یا مفلس شوہر کے بارے میں جو یہ رائے دی ہے کہ اس کی بیوی اور اس کے درمیان تفریق نہ کی جائے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے اس کی کوئی سبیل پیدا نہیں کی ہے، بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ عورت کے دین و اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صبر و تحمل سے کام لے، اور کچھ دنوں تکلیف جھیل جائے، ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ اس کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دے، جس طرح قرآن میں کہا گیا ہے کہ اگر مفلس لڑکے بھی مل جائیں تو ان سے نکاح کر لو، خدا تعالیٰ

رزق کی کوئی سبیل پیدا کردے گا، تو ہر تکلیف پر تفریق بین الزوجین قرآن کی اس تعلیم کی روح کے خلاف ہے:۔

اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ یُغۡنِہِمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ (النور) — اگر وہ تنگ دست ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو فراخ دست بنادے گا۔

جب فقر و افلاس کو مانع نکاح قرار نہیں دیا گیا ہے، تو پھر بقاء رشتہ کے لئے کیوں مانع قرار دیا جائے[1] پھر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ شادی کے بعد اگر شوہر افلاس کی وجہ سے نان نفقہ نہیں دے پاتا ہے، تو اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے، جو شادی سے پہلے اس عورت کے نان نفقہ کے ذمہ دار تھے، یعنی اگر کوئی شوہر بیوی کے ساتھ انتہائی انسانیت سے پیش آتا ہے، اس کی جنسی خواہش بھی پوری کرتا ہے، لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے اس کی کفالت نہیں کرپاتا تو اس بیوی کے سرپرستوں کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس کی کفالت جس طرح شادی سے پہلے کرتے تھے، اسی طرح اب بھی کریں، ممکن ہے کہ آئندہ اس شوہر کے لئے کوئی معاش کا ذریعہ پیدا ہو جائے لیکن محض اخلاقی تعلیم اور اخلاقی دباؤ کو تمام لوگ نہیں مانتے ہیں اس کے لئے قانون کا سہارا لینا پڑتا ہے، چنانچہ جس طرح متعنت کے لئے فقہائے احناف نے فقہ مالکی کی روشنی میں تفریق کی اجازت دی ہے، اسی طرح راقم الحروف ائمہ ثلاثہ کی رائے[2] کی روشنی میں افلاس کی صورت میں بھی تفریق

---

[1] احناف کے دلائل بہت مضبوط ہیں، اوپر جو آیت نقل ہوئی ہے، اس کے علاوہ دوسری آیت یہ ہے وَلْیُنۡفِقۡ ذُوۡ سَعَۃٍ مِّنۡ سَعَتِہٖ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قدرت کے مطابق نفقہ فرض ہے اور اگر وہ تنگدست ہے تو پھر وہ نفقہ کا مکلف نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں محض فاقہ کی وجہ سے کوئی طلاق یا تفریق نہیں ہوئی حضرت علی اور حضرت ابوہریرہ کا عمل بھی اسی پر تھا مگر حالات کے لحاظ سے دوسرے ائمہ کے مسلک پر عمل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

[2] ائمہ ثلاثہ کے اس کے شرائط میں تھوڑا سا اختلاف ہے امام مالک خاص طور پر دو شرط لگاتے ہیں ایک یہ کہ نکاح کے وقت اسکے فقر و فاقہ کا علم نہ رہا ہو دوسری شرط یہ کہ عورت قاضی یا جماعت مسلمین کے پاس دعویٰ کرے اگر واقعی یہ ثابت ہو جائے تو پھر قاضی یا جو اسکے قائم مقام ہو وہ ایک مدت مقرر کردے گا، اگر اس مدت میں شوہر اسکے نفقہ کا انتظام کر دیتا ہے تو فسخ نکاح صحیح نہیں ہے اور اگر نہیں کرتا تو پھر ایک طلاق رجعی واقع کر دے گا۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۴ ص ۵۸۲)

کی اجازت دینے کی تجویز پیش کرتا ہے، علمائے احناف کو اس پر غور کرنا چاہیئے اوپر ہم شرح وقایہ کے مصنف کی رائے نقل کر چکے ہیں کہ وہ اس کی اجازت اس قید کے ساتھ دیتے ہیں کہ کوئی شافعی یا مالکی یا حنبلی قاضی اس کا فیصلہ کر دے۔

استحسنوا أن ینصب القاضی نائباً شافعی المذھب یفرق بینھما۔	فقہائے احناف نے اسی کو بہتر سمجھا ہے کہ کوئی شافعی المذہب ان کے درمیان تفریق کرا دے،

امام شافعیؒ کے نزدیک چار شرطوں کے ساتھ فسخ جائز ہے۔

(الف) کم سے کم ضروریات زندگی کے گذر اوقات کا سامان بھی شوہر نہ کر پاتے۔

(ب) اور فی الحال وہ اخراجات پورا کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اور آیندہ بھی امید نہ ہو، ماضی میں جو دن گذر چکے ہیں، اس کی تکلیف کی بنا پر فسخ نکاح جائز نہیں۔

(ج) صرف بیوی کے خرچ کو وہ پورا نہیں کر پاتا ہو، اب اگر اس کا خرچ پورا ہو رہا ہے، اس کے خادم کا نہیں تو فسخ نکاح جائز نہیں۔

(د) عمدہ کھانے کپڑے یا دوسری تراش خراش کے مطالبہ پر فسخ نہیں ہو سکتا، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک بھی قریب قریب ایسی ہی شرطیں ہیں، البتہ نکاح کے وقت اسے اس کے فقرو فاقہ کا علم نہ رہا ہو اور بعد میں علم ہوا ہو تو بھی ایسے فسخ نکاح کو وہ جائز سمجھتے ہیں (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۴ ص ۵۸۴)

لیکن اس سلسلہ میں ان باتوں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے جو اوپر متعنت اور امام صاحب کی اخلاقی رائے کے سلسلہ میں عرض کی گئی ہیں اور ان ہدایتوں کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے۔

۱۔ سب سے پہلی بات افلاس کے سلسلہ میں یہ ملحوظ رہنی چاہیئے کہ عورت کو تفریق کا مطالبہ اس وقت کرنا چاہیئے جب اس کے معاش کی دوسری سبیل نہ ہو اور عورت کی حالت یہ ہو کہ وہ فاقے پر فاقے کر رہی ہو[1]

---

[1] مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ شرح وقایہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں۔ وحاصل أن الزوج اذا اعسر النفقۃ فللقاضی أن یفرق بینھما اذا طالبت الزوجۃ بذالک وکذا اذا غاب أو تعذر تحصیل نفقتھا منہ (ج ۲ ص ۱۷۱)

۲۔ دوسری یہ کہ تفریق سے پہلے حکومت یا جماعت مسلمین پوری تحقیق کرلے کہ واقعی عورت کی بنیادی ضرورتیں پوری نہیں ہورہی ہیں، یا محض تعیش یا تجدید لذت کے لئے وہ ایسا کررہی ہے۔

۳۔ تیسری یہ کہ تحقیق کے بعد حاکم یا اسلامی جماعت شوہر کو قرآن کی ہدایت وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ[1] (یعنی جو تنگ حال ہوں ان کو خوش حالی تک کی مہلت دی جائے) کے تحت ایک دو یا تین مہینے کی مہلت دے، اگر وہ اس مدت میں اس قابل ہو جاتا ہے تو پھر تفریق نہ ہوگی، ورنہ جس طرح متعنت سے تفریق کرادی گئی ہے، اسی طرح اس سے بھی کرادی جائے گی۔

۴۔ اس تفریق سے بھی طلاق رجعی پڑے گی، اگر عدّت کی مدّت گذرنے سے پہلے شوہر اس قابل ہو جائے کہ اس کی کفالت کرسکے تو پھر رجعت کا حق اس کو ہوگا، خواہ عورت راضی ہو یا نہ ہو، البتہ اگر عدت گذر جائے تو پھر تجدید نکاح کے بغیر مرد اس کو نہیں رکھ سکتا، اور تجدید نکاح کے لئے دونوں کی رضامندی ضروری ہے۔

۴۔ مفقود الخبر وہ شخص جو شادی کرنے کے بعد بالکل غائب اور لاپتہ ہو جائے نہ اس سے کسی جاننے والے کی خط و کتابت ہو، نہ اس کے جینے یا مرنے کی کوئی خبر ہو، اس کو شریعت میں مفقود الخبر کہتے ہیں۔

مفقود کی بیوی کے بارے میں امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کی رائے یہ ہے کہ وہ اس وقت تک دوسرا نکاح نہ کرے، جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ مرگیا ہے، اس کے لئے بعض فقہاء نے ۹۰ سال اور بعض نے ستر سال کی قید لگائی ہے، الّا یہ کہ ایسے قرائن موجود ہوں جن سے اس کی موت کا گمان غالب ہو جائے، مثلاً وہ جنگ میں غائب ہو جائے یا فساد کے بعد اس کا پتہ نہ چل سکے یا کوئی اس کا پتہ بتانے والا نہ ہو، تو قاضی کو حق ہے کہ وہ فسخ نکاح کا حکم لگادے (الحلیۃ الناجزۃ) اور امام مالک اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما کی رائے یہ ہے کہ عورت اگر چاہتی ہے تو اس کو چار سال انتظار کرنے کے بعد عقد ثانی کی اجازت دی جاسکتی ہے، گو اخلاقی اعتبار سے اور ازدواجی تعلق کے احترام کے پیش نظر امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کی رائے بہت وزنی ہے لیکن چونکہ موجودہ

---

[1] یہ آیت قرض سے متعلق ہے مگر اس کا حکم عام ہے۔

ماحول میں نہ تو مردوں میں اسلامی اخلاق کا بلند معیار باقی رہ گیا ہے اور نہ عورتوں میں، اس لئے فقہائے احناف نے امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے مسلک کے مطابق فتویٰ دینے کی اجازت دی ہے، اور اب یہ مسئلہ فقہ حنفی کا جزو بن گیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی اسلامی حکومت کے سامنے یا کسی اسلامی جماعت کے سامنے دعویٰ کرے کہ اس کا شوہر اتنے دنوں سے غائب ہے، اور اس کے نان نفقے کا کوئی انتظام نہیں ہے، یا نان نفقے کا تو انتظام ہے مگر شوہر سے جدائی میں اس کے گناہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ دعوے کی سماعت کے وقت عورت پہلے دو ایسے گواہوں کے ذریعے جو نکاح کے وقت موجود رہے ہوں، یا ان کو نکاح کا علم ہو یہ ثابت کرے کہ فلاں مرد سے میرا نکاح ہوا تھا، مگر وہ اتنے دنوں سے لاپتہ ہے، اب اس سے میں علیحدگی اختیار کرنا چاہتی ہوں، عورت کو اس کے لاپتہ ہونے کا ثبوت بھی گواہوں کے ذریعہ دینا پڑے گا۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ یہ معاملہ جس حاکم یا جماعت کے سامنے پیش ہو، وہ اس کے بعد تمام ممکن ذرائع سے اس کی زندگی یا موت کی تحقیق کرے جب اس کے ملنے سے بالکل مایوسی ہو جائے، تو پھر وہ عورت کو حکم دے کہ وہ چار سال تک اور انتظار کرے، اب اگر چار سال کے بعد بھی شوہر کا پتہ نہ ملے تو اب اس کے مرجانے کا حکم نافذ ہو جائے گا، یعنی اب عورت دوبارہ اسلامی حکومت یا اسلامی جماعت کے پاس درخواست کر کے اس کی موت کا پروانہ حاصل کرے، اور دوسرے نکاح کی اجازت لے، جب وہ دوبارہ اجازت لے گی تو اس کو موت کی عدت یعنی چار مہینے دس دن گذارنے کے بعد دوسرا نکاح کرنے کا حق ہو جائے گا۔

یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ چار سال کی مدت اس وقت سے شمار ہوگی، جب سے کسی حاکم یا اسلامی جماعت نے شوہر کے لاپتہ ہونے کا حکم دیا ہے، اس سے پہلے چاہے جتنی مدت گذر جائے، اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

اگر عورت کے نان نفقے کا کوئی انتظام نہ ہو، یا اس کے گناہ و معصیت میں مبتلا ہو جانے ہو جانے کا اندیشہ ہو، تو علمائے احناف اس کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ تفریق کے لئے ایک سال

کی مدت بھی مقرر کی جا سکتی ہے[1]۔ فقہ مالکی کی کتابوں سے اس اجازت کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ ان کے یہاں چار سال کی مدت اس وقت ہے جب عورت کے نان نفقے کا انتظام ہو اور اس کے مبتلائے معصیت ہونے کا خوف نہ ہو اور شوہر کے ملنے کے امکانات ہوں۔

اگر ان مذکورۂ بالا شرطوں میں سے کوئی شرط بھی نہ پائی گئی تو پھر فسخِ نکاح فوراً ہو سکتا ہے۔

مفقود کی واپسی کے بعد

اگر فسخ نکاح کے بعد عورت نے دوسرا نکاح کر لیا اس کے بعد پہلا شوہر واپس آجائے تو پھر اس کی منکوحہ اس کو واپس کر دی جائے گی، یا اب وہ دوسرے شوہر ہی کے پاس رہے گی، اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

پہلے شوہر کی واپسی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ دوسرے شوہر سے خلوتِ صحیحہ کے بعد وہ واپس آئے، دوسری یہ کہ خلوتِ صحیحہ سے پہلے واپس آجائے تو اگر خلوتِ صحیحہ سے پہلے واپس آجائے تو تمام ائمہ کی متفقہ رائے ہے کہ وہ عورت پہلے شوہر کو واپس کر دی جائے گی، اور دوسرے شوہر کا نکاح فسخ کرا دیا جائے گا، لیکن اگر خلوتِ صحیحہ کے بعد واپس آئے تو پھر اس بارے میں ائمہ کی رائیں مختلف ہیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مسلک یہ ہے کہ اس صورت میں وہ دوسرے شوہر ہی کے پاس رہے گی، پہلے شوہر کا اس پر کوئی حق نہیں رہا، مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ اس صورت میں بھی وہ پہلے شوہر کو واپس کر دی جائے گی[2]۔

ھندوستان کے علمائے احناف جنھوں نے زوجۂ مفقود کے تفریق کی اجازت فقہ مالکی کی روشنی میں دی ہے، وہ واپسی مفقود کے سلسلہ میں امام مالک کے مسلک کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ فقہ حنفی کے مطابق ہر حال میں پہلے شوہر کو واپس کرنے کے حق میں ہیں، لیکن راقم کے خیال میں یہ بات مناسب نہیں ہے کہ ان کا مسلک آدھا کٹا بنا کر لیا جائے، اور پھر یہ بات اس لئے بھی مناسب نہیں ہے کہ جن مصالح کے تحت اس کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دی گئی، ان ہی مصالح کا یہ تقاضا ہے کہ

---

[1] امام مالکؒ کا اصل مسلک تو یہ ہے کہ اگر اس کے نان نفقے کا کوئی انتظام نہ ہو تو فوراً ہی تفریق ہو سکتی ہے مگر علمائے ہندوستان نے احتیاط کے خیال سے ایک سال کی مدت مقرر کی ہے اور یہ احتیاط بہت ضروری تھی۔

[2] تحفظ حقوق زوجین اور الحیلۃ الناجزہ وغیرہ۔

واپسی کی اجازت نہ دی جائے، ورنہ اس عورت سے شادی کے لئے کوئی بھلا مانس آدمی تیار نہ ہوگا، اور اگر کوئی تیار ہو بھی گیا تو قرآن و حدیث میں نکاح کے جو مقاصد بیان ہوئے ہیں نہ تو وہ پورے ہوں گے اور نہ اس نکاح سے واقعی عورت کے دکھ کا پورا مداوا ہو سکے گا، ان ہی مصالح کی بنا پر حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہ نے یہ رائے دی ہے کہ خلوت کے بعد بھی بیوی کو دوسرے شوہر ہی کے پاس رہنے دیا جائے، اب پہلے شوہر کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔

اس سلسلے میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اس سے رجوع کرلیا تھا، ان کے بارے میں امام مالکؒ نے لکھا ہے کہ "یہ جھوٹ ہے"۔ (المغنی)

اسی رائے کو بھوپال کے شعبۂ قضا نے بھی پسند کیا ہے، چنانچہ اس کے شائع کردہ ضابطے میں ہے:"اگر شخص مذکور (مفقود) بعد فسخِ نکاح و مرورِ ایام عدت واپس آئے اور اس عورت پر دعویٰ کرے تو ایسی صورت میں اس کا دعویٰ قابلِ سماعت نہ ہوگا"۔ صـ۴

زوجہ مفقود کو تفریق کے بعد ایک طلاق رجعی پڑ جائے گی، اگر شوہر طلاق کی عدت کے زمانے میں آگیا تو وہ اس سے رجوع کرسکتا ہے، اس کو تجدید نکاح کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر عدت ختم ہوگئی، یا وہ عدت کے اندر آ تو گیا مگر اس نے رجوع نہیں کیا تو عورت کو ایک طلاق بائن پڑ گئی، اب عورت کو حق ہے کہ وہ جس سے چاہے نکاح کرے۔

۵۔ غائب غیر مفقود

یہ تو اس شوہر کا حکم تھا جو بالکل لاپتہ ہو، لیکن ایک صورت یہ بھی پیش آتی ہے کہ شوہر لاپتہ تو نہیں ہوتا مگر کسی دوسری جگہ رہتا ہے، نہ تو بیوی کے پاس آتا ہے، اور نہ اس کو خرچ بھیجتا ہے، تو ایسے شوہر کو غائب غیر مفقود کہا جاتا ہے، اس سے رہائی کی یہ صورت ہے کہ پہلے عورت اسلامی حکومت کے حاکم کے پاس دعویٰ کر کے اس سے اپنا نکاح ہونا اور اس کا نان نفقہ نہ دینا ثابت کرے، اگر عورت صرف نان نفقے کی تکلیف کی بنا پر اس سے علیحدگی چاہتی ہے، تو اگر اس کی کفالت کا کوئی معقول انتظام ہو جائے تو اب عورت کو فسخ نکاح کی کوشش نہ کرنا چاہیئے، لیکن اگر اس کے نان نفقے کا انتظام نہ ہو، یا انتظام تو ہو جائے مگر اس کے گناہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو پھر دونوں صورتوں میں حاکم یا اسلامی جماعت اس شوہر کے پاس دو آدمیوں کے ذریعہ یہ پیغام بھیجیں کہ تم یا تو خود یہاں آکر یا عورت کو اپنے پاس

بلواکر اس کی ضروریات پوری کرو، ورنہ اس کو طلاق دے دو، اگر تم نے ان باتوں میں سے کوئی بات نہ کی تو پھر ہم تمہارے اور تمہاری بیوی کے درمیان تفریق کرادیں گے، اگر اس کے بعد بھی شوہر کوئی توجہ نہیں کرتا ہے، یا طلاق نہیں دیتا ہے تو جس کے متعلق یہ معاملہ ہے وہ ایک ماہ کی مزید مہلت اس کو دے دے، اگر اس مدت میں اس نے اپنا رویہ درست نہ کر لیا تو اگر عورت اس سے علیحدگی کے مطالبے پر اب بھی قائم ہے تو ان دونوں کے درمیان علیحدگی کرادی جائے گی اگر عورت خود مطالبے سے باز آجائے، تو پھر تفریق نہیں ہوگی۔

اگر شوہر کسی دور دراز جگہ ہے جہاں پہونچنا دشوار ہو، یا خود عورت یا اس کے ورثہ وہاں پہونچنے کا خرچ برداشت نہ کر سکتے ہوں تو پھر حاکم یا اسلامی جماعت کو یہ حق ہے کہ شوہر کو اطلاع دیئے بغیر وہ معاملے کی تحقیق اور شرعی شہادت وغیرہ لے کر تفریق کرادے۔

تفریق کی نوعیت اس تفریق سے ایک رجعی طلاق پڑ جائے گی، یعنی عدّت کے بعد اس کو دوسرا نکاح کرنے کا حق ہوگا۔

واپسی کے بعد اگر یہ شوہر تفریق کے بعد واپس آجائے تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ عدت کے اندر آجائے، اور عورت کی ضروریات پوری کرنے پر راضی ہو، تو پھر اس صورت میں اس کو رجعت کرنے کا حق ہوگا خواہ عورت راضی ہو یا نہ ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عدت کے بعد واپس آئے تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ آنے کے بعد اس نے عورت کے دعوے کے خلاف یہ ثابت کیا کہ میں اس کو برابر خرچ دیتا تھا یہ میری فلاں جائداد سے یہ فائدہ اٹھاتی تھی، تو اس صورت میں عورت کو اس کی بیوی بن کر رہنا ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے عورت کے دعوے کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں کی، تو پھر عورت آزاد ہے، جس سے چاہے نکاح کرے۔

جس صورت میں شوہر نے عورت کے دعوے کے خلاف کوئی بات ثابت کر دی، تو پھر اس عورت سے اگر کسی دوسرے نے نکاح اور مجامعت کر لی ہے جب بھی عورت کو پہلے شوہر کے پاس واپس آنا ہوگا، اس صورت میں پہلے شوہر کے پاس آنے میں نہ تو تجدید نکاح کی ضرورت ہے اور نہ تجدید مہر کی، البتہ اگر دوسرے شوہر سے خلوتِ صحیحہ ہو چکی ہے، تو عورت پر عدت واجب ہے یعنی

پہلا شوہر عدت بھر اس سے مجامعت نہیں کرسکتا، اگر حاملہ ہے تو ولادت تک اس سے مجامعت نہیں کرسکتا۔

اسی طرح اگر خلوت صحیحہ ہوچکی ہے تو وہ دوسرے شوہر سے مہر پانے کی بھی حق دار ہوگی اور اگر خلوت نہیں ہوتی ہے، صرف نکاح ہوا ہے، تو مہر پانے کی مستحق نہیں ہوگی۔ (المرقومات للمظلومات)

عنین یعنی جو شخص عورت کی جنسی خواہش پوری نہ کرسکتا ہو اس کو شریعت میں عنّین کہتے ہیں۔

عنین سے علیحدگی کا طریقہ

(۱) جس طرح اوپر مفقود، متعنت اور غائب کے بارے میں یہ گذر چکا ہے کہ عورت علیحدگی کے لئے درخواست دے، اسی طرح عنین کی عورت بھی کسی مسلمان حاکم یا کسی اسلامی جماعت کے پاس علیحدگی کی درخواست دے۔

(۲) جس کے پاس عورت علیحدگی کی درخواست دے، اس کو چاہیئے کہ شوہر سے خود پوچھے کہ اس کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں، اگر وہ اپنی نامردی کا اقرار کرلے تو پھر اس کو ایک سال علاج کرنے کی مہلت دے، اگر اس مدت میں اچھا ہو جائے تو پھر عورت کو علیحدگی کا اختیار باقی نہیں رہے گا، اور اگر وہ نامردی سے انکار کرے، تو ماہر اور قابل اطمینان ڈاکٹروں کو دکھا کر اس کی تحقیق کرائی جائے کہ اس کا انکار صحیح ہے یا نہیں، اور اسی کے ساتھ کسی ماہر لیڈی ڈاکٹر یا دائی سے لڑکی کا معائنہ کرایا جائے کہ عورت کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں کہ اس کا شوہر اس سے جماع کرنے پر قادر نہیں، اگر اس کا دعویٰ صحیح معلوم ہو تو اس صورت میں اس کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی، یہ تو اس صورت کا حکم ہے کہ مرد اپنی نامردی کا انکار کرتا ہے اور ڈاکٹری معائنے کے بعد مرد کا انکار صحیح نہ معلوم ہو، لیکن اگر مرد اپنے عنین ہونے سے انکار کرتا ہے اور عورت خود یہ کہتی ہے یا عورت کا معائنہ کرنے والی لیڈی ڈاکٹر یہ کہتی ہے کہ عورت سے ایک یا دوبار جماع ہوچکا ہے تو اب شوہر سے اس بات پر حلف لیا جائے گا کہ اس نے جماع کیا ہے، اگر وہ حلف لے لے گا تو اب عورت کو تفریق کا حق باقی نہیں رہے گا، اگر وہ حلف سے انکار کرے گا تو اس کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی کہ وہ علاج کرے۔

اب ایک سال کے علاج کے بعد اگر مرد جماع کے قابل ہوگیا ہے، اور عورت بھی مطمئن ہوگئی

تو پھر اب عورت کو اس سے تفریق کا حق نہ ہوگا، اور اگر عورت نے اپنے اطمینان کا اظہار نہیں کیا، بلکہ تفریق کا مطالبہ کیا، یا شوہر نے خود اقرار کر لیا کہ اب بھی وہ ناکارہ ہے تو دونوں صورتوں میں اگر عورت اس سے علیٰحدگی ہی چاہتی ہے، تو شوہر سے کہا جائے گا کہ وہ طلاق دے دے، اگر طلاق نہ دے، تو صاحبِ معاملہ خود دونوں میں تفریق کرادے۔

نامرد شوہر سے علیٰحدگی کے لئے ان چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، اگر یہ شرطیں نہ پائی گئیں، تو تفریق نہیں ہو سکتی۔

۱۔ بیوی کو نکاح سے پہلے اس کے نامرد ہونے کا علم نہ رہا ہو، اگر یہ جانتے ہوئے اس نے نکاح کیا کہ وہ عنین ہے تو اب اس کو تفریق کا حق نہ ملے گا۔

۲۔ نکاح کے بعد اس سے ایک بار بھی مباشرت نہ کی ہو، اگر ایک بار بھی جماع کر چکا ہے، تو اب تفریق کا حق نہ ہوگا۔

۳۔ جس وقت عورت کو اس کے نامرد ہونے کا علم ہوا ہو، اس کے بعد سے اپنی زبان سے اس کے ساتھ رہنے اور زندگی گذارنے کی رضامندی ظاہر نہ کی ہو، اگر رضامندی ظاہر کر دی ہوگی، تو پھر تفریق کا حق نہ ہوگا، یوں اگر وہ خاموش رہی ہو، اور شوہر کے ساتھ سوتی بیٹھتی رہی ہو، اور شرم کی وجہ سے اپنی ناراضگی کچھ دن ظاہر نہ کر سکی ہو، تو اس سے تفریق کا حق نہیں جاتا۔

۴۔ یہ تفریق عورت خود بخود نہیں کر سکتی، بلکہ اس میں بھی اس کو مسلمان حاکم یا کسی اسلامی جماعت کے پاس دعویٰ کر کے تفریق کرانی چاہیئے، اور سال بھر کی مہلت دینا اور پھر تفریق وغیرہ کرانا یہ سب یا تو اسلامی حکومت کے ذریعے یا مسلمان حاکم کے ذریعے یا پھر اسلامی جماعت کے ذریعے ہونا چاہیئے۔

مجبوب کا حکم یہ تو عنین کا حکم تھا، یعنی مجبوب جس کا عضو مخصوص پیدائشی طور پر نہ ہو یا بعد میں اس نے بےکار کر دیا ہو، تو اس کے لئے سال بھر کی مہلت کی ضرورت نہیں ہے بس تحقیق یا اقرار کے بعد جب یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ایسا ہے تو تفریق کرا دی جائے گی۔

۷۔ مجنون اگر کسی عورت کا شوہر شادی کے بعد پاگل ہو جائے یا شادی کے وقت پاگل پن موجود تھا، مگر بےخبری میں نکاح ہو گیا ہو تو اس کو تفریق کرانے کا حق حاصل ہے،

مجنون شوہر سے تفریق کے لئے بھی وہی تمام شرائط ہیں جو اوپر عنین کے سلسلہ میں مذکور ہیں یعنی یہ کہ نہ تو نکاح سے پہلے جنون کا علم رہا ہو، نہ عورت نے علم کے بعد اس کے ساتھ رہنے کی رضامندی ظاہر کی ہو، نہ اس نے مباشرت کا موقع دیا ہو، اور جس طرح عنین کی بیوی کو دعوے کی ضرورت ہے، مجنون کی بیوی کو بھی دعویٰ کرنا ضروری ہے، اور جس طرح عنین کو علاج کے لئے ایک سال کی مہلت دی جائے گی، اسی طرح پاگل کو بھی۔

اگر مجنون سے علیٰحدگی کے لئے مذکورۂ بالا شرائط نہ پائے جاتے ہوں تو تفریق نہیں ہوسکتی، لیکن یہ اس صورت میں ہے، جب کہ عورت کے نان نفقے کا کوئی انتظام ہو، اگر اس کے لئے اس کے پاگل ہونے کے بعد کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی نہیں رہ گیا ہے، تو اس صورت میں اس کو عدم ادائگی نفقے کی بنا پر تفریق کا حق حاصل ہوگا جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

امراض خبیثہ یا مانع جماع امراض

اوپر جس طرح عنین، مجبوب سے جماع پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے عورت کو تفریق کرانے کا حق دیا گیا ہے، اور مفقود، متعنت، غائب، مفلس اور مجنون سے جماع اور نفقہ دونوں کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے عورت کو تفریق کا حق دیا گیا ہے۔ اسی طرح مرد کے وہ امراض جو مانع جماع ہوں، یا مانع جماع نہ ہوں، مگر جماع کی صورت میں ان امراض کے متعدی ہو کر عورت تک پہونچ جانے کا اندیشہ ہو، ان میں بھی امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما عورت کو یہ اجازت دیتے ہیں کہ وہ نکاح فسخ کرالے۔ ان امراض کے بارے میں اوپر کسی قدر تفصیل آچکی ہے۔ البتہ فسخ سے پہلے علاج کے لئے کوئی مدت مقرر کرنی ضروری ہے۔ عنین اور مجنون کے بارے میں فقہائے احناف نے ایک سال کی مدت مقرر کی ہے، لیکن دوسرے امراض جن میں ائمۂ ثلاثہ فسخ نکاح کے قائل ہیں ان میں علاج کی مدت کی کوئی تصریح نہیں کرتے۔ ”المدونہ“ میں امام مالکؒ کے ممتاز شاگرد ابن القاسم، مجذوم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں امام مالکؒ سے تو کوئی تصریح نہیں سنی، لیکن میری رائے ہے کہ :-

وَاِنْ کَانَ مِمَّنْ یُرْجٰی بُرْءُہٗ فِی الْعِلَاجِ وَقُدِّرَ عَلَی العلاج یضرب لہ الاجل (ج ۲ ص ۱۹۶)	اگر اس کے اچھا ہونے کی امید ہو اور علاج کی مدت کا اندازہ کیا جاسکے تو اس کے لئے کوئی مدت مقرر کی جائے۔

لیکن چونکہ مدت کی تصریح نہیں ہے، اس لئے مرض کی شدت اور مریض کے حالات کے لحاظ سے اس مرض کے ماہرین کی رائے کی روشنی میں اسلامی جماعت کے افراد اور علماء اپنی صوابدید کے مطابق مدت مقرر کریں۔ اوپر بھی اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔

تفریق کی جو شرائط عنین اور مجنون وغیرہ کے سلسلے میں ذکر کئے گئے ہیں، ان سب کا ان میں بھی لحاظ ضروری ہے۔

عورت کے امراض جس طرح مرد کے امراض میں عورت کو تفریق کا حق حاصل ہے اسی طرح اگر کسی کی بیوی پاگل ہو جائے، یا کوڑھی یا مبروص ہو جائے، یا ایسے امراض میں مبتلا ہو جو متعدی ہوں یا مانعِ جماع ہوں تو مرد کو طلاق کا حق حاصل ہے، لیکن جس طرح ان امراض میں مرد کو مہلت دی گئی، اسی طرح مرد کو طلاق سے پہلے عورت کو مہلت دینی چاہیئے۔ قانونی طور پر گو اس کو طلاق دینے کا ہر وقت اختیار ہے، مگر اس کو اس فیصلے میں جلدی نہ کرنی چاہیئے، کیونکہ اس اختیار کی اخلاقی روح یہ ہے کہ اس کو بالکل آخری طور پر استعمال کیا جائے۔

ضروری ہدایت اوپر تفریق کے سلسلے میں جو مختصر باتیں لکھی گئی ہیں، صرف اُن ہی کو دیکھ کر ہر شخص عورت اور مرد کے درمیان تفریق نہ کرا دے، بلکہ اس سلسلے میں خدا ترس اور محتاط علماء سے پوچھ کر تفریق کرائی جائے، اگر کہیں لوگوں نے کسی عالم سے فتویٰ دریافت کئے بغیر اپنے طور پر تفریق کرا دی تو یہ تفریق صحیح نہ ہوگی۔

ہندوستان میں قضائے قاضی اوپر عورتوں اور مردوں کے جن عیوب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور ان میں فسخ کی صورتیں بیان کی گئی ہیں، وہاں بار بار اسلامی جماعت اور قضائے قاضی کا ذکر آیا ہے، اس لئے یہاں ہندوستان میں قضائے قاضی کی غیر موجودگی میں اس کی تلافی کی کیا صورتیں ممکن ہیں ان کی تفصیل کی جاتی ہے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے مسلمان تاجر ساحلی صوبہ کیرالہ اور کالی کٹ وغیرہ میں آئے اس وقت وہاں ہندو راجہ کی حکومت تھی مگر اس نے مسلمانوں کے لئے الگ قاضی مقرر کر دیا، اور اس کے مطابق وہ تمام فیصلے کرتے تھے[1]۔ ایک دو صدیوں کے بعد پھر یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی،

---

[1] تفصیل کے لئے تحفۃ المجاہدین کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اور ان کی طرف سے عہدۂ قضا قائم کیا گیا، جس میں سارے دیوانی اور فوجداری معاملات میں چھ، سات سو برس تک فقہ حنفی کے مطابق فیصلے ہوتے رہے، پھر ان کی حکومت کے جانے کے بعد انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو اب یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کے معاشرتی و معاملاتی مسائل میں شریعت کے مطابق کس طرح فیصلے کئے جائیں۔ انگریزوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے فوجداری مسائل کو اسلامی شریعت کے دائرۂ اختیار سے نکال کر عام عدالتوں کو دے دیا، اور دیوانی مسائل میں صرف معاشرتی مسائل کو انھوں نے شرعی قانون کو تسلیم کیا اور وہ "محمڈن لا" کے نام سے موسوم ہوا۔ عہد برطانیہ میں قضائے قاضی کی تلافی کے لئے علماء نے کئی طرح کی کوششیں کیں، ایک تو امارت شرعیہ کے قیام کی کوشش کی گئی جو صوبۂ بہار اڑیسہ میں قائم ہوئی اور مسلمانوں کی ریاستوں مثلاً حیدر آباد اور بھوپال وغیرہ میں عہدۂ قضا کا قیام عمل میں آیا۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے گورنمنٹ سے شرعی ایکٹ کو تسلیم کرایا۔ دوسری طرف علماء مکمل اسلامی ریاست کے قیام کی جد و جہد بھی کرتے رہے۔ سب سے پہلے سید احمد شہیدؒ نے اس کی جد و جہد کی، اور ان کی شہادت کے بعد ان کے خلفاء اس کے لئے کوشاں رہے۔ اور بیسویں صدی کے شروع میں ریشمی رومال کی تحریک کے ذریعہ اس کی کوشش ہوئی۔ حالات کے لحاظ سے تیسری صورت انھوں نے یہ اختیار کی کہ سرکار کے مقرر کردہ مسلم منصفوں اور ججوں کو بھی قضائے قاضی کا قائم مقام قرار دیا۔ ان کے پیش نظر فقہ کا یہ جزیہ تھا:۔

ویجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو کان کافراً۔ (الحیلۃ الناجزۃ بحوالہ در مختار)	اور حاکم وقت خواہ وہ عادل ہو یا ظالم ہو اور چاہے کافر ہی کیوں نہ ہو اس کی طرف قاضی کا تقرر ہو تو اس کے فیصلہ کو ماننا جائز ہے۔

لیکن شرعی معاملات میں چونکہ کسی غیر مسلم کا فیصلہ صحیح نہیں ہوتا:۔

لأن الکافر لیس بأهل القضاء علی المسلم (الحیلۃ الناجزہ ص ۶۲)	اس لئے کہ کافر مسلمانوں کے شرعی معاملات میں فیصلہ کا اہل نہیں ہے۔

اس بنا پر علماء کے سامنے یہ دقت آئی کہ اگر کہیں مسلمان حاکم موجود نہ ہو یا موجود ہو مگر مقدمہ کا فیصلہ نہ کر سکے مثلاً مقدمہ دائر تو ہوا مسلمان کے یہاں مگر اس کا تبادلہ ہو گیا اور اس کی جگہ غیر مسلم آ گیا تو اس معاملہ میں شہادت وغیرہ لے کر اس کا فیصلہ غیر مسلم حاکم کرے تو یہ فیصلہ نافذ نہیں ہو گا،

یا ایسی صورت پیش آجائے کہ عورت کی گلو خلاصی شوہر سے ضروری ہو تو فقہ حنفی کی رو سے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ شوہر طلاق دے دے۔ اب اگر وہ طلاق نہیں دیتا ہے تو دوسری صورت خلع کی ہے۔ مگر خلع میں بھی شوہر کی رضامندی ضروری ہے۔ ان دقتوں کی وجہ سے الحیلۃ الناجزہ کے مرتبین علماء نے جس کے سرخیل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق ایسے معاملات کو دیندار مسلمانوں کی جماعت کے سپرد کر دینے کی اجازت دی جس کا فیصلہ امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق قضائے قاضی کے قائم مقام ہوگا۔

بحمداللہ فقہ حنفی میں استنباط مسائل کے اصولوں میں جو پختگی اور جزئیات کے استقصا میں جتنی وسعت ہے، اتنی دوسرے فقہی مسلکوں میں نہیں ہے، مگر پھر بھی بعض مسائل ایسے ہیں جن میں اس کا دامن اتنا وسیع نہیں ہے، جتنا استصلاح اور مصالح مرسلہ کے پیش نظر امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک میں ہے، اور چونکہ ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک کا مسلک حق ہے، اس لئے ان سے استفادہ کرنے میں چنداں مضائقہ نہیں ہے، مگر اس سے استفادہ میں واقعی کوئی ضرورت یا دقت ہو تو فائدہ اٹھایا جائے۔ صرف خواہش نفس کی تکمیل کے لئے ایسا کرنا نہ صرف صحیح نہیں ہے بلکہ اس سے ایک اباحیت پسندی کا ذہن پیدا ہوگا، جو پوری اسلامی شریعت اور خاص طور پر عزیمت احکام کی اہمیت ہی کو ختم کر دے گا۔ اور صرف رخصتوں کو اختیار کرنا اور عزیمتوں کو چھوڑ دینا گویا شریعت کے بڑے حصہ کو معطل کر دینے کے مرادف ہے، جیساکہ ہمارے ملک کے اہل حدیث حضرات نے کر رکھا ہے۔

اس تھوڑی سی تفصیل کے بعد اب ہم اسلامی جماعت کے طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہیں۔

اسلامی جماعت

اسلامی جماعت کے سلسلے میں چند ضروری باتیں پیش نظر رکھی جائیں (۱) سب سے پہلی بات تو یہ کہ جہاں کہیں مسلمان حکومت ہو یا جہاں کوئی مسلمان حاکم موجود ہو، وہاں اسی کے پاس درخواست دے کر تفریق کرائی جائے، لیکن جہاں مسلمان حاکم نہ ہوں یا ہوں تو ان کو قانوناً ان عام امور میں فیصلے کا حق نہ ہو مثلاً وہ خلع تو کرا سکتے ہوں، لیکن متعنت یا مریض کے بارے میں فیصلے کا حق نہ رکھتے ہوں یا غیر اسلامی حکومت کے مسلمان حاکم سے کوئی اپنا فیصلہ کرانا نہ چاہتا ہو، تو پھر اس صورت میں عورت کے سرپرستوں یا ورثہ کو چاہئے کہ وہ محتاط اہل علم (علماء) مسلمانوں کی ایک جماعت کے سامنے جس کے افراد کم سے کم تین ہوں اس معاملے کو رکھیں مگر اس

جماعت کے بنانے میں چند باتیں لازماً ملحوظ رکھی جائیں۔

(۱) ایک یہ کہ اس جماعت کے کم سے کم ارکان تین ہوں۔

(۲) اس کے تمام ارکان خدا ترس اور محتاط علماء ہوں، یا کم سے کم ایک عالم اور دوسرا ارکان دیندار اور متقی ہوں۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ تمام ارکان متفقہ فیصلہ دیں، کثرت رائے کا فیصلہ معتبر نہ ہوگا۔

قانونی دقت

اس جماعت نے اگر فیصلہ کر دیا، اور عورت نے اپنے کو جدا سمجھ کر دوسری جگہ نکاح کرنے کا ارادہ کرلیا تو اس میں ان جگہوں پر جہاں بالکل غیر اسلامی قانون جاری ہے، یا جہاں محدود اسلامی قانون جاری ہے، وہاں مرد عدالت میں قانونی چارہ جوئی کرکے اس فیصلے کو بدلوا سکتا ہے۔ اس طرح عورت کے لئے بڑی مشکل پیش آسکتی ہے، اس لئے ان جگہوں پر مرد کی قانونی چارہ جوئی سے بچنے کے لئے قانون داں لوگوں سے مشورہ کرکے پھر یہ فیصلہ کرانا چاہیئے، ورنہ یہ فیصلہ بے کار ہوگا، بلکہ الٹے فیصلہ کرنے والے ہی قانونی زد میں آسکتے ہیں۔ ایسے بحمداللہ اب تک کسی عدالت نے ان کے فیصلہ کو رد نہیں کیا ہے۔ مثلاً جامعۃ الرشاد پندرہ برس سے "الجماعۃ الشرعیۃ" کے نام سے دارالافتاء اور دارالقضاء کا کام انجام دے رہا ہے اور اب تک پچاسوں معاملات میں اس نے فیصلے کئے ہیں اور بحمداللہ سب نافذ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کو قانونی شکل دینے کی کوشش جاری رکھنی ضروری ہے۔

قسم کا بیان

کسی بات کو مؤکد کرنے اور اس میں زور پیدا کرنے کے لئے عموماً قسم کھائی جاتی ہے شریعت نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن اگر یہ قسم کسی اچھے کام کرنے کے لئے کھائی گئی ہے، تو شریعت نے اس کو پورا کرنے کی تاکید کی ہے۔ اور اگر کسی برے کام کرنے کی قسم کھائی گئی ہے تو اسے پورا نہ کرنے اور قسم توڑ دینے کی تاکید کی ہے اور اس جرم میں کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص بغیر کسی وجہ اور مقصد کے قسم کھایا کرتا ہے تو اس کو بھی شریعت نے ناپسند کیا ہے کیونکہ اس سے خدا کی ذات وصفات کی بھی توہین ہوتی ہے اور وہ شخص خود بھی لوگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ قرآن میں قسم کے بارے میں متعدد جگہ ہدایت دی گئی ہے۔ خاص طور پر سورۃ مائدہ میں اس کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے:۔

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ   اللہ تعالیٰ لغو وبے مقصد قسموں پر تم کو نہیں

اَیۡمَانِکُمۡ وَلٰکِنۡ یُّؤَاخِذُکُمۡ بِمَا عَقَّدۡتُّمُ الۡاَیۡمَانَ۔ (مائدہ)	پکڑے گا لیکن جن قسموں کو تم نے واقعی باندھ ہی لیا ہو تو ان پر مواخذہ کرے گا۔

جو لوگ بے مقصد جھوٹ، لغو، یا کسی کی حق تلفی کے لئے قسم کھا جاتے ہیں، ان کے بارے میں کہا گیا ہے:۔

وَلَا تَجۡعَلُوا اللّٰہَ عُرۡضَۃً لِّاَیۡمَانِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡا وَتَتَّقُوۡا وَتُصۡلِحُوۡا بَیۡنَ النَّاسِ۔ (بقرہ)	اپنی قسموں میں خدا کے نام کو ڈھال نہ بنالو کہ تم لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے، خدا سے ڈرنے اور ایک دوسرے کے دل جوڑنے سے باز رہو۔

قسم کی شرعی تعریف

زبان سے خدا کی ذات یا صفات کا نام لے کر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا مکمل ارادہ کرنے کو شریعت میں یمین یعنی قسم کہتے ہیں، اگر کوئی شخص خدا کی ذات وصفات کے علاوہ کسی اور چیز کا نام لے کر قسم کھاتا ہے یا ایسے ہی بلا وجہ اور بے مقصد قسم کھاتا ہے تو یہ شرعی قسم نہ ہوگی، عربی میں قسم کو یمین کہتے ہیں اور قسم کھانے کو حلف کہتے ہیں۔

قسم کی اقسام

قسمیں تین طرح کی ہوتی ہیں:۔

(۱) یمین غموس یعنی جھوٹی قسم۔
(۲) یمینِ لغو یعنی بے کار اور بے مقصد قسم۔
(۳) یمین منعقدہ یعنی وہ قسم جو شریعت میں معتبر ہے۔

یمین غموس کی تعریف اور اس کا حکم

کسی گزشتہ بات یا واقعے کے بارے میں جانتے ہوتے قصداً جھوٹی قسم کھا کر کہہ دینا کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کو یمین غموس کہتے ہیں۔ عام طور پر کسی گزشتہ بات یا واقعے ہی کے بارے میں قسمیں کھائی جاتی ہیں، اس لئے یہاں گزشتہ بات کی قید لگائی گئی ہے، ورنہ حال کے بارے میں بھی قسم کھانے کو یمین غموس کہتے ہیں۔ مثلاً کسی نے ایک شخص سے کہا کہ یہ تمہارے سامنے

زید کھڑا ہے، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ زید نہیں ہے، بلکہ خالد ہے، تو یہ بھی جھوٹی قسم ہوئی۔ اگرچہ یہ حال کا واقعہ ہے۔

جھوٹی قسم کبھی تو ذاتی فائدے کے لئے کھائی جاتی ہے اور کبھی کسی کا حق مارنے کے لئے کھائی جاتی ہے، یا کچھ لوگ عادتۂ جھوٹی قسم کھایا کرتے ہیں، بہرحال جو صورت بھی ہو، جھوٹی قسم کھانا شریعت میں گناہ کبیرہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہ کبیرہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ والدین کی نافرمانی کرنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، گناہ کبیرہ ہے۔ پھر آخر میں فرمایا:۔

وَالْيَمِيْنُ الْغَمُوْسُ۔ (بخاری) اور جھوٹی قسم بھی گناہ کبیرہ ہے۔

آپ نے فرمایا کہ جو شخص جھوٹی قسم کھا کر کسی کا حق مار بیٹھتا ہے، اس پر جنت حرام ہے اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

منافقین دل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن مصلحت اور منفعت کے پیش نظر زبان سے قسم کھا کر کہتے تھے کہ آپ خدا کے رسول ہیں، خدا تعالیٰ نے ان کی قسم کے جواب میں کہا:۔

إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكَاذِبُوْنَ اِتَّخَذُوْا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (منافقون)

بے شک منافقین جھوٹے ہیں انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے تو انھوں نے (ان کے ذریعے) خدا کے رستے سے روکا۔

مفہوم یہ ہوا کہ دل میں کچھ اور ہو اور قسم کے ذریعہ زبان سے کچھ اور ظاہر کیا جائے تو یہ جھوٹی قسم ہے، جس کا رشتہ نفاق سے جڑ جاتا ہے۔ قسم کھانا بہت بڑا گناہ اور قابلِ ملامت فعل ہے، لیکن قرآن و حدیث میں اس کے لئے کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے۔ اسی لئے امام ابو حنیفہؒ نے بعض آثار صحابہ کی روشنی میں اس کی کوئی سزا مقرر نہیں کی ہے۔ صرف اس کے لئے توبہ استغفار ضروری قرار دیا ہے۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس پر سزا دی جائے۔ یعنی اس سے کفارہ ادا کرایا جائے۔ کیوں کہ اس نے خدا کے نام کی بے عزّتی کی ہے۔ اور اسی کے ساتھ اس کو توبہ و استغفار بھی کرنا چاہیئے۔

یمین لغو کی تعریف اور حکم

قرآن نے لغو قسموں کے بارے میں یہ تو کہا ہے کہ اس پر مواخذہ نہیں ہوگا، لیکن اس نے لغو کی کوئی تعریف نہیں کی ہے، اسی لئے فقہاء نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ اور یہ سب کی سب لغو میں داخل ہیں۔ عام طور پر فقہائے احناف نے یمین لغو کی یہ تعریف کی ہے:۔

اَنْ یَّحْلِفَ عَلٰی اَمْرٍ مَاضٍ وَھُوَ یَظُنُّ اَنَّہٗ کَمَا قَالَ وَالْاَمْرُ بِخِلَافِہٖ۔	گزری ہوئی بات پر یہ سمجھ کر قسم کھائے کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے، لیکن وہ واقعہ اس کے خلاف ہو۔

عموماً گزشتہ بات ہی پر قسمیں کھائی جاتی ہیں، اسی لئے گزشتہ کی قید لگائی گئی ہے، ورنہ اگر حال کے کسی واقعہ یا کسی بات کے بارے میں قسم کھالی جائے تو وہ بھی لغو قسم ہے۔

اوپر جو تعریف فقہاء نے کی ہے، وہ حضرت عائشہؓ کے ایک قول سے ماخوذ ہے، اور حضرت عائشہؓ نے اس کی ایک دوسری تعریف بھی فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ عام طور پر تکیہ کلام کے طور پر بات چیت کے درمیان آدمی جو واللہ اور باللہ وغیرہ کہہ دیتا ہے یہ بھی لغو قسم ہے۔ یہی تعریف امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام محمد سے منسوب ہے۔ امام شافعیؒ اس کی ایک اور تعریف فرماتے ہیں "وہ قسم جو آدمی بغیر ارادے کے کھاتا ہے، یا ارادہ کچھ کرتا ہے اور زبان سے بغیر دل کے ارادے کے قسم کچھ اور نکل جاتی ہے، وہ یمین لغو ہے۔

غرض یہ کہ وہ تمام قسمیں جن کو آدمی یا تو کسی غلط فہمی کی بنا پر یا تو تکیہ کلام کے طور پر یا بے فائدہ کھاتا ہے وہ یمین لغو ہے۔ اس کے بارے میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ:۔

نَرْجُوْ اَنْ لَّا یُؤَاخِذَ اللّٰہُ بِھَا صَاحِبَھَا۔	ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر مواخذہ نہیں کرے گا۔

انھوں نے غایتِ احتیاط میں "ہم امید کرتے ہیں" کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ خدا نے لغو قسم کی کوئی تعریف نہیں کی ہے۔ انھوں نے اپنے قیاس سے اس کی تعریف کی ہے، ممکن ہے۔ اس تعریف کی بنا پر کوئی قسم خدا کے یہاں لغو نہ ہو، اور عذاب بھگتنا پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ بے فائدہ قسم کھانے میں بھی آدمی کو بہت زیادہ محتاط ہونا چاہیئے۔

یمین منعقدہ کی تعریف اور حکم

وہ قسم جو آدمی کسی کام کے آیندہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کھاتا ہے، وہ یمین منعقدہ ہے۔

اس قسم کا حکم یہ ہے کہ جس کام کے کرنے کی اس نے قسم کھائی ہے، وہ کام جب نہ کرے گا، یا جس کام کے نہ کرنے کی قسم کھائی ہے۔ وہ کرے گا تو اب اس کو کفارہ دینا پڑے گا۔ کفارہ کا ذکر آگے آتا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صحیح قسم میں دل کا ارادہ اور نیت کا ہونا ضروری نہیں ہے، یعنی اگر وہ مستقبل کے بارے میں کوئی قسم ارادے کے بغیر یا بھول کر کھا جائے یا زبردستی اس سے قسم لی جائے تب بھی وہ قسم صحیح مان لی جائے گی، کیونکہ اصل میں قسم میں فعل دیکھا جاتا ہے۔ اب فعل خواہ قصد و ارادے سے پایا جائے۔ یا بھول چوک یا جبر سے، قسم ہو جائے گی، مگر امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ قسم میں قصد و ارادے کا پایا جانا ضروری ہے، کیونکہ قرآن نے قسم کے سلسلے میں کہا ہے کہ "بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ" دوسری جگہ ہے "بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک دل کا ارادہ اور نیت شامل نہ ہو قسم نہ ہوگی۔ اب اس تعریف سے بغیر ارادہ یا بھول چوک کی یا زبردستی کی قسمیں اس سے خارج ہو گئیں، اس تعریف کی تائید حدیث نبوی سے بھی ہوتی ہے، بھول چوک اور زبردستی کے کام کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:۔

رُفِعَ عَنْ اُمَّتِيْ الْخَطَاءُ وَالنِّسْيَانُ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ[1]

میری امت سے غلطی، بھول چوک اور وہ کام جس کے کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہو، معاف ہے،

وہ اسمائے الٰہی جن سے قسم کھائی جا سکتی ہے

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ خدا کی ذات اور صفات کا نام لے کر کسی کام کے آئندہ کرنے یا نہ کرنے کو زبان سے کہنے کا نام قسم ہے۔ مثلاً یوں کہا کہ اللہ کی قسم، خدا کی قسم، یا خدا کو حاضر و ناظر جان کر یا اللہ کو گواہ بنا کر، اللہ کو واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ میں یہ کام ضرور ضرور کروں گا،

---

[1] یہ تمام تفصیل شرح النقایہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ سے ماخوذ ہے۔

تواب قسم ہو جائے گی، اللہ کی صفات میں سے کسی صفت کا نام لے کر قسم کھائی تو بھی قسم ہو جائے گی، مثلاً یوں کہا کہ خدائے رحمٰن کی قسم، خدا کی عزت و جلال کی قسم، خدا کی قدرت وکبریائی کی قسم، رب العلمین کی قسم، پروردگار کی قسم، تو قسم ہو گئی، یعنی ان تمام صورتوں میں کسی کام کے کرنے کی قسم کھائی ہے، تو نہ کرنے کی صورت میں اس کی قسم ٹوٹ جائے گی، اب خدا کی ذات وصفات کی حرمت کا یہ تقاضا ہے کہ اس جرم میں وہ کفارہ ادا کرے۔ مثلاً کسی نے کہا کہ میں خالد کے گھر نہ جاؤں گا، یا میں چاول نہ کھاؤں گا، یا حمید سے ایک ماہ نہ بولوں گا، یا فلاں کپڑا نہ پہنوں گا، تو جب خالد کے گھر کے اندر جائے گا، یا چاول کھائے گا، یا حمید سے ایک ماہ کے اندر بولے گا، یا وہ کپڑا پہنے گا تو اس کی قسم ٹوٹ جائے گی اور چونکہ اس نے خدا کے نام کو بلاوجہ ڈھال اور کھیل بنایا اس لئے اس کو کفّارہ دینا ہو گا، اسی طرح اگر کسی نے کہا کہ میں آج فلاں جگہ جاؤں گا، آج اتنی رکعت نماز پڑھوں گا، تو اگر نہ کرے گا تو کفارہ دینا ہو گا، اسی طرح اگر کسی نے یوں کہا کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ کام نہ کروں گا تو اس کا مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ یہ خدا کی قسم کھاتا ہے، کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قسم قرار دیا ہے[۱]۔ اسی طرح اگر کسی نے قرآن کی قسم کھائی تو گو قرآن کی قسم کھانا مناسب نہیں ہے۔ لیکن چونکہ کلام الٰہی بھی خدا کی ایک صفت ہے، اور اس کا مظہر قرآن ہے اس لئے اس کو صحیح قسم قرار دیا گیا ہے[۲]۔

دوسری زبانوں میں جو الفاظ خدا کی ذات و صفات کیلئے استعمال ہوتے ہیں

خدا کی ذات کے لئے عربی زبان میں اللہ اور فارسی زبان میں خدا استعمال ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ دونوں لفظ خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات کے لئے مخصوص ہو گئے ہیں۔ اگر کسی زبان میں کوئی لفظ خدا کی ذات یا اس کی صفت ہی کے لئے مستعمل ہوتا ہو۔ جس میں انسان شریک نہ ہو تو اس سے قسم کھائی جا سکتی ہے۔ مثلاً ہندی زبان میں ایشور[۳] کا لفظ ہے۔ اگر یہ لفظ صرف خدا ہی کے لئے استعمال ہوتا ہو تو وہ مسلمان جس کی مادری زبان ہندی ہی ہے، وہ اس لفظ میں قسم

---

[۱] اذا قال اقسم فهو حالف جوهره نيره ج ۲ صـ ۱۵۷ [۲] ولا يخفى ان الحلف بالقرآن متعارف فيكون يمينا (در مختار ج ۱ ص ۲۹۱)
[۳] ہندی دانوں کو اس کی تحقیق کر لینی چاہیئے۔

کھائے گا تو قسم ہو جائے گی، اسی طرح اگر دنیا کی اور زبانوں میں جو الفاظ صرف خدا کے نام کے لئے مخصوص ہوں، ان سے جب قسم کھائی جائے گی، تو قسم ہو جائے گی، نقایہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص فارسی میں کہے کہ:۔

سوگندمی خورم بخدا — میں خدا کی قسم کھاتا ہوں

تو یہ قسم قرار دی جائے گی، اس کی تشریح کرتے ہوتے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

وَكَذَا الْحُكْمُ لِسَائِرِ أَلْسِنَةِ الْعَجَمِ۔ (ج ۲ ص ۲۷۹) — یہی حکم تمام غیر عربی زبانوں کا ہے۔

غیر اللہ کی قسم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آدمی اگر قسم کھاتے تو خدا کے نام کی، ورنہ چپ رہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

مَنْ حَلَفَ لِغَيْرِ اللهِ فَقَدْ أَشْرَكَ (ترمذی) — جس نے خدا کے علاوہ کسی اور کی قسم کھائی تو اس نے شرک کیا۔

اس لئے عام طور پر جو لوگ اس طرح قسم کھاتے ہیں کہ عمر کی قسم، جوانی کی قسم، کعبے کی قسم، محمد کی قسم، کتاب کی قسم، یہ سب حرام ہیں۔

اللہ کی ایسی صفتیں جن سے عام طور پر خدا کی ذات مراد لی جاتی ہے، اس کی اجازت فقہاء نے دی ہے۔ لیکن جو صفات خدا کی مخصوص ذات کے لئے استعمال نہیں ہوتیں، یا ان سے خدا کی ذات کی طرف ذہن نہیں جاتا، ان کے ساتھ قسم کھانے سے منع کیا ہے، چنانچہ رسول کی قسم، نبی کی قسم، کعبے کی قسم، مدینے کی قسم، حتیٰ کہ بعض فقہاء نے قرآن کی قسم کھانے کو بھی غیر اللہ کی قسم میں داخل کیا ہے، لیکن بعض فقہاء نے اس کی اجازت اس لئے دی ہے کہ کلام خدا کی ایک مستقل صفت ہے اور قرآن اس کا مظہر ہے، اور پھر عام طور پر ہندوستان کے مسلمان قرآن کی قسم کھا کر خدا کی قسم ہی مراد لیتے ہیں، اس لئے اس کی اجازت دے دی گئی ہے، مگر اس اجازت کے باوجود اس سے پرہیز کرنا ہی بہتر ہے۔

گناہ کے کام کی قسم کھانا

اگر کوئی شخص کسی ایسے کام کے کرنے کی قسم کھا جائے، جس کا کرنا گناہ ہے، یا کسی نیک کام کے نہ کرنے کی قسم کھا جائے تو ایسی

قسم کھانا سخت گناہ ہے۔ ایسی قسم کو پوری کرنے کے بجائے توڑ دینا اور کفارہ دینا چاہیئے مثلاً کسی نے کہا کہ میں خدا کی قسم زندگی بھر روزہ نہ رکھوں گا، قرآن کی تلاوت نہ کروں گا، نماز نہ پڑھوں گا، زکوٰۃ نہ دوں گا، تو ایسی قسم کھانا سخت گناہ ہے، فوراً قسم توڑ دینا چاہیئے یعنی وہ نیک کام کر ڈالنا چاہیئے، مثلاً روزہ رکھ لینا چاہیئے، نماز پڑھ لینی چاہیئے، اور قرآن کی تلاوت کر لینی چاہیئے، اور قسم کا کفارہ دے دینا چاہیئے۔ اسی طرح یوں قسم کھائی کہ اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ آج فلاں کی فلاں چیز نقصان کروں گا، یا فلاں آدمی سے زندگی بھر نہ بولوں گا، یا فلاں کو گالی دوں گا یا ماروں پیٹوں گا، یا آج شراب پیوں گا، یا سینما دیکھوں گا، گویا جو کام شریعت میں حرام اور مکروہ ہیں ان کے کرنے کی قسم کھانا سخت گناہ ہے۔ اگر غلطی سے غصّے میں ایسی قسم کھا بیٹھے تو اس کو قسم توڑ دینی چاہیئے، یعنی وہ کام نہ کرنا چاہیئے، نہ تو چیز کا نقصان کرنا چاہیئے۔ نہ بات چیت چھوڑنی چاہیئے، نہ اپنی قسم پوری کرنے کے لئے کسی کو گالی گفتہ کرنا چاہیئے۔ نہ مار پیٹ کرنا چاہیئے، نہ شراب پینا چاہیئے۔ اور نہ سینما دیکھنا چاہیئے، بلکہ قسم توڑ کر اس کا کفارہ دینا چاہیئے۔

بعض ضروری مسائل

(۱) اگر کوئی کسی کو قسم دلادے، مثلاً یہ کہے کہ میں خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ یہ کام کر ڈالو، یا یوں کہا کہ اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں یا خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ تم یہ کام کرو، یا نہ کرو، تو اس سے قسم نہیں ہوتی۔

(۲) قسم کھا کر اگر انشاء اللہ کہہ دیا تو قسم نہیں ہوتی، مثلاً یوں کہا کہ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ انشاء اللہ یہ کام نہ کروں گا، تو یہ قسم نہیں ہوئی، یعنی اگر وہ کام کرے گا، تو کفارہ نہ دینا ہوگا۔

(۳) اگر کسی نے یہ کہا کہ خدا کی قسم آج پانی برسے گا، یا آج میرے یہاں کوئی مہمان ضرور آئے گا، اور پانی نہ برسا اور مہمان نہ آیا تو اس کو کفارہ دینا پڑے گا۔

(۴) کسی نے کہا کہ میں آج فلاں چیز نہ کھاؤں گا، یا فلاں سے نہ بولوں گا، تو اگر بھول کر کھالے، یا زبردستی کوئی کھلا دے یا اچانک بغیر ارادہ بول اٹھے تو بھی قسم ٹوٹ گئی اور کفارہ دینا ہوگا۔

قسم کا کفارہ

اگر کسی نے اپنی جائز قسم توڑ ڈالی، یا غیر شرعی قسم تھی اور شریعت کے حکم سے اس کے توڑ ڈالنے پر وہ مجبور ہوا تو ہر صورت میں اس کو کفارہ دینا پڑے گا، قرآن میں قسم کے کفارے کی ترتیب یہ بیان کی گئی ہے، جس کو استطاعت ہو وہ دس

محتاجوں کو دونوں وقت کھانا کھلادے، یا صدقۂ فطر میں جتنا غلہ دیا جاتا ہے، اتنا دس فقیروں کو دے دے، یعنی پونے دو سیر گیہوں، یا ساڑھے تین سیر جو، یا اس کی قیمت، اگر کھانا کھلانے میں دقت محسوس کرتا ہو، تو دس مستحقین کو کپڑا پہنا دے، اگر مرد کو کپڑا پہناتے، تو ایسا جوڑا دے کہ اس کا جسم ڈھک جائے، یعنی کرتہ، پائجامہ، یا پائجامہ کے بجائے لنگی، اگر عورت کو کپڑے دے تو ایسا دے کہ اس کو پہن کر وہ نماز پڑھ سکے، اتنا دینا واجب ہے، اگر اس سے زیادہ دے تو بہتر ہے۔ اگر کسی نے صرف ایک چادر دی تو کفارہ ادا نہ ہوگا۔

(۲) اگر کھانے یا کپڑے کی استطاعت نہیں رکھتا، یعنی وہ خود محتاج ہے تو اس کو یہ اجازت ہے کہ وہ مسلسل تین روزے رکھ لے، اگر تین روزے مسلسل نہ رکھے، بلکہ درمیان میں ناغہ کر دے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کفارہ ادا نہ ہوگا، یعنی جس طرح روزے اور ظہار کے کفارے کا حکم ہے، اسی طرح اس کا بھی ہے، مگر امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ مسلسل روزہ رکھنے کی قید کو ضروری نہیں سمجھتے، ان کی دلیل یہ ہے کہ روزے اور ظہار وغیرہ کے سلسلے میں مسلسل بلا ناغہ روزہ رکھنے کا حکم اس لئے دیا جاتا ہے کہ قرآن وحدیث میں اس کا حکم تسلسل کی قید کے ساتھ آیا ہے[1]، مگر یہاں تسلسل کی قید کے بغیر حکم ہے:۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ۔ (مائدہ)	جو شخص کھانا کپڑا دینے کی استطاعت نہیں رکھتا ہے، وہ تین دن روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے۔

---

[1] قرآن پاک میں شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ کے الفاظ آئے ہیں یعنی دو مہینے مسلسل روزے۔

مُعاملات

عقائد، عبادات اور معاشرتی احکام کے بعد اسلام میں سب سے زیادہ اہمیت ان وسائل و ذرائع کی ہے، جن کے ذریعہ انسان خود اپنی روزی کماتا ہے، اور بندگانِ خدا کی روزی کا سامان مہیّا کرتا ہے، عقائد و عبادات دراصل انسان کے قلب و روح کو اخلاقی غذا پہونچاتے ہیں، اور روح کے واسطے سے جسم پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے، اور معاشرتی احکام کے ذریعے اسلامی شریعت ایک اچھے اور پاکیزہ خاندان کی بنیاد ڈالتی ہے، جس کے ذریعہ ایک صالح اور پاکیزہ معاشرہ وجود میں آتا ہے، اور انسان کے روزی کے وسائل و ذرائع اصلاً اس کے جسم کو مادّی غذا پہونچاتے ہیں، اور روزی کے اچھے اور برے جتنے ذرائع ہوتے ہیں جسم کے واسطہ سے قلب و روح پر ان کا اثر پہونچتا ہے، اور اس کا اثر انسان کی اجتماعی زندگی پر پڑتا ہے، یعنی آپس کے معاملات جتنے اچھے اور عدل و انصاف پر مبنی ہوں گے، اسی اعتبار سے ہماری اجتماعی زندگی میں خوشگواری پیدا ہوگی، اور دنیا میں ترقی کی راہیں کھلیں گی، اور آپس کے معاملات جتنے خراب ہوں گے اسی اعتبار سے ہم زوال پزیر ہوں گے۔

ذرائع رزق و وسائل معاش تو بے شمار ہیں، لیکن عام طور پر دنیا میں تجارت، زراعت، صنعت، محنت، مزدوری، قرض، رہن اور مضاربت و شرکت اور ذہنی صلاحیت کے ذریعہ انسان کو روزی مہیّا ہوتی ہے، اور ان کے ذریعہ وہ اپنے جسم و جان کے رشتہ کو قائم رکھتا ہے، اور اپنے بال بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ اور ملک و ملت کو فائدہ پہونچاتا ہے، ان ہی

وسائل و ذرائع کو اسلامی شریعت میں معاملات کہتے ہیں۔

معاملات کے معنی

عربی میں عمل کام کو کہتے ہیں، اسی عمل سے معاملات بنا ہے، مگر معاملات صرف کام کو نہیں کہتے ہیں، بلکہ معاملات کے معنی ایسے کام کے ہیں جن میں کم از کم دو آدمی یا دو چیزوں کی شرکت ہوتی ہو، چنانچہ رزق کے ان تمام وسائل میں دو آدمی یا دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ تجارت میں خریدنے والے اور بیچنے والے ہوتے ہیں۔ زراعت میں کاشتکار اور دوسرے عوامل پیدائش ہوتے ہیں، محنت مزدوری کے کاموں میں اجیر و مستاجر یا مالک و مزدور ہوتے ہیں، مضاربت میں ایک کا روپیہ دوسرے کی محنت ہوتی ہے۔ شرکت میں دو یا دو سے زیادہ آدمی شریک ہوتے ہیں[1]

معاملات میں اسلامی ہدایات

معاملات میں اسلامی شریعت نے جو ہدایتیں دی ہیں، وہ دو طرح کی ہیں، ایک منفی اور دوسری مثبت، منفی سے مراد یہ ہے کہ ایسا نہ ہونا چاہیئے، اور مثبت سے مراد یہ ہے کہ یہ ہونا چاہیئے، مثبت ہدایات میں بنیادی ہدایت یہ ہے کہ جو معاملہ کیا جائے، اس میں تراضی یعنی فریقین کی رضامندی ہو اور منفی ہدایات میں بنیادی ہدایت یہ ہے کہ وہ معاملہ باطل نہ ہو، مثلاً خرید و فروخت کے معاملہ میں ضروری ہے کہ خریدار اور دوکاندار دونوں راضی ہوں، اسی طرح مزدور و مالک میں جب کوئی معاملہ طے ہو، تو ضروری ہے کہ دونوں کی رضامندی سے طے ہو، اگر ان میں سے کوئی راضی نہ ہوگا تو اسلام میں یہ معاملہ ناجائز قرار پائے گا، معاملات میں رضامندی کی حد تک اسلامی ہدایات اور دنیا کے دوسرے نظاموں کی ہدایات میں بڑی حد تک یکسانیت ہے، لیکن اسلامی شریعت نے رضامندی کے ساتھ جو دوسری منفی شرط لگا دی ہے، اس سے اسلامی معاملات، دنیا کے دوسرے نظاموں کے معاملات سے بالکل جدا ہو جاتے ہیں، اور وہ شرط یہ ہے کہ یہ رضامندی کسی باطل معاملہ اور کسی حرام چیز میں نہ ہو، مثلاً اگر کوئی تجارت یا زراعت کا معاملہ ایسا کیا جائے، جس میں سود کی

---

[1] بان المبادلة دالة على الرضا لانها من المفاعلة فلا يتم الا بالاثنين۔

(حاشیہ شرح وقایہ ج ۳ ص ۱)

آمیزش ہو، دھوکہ ہو، جھوٹ ہو، تو اسلامی شریعت میں ایسے معاملات کو حرام قرار دیا جائے گا، خواہ اس میں معاملہ کرنے والے آپس میں راضی ہی کیوں نہ ہوں، کیوں کہ اسلام نے ان چیزوں کو مستقلاً حرام قرار دے دیا ہے، اسی طرح صنعت و حرفت میں یہ منفی قید لگی ہوتی ہے مثلاً کوئی شخص شراب کا کارخانہ قائم کرے، یا ایسے سامان بنائے، جن سے زنا کی ترغیب ہوتی ہو، یا ان پر انسانی دولت بے کار ضائع ہوتی ہو، یا انسان کی بربادی کا سامان اس کارخانہ میں تیار ہو رہا ہو تو پھر ان صنعتوں کی اجازت نہیں دی جا سکتی، حتیٰ کہ مزدوروں کو ایسے کارخانوں میں کام کرنے سے بھی روکا جائے گا۔ گو ان کاموں میں صنّاع و خریدار مالک و مزدور آپس میں راضی ہی کیوں نہ ہوں، اس رضامندی کا اعتبار اس لئے نہیں کیا جائے گا کہ حرام پر رضامندی کی اجازت یا تو کسی شدید معاشی مجبوری کی وجہ سے دی جا سکتی ہے، یا جان و مال، عزت و آبرو کے خطرے کے وقت اور یہاں ان میں سے کوئی بات نہیں ہے۔

بعض فقہاء نے اسی بنا پر بیع کی تعریف میں مال مفید کی قید لگائی ہے[1] یعنی شریعت اس کی افادیت تسلیم کرتی ہو اور اسی شرعی افادیت کی بنا پر معاملات کے صحیح، فاسد اور باطل ہونے کی تقسیم کی گئی ہے! اسی کو فقہاء مال متقوم کہتے ہیں یعنی جن کی کوئی قیمت شریعت کی نگاہ میں ہو، اور حرام، باطل کی کوئی قیمت شریعت کی نگاہ میں نہیں ہے۔

ان ہدایتوں کا فائدہ دنیا میں

ان دونوں ہدایتوں کا نتیجہ اور مادی فائدہ دنیا میں یہ ہے کہ نہ تو معاملہ کرنے والوں میں کوئی اختلاف ہوگا، اور نہ ایک فریق دوسرے فریق پر ظلم کر سکے گا، اور یہ وسائل و ذرائع حرام و حلال کی پروا کئے بغیر نہ تو چند لوگوں کے لئے عیش و عشرت کا سامان مہیا کریں گے، اور نہ باقی لوگوں کے لئے مصیبت اور وبال ثابت ہوں گے، آج پوری دنیا اور خاص طور پر ہندوستان و پاکستان میں ضروریات زندگی کی جو قلّت اور گرانی ہے اور اس کی وجہ سے کم آمدنی رکھنے والے کسانوں،

---

[1] ھو ان البیع مبادلۃ مال مفید بمال مفید برضا (حاشیہ شرح وقایہ ج ۳ ص۲) اور جن حضرات نے "مبادلۃ المال بالمال بالتراضی" کے لفظ سے تعریف کی ہے اس میں انھوں نے المال میں الف لام عہد کا لیا ہے یعنی مال شرعی سے مال شرعی کا تبادلہ، مثلاً خنزیر اور خمر وغیرہ کچھ لوگوں کے یہاں مال سمجھا جاتا ہے مگر اسلامی شریعت اسے مال ہی نہیں تسلیم کرتی۔

مزدوروں اور تاجروں میں جو بے چینی پائی جاتی ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ معاملات میں نہ تو صحیح طور پر ان منفی قیدوں کی پابندی کی جارہی ہے اور نہ مثبت قیدوں کی[1]۔ معاملات میں سود و قمار کی آمیزش نے دنیا کو ایک معاشی جہنم بنا کر رکھ دیا ہے۔ اقبالؔ نے تو سود کے لئے کہا تھا کہ "سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات"، مگر اس وقت تو سود و قمار کے بطن سے نہ جانے مرگِ مفاجات کی نئی نئی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔

آخرت کے نقطۂ نظر سے

معاملات کے سلسلہ میں جو ہدایتیں دی گئی ہیں، وہ نہ صرف اس دنیا میں مادی حیثیت سے مفید ہیں، بلکہ ایک مسلمان کے لئے ان کی رعایت، آخرت میں کامیابی اور فلاح کا ذریعہ ہے، اور ان کی عدم رعایت دنیا میں بھی نقصان رساں ہے اور آخرت میں بھی، ناکامیابی و خسران کا سبب ہے۔

اگر کوئی مسلمان باطل، حرام اور تراضی کے بغیر کوئی معاملہ کرتا ہے تو وہ اس دنیا میں بھی کسی نہ کسی انسان کا حق مارتا اور نقصان کرتا ہے اور آخرت میں بھی اپنے لئے ناکامیابی اور خسران کا سامان فراہم کرتا ہے، چنانچہ قرآن نے باطل اور تراضی کے بغیر مال کمانے والوں کے فعل کو مادی حیثیت سے قتل اور ظلم سے تعبیر کیا ہے، اور آخرت میں دوزخ کی سزا کی دھمکی دی ہے:۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا[2]	اے ایمان والو! آپس میں اپنے مال کو باطل طریقہ سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ رضامندی کے ساتھ کوئی تجارت ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے،(اور باطل معاملہ کرکے) ایک

---

[1] اس کی پوری تفصیل راقم کی زیر طبع کتاب "اسلامی قانون تجارت" اور "اسلامی قانون اُجرت" میں ملے گی۔

[2] عام مفسرین نے "ولا تقتلوا انفسکم" کو الگ جملہ مان کر اس کی تفسیر قتل نفس ہی سے کی ہے، مگر سیاق و سباق کی بنا پر بعض مفسرین نے یہی تفسیر کی ہے، تفسیر ابن کثیر میں ہے۔ ای بارتکاب محارم اللہ وتعاطی معاصیه واکل اموالکم بینکم بالباطل۔ (مختصر تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۳۷۹)

أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ○ (النساء ۲۹، ۳۰)

دوسرے کو (معاشی طور پر) قتل نہ کرو، اللہ تمہارے اوپر رحیم ہے (تو تم بھی رحم کے خلاف رویہ اختیار نہ کرو)، اور جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا، اس کو ہم عنقریب آگ میں ڈالیں گے، اور اللہ کے اوپر یہ بہت آسان ہے۔

قرآن پاک نے یہاں باطل اور تراضی کی منفی اور مثبت دونوں قیدوں کا ذکر کرکے واضح کردیا کہ ان قیدوں کے ساتھ مالی لین دین کا جو معاملہ ہوگا وہ صحیح ہوگا، اور ان کا لحاظ کئے بغیر جو بھی مالی لین دین ہوگا وہ سب اپنی اپنی شناعت اور کچھ مزید خرابی کی وجہ سے مکروہ، ناجائز یا حرام ہوگا، اس کی پوری تفصیل حدیث نبوی میں ملے گی جس کا ذکر علیحدہ علیحدہ ابواب میں آرہا ہے۔

قرآن پاک کی اس آیت کے علاوہ دوسری آیات میں بھی أکل بالباطل اور عدم تراضی کا ذکر آیا ہے، مثلاً رشوت کے بارے میں ہے:۔

لَا تَأْكُلُوْٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ۔ (نساء)

آپس میں باطل طریقہ سے ایک دوسرے کا مال نہ کھا اس طرح کہ جھوٹے مقدمات حکام تک لے جاکر تم لوگوں کا کچھ مال گناہ طور پر کھاؤ۔

یتیم کے بارے میں ہے:۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۔ (نساء)

جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، اور عنقریب وہ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔

قرآن پاک کی انہی آیات اور احادیث نبوی کی روشنی میں فقہائے کرام پیش آمدہ مسائل میں صحیح، جائز یا ناجائز یا مکروہ کا حکم لگاتے ہیں، گویا قرآن پاک نے ان دو لفظوں میں سارے مالی

معاملات کا حکم بیان کر دیا ہے، مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ "قرآن نے یہاں تجارت کا لفظ استعمال کیا ہے، مگر اس کے تحت وہ تمام معاملات داخل ہیں، جن میں دو یا اس سے زائد آدمی شریک ہوتے ہیں، اور لین دین کرتے ہیں" فقہائے کرام نے بیع کی تعریف میں مبادلۃ المال بالمال بالتراضی کی جو قید لگائی ہے، اس سے سود، قمار، سٹہ، ذخیرہ اندوزی اور مستقبل کے سودے ساری صورتیں اس میں آگئی ہیں۔

تجارت نام ہے، مال کے بدلے مال یا سامان کے بدلے سامان کے تبادلہ کا، اگر ایک طرف مال یا سامان ہو اور دوسری طرف مال یا سامان نہ ہو تو یہ تجارت نہیں ہے، بلکہ وہ ایک طرح کا دھوکہ ہے۔ مثلاً سود کو لیجئے، سود کی رقم اس مقررہ وقت کا معاوضہ ہوتی ہے جو قرض یا اُدھار لیتے وقت مقرر کی جاتی ہے، اور ظاہر ہے کہ وقت مقررہ مال نہیں ہے، اس لئے یہ لین دین صحیح نہیں ہے اسی طرح سٹہ اور جوا اور لائٹری وغیرہ ہے اس میں ایک طرف تو مال ہوتا ہے اور دوسری طرف مال کا ہونا متعین نہیں ہے، ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ اسی طرح اس چیز کا سودا جو ابھی وجود میں نہیں آئی ہے، ایک طرف تو مال ہوتا ہے مگر دوسری طرف موہوم وعدہ ہوتا ہے، اسی لئے اس کو فقہاء نے بیع باطل قرار دیا ہے، اسی طرح جب عام استعمال کی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی کرلی جاتی ہے تو اس کی وجہ سے ان چیزوں کی گرانی ہو جاتی ہے۔ اب لوگ مجبور ہو کر اپنی ضرورت کے لئے انھیں خریدتے ہیں، مگر اس خریدنے میں ان کی رضامندی نہیں ہوتی بلکہ جبر ہوتا ہے اس لئے احتکار کو شریعت نے مکروہ قرار دیا ہے، اور حدیث میں ایسے شخص پر لعنت کی گئی ہے، اسی طرح سود، قمار، اور رشوت کے جتنے معاملات ہوتے ہیں بظاہر ان میں تراضی ہوتی ہے، مگر وہ تراضی عموماً مجبوری کی تراضی ہوتی ہے۔

غرض یہ کہ روزی حاصل کرنے کا جو معاملہ باطل اور عدم تراضی کی بنیاد پر کیا جائے گا، وہ دنیا میں ممکن ہے کہ اس کے لئے کچھ دنوں کے لئے مفید ہو جائے، مگر دوسرے بندگانِ خدا کے لئے دنیا میں اور خود اس کے لئے دنیا و آخرت دونوں میں مضر اور گھاٹے کا سبب ہوگا، اسی بنا پر قرآن نے حرام اور باطل طریقہ پر مال کھانے والوں کو "اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ" کہا ہے، سُحت کے معنی نیست و نابود کر دینے اور مٹا دینے کے ہیں، یعنی یہ ذریعہ رزق انجام کے اعتبار سے اپنے کو

بھی برباد ونیست ونابود کرتا ہے، اور دوسروں کو بھی نقصان پہونچاتا ہے۔ حدیث میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

لا یدخل الجنۃ لحم نبت من السحت وکل لحم نبت من السحت کانت النار اولیٰ بہا۔

حرام مال سے پلا ہوا جسم جنّت میں داخل نہ ہوگا، اور جو گوشت پوست حرام مال سے بنے، اس کی جگہ دوزخ ہے۔

جو معاملہ یا تجارت باطل اور سحت سے خالی ہو اور اس میں تراضی ہو، اسے اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل قرار دیا ہے اور اس فضل کے طلب کرنے کی ترغیب دی ہے، جمعہ کی نماز کا حکم دینے کے بعد کہا گیا ہے:-

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ۔ (جمعہ)

جب نماز ختم ہو جائے تو رزقِ حلال جو سراسر اللہ کا فضل ہے، اسے حاصل کرنے کے لئے زمین میں پھیل جاؤ۔

حج کے احکام بیان کرنے کے بعد کہا گیا:-

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ (بقرہ)

فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد اگر تم اللہ کا فضل بھی) اپنا رزق تلاش کرو تو کوئی گناہ نہیں ہے۔

حلال کمائی کی ترغیب

تراضی اور باطل کی بہت سی تفصیل تو قرآن نے کر دی ہے مگر اس کی پوری تفصیل آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وفرمودات میں ملے گی ان ہی کی روشنی میں فقہائے کرام نے ہزاروں مسئلے مستنبط کئے ہیں، آپ نے سب سے پہلے اپنے ہاتھ کی کمائی پر زور دیا، کیونکہ ہاتھ کی کمائی میں باطل اور سحت کا شائبہ کم پایا جاتا ہے۔ حضرت مقداد بن معدیکربؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ:-

مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا خَيْرًا مِّنْ اَنْ يَّاْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِہٖ۔ (بخاری، مشکوٰۃ ج ا صـ۲۴۱)

کوئی روزی اس سے بہتر نہیں ہے، جو محنت مزدوری کر کے حاصل کی گئی ہو۔

آپ نے خود اپنے بارے میں فرمایا کہ میں قریش کی بکریاں ایک قیراط روزانہ پر چراتا تھا، اسی طرح حضرت داؤد، حضرت ادریس اور بعض دوسرے انبیاء کے بارے میں حدیث میں آیا ہے، کہ وہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کماتے پیتے تھے[۱] آج یہ ایک ذلیل چیز سمجھی جاتی ہے، لیکن انہی ہدایات کی بنا پر صحابہ اور بزرگان ملت کی بیشتر تعداد اپنے ہاتھ کی کمائی پر گزارہ کرتی تھی، ان میں کتنے لوگ لکڑی کا کام کرتے تھے اور کتنے لوگ لوہار کا، کتنے سُنار تھے، کتنے کمہار تھے، کتنے موچی تھے، کتنے کپڑا بنتے تھے، کتنے کسان تھے، اور کتنے روزانہ معمولی مزدوری کر کے گذر بسر کرتے تھے، اور معاشرہ میں اپنے علم و فضل کی وجہ سے ان کا وہ مقام تھا جو بڑے بڑے سادات و شیوخ کو حاصل نہیں تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حرام مال سے جو عبادت کی جائے وہ خدا کے یہاں مقبول نہیں ہوتی، آپ نے فرمایا ہے کہ "حرام مال سے پلا ہوا جسم کچھ دن جہنم میں جلے بغیر جنت میں نہیں جا سکتا۔ اور نہ اس کی دعا مقبول ہوگی"[۲] حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ:۔

یاتی علی الناس زمان لایبالی	ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ آدمی اس کی پروا
المرء ما اخذ منہ أمِن الحلال	نہیں کرے گا کہ یہ مال حلال ذریعہ سے
ام من الحرام (بخاری)	کمارہا ہے یا حرام ذریعہ سے۔

حلال و حرام مال کے بارے میں ایک عبرت خیز روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے:۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ	انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
علیہ وسلم ان اللہ طیب لایقبل	نے فرمایا کہ اللہ پاک ہے اور پاک ہی
الا طیبا و ان اللہ امر المومنین	مال کو قبول کرتا ہے، اور اس نے مومنین
بما امر بہ المرسلین فقال	کو بھی وہی حکم دیا ہے جو اس نے اپنے رسولوں
یٰاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ	کو دیا تھا کہ اے رسولو! پاک روزی کھاؤ
الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا	اور اچھے عمل کرو، پھر مومنین سے اس نے

---

[۱] ان نبی اللہ داؤد علیہ السلام کان یاکل من عمل یدیہ (بخاری) حدیث میں آتا ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا ہے جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ [۲] مشکوۃ ج ۱ ص ۲۴۲۔

وقال تعالیٰ یاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَارَزَقْنَاکُمْ ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدیہ إلی السماء یارب یارب ومطعمہ حرام ومشربہ حرام وملبسہ حرام وغذی بالحرام فانی یستجاب لذالک۔ (مسلم)

کہا کہ اے ایمان والو! پاکیزہ روزی کھاؤ، پھر آپ نے ایک ایسے شخص کا ذکر فرمایا کہ جو لمبے سفر میں ہے (اور سفر میں دعا قبول ہوتی ہے) اور یارب کہہ کر وہ دعا کرتا ہے تو اس کی دعا کیسے قبول ہوگی، جب کہ اس کا کھانا پینا اور لباس سب کچھ حرام ہے، اور حرام ہی میں وہ پلا بڑھا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ ”جس نے کسی کی ایک بالشت زمین ظلم سے دبالی، قیامت کے دن اسے لعنت کا طوق پہنایا جائے گا“۔ آپ نے فرمایا کہ حلال روزی طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے[1] آپ نے فرمایا کہ ”حلال مال طلب کرنے کا اجر جہاد کے برابر ہے۔

معاملات کے بارے میں یہ تو قرآن وسنّت کی عام ہدایات تھیں، اب ہم الگ الگ ان تمام معاملات کے بارے میں قرآن وسنت کی ہدایات اور ان کی روشنی میں فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے جو اجتہادات کئے ہیں ان کی تفصیل پیش کرتے ہیں، مگر اس سے پہلے حرام وحلال اور مکروہ چیزوں کی فہرست پر ایک نظر ڈال لینی ضروری ہے، کیونکہ معاملات کے بیان میں بار بار ان کا ذکر آئے گا۔

حرام وحلال اور مباح چیزیں

فقہائے کرام اپنی کتابوں میں ایک باب ”باب الحظر والاباحۃ“ کا باندھتے ہیں، اس میں وہ ان چیزوں کا ذکر کرتے ہیں، جن کا کھانا یا پہننا حرام یا مکروہ ہے، یا ان کا کھانا درست اور مباح ہے، پھر ان میں سے کن چیزوں کی خرید وفروخت جائز ہے، اور کن چیزوں کی خرید وفروخت حرام یا مکروہ یا مباح ہے، قرآن پاک میں ہے:۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا

آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے

---

[1] مشکوٰۃ، ص ۲۴۲،

عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

(الانعام)

پاس آتے ہیں، ان میں تو میں کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے، مگر یہ کہ وہ مردار (جانور) ہو یا بہتا ہوا خون یا خنزیر کا گوشت ہو، کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے جو (جانور) شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو تو جو شخص بیتاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو، اور نہ تجاوز کرنے والا ہو تو بقدر ضرورت وہ اسے کھا سکتا ہے واقعی آپ کا رب غفور و رحیم ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن پاک میں جہاں تمام پاکیزہ چیزوں کے کھانے اور استعمال کرنے کا حکم دیا وہی حرام چیزوں کے کھانے اور ان کے استعمال خرید و فروخت سے منع بھی کیا ہے:۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ۔

(مائدہ)

تم پر حرام کئے گئے ہیں مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جو جانور کہ غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو اور پھر گلا گھٹنے سے مر جائے اور جو کسی ضرب سے مر جائے اور جو اونچے سے گر کر مر جائے اور جس کو کوئی درندہ کھانے لگے، لیکن جس کو ذبح کر ڈالو اور جو جانور پرستش گاہوں پر ذبح کیا جائے اور یہ کہ تقسیم کرو پروں کے ذریعہ قرعہ ڈال کر، یہ سب گناہ ہیں۔

اسی طرح حدیث شریف میں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے:۔

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كل ذى ناب من السباع وكل ذى مخلب من الطير۔

(المنتقی ج ۲ ص ۸۶۴)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درندوں اور شکار کرنے والے پرندوں کے کھانے سے منع فرمایا ہے۔

قرآن پاک کی مذکورہ آیات اور مذکورہ حدیث کے علاوہ متعدد آیات اور احادیث نبوی کی روشنی میں فقہاء نے جانوروں، پرندوں کے بارے میں یہ احکام مستنبط کئے ہیں۔

حظر و اباحت کی تعریف صاحب درمختار نے ان الفاظ میں کی ہے:۔

والحظر لغة المنع والحبس وشرعًا ما منع من استعماله شرعًا والمحظور ضد المباح والمباح ما اجيز للمكلفين فعله وتركه بلا استحقاق ثواب وعقاب نعم يحاسب عليه حسابًا يسيرًا۔ (ج ۵ ص۲۱۳)	حظر کے لغوی معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں، اور شریعت میں جس کے استعمال سے روک دیا گیا ہو اسے محظور کہتے ہیں اور مباح اس کی ضد ہے، یعنی مباح وہ چیز ہے جس کے کرنے میں عذاب نہیں اور چھوڑنے میں ثواب ضروری نہیں ہے، البتہ اس کے استعمال میں قیامت کے دن ہلکا حساب وکتاب ہوگا۔

اس سے پہلے حرام، مکروہ اور مباح وغیرہ کا ذکر طہارت ونجاست کے بیان میں اس حیثیت سے آچکا ہے کہ ان میں سے کون سی چیزیں نجس و ناپاک ہیں، اور کون کون طاہر و پاک ہیں، اب یہاں ان چیزوں کا ذکر خرید و فروخت اور اس کے استعمال کے نقطۂ نظر سے کیا جا رہا ہے، چونکہ معاملات کے بیان میں ہر جگہ ان کا ذکر آئے گا، اس لئے اکٹھا ان کی فہرست دی جا رہی ہے، تاکہ آگے جب ان کا حکم بیان کیا جائے تو آسانی سے وہ ذہن نشین ہو جائے۔

حرام اور مُردار جانور

سُور، کتّا اور جو جانور یا پرندے شکار کرتے ہیں، ان کا کھانا حرام ہے، اور ان میں سے بعض کی خرید و فروخت بھی ناجائز ہے، مثلاً شیر، چیتا، بھیڑیا گینڈا، سیار، خرگوش، لومڑی[1]، بلّی بندر، گدھا، خچر، ہاتھی وغیرہ، اسی طرح

---

[1] گوہ (ضبّ) اور لومڑی کے بارے میں بعض احادیث سے ان کا مباح ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مگر احناف اسے مکروہ تحریمی کہتے ہیں، اس لئے کہ حضورؐ نے خود اس کے کھانے کو ناپسند فرمایا ہے (المنتقی ج ۲ ص۸۶۶) اور جن احادیث سے ان کا مباح ہونا ثابت ہوتا ہے اسے قرآن کی آیت يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ سے منسوخ قرار دیتے ہیں۔

پرندوں میں شکرا، باز، شاہین، گدھ[1]، چیل، چمگادڑ وہ کوّا جو مردار کھاتا ہو، مردار خواہ چرند ہوں یا پرند، سب کا کھانا اور بیچنا حرام ہے، آگے اس کی مزید تفصیل آرہی ہے:

کبوتر، گوریا، مینا، مور، بگلا، ٹڈی وغیرہ حلال ہیں۔

مچھلی اور پانی کے دوسرے جانور

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مچھلی اور مچھلی کی شکل کے جو دریائی جانور ان کو حلال سمجھتے ہیں، بقیہ سارے دریائی جانوروں کو وہ حرام کہتے ہیں، جیسے کیکڑا، مینڈک، کچھوا، سونس، گھڑیال وغیرہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تمام دریائی جانوروں کو حلال کہتے ہیں[2] جھینگا کے بارے میں بعض علماء عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، مگر یہ جائز ہے، اسے عربی میں روبیان کہتے ہیں، مولانا عبد الحئی صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی عبد الرحیم صاحب وغیرہم نے اسے جائز لکھا ہے۔ کتاب الحیوان دمیری کے حوالے اور دوسرے حوالوں سے لکھا ہے:۔

الربیان ھو السمك صغیر جدًا   رُوبیان ایک چھوٹی مچھلی ہے۔

(فتاویٰ رحیمیہ۔ ج ۶ ص ۲۵۸، ۲۵۹)

سانپ، بچھو

حشرات الارض یعنی زمین پر رینگنے والے قسم کے جتنے جانور ہیں وہ سب حرام ہیں مثلاً سانپ، بچھو، چوہا، نیولا۔

کیڑے مکوڑے

زندہ یا مردہ کیڑوں مکوڑوں کا کھانا جائز نہیں، البتہ گھُن وغیرہ جو گیہوں وغیرہ میں رہتے ہیں اور اس کے ساتھ پسے جاتے ہیں ان کے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بھڑ، شہد کی مکھی کا کھانا جائز نہیں، اگر وہ شہد میں بالکل مل جائے تو وہ شہد بھی نہ کھانا چاہیئے۔

---

[1] گدھا اور خچر اور شکاری جانوروں کے گوشت کے کھانے کے بارے میں صراحۃً حدیث میں ممانعت آئی ہے اسی طرح لومڑی، سیار، اور گرگٹ وغیرہ کا ذکر بھی حدیث میں کراہت کیساتھ آیا ہے (المنتقی ج ۲ صفحہ ۸۶۷)

[2] الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۲ صفحہ ۳-۲

اوپر مردار اور گھائل جانوروں کے سلسلے میں قرآن پاک کی آیت کا ذکر آچکا ہے، اب ان جانوروں اور پرندوں کی مزید کچھ تفصیل کی جاتی ہے۔

مردار اور دوسرے گھائل جانور اور پرندے

مردار جانور تو وہ ہوتے ہیں جو اپنی طبعی موت سے مر جاتے ہیں، مگر بعض جانور اور پرندے چوٹ کھا کر یا ٹکرا کر مر جاتے ہیں، ان سب کا حکم ایک ہے:۔

(۱) منخنقہ: وہ جانور جس کی گردن مروڑ کر مار ڈالا گیا ہو، ہندو اور غیر مسلم ایسا بہت کرتے ہیں۔

(۲) موقوذہ: وہ جانور جو کسی لوہے یا ڈنڈے وغیرہ سے مار کر ہلاک کر دیا گیا ہو۔

(۳) متردیہ: وہ جانور جو کسی اونچی جگہ سے گر کر مر جائے۔

(۴) نطیحہ: وہ جانور جسے کسی دوسرے جانور نے سینگ سے مار کر ہلاک کر دیا ہو۔

چاروں قسم کے جانور یا پرندے اگر وہ حلال ہیں اور جان باقی ہے تو ذبح کر کے کھانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر مر گئے تو کھانا حرام ہے، بندوق کے شکار کو بھی موقوذہ میں شمار کیا گیا ہے بندوق وغیرہ سے بسم اللہ کر کے جو شکار کیا جائے اسکے بارے میں علماء کو دوبارہ غور کرنا چاہیئے کہ یہ موقوذہ ہے یا نہیں؟

انسان

انسان کا خون، گوشت، ہڈی، چمڑا، ہر چیز کا کھانا یا ان میں سے کسی کا استعمال کرنا یا فروخت کرنا حرام ہے۔

جلالہ

وہ جانور یا پرندے جن کی غذا غلاظت اور گندگی ہے ان کو جلالہ کہتے ہیں خواہ وہ مرغی وبط ہو، یا گائے، بھینس اور اونٹ ہو، ایسے پرندوں اور جانوروں کا دودھ اور گوشت مکروہ ہے، اور ان کا جھوٹا بھی ناپاک ہے، ان کو کچھ دن بند کر کے یا باندھ کر رکھا جائے، تو ان کا دودھ اور گوشت استعمال کرنا جائز ہے، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے۔ البتہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نجاست کھانے والے جانوروں اور پرندوں کے گوشت کو مباح کہتے ہیں، اور دودھ کو مکروہ کہتے ہیں، اوپر جن جانوروں اور پرندوں کے حرام یا مکروہ ہونے کا ذکر ہوا ہے، وہ اپنی اندرونی گندگی اور خباثت کی وجہ سے حرام یا مکروہ ہیں۔

مگر انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اس لئے احتراماً اس کی زندگی میں یا موت کے

بعد اس کے جسم کی ہر چیز کا استعمال حرام ہے، اس کا خون بھی حرام ہے، مگر علاج کیلئے خون کے استعمال کی گنجائش ہے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔

نشہ آور چیزیں

نشہ آور چیزیں خواہ کھانے والی ہوں یا پینے والی سب حرام ہیں۔ مثلاً شراب، تاڑی اور اس کی ساری قسمیں اسپرٹ، افیون، گانجا، بھانگ، الکحل، چرس، کوکین، ہیروئن وغیرہ یہ تمام چیزیں اس میں شامل ہیں، فقہائے کرام نے ذیل کی آیات اور احادیث نبوی کی روشنی میں تمام نشہ آور چیزوں کے حرام یا مکروہ ہونے کا فتویٰ لگایا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ	اے ایمان والو! شراب، جوا اور بت اور قرعہ کے تیر یہ سب حرام اور شیطان کے اعمال ہیں، تم ان سے پرہیز کرو۔

(الانعام)

قرآن پاک نے کچھ حرام چیزوں کی قانونی حقیقت بیان کرنے کے بعد اخلاقی حقیقت سے ان کے نقصانات کی طرف توجہ دلائی ہے:۔

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۝	شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان عداوت اور بغض وحسد ڈال دے، شراب اور جوئے کے ذریعے اور تم کو اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روک دے۔

(مائدہ)

دوسری آیت میں نشہ آور چیزوں اور جوئے کے نفع و نقصان کی اخلاقی حیثیت کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے:۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ	اور وہ شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں تو ان سے کہہ دیجئے اس میں گناہ ہیں اور لوگوں کے کچھ فوائد بھی مگر گناہ

مِن نَّفْعِهِمَا ۔ (سورہ بقرہ) اور نقصان نفع سے بہت زیادہ ہے۔

ان آیات میں نشہ آور چیزوں کے حرام ہونے کی دس دلیلیں بیان کی گئی ہیں :۔

(۱) ایک یہ کہ اس کو جوا اور اس کی قسموں کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے، اس لئے اسی طرح یہ بھی حرام ہے (۲) ان کو رِجْسٌ کہا گیا ہے اور رِجس حرام کو کہتے ہیں (۳) اس کو شیطان کا عمل کہا گیا ہے (۴) اس سے بچنے کا حکم ہے (۵) فلاح کو اس سے بچنے پر منحصر کیا گیا ہے (۶) اس کے ذریعہ شیطان آپس میں عداوت پیدا کر دیتا ہے (۷) شیطان اس کے ذریعہ بغض وحسد پیدا کر دیتا ہے (۸) شراب نوشی ذکر اللہ سے دور کر دیتی ہے (۹) نماز سے غفلت ہو جاتی ہے، (۱۰) آخر میں استفہام کی صورت میں اس کی مذمت کر دی ہے فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیشمار احادیث میں شراب پینے والوں کی مذمت فرمائی ہے، ایک حدیث میں ہے :۔

لا یشرب الخمر حین یشرب وھو مومنٌ۔ (مشکوٰۃ) مومن ہوتے ہوئے کوئی شراب نہیں پی سکتا۔

آپ کے پاس ایک شرابی لایا گیا تو آپ نے فرمایا اس کو مارو اور سزا دو، اور خود آپ نے اس کے چہرے پر خاک ڈالدی (ابو داؤد)

شراب مختلف چیزوں سے بنائی جاتی ہے، مثلاً انگور، کھجور، جو وغیرہ۔ تو وہ خواہ کسی چیز سے بنائی گئی ہو سب حرام ہے، خمر کے سلسلہ میں عبدالرحمٰن الجزیری کی مندرجہ ذیل عبارت سے پوری وضاحت ہو جاتی ہے :۔

والخمر: ماخامر العقل	خمر اس نشہ کو کہتے ہیں جو عقل کو ماؤف
أی خالطه فأسکرہ وغیبهٗ	کر دے، پھر اس کے استعمال سے وہ
فکل ما غیب العقل فھو خمر۔	نشہ میں ہو جائے، اور آپے سے باھر
سواء کان مأخوذا من العنب	ہو جائے، تو جو چیز آدمی کو آپے سے باہر
المغلی علی النار: أو من التمر	کر دے وہ خمر (شراب) ہے، چاہے وہ
أو من العسل أو لحنطه	انگور کو آگ پر جوش دے کر بنائی جائے

أو الشعير حتى ولو كان مأخوذًا من اللبن أو الطعام أو أي شئ وصل الى حد الاسكار وقد بين النبي صلى الله عليه وسلم أن كل ما أسكر كثيرة فقليله حرام۔ (رواه أبو داؤد، رواه الترمذي وابن ماجه والبيهقي)

یا کھجور سے تیار کی جاتے یا شہد یا گیہوں یا جو سے تیار کی جاتے، یہاں تک کہ اگر دودھ یا کھانا یا کوئی اور چیز جو نشہ آور ہو جاتے تو اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمادی ہے کہ وہ حرام ہے۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی)

جس کا زیادہ حصہ نشہ لاوے اس کا تھوڑا حصہ بھی حرام ہے۔

اس وضاحت سے بیئر کا حکم بھی معلوم ہو گیا جسے بعض مسلمان جائز سمجھتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ جو شراب جو یا گیہوں سے بنائی جائے تو اس کا تھوڑا استعمال حرام نہیں ہے، مگر امام محمد اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ ان احادیث کی بنا پر جن میں سے (ما اسکر الفرق فملأ الکف) آیا ہے اس کو بھی حرام کہتے ہیں اور فقہ حنفی میں اسی پر فتویٰ ہے، جو کہ شراب جسے بیر کہتے ہیں، مغربی تہذیب کے اثر سے جن کا مسلمان ملکوں میں بھی رواج ہو گیا ہے۔ یہاں کے بعض مسلمان ملک کے علماء اسے جائز سمجھتے ہیں اور اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کی رائے نقل کرتے ہیں، اس کے بارے میں عبدالرحمٰن الجزیری لکھتے ہیں:

يظن بعض شاربي البيرة و نحوها أن قليلها حلال في مذهب الحنفية: والواقع أن قليلها وكثيرها حرام في مذهب الحنفية كسائر

بعض بیر (Been) کے پینے والوں کا خیال ہے کہ اس کا تھوڑا سا حصہ پینے میں فقہ حنفی کی رو سے کوئی حرج نہیں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا کم یا زیادہ سب حصہ حرام ہے، جس طرح دوسرے ائمہ کے یہاں

المذاهب على الصحيح المفتى به بل هي حرام عند الحنفية باجماع ارائهم وذالك لأن الخلاف وقع في ثلاثة أمور، اولا: المثلث وهو مايطبخ من العنب حتى يذهب ثلثاه ويبقى ثلثه ويسكر كثيره لا قليله ويسمى "طلا" ثانيا: نبيذ التمر وهو ما يطبخ طبخا يسيرا ويسكر كثيره لا قليله، ثالثا: مايؤخذ من الشعير والحنطة ونحوهما مماذكر اذا أسكر كثيره لا قليله، فأبوحنيفة وابو يوسف يقولون ان الذى يحرم هو كثير هذا لا قليله، ومحمّد يقول: ان كثير هذا وقليله حرام كغيره، وهو قول الائمة الثلاثة، وقول محمد هو الصحيح المفتى به في المذهب، فمذهب الحنفية هو، مذهب محمد حينئذ، على أنهم أجمعوا على أن القليل الذى لا يسكر اذا كان يؤخذ للهو والتسلية،

حرام ہے اور فقہ حنفی کا متفقہ صحیح اور فقہی مسلک یہی ہے۔

اس لئے کہ اختلاف تین چیزوں میں ہے:

مثلث: (Cocklail) پکایا ہوا وہ انگور جس کا دو تہائی حصہ جاتا رہے، اور ایک تہائی حصہ باقی رہے اس طرح کے مشروب کا زیادہ حصہ نشہ آور ہوتا ہے، تھوڑا نہیں اسے طلل بھی کہتے ہیں۔

۲۔ کھجور سے بنائی ہوئی نبیذ جسے تھوڑا پکا لیا جائے اور اس کے زیادہ پینے سے سکر کی کیفیت طاری ہو کم پینے سے نہیں۔

۳۔ وہ مشروب جو جَو اور اس کے بالی سے کشید کیا گیا ہو، اس کا زیادہ حصہ نشہ آور ہے کم نہیں، امام ابوحنیفہ رح اور امام ابویوسف رح کہتے ہیں کہ اس کا زیادہ حرام ہے کم نہیں اور امام محمد رح کہتے ہیں کہ جس طرح دوسری نشہ آور چیزوں کا کم اور زیادہ، سب حرام ہے اسی طرح اس کا بھی یہی مسلک ائمہ ثلثہ (امام شافعی، امام احمد اور امام مالک) کا بھی ہے، فقہ حنفی میں امام محمد کا قول مفتی بہ ہے اور امام محمّد کا مسلک ہی حنفیہ کا مسلک ہے حنفی فقہ کے ائمہ کے مابین اس اختلاف کے باوجود اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ مشروب جس کا کم حصہ نشہ آور ہے، اگر تسلی طبع اور تفریح قلب کی غرض سے استعمال کیا جائے، جیسا کہ اس کے پینے والے کرتے ہیں، اس کا

كما يفعل هؤلاء الشاربون،	مقصود بدن کو تقویت پہونچانا نہ ہو
لا لتقوية البدن الضعيف	تو وہ سراسر حرام ہے خواہ ایک ہی
فهو حرام كالكثير تماما	قطرہ کیوں نہ ہو۔
ولو قطرة واحدة۔	بیر اور شراب کی تمام قسمیں خواہ کم
فالبيرة وجميع أنواع الخمور	ہوں، یا زیادہ تمام ائمہ اور مسلمانوں
محرمة، قليلها وكثيرها	کے نزدیک شرعاً حرام ہے۔
على الوجه المشروع عند جميع	(الفقه على المذاهب الاربعة)
أئمة وجميع المسلمون۔	لعبد الرحمٰن الجزيري ص۷ الجزء الثانی قسم المعاملات

اس اختلاف کی بنیاد میں اصلاً یہ پہلو شیخین کے پیش نظر رہا کہ حدِّ خمر کس مقدار پر جاری کی جائے ورنہ اس کے حرام ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے (مرتب)

قریب قریب یہی حکم افیون، کوکین، بھانگ، گانجا، ہیروئن وغیرہ کا ہے۔

حلال وحرام ومکروہ چیزوں کا حکم

(۱) جو جانور حرام ہیں ان کی خرید وفروخت بھی بغیر کسی عذر شدید کے حرام ہے، اگر ان کے سینگ، کھال اور چمڑے کو سجا کر استعمال کیا جائے یا ان کی خرید و فروخت کی جائے، یا ان کا کوئی سامان بنا کر بیچا جائے تو جائز ہے، لیکن سور کا چمڑا یا اس کی اور کوئی چیز کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتی، اسی طرح انسان کے کسی حصہ یا عضو کی خرید وفروخت احتراماً جائز نہیں ہے[1]

(۲) مردار۔ اگر مردار کا گوشت یا چمڑا کوئی بیچے تو یہ حرام ہے، لیکن اگر اس کا چمڑا سجھا کر یا پکا کر کوئی بیچے تو جائز ہے۔ بغیر سجھاتے ہوتے اس پر خرید و فروخت کا معاملہ کرنا جائز نہیں۔

(۳) جو جانور یا پرندے شکار کھاتے یا ان کی غذا صرف گندگی ہے، ان کا کھانا جائز نہیں ہے،

---

[1] اذا دبغ ما لا يوكل لحمه طهر جلده ولحمه الا الآدمي والخنزير (ہدایہ ج ۴)

جیسے شیر، چیتا، بھیڑیا، گیدڑ، شکرا، باز، گدھ، چیل وغیرہ[1] ان کا کاروبار بھی کراہت سے خالی نہیں ہے۔

(۴) نشہ آور چیزیں، مثلاً ہر قسم کی شراب، تاڑی، افیون، بھنگ، گانجا، چرس حرام ہیں۔

(۵) تمام زہریلی چیزیں حرام ہیں، مثلاً سنکھیا وغیرہ۔

(۶) سونے اور چاندی کا استعمال عورتوں کے لئے جائز ہے، مگر مردوں کے لئے حرام ہے، عورتوں کے لئے بھی اسی حد تک جس حد تک ان کے جسم کی زینت کا تعلق ہے، مگر ان کے برتن، چمچے، پاندان، خاصدان، گھڑی اور شیشے کا استعمال جائز نہیں ہے۔

(۷) مردوں کے لئے تمام ریشمی کپڑے حرام ہیں۔ لیکن گدّے یا لحاف وغیرہ میں ان کی گوٹ لگ جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

(۸) سود، اس کی جتنی بھی قسمیں ہوں وہ حرام ہیں، ان کی تفصیل آگے آئے گی۔

(۹) جوا۔ اس کی جتنی قسمیں ہیں۔ مثلاً لاٹری، سٹہ بازی، گھوڑ دوڑ پر شرط، غائب مال کی خرید و فروخت وغیرہ، دھوکہ و فریب کے ذریعہ جو تجارت کی جائے وہ بھی اسی میں داخل ہے۔

(۱۰) ناچ، گانا اور اس کا وہ تمام سامان جو صرف اسی مقصد کے لئے بنائے گئے ہوں، ان کا کاروبار حرام ہے، آگے ریڈیو وغیرہ کی تفصیل آئے گی۔

(۱۱) جاندار کی مصوّری، فوٹو گرافی، تصویر سازی اور فلم سازی جس میں رقص و سرود اور عورتوں کی نمائش کی گئی ہو، حرام ہے۔

ان چیزوں کے استعمال میں تھوڑا فرق ہے

اس میں کچھ چیزیں تو ایسی ہیں کہ ان کی صنعت اور خرید و فروخت یا خرید و فروخت و صنعت میں ان کی آمیزش کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتی، مثلاً سود، جوا، ناچ گانے کے سامان، شراب اور دوسری نشہ آور چیزیں وغیرہ، لیکن ان میں کچھ

---

[1] عن ابن عباس نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن کل ذی ناب من السباع وکل ذی مخلب من الطیر۔ (ابو داود، نسائی بحوالہ المنتقی ج۲ ص۸۶۴)

چیزیں ایسی ہیں، جن کا استعمال تو ناجائز و حرام ہے، مگر ان کی خرید و فروخت حرام نہیں ہے مثلاً ریشمی کپڑے صرف مردوں کے لئے حرام ہیں، اور چاندی سونے کے سامان مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے حرام ہے، مگر عورتوں کے لئے ریشمی کپڑے اور سونے چاندی کے زیور حلال ہیں، اس لئے ان کی خرید و فروخت حرام نہیں ہے۔ حرام جانوروں اور مردار کا گوشت اس کی چربی ہر حال میں[1] حرام ہے، لیکن اگر اس کی ہڈی، سینگ اور بال کا استعمال کیا جائے تو جائز ہے، اسی طرح مردار کی کھال کو پکانے اور سجھانے سے پہلے استعمال کرنا اور بیچنا تو جائز نہیں ہے لیکن اگر وہ پکا کر یا سجھا کر بیچی جائے تو جائز ہے، مگر سور کی کوئی چیز کسی حال میں حلال نہیں ہے۔ اسی طرح مردار کی چربی کھانے کے علاوہ دوسرے استعمال میں لائی جائے تو جائز ہے۔

تجارت

انسان کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کی چیزیں فراہم کرنے کے سب سے بڑے دو ذریعے ہیں، ایک تجارت، دوسرے زراعت، بلکہ موجودہ دور میں تو زراعت، صنعت، اور دوسری تمام ضروریات زندگی تجارت ہی کی تابع ہوگئی ہیں، اگر تجارت صحیح طریقہ پر نہ کی جائے تو کسی حال میں خواہ کتنا ہی زیادہ غلہ، کپڑا، اور دوسری ضروریات کی چیزیں کیوں نہ پیدا کی جائیں اس کی کمی اور گرانی ہی رہے گی[2] مثال کے لئے ہندوستان میں غلہ کے بھاؤ کو لے لیجئے، ۱۹۵۷ء میں ہندوستان میں جتنا غلہ پیدا ہوا، ۱۹۶۳ء میں اس سے

---

[1] مردار کی چربی کے بارے میں بعض فقہاء نے یہ اجازت دی ہے کہ اگر کسی چیز پر لگانے کے کام لائی جائے تو مباح ہے لیکن حدیث میں مطلقاً اس کی نفی کی گئی ہے اس لئے اس اجازت کو کسی مجبوری پر محمول کرنا چاہیئے۔

[2] امام سرخسیؒ نے اسی لئے لکھا ہے، فالاشتغال بما یکون نفعه اعم یکون افضل۔ (المبسوط ج ۳۰ ص ۲۵۹ کتاب الکسب)

دو تین فیصدی زیادہ پیدا ہوا، ۱۹۵۷ء میں اس کا جو بھاؤ تھا، ۱۹۶۳ء میں اس میں تقریباً ۳۰ فیصدی سے لے کر چالیس فیصدی تک اضافہ ہوا، یعنی جو گیہوں ۱۵ روپے من بکتا تھا وہ ۲۰-۲۲ روپے من بکنے لگا، اور پھر ۱۹۷۱ء میں یہ بھاؤ بڑھ کر ۴۵ روپے من تک ہو گیا، اور ۱۹۷۴ء میں ۶۰-۷۰ تک پہونچ گیا، اور ۱۹۸۶ء میں ۸۰-۸۵ روپے من بک رہا ہے، ایسا دو سبب سے ہو رہا ہے، ایک ان تاجروں کی ذخیرہ اندوزی، سٹہ بازی، خود غرضی و بددیانتی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے، جن کے ہاتھ میں غلہ کی تجارت ہے۔ دوسرے حکومت خود تاجر بن گئی ہے، اور اس سے فائدہ اٹھانے میں لگی ہوئی ہے، اسلامی شریعت میں حکومت کو تاجر بننے کا موقع نہیں دیا گیا ہے۔

تجارت کی اسی اہمیت کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ انسانوں کو ۹/۱۰ ذرائع رزق (تسعة اعشار) تجارت کے ذریعہ ملتے ہیں[۱]۔ تاجروں کی ذہنیت درست کرنے کے لئے اسلام نے بہت سی مثبت اور منفی تدبیریں اختیار کی ہیں، یہ تدبیریں دو طرح کی ہیں ایک تو اخلاقی، دوسری قانونی، اخلاقی سے مراد یہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ یہ بات ایک مسلمان کے ایمان و عقیدہ کے خلاف ہے یا عام انسانی قدروں کے احترام کے منافی ہے، اس لئے اس کا نتیجہ اس کے لئے آخرت میں برا ہوگا، اور (قانونی سے مراد یہ ہے کہ ان کی خلاف ورزی کی صورت میں اس کو دنیا میں سزا بھی دی جا سکتی ہے، اس کتاب میں اصلاً ہمیں قانونی تدبیروں ہی کو بیان کرنا ہے، مگر چند باتیں اخلاقی تدبیروں سے متعلق بھی لکھ دی جاتی ہیں، تاکہ یہ بات ذہن میں تازہ رہے کہ اسلام میں جتنی قانونی ہدایتیں دی گئی ہیں ان کا رشتہ ہر مسلمان کے ایمان و عقیدہ سے بھی جڑا ہوا ہے۔ قرآن کریم نے تجارت اور بیع و شراء کی قانونی اور اخلاقی اہمیت چند جملوں میں ذہن نشین کرایا ہے، اوپر ایک آیت کا ذکر آچکا ہے، دو اور آیتیں یہ ہیں:

وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ   وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی مثل سود ہے، حالانکہ

---

[۱] تسعة اعشار الرزق فی التجارة۔ (کنز العمال ج ۲ ص ۱۹۲)

وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ — بیع کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام، تو دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔ (بقرہ)

وَاَشْهِدُوْا اِذَا تَبَايَعْتُمْ۔ — جب خرید و فروخت کا معاملہ کرو تو اس پر گواہ بنا لیا کرو۔ (بقرہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

لولا هٰذه البيوع صرتم عالة على الناس۔ (کنز العمال ج ۴ ص ۲۱ باب الکسب) — اگر یہ تجارتیں نہ ہوتیں تو تم لوگوں پر بوجھ بن جاتے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ قرآن نے باطل اور سُحت کے ذریعے مال کمانے والوں کو دوزخ کے عذاب کی دھمکی دی ہے، ان کو ظالم قرار دیا ہے، ان ہی باتوں کی تفصیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے، آپؐ نے فرمایا کہ "تاجر زمین میں خدا کے دیتے ہوتے ذرائع رزق کے امین اور اپنی اور عام انسانوں کی عزّت و آبرو کے پردہ دار ہیں"۔

فَاِنَّهُمْ بُرُدُ الْاٰفَاقِ وَاُمَنَاءُ اللّٰهِ فِى الْاَرْضِ۔ (مشکوٰۃ)

آپؐ نے فرمایا: "سچا اور امانت دار تاجر قیامت کے دن نبیوں، صدیقوں اور شہداء کے ساتھ ہوگا" (ترمذی دارمی) آپؐ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے گا جو بیچنے خریدنے اور تقاضا کرنے میں نرم دل اور رحیم واقع ہو"[1] آپؐ نے فرمایا کہ "قیامت کے دن تمام تاجر گنہ گار اٹھائے جائیں گے، مگر وہ جو خدا سے ڈرے اور لوگوں سے نیکی و نرمی سے پیش آئے یعنی تجارت میں ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کرے کہ لوگوں کے لئے وہ زحمت و تکلیف کا سبب ہو"[2] آپؐ نے فرمایا کہ "جھوٹ بول کر یا دھوکہ دے کر جو تجارت کی جاتی ہے، وہ بظاہر تو فائدہ بخش نظر آتی ہے، مگر نتیجہ کے اعتبار سے نقصان کا سبب ہوتی ہے"۔ آپؐ نے فرمایا کہ "تجارت رضامندی ہی سے صحیح ہو سکتی ہے"۔

---

[1] بخاری و مسلم، مشکوٰۃ ص ۲۵۱۔

[2] ترمذی و ابن ماجہ۔

اسلام کی ان ہی اخلاقی تعلیمات کی بنیاد پر تجارت کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس طریقۂ تجارت میں دنیا کے ہر انسان کے لئے بھلا ہے، مگر افسوس ہے کہ مسلمان جو اِن تعلیمات کے مخاطب ہیں، وہ خود ان تعلیمات کو بھلا کر دوسروں کی دنیا خراب کر رہے ہیں، اور اپنی دنیا و آخرت دونوں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شاگرد امام محمد سے کسی نے کہا کہ آپ زہد و تقویٰ کے بارے میں کوئی کتاب کیوں تصنیف نہیں کر دیتے؟ انھوں نے کہا کہ:

صَنَّفْتُ کِتَابَ الْبُیُوْعِ۔ میں نے خرید و فروخت کے طریقہ پر ایک ایک کتاب تصنیف کر دی ہے۔

مقصد یہ تھا کہ اصل زہد و تقویٰ تو حرام سے بچنا اور حلال ذریعہ رزق تلاش کرنا ہے وہ تمام باتیں اس کتاب میں آگئی ہیں۔

تجارت کی چند فقہی اصطلاحیں

چند الفاظ اور اصطلاحات کا ذکر بار بار آئے گا، اس لئے ان کی تشریح کر دی جاتی ہے:

۱۔ بیع، بیع کے معنی بیچنے کے ہیں اور بیچنے والے کو بائع کہتے ہیں اور جو چیز بیچی جائے اسے مبیع کہتے ہیں۔

۲۔ شراء، شراء کے معنی خریدنے کے ہیں اور خریدنے والے کو مشتری کہتے ہیں، کبھی یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

۳۔ ایجاب وقبول، جن الفاظ سے تجارت یا بیع و شراء کا معاملہ کیا جاتا ہے ان کو ایجاب و قبول کہتے ہیں، مثلاً بائع نے کہا کہ میں نے یہ چیز اتنے میں فروخت کی اور خریدار نے کہا کہ میں نے لے لی تو بائع کا قول ایجاب اور مشتری کا قول قبول کہا جائے گا، اگر خریدار نے پہلے کہا کہ یہ چیز مجھے چاہیئے اور دوکاندار راضی ہوگیا، خریدار کا قول ایجاب اور دوکاندار قبول کہا جائے گا، یعنی بات چیت کی ابتدا جس کی طرف سے ہوگی، اس کے قول کو ایجاب کہیں گے

بیع و شراء کی دو قسم ہے، ایک وہ جو منعقد ہو، دوسرے جو منعقد نہ ہو، بیع منعقد کی چار قسمیں ہیں، صحیح، فاسد، نافذ، موقوف، اور جو بیع و شراء منعقد نہ ہو وہ باطل ہے، ہر ایک کی تعریف یہ ہے۔

بیع صحیح وھو البیع المشروع ذاتاً ووصفاً، وہ بیع جو اپنی ذات اور اپنی خارجی اوصاف کے اعتبار سے شریعت کے مطابق ہو، یعنی وہ نہ باطل ہو اور نہ اس میں عدم تراضی پائی جاتی ہو (المجلہ) اس میں بائع قیمت کا اور مشتری بیع کا مالک ہو جاتے گا۔

بیع فاسد البیع الفاسد ھو البیع المشروع اصلا لا وصفاً، وہ بیع اپنی حقیقت کے اعتبار سے صحیح ہو، لیکن بعض خارجی اسباب کی بنا پر وہ شرعاً صحیح نہ ہو، یعنی بیع کے ارکان یعنی ایجاب وقبول میں کوئی نقص ہو، مثلاً اس میں دونوں نے ثمن یعنی قیمت کا ذکر نہ کیا یا مبیع یعنی جو چیز بیچی جا رہی ہے، وہ مجہول ہو، یا جیسے آم یا امرود کے باغ کی فروخت پھل آنے سے پہلے (شرح المجلہ ص۲۰۱) بیع فاسد میں دونوں کو بیع فسخ کرنے کا اختیار رہے، لیکن اگر مشتری نے قبضہ کر لیا ہے تو وہ نافذ ہو جاتے گی، مگر اس کا حکم سودی معاملہ کا ہوگا۔ (امداد الفتاویٰ، ج ۳ ص ۹۳)

بیع باطل البیع الباطل ما لا یصح اصلا یعنی لا یکون مشروعاً اصلا۔ یعنی رکن بیع اور محل بیع دونوں میں نقص ہو، یعنی کوئی چھوٹا بچہ بیع کرے، یا کسی حرام چیز کی خرید وفروخت ہو، یا وہ مال ابھی وجود ہی میں نہ آیا ہو اور اس پر قبضہ ممکن نہ ہو۔ (شرح المجلہ ص۲۰۲)

اسی طرح مبیع یا ثمن میں کوئی ایک حرام ہو تو یہ بیع باطل ہوگی، اذا کان احد العوضین محرما او کلاھما (الجوھرۃ النیرہ)

بیع موقوف کوئی آدمی بغیر اجازت کوئی معاملہ کرے تو مشتری کی اجازت پر بیع موقوف رہے گی، یا کوئی ہوشیار بچہ معاملہ کرے تو ولی کی اجازت پر یہ بیع موقوف رہے گی۔

الفضولی الفضولی ھو من یتصرف بحق الغیر بدون اذن شرعی۔ بغیر شرعی اجازت کے جو کسی چیز میں تصرف کرے اسے فضولی کہتے ہیں۔

بیع نافذ بیع نافذ کی دو قسم ہے، لازم اور غیر لازم۔

بیع لازم هو البیع النافذ العاری من الخیارات. یعنی وہ بیع جس میں معاملہ کو رد کرنے کا کوئی اختیار باقی نہ ہو۔

بیع غیر لازم البیع الغیر اللازم ہو البیع النافذ الذی فیہ الخیارات۔ وہ بیع نافذ جس میں بائع یا مشتری کو رد کرنے کا اختیار باقی ہو، اس کی تین قسمیں ہیں، خیار شرط، خیار عیب، خیار وصف، ان تینوں کی تعریف آگے آتے گی۔

مال المال ما یمیل الیہ طبع الانسان ویمکن ادخارہ إلی وقت الحاجۃ۔ مال وہ ہے جس کی طرف انسان کی طبیعت مائل ہو اور ضرورت کے وقت اس کا جمع کرنا ممکن ہو۔

مالِ متقوم المال المتقوم یستعمل فی معنیین الاول بمعنی ما یباح الانتفاع بہ والثانی بمعنی المال المحرز۔ مال متقوم دو معنی میں استعمال ہوتا ہے، ایک وہ مباح چیز جس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، دوسرے وہ مباح چیز جس کو آدمی اپنے قبضہ میں کرلے، جیسے دریا میں مچھلی مال غیر متقوم ہے، لیکن شکار کرلیا جائے تو پھر مالِ متقوم ہے، پہلی صورت میں بیع ناجائز ہے اور دوسری صورت میں جائز۔

اسی طرح وہ مال تو ہو مگر شریعت اسے مال نہ تسلیم کرتی ہو وہ غیر متقوم ہے۔ مثلاً شراب، سود، مردار، خون وغیرہ، یہ چیزیں مسلمان کے حق میں مال نہیں ہے، (الفقہ علی المذاہب الادبعہ، ج ۲ ص۲۹)

ثمن الثمن ما یکون بدلا للمبیع ویتعلق بالذمۃ۔ جو مبیع کے بدلہ میں دیا جائے وہ ثمن ہے، اور اس کی ذمہ داری باقی رہتی ہے۔

الثمن المسمی الثمن المسمی ہو الثمن الذی یسمیہ ویعینہ العاقدان وقت البیع بالتراضی سواء کان مطابقاً لقیمتہ الحقیقتہ اوناقصا بہا اوذائدا۔ یعنی جو رقم معاملہ کرتے وقت بائع اور مشتری کی رضامندی سے مقرر ہو، اس کو ثمن کہتے ہیں، چاہے اصل قیمت سے کم ہو یا زیادہ۔

قیمت القیمۃ ہی الثمن الحقیقی للشیٔ۔ کسی چیز کا جو حقیقی دام ہو، اسے فقہ کی اصطلاح

میں قیمت کہتے ہیں۔ گویا ثمن اور قیمت میں یہ فرق ہے۔ (شرح المجلہ)

بیع کی قسمیں بیع کی مبیع کے اعتبار سے چار قسمیں ہیں (۱) بیع المال بالثمن یعنی سودا نقد رقم لے کر بیچا جائے، اصل بیع اسی کا نام ہے (۲) دوسری قسم "صرف" ہے، یعنی نقد کا تبادلہ نقد سے یا ایک جنس کے سکّہ کا تبادلہ ایک جنس سے ہو (۳) تیسری قسم "البیع المقائضہ" یعنی نقد کے علاوہ کسی چیز کا تبادلہ کسی دوسری چیز سے (۴) بیع سلم یعنی دام نقد دیا جائے اور چیز کچھ مدت بعد لی جائے، یعنی اُدھار معاملہ ہو۔

ان چار قسموں سے بیع و شراء کی اور بہت سی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

بیع تعاطی ان المقصد الاصلی من الایجاب والقبول ھو تراضی الطرفین فنیعقد البیع بالمبادلۃ الفعلیۃ الدالۃ علی التراضی ویسمی ھذا بیع المتعاطی۔ (المجلہ ص ۲۳)

ایجاب و قبول کا مقصد یہ ہے کہ معاملہ کرنے والے آپس میں راضی ہوں تو زبان سے کہے بغیر طرز عمل سے بھی رضامندی ہو جایا کرتی ہے، اسی عملی رضامندی سے جو معاملہ کیا جائے اسے بیع تعاطی کہتے ہیں، مثلاً دوکان پر کسی چیز کا دام لکھا ہوا ہے خریدار نے دوکاندار کو پیسہ دیا اور وہ چیز لے لی، زبان سے کچھ نہیں کہا تو اسے بیع تعاطی کہتے ہیں۔

ملکیت الملک ماملکہ الانسان سواء کان اعیاناً او منافع۔ ملکیت وہ چیز ہے جس کا انسان مالک ہو جائے، وہ کوئی مخصوص چیز ہو، یا اس سے کوئی منفعت حاصل ہو رہی ہو، اعیان میں جیسے سامان، زمین، جانور، وغیرہ۔ اور منفعت میں جیسے کرایہ پر مکان لینا یا دینا، اجرت پر کام کرنا، کاریگر یا صناع جو کام کرتے ہیں وہ سب اس ضمن میں آتے ہیں، اس میں ایک طرف مال ہوتا ہے اور دوسری جانب کام یا منفعت ہوتی ہے، اس لئے اس کو ملکیت کہیں گے، مگر اس کو مال نہیں کہیں گے، مال اس کو کہتے ہیں جس کو جمع کیا جا سکے اور منافع کو جمع نہیں کیا جا سکتا، اس کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔

غبن فاحش زبردست نقصان بیع و شراء میں اگر آدمی بڑا دھوکہ کھا جائے تو اس کو غبن فاحش کہتے ہیں جس کی تعریف یہ ہے:

غبن علی قدر نصف العشر فی العروض والعشر فی الحیوانات والخمس فی العقار۔

اگر سامان کی خرید و فروخت ہو، اور پانچ فیصد نقصان ہو تو یہ غبن فاحش ہے، حیوانات کی خرید و فروخت میں دس فیصد نقصان ہو تو یہ غبن فاحش ہے، اور اگر زمین وغیرہ ہے تو اس میں بیس فیصد نقصان غبن فاحش سمجھا جائے گا، یعنی اس وقت معاملہ ختم کرنے کا بائع یا مشتری کو اختیار ہوگا، اس سے کم میں معاملہ نافذ سمجھا جائے گا۔

تجارت کے معنی

آپس میں لین دین اور خرید و فروخت کے لئے اسلامی شریعت میں تجارت کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے اور بیع و شراء کا بھی، تجارت کے لفظی معنی فائدے کے لئے لین دین کرنا اور بیع کے معنی بیچنے اور شراء کے معنی خریدنے کے ہیں، اور کبھی بیع کو شراء کے معنی میں اور شراء کو بیع کے معنی میں بھی بولتے ہیں۔

تجارت کی تعریف

موجودہ زمانہ کی معاشیات میں تجارت کے لئے صرف افادہ اور استبدال کی صلاحیت کا ہونا کافی ہے، یعنی جس چیز میں ۔۔ئی فائدہ ہو یا اس کے اندر تبادلہ کی صلاحیت موجود ہو تو اس کی تجارت صحیح ہے لیکن اسلامی شریعت میں کسی ایسی پسندیدہ چیز کو جو باطل اور حرام نہ ہو، حلال ذرائع اور باہم رضامندی کے ساتھ بدلنے یا اس کی خرید و فروخت کرنے کا نام تجارت ہے، جیساکہ اوپر ذکر آچکا ہے، گویا اب جو تجارت باطل و حرام چیزوں میں کی جائے گی یا حلال ذرائع سے نہ ہوگی، چاہے اس خرید و فروخت میں بظاہر فائدہ ہی کیوں نہ نظر آتا ہو، اسلامی شریعت میں باطل اور فاسد قرار پائے گی، اسی طرح اگر وہ تجارت حلال چیزوں اور حلال ذرائع سے تو کی گئی ہو، مگر لین دین کرنے والوں کی رضامندی اور پسندیدگی شامل نہ ہو تو وہ تجارت بھی باطل قرار پائے گی[1]، جیساکہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اسلامی معاملات میں مثبت اور ۔۔ دونوں شرطوں کا پایا جانا بہرحال ضروری ہے، یعنی یہ کہ وہ باطل نہ ہو اور تراضی ہو،

---

[1] اوپر قرآن کریم کی آیت اور احادیث نبوی کا ذکر آچکا ہے۔

محض افادہ اور استبدال کی صلاحیت کا ہونا کافی نہیں ہے۔

باطل باطل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے جن چیزوں کو مستقلاً حرام قرار دیا ہے ان کی خرید و فروخت باطل ہوگی، مثلاً شراب، گانے بجانے کا سامان، سور کی ہر چیز، کتا، مردار گوشت اس کی چربی یا جن ذرائع سے پیسہ پیدا کرنے کو اس نے حرام قرار دیا ہے، ان ذرائع سے دولت پیدا کرنا باطل ہوگا، مثلاً سود اور جوا، سود سے مراد صرف مہاجنی سود نہیں ہے یعنی کسی کو ایک روپیہ دے کر دو روپے لینے ہی کو سود نہیں کہتے، بلکہ سودی کاروبار کی ایک بڑی لمبی فہرست ہے، اس کا ذکر بعد میں آئے گا، اسی طرح موجودہ زمانے میں جوئے کی جو بے شمار قسمیں پیدا ہوگئی ہیں، ان کی تفصیل بھی بعد میں آئے گی' ان کو شریعت مسلمان کے لئے مال متقوم تسلیم نہیں کرتی۔

اسی طرح جو چیز کسی کے قبضہ میں نہ ہو یا ابھی وجود میں نہ آئی ہو، ان سب کی تجارت باطل ہوگی، اسی طرح مال کے بازار میں آنے سے پہلے پہلے تاجر اوپر اوپر جو اس کے فائدہ کو اُچک لیتے ہیں تو یہ تجارت بھی اسلام میں مکروہ اور کبھی فاسد قرار پاتی ہے۔

بیع باطل و فاسد کا حکم یہاں پر صرف تجارت کے باطل ہونے کی طرف اشارہ کردیا گیا ہے، اسلامی فقہ میں باطل اور فاسد تجارت کی اصطلاحی تقسیم کی گئی ہے' اس کی تعریف اوپر آچکی ہے، باطل بیع واقع ہی نہیں ہوتی اور فاسد بیع اگر بائع مشتری کو قبضہ کی اجازت دے دے تو واقع ہو جاتی ہے[1] مگر اس کا شمار سودی کاروبار میں ہوگا۔

تراضی یعنی رضامندی اسلامی شریعت نے تجارت کے صحیح ہونے کے لئے دوسری شرط باہم رضامندی کی لگائی ہے۔

اس قید کے لگانے کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ خریدنے والے اور بیچنے والے میں کوئی اختلاف نہ ہو، کسی کے اوپر ظلم نہ ہو، کسی کا مال ناحق نہ لے لیا جائے اس قید کی

---

[1] والفاسد لا یوقع الملک والعقد مالم یتصل بہ القبض باذن البائع والباطل لا یوقع وان قبض بالاذن۔ (الجوہرۃ النیرہ، ج ۱ ص ۲۹۳)

بنا پر وہ تجارت بھی رضامندی کے بغیر سمجھی جائے گی، جس میں کچھ لوگوں کا نفع تو متعین ہو، اور کچھ لوگوں کا غیر متعین ہو، اس قید کی بنا پر وہ تجارت بھی ممنوع ہوگی، جس میں آدمی حالات وضروریات سے مجبور ہو کر کوئی چیز خریدتا ہے، مثلاً ذخیرہ اندوزی، سٹہ بازی کی وجہ سے عموماً اشیاء کی قلّت اور گرانی ہوتی ہے، مگر آدمی مجبور ہو کر گراں چیز خریدتا ہے، کیونکہ اگر نہ خریدے تو کھاتے اور پہنے کیا، لیکن ظاہر ہے کہ اگر اس کو یہ علم ہو جائے کہ اس کی گرانی کا اصل سبب ذخیرہ اندوز اور سٹہ باز تاجر ہیں، تو وہ انتہائی ناپسندیدگی سے اس کو خریدے گا، اسی طرح اگر کوئی تاجر جھوٹ بول کر کسی سے زیادہ دام لے لے تو بظاہر خریدار نے رضامندی سے وہ چیز خریدی ہے، مگر درحقیقت اس کی رضامندی اس میں شامل نہیں ہے، اس لئے کہ اگر اس کو علم ہو جائے گا کہ جھوٹ بول کر مجھ سے دام لئے گئے ہیں تو وہ انتہائی ناراضی کا اظہار کرے گا، غرض یہ کہ دھوکے فریب، اور جھوٹ اور دباؤ کے جتنے کاروبار ہیں، وہ سب عدم تراضی اور غبن فاحش کی فہرست میں آتے ہیں۔

تجارت ایک معاہدہ ہے

تجارت بائع اور مشتری کے درمیان ایک معاہدہ کا نام ہے، اس وجہ سے اسلامی شریعت میں اس کو عقدِ بیع کہا جاتا ہے، عقد کے معنی باندھنے اور گرہ دینے کے ہیں، یعنی اس معاہدہ کے ذریعہ دو یا اس سے زیادہ آدمی گویا آپس میں بندھ جاتے ہیں، اب جس طرح کوئی معاہدہ، دھوکہ فریب کے ساتھ اور رضامندی کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، اسی طرح خرید وفروخت کے معاہدہ میں بھی اگر دھوکہ وفریب ہو یا رضامندی نہ ہو تو وہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

خرید وفروخت کا طریقہ

خرید وفروخت کا طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی چیز خریدی یا بیچی جائے تو سودا اچھی طرح دیکھ لیا جائے اور قیمت اچھی طرح طے کر لی جائے، یا اگر دو چیزیں بدلنی ہوں تو دونوں کو اچھی طرح دیکھ لیا جائے اور پھر زبان کے ذریعہ اس کا اقرار کر لیا جائے، کہ ہم نے اس چیز کی خرید وفروخت کی، یعنی سودے والا قیمت بتا دے کہ اتنی ہے اور خریدار سودا دیکھ کر یا ہاتھ میں لے کر یہ کہے کہ ہاں ہم کو منظور ہے، مثلاً کسی نے دوکاندار سے پوچھا کہ گیہوں کتنے من ہے، دوکاندار نے بتایا کہ ستر روپے من،

اب اگر خریدار نے یہ کہا کہ ہاں یہ قیمت منظور ہے، تو اب یہ گیہوں بک گیا، اگر اس نے کہا کہ ستّر روپے نہیں بلکہ ساٹھ روپے من لوں گا اور دوکاندار نے کہا کہ اچھّا قیمت لا تیے تو بھی بیع درست ہوگئی، اب خریدار کو اس کا خریدنا اور دوکاندار کو بیچنا ضروری ہے، اگر ان میں کوئی انکار کرے گا، تو قانوناً اس کو مجبور کیا جائے گا، اس قول و قرار کو شریعت میں ایجاب و قبول[۱] کہتے ہیں معاملہ کی ابتداء کرنے والے کی رضامندی کو ایجاب اور بعد میں راضی ہونے والے کی بات کو قبول کہتے ہیں، کبھی معاملہ کی ابتداء خریدار کی طرف سے ہوتی ہے اور کبھی بیچنے والے کی طرف سے۔

عملی اقرار اگر زبان سے دونوں نے اقرار نہیں کیا لیکن عملاً دونوں نے ایسی صورت اختیار کی جس سے دونوں کی رضامندی ظاہر ہوتی ہو، تو یہ بھی جائز ہے، مثلاً کسی نے بساطے کے دوکاندار سے یہ کہا کہ ایک پاؤنڈ اون فلاں نمبر کا دے دیجئے یا بھاسکر

---

[۱] جب تک خرید و فروخت کی بات کا سلسلہ جاری رہے اس وقت تک دونوں کو معاملہ کے ختم کرنے کا اختیار ہے، لیکن اگر معاملہ طے ہوگیا تو پھر کسی کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار نہیں ہے، البتہ اثنائے بات چیت میں دوسرا فریق وہاں سے اٹھ گیا، یا کسی اور کام میں مشغول ہوگیا اور ایسا محسوس ہوا کہ وہ چیز بیچنا یا دوسرا خریدنا نہیں چاہتا تو اب یہ معاملہ ختم سمجھا جائے گا، یہ مسلک امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا ہے، امام شافعیؒ اور امام احمد کہتے ہیں کہ جب تک دونوں جہاں گفتگو ہو رہی ہے وہاں سے چلے نہ جائیں اس وقت تک ایجاب و قبول کا اختیار باقی رہے گا خواہ بات کا سلسلہ جاری ہو یا منقطع ہوگیا ہو، اس کو خیار مجلس اور خیار قبول کہتے ہیں، عام فقہائے احناف کی کتابوں میں تو مطلقاً مجلس سے اٹھ جانا یا کسی دوسرے کام میں مشغول ہو جانے کو اس کے نہ قبول کرنے کی علامت سمجھا گیا ہے مگر خواہر زادہ اور عینی نے اس کو چلے جانے (ذہاب)، کے معنی میں لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ کھڑا ہونا تو کسی ضرورت سے بھی ہو سکتا ہے تو مطلق کھڑے ہونے کو دلیل اعراض کیسے بنا لیا جائے؟ اگر یہ توجیہہ مان لی جائے تو امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے مسلک میں بہت کم اختلاف باقی رہتا ہے، بہرحال امام شافعیؒ کے مسلک میں وسعت ہے اور حنفی مسلک عملی اعتبار سے زیادہ بہتر ہے اور اخلاقی لحاظ سے بھی یہ مناسب ہے کہ جب زبانی یا تحریری بات چیت طے ہوگئی تو اس کو مزید وسعت نہ دی جائے، ورنہ بلا وجہ ٹال مٹول کا موقع ملے گا۔

کی لالٹین دے دیجئے، یا کی۔ وی پالش دے دیجئے، تو اگر ان چیزوں کی قیمت پہلے سے اس دوکان یا بازار میں متعین ہے، تو اس کو چیز لے کر قیمت دینا ہی کافی ہے، قیمت کا تعین اور خریدار کا قیمت، دے دینا ہی اقرار سمجھا جائے گا، البتہ اگر دوکاندار بازار کی قیمت پر راضی نہ ہو تو پھر خریدار وہ چیز نہیں لے سکتا، اسی طرح اگر کسی نے کوئی چیز دوکان سے لے کر کہا کہ اتنی قیمت لیجئے اور دوکاندار نے لے لیا تو یہ بھی رضامندی ہوتی، مثلاً کسی نے پھل بیچنے والے کی ٹوکری سے دس آم یا دس سنترے یا چار سیب لے لیئے اور دو روپئے اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے، اگر اس نے لے لیا تو بیع ہو جائے گی۔ ساگ کی ایک ڈھیری دس پیسہ میں بک رہی ہے، ایک شخص گیا اور اس نے ڈھیری لے لی اور دس پیسہ دے دیئے، تو اگر زبان سے دونوں نے کچھ نہ کہا ہو بیع ہو جائے گی، اس طرح کی بیع کو بیع تعاطی کہتے ہیں[1]۔ بیع تعاطی کو بعض فقہاء نے معمولی چیزوں میں صحیح سمجھا ہے، مگر عام فقہاء چھوٹی بڑی اور معمولی اور غیر معمولی ہر چیز میں صحیح سمجھتے ہیں، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بیع تعاطی کو صحیح نہیں سمجھتے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۲ ص ۱۵۵)

تحریر کے ذریعہ

جس طرح زبان یا طرزِ عمل سے معاملہ طے ہو جاتا ہے اور رضامندی ظاہر ہوتی ہے، اسی طرح تحریر کے ذریعہ دونوں کوئی معاملہ طے کرلیں تو اس کی بھی اجازت ہے، لیکن تحریر ایسی قابلِ اطمینان شکل میں ہونی چاہئے کہ آئندہ دونوں میں اختلاف نہ ہو، اوپر نکاح کے بیان میں اور چاند کی گواہی کے بیان میں اس کا ذکر آچکا ہے۔

ٹیلی فون اور ٹی لکس

اگر کوئی شخص ٹیلی فون یا ٹی لکس کے ذریعہ چاند کی گواہی دے تو یہ شہادت صحیح نہیں مانی جائے گی، لیکن ان ذرائع سے کوئی خرید فروخت

---

[1] بیع تعاطی کی تعریف اوپر آچکی ہے۔ والمعنی ھو المعتبر فی ھذہ العقود ولھذا ینعقد بالتعاطی فی النفیس والخسیس ھو الصحیح۔ (ہدایہ، ج ۳ ص ۲۵)۔ وینعقد البیع بالمعادلۃ الفعلیہ الدالۃ علی التراضی ویسمی ھذا بیع التعاطی (المجلہ ص ۲۳)۔

کا معاملہ کرے تو یہ جائز ہوگا، جن معاملات میں شہادت کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ تمام معاملات ان آلات کے ذریعہ صحیح ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ دونوں فریق کو اطمینان ہو جائے۔

سودا اور قیمت کا بیان

غرض یہ کہ سودا اور قیمت دونوں کا طے ہونا ضروری ہے، ان دونوں کے بارے میں اسلامی شریعت نے بہت سی شرطیں لگائی ہیں، یہاں ان کو بیان کیا جاتا ہے، سودے کو مبیع اور جو قیمت طے ہو اس کو ثمن کہتے ہیں۔

مَبیع کا بیان

مبیع یعنی جو چیز بیچی جائے اس کے لئے چند باتوں کا ہونا اور چند باتوں کا نہ ہونا ضروری ہے۔ (۱) وہ چیز جو بیچی جائے وہ سامنے موجود ہونی چاہیئے۔ اگر موجود نہ ہوگی تو اس کا بیچنا صحیح نہ ہوگا، مثلاً کسی نے ہندوستان میں بیٹھ کر امریکہ میں خریدے ہوتے غلّے، کپڑے یا کسی اور چیز کا سودا کیا تو یہ صحیح نہیں ہوگا، البتہ اگر غیر موجود چیز اس شرط پر بیچی جائے کہ خریدار دیکھنے کے بعد اس کا آخری فیصلہ کرے گا تو اس کی اجازت ہے، یا اس مال کا نمونہ سامنے ہو تو خریدی و بیچی جا سکتی ہے، اسی طرح جو چیز ابھی وجود میں آئی نہیں ہے اس کی خرید و فروخت ناجائز ہے، مثلاً باغ میں ابھی پھل آیا نہیں، اور باغ بیچ دیا گیا، گیہوں کی بالیں ابھی ظاہر نہیں ہوئی تھیں اور کھیت کا غلّہ بیچ دیا گیا، جانور کا بچہ پیٹ میں ہے اور اسے فروخت کر دیا گیا، تو بیچنا و خریدنا باطل ہوگا، اسی طرح اگر کوئی چیز موجود تھی مگر غائب ہوگئی یا معدوم ہوگئی تو اس کو بھی نہیں بیچا جا سکتا، مثلاً جانور تھا وہ گم ہوگیا تو اس کو نہیں بیچا جا سکتا، یا دو منزلہ مکان تھا، اوپر کا حصّہ گر گیا تو اب اوپر کی فضا کو فروخت نہیں کیا جا سکتا[۱]

(۲) جو چیز بیچی جائے وہ بیچنے والے کی ملک ہونی چاہیئے، یا مالک نے اس کو بیچنے کی اجازت دی ہو، مثلاً کسی نے تالاب کا یا دریا و سمندر کا پانی یا اس کی مچھلیاں فروخت کیں، یا فضا کے پرندے بیچے یا جنگل کی لکڑیاں یا اس کے جانور یا میدان کی گھاس بیچی تو چونکہ یہ چیزیں اسلام میں کسی کی ملک نہیں ہیں، اس لئے کسی کو ان کے بیچنے کا حق نہیں ہے، چاہے بظاہر وہ اس کی ملک میں ہی

---

[۱] بیع المعدوم باطل فیبطل بیع الثمرۃ لم تبرز اصلا (شرح المجلہ ص۹۵)، ولا یجوز بیع الحمل والنتاج (الجوھرۃ النیرہ ج ۱ ص۲۰۴)

کیوں نہ سمجھی جاتی ہوں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پانی، گھاس اور آگ تمام انسانوں کا مشترک سرمایہ ہیں[1]، اسی طرح اگر کوئی جانور گم ہوگیا ہے اور اس کو فروخت کردیا گیا، یا جنگل کے جانوروں کو فروخت کردیا گیا تو بیع باطل ہوگی، کیونکہ یہ چیزیں نہ تو بیچنے والے کے قبضہ میں ہیں، اور نہ ان کی ملک ہیں[2]

یہ چیزیں کب بک سکتی ہیں

یہ چیزیں اس وقت بک سکتی ہیں، جب ان کے اوپر محنت یا روپیہ صرف کیا گیا ہو، مثلاً اگر کسی شخص نے یا حکومت نے دریا پر بندھ باندھا، یا تالاب کا پانی باقی رکھنے کے لئے کوئی تدبیر کی یا دریا سے نہر نکال کے یا مشین کے ذریعہ اس کا پانی باہر نکالا یا کسی نے جنگل یا گھاس پر پیسہ خرچ کر کے یا محنت کر کے اسے لگایا، یا دریا سے مچھلی پکڑی یا پکڑنے کے لئے کوئی تدبیر کی یا جنگل کی لکڑی کاٹ کے لایا تو ان تمام صورتوں میں وہ اس کو بیچ سکتا ہے، یا حکومت دوسرے آدمی کو اس کے بیچنے کی اجازت دے سکتی ہے، اسی طرح زمین کے نیچے کی معدنی اشیاء کو جب تک ان کے اندر سے نکال نہ لیا جائے بیچا نہیں جا سکتا، مثلاً لوہا، تانبا، سونا، چاندی، گندھک، ابرک، کوئلہ، پٹرول، مٹی کا تیل، البتہ اگر ان چیزوں کے دریافت کرنے میں محنت و دولت خرچ کی گئی ہے تو پھر ان پر محنت کرنے والے اور روپیہ خرچ کرنے والے کی ملکیت تسلیم کی جائے گی۔

ملکیت کی تعریف

کسی چیز کے ملک میں آنے کی کئی صورتیں ہیں، مگر ان صورتوں کے بیان سے پہلے ملکیت کی تعریف ذہن نشین کر لینی چاہیئے، ابن ہمام نے فتح القدیر، ج ۵ ص ۵۶ھ میں اور ابن نجیم نے الاشباہ والنظائر، ص ۶۰۵ میں ملکیت کی یہ تعریف کی ہے:

---

[1] قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المسلمون شرکاء فی ثلث فی الماء والکلاء والنار
دوسری حدیث میں الملح کا لفظ بھی آیا ہے، یعنی نمک بھی عام چیز ہے، آگے تفصیل آرہی ہے۔

[2] یلزم ان یکون المبیع مقدوراً التسلیم ویلزم ان یکون موجوداً وان یکون مالاً متقوماً ویشترط ان یکون المبیع معلوماً عند المشتری (المجلہ)

الملك هو قدرة يثبتها الشرع ابتداءً على التصرف۔	تصرف پر اس قدرت وقابو کا نام ہے جس کی اجازت شریعت نے دیا ہے۔

فقہاء نے اور بھی تعریفیں کی ہیں، ان سب کی روشنی میں شیخ مصطفیٰ زرقاء نے اپنی کتاب "المدخل الفقہی" میں امام قرافی کی کتاب الفروق ج ۲، ص ۲۱۶ سے یہ جامع تعریف نقل کی ہے۔

اختصاص حاجز شرعا یسوغ صاحبه التصرف الا لمانع (ج ۱ ص ۲۲۰)

"تصرف وہ خصوصیت ہے جو کسی شخص کو شریعت کی اجازت سے اس وقت تک حاصل رہتی ہے جب تک کوئی دوسرا مانع نہ ہو۔ حاجز سے مراد یہ ہے کہ دوسرا شخص اس سے بغیر اجازت منتفع نہ ہو سکے، اور مانع سے مراد یہ ہے کہ وہ تصرف کے لائق بھی ہو مثلاً استعمال کی اہلیت ہو، یا وہ دوسرے کی چیز نہ ہو۔ ملکیت کی اس اسلامی تعریف کے مقابلہ میں اہل مغرب ملکیت کی جو تعریف کرتے ہیں، اس میں ملکیت کا تصور بالکل بے قید ہو کر رہ جاتا ہے، مشہور مغربی محقق ماہر قانون جان آسٹین نے ملکیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے یہ کسی متعین شے پر ایک حق کی نشاندہی کرتا ہے، جو استعمال کے اعتبار سے غیر محدود اور تصرف اور انتقال کے اعتبار سے بے قید ہے"[1]

اس تعریف میں ملکیت کے انتقال اور تصرف کے حق کو بالکل بے قید بنا دیا گیا ہے، جو حدود وقیود سے بالکل آزاد ہے، خواہ اس سے دوسرے کو کتنا ہی نقصان پہونچے، اس کے برخلاف اسلامی شریعت میں ملکیت کے تصرف اور انتقال میں دو قیدیں ایسی لگی ہوئی ہیں کہ اس سے ملکیت میں تصرف اور اس کا انتقال اور استبدال شتر بے مہار نہیں ہو پاتا، ایک شرط تو یہ لگی ہوئی ہے کہ ملکیت میں تصرف شارع کی اجازت سے ہو یعنی شریعت نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، اس کا استعمال اور تصرف جائز نہیں، دوسرے اپنی ملکیت کے تصرف اور انتقال میں آدمی اس وقت تک آزاد ہے، جب تک دوسرا مانع نہ ہو، یعنی وہ حقِ استعمال دوسروں کے لئے مضر نہ ہو، مثلاً ایک شخص اپنی زمین میں کنواں کھود رہا ہے، مگر وہ راستہ پر پڑتا ہے، تو

---

[1] John Auslin: Letures on juris prudence Vol. 11 P. 790,

اسے اس سے روک دیا جائے گا، فقہا نے قرآن مجید کی آیت لَا یَظْلِمُونَ وَلَا یُظْلَمُونَ "نہ ظلم کیا جائے اور نہ ظلم اٹھایا جائے"، اور حدیث نبوی لاضرر ولا ضرار "نہ تکلیف میں ڈالنا صحیح ہے اور نہ اٹھانا" کے بحث پر یہ اصول بنا دیا ہے،

یتحمل الضرر الخاص لدفع ضرر عام۔ (المجلہ)[۱]	انفرادی نقصان کو عام لوگوں کو تکلیف سے بچانے کے لئے برداشت کرنا ہوگا۔

ملکیت کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے:

ملکیت کی دو قسمیں ہیں، ایک ملک عین اور دوسری ملک منفعت، یہاں یہ بات یاد آنی چاہیئے کہ فقہائے احناف ملک اور مال میں فرق کرتے ہیں، ملک کی تعریف یہ ہے "الملك ماملكه الانسان سواء كان اعياناً اومنافع"۔ ملک وہ چیز ہے جس کا آدمی مالک ہو خواہ ملک عین ہو یا ملک منفعت اور مال کی تعریف یہ ہے کہ یمكن ادخاره الىٰ وقت الحاجة منقولاً كان او غير منقول گویا مال کا اطلاق صرف مادی چیزوں پر ہوتا ہے اور ملک میں مادی اور غیر مادی یعنی نفع اندوزی بھی شامل ہے۔ اوپر اس کا ذکر آچکا ہے۔

ملکیت میں آنے کی صورتیں

کوئی شخص جب کسی چیز کا مالک ہوتا ہے، تو اس کی چار صورتیں یا اس کے چار ذریعے ہوتے ہیں۔

۱۔ عقود یا معاہدہ کے ذریعہ یعنی دو آدمی آپس میں کوئی معاملہ کرکے ایک دوسرے کو مالک بنادیں، عقود کی ایک قسم عقود جبر یہ ہے یعنی حکومت کسی کو کسی دوسرے کی چیز کا مالک بنا دے، مثلاً مقروض کا مال قرض دینے والے کو دلا دیا، یا احتکار کرنے والے کا مال لے کر بازار بھاؤ سے فروخت کرا دیا، شفعہ کی صورت میں بھی یہی ہوتا ہے، اسی طرح مصالحِ عامہ کے لئے کسی کی ملک پر حکومت قبضہ کرلے اور رفاہِ عام میں لگا دے۔ مثلاً اسکول کے لئے مسجد کے لئے، راستہ کے لئے، کوئی زمین کسی کی ملک سے نکال کر مصالح عامہ میں دے دے۔

۲۔ احراز المباحات۔ وہ چیزیں جو کسی ملک میں نہ ہوں، بلکہ وہ پوری نسل انسانی کا مشترکہ

---

[۱] المجلہ، ص ۲۰۔

سرمایہ ہوں، ان پر کوئی اپنی محنت و پیسہ لگا کر اسے حاصل کرے تو وہ اس کی ملک ہوگی، مثلاً سمندر کا پانی، اس کی مچھلیاں اور اس کے دوسرے خزانے، جنگل کی گھاس، فضا کی چیزیں۔ راقم الحروف کے نزدیک ان چیزوں پر کسی کا مستقلاً اقتدار و تسلط صحیح نہیں ہے۔

۳۔ اَلْخَلَفِیَّۃ۔ یعنی جانشینی۔ اس کی دو صورتیں ہیں (۱) کسی شخص کا جانشین ہونا، مثلاً وراثت کی چیزوں کا آدمی مالک ہو، (۲) یا آدمی کسی معاوضہ یا جرمانہ و سزا میں کوئی چیز پائے، مثلاً کسی نے کوئی چیز نقصان کر دی اور اس کا عوض نقصان اٹھانے والے کو دلایا گیا یا مقتول کے ورثہ کو دیت وغیرہ میں کوئی مال ملا تو وہ اس کا مالک ہوگا۔

۴۔ عام طور پر فقہاء ان ہی تین صورتوں کا ذکر کرتے ہیں، خود المجلہ کے مرتبین نے بھی ان ہی تین صورتوں کا ذکر کیا ہے[1] مگر اس کی چوتھی صورت یہ ہے، جو چیز کسی کی ملکیت سے طبعی طور پر پیدا ہو وہ بھی اس کی ملکیت ہے، مثلاً درخت کا پھل، جانوروں کے بچے، بکری کا بال اور دودھ اب کوئی خرید و فروخت میں ان دونوں میں سے کسی کو علیحدہ نہیں کر سکتا بلکہ وہ چیزیں خود بخود اس میں داخل ہیں، آگے ان تمام صورتوں کی تفصیل آئے گی۔

جو چیزیں ایسی ہوں کہ ان پر تمام انسانوں کو قابو حاصل نہ ہو سکتا ہو، ان پر نہ تو کسی کی ملکیت قائم ہو سکتی ہے اور نہ وہ بیچی جا سکتی ہیں، مثلاً جو لوگ سمندر پر یا فضا پر، یا فضا کی چیزوں پر اپنی ملکیت جماتے ہوتے ہیں، وہ انسان کے مشترک سرمایہ کے غاصب ہیں، ان کو اس کا کوئی حق نہیں ہے[2]

---

[1] اسباب التملك ثلثة الاول الناقل للملك عن مالك الى مالك آخر كالبيع والهبة والثاني ان يخلف واحد الآخر كالارث والثالث احراز شئ مباح لامالك له (شرح المجلہ ص ۶۷۹) احراز کی دو قسمیں ہیں ایک حقیقی جیسے کسی نے دریا کی مچھلی پکڑ لی، دوسرے حکمی جیسے جال ڈالا اور اس میں شکار پھنس گیا۔

[2] الناس شركاء فى الماء والكلاء والنار۔ (ابو عبید، کتاب الاموال ص ۲۹۵) و (ابو داؤد کتاب البیوع)

مبیع کی تیسری خصوصیت

(۳) جو چیز بیچی جائے اس کے تمام اوصاف خریدار کو بتا دیئے جائیں، مثلاً اگر گیہوں بیچنا ہے تو اس کی پوری تفصیل بتا دینی چاہیئے، مثلاً وہ سفید ہوگا یا لال، موٹا ہوگا یا پتلا یا چاول ہے تو نیا ہوگا یا پرانا، موٹا ہوگا یا باریک، یا اگر مکان ہے تو اس کی پوری حیثیت اس کے عیوب اور خوبیاں سب بتا دی جائیں یا زمین ہے تو اس کی زرخیزی کی حیثیت بتا دی جائے، یا جانور ہے تو اس کے محاسن و معائب بیان کر دیتے جائیں[1]، کپڑا ہے تو صاف بتا دیا جائے کہ کٹا پٹا تو نہیں ہے، مضبوط ہے یا کمزور ہے کس مِل کا ہے، غرض یہ کہ جو چیزیں دیکھی نہیں جاسکتیں یا دیکھی تو جاسکتی ہیں مگر ان کے بارے میں صحیح بات تجربہ کے بعد ہی معلوم ہوسکتی ہیں، مثلاً مکان ٹپکتا ہے، زمین شور یا کنکریلی ہے، جانور مارتا ہے یا کپڑا بہت دنوں کا رکھا ہے اور کمزور ہوگیا ہے، یا تھان کے اندر کا حصّہ کٹا ہوا ہے، تو ان باتوں کو دوکاندار کے لئے بتا دینا ضروری ہے، اگر نہ بتایا تو یہ بیع فاسد ہو جائے گی، اور خریدار کو واپس کردینے کا حق ہوگا۔

(۴) جو چیز بیچی جائے وہ ایسی ہو جسے اسلام مال تسلیم کرتا ہو، مثلاً جتنی چیزیں اسلام میں حرام ہیں، ان کو وہ مال تسلیم نہیں[2] کرتا، اس لئے ان کا بیچنا اور خریدنا بھی حرام ہے، البتہ اگر وہ انسان کی کسی ایک صنف کے لئے جائز ہے تو اس کا کاروبار جائز ہے مثلاً سونا، چاندی، ریشمی کپڑے وغیرہ عورتوں کے لئے جائز ہیں، مگر مرد کے لئے حرام ہیں۔

(۵) اگر کسی دوکاندار نے کوئی چیز بیچی، اور جو صفت بتائی وہ اس کے لئے خلاف نکلی تو بیع فاسد ہو گی، اس نے کہا کہ اس کپڑے کا رنگ پختہ ہے اور کچّا نکلا، یہ لالٹین بھاسکر کی ہے اور دوسرے کارخانہ کی نکلی، یا موتی سچّے ہیں اور جھوٹے نکلے، یا زیور سونے کا ہے اور ملمّع نکلا[3]، تو یہ تمام بیع

---

[1] یصیر المبیع معلوماً ببیان احواله وصفاته التی تمیزه عن غیره۔ (شرح المجلہ ص۹۷)

[2] یلزم ان یکون المبیع مالاً متقوماً ص۲۸ بیع غیر المتقوم من المال باطل والشراء بغیر المتقوم من المال فاسدٌ ص۲۹۔

[3] یصیر المبیع معلوماً ببیان احواله وصفاته ص۲۸ المجلہ۔

بیع فاسد ہوگی، اگر اس نے اس کو واپس نہیں کیا بلکہ استعمال کر لیا تو اب بیع نافذ ہو جائے گی۔

(۷) کوئی شخص یہ کہے کہ جو کچھ میری ملکیت میں ہے وہ سب بیچتا ہوں تو یہ بیع فاسد ہوگی، کیونکہ ملکیت کا لفظ واضح نہیں ہے بلکہ مجہول ہے، ملکیت کی وضاحت ہونی چاہیئے[۱]

جو چیزیں بیع میں خود بخود داخل ہو جاتی ہیں یا نہیں داخل ہوتیں

بعض ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو بیچی ہوئی چیز کے ساتھ خود بخود بک جاتی ہیں، ان کی قیمت الگ سے نہیں لی جا سکتی، مثلاً

(۱) اگر کوئی مکان بیچے تو اس کے دروازے کھڑکیاں، باورچی خانہ، پیشاب خانہ، پاخانہ، اس میں جانے کا راستہ سب بک گیا[۲] اسی طرح کسی نے گھوڑا بیچا تو اس کی لگام اور زین بھی بک گئی یا کسی نے تالا بیچا تو اس کی کنجی بھی بک گئی، کسی نے بچّہ والی اور دودھ دینے والی گائے یا بھینس بیچی تو اس کا دودھ اور بچّہ بھی بک گیا، البتہ اگر بچّہ دودھ نہ پیتا ہو، تو پھر وہ اس میں داخل نہیں ہے، کسی نے اپنا باغ بیچا تو پھل بھی بک گیا، لیکن اگر زمین بیچی اور اس میں درخت ہیں یا فصل لگی ہوتی ہے تو جب تک صراحۃً اس کا ذکر نہ ہو یہ مبیع میں داخل نہیں ہیں، اسی طرح چھوٹی چھوٹی چیزیں جو منتقل ہو سکتی ہیں وہ بھی داخل نہیں ہیں، مثلاً کسی نے مکان بیچا اور اس نے مکان کے اندر گملوں میں پھول لگا رکھے ہیں تو مکان میں یہ چیز شامل نہیں ہے۔

غرض یہ کہ عرف عام میں جو چیزیں مبیع میں داخل سمجھی جاتی ہیں وہ اس کا جزو سمجھی جائیں گی۔[۳]

۲- کسی چیز کی خرید و فروخت کی بات چیت طے ہو گئی، مگر ابھی خریدار بائع یعنی بیچنے والے کے پاس سے اسے لے نہیں گیا ہے اور اس مدت میں اس میں کچھ اضافہ ہو گیا، تو وہ خریدار کا حق ہے، مثلاً کسی نے باغ خریدا اور ابھی اس پر قبضہ نہیں کیا تھا کہ پھل آ گیا، یا گابھن جانور خریدا تھا اور اس نے بچہ دیا تو یہ سب خریدار کا حق ہے، بائع اس کو نہیں لے سکتا[۴]

---

[۱] ویشترط ان یکون المبیع معلوماً (شرح المجلہ صـ ۶۲)

[۲] ویدخل البناء والمفاتیح فی بیع الدار، (کنز الدقائق صـ ۲۲۹)

[۳] اس سے پہلے بھی اس کی تشریح آچکی ہے۔ [۴] الزیادۃ الحاصلۃ فی المبیع بعد العقد قبل القبض کالحمل واشباھھا للمشتری (الحکم صـ ۱۲۰)

(۳) اگر کسی نے اپنا باغ بالکل بیچ دیا، یا کوئی کھیت بیچ دیا اور باغ کے درختوں پر پھل ہے، یا کھیت میں فصل لگی ہوئی ہے، تو یہ بائع کا حق ہے، مشتری یعنی خریدار کو اس کے لینے کا کوئی حق نہیں ہے، البتہ اگر معاملہ کرتے وقت یہ طے ہو جائے کہ پھل اور لگی ہوئی فصل بھی بیع میں داخل ہے تو پھر خریدار کا حق ہو جائے گا، اسی طرح کسی نے مکان فروخت کیا تو جو چیز اس کا جز نہیں ہے۔ مثلاً تخت، پلنگ، کرسی، میز اور گھر کا دوسرا سامان تو ان پر خریدار کا کوئی حق نہیں ہے[1]

جن باتوں کی اجازت ہے

۱۔ جو چیزیں تول کر یا ناپ کر یا گن کر بکتی ہیں، ان میں اختیار ہے کہ چاہے ان کو تول کر یا ناپ کر بیچے یا ان کے ڈھیر کو اندازہ سے فروخت کر دے، مثلاً غلّہ کو اس طرح بھی کہہ کر بیچا جا سکتا ہے کہ چار روپے کے دو کلو اور اس طرح بھی کہہ کر بیچا جا سکتا ہے کہ یہ غلہ کا ڈھیر یا یہ پورا کھیت پچاس روپے میں یا سو روپے میں بیچتا ہوں اسی طرح پھل وغیرہ کے ڈھیر کی بھی قیمت لگائی جا سکتی ہے، اور ان کو گن کر بھی بیچا جا سکتا ہے، مثلاً بائع یہ کہے کہ امرود کی یا سنترے کی یہ ڈھیری چار روپے میں ہے، یا دو روپے میں دس یا پانچ سنترے ملیں گے یا امرود ایک روپے کے ایک سیر ملیں گے تو یہ سب صورتیں جائز ہیں، اسی طرح اگر پھلوں کی پوری ٹوکری کو بیچ دیا اور کسی نے لے لی تو یہ جائز ہے، چاہے اس میں کتنا ہی پھل نکلے، لیکن اگر کوئی یہ کہہ کر بیچے کہ اس میں اتنے پھل ہیں، مثلاً سنترے یا آم یا امرود کی ٹوکری کے بارے میں یہ کہا کہ اس میں پانچ سو پھل ہوں گے اور اس کی قیمت دس روپے ہوگی، تو اگر پانچ سو سے کم ہوں تو پھر خریدار کو اختیار ہو گا کہ وہ خریدے یا نہ خریدے لیکن اگر پانچ سو سے زیادہ ہوں گے، تو وہ بیچنے والے کے ہوں گے[2]

---

[1] لا یدخل الزرع فی بیع الارض والثمر فی بیع الاشجار مالم تذکر صریحاً حین المبیع (شرح المجلۃ ص ۱۱۷)

[2] المجلۃ ص ۳۳، ۳۴ ویباع الطعام کیلاً وجزافاً وبانا ء وحجر بعینہ لم یر قدرہ (کنز الدقائق ص ۲۲۸) ولیست الصبرۃ قیداً بل کل کلیل وموزون او معدود من جنس واحد اذا لم تختلف قیمتہ (شامی ج ۴ ص ۳۷)

۲- اگر کوئی چیز سامنے ہو تو اس کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے، مثلاً غلہ کا یا پھلوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے، بیچنے والے نے کہا کہ یہ ڈھیر میں اتنے روپے میں بیچتا ہوں، تو یہ جائز ہے[1]۔

۳- جن چیزوں میں یکبارگی پھول پھل نہیں آتے بلکہ برابر آتے رہتے ہیں تو ایسے درختوں میں جب کچھ پھل آ جائیں تو ان کو بیچا جا سکتا ہے، مثلاً مہوے کے درخت، امرود کے درخت، ترکاریاں، پھول کے پودے[2]۔

۴- جن درختوں اور پودوں میں ایک ساتھ پھل آ جاتے ہیں، یا دانے نکلتے ہیں، مثلاً آم، بیر اور تمام غلّے تو ان کا حکم یہ ہے کہ جب یہ سب ظاہر ہو جائیں تو ان کو فروخت کیا جا سکتا ہے، چاہے کھانے کے لائق ہوں یا نہ ہوں، مثلاً جب آم میں کیریاں اچھی طرح آ جائیں، یا گیہوں کے کھیت میں بالیں ظاہر ہو جائیں، یا بیر کے پھل ظاہر ہو جائیں، اگرچہ ابھی کھانے کے لائق نہ بھی ہوں تو ان کو فروخت کیا جا سکتا ہے[3]۔

۵- اگر کسی نے صرف گزرنے کا حق یعنی راستہ بیچا، یا تالاب اور کنویں کا پانی بیچا، یا پانی لے جانے کی نالی بیچی تو یہ بیع جائز نہیں ہے، البتہ اگر زمین کے ساتھ راستہ اور نالی کنویں کے ساتھ پانی وغیرہ بیچا تو یہ صحیح ہے[4]۔

۶- اگر کسی نے باغ بیچا تو شیخین کے نزدیک اس کے پھل کا فوراً توڑنا ضروری ہے، مگر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے استحساناً فوری طور پر توڑنا ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ پکنے تک باقی

---

[1] اذا کان المبیع حاضراً فی مجلس البیع تکفی الاشارۃ۔ المجلہ ص۲۸۔

[2] ما تتلاحق افرادہ یعنی ان ما لا یبرز دفعۃ واحدۃ بل شیئاً بعد شیء کالفواکہ والازھار والورق والخضراوات اذا کان برز بعضھا یصح بیع ما سیبرز مع ما برز تبعاً لہ بصفقۃ واحدۃ۔ شرح المجلہ ص۲۹۔

[3] الثمرۃ التی برزت جمیعھا یصح بیعھا وھی علی شجرھا سواء کانت صالحۃ للاکل ام لا۔ شرح المجلہ ص۲۹۔

[4] یصح بیع المرور وحق الشرب والمسیل تبعاً للارض والماء تبعاً لقنواتہ۔ المجلہ ص۲۹۔

رکھنے کی خریدار شرط لگا سکتا ہے[۱]، اس لئے کہ باغ کا فائدہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے، اسی طرح باغ کے کسی ایک درخت یا ڈالی کو بیع سے مستثنیٰ کر سکتا ہے، لیکن متعین تعداد کا مستثنیٰ کرنا صحیح نہیں ہے۔

۷۔ اگر کوئی مشترک زمین یا کوئی مشترک جائداد ہو تو حصہ دار کو اپنے حصّہ کے فروخت کرنے کا حق ہے، چاہے وہ تقسیم ہو گئی ہو یا نہ ہوئی ہو، یا شریک سے اجازت لی گئی ہو یا نہ لی گئی ہو[۲]۔

ثمن یعنی قیمت کا بیان

ثمن یا قیمت سے مراد وہ رقم ہے جو کسی مال کو خریدنے کے بدلے میں دی جاتی ہے، مثلاً ایک جانور کے بدلے دوسرا جانور یا ایک کپڑے کے بدلے دوسرا کپڑا جب چیز کے بدلے چیز یا جنس کے بدلے جنس دی جاتے تو اس کی بہت سی صورتیں ایسی ہیں جن میں ذراسی بے احتیاطی سے خرید و فروخت کا معاملہ سود ہو جاتا ہے، اس کا مفصل بیان سود کے سلسلہ میں آئے گا، یہاں اس کے بارے میں چند باتیں لکھ دی جاتی ہیں۔

۱۔ قیمت کو واضح طور پر بتا دینا ضروری ہے کہ اگر کسی نے مجمل رکھا تو بیع فاسد ہوگی[۳]، مثلاً کسی نے کہا کہ اس بیگ یا ہاتھ میں جتنا روپیہ ہے، وہ سب کے بدلے میں فلاں چیز خریدتا ہوں، تو یہ جائز نہیں ہے، یا دوکاندار نے کہا کہ چیز لے جائیے جو واجب دام ہوں گے، آپ سے مناسب لے لئے جائیں گے، یا میں بعد کو بتاؤں گا، یا جتنا فلاں نے دیا ہے آپ بھی دے دیجئے گا، یا آپ جو مناسب سمجھتے دے دیجئے، یا فلاں آدمی جو دام لگا دیں گے وہ دیدیجئے گا تو ان تمام صورتوں میں بیع فاسد ہوگی، البتہ اگر قیمت طے ہو جائے، پھر چاہے بعد میں ادا کرے تو کوئی حرج نہیں ہے یا قیمت بتا کر کہے کہ لیجائیے سوچ کر لینے یا نہ لینے کا فیصلہ کیجئے گا تو یہ کہنا صحیح ہوگا، اگر اس نے سوچ کر قیمت بھجوا دی تو بیع ہو گئی، ثمن اور قیمت کا فرق اوپر بتایا جا چکا ہے۔

---

[۱] ویجوز عند محمد لانہ شرط من متممات العقد۔ (حاشیہ شرح وقایہ ج ۳ ص ۱۸)

[۲] یصح بیع الحصۃ المعلومۃ شائعۃ بدون اذن الشریک۔ (شرح المجلہ ص ۲۹)

[۳] یلزم ان یکون الثمن معلوما۔ المجلہ ص ۳۴، فلوجھل الثمن فسد البیع۔ شرح المجلہ ص ۱۲۲)

۲۔ جو قیمت ادا کی جارہی ہے، یا جس چیز کے بدلے چیز بدلی جارہی ہے، وہ سامنے ہو، تو پھر اس کی مقدار یا تعداد بتا دینا ضروری نہیں ہے، بلکہ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ سامنے رکھی ہوئی رقم یا موجود غلہ کے بدلے ہم یہ جانور یا کپڑا بیچتے ہیں[1]

۳۔ اگر قیمت خریدتے وقت نہ دی جائے مگر بائع کو یہ بتا دیا جائے کہ ہم اتنے روپے میں یہ چیز خریدتے ہیں بعد میں ادا کریں گے، تو یہ درست ہے۔

۴۔ کسی نے کوئی چیز خریدی اور یہ کہا کہ بارش تک قیمت ادا کریں گے، تو یہ بیع فاسد ہوگی، اس کو دن یا تاریخ بتانا چاہیئے[2]

۵۔ خریدار نے کوئی چیز ادھار خریدی مگر ادائیگی کی کوئی مدّت نہیں بتائی اور یوں ہی لے کر چلا گیا تو وہ مدّت ایک ماہ سمجھی جائے گی، ایک مہینہ کے بعد اسے ادا کر دینا چاہیئے، ایک ماہ بعد دوکاندار اس کے خلاف قانونی کارروائی کر سکتا ہے[3]

۶۔ اگر کسی دوکاندار کے یہاں سے سامان آتا رہتا ہے اور مہینہ میں حساب ہوجاتا ہے، جو کچھ مہینہ کے شروع یا آخر میں نکلتا ہے وہ دے دیا جاتا ہے، تو یہ صورت جائز ہے، لیکن حساب کے وقت اگر قیمت مقرر کرنے میں اختلاف کا خوف ہو تو پھر جائز نہیں ہے اس صورت میں قیمت طے کر کے پھر سودا منگانا چاہیئے[4]

۷۔ جو سکّے کسی ملک میں رائج ہوں، ان میں سے جو سکّہ بھی قیمت میں دیا جائے دوکاندار کو لینا پڑے گا، البتہ اگر دوکاندار نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم ریزگاری نہیں لیں گے، یا عموماً ریزگاری قیمت میں نہ لی جاتی ہو، تو پھر دوکاندار ریزگاری لینے سے انکار کر سکتا ہے، اگر

---

[1] اذا کان الثمن حاضراً فالعلم به یحصل بمشاھدته والاشارة الیه واذا کان غائباً یحصل ببیان مقداره ووصفه۔ المجلہ ص۳۴۔

[2] تاجیل الثمن الیٰ مدة غیر معینة کامطار السماء یکون مفسداً للبیع۔ شرح المجلہ ص۳۶

[3] اذا باع نسیئة بدون بیان مدة فتصرف المدة الیٰ شھر واحد۔ المجلہ ص۳۶۔

[4] البیاع اذحاسبه علیٰ اثمانها بعد استھلاکها جاز استحسانا۔ درمختار، شامی ج۴ ص۱۶

کسی ملک میں کئی طرح کے سکّے رائج ہوں تو اس کی تصریح ضروری ہے، مثلاً سنگاپور اور ملیشیا کے ڈالر اور امریکن ڈالر کی قیمت میں فرق ہے، تو اگر یہ تینوں سکّے کہیں چل رہے ہوں تو اس کی تصریح ضروری ہے کہ کونسا ڈالر مراد ہے۔[1]

نیلام اگر کوئی شخص کسی چیز کو نیلام کرکے بیچے تو وہ جائز ہے یعنی کئی خریدار ہوں، اور ان میں جو زیادہ قیمت دے اسے وہ سودا دے دے، حدیث نبوی میں اس کی مثال موجود ہے۔ آپؐ نے خود ایک صحابی کے پیالہ کی قیمت لگوائی اور پھر فرمایا "من یزید" کون اس سے زیادہ دے گا، جس کی قیمت زیادہ ہوئی، آپؐ نے اسے عنایت فرمادیا، اسی حدیث کی روشنی میں حنفی فقہاء نے لکھاہے۔ ولا یکرہ بیع من یزید (شرح وقایہ ج۲ ص۵۶)

۸۔ جو مال اُدھار بیچا جائے اس میں مدت مقرر کرکے اکٹھا قیمت لینا اور قسط مقرر کرکے لینا دونوں درست ہے، مگر مدّت کا تعین ضروری ہے۔[2]

۹۔ اگر خریدار یہ کہے کہ پہلے سودا میرے حوالے کردو تو میں قیمت دوں گا اور بیچنے والا پہلے قیمت طلب کرے تو پہلے خریدار سے قیمت دلائی جائے گی پھر سودا۔

معاملہ طے ہوجانے کے بعد خرید و فروخت کا معاملہ کرنے کا جو طریقہ اوپر بتایا گیا، اور سودا اور قیمت کے بارے میں جو تفصیل کی گئی ہے اگر اس طریقہ پر کوئی معاملہ طے کرلیا تو پھر بائع اور مشتری میں سے کسی کو اس سے انکار کرنے کا حق نہیں ہے، مثلاً ایک خریدار نے کپڑے کے دوکاندار یا غلّہ کے بیوپاری سے کپڑے یا غلہ کا معاملہ طے کیا اور دونوں میں بھاؤ اور قیمت طے ہوگئی، تو پھر ان میں سے کسی کو یہ اختیار

---

[1] اذا جری البیع علیٰ قدر معلوم من القروش کان للمشتری ان یؤدی ثمن فی ای نوع شاء من النقود الرائجۃ و اذا بین وصف الثمن وقت البیع لزم علی المشتری ان یؤدی الثمن من نوع النقود التی وصفھا۔ المجلہ ص۳۵۔

[2] البیع مع تاجیل الثمن والتسقیط صحیحٌ۔ شرح المجلہ ص۲۵۔

نہیں ہے کہ وہ انکار کرے، دوکاندار کو بیچنا اور مشتری کو خریدنا پڑے گا[1] الا یہ قیمت یا مال میں کوئی عیب نکل جائے یا اس نے سودا دیکھا نہ ہو، یا معاملہ تو طے ہوگیا اور بائع نے یہ کہا کہ آج موقع نہیں ہے، کل سودا لے جائیے گا، یا مشتری نے کہا کہ میں کل قیمت دوں گا اور غلہ لیجاؤں گا، تو دوسرے دن چاہے غلہ کا بھاؤ تیز ہوجائے یا کم ہوجائے دونوں اس معاہدہ کے پابند ہوں گے جو اس سے پہلے طے ہوگیا ہے، اگر کوئی انکار کرے گا تو وہ مجبور کیا جائے گا، اور اسلامی حکومت قانوناً اس معاملہ کو نافذ کرے گی[2]

بائع و مشتری کب معاملہ فسخ کرسکتے ہیں

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خریدار کو کوئی چیز خریدنے کے بعد پھیرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے، یا دوکاندار کسی وجہ سے سودا دینا نہیں چاہتا اور قیمت واپس کردینا چاہتا ہے اگر ایسی صورت پیش آجائے تو پھر ان دونوں کو معاملہ کے فسخ کرنے کا اختیار رہے، بشرطیکہ دونوں اس پر راضی ہوں[3]، اگر دونوں راضی ہوں تو پھر خریدار مال واپس کردے، اور دوکاندار قیمت، لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خریدار مال کا کچھ حصہ استعمال کرچکا ہوتا ہے اور دوکاندار وہ پیسے خرچ کردیتا ہے، تو اگر مال کا کچھ حصہ اس نے استعمال کرلیا ہے تو بھی اس کو پھیرنے کا اختیار ہے، مگر اس میں شرط یہ ہے کہ دوکاندار پھیر لینے پر اور یہ استعمال شدہ حصہ کی قیمت وضع کرلینے کے بعد بقیہ قیمت لینے پر راضی ہو، اگر اس پر وہ راضی نہ ہو اور پوری قیمت مانگے تو دوکاندار کو حق ہے کہ وہ نہ واپس کرے، مثلاً کسی نے

---

[1] واذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منهما الا من عیب او عدم رویة۔ ہدایہ ج ۳ ص ۳۵،

[2] ولو ترقی بسعر مد الحنطة فی الغد الی دینار و نصف یجبر البائع علی اعطاء الحنطة بسعر المد بدینار وکذا بالعکس لو رخصت الحنطة فالمشتری مجبور علی قبولها بالثمن الاولی۔ المجلہ ص ۲۴۔

[3] للمعاقدین ان یتقایلا لبیع برضاهما بعد انعقادہ۔ المجلہ ص ۲۷۔

ایک پیکٹ بسکٹ ایک روپیہ میں خریدا، اور اس میں بیس بسکٹ ہیں، اس میں سے چار بسکٹ کھالیے، پھر وہ پسند نہیں آتے یا اس کی ضرورت نہیں سمجھی، تو اگر دوکاندار بقیہ کے واپس کرنے پر راضی ہو تو واپس کر سکتا ہے، اور اس کو اختیار ہے کہ وہ چار بسکٹ کی قیمت کاٹ لے اگر دوکاندار واپسی پر راضی نہ ہو تو پھر خریدار اس کو مجبور نہیں کر سکتا، اسی طرح کسی نے زمین مع فصل یا باغ مع پھل خریدا اور اس نے جب فصل کاٹ لی، یا پھل کھالیا اس کے بعد زمین واپس کرنے کا ارادہ کیا تو اس کی واپسی بائع کی رضامندی اور فصل اور پھل کی قیمت وضع کرنے کے بعد ہو سکتی ہے[1]

لیکن اگر خریدار نے پوری چیز استعمال کر لی، تو پھر اب اس کی واپسی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا[2] مثلاً اگر اس نے پورا پیکٹ بسکٹ کا استعمال کر لیا تو پھر رقم کی واپسی کا اختیار نہیں رہا، خواہ اس کو وہ پسند آئے ہوں یا نہ آئے ہوں وہ اچھے رہے ہوں یا خراب، کیوں کہ اس کے پاس وہ چیز ہی نہیں ہے تو واپس کیا کرے گا، اس کو شریعت میں بیع اِقالہ کہتے ہیں[3]

قیمت خرچ ہو جانے کی صورت

لیکن قیمت کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یعنی قیمت اگر بائع نے خرچ کر دی ہے تو بھی واپس ہو سکتی ہے کیونکہ روپے کے بدلے دوسرا روپیہ وہ دے سکتا ہے، اس لئے اگر وہ سودا کے واپس لینے پر راضی ہو گیا ہے تو اس کو قیمت کے خرچ ہو جانے کا بہانہ بنانا صحیح نہیں ہے، البتہ اس کو یہ اختیار ہے کہ وہ قیمت بعد میں ادا کرے مگر اس صورت میں خریدار کی رضامندی ضروری ہے، غرض یہ کہ جس طرح خرید و فروخت کا معاملہ ہوا تھا، اسی طرح واپسی کا معاملہ بھی صاف صاف

---

[1] لو کان بعض المبیع قد تلف صحت الاقالۃ ۔ المجلہ ص۲۷۔

[2] فلو کان المبیع قد تلف لا تصح الاقالۃ ۔ المجلہ ص۲۷۔

[3] حدیث میں آتا ہے، من اقال مسلماً اقال اللہ عثرتہ یوم القیامۃ ۔ جو مسلمان سے خریدی ہوئی چیز واپس لے لے، اس کے گناہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن معاف کر دیں گے ۔ (مشکوٰۃ ص۲۴۹)

اور رضامندی کے ساتھ ہونا چاہیئے [1]

چند اور شرطیں (۱) اقالہ، یعنی واپسی اصل قیمت سے زیادہ پر نہ ہونی چاہیئے (۲) اگر دوکاندار نے بازار کے بھاؤ سے قیمت زیادہ لی ہے تو اس کو واپس کرنا ضروری ہے، (۳) اگر مشتری نے اس میں کوئی اضافہ یا عیب پیدا کر دیا ہے، تو اقالہ نہیں ہو سکتا، الّا یہ کہ بائع خود راضی ہو جائے۔

سودا یا قیمت واپس کرنے کی بعض اور صورتیں

معاملہ طے ہونے سے پہلے فریقین کو جو اختیار رہتا ہے اسے خیارِ مجلس اور خیار قبول کہتے ہیں اور معاملہ طے ہونے کے بعد قیمت پھیر کر سودا واپس لینے کی یا سودا واپس کر کے قیمت پھیر لینے کی سات صورتیں ہوتی ہیں (۱) خیار شرط (۲) خیار وصف (۳) خیار نقد (۴) خیار تعیین (۵) خیار رویت (۶) خیار عیب (۷) خیار غبن، اب ان سب کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

خیار شرط خرید و فروخت کا معاملہ طے ہو گیا مگر خریدار نے خریدتے وقت یہ شرط لگا دی کہ میں دو یا تین روز میں بتاؤں گا کہ اس کو لیتا ہوں یا نہیں، یا گھر میں دکھلا کر پھر بتاتا ہوں، تو خریدار کو اس کے پھیر دینے کا اختیار رہے، اس کو خیار شرط کہتے ہیں، یعنی یہ شرط لگا دینے کی وجہ سے اس کو یہ اختیار مل گیا، اسی طرح بائع کو بھی شرط لگانے کا اختیار ہے یعنی وہ کسی خریدار کی پسندیدہ چیز کے بارے میں کہہ سکتا ہے کہ میں اس کے بیچنے کا فیصلہ دو روز یا تین روز بعد کروں گا، لیکن خیار شرط کے بارے میں چند باتیں یاد رکھنی ضروری ہیں، (۱) خیار شرط کی مدت [2] کی تعین ضروری ہے کہ وہ کتنے دن میں لینے یا نہ لینے کا جواب

---

[1] ھلاک الثمن ای تلفہ لا یکون مانعا من صحۃ الاقالۃ۔ المجلہ ص۲۷۔

[2] امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ خیار شرط میں زیادہ سے زیادہ تین دن کی مدت مقرر کی جا سکتی ہے، مگر صاحبین یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ یہ کہتے ہیں کہ مدت کی تعین ہونی چاہیئے،

باقی ص پر

دے گا۔[1]

۲۔ اگر کسی اجنبی آدمی کو یہ خیار دے دیا جائے تو بائع اور مشتری کا اختیار ختم نہیں ہو گا۔

(بقیہ ص)

مگر یہ مدت تین دن سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے، ان دونوں حضرات کے پاس دلائل ہیں۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ، حبان بن منقذ انصاری کی روایت سے استدلال کرتے ہیں، جس میں ہے کہ ان کو بیع میں دھوکہ ہو جایا کرتا تھا تو ان کے گھر والے حضورؐ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ ان کو بیع سے روک دیجئے مگر انھوں نے کہا کہ میں خرید و فروخت سے باز نہیں رہ سکتا تو حضورؐ نے فرمایا کہ اچھا تم خرید و فروخت کرتے وقت لَا خَلَابَۃَ کہہ لیا کرو یعنی اس میں دھوکہ نہ ہو، "و انت بالخیار ثلاثاً (بحوالہ صحاح ستہ المنتقی ج ۲ ص ۳۳۵)

صاحبینؒ اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ مدت کی تعین ہونی چاہیئے، خواہ ایک دو ماہ کی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ خیار شرط کی اجازت اس ضرورت کے تحت دی گئی ہے کہ بائع اور مشتری اچھی طرح غور کرلیں، اور یہ ضرورت تین دن سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے، اس سلسلے میں عبداللہ بن عمرؓ کا ایک اثر بھی منقول ہے، جس میں دو ماہ کی مدت کا ذکر ہے مگر اس اثر میں خیار شرط کا ذکر نہیں ہے اس لئے خیار وصف بھی مراد ہو سکتا ہے، نیز اس اثر کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے مگر محدثین کے اس اصول کے تحت کہ جب اہل سنت والجماعت کے ایک قابل اعتماد بڑے حلقہ کا اس پر تعامل ہو تو کسی روایت کا ضعف دور ہو جاتا ہے اور اس لئے اسے صحیح سمجھا جاتے گا (تدریب الراوی) یہ اختلاف مدت کی تعین میں ہے لیکن اگر کوئی مدت مقرر ہی نہ کیجاتے تو تمام ائمہ کے یہاں یہ بیع فاسد ہے (ہدایہ ج ۳ ص ۳۵، ۱۳)۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۲ ص ۱۷۱)۔ خیار شرط کے سلسلہ میں ائمہ اربعہ کے درمیان کچھ اور اختلافات ہیں، مگر بنیادی مسائل میں سب کا اتفاق ہے۔

راقم کے خیال میں اس اختلاف کو موقع و محل یا سودے کے اہم و غیر اہم ہونے پر محمول کرنا چاہیئے یعنی معمولی چیزوں میں تو تین دن سے زیادہ کی مدت نہ ملنی چاہیئے مگر کسی بڑی چیز کی خریداری میں یہ مدت کافی نہیں ہو سکتی اس لئے اس میں غور و فکر کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، غالباً اسی لئے صاحبینؒ نے یہ رائے دی ہے، المجلہ کے مرتبین نے بھی تین دن کی قید کا ذکر نہیں کیا ہے، اس لئے ان کا رجحان بھی صاحبین کی طرف معلوم ہوتا ہے، جہاں تک حبان منقذ کی روایت کا تعلق ہے، اسے ان کی خصوصیت پر محمول کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے امام ابو حنیفہؒ

(باقی ص پر)

[1] خیار الشرط جائز فی البیع للبائع والمشتری ولهما الخیار ثلثة ایام۔

۳۔ اگر مقررہ مدت کے بعد اس نے کوئی جواب نہیں دیا، تو اب بائع یا مشتری کو واپسی کا کوئی اختیار نہیں ہے، ہاں اگر بائع اپنی خوشی سے واپس کرلے تو اور بات ہے[۱]

۴۔ جس طرح بائع اور مشتری زبان سے بیچنے اور خریدنے کے ساتھ ہی خیار شرط کرتے ہیں، اسی طرح کوئی ایسا فعل ان سے سرزد ہو، جس سے خیار کی اجازت یا اس کا فسخ سمجھا جاتے تو یہ بھی جائز ہے[۲] مثلاً اس نے اس چیز کو استعمال کرلیا تو یہ قبول سمجھا جائے گا۔

۵۔ اگر خریدار سے کسی نے خیار شرط کی مگر گھر لے جاکر اس کو استعمال کرلیا تو پھر اب واپس کرنے کا اختیار نہیں ہے، بلکہ اب اس کو قیمت ادا کرنا پڑے گی، البتہ اگر وہ ایسی چیز ہو جس کے استعمال کے بعد ہی اس کا فیصلہ ہوسکتا ہے تو پھر استعمال کا حق ہے، مثلاً کسی نے ایک پلنگ خریدا، یا کرسی و میز خریدی، یا چادر خریدی، یا جوتا خریدا اور اس کو لے جاکر استعمال کرنا شروع کرنا، تو اب اس کو واپسی کا حق نہیں ہے، ہاں اگر تھوڑا سا استعمال کرلیا اور کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر گھڑی خریدی اور دو تین دن تک کلائی میں لگاکر یا میز پر رکھ کر یا دیوار پر ٹانگ کر اس کا وقت دیکھا اور اس کے بعد واپس کیا تو اس کو

(بقیہ صـ)

یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر فریق ثانی زیادہ کی اجازت دے دے تو جائز ہے۔

راقم الحروف نے جو بات عرض کی ہے، امام مالکؒ کا مسلک بھی یہی ہے، انھوں نے خیار شرط کی چار قسمیں کی ہیں (۱) اگر کسی زمین اور مکان اور درخت وغیرہ ہوں تو اس کی خریداری کے لئے ۳۶-۳۸ دن کی مدت ہوسکتی ہے (۲) اگر کپڑے، برتن اور دوسرے سامان زندگی کی خریداری ہو تو اس میں تین دن سے پانچ دن تک کی مدت مقرر کی جاسکتی ہے، اس سے زیادہ بیع فاسد ہوگی (۳) اسی طرح جانوروں اور پرندوں کی خریداری میں بھی یہی مدت ہے (۴) غلام وغیرہ کی خریداری میں آٹھ دن کی مدت کافی ہے۔

[۱] اذ مضت مدۃ الخیار فلم یفسخ او لم یجز من له الخیار لزم البیع وتم۔ (المجلہ صـ۴۵)

[۲] فسخ البیع و اجازته فی مدۃ الخیار کما یکون بالقول یکون بالفعل ایضاً۔ المجلہ صـ۴۴۔

واپسی کا حق ہے، اسی طرح اگر اس نے موٹر خریدا، سائیکل خریدی تو اس کی رفتار وغیرہ دیکھنے کے لئے اس پر چڑھنے کا حق ہے، اسی طرح اگر دودھ کے لئے گائے بھینس خریدی، یا سواری کے لئے گھوڑا خریدا، تو اس کو اس مدت میں دودھ دوہنے اور گھوڑے پر سواری کرنے کا حق ہے، اسی طرح کسی نے سوئٹر خریدا، یا موزہ خریدا یا بنیان خریدا تو ان کو پہن کر دیکھ سکتا ہے، کیوں کہ ان تمام مذکورہ چیزوں کی اچھائی یا خرابی بغیر استعمال کئے نہیں معلوم کی جا سکتی۔

اسی طرح اگر بائع یہ کہے کہ میں تین دن کے اندر واپس لے سکتا ہوں، اس کے بعد نہیں لوں گا، تو اس کو اس کا اختیار ہے[1]

خرابی آجانے کی صورت میں

لیکن اگر مشتری کے استعمال سے اس چیز میں کوئی خرابی آگئی تو پھر واپسی کا حق نہ ہوگا اور خریدار کو قیمت ادا کرنی ہوگی، اسی طرح اگر وہ چیز ضائع ہوگئی تو بھی خریدار کو طے شدہ قیمت ادا کرنی ہوگی، پہلی صورت میں اگر بائع اپنی خوشی سے واپس کرلے تو یہ اس کا احسان ہوگا، اسی طرح اگر موزہ یا بنیان پر لیبل لگا ہے، اس کو چھڑانے کے بعد اس کی قیمت گھٹ جائے گی تو اس صورت میں بھی اس کو پہن کر دیکھنے کا اختیار نہ ہوگا، اگر پہنے گا تو قیمت دینی ہوگی[2]

موت کے بعد

اگر خیار شرط کی مدت میں بائع یا مشتری میں سے کوئی مرجائے تو اب ورثہ کو اس کے توڑنے کا کوئی اختیار باقی نہیں رہے گا، یعنی اگر بائع مرجائے تو اب مشتری کو وہ چیز لینی پڑے گی، اگر مشتری مرجائے تو بائع کو اس کی قیمت لینے کا حق ہوگا، چیز واپس کرنے کا حق مشتری کے ورثہ کو نہیں ہوگا[3]

اگر خیار شرط بائع کی طرف سے ہے تو مال اسی کی ملکیت سمجھا جائے گا، اگر اس مدت میں

---

[1] خیار البائع یمنع خروج المبیع عن ملکہ۔ ہدایہ ج ۳ ص ۱۴، المجلہ ص ۴۵

[2] فان ھلک فی یدہ ھلک بالثمن وکذا اذا دخلہ عیب۔ ہدایہ ج ۳ باب الخیار ص ۱۵۔ المجلہ ص ۴۵

[3] ہدایہ باب خیار الشرط، المجلہ ص ۴۵۔

مشتری سے وہ مال ضائع ہوگیا تو مشتری کو اس کی اصل قیمت ادا کرنی ہوگی اور اگر خیار مشتری کی طرف سے ہے، اور قبضہ کے بعد اس مدت میں مال ضائع ہوگیا تو مشتری کو طے شدہ رقم یعنی ثمن دینا ہوگا۔[1]

کن کن معاملات میں خیار نہیں ہے

دس[2] معاملات ایسے ہیں جن میں خیار شرط کی اجازت نہیں ہے (۱) نکاح (۲) طلاق (۳) یمین یعنی قسم (۴) نذر (۵) بیع صرف (۶) بیع سلم (۷) اقرار اس کی دو صورتیں ہیں، ایک اقرار ایسی چیز میں ہو جس میں خیار کی اجازت نہیں ہے تو بھی اگر وہ اقرار کرے گا، تو مان لیا جائے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ایسی چیز میں اقرار کرتا ہے جس میں خیار ہے تو پھر عقد کے اعتبار سے وہ صحیح سمجھا جائے گا، اس کی اقرار کی وجہ سے نہیں، (۸) وکالت (۹) وصیت (۱۰) ہبہ۔

عام طور پر فقہاء خیار وصف کا ذکر الگ سے نہیں کرتے بلکہ اسے خیارِ رویت اور خیارِ عیب کے ضمن میں ذکر کرتے ہیں، مگر المجلہ کے مرتبین نے اس کا ذکر الگ سے کیا ہے اور موجودہ دور میں اس کی شدید ضرورت ہے۔

خیارِ وصف

کسی دوکاندار نے کسی کپڑے کی، یا سُنار نے کسی زیور کی، یا کسی پھل والے نے پھل کی، یا کسی جانور کے بیوپاری نے جانور کی چال کی یا اس کے دودھ کی بڑی تعریف کی رات کا وقت تھا خریدار نے غور سے دیکھا نہیں یا محض اس کی ترغیب کی بنا پر خرید لیا مگر جب گھر لے جا کر دیکھا اور آزمایا تو اس چیز کو تعریف کے مطابق نہیں پایا، تو اب اس کو اس کی واپسی کا حق حاصل ہے، اسی طرح ایجنٹ نے کوئی چیز عمدہ دکھائی یا ہوائی جہاز یا مشین کا فوٹو نمونہ کے طور پر دکھلایا اور اس کے اوصاف بیان کئے اور خریدار نے اس کا آرڈر دے دیا، مگر جب چیز آئی تو نمونہ کے مطابق نہ تھی، تو اس کی واپسی کا حق ہے

---

[1] اذا شرط الخیار للبائع فقط فاذا تلف المبیع فی ید المشتری بعد قبضہ لا یلزمہ الثمن المسمیٰ بل یلزمہ اداء قیمتہ للبائع لو قبضہ۔ المجلہ ص۴۵۔

البتہ اگر اس نے اس کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا، یا خود استعمال کرلیا تو پھر واپسی کا حق نہیں ہے، استعمال کرنے کی جو تفصیل خیار شرط میں بیان کی گئی ہے اس کو یہاں بھی سمجھنا چاہیئے، خیار وصف کی صورت میں اگر خریدار کا انتقال ہو گیا تو ورثہ کو بھی اس مال کے واپس کرنے کا حق باقی رہے گا[1]

خیار وصف کے دوسرے احکام قریب قریب وہی ہیں، جو خیار شرط اور خیار رویت کے ہیں۔

خیار رویت

اگر کسی نے بائع کے کہنے اور بتانے پر بے دیکھے ہوتے کوئی چیز خریدلی، تو اس کے دیکھنے کے بعد خریدنے یا نہ خریدنے کا اختیار باقی رہے گا، اس کو خیار رویت کہتے ہیں[2]، البتہ بائع یعنی بیچنے والے کو خیار رویت کا حق نہیں ہے، مثلاً کسی نے اپنی چیز بغیر دیکھے فروخت کردی تو اس کو اب واپس لینے کا حق نہیں ہے[3]۔ مثلاً کسی نے ایک مکان کسی دوسری جگہ پر خریدا، یا کسی دوسرے ملک سے کوئی مال منگالیا اور دیکھنے کے بعد پسند نہ آیا، تو اس کو لینے یا نہ لینے کا حق حاصل ہوگا، لیکن اگر کسی نے کوئی مال یا جائداد دوسرے شہر میں وراثت میں پائی، یا اور کسی طریقہ سے اس کو مل گئی اور اس نے کسی کے ہاتھ فروخت کردی، تو اب بائع کو دیکھنے کے بعد واپسی کا حق نہیں، چاہے اس میں اس کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو، اس کو پہلے ہی دیکھ لینا چاہیئے تھا، کیوں کہ یہ اس کی ملک میں تھی، بخلاف خریدار کے کہ چونکہ اس کی ملکیت میں یہ چیز نہیں تھی، اس لئے اس کو دیکھنے کے بعد فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں چند باتیں اور یاد رکھنی چاہئیں۔

---

[1] اذا باع مالاً بوصف مرغوب فظهر المبيع خالياً عن ذالك الوصف كان المشتري مخيراً ان شاء فسخ البيع وان شاء اخذه ويسمي هذا الخيار خيار الوصف۔ المجلہ ص۴۵۔

[2] من اشتري شيئاً لم يره جائز وله الخيار۔ ہدایہ ج۳ ص۱۹۔

[3] لا خيار للبائع ولو كان لم يري المبيع۔ شرح المجلہ ص۴۷۔

۱۔ کسی چیز کا نمونہ دیکھ لینے کے بعد معاملہ کیا تو اب واپسی کا حق نہیں ہے، البتہ اگر مال نمونہ کے مطابق نہ ہو تو پھر دیکھنے کے بعد واپس کر سکتا ہے، مثلاً کسی نے کپڑے کا، اون کا، یا گھڑی کا یا غلہ کا نمونہ دکھایا اور اسی کے مطابق اس نے مال بھیج دیا تو اب اس کو واپسی کا حق نہیں ہے، البتہ اگر نمونہ کے مطابق نہ ہو تو پھر واپس کر سکتا ہے[۱]

۲۔ جن چیزوں کا صرف نمونہ دیکھنے سے اندازہ نہ ہو سکے، ان میں نمونہ دکھانا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو دیکھنے کے بعد واپس کرنے کا اختیار ہوگا، مثلاً ایک بکری دکھا کر سو بکری کا معاملہ طے کیا، یا ایک بیل یا ایک گھوڑا دکھا کر چار بیلوں یا گھوڑے کا معاملہ طے کیا، یا ایک یا چند پھل دکھا کر پوری ایک گاڑی پھل کا معاملہ طے کیا گیا، تو ان چیزوں میں چونکہ یکسانیت نہیں ہوتی، اس لئے خریدار کو خیار رویت کا حق باقی رہے گا[۲]

۳۔ جو چیزیں کھانے پینے والی ہیں، ان کو صرف دیکھنے ہی کا حق نہیں ہے، بلکہ ان کو چکھنے کا حق بھی خریدار کو ہے، بشرطیکہ اس سے بائع کو بہت زیادہ نقصان نہ ہو، یا وہ چیز بالکل خراب نہ ہو جائے اور بائع کو مطلع کر دیا گیا ہو، کہ ہم چکھیں گے، مثلاً اگر کسی نے بسکٹ کا پیکٹ خریدا، جیلی کا ایک ڈبہ خریدا، امرود یا سنترے خریدے تو ان چیزوں کو آپ چکھ سکتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ آپ کو بائع سے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ہم چکھ کر خریدیں گے اگر وہ راضی ہو تو چکھنے کے بعد بھی خریدار واپس کر سکتا ہے، لیکن اگر وہ راضی نہ ہو تو اس کو چکھنے کا حق نہیں ہے، یا چکھنے کی صورت میں دوکاندار کو زیادہ نقصان ہو تو بھی وہ اس پر مجبور نہیں ہے مثلاً اگر جیلی کا ڈبہ آپ کھول کر اس کو چکھیں اور پھر نہ لیں تو اس صورت میں دوکاندار کو بہت زیادہ نقصان ہوگا، کیونکہ کھل جانے کے بعد اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے، اور اگر کچھ دن

---

[۱] ما بیع علی مقتضی الانموذج اذا ظہر دون الانموذج یکون المشتری مخیراً ان شاء قبلہ وان شاء ردہ۔ المجلہ ص۴۷۔

[۲] المراد من الرویۃ فی بحث خیار الرویۃ ھو الوقوف علی الحال والمحل الذی یعرف بہ المقصود الاصلی من المبیع۔ المجلہ ص۴۲۔

نہ بکے تو خراب ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے، لیکن معمولی پھل وغیرہ کے چکھنے میں یہ بات نہیں، اس لئے اس کے چکھنے کی مطلقاً اجازت ہے، برخلاف اس کے اگر گیہوں خریدا، یا آٹا خریدا، اور پسانے یا پکانے پر وہ خراب نکلا تو پھر بائع کی مرضی کے خلاف وہ واپس کر سکتا ہے، البتہ جتنا آٹا یا گیہوں وہ استعمال کر چکا ہے، اس کی قیمت وضع کر لینے کا حق بائع کو ہے۔

۴۔ اگر خریدنے سے پہلے اس چیز کو دیکھ لیا تھا، اس کے بعد خریدنے کا معاملہ کیا تو اب دوبارہ اس کو خیار رویت نہیں ہے، لیکن دیکھنے اور معاملہ کرنے کی درمیانی مدت میں اس میں کوئی خرابی آگئی ہو، تو البتہ واپسی کا حق ہے، مثلاً کسی کا مال اسٹیشن پر یا دوسرے کسی مقام پر پڑا ہوا ہے، خریدار نے اسے دیکھ لیا اور پھر اس نے مال والے سے اس کے خریدنے کا معاملہ کر لیا تو پھر اب دوبارہ دیکھ کر اس کو واپس کرنے کا حق باقی نہیں رہا، البتہ اگر اسی درمیان میں بارش آگئی، یا کوئی اور حادثہ پیش آگیا، اور وہ مال خراب ہو گیا تو پھر اس کو واپسی کا حق ہے۔

۵۔ کسی دوکاندار کا نمائندہ اگر کوئی چیز دیکھ کر خریدے تو اب مالک کو واپسی کا حق نہیں ہے[1] لیکن اگر اس نے مال کی خریداری کا نمائندہ اس کو نہیں بنایا تھا، بلکہ اس لئے بھیجا تھا کہ وہ مال حفاظت سے پیک کرا کے بھیج دے، یا وہاں سے اٹھوا دے، تو پھر اس نمائندہ کا دیکھنا کافی نہیں ہے، بلکہ اصل مالک کا دیکھنے کے بعد واپسی کا اختیار باقی رہے گا[2]

۶۔ اگر خریدار اس چیز کو اپنے استعمال میں لے آئے، تو پھر اس کو واپسی کا حق نہیں ہے، لیکن یہ استعمال چکھنے والا نہ ہو، مثلاً کسی نے سو ڈبے جیلی کے منگائے اور اس میں سے دس بیس ڈبے فروخت کر لئے تو اب پھر مال واپس کرنے کا حق نہیں ہے، ہاں اگر ایک ڈبہ کھول کر دوکاندار نے چکھا اور وہ خراب نکلا تو واپسی کا حق ہے، یا ابھی دو ایک ڈبے فروخت کئے تھے،

---

[1] تکون رویتہما لذالك الشئ کرویۃ الاصیل (المجلہ)

[2] من ارسل من طرف المشتری لاخذ المبیع وارسالہ لا تسقط رویتہ خیار المشتری (المجلہ ص۴۸)

اور خریدار نے شکایت کی تو پھر اس کو مال واپس کر دینے کا حق ہے۔

۷۔ اگر کوئی اندھا ہوا اور وہ اپنے ہاتھ سے چھو کر یا چکھ کر یا سونگھ کر یا دوسرے سے پوچھ کر کوئی چیز خریدے تو اب اس کو خیار رویت باقی نہیں رہے گا۔

خیار رویت کی مدت میں مشتری کا انتقال ہو گیا تو اس کے ورثہ کو خیار رویت کا حق نہیں پہونچتا، اب وہ معاملہ طے سمجھا جائے گا[۱]

۸۔ اگر کوئی مکان خریدا تو سارے کمروں کو دیکھنا ضروری ہے، لیکن اگر ایک ہی طرح کے سارے کمرے ہوں تو ایک کا دیکھ لینا کافی ہے، اگر مختلف ہیں اور سارے کمروں کو نہیں دیکھا تو اس کو خیار رویت باقی رہے گا، اور اگر یکساں ہیں تو ایک کا دیکھ لینا کافی ہے (المجلہ ص ۴۷)

۹۔ اگر مختلف چیزوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے، تو ہر چیز کو دیکھنا ضروری ہے، اگر خریدار نے بعض کو دیکھا اور بعض کو نہیں دیکھا تو اب اس کو یا تو سب لینا ہوگا یا سب کو رد کر دینا ہوگا[۲] مثلاً

---

[۱] خیار رویت کے سلسلہ میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں ایک یہ کہ مبیع خواہ معاملہ کے موقع پر موجود نہ ہو یا موجود ہو مگر آنکھوں سے اوجھل ہو، اس کی بیع جائز نہیں یہی ان کا ظاہری مسلک ہے، مگر دوسرا قول یہ ہے کہ اگر مبیع کی جنس اور وصف پورے طور پر بیان کر دیا جائے تو یہ بیع صحیح ہے اور مشتری کو خیار رویت حاصل ہے، اس دوسرے قول کے مطابق ان کی اور ائمہ ثلثہ کی رائے ایک ہو جاتی ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ چیز جو بیچی جا رہی ہے وہ وہاں موجود ہے مگر مشتری نے دیکھا نہیں تو اس صورت میں بیع صحیح نہ ہوگی، دوسری صورت یہ ہے کہ مبیع وہاں موجود نہیں چاہے وہ دیہات، شہر یا کہیں ملک کے اندر ہو یا باہر، دونوں صورتوں میں بیع صحیح ہو جائے گی اور اسے خیارِ رویت حاصل رہے گا خواہ اس کے لانے میں دقت ہو یا آسانی لیکن شرط یہ ہے کہ اس نے دیکھنے کی شرط لگا دی ہو، اور اس سودے کی جنس اور صفت بیان کر دی گئی ہو۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ وہ چیزیں جو آنکھوں کے سامنے نہ ہوں ان کی بیع انھیں چیزوں میں صحیح ہو سکتی ہے جن میں بیع سلم جائز ہے، بیع سلم کا ذکر آگے آرہا ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ص ۲۲۲، ۲۲۲)۔

[۲] ان شاء اخذ جمیع الاشیاء المبیعة وان شاء ردجمیعها۔ المجلہ ص ۴۸۔

بہت سے جوتے، چپل، سائیکلیں، کاریں وغیرہ، ایک جگہ رکھی ہوئی ہیں اور سب کو خریدنا ہے، تو اسے ہر ایک کو دیکھ لینا چاہیئے، ورنہ اگر ایک سائیکل دیکھ کر یا ایک چپل کو دیکھ کر پورے ڈھیر کا معاملہ کرے گا تو اسے سب لینا ہوگا یا سب چھوڑنا ہوگا۔

خیارِ عیب

اوپر ذکر آچکا ہے کہ جو چیز بیچی جائے، بیچنے والوں کو چاہیئے کہ اس کی اچھائی اور برائی کو وہ بتادیں، اگر کسی نے دھوکے سے کوئی چیز بیچ دی، یا کسی نے خراب نوٹ یا روپیہ دھوکے سے کسی چیز کی قیمت میں اس کو دے دیا، تو ایسا کرنا حرام ہوگا اور وہ سخت گنہ گار ہوگا، اور یہ خرید و فروخت باطل ہوگی، خریدار کو واپسی کا حق ہوگا، اس کو خیار عیب کہتے ہیں، ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلّہ کی دوکان پر تشریف لے گئے، اور اس کے غلّہ کے ڈھیر میں دستِ مبارک ڈال کر دیکھا تو اندر کچھ نمی محسوس ہوئی، آپؐ نے پوچھا کہ کیا بات ہے، اس نے کہا کہ بارش سے یہ غلہ بھیگ گیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ پھر بھیگے ہوئے غلہ کو اوپر کیوں نہیں کر دیتے تاکہ لوگوں کی نظریں پڑیں اور دھوکہ نہ کھائیں، پھر فرمایا کہ جس نے دھوکے سے کوئی چیز فروخت کی وہ میری امّت سے نہیں ہے[1] اس حدیث اور متعدد احادیث نبوی و آیاتِ قرآنی کی روشنی میں فقہاء کرام نے خیار عیب کے بے شمار مسائل مستنبط کئے ہیں۔

عیب کی تعریف

عیب سے مراد ایسی خامی یا کمی یا نقص ہے، جس سے چیز کی قیمت گر جاتی ہے[2]،

۱۔ اگر بائع نے کسی چیز کی قیمت اتنی لی، جتنی صحیح سالم چیز کی لی جاتی ہے، اس کے بعد عیب نکلا تو خریدار کو واپس کر دینے کا حق ہے، اگر خریدار اس عیب دار چیز کو لینا چاہتا ہے تو قیمت کم کرانے کا اس کو اختیار نہیں ہے، بلکہ یا تو وہ اسی قیمت پر لے لے ورنہ واپس کر دے، البتہ اگر دوکاندار اپنی خوشی سے کچھ دام کم کر دے تو اس کو اختیار ہے[3]

۲۔ اگر دوکاندار نے عیب بتادیا اور اس کے باوجود کسی نے وہ چیز خرید لی، تو اب اس کو

---

[1] من غش فلیس منی۔ مسلم بحوالہ مشکوٰۃ۔

[2] العیب ھو ما ینقص ثمن المبیع عند التجار و ارباب الخبرۃ۔ المجلہ ص۴۹۔

[3] یکون المشتری مخیراً ان شاء ردہ و ان شاء قبلہ بثمنہ المسمیٰ۔ المجلہ ص۴۹۔

واپسی کا حق نہیں ہے۔ (المجلہ ص۴۹)

۳۔ اسی عیب و نقص کی بنا پر کسی چیز کے واپس کرنے کا حق ہے، جو دوکان یا بائع کے گھر میں پیدا ہو چکا ہو، یعنی خریدنے سے پہلے موجود ہو، اگر خریدار کے گھر میں کوئی عیب پیدا ہو گیا تو اب واپسی کا حق نہیں ہے، یا ایک عیب دوکان کا تھا، دوسرا اس کے گھر پیدا ہو گیا، تو اس صورت میں بھی اس کو واپس کرنے کا حق نہیں ہے۔ مثلاً کپڑا خریدا، اور وہ کچھ کٹا ہوا تھا، گھر لا کر رکھا اور اس کے اوپر روشنائی گر گئی، یا کتھا گر گیا یا چوہے نے کاٹ دیا، یا خود ہی اس نے قینچی لگا دی، تو اب اس دوسرے عیب کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس کو واپسی کا حق باقی نہیں رہا۔ البتہ پہلے عیب کے بقدر اس کی قیمت کم کرانے کا حق ہے، قیمت کا اندازہ اس پیشہ کے ماہر یا اس چیز کے مستقل بیچنے والے یا خریدنے والوں سے کرانا چاہیئے۔ اگر دوکاندار دوسرے عیب کے باوجود واپس کرلے تو یہ اس کی شرافت ہے، مگر خریدار کو اس کی شرافت یا مروّت سے فائدہ نہ اٹھانا چاہیئے، کیوں کہ اس میں اس کا نقصان ہے[1]

۴۔ اگر بائع یہ کہہ کر کوئی چیز فروخت کرے، کہ ظاہری طور پر اس میں کوئی عیب نہیں ہے، اور خریدار نے بھی اچھی طرح دیکھ بھال لیا تو اب اس کو واپس کرنے کا حق نہیں ہے، لیکن اگر محض اس کے کہنے پر لے لیا اور خود دیکھا بھالا نہیں تو اس کو واپسی کا حق ہو گا[2]

۵۔ عیب معلوم ہو جانے کے بعد خریدار کو چیز فوراً واپس کر دینی چاہیئے، اگر اس نے اس کے بعد بھی استعمال کی تو اب اس کو واپس کرنے کا حق نہیں ہے، البتہ اگر ایسی چیز ہے جس کا عیب استعمال کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے، مثلاً گھڑی، فاؤنٹن پین، سواری

---

[1] لو حدث فی المبیع عیب عند المشتری ثم ظهر فیہ عیب قدیم فلیس للمشتری ان یردہ بالعیب القدیم بل المطالبۃ بنقصان الثمن فقط۔ المجلہ ص۴۹۔

[2] ما بیع بیعاً مطلقاً اذا ظهر عیبٌ قدیم یکون المشتری مخیراً ان شاء ردہ وان شاء قبلہ بثمنہ المسمی۔ المجلہ ص۴۹۔

کا جانور، موٹر سائیکل رکشا، کار، موٹر تو ان چیزوں کا تھوڑا سا استعمال جائز ہے، اسی طرح اگر جوتہ پیر میں ڈال کر دیکھ لیا یا سوٹر پہن کر دیکھ لیا اور عیب نکلا تو اس کو واپسی کا حق ہے، لیکن اگر اس نے کئی دن استعمال کر لیا تو پھر واپسی کا حق نہیں ہے، لیکن اگر کسی ایسی چیز کا استعمال کر لیا، جس کا عیب استعمال کے بغیر معلوم ہو سکتا ہے، مثلاً پلنگ، کرسی، میز، تخت، بغیر سلا ہوا کپڑا، کتاب، کاغذ، وغیرہ تو ان چیزوں کے استعمال سے واپسی کا حق جاتا رہے گا، یا اس نے کوئی جانور خریدا، اور گھر لے جانے پر معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے، یا اس میں کوئی اور عیب ہے، مگر اس کے باوجود جانور پر سواری کرنے لگا، یا اس کا دودھ دوہنے لگا، یا اس کو ہل میں جوتنے لگا، یا اس کا علاج کرانے لگا، تو اب اس کو واپس کرنے کا حق نہیں ہے، یا کپڑا لیا، اور عیب معلوم ہو جانے کے بعد اسے رنگ دیا، یا سِلنے کو دے دیا، تو اب اس کو اختیار نہیں ہے، یا کوئی زمین لی اور اس کو معلوم ہوا کہ یہ اوسر ہے یا شور بنجر ہے مگر اس کے باوجود اس نے اس میں درخت بٹھا دیا، یا کوئی چیز بو دی تو اس کو واپس کرنے کا حق نہیں ہے[۱]

۶ ۔ اگر کوئی چیز ایسی خریدی، جس کو گھر لا کر دیکھا تو کچھ خراب نکلی اور کچھ اچھی تو خریدار کو یہ حق نہیں ہے کہ اچھی چیزیں رکھ لے اور خراب واپس کر دے، البتہ اگر دوکاندار خوشی سے واپس لے لے تو کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً ایک من غلہ خریدا اس میں نصف سے زیادہ جو ملا ہوا ہے، یا گرد و غبار ہے، یا پھل لیا اور اس میں آدھے کے قریب سڑے نکلے تو، یا تو پورا لے، یا پورا واپس کر دے، چھانٹ کر لینے کا حق اس وقت ہے، جب بیچنے والا ہنسی خوشی اس پر راضی ہو[۲]

۷ ۔ اگر کسی نے غلّہ خریدا اور ذرا سا اس میں گرد و غبار نکلا یا جَو یا مٹر یا کنکری نکلی تو اس کا

---

[۱] بعد اطلاع المشتری علیٰ عیب فی المبیع اذا تصرف فیه تصرف الملاک سقط خیارہٗ۔ المجلہ ص۴۹۔

[۲] ، ثم وجد بعضه معیباً کان مخیراً ان شاء قبله جمیعاً وان شاء رد جمیعاً۔ المجلہ ص۵۱

کچھ اعتبار نہیں، البتہ اگر ایک من میں دو چار سیر گرد و غبار نکل جائے تو پھیرنے کا حق ہے،
اس کا تعلق عرف عام سے ہے، یعنی عام طور پر جتنا گرد و غبار غلّوں میں رہا کرتا ہے یا دوسرے
اناج کی ملاوٹ رہتی ہے، اتنے میں تو پھیرنے کا حق نہیں ہے اور اس سے زیادہ میں ہے مثلاً
ایک من گیہوں میں اگر آدھ سیر یا پاؤ بھر گرد و غبار یا سیر یا دو سیر دوسرے اناج کی ملاوٹ
ہو تو یہ عیب نہیں سمجھا جائے گا، لیکن اگر چار چھ سیر گرد و غبار یا ملاوٹ نکلے تو یہ عیب ہے،
خریدار کو واپسی کا حق ہے[1]

اسی طرح کسی نے ایک سیر بادام یا چار درجن انڈے خریدے اور جب توڑا تو دو چار
خراب نکل گئے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں[2]

البتہ اگر زیادہ خراب نکلیں تو اتنی قیمت خریدار کو واپس لینے کا حق ہے، مثلاً ایک انڈا
خریدا اور وہ خراب نکلا یا دو خریدے اس میں سے ایک خراب نکلا تو خریدار کو واپس لینے کا
حق ہے۔

۸ - ایسی ترکاریاں یا ایسی چیزیں جن کی اچھائی یا خرابی کا پتہ کاٹنے کے بعد ہی چل سکتا ہے
تو اگر وہ سب کی سب بیکار اور پھینک دینے کے قابل ہوں، تو پھر خریدار کو دام واپس
لینے کا حق ہے، اگر کچھ خراب ہیں تو اس کا حکم اوپر آچکا ہے، اگر یہ کھانے کے کام میں لانے کے
قابل نہ ہوں، مگر کسی دوسرے کام میں آجائیں تو ان کی قیمت کم کرانے کا خریدار کو حق ہے، مثلاً
کسی نے لوکی یا ککڑی یا خربوزہ خریدا، گھر لا کر کاٹا، تو سب خراب نکلے تو ایسی صورت میں واپس

---

[1] واذا وجد المشتری فی الحنطة والشعیر وامثالهما من الحبوب المشتراة ترابًا فان کان
ذالک التراب یعد قلیلاً فی العرف صح البیع وان کان کثیرًا بحیث معه عیبًا
عند الناس یکون المشتری مخیرًا۔ المجلہ ص۵۱

[2] البیض والجوز وما شابههما اذا ظهر بعضهما فاسدًا فما لا یستکثر فی العادة والعرف
کالاثنین والثلاثة فی المائة یکون معفوًا وان کان الفاسد کثیرًا کالعشرة فی المائة
کان للمشتری ردہ جمیعًا۔ المجلہ ص۵۲

رنے اور دام لینے کا حق ہے، یہ بیع باطل ہے، اور اگر وہ آدمی کے کھانے کے قابل نہیں تھے، مگر ایسے کسی جانور کو کھلا دیا تو اس صورت میں قیمت کم کرانے کا حق ہے، یا دودھ لیا اور جس برتن میں لیا ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں تھی اور پھٹ گیا تو اگر وہ استعمال کے قابل تھا، اور اسے استعمال کر لیا تو اس سے قیمت کم کرانے کا حق ہے، اگر پھینک دینے کے قابل تھا، تو پھر پوری قیمت واپس لینے کا حق ہے، اسی طرح بادام اور انڈے وغیرہ کا حکم ہے[۱]

خیار تعیین

اگر کوئی شخص کئی چیزوں کی قیمت بتا کر مشتری سے کہے کہ اتنے دن میں آپ کو جو چیز لینی ہو اسے طے کر لیجئے تو بیع صحیح ہوگی، اور مشتری کو مقررہ مدّت کے اندر ایک یا دو چیز جو اسے خریدنا ہے، اس کی تعین کر لینی ہوگی، اسی طرح بائع ان میں سے جو چیز چاہے بیچے دونوں صورتوں میں بیع صحیح ہوگی، اس کو خیار تعیین کہتے ہیں، مگر مدّت کی تعیین ضروری ہے کہ اتنے دن میں یہ لے لے گا یا نہیں لے گا[۲]۔ خیار تعیین کے زمانہ میں مبیع بائع کی ملکیت سے نکل جاتی ہے یا نہیں؟ بعض ائمہ کے یہاں نکل جاتی ہے اور بعض کے یہاں نہیں!

بائع اور مشتری کے اختیارات

(۱) جب تک خرید و فروخت کی بات چیت مکمل نہ ہو جائے اس وقت تک دونوں میں سے ہر ایک کو

---

[۱] خیار عیب کے سلسلہ میں راقم نے وقت کی تعین کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں تلاش کی مگر ملی نہیں، غالباً فقہاء نے اسے عرف عام پر چھوڑ دیا ہے، ہدایہ کے اس جزیہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جلد سے جلد اس کا فیصلہ ہو جانا چاہئے وہ جزیہ یہ ہے کہ اگر مشتری نے عیب کا دعویٰ کیا اور جب اس سے ثبوت مانگا گیا تو اس نے کہا کہ میرے گواہ یہاں سے دور ہیں تو بائع کو قسم دے کر اس کی قیمت دلا دی جائے گی پھر وہ لکھتے ہیں کہ "لان فی الانتظار ضرراً بالبائع" اس سے معلوم ہوا کہ نقصان و عدم نقصان کا اندازہ کر کے اس کی تعین کی جانی چاہئے، گویا اس کا تعلق عرف سے ہے۔

خیار عیب کے سلسلہ میں ائمہ ثلثہ کا مسلک بھی قریب قریب وہی ہے جو امام ابوحنیفہؒ کا ہے۔

عبدالرحمٰن الجزیری امام مالکؒ کا مسلک ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ ولا یخرج هذا ما ذکر فی اعلی الصحیفة السابقة وهو ما علیه الحنفیة والشافعیة ج ۲ ص ۱۹۰۔

[۲] یلزم فی خیار التعیین تعیین المدة ایضاً۔ المجلہ ص ۴۶۔

اختیار ہے کہ وہ معاملہ کو ختم کر دے[1]۔ مگر مکمل ہو جانے کے بعد یا خیارِ شرط، خیارِ رویت، خیارِ عیب اور خیارِ وصف کی وجہ سے معاملہ ختم ہو سکتا ہے، یا پھر دونوں میں سے کسی کو شدید قسم کا دھوکا دیا گیا ہو، جسے فقہاء کی اصطلاح میں غبنِ فاحش کہتے ہیں، مثلاً کسی نے سونے کے زیور خریدے اور سونے کے نہیں نکلے، بلکہ صرف اس پر سونے کا ملمعہ تھا یا خریدار نے جو روپے دیئے وہ سب کھوٹے نکلے، یا جعلی تو ایسی صورت میں دونوں کو واپس کر دینے کا حق ہے۔

(۲) اگر معاملہ طے ہو گیا مگر خریدار نے ابھی قیمت نہیں دی، تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ قیمت فوراً دینے کا وعدہ تھا تو جب تک مشتری قیمت ادا نہ کرے، بائع کو اپنی چیز اپنے پاس روکے رکھنے کا حق ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ معاملہ اُدھار طے ہوا تھا اور خریدار سودا اپنے گھر لے گیا تو اب بائع کو اپنی چیز واپس لینے کا حق نہیں ہے، اگر مشتری خود واپس کر دے تو اور بات ہے، اس کو پہلے ہی سوچ سمجھ کر دینا چاہیئے تھا، اب خریدار کی حیثیت مقروض کی ہوگی، اور بائع کی قرض خواہ کی، جس طرح مقروض سے روپیہ وصول کرنے کا حکم شریعت نے دیا ہے اسی طرح وصول کرلے، قرض کا بیان آگے آئے گا، لیکن اگر مدت مقرر ہو اور اس مدّت تک وہ قیمت نہ دے تو بائع کو واپس لینے کا حق ہے[2]۔

(۳) پہلے قیمت ادا کی جائے، پھر سامان پر قبضہ کیا جائے، خریدار کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ پہلے سودے کا مطالبہ کرے اور قیمت بعد میں دے[3]۔

(۴) اگر کوئی زمین فروخت کی گئی اور اس میں فصل کھڑی ہے، یا باغ بیچا گیا اور اس میں پھل ہے، تو بائع کو فوراً اس زمین کو خالی کر دینا، اور درختوں سے پھل کو توڑ لینا ضروری ہے،

---

[1] اس اختلاف کا سبب وہ حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ "المتبایعان بالخیار مالم یتفرقا"۔ (بخاری ومسلم) امام صاحب اس سے بات چیت کا اختتام مراد لیتے ہیں اور دوسرے ائمہ جسمانی طور پر دونوں کی علیحدگی مراد لیتے ہیں۔

[2] ویجوز البیع بثمن حال ومؤجل اذا کان الاجل معلوماً لاطلاق قولہ۔ احل اللہ البیع۔ ہدایہ ج ۳ ص۳۔

[3] ومن باع سلعۃ بثمن قیل للمشتری ادفع الثمن اولا۔ ہدایہ ج ۳ ص۱۳۔

خواہ فصل کچّی اور پھل ناپختہ ہی کیوں نہ ہوں، البتّہ اگر مشتری فصل کٹ جانے یا پھل کے پک جانے تک کی اجازت دے تو یہ جائز ہے، مگر بیع کے وقت یہ شرط نہ ہونی چاہیئے۔ ورنہ بیع فاسد ہو جاتی ہے[1]

(۵) بائع جو چیز بیچے اس کو چاہیئے کہ وہ خریدار کے اس طرح حوالے کر دے کہ اس کو قبضہ کرنے میں کوئی چیز مانع نہ ہو، مثلاً کوئی زمین بیچی اور رہن ہے تو یہ بیع جائز نہیں ہے کیونکہ رہن قبضہ میں مانع ہے، یا درخت بیچا اور اس میں کوئی اور شریک ہے تو یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ یہاں شرکت قبضہ میں مانع ہے، غرض یہ کہ ایسی صورت وہ پیدا کر دے کہ خریدار اس کو اپنے قبضہ میں کر سکے، کوئی مزاحمت پیش نہ آئے، مثلاً مکان بیچا اور اس کا تالا کنجی اس کے حوالے کر دیا تو اب قبضہ سمجھا جائے گا، یا اس نے آٹو بیچا اور خریدار نے اس کو بورے میں کس لیا تو اب اس کا قبضہ ہو گیا،

(۶) حوالہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں جو چیز بیچی جائے وہاں وہ خریدار کی سپردگی اور چارج میں دے دی جائے، یہ ضروری نہیں ہے کہ خود بائع یا مشتری جہاں کے ہیں وہیں وہ چیز حوالہ کی جائے، مثلاً کسی ہندوستانی تاجر نے مصر میں یا کسی پاکستانی تاجر نے امریکہ میں اپنا کوئی مال بیچا اور خریدار کے حوالہ کر دیا تو وہ بیع تمام ہو گئی، اب خریدار خواہ ہندوستان کا ہو، یا جاپان وچین کا، بائع پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اس مال کو چین یا جاپان یا ہندوستان میں لاکر اس کے گھر پہنچا دے یا اس کو وہیں لاکر فروخت کرے، بلکہ اس کو حق ہے کہ وہ مال جہاں ہے وہاں بیچ دے، اور اس کو خریدار کے حوالے کر دے، اب یہ خریدار کی ذمہ داری ہے، کہ اس نے بخوشی خرید لیا ہے تو وہ اٹھا کر جہاں جی چاہے لے جائے[2] لیکن اگر خریدار نے یہ شرط لگا دی تھی کہ ہم یہ مال ہندوستان یا چین میں لیں گے، تو بائع پر یہ ذمہ داری ہو گی کہ وہ شرط

---

[1] و ان شرطها علی النخیل فسد البیع۔ ہدایہ ج ۳ ص ۱۱ اذا بیعت ارض مشغولة بالزرع یجبر البائع علی رفع الزرع بحصادہ وجز الثمار ورفعها وتسلیم الاشجار خالیة۔ المجلہ ص ۳۹۔

[2] مطلق العقد یقتضی تسلیم المبیع فی المحل الذی ہو موجودٌ فیہ۔ المجلہ ص ۲۲۔

کے مطابق مال وہاں پہنچا بھی دے[1]

(۷) اگر بائع نے کوئی مال بیچا، مگر وہ سامنے نہیں ہے، اور یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ کہاں ہے، تو خریدار کو معاملہ طے ہو جانے کے بعد اگر معلوم ہو کہ مال ایسی جگہ ہے جہاں سے آنے میں خطرہ ہے یا بہت خرچ پڑے گا، تو وہ عقدِ بیع کو ختم کر سکتا ہے۔ (المجلہ ص۴۱)

(۸) معاملہ طے ہو گیا لیکن ابھی خریدار نے قیمت نہیں دی ہے، تو جب تک بائع اجازت نہ دے اس کو چیز اٹھانے کا حق نہیں ہے، اگر اس نے اٹھا لیا اور اس چیز میں کوئی خرابی آگئی تو اب یہ اس کا مال تسلیم کر لیا جائے گا، اور اس کو قیمت دینی پڑے گی[2]

(۹) معاملہ طے ہو گیا، مگر ابھی خریدار نے قبضہ نہیں کیا تھا کہ وہ چیز خراب ہو گئی، تو اس کا نقصان بائع کو برداشت کرنا پڑے گا، اور اگر اس نے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وہ ٹوٹ گئی تو اب خریدار کو قیمت دے کر اس کو خریدنا پڑے گا۔ (المجلہ ص۴۲)

مثلاً کسی نے شیشہ کا ایک گلاس خریدا، یا چھنی خریدی، یا چینی کا برتن خریدا لیکن ابھی اس نے قیمت ادا نہیں کی تھی کہ وہ کسی طرح ٹوٹ گیا، تو خریدار پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے لیکن اس نے پسند کر کے اپنے ہاتھ میں لے لیا، یا اپنے سامنے اسے رکھ لیا، اور وہ دھکا لگ کر یا گر کر ٹوٹ گیا، تو اب خریدار کو قیمت دینی پڑے گی، یعنی جس کے قبضہ میں وہ ٹوٹے گا، اسی پر ذمہ داری ہو گی۔

(۱۰) معاملہ طے ہو گیا تھا مگر قیمت دینے سے پہلے مشتری یا سودا دینے سے پہلے بائع مر گیا، تو بائع کو قیمت لینے کا اور مشتری کو سودا لینے کا حق ہو گا، فرض کیجئے کہ بائع نے دو سو روپے کا غلّہ بیچا اور قیمت بھی لے لی، مگر ابھی غلّہ خریدار کے حوالے نہیں کیا تھا کہ وہ مر گیا اور اس کے اوپر کچھ قرض بھی ہے، تو خریدار کو اس کے ورثہ سے غلّہ لینے کا حق حاصل ہے، دوسرے قرض خواہ اگر غلّے کو اپنے قرض میں لینا چاہیں تو ان کو اس کا حق نہیں ہے، اسی طرح اگر مشتری مر جاتے اور

---

[1] اذا بیع مال علیٰ ان تسلیم فی محل کذا لزم تسلیمہ فی المحل المذکور۔ المجلہ ص۲۲۔

[2] اذا هلك المبیع بعد القبض هلك من مال المشتری۔ المجلہ ص۲۲۔

اس نے قیمت نہ دی ہو تو بائع کو لینے کا حق ہے، قرض خواہ روک نہیں سکتے۔[۱]

(۱۱) بائع نے اگر کوئی چیز بخوشی زیادہ دے دی، یا خریدار نے کچھ قیمت زیادہ دے دی، تو معاملہ طے ہو جانے کے بعد کسی کو واپسی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، یوں اپنی خوشی سے واپس کر دیں تو ان کو اختیار ہے، مثلاً کوئی دوکاندار ایک روپیہ میں دو درجن بٹن بیچتا ہے اور اس نے اپنی خوشی یا رعایت سے کسی کو ایک روپے میں ڈھائی درجن دیئے تو اب اس کو واپس لینے کا حق نہیں ہے، اسی طرح اگر خریدار نے اس کو بخوشی ایک روپے کی چیز کی قیمت ڈیڑھ روپے دی تو اب اس کو واپسی کا حق نہیں ہے، البتہ غلطی سے دونوں نے زیادہ دے دیا تو واپسی کا حق باقی رہے گا، مثلاً خریدار نے غلطی سے ایک روپے کے بجائے سوا روپے دیئے، یا دوکاندار نے دو درجن کے بجائے غلطی سے ڈھائی درجن بٹن دے دیئے، تو دونوں کو اپنی زیادہ چیز واپس لینے کا حق ہے۔

قیمت کی ادائیگی اور مبیع کے اخراجات

چھوٹی موٹی یا تھوڑی چیزوں کی دست بدست خرید و فروخت میں کچھ خرچ نہیں ہوتا لیکن کوئی بڑی یا بہت زیادہ چیز خریدی جائے، یا کوئی چھوٹی چیز باہر سے منگائی جائے، یا کسی چیز کا تبادلہ کیا جائے تو پھر اس میں ڈاک خرچ یا باربرداری کا خرچ بھی ہوتا ہے تو یہ اخراجات کس پر ہوں گے، اس بارے میں بھی اسلامی شریعت نے یہ ہدایتیں دی ہیں۔

۱۔ قیمت کی ادائیگی کے متعلق جو اخراجات ہوں گے، وہ خریدار کے ذمہ ہوں گے، مثلاً منی آرڈر کا خرچ، بیمہ کا خرچ یا ڈرافٹ کا خرچ وغیرہ۔

۲۔ اسی طرح لکھا پڑھی کے جتنے اخراجات ہوں گے، وہ سب خریدار کو دینے پڑیں گے، مثلاً کوئی زمین یا مکان خریدا تو اس کے دستاویز رجسٹری وغیرہ کے اخراجات خریدار کو دینے پڑیں گے۔[۲]

۳۔ جو اخراجات کہ مبیع یعنی بیچی ہوئی چیز کو خریدار کے حوالے کرنے سے متعلق ہیں، وہ بائع کے

---

[۱] المجلہ ص۱۴۳۔ [۲] المؤنۃ المتعلقۃ بالثمن تلزم علی المشتری۔ المجلہ ص۴۲۔

ذمہ ہوں گے، مثلاً غلّہ بیچا تو اس کے تولنے کی ذمہ داری بائع پر ہے، اگر زیادہ غلہ ہوا تو اس کے تولنے یا ناپنے میں جو خرچ آئے گا، وہ بھی بائع پر ہوگا[1]۔ اسی طرح کوئی جائداد بیچی مگر اس کا کاغذ اس کے پاس نہیں ہے تو اس کاغذ کے حصول میں جو خرچ ہوگا وہ بائع کے ذمہ ہوگا۔

۴۔ اگر کوئی چیز تول کر نہیں، بلکہ اندازے سے بیچ دی گئی، مثلاً کھڑی فصل بیچ دی یا باغ بیچ دیا، تو کھیت کاٹنے یا باغ کے پھل توڑنے یا تڑوانے و کٹوانے کی ذمہ داری بائع پر نہیں مشتری پر ہوگی[2]۔

۵۔ جو چیز سواری یا ڈاک خانہ یا ریل یا مزدور کے ذریعہ بھیجی جائے، اس کے تمام اخراجات خریدار کو برداشت کرنے پڑیں گے، البتہ اگر بائع خود اخراجات برداشت کرے تو یہ اس کا احسان ہوگا، مگر خریدار کو مطالبہ کرنے کا حق نہیں، اور اگر اس نے یہ شرط لگا دی کہ خرچ بائع برداشت کرے گا، تو یہ بیع فاسد ہوگی[3]۔

۶۔ اگر اشیاء کا تبادلہ اشیاء سے ہوگا، مثلاً ہندوستان کی حکومت یا ہندوستان کے کسی تاجر نے امریکہ سے غلّہ منگایا اور اس کے بدلہ میں پٹ سن چمڑا یا کوئی اور جنس دی تو دونوں خریداروں کو اپنی اپنی چیزوں کے منگانے اور باربرداری کے اخراجات برداشت کرنا پڑیں گے، البتہ اگر دونوں میں طے ہو جائے کہ دونوں ایک دوسرے کی جائے قیام تک پہونچا دیں، تو پھر دونوں کو اپنی اپنی چیز پہونچانے کا خرچ برداشت کرنا پڑے گا[4]۔

---

[1] المونته المتعلقة بتسليم المبيع تلزم على البائع ۔ المجله صـ۴۲ ۔

[2] الاشياء المبيعة جزافاً مؤنتها و مصارفها على المشتري ۔ المجله صـ۴۲ ۔

[3] اس سلسلہ میں المجلہ اور اس کے شارح علامہ رستم باز کا خیال ہے کہ یہ چیز عرف سے متعلق ہے وہ لکھتے ہیں کہ اذا كان العرف يقتضي عليه ان يسلم في منزل المشتري والا فعلى المشتري ۔ راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ مقامی خرید و فروخت میں تو عرف یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری خریدار پر ہوتی ہے وہ جیسے چاہے خریدی ہوئی چیز لیجائے مگر غیر مقامی سودوں کی خریداری میں عرف کا لحاظ یا اسکی رضامندی کا لحاظ کرنا چاہئے البتہ مشتری کو مبیع کے پہنچانے کی شرط لگانا صحیح نہیں ہے۔ [4] حاشیہ ۲ میں عرف اور تراضی کی جو بات لکھی گئی ہے وہی صورت یہاں بھی اختیار کیجائے گی۔

بیع کے جائز طریقے

عام طور پر تین طریقوں سے خرید و فروخت ہوتی ہے، اور اسلامی شریعت نے ان تینوں طریقوں کو جائز قرار دیا ہے۔

ایک یہ کہ خرید و فروخت یا دو چیزوں کا تبادلہ دست بدست ہو، یعنی اسی وقت خریدار کو سودا مل جائے اور دوکاندار کو قیمت، بیع کا سب سے عام اور اچھا طریقہ یہی ہے، اور اوپر زیادہ تر اسی طریقہ کا بیان ہوا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سودا تو معاملہ کرنے کے بعد ہی دے دیا جائے اور قیمت اُدھار لگا دی جائے۔

اس طریقۂ بیع کو اسلامی شریعت میں بیع نسیہ اُدھار بیع کہا جاتا ہے اس طریقۂ بیع کی اجازت خریدار کی سہولت کے پیش نظر دی گئی ہے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ قیمت تو پیشگی وصول کر لی جائے، مگر سودا بعد میں دیا جائے، اس کو اسلامی شریعت میں بیع سلم یا بیع سلف کہتے ہیں، اور اسی کی ایک قسم بیع استصناع ہے، اس طریقۂ بیع کی اجازت اصلاً بائع کی سہولت کے پیش نظر دی گئی ہے، مگر اس میں خریدار کا فائدہ بھی مضمر ہے۔

ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کچھ نہ کچھ تفصیلات اوپر آچکی ہیں، خاص طور پر دست بدست لین دین کا ذکر اوپر تفصیل سے آیا ہے، مگر کچھ اور باتیں بیع نَسیہ اور بیع سَلَم کے بارے میں لکھی جاتی ہیں۔

بیع نَسیہ

جو چیزیں اُدھار بیچی جائیں، یعنی سودا پہلے دے دیا جائے، اور قیمت اس کے کچھ دن بعد لی جائے اسے بیع نَسیہ کہتے ہیں، اس کے بارے میں کچھ باتیں قیمت کے بیان میں آچکی ہیں، چند باتیں اور بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ اُدھار معاملہ کرنے میں بائع کی رضامندی ضروری ہے، بغیر اس کی رضامندی معلوم کیے قیمت اُدھار لگانا جائز نہیں ہے[۱]

---

[۱] البیع مع تاجیل الثمن وتقسیطہ صحیح۔ شرح المجلہ ص۱۲۵۔

۲ - قیمت کی ادائیگی کی مدّت اسی وقت مقرر ہو جانی چاہیئے، یعنی یہ فلاں مہینہ یا فلاں تاریخ کو یا فلاں مہینہ کے فلاں دن کو دیں گے، یا یہ کہہ دیا کہ عید کے دن یا عید الاضحیٰ کے دن تو بھی جائز ہے، مگر یہ کہنا صحیح نہیں ہے، کہ جاڑے تک یا گرمی تک یا بارش تک دیں گے، کیوں کہ جاڑے اور گرمی میں بڑی گنجائش ہے، اس لئے اس میں اختلاف پیدا ہو سکتا ہے اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ پھر دیں گے، یا جب خرچ آئے گا تو دیں گے، یا جب پیسہ آئے گا، تو دیں گے[1]

۳ - ادھار فروخت کر دینے کے بعد بائع کو سودا کے واپس لینے کا حق نہ ہوگا۔

۴ - ادھار کی مدّت بڑھانے کا اختیار بائع کو ہے۔

۵ - اگر کوئی مدّت مقرر نہ کی تو وہ مدت زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ کی ہوگی، ایک ماہ کے بعد خریدار یا تو فوراً قیمت دے یا بائع سے کچھ اور مہلت مانگے، اس نے مہلت نہ دی تو لامحالہ خریدار کو قیمت اس مدت کے ختم تک دے دینی پڑے گی[2]

۶ - ادھار کی مدّت اس وقت سے شروع ہو جاتی ہے، جس وقت بائع نے وہ چیز خریدار کے حوالہ کر دی، اگر بائع نے معاملہ کے بعد ایک مہینہ بعد یا دس دن بعد چیز دی تو دس دن بعد یا ایک ماہ بعد سے مدت شروع ہوگی، اسی طرح بائع نے تو چیز حوالہ کر دی، مگر مشتری اس وقت اس کے پاس سے لے نہیں گیا، بلکہ دس دن بعد لے گیا، تو جس وقت بائع نے حوالہ کیا ہے، اسی وقت سے ادھار کی مدت شروع ہو جائے گی، خریدار کا جب جی چاہے لے جائے، اس کا کوئی اعتبار نہیں[3]

۷ - اگر بائع نے قیمت کی ادائیگی کی قسط مقرر کر دی ہے تو پھر پوری قیمت اکٹھا مانگنے کا حق اس کو نہیں ہے۔

---

[1] یلزم ان تکون المدۃ معلومۃ فی البیع بالتاجیل والتقسیط۔ المجلہ ص۳۵۔

[2] اذا باع نسیئۃً بدون بیان مدۃ فتصرف المدۃ الیٰ شہر فقط۔ المجلہ ص۳۶۔

[3] یعتبر ابتداء مدۃ الاجل والقسط المذکورین فی عقد البیع من وقت التسلیم المبیع۔ المجلہ ص۳۶

۸ ۔ بائع کو اختیار ہے کہ نقد کوئی چیز سستی بیچے اور ادھار کچھ گراں، مگر اس بارے میں خریدار کو بتا دینا اور اس کا منظور کر لینا بھی ضروری ہے، لیکن اگر بغیر بتائے فروخت کرے گا تو یہ جائز نہیں [1]

اُدھار خرید و فروخت کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایتیں دی ہیں ان کو ضرور سامنے رکھنا چاہیئے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ سامان ادھار دینے اور پھر تقاضے میں آسانی کرنے والے کی بڑی فضیلت ہے۔ آپؐ نے ایک طرف بائع کو ہدایت دی اور دوسری طرف خریدار کو بھی تنبیہہ فرمائی۔

خریدار کو ہدایت

خریدار کے پاس جب قیمت ہو جائے، تو پھر اس کو ٹالنا اور بائع کو پریشان کرنا حرام ہے، اسلامی حکومت میں ایسے شخص کو سزا دی جائے گی، جو استطاعت کے باوجود کسی کی بقایا رقم نہ ادا کرے، آپؐ نے فرمایا ہے۔

مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ (بخاری و مسلم) دینے کی قدرت رکھنے والے کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔

آپؐ نے فرمایا کہ "سب سے اچھا وہ شخص ہے، جو کسی کا بقایا اچھے طریقے پر ادا کر دے۔"

بائع کو ہدایت

بائع کو پوری مدّت ہو جانے کے بعد تقاضے کا بلکہ سختی کے ساتھ وصول کرنے کا بھی حق ہے، ایک بار خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کسی کی کوئی رقم باقی تھی، اس نے کچھ سختی کی، بعض صحابہ کو معلوم ہوا اور انھوں نے بھی اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنا چاہا تو آپؐ نے ان کو منع فرمایا، اور فرمایا:۔

اِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا۔ حقدار کو کہنے سننے کا حق حاصل ہے۔

لیکن بائع کو اپنے اس قانونی حق کے استعمال میں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ممکن ہے، یہ شخص نہ دے سکتا ہو، یا کوئی مجبوری ہو، اسی بنا پر آپؐ نے فرمایا ہے کہ ایک

---

[1] اذا لم تتعین فی العقد انه نقداً او نسیة بجهالة الثمن لم یجز واما اذا تعین فی العقد فیجوز۔ (عالمگیری ج ۲ ص ۱۳۶)

شخص سے موت کے وقت فرشتے نے پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی نیکی ہے، وہ بولا کوئی اور نیکی تو نہیں، البتہ میں ادھار خرید و فروخت میں تنگ دست کو ادائیگی کی مہلت دے دیتا تھا، یا اس کو بالکل چھوڑ دیتا اور معاف کر دیتا تھا، اور تقاضہ میں نرمی برتتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اسے اس نیک عمل کے بدلے جنّت میں داخل کر دیا، اور فرمایا کہ جب وہ لوگوں سے درگذر کرتا تھا، تو میں اس سے زیادہ درگذر کرنے والا ہوں۔ (بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص۲۴۳)

بیع سَلَم اُدھار بیع کی ایک قسم بیع سلم ہے، یعنی بائع نے مشتری سے قیمت پہلے لے لی یا مشتری نے خود پہلے قیمت دے دی، اور چیز بعد میں دینے کا وعدہ ہوا، اسی کا نام بیع سلم ہے، اس میں بھی اسی طرح ایجاب و قبول ہوتا ہے، جس طرح دوسرے طریقۂ بیع میں ہوتا ہے، بیع سلم کی اجازت شریعت نے بائع اور مشتری دونوں کی سہولت کے لئے دی ہے اس لئے کہ کبھی خریدار یعنی مشتری کو اس کی ضرورت پیش آتی ہے، اور کبھی بائع کو بیع سلم ہر اس چیز میں جائز ہے، جس کی صفت زبان سے بیان کی جا سکے[۱] یا تحریر میں لائی جا سکے اور اس کی مقدار کا اندازہ ناپ کر یا تول کر یا گن کر کیا جا سکتا ہو، تاکہ بائع و مشتری کے درمیان جھگڑا نہ پیدا ہو، بیع سَلَم کے احکام فقہاء نے آیتِ دین یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا تَدَایَنْتُمْ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْهُ وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌ بِالْعَدْلِ الخ سورۃ بقرہ رکوع ۶، ور متعدّد احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں مستنبط کئے ہیں، ایک حدیث میں ہے۔"عن ابن عباسؓ قال قدم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المدینة وھم یسلفون فی الثمار السنة والسنتین والثلث فقال من اسلف فی شئ فلیسلف فی کیل معلوم ووزن معلوم الیٰ اجل معلوم"۔ (بخاری و مسلم بحوالہ مشکواۃ ص۲۵۰)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو بیع سلم یعنی لوگ ادھار لین دین کیا کرتے تھے تو آپؐ نے فرمایا کہ جو ادھار لین دین کرے تو

---

[۱] السلم انما یکون صحیحًا فی الاشیاء التی تقبل التعتین بالقدر والوصف کالجودۃ والحسنة۔ (المجلہ ص۵۵۔)

اس کا وزن معلوم ہونا چاہئیے اگر ناپ تول کی چیز ہے تو پیمانہ معلوم ہونا چاہئیے، اور وقت کی تعیین بھی ہونی چاہئیے"۔ اس کے صحیح ہونے کے لئے چند شرطیں لگائی گئی ہیں، اگر ان شرطوں میں سے کوئی شرط بھی نہ پائی جائے گی، تو بیع باطل ہو جائے گی۔

پہلی شرط یہ ہے کہ بات چیت پختہ ہو! ورنہ خیارِ شرط سے خالی ہو[1]

دوسری شرط یہ ہے کہ جو چیز لینی ہو، اس کی پوری تفصیل معلوم ہو جانی چاہئیے، اور بہتر ہے کہ کوئی نمونہ دکھلا کر بتا دیا جائے، مثلاً غلہ لینا ہو، تو غلہ کے بارے میں پوری تفصیل آ جانی چاہئیے، گیہوں ہوگا یا جو، اگر گیہوں ہوگا تو کیسا ہوگا، موٹا ہوگا یا پتلا، سفید ہوگا یا لال، اس میں گرد و غبار نہ ہوگا، دوسرے غلوں کی ملاوٹ نہ ہوگی، خشک ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح اگر کپڑا لینا ہے تو اس کی قسم معلوم کر لینی چاہئیے، یعنی ململ ہوگا یا چھالٹی، تن زیب ہوگا یا ادھی یا سوتی ہوگا یا ریشمی وغیرہ وغیرہ۔ سائیکل، گھڑی، یا فاؤنٹین پن خریدنا ہے تو بتا دینا چاہئیے کہ فلاں کارخانہ اور فلاں ماڈل کی ہوگی، اگر یوں کہہ دیا کہ کوئی چیز کیسی بھی دے دینا تو یہ صحیح نہیں ہے، اس میں آئندہ اختلاف کا خدشہ ہے، اور جہاں اختلاف کا خدشہ ہو وہ بیع درست نہیں ہے[2]

تیسری شرط یہ ہے کہ بھاؤ اور قیمت بھی طے کر لی جائے، یعنی اگر گیہوں لے گا تو ایک روپے کا کتنا سیر لے گا، اور کتنے روپے کا لے گا، یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ فصل کے وقت جو بھاؤ ہوگا لے لینا، اسی طرح ایک سائیکل یا فاؤنٹین پین یا گھڑی کے بارے میں بات چیت ہوئی اور دکاندار نے کہا کہ ہم منگا دیں گے، قیمت آپ پیشگی دے دیجئے یا خریدار نے خود ہی پیشگی رقم دے کر کہا کہ ہمیں یہ چیز منگا دیجئے تو اسی وقت یہ بات چیت ہو جانی چاہئیے کہ وہ کتنی قیمت کی ہوگی تاکہ بعد میں کوئی اختلاف نہ ہو، یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ جتنے میں

---

[1] ان یکون باتا عاریا عن خیار الشرط۔ شرح المجلہ ص۲۱۱۔

[2] السلم کالبیع ینعقد بالایجاب والقبول یشترط لصحۃ السلم بیان جنس المبیع مثلاً انہ حنطۃ او ارز او تمر ونوعہ۔ شرح المجلہ ص۲۱۶۔

پڑے گی، لے لیجئے گا، اسی طرح اگر کپڑا منگانا ہے تو وہ موٹا ہوگا یا باریک، سوتی ہوگا یا ٹیریکاٹ اور کس کمپنی کا ہوگا، اسی طرح مشین یا کار وغیرہ کے سلسلے میں ہر چیز طے ہونی چاہیئے، غرض یہ کہ نرخ اور قیمت دونوں طے ہو جانی چاہیئے، ہاں منگانے کے اخراجات کے سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جتنا خرچ ہوگا وہ دیدیجئے گا، کیونکہ اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے، اور یہ خریدار کے ذمّہ ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ مال لینے کی مدّت مقرر کرلی جائے، یعنی یہ طے ہو جانا چاہیئے کہ فلاں مہینے یا فلاں تاریخ کو ہم مال دے دیں گے، یا عید تک یا بقرعید تک دے دیں گے[۱]

پانچویں شرط یہ ہے کہ خریدار وہ جگہ بتادے کہ ہم یہ چیز فلاں جگہ لیں گے، مگر یہ شرط ان چیزوں میں ہے جو آسانی سے منتقل نہ ہوسکیں، مثلاً دس بیس، یا سو دو سو من غلہ خریدنا ہے یا دو چار گانٹھ کپڑے کی لینی ہے، یا دس بیس کرسیاں خریدنی ہیں، تو ایسی چیزوں کے بارے میں خریدار بائع کو یہ بتادے کہ ہم کو فلاں جگہ یہ چیزیں پہنچا کر دینی ہوں گی، اگر ایسی چیزیں ہیں جو آسانی سے منتقل ہوسکیں، مثلاً گھڑی فاؤنٹین پین، لالٹین، دس بیس گز کپڑا، دس بیس سیر غلّہ تو پھر ایسی چیزوں میں اس کی شرط کی اجازت نہیں ہے[۲]

چھٹی شرط یہ ہے کہ پورا روپیہ معاملہ کرتے وقت ہی ادا کر دیا جائے، اگر بات چیت آج ہوتی اور روپیہ کل دیا، تو بائع کے اوپر کوئی ذمّہ داری نہیں ہے کہ وہ کل کی بات کا آج بھی پابند رہے، بلکہ اب پھر سے اس کو معاملہ کرنے اور انکار کر دینے کا حق ہے، گویا وہ پہلی بات چیت ختم ہوگئی[۳] اس میں تمام ائمہ متفق ہیں۔

ساتویں شرط یہ ہے کہ جتنی مدّت کے لئے یہ معاملہ کیا گیا ہے، اس پوری مدت میں وہ چیز بازار میں موجود ہو، اگر وہ بازار سے غائب ہو جائے تو پھر بائع روپیہ واپس کر سکتا ہے، یہ قید

---

[۱] ولا یجوز السلم الا مؤجلاً۔ ہدایہ ج ۳ ص۷۳۔

[۲] وتسمیۃ المکان الذی یوفیہ فیہ اذا کان لہ حملٌ ومؤنۃٌ۔ ہدایہ ج ۳ ص۷۹۔

[۳] یشترط لصحۃ بقاء السلم تسلیم الثمن فی مجلس العقد۔ المجلہ ص۵۶۔

فقہائے احناف نے لگائی ہے، مگر امام شافعیؒ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ جس وقت اس کو وہ چیز دینا ہے، اس وقت موجود ہونا چاہیئے، اور اگر وہ چیز نادرالوجود ہو تو پوری مدّت میں موجود رہنا ضروری نہیں ہے[۱]۔ راقم کے نزدیک عام حالت میں فقہائے احناف ہی کی رائے کتاب و سنت کی عام ہدایات کے زیادہ مطابق معلوم ہوتی ہے، مثلاً حدیث میں ہے کہ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع النخیل حتیٰ یوکل، اس مفہوم کی دوسری احادیث بھی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز موجود نہ ہو، اس کا اُدھار معاملہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ مگر شدید ضرورت میں ائمہ ثلثہ کی رائے پر عمل کیا جا سکتا ہے، شدید ضرورت کا مطلب یہ ہے کہ جب اشیاء کی قلّت کا شدید اندیشہ ہو، اور اگر ابتلائے عام ہو جائے تو مولانا تھانویؒ نے امام شافعیؒ کے مسلک پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے (امدادالفتاویٰ)

اسی طرح جن چیزوں کی تعیین نہ کی جا سکے، اس میں بیع سَلَم نہیں ہے۔ مثلاً جانور اس بارے میں امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان میں بھی تعیین کی جا سکتی ہے، اس لئے ان کی بیع سلم بھی جائز ہے[۲]، دونوں طرح کی حدیثیں موجود ہیں، اس لئے اس کا تعلق عرف عام سے ہے، اگر عرف عام میں اس کی تعیین ہو جائے، تو اس کو اس طرح خرید ا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔

مدّت گذر جانے کے بعد اگر بائع نے چیز نہیں دی، تو اس روپے سے خریدار کو دوسری چیز لینے کا حق نہیں ہے، یا تو روپیہ واپس لے لیا جائے، یا پھر اس کو کچھ اور مہلت دی جائے،

---

[۱] ولا یجوز السلم حتیٰ یکون المسلم فیہ موجوداً من حین العقد الیٰ حین المحل۔ ہدایہ ج ۳ ص ۷۷ (الفقہ المذاہب الاربعہ ج ۲ ص ۳۰۹، ۳۰۷)

[۲] امام ابوحنیفہؒ نے یہ رائے اس حدیث نبوی کی بنا پر قائم کی ہے جس میں ہے کہ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن السلم فی الحیوان۔ اس روایت کو حاکم اور دارقطنی نے نقل کیا ہے۔

ائمہ ثلثہ اس حدیث کو ضعف قرار دیتے ہیں اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو اس کے معارض ہے جس میں اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح جس چیز کے لئے خریدار نے کہا تھا، اب اس کو اس کی ضرورت نہیں رہی، تو اب وہ معاملہ ختم کر سکتا ہے، مگر اس کے بجائے وہ دوسری چیز نہیں لے سکتا، بلکہ وہ اپنا روپیہ واپس لے لے، اس کے بعد پھر دوسری چیز کے خریدنے کا دوسرا معاملہ کرے[1]

کئی وجوہ کی بنا پر اس سے روکا گیا ہے، ایک تو یہ کہ بائع اگر کسی وجہ سے مال نہ دے سکا تو خریدار کو جب بھی وہ دوسری چیز دے گا، تو شرمندگی یا وعدہ خلافی کی وجہ سے اس میں کچھ نہ کچھ رعایت ضرور ملحوظ رکھے گا، اور ظاہر ہے کہ اس رعایت کے بدلے میں بائع کو تو کچھ ملے گا نہیں، بلکہ نقصان ہوگا، اور اسی کا نام سود ہے، دوسرے یہ کہ یہ روپیہ بطور قرض دیا گیا ہے، اور قرض کے بدلے میں کوئی نفع اٹھانا منع ہے، اور یہ رعایت ایک طرح کا نفع ہے، تیسرے یہ کہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔

بیع استصناع بیع سلم ہی کی ایک قسم بیع استصناع بھی ہے، استصناع کے معنی بنوانے کے ہیں، یعنی وہ معاملہ جو کسی چیز کے بنوانے کے لئے کیا جاتا ہے، دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ بیع سلم میں قیمت معاملہ کرتے ہی ادا کر دی جائے اور بیع استصناع میں قیمت فوراً ادا کرنی ضروری نہیں ہے، بلکہ جب اس کو مال مل جائے، تب قیمت ادا کرلے اور تمام باتیں بیع سلم کی طرح پہلے ہی طے ہو جانی چاہئیں، بیع استصناع ہر جائز چیز میں جائز ہے جس کے بنانے اور بنوانے کا رواج ہو۔

مثال مثلاً آپ نے ایک جوڑے جوتے کا آرڈر دیا تو جوتہ کے بارے میں یا تو کوئی نمونہ دکھا کر معاملہ طے کرنا چاہیئے، یا پھر اس کی پوری تفصیل طے ہو جانی چاہیئے، کہ نیوکٹ رہے گا یا فیتہ دار، چمڑا کس رنگ کا ہوگا، براؤن یا کالا یا ڈارک براؤن، یا مثلاً کسی تاجر نے ہندوستان یا امریکہ کی کسی فرم کو چند سائیکلوں یا موٹروں یا ہوائی جہازوں کا آرڈر دیا تو اس بارے میں یہ بات طے ہو جانی چاہیئے کہ وہ موٹر یا سائیکل یا ہوائی جہاز کیسا ہوگا،

---

[1] فان تقایلا السلم لم یکن لہ ان یشتری من المسلم الیہ برأس المال شیئاً حتی یقبضہ کلہ۔ ہدایہ ج ۳ ص ۸۱۔

اس کا ماڈل کیسا ہوگا، پُرزے امریکن ہوں گے، یا جرمن یا برطانوی، قیمت کتنی ہوگی، وہ سامان بمبئی میں ملے گا، یا دلّی اور لکھنؤ میں، قیمت وہ ہندوستانی روپے میں دے گا، یا ڈالر، یا پاؤنڈ میں وغیرہ وغیرہ، غرض یہ ہے کہ وہ تمام باتیں طے ہو جانی چاہئیں، جن سے بعد میں کوئی اختلاف پیدا ہونے کا اندیشہ ہو[1]۔ البتہ اگر اس میں مدت کی تعیین ہو جائے تو بیع سلم کے حکم میں ہو جائے گی، لیکن بیع سلم کے حکم میں اس وقت ہوگی جب ٹال مٹول کے لئے مقرر کی جائے، اگر عجلت کی غرض سے ہو تو یہ بیع استصناع ہی رہے گی۔ شرح المجلہ۔ جب بنانے اور بنوانے کا معاملہ طے ہو جائے تو پھر کوئی فریق انکار نہیں کر سکتا[2]۔ البتہ معیار مطلوب کے مطابق نہ ہو تو بنوانے والا رد کر سکتا ہے، اگر بنوانے کے بعد بنوانے والا نہ لے تو اس کا بیعانہ کاریگر کو روک لینے کی اجازت ہے۔ (امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۱۴۱)

بیع کے ناجائز طریقے

اوپر کی اصطلاحوں کی تشریح کے ضمن میں جائز اور ناجائز بیع کا ذکر آچکا ہے، اب تک بیع کے جائز طریقوں کا ذکر تھا، اب بیع کے ناجائز طریقوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ فقہاء ناجائز بیع کی تین قسمیں کرتے ہیں ایک بیع باطل، دوسرے بیع فاسد، تیسرے بیع مکروہ۔

بیع باطل کا حکم

بیع باطل کا حکم یہ ہے کہ وہ خرید و فروخت کا معاملہ بالکل کالعدم سمجھا جائے گا، یعنی خریدنے والا نہ تو چیز کا مالک سمجھا جائے، اور نہ بیچنے والا قیمت کا، اس کا کھانا اور پھر اس کا بیچنا سب حرام ہے، مثلاً کسی نے سودی کاروبار کیا یا شراب کا کارخانہ قائم کیا، یا اس کی دوکان کھولی، یا جوئے کے ذریعہ آمدنی بڑھالی، جیسے لاٹری، اور معمّے وغیرہ تو چونکہ یہ چیزیں اسلام میں مال ہی تسلیم نہیں کی گئی ہیں، اس لئے یہ سارا کاروبار

---

[1] کل شئ تعومل استصناعه یصح فیه الاستصناع ..... یلزم فی الاستصناع وصف المصنوع وتعریفه علی الوجه الموافق المطلوب ..... لا یلزم فی الاستصناع دفع الثمن حالاً ای وقت العقد۔

[2] اذا انعقد الاستصناع فلیس لاحد العاقدین الرجوع واذا لم یکن المصنوع علی الاوصاف المطلوبة المبینة کان المستصنع مخیراً۔ المجلہ ص ۵۶۔

حرام اور باطل ہوگا۔

بیع فاسد و مکروہ کا حکم

بیع فاسد و مکروہ کا حکم یہ ہے کہ اگر غلطی سے ایسی خرید و فروخت ہو گئی ہے تو اس معاملہ کو فسخ کر دینا چاہیئے، اگر نہ کرے گا، تو اسلامی حکومت بیع فاسد کو تو زبردستی فسخ کرا دے گی، بیع مکروہ کو زبردستی فسخ نہیں کرائے گی ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا۔

لیکن اگر خرید و فروخت مکمل ہو گئی اور خریدار نے سودا اور بائع نے قیمت لے لیا، اس کے بعد علم ہوا کہ یہ بیع فاسد تھی، تو یا بیع کو فسخ کر دینا چاہیئے، یا کم از کم بائع کو اس کی قیمت اور مشتری کو سودا استعمال نہ کرنا چاہیئے، بلکہ کسی غریب محتاج کو دے دینا چاہیئے، اور اس سے ثواب کی امید نہ رکھنی چاہیئے، لیکن اگر دونوں نے ایسا نہ کیا تو بہرحال قانوناً ان کو مجبور نہ کیا جائے گا، کہ واپس ہی کر دیں، ہاں اگر وہ ایسا معاملہ کرنے کو صحیح سمجھتے ہوں، یا اب اس پر اصرار کرتے ہوں تو پھر ان کو قانوناً اس سے روکا جائے گا اوپر ذکر آچکا ہے، بیع باطل اپنی اصل کے اعتبار سے حرام ہے اور بیع فاسد خارجی اوصاف کی وجہ سے ناجائز ہے، اس لئے اس کا کھانا پینا، اور استعمال کرنا درست نہیں ہے، بلکہ بیع توڑ دینا واجب ہے۔[1]

فاسد و مکروہ کا فرق

فاسد و مکروہ میں فرق یہ ہے کہ فاسد بیع وہ ہوتی ہے، جس میں مبیع بک تو سکتی ہے، لیکن جس صورت میں بیچی جا رہی ہے، اس میں وہ جائز نہیں ہے، مثلاً کسی نے میدان میں خود سے اگی ہوئی گھاس بیچ دی تو گو کہ مطلقاً گھاس کا بیچنا ناجائز نہیں ہے، لیکن چونکہ خودرو ہونے کی صورت میں یہ اس کی ملک نہیں ہے، مگر پھر بھی اس نے بیچ دیا، اس لئے اب یہ بیع فاسد ہو جائے گی، اور مکروہ میں مال بھی حلال ہوتا ہے، اور جو چیز بیچی جا رہی ہے، وہ بھی اس کی ملک ہوتی ہے، مگر جس طریقہ سے خرید و فروخت کر کے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے، وہ ناجائز ہے، مثلاً کسی چیز کی قیمت دس روپے

---

[1] اذا کان احد العوضین او کلاهما محرمًا فالبیع فاسد۔ بہشتی زیور بحوالہ الجوہرۃ النیرۃ ج ۱ صـ۳، ۲۔

لگ گئی ہے، اور یقین ہے کہ بیچنے والا راضی ہو جائے گا، لیکن ایک دوسرا شخص آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہم اس کے گیارہ روپے دیں گے، اور وہ گیارہ روپے دے کر لے لیتا ہے، تو یہ بیع مکروہ ہو گی، یا دام بڑھانے سے اس کا مقصود لینا نہیں ہوتا، بلکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ خریدار کے کچھ پیسے زیادہ لگ جائیں[1]۔ یا بائع کا فائدہ ہو جائے، اس کو بیع نجش کہتے ہیں، چونکہ خریدار کو ضرورت ہے اس لئے اب وہ زیادہ روپئے لگا کر لے لیتا ہے، یہ دو روپے خریدار کو محض اس دوسرے شخص کی وجہ سے زیادہ دینے پڑے ہیں، اس لئے اس کا یہ فعل مکروہ ہوگا[2]، اگر وہ اس کو پیشہ بنا لے یا بائع خود اس طرح کے دلال مقرر کرے تو پھر یہ بیع فاسد قرار دی جائے گی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے بھاؤ کے اوپر بھاؤ لگانے سے منع فرمایا ہے، نیلام کا حکم اس سے جدا ہے[3]

بیع باطل

جو چیز شریعت میں حرام ہے اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، البتہ اگر وہ مردوں کے لئے حرام ہو اور عورتوں کے لئے نہ ہو تو اس کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے، اسی طرح بعض چیزوں کا کھانا حرام، مگر ان کی خرید و فروخت حرام نہیں ہے، اب ان سب کی تفصیل کی جا رہی ہے۔

سودی کاروبار

اسلامی شریعت میں سود قطعی حرام ہے، اور ہر طرح کا سودی کاروبار بھی حرام ہے، سود کا مطلب اتنا ہی نہیں ہے کہ آپ نے کسی کو ایک روپیہ دیا اور ایک سال یا ایک ماہ بعد اس کے بدلے میں دو روپے وصول کئے، بلکہ سود یہ بھی ہے کہ آپ نے سود پر روپے لے کر تجارت میں لگایا، آپ نے بلا سودی قرض دے دیا مگر روپے دینے کی رعایت میں قرض دار سے روپے لینے کے علاوہ کچھ اور فائدہ اٹھایا، مثلاً

---

[1] وهو ان يزيد في الثمن ولا يريد الشراء۔ ہدایہ ج ۳ صفحہ ۵۰۔

[2] اصول فقہ کی کتابوں میں دونوں کا فرق ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان القبح اذا كان لامر مجاور كان مكروها وان كان لوصف متصل كان فاسداً۔ حاشیہ ۱۶ ہدایہ ج ۳ صفحہ ۵۰۔

[3] حضورؐ نے فرمایا، لا يسوم الرجل على سوم اخيه المسلم۔ مشکوٰۃ صفحہ ۲۴۷۔

اپنی خدمت لی، یا کوئی چیز سستی خریدی، تو یہ سب سود میں داخل ہے، اسی طرح جو چیزیں ایک ہی جنس کی ہوں، ان کی خرید و فروخت اور تبادلہ میں بھی بعض وقت سود ہو جاتا ہے، اسی طرح ملازموں کے فنڈ پر جو سود ملتا ہے وہ بھی سود ہے، غرضیکہ ہر طرح کے سودی کاروبار کی اسلام میں ممانعت آئی ہے، قرآن میں سود کو حرام کہا گیا ہے، اور جو لوگ سود لیتے ہیں، ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کی کیفیت ایسی ہوتی ہے، جیسے کسی کو شیطان نے مخبوط کر دیا ہو، جو لوگ مسلمان ہونے کے باوجود سود نہیں چھوڑتے ان کے بارے میں کہا گیا ہے۔

فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ (بقرہ) تو خدا سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

یعنی سود لینا خدا کے ساتھ جنگ اور اس سے بغاوت ہے، یعنی اگر کوئی مسلمان، مسلمان ہونے کے باوجود سود لیتا ہے، تو وہ خدا کا نافرمان اور اس کا باغی قرار پائے گا، اور اس کو وہی سزا ملے گی جو خدا کے باغیوں اور سرکشوں کو ملتی ہے، اس کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ وہ مسلمان ہے، یعنی فرماں بردار ہے، کیونکہ فرماں بردار ہوتا تو خدا سے بغاوت و سرکشی کی راہ (سودی لین دین) کیوں اختیار کرتا، کیا کوئی مسلمان، مسلمان ہوتے ہوئے خدا سے بغاوت کرنا پسند کرے گا، حدیث میں آتا ہے کہ سود کے ستّر درجے ہیں اور اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کوئی اپنی ماں سے زنا کرے۔ (بیہقی، ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے، دینے والے سودی کاروبار لکھنے والے اور اس کی گواہی دینے والے سب پر لعنت کی ہے، اور فرمایا کہ گناہ میں سب برابر ہیں۔ (مسلم)

حضرت عمرؓ سود کے حکم کی شدت کے پیش نظر فرماتے تھے کہ ربو (سود) اور ریبہ (شبہ) دونوں چھوڑ دو، یعنی سود بھی چھوڑ دو اور جس میں سود کا شائبہ اور شبہ پایا جائے، اس کے قریب بھی نہ جاؤ، اگر وہ سود نہیں کھائے گا تو بھی اس کے گرد و غبار سے محفوظ نہیں رہے گا، یعنی کسی سود خوار کا ہدیہ لے لے گا، یا دعوت کھا لے گا وغیرہ وغیرہ۔ (ابن ماجہ، نسائی)

جس معاملہ میں ذرا سا بھی سود کا شبہ ہوتا ہو، اس سے بھی بچنے کی آپؐ نے تاکید فرمائی ہے، آپؐ نے فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ (ایک آدمی بھی) سود کھانے سے نہیں بچے گا۔ حضرت

کتاب وسنّت کے ان ہی احکام کے پیش نظر فقہائے کرام نے کاروبار کی ان تمام قسموں کو حرام قرار دیا ہے، جن میں سود کا کوئی حصّہ شامل ہو جائے، یا اس کے سود ہو جانے کا شبہ ہو۔ سود کی برائی اب آہستہ آہستہ تمام دنیا پر روشن ہوتی چلی جارہی ہے چنانچہ کتنے ملکوں نے اپنے یہاں سودی کاروبار کو بالکل ممنوع قرار دے دیا ہے۔

اخلاقی حیثیت سے سود کی برائی

سود صرف دینی ہی حیثیت سے برا نہیں ہے، بلکہ اس کا اثر انسان کے اخلاق وکردار پر بھی بہت برا پڑتا ہے، ہمدردی اور بہی خواہی جو انسانیت کا جوہر ہے، اور جس کی تاکید قرآن وحدیث میں بھی آئی ہے، سود اس کو مٹا کر اس کی جگہ خودغرضی اور خالص منفعت پرستی سکھاتا ہے، اپنے نفع کی خاطر وہ دوسروں کی عزت وآبرو ہی نہیں بلکہ جان ومال سے بھی کھیل سکتا ہے، وہ اگر کسی لاوارث کی تجہیز وتکفین کے لئے چند روپے دے گا تو اس کی خواہش ہوگی کہ اس روپے کا سود اگر نہ ملے تو کم از کم اصل روپیہ ہی لوگ چندہ کر کے واپس کر دیں، غرض یہ کہ انسانیت کا یہ جوہر اس سے بالکل چھن جاتا ہے اور اسلام سب سے زیادہ اسی جوہر کو پیدا کرنا چاہتا ہے، قرآن میں دوسروں کے ساتھ ہمدردی، بھلائی اور کسی غرض اور ریا کے بغیر ان کی مالی اعانت کی تاکید بار بار کی گئی ہے، اسی طرح بے شمار احادیث میں اس کی تاکید آئی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الدین النصیحۃ۔ — دین خیر خواہی کا نام ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

خیر الناس من ینفع الناس۔ — بہتر وہ شخص ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔

کیا جو اخلاق، اور کردار اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ سود خواری کی ذہنیت کے ساتھ ممکن ہے؟

بینک اور ڈاکخانہ کا سود

ڈاک خانہ اور بینک سے جمع شدہ روپیہ پر جو سود ملتا ہے، وہ بھی حرام ہے، اور ان سے سود پر روپیہ لے کر اس سے تجارت کرنا یہ بھی حرام ہے، اسی طرح نیشنل سیونگ سرٹیفکٹ یا زمینداری بانڈ وغیرہ

پر جو سود ملتا ہے، وہ بھی حرام ہے، پراوڈنٹ فنڈ[1] بیکاری فنڈ پر یا کسی اور فنڈ پر حکومت کی طرف سے جو سود ملتا ہے، وہ بھی حرام ہے۔

معاشی حیثیت سے سود کی برائی

سودی کاروبار صرف اخلاقی حیثیت سے ہی بُرا نہیں ہے، بلکہ معاشی حیثیت سے بھی وہ غریبوں کے لئے انتہائی تباہ کن ہے، اس کی خرابی کا اندازہ کرنا ہو تو ہندوستان کی ایک مثال لیجئے ہندوستان میں جب ۱۹۷۱ء سے غلہ کا بھاؤ بڑھنا شروع ہوا تو تاجروں نے زیادہ سے زیادہ روپیہ غلہ کی تجارت میں لگانے کے لئے بینکوں سے سود پر لے کر پیشگی غلہ کی خریداری کے لئے تقسیم کیا اور بینکوں نے جی کھول کر روپیہ قرض دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جو گیہوں بازار میں ۲۵ روپے من بکتا تھا،

---

[1] پراویڈنٹ فنڈ کے سود کے بارے میں بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ سود نہیں ہے، بلکہ حکومت کا انعام ہے، گویا یہ حضرات اس کو سود سمجھتے ہی نہیں، راقم کے نزدیک چونکہ یہ بھی سود ہی ہے، اس لئے اس سے فرق نہیں کیا ہے، پراویڈنٹ فنڈ میں گورنمنٹ یا کسی ادارہ کا انعام کا اتنا حصہ ہوتا ہے جتنا وہ اپنی طرف سے ملازم کی کٹوتی کے بقدر دیتا ہے اور اس کی مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی ہے مگر جو سود ملتا ہے اس کی تعداد میں کمی بیشی نہیں ہوتی یعنی وہ سب کو چار فیصدی یا پانچ فیصد ملتا ہے۔ یہ حضرات دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ وہ روپیہ اس کی ملکیت میں نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اس کو ملا ہی نہیں، مگر راقم کے نزدیک وہ روپیہ سود ہے اور اس کی ملکیت میں ہوتا ہے، وہ روپیہ کسی بھی معاشی یا ہنگامی ضرورت پر وہ لے سکتا ہے، وہ اپنی ملکیت سمجھ کر اسے ہر ماہ کٹواتا ہے، جس طرح کوئی ہر ماہ ڈاک خانہ میں کچھ رقم جمع کرتا ہے، کم از کم اس کی ملکیت اس روپے پر اس سے زیادہ ہوتی ہے جتنی قرض پر دیئے ہوتے روپے پر ہوتی ہے، جس طرح قرض میں دیتے ہوتے اس روپے پر جس کے ملنے کی توقع ہے اور زکوٰۃ وغیرہ کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں، اسی طرح اس پر بھی ہونے چاہئیں، راقم کو ان علماء کے علم و فضل سے کوئی مناسبت نہیں ہے، مگر اس کے باوجود چونکہ یہ نیا مسئلہ ہے اسکے بارے میں دو رائے ہو سکتی ہے اس لئے یہ جرأت کی ہے۔ اگر میں نے اس اختلاف میں غلطی کی ہے تو اہل قلم حضرات سے گذارش ہے کہ وہ دلائل سے راقم الحروف کو اس سے آگاہ فرمادیں، میں ان کا ممنون ہوگا۔ اور اپنی رائے رجوع کرنے میں ایک لمحہ کی تاخیر نہیں کروں گا۔

وہ تیس چالیس روپے من بکنے لگا اور اس وقت وہ ۷۰، ۸۰ روپے من بک رہا ہے، کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب کسی چیز کی مانگ زیادہ ہوتی ہے، تو دام بڑھ جاتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، گویا ایک طرف اگر ہندوستان میں سیلاب وغیرہ کی وجہ سے فصل تباہ ہوئی تو دوسری طرف سودی کاروبار نے اس بات کا موقع دیا کہ تاجر اپنے فائدہ کے لئے زیادہ سے زیادہ غلّہ جمع کر کے غریبوں اور کم آمدنی والے لوگوں کو تکلیف میں مبتلا کریں، گویا چند بینکوں کے مالکوں نے اور غلہ کے بڑے تاجروں نے تو سودی کاروبار سے فائدہ اٹھایا، اور ہم آپ جیسے لوگوں کے گھروں میں تین وقت کے بجائے ایک وقت کھانا پکنے لگا، یا فاقہ ہونے لگا، حکومت گو اس جرم میں خود شریک تھی، لیکن جب عوام کی طرف سے بہت چیخ پکار ہوئی تو پھر اس نے بینکوں کو زیادہ قرض دینے سے روکا، مگر یہ قدم اس وقت اٹھایا گیا، جب وہ اپنا کام کر چکے تھے۔ ہمارا دن رات کا مشاہدہ ہے کہ گورنمنٹ سے یا بینک سے قرض لے کر جو لوگ مکان وغیرہ لیتے ہیں یا کاروبار کرتے ہیں اس میں ۸۰ فیصد لوگ ناکام ہوتے ہیں اور ان کا اثاثہ یعنی دوکان، ان کا ٹریکٹر اور مکان نیلام ہو جاتا ہے۔

جو چیزیں بیچی یا خریدی جاتی ہیں یا ان کا تبادلہ ہوتا ہے وہ پانچ طرح کی ہوتی ہیں

جن چیزوں کو ہم استعمال کرتے ہیں۔ اور ان کو روپے پیسے سے یا ان میں کمی بیشی کر کے یا ان کو ادھار بیچتے ہیں وہ عموماً پانچ طرح کی ہوتی ہیں۔ (۱) سونا چاندی یا ان کی بنی ہوئی چیزیں (۲) وہ چیزیں جو تول کر بکتی ہیں جیسے غلّہ، مسالہ، گھی، تیل، دودھ، دہی، ترکاری، میوے، روئی، لوہا، تانبہ، پیتل وغیرہ، (۳) وہ جو پیمانہ سے بکتی ہیں، مثلاً سیمنٹ، چونا، شربت، روشنائی وغیرہ (۴) وہ چیزیں جو گز یا فٹ سے ناپ کر بکتی ہیں، مثلاً کپڑے، ٹاٹ، ربن، فیتے، تار وغیرہ (۵) وہ چیزیں جو گن کر بکتی ہیں، جیسے جانور، گائے، بیل، بکری، گھوڑے یا پھل، بعض چیزیں بعض جگہ گن کر بکتی ہیں، مثلاً آم سنترے اور وہی چیزیں دوسری جگہ تول کر بکتی ہیں تو جہاں جیسا رواج ہو اس کے مطابق عمل کیا جائے گا، اب ہم ان میں سے ہر ایک کا بیان الگ الگ کرتے ہیں۔

چاندی اور سونے کا حکم

(۱) ایک تو وہ چیزیں جو سونے یا چاندی سے بنی ہوں، اگر وہ سونے یا چاندی یا ان کے سکّوں سے خریدی، یا بدلی جائیں، تو اس میں دو باتیں ضرور ہی ہونی چاہئیں، ایک یہ کہ دونوں کا وزن برابر ہو، دوسری یہ کہ دست بدست ہوں، یعنی آمنے سامنے دونوں چیزیں خریدی یا بدلی جائیں، اگر ان میں

کوئی بات نہ ہوگی تو یہ معاملہ سود کا معاملہ ہو جائے گا، اس کی دو صورتیں ہیں (۱) ایک یہ کہ دونوں طرف چاندی ہو، یا دونوں طرف سونا ہو، مثلاً کسی کے پاس چاندی ہے وہ چاندی کے بدلہ دوسری چاندی یا چاندی کا زیور لینا چاہتا ہے، یا سونا ہے اور اس کے بدلہ میں دوسرا سونا یا سونے کا زیور لینا چاہتا ہے، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ معاملہ دست بدست کرے، اور دونوں کا وزن برابر ہو، اگر اس نے ادھار معاملہ کیا، یا دونوں کے وزن میں کمی بیشی کی تو یہ معاملہ حرام ہو جائے گا، اگر نئے زیور کی بنوائی دینی ہو تو اس کو الگ سے دینا چاہیئے، جس چاندی یا سونے یا ان کے بنے ہوئے زیور یا برتن کے بدلہ میں یہ نیا زیور لیا جا رہا ہے، اس میں کمی بیشی نہ ہونی چاہیئے۔

سونے چاندی کے سکّے

اسی طرح جن ملکوں میں سونے یا چاندی کے سکّے چلتے ہیں مثلاً حجاز اور عرب کے بعض ملکوں میں دینار اور درہم چلتے ہیں یا ہندوستان میں پہلے چاندی کے روپے اور سونے کی گنی چلتی تھی، تو ان سکوں کے بدلے میں اگر وہ سونا اور چاندی ہو تو اتنی ہی چاندی لینی چاہیئے، اسی طرح جب ایک حکومت دوسری حکومت سے سونے اور چاندی کے سکوں کا تبادلہ کرتی ہے تو اس میں سے دونوں حکومتیں کچھ بٹہ کاٹتی ہیں، یہ بھی اسلام میں سود ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک دینار کو دو دینار کے بدلہ یا ایک درہم کو دو درہم کے بدلہ نہ بیچو، آپ کے اس حکم کو سمجھنے کے لئے موجودہ زمانہ میں سکوں کے تبادلہ کو جاننا ضروری ہے، اسی طرح سکوں کی بلیک مارکٹنگ بھی ناجائز ہے، آج ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں پر یہ کاروبار خوب ہوتا ہے، بلکہ اب تو اندرونِ ملک بھی باقاعدہ اس کی تجارت ہونے لگی ہے۔

(۲) اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ سونے کو چاندی سے یا چاندی کو سونے سے بدلے، یا سونے کے سکّے سے چاندی خریدے یا چاندی کے سکّے سے سونا خریدے تو اس صورت میں وزن کا برابر ہونا ضروری نہیں ہے، لیکن ایک شرط اس میں باقی رہے گی، وہ یہ کہ معاملہ دست بدست ہو، اگر ادھار ہوا تو یہ ناجائز ہوگا، مثلاً ایک تولہ سونے کے بجائے جتنی چاندی ملے لے سکتا ہے یا دس تولے چاندی کے بدلے میں جتنا سونا بھی ملے وہ خرید سکتا ہے مگر لین دین کا معاملہ دست بدست

ہونا چاہیئے، غرض یہ کہ چاندی اور سونا اور اس کی بنی ہوئی چیزوں کو اگر ایک ہی جنس سے بدلنا ہے تو پھر اس میں دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ وزن بھی برابر ہو، اور دست بدست بھی ہو، لیکن اگر جنس بدل جاتے تو پھر کمی بیشی تو ہو سکتی ہے، مگر دست بدست ہونا ضروری ہے۔

ضروری ہدایتیں

(۱) اگر کسی نے دس تولے چاندی خریدی اور اگر اس کے بدلہ میں ۵ تولہ چاندی، یا ۵ تولے چاندی کا زیور دے دیا اور بقیہ ۵ تولہ چاندی کی قیمت میں دس روپے یا پانچ تولے کی جتنی قیمت ہو، اتنی ریزگاری یا نوٹ دے دیا تو یہ جائز ہو جائے گا، اسی طرح اگر ایک پرانے سونے کے زیور کے بدلہ میں دوسرا نیا سونے کا زیور لینا ہو، تو اگر نئے زیور کا وزن زیادہ ہو تو پرانے زیور کے ساتھ اتنا روپیہ[1] یا نوٹ اس میں ملا کر دے دے تو یہ صورت بھی جائز ہے، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، لیکن یہ معاملہ دست بدست ہونا بھی ضروری ہے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ جو سکّہ دیا جا رہا ہے، وہ چاندی اور سونے کا نہ ہو، اگر وہ چاندی یا سونے کا ہوگا، تو پھر وزن کا برابر ہونا بھی ضروری ہے اور دست بدست ہونا بھی۔

خلاصہ یہ کہ اس سونے اور چاندی اور ان کی بنی ہوئی چیزوں کا وزن جو وہ دے رہا ہے، اس سونے اور چاندی یا ان کے سامان کے وزن سے کم ہو جسے وہ لے رہا ہے تو اس کے ساتھ کچھ پیسے روپے ملا کر اس زیادتی کی قیمت پوری کر دی تو جائز ہے لیکن اگر چاندی یا سونے یا ان کے سکوں سے یہ کمی پوری کی تو جائز نہیں ہے۔

۲۔ یہی حکم ان تمام چیزوں کا ہے جو چاندی کی بنی ہوتی ہوں، مثلاً سچّے گوٹے پٹھے، انگوٹھی برتن وغیرہ۔

۳۔ سونے یا چاندی کے سکّوں یا ان کی بنی ہوتی چیزوں میں اگر نصف سے زیادہ ملاوٹ

---

[1] جب روپے چاندی کے بنتے تھے تو اس طرح معاملہ کرنا صحیح نہیں تھا کیونکہ دونوں ایک جنس کے تھے لیکن اب روپے دوسری دھاتوں کے بنتے ہیں یا کاغذ کے، اس لئے اسکا حکم بدل جائیگا جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔

ہو اور ان سے چاندی یا چاندی کے زیور یا سونا خریدا جائے، تو پھر اس میں وزن کا برابر ہونا ضروری نہیں ہے، لیکن دست بدست ہونا ضرور چاہیئے اگر ذرا سا ملاوٹ ہے تو اس کا حکم سونے یا چاندی کا ہے، جیسا کہ عام طور پر زیور وغیرہ میں دو پیسہ یا ایک اکنی بھر تانبا ملا دیتے ہیں تو اس سے حکم نہیں بدلتا، شراب کا کاروبار، حرام جانوروں کا کاروبار، انسانی اعضاء کا کاروبار، پوسٹ مارٹم، ان سب کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

(۲) تول کر بکنے والی چیزوں کا بیان

سونا چاندی کے علاوہ جو چیزیں تول کر بکتی ہیں، مثلاً غلہ، ترکاری، میوہ، شکر، نمک، گوشت، دودھ، لوہا، تانبا، پیتل، المونیم، اگر یہ چیزیں روپے پیسے سے خریدی جائیں پھر تو خریدار اور دوکاندار میں جو بھاؤ اور قیمت طے ہو جاتے، اس کے مطابق وہ خریدی دبیچی جاسکتی ہیں، لیکن اگر ان میں سے کوئی چیز یا ان کی بنی ہوئی چیزیں ایک دوسرے سے بدلی جائیں تو ان کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ دونوں طرف ایک ہی جنس کی چیز ہو، مثلاً آپ تانبے کا لوٹا دے کر تانبے کی پتیلی لیں، یا گیہوں دے کر گیہوں لیں، یا جَو دے کر جَو لیں، المونیم دیکر المونیم یا شکر دے کر شکر لیں تو اس تبادلہ میں اوپر کی دونوں شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے، یعنی وزن بھی برابر ہو، اور آمنے سامنے اور ہاتھ در ہاتھ معاملہ ہو جاتے، اب اگر کوئی شخص گیہوں سے گیہوں کا آٹا، یا جو کے آٹے سے جو کا آٹا بدلنا چاہے تو اس میں کمی بیشی اور اُدھار جائز نہیں ہے، بلکہ وزن بھی برابر ہونا چاہیئے، اور ہاتھ در ہاتھ لینا دینا چاہیئے، خواہ ایک طرف خراب اور دوسری طرف اچھی ہی چیز کیوں نہ ہو، اور دونوں اس کے بدلنے پر راضی کیوں نہ ہوں، کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے، مثلاً کوئی شخص خراب گیہوں دے کر اچھا گیہوں لینا چاہتا ہے تو دست بدست ہونا چاہیئے اور دونوں کا وزن برابر ہونا چاہیئے، البتہ اگر اس نے وہ گیہوں قیمت سے خرید لیا، تو اس قیمت سے وہ جس بھاؤ سے بھی دوسرا گیہوں چاہے، خرید لے یہ جائز ہے، غرض یہ کہ تول کر بکنے والی چیزوں، میں اگر ایک جنس کا تبادلہ دوسری جنس سے کرنا ہو تو پھر وزن میں برابری اور دست بدست ہونا ضروری ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جو چیزیں بدلی جا رہی ہیں، وہ مختلف جنس کی ہیں، مثلاً کسی نے

گیہوں دے کر جو لیا، یا جو دے کر دھان لیا، یا دھان دے کر چنا یا باجرہ لیا، یا کوئی غلہ دیکر ترکاری لی، یا دودھ لیا، تانبے کی چیز دے کر المونیم یا لوہے، یا پیتل کی چیز لی، تو اس میں کمی بیشی ہوسکتی ہے، مگر معاملہ آمنے سامنے ہونا چاہیئے، ادھار اور وعدہ کرنا صحیح نہیں ہے، یعنی اس صورت میں وزن کا برابر ہونا ضروری نہیں ہے، کمی بیشی جائز ہے، مگر معاملہ فوراً ہونا چاہیئے، کیونکہ اس صورت میں ادھار معاملہ کرنے میں اختلاف اور وزن میں کمی بیشی ممکن ہے مثلاً کسی نے دھان دے کر ترکاری خریدی، یا ترکاری آج لی گئی، اور دھان اس کو کل دینے کا وعدہ کیا گیا، تو اس بارے میں یہ اختلاف ہوسکتا ہے کہ ترکاری والا کہے کہ دھان تو اچھا نہیں ہے، یا یہ وزن میں کم ہے، اور دینے والا باصرار کہے کہ تم کو یہی لینا پڑے گا، تم سے میں نے اسی کا وعدہ کیا تھا۔

(۳) پیمانے سے بکنے والی چیزیں

پیمانے سے ناپ کر بکنے والی چیزوں کا حکم بھی وہی ہے، جو تول کر بکنے والی چیزوں کا ہے، مثلاً ایک بوری سمینٹ لینی ہے، یا کنکر کا سوفٹ چونا دے کر دوسرا سوفٹ چونا لینا ہے تو دونوں کے پیمانے کا برابر ہونا بھی ضروری ہے، اور دست بدست ہونا بھی۔ لیکن ایک بوری سمینٹ دیکر چونا یا چونے دکر سمینٹ لیتی ہے، تو پھر اس میں کمی و بیشی ہوسکتی ہے، مگر معاملہ آمنے سامنے ہونا چاہیئے، یعنی جو چیزیں بدلنی ہوں وہ الگ کر دی جائیں۔

(۴) جو چیزیں گز یا فٹ سے ناپ کر یا گنتی سے بکتی ہیں

جو چیزیں تول کر نہیں بکتیں، بلکہ ناپ کر بکتی ہیں، مثلاً کپڑا، فیتہ، ٹاٹ وغیرہ، یا تعداد کے اعتبار سے گن کر بکتی ہیں، مثلاً آم، انڈے وغیرہ، تو ان کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ دونوں طرف ایک ہی قسم کی چیز ہے، مثلاً کسی نے ایک کتاب دے کر دوسری کتاب یا کاغذ لے کر کاغذ بدلا، یا ایک جوتہ دے کر دوسرا لیا، تو اس کے لئے صرف ایک شرط ہے، وہ یہ معاملہ آمنے سامنے اور دست بدست ہو یعنی دینے والی چیز فوراً دی جائے اور لینے والی چیز فوراً لے لی جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں چیزیں دو قسم کی ہوں، مثلاً کسی نے کتاب کے بدلہ

جوتہ لیا، یا جوتہ کے بدلہ کپڑا لیا یا ان میں سے ایک چیز تول کر بکنے والی ہے، دوسری ناپ کر مثلاً کسی نے ایک من گیہوں دے کر کپڑا یا ترکاری یا آم دے کر کپڑا لیا، یا سنترے دے کر میوے خریدے، تو ان تمام صورتوں میں نہ تو وزن کے برابر ہونے کی ضرورت ہے، اور نہ دست بدست کی، بلکہ ادھار بھی لین دین ہو سکتا ہے، اسی طرح اگر ایک ہی طرح کی چیز ہو، مگر اس کی صورت یا اس کی قسم بدل گئی ہو تو بھی اس میں ان دونوں شرطوں کی ضرورت نہیں ہے، مثلاً کپڑے بہت قسم کے ہوتے ہیں، مثلاً کسی نے چھالٹی کے بدلے ململ یا تنزیب کے بدلے گزی خریدی یا بدلی یا دودھ دے کر کھویا لیا، یا کاغذ دے کر کاپی لی، یا کتاب دے کر کاپی خریدی، تو ان تمام صورتوں میں برابر ہونا یا دست بدست ہونا ضروری نہیں ہے۔

خلاصہ غرض یہ کہ وزن اور پیمانہ سے بکنے والی چیزوں میں اگر دونوں طرف ایک ہی جنس کی چیز ہو تو دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ دست بدست ہو اور دونوں کا وزن برابر ہو، اور جو چیزیں پیمانہ سے یا تول کر نہیں بکتیں، بلکہ ناپ کر یا گن کر بکتی ہیں، اگر دونوں طرف ایک ہی طرح کی چیزیں ہیں، مثلاً دونوں طرف انڈے ہی انڈے ہیں، یا دونوں طرف جوتے ہیں، یا تول کر تو بکتی ہیں، مگر ان کی جنس دو ہے، مثلاً گیہوں یا جو، اور چنا تول کر بکتے ہیں مگر ان سب کی جنس جدا جدا ہے، تو ان تمام کا حکم یہ ہے کہ ان میں وزن پیمانہ اور تعداد کا برابر ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ صرف دست بدست ہونا ضروری ہے اور جو چیزیں پیمانہ سے اور تول کر نہیں بکتیں یا دونوں طرف دو قسم کی چیزیں ہیں، ایک تول کر بکنے والی چیز ہے اور دوسری گن کر تو ان میں نہ تو وزن کی برابری ضروری ہے، اور نہ پیمانہ اور تعداد کی، مثلاً اگر آپ تانبے کی پتیلی دے کر دس چینی کی یا تام چینی کی پلیٹیں خریدیں تو ان میں دونوں میں سے کوئی شرط بھی نہیں ہے، یا ایک تھان کپڑا دے کر ایک من شکر خریدیں تو یہ جائز ہے۔

جوا اور شرط والے کاروبار جس طرح ہر طرح کا سودی کاروبار حرام ہے، اسی طرح جوئے کا تمام کاروبار حرام ہے، جو خواہ بازی لگا کر کھیلا جائے، یا کوئی شرط لگا کر یا بخت و اتفاق کی بنا پر کوئی فائدہ اٹھایا جائے، اسلام میں یہ سب ناجائز ہے۔ قرآن و حدیث میں جوئے (میسر) کو حرام کیا گیا ہے، مگر جوا صرف یہی نہیں ہے کہ چند روپے، یا

چند پیسے کی بازی لگا کر فائدہ یا نقصان اٹھایا جائے، بلکہ جوئے اور قمار بازی میں وہ تمام صورتیں داخل ہیں، جن میں ایک آدمی کا مال دوسرے آدمی کو بخت و اتفاق کی بنا پر مل جاتا ہو، چنانچہ موجودہ زمانہ میں لاٹری، ریس، اور معمّہ وغیرہ کے ذریعہ جو فائدہ حاصل کیا جاتا ہے، وہ سب جوئے میں داخل ہے، کیونکہ اس میں سارا فائدہ یا نقصان اتفاق پر مبنی ہوتا ہے۔

میسر یعنی جوئے کی تعریف میسر کی تعریف علماء نے یہ کی ہے "تَعْلِيقُ الْمِلْكِ عَلَى الْخَطَرِ"[1] یعنی اس کا فائدہ اتفاق پر مبنی ہو، اسی بنا پر حدیث میں بیع الغرر اور اس کی تمام قسموں سے منع کیا گیا ہے، مثلاً بیع مُنابذہ، بیع ملامسہ، بیع الحصاۃ وغیرہ، بیع الغرر ایک جامع لفظ ہے، اس میں ہر وہ کاروبار داخل ہے، جس میں مذکورہ صفت پائی جائے، گویا غرر کی جو تفسیر آپؐ نے فرمائی ہے، ان میں سے ایک میسر بھی ہے، غرر کی چند قسمیں یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

بیع منابذہ یہ ہے کہ ایک طرف تو متعین رقم یا جنس ہو، اور دوسری طرف غیر متعین رقم یا جنس ہو، مثلاً کسی نے کہا کہ اس باغ کا پھل میں نے اس شرط پر بیچا، کہ اگر اس میں پانچ ہزار پھل سے جتنے زیادہ ہوں گے تو وہ سب میرے ہونگے اور اگر کم ہونگے تو اس کی ذمہ داری خریدار پر ہوگی، یا کسی نے کہا کہ اس چار من گیہوں کے بدلے مجھے اس مٹر کے کھیت کی فصل فروخت کر دو، یا کسی نے کہا کہ فلاں جہاز پر جو سامان آرہا ہے، یا فلاں ریل کے ڈبہ میں جتنا سامان ہے، وہ سب ہم اتنے روپے پر بیچتے ہیں تو ان تمام صورتوں میں خرید و فروخت صحیح نہ ہوگی، کیونکہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ قیمت کی تعیین بھی ہونا چاہیئے، اور جو چیز بیچی جارہی ہے اس کو متعین اور مقرر ہونا چاہیئے، کیونکہ جس وقت یہ معاملہ طے ہو جائے گا، تو اس کی دو صورتیں ہیں، یا تو بائع کو نقصان اٹھانا پڑے گا یا مشتری کو، اور دونوں صورتوں میں اختلاف اور ناراضگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، یوں تو نقصان و فائدہ کا امکان ہر خرید و فروخت میں

---

[1] اپنی ملکیت کو خطرہ میں ڈالنا۔

ہوتا ہے، مگر اس کی وجہ دوسری ہوتی ہے اسکا اصل معاملہ اتفاق پر مبنی نہیں ہوتا، اور یہاں اصل معاملہ ہی اتفاق پر مبنی ہے، اس لئے اس میں ایک کا فائدہ اور ایک کا نقصان بالکل متعین ہوتا ہے، چنانچہ آئے دن ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ ایک آدمی ایک جہاز کا مال بغیر اس کو دیکھے ہوئے خرید لیتا ہے، اور اس کو ایسا دھکّا لگتا ہے کہ وہ بالکل دیوالیہ ہو کر پیسے پیسے کو محتاج ہو جاتا ہے۔

بیع الملامسہ اور بیع الحصاۃ یہ ہے کہ بہت سی چیزیں رکھی ہوئی ہیں، ایک شخص نے ان میں سے ایک چیز کو چھو دیا، یا اس نے کسی چیز پر ایک کنکری پھینک دی، یا یہ کہا کہ میرا ہاتھ جس چیز پر پڑ جائے، یا جس پر کنکری پہنچ جائے وہ میری ہے، جیسا کہ آج کل ریس میں اور لاٹری میں ہوتا ہے کہ لاکھوں روپے کا مال صرف پانسے، داؤ اور بازی کے ذریعہ بک جاتا ہے۔[1]

لاٹری اور معمّہ بازی لاٹری اور معمّہ بازی میں یہ ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کا فائدہ تو متعین ہوتا ہے، ایک معمّہ یا لاٹری جاری کرنے والے کا، دوسرے جس نے بازی جیتی ہے، یا انعام پایا ہے، مگر ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کی جیب کا پیسہ بلا کسی وجہ کے نکل جاتا ہے، اور یہ سب اتفاقی طور پر ہوتا ہے اور پھر لاٹری اور معمّہ بازی اس پہلو سے بھی اسلامی شریعت میں جائز نہیں ہو سکتی کہ یہ صریح ظلم ہے کہ ہزاروں کی جیب کاٹ کر دو آدمی کی جیب بھر دی جائے، اور یہ ظلم ہزاروں آدمی صرف ایک موہوم امید کی بنا پر برداشت کرتے ہیں، اگر ان میں سے ہر ایک کو معلوم ہو جائے کہ اس کے حصّے میں کچھ نہیں آئے گا، تو بہت کم آدمی ہوں گے، جو اپنا روپیہ معمّہ کی نذر کریں گے، اور اس کے حل کرنے میں اپنی محنت عزیز ضائع کریں گے، معمہ صرف وہی حرام نہیں جو فیس ادا کر کے شائع کیا جائے، بلکہ وہ بھی نا جائز ہے جو بغیر فیس کے شائع کیا جاتا ہے، اور بظاہر بغیر فیس کے جو معمّے شائع کئے جاتے ہیں، ان میں بھی اس رسالہ کو بیچ کر ایک دوسرے طریقے سے

---

[1] والملامسة لمس الرجل ثوب الآخر بیدہ باللیل والنهار ولا یقلبه والمنابذة ان ینبذ الرجل بثوبه وینبذ الآخر بثوبه ویکون بیعهما من غیر نظر ولا تراض۔ بخاری ومسلم بحوالہ المنتقی ج ۲ ص ۳۱۹

فیس حاصل کرلی جاتی ہے، یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک رسالہ دس آدمی لے کر اور اس سے نقل کر کے اپنا حل بھیج دیں، بلکہ ہر معمہ بھیجنے والے کو ایک رسالہ خریدنا پڑتا ہے، جب تک کسی حل کے ساتھ اس رسالہ کی کوپن نہ بھیجی جائے گی، اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

بیمہ کی شرعی حیثیت

بیمہ خواہ مال کا ہو یا جان کا ناجائز ہے، اور حرام ہے، اس میں سود بھی ہوتا ہے، اور قمار بھی اور رشوت بھی، مثلاً مال کے بیمہ میں جو معاوضہ بیمہ کمپنی دیتی ہے، وہ معاوضہ کسی مال کا نہیں ہوتا، بلکہ اس رقم کا ہوتا ہے جو بیمہ کرانے والے اس کو سالانہ ادا کرتے رہتے ہیں، ورنہ مال سے تو اس کمپنی کو کوئی فائدہ ہوتا نہیں، ظاہر یہ نفع بالکل بخت و اتفاق پر مبنی ہے، اور اسی کا نام میسر یا قمار و جوا ہے، اور یہ سود اس طرح ہے کہ بیمہ کمپنی نقصان کا جو معاوضہ دیتی ہے، وہ رقم یا تو اس رقم سے زیادہ ہوگی، جو اس کو بیمہ کرانے والوں سے ملی ہے، یا اس سے کم دونوں صورتوں میں کسی نہ کسی فریق کا نقصان ہوگا، اور کسی نہ کسی کا فائدہ، اور اسی کا نام سود ہے کہ ایک کا فائدہ یا نقصان تو متعیّن ہو اور دوسرے کا غیر متعین، اسی طرح جان کا بیمہ سود ہونے کے ساتھ رشوت بھی ہے، کیونکہ جان اسلام کے نزدیک مال متقوم نہیں ہے، یعنی وہ عوض یا خرید و فروخت کے بدلہ میں استعمال نہیں کی جاسکتی اور معاملات میں دونوں طرف ایسی چیزوں کا ہونا ضروری ہے، جو عوض بن سکیں اور رشوت کی یہی تعریف ہے کہ رشوت کسی مال متقوم کے عوض کے بغیر دی جاتی ہے، مگر اس وقت ساری دنیا میں بیمہ کا رواج ہے، اس لئے اس کی مزید تفصیل کی جاتی ہے، اور یہ تفصیل ڈاکٹر نور محمد غفاری صاحب کے مضمون اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کے مضمون "بیمہ کی شرعی حیثیت" سے ماخوذ ہے۔

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ بیمہ میں رِبٰو یعنی سودی لین دین بھی ہوتا ہے، اور اس میں قمار یعنی جوا بھی ہوتا ہے، اور غرر یعنی دھوکہ بھی ہوتا ہے، اور اس پر رشوت کی تعریف بھی صادق آتی ہے، انشورنس (Insurance) انگریزی لفظ ہے، جس کا ترجمہ اردو میں بیمہ کیا جاتا ہے، جس کے اندر ضمانت اور تحفظ کا مفہوم شامل ہے، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"انشورنس کا تازہ ترین مفہوم ایسی ضمانت ہے، جو لوگوں کا ایسا گروہ دیتا ہے جن میں سے

ہر ایک خطرہ میں ہوتا ہے، جس کے اثرات خطرہ کے واقع ہونے سے پہلے جانچا نہیں جاسکتا، ایسا خطرہ جب بھی واقع ہوتا ہے، تو اس کے اثرات کو اس کے گروہ کے تمام افراد پر تقسیم کر دیتے جاتے ہیں"[1]

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں انشورنس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انشورنس گویا مستقبل کے خطرات کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے، اس سلسلہ میں انشورنس کے حامیوں میں دو رائیں ہوگئی ہیں، ایک گروہ ایسے خطرات اسے بچاؤ کی تدبیر کا نام دیتا ہے، اور دوسرا گروہ اسے خطرات کے خلاف ایک اہتمام تصوّر کرتا ہے۔

غرض یہ کہ انشورنس کی ابتدا، ایک جذبۂ خیر خواہی اور ہمدردی کے تحت ہوئی تھی مگر جب سے یہ اسکیم یہودی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں گئی تو انھوں نے اسے ربٰو و قمار کی لعنت تک پہنچا دیا جیسا کہ ان کی دوسری معاشی اسکیموں میں یہی ذہنیت کام کر رہی ہے، علامہ ابو زہرہ مرحوم اور شیخ مصطفےٰ زرقاء میں اس مسئلہ پر جو مباحثہ ہوا تھا، وہ کتابی شکل میں عقد التامین کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس میں شیخ ابو زہرہ کے الفاظ یہ ہیں:

"اگرچہ اس کی ابتداء جذبۂ تعاون سے ہوتی، لیکن جب یہ ادارہ یہودی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں گیا تو انھوں نے اپنی ہر معاشی اسکیم کی طرح اسے ایک ایسے یہودی نظامِ معیشت میں تبدیل کر دیا جس سے تعاون علی البر والتقویٰ کی روح رخصت ہوگئی، اور وہ بھی سود، اور قمار یعنی جوا کا مجموعہ ہو کر رہ گئی"[2]

انشورنس کا طریقۂ کار

انشورنس کمپنی انشورنس کرانے والے سے ایک معاہدہ کرتی ہے جس کی رو سے بیمہ کرانے والا ایک معینہ رقم بیمہ کمپنی کو ہر ماہ یا سالانہ جمع کرتا ہے، رقم کی تعیین، اگر بیمہ جان کا ہے، تو اس کی صحت کی جانچ کے بعد اس کی تعین ہوتی ہے، اور اگر جائداد یا دوکان کا ہے، تو اس کی نوعیت اور نقصانات اور خطرات سے

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ایڈیشن گیارہ، ج ۱۴ ص ۱۵۶۔

[2] عقد التامین ص ۸، مطبع جامع دمشق ۱۹۶۲ء۔

متعلق تجربات بیمہ کمپنی کے اخراجات اور اس سے متوقع نفع یعنی شرح سود سے اس کی تعیین ہوتی ہے، پھر ایک متعینہ مدت کے بعد وہ رقم بیمہ دار یا اس کے وارث کو جسے وہ نامزد کر دے، مل جاتی ہے، اس کی اصل رقم کے ساتھ کمپنی ایک مقررہ شرح کے ساتھ کچھ مزید رقم بھی دیتی ہے، جو دراصل سود ہوتا ہے، مگر انشورنس کمپنی اسے بونس کہتی ہے، بیمہ کمپنی پالیسی ہولڈروں کی اس رقم کو سود پر تاجروں کو دیتی ہے، اس طرح وہ اس رقم سے ایک کثیر رقم کماتی ہے جس کا بیشتر حصہ وہ کمپنی خود رکھ لیتی ہے اور ایک قلیل مقدار بیمہ کرانے والوں کو دیتی ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ کمپنی خود اپنا ایک پیسہ بھی اس میں نہیں لگاتی، یہ سب رقم بیمہ کرانے والوں (پالیسی ہولڈرس) کی ہوتی ہے۔

انشورنس کے چند شرائط

انشورنس کے طریقۂ کار کے ساتھ اس کے شرائط کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ اسی سے اس کی شرعی حیثیت معلوم ہو سکے گی۔

۱۔ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ بیمہ دار یا پالیسی ہولڈر جب دو سال تک مسلسل اپنی معینہ رقم کی قسط ادا کرتا رہے گا، تو اس کا اہل سمجھا جائے گا کہ وہ اپنی جمع شدہ رقم کے بقدر رکم سود پر کمپنی سے قرض لے سکے۔

۲۔ بیمہ دار کو ایک متعینہ رقم ادا کرنی پڑتی ہے، جسے پریمیم (Premium) کہا جاتا ہے، اگر وہ بعض اپنی مجبوریوں کی وجہ سے کچھ قسطوں کی ادائیگی کے بعد وہ پوری رقم نہ جمع کر سکے تو اس کی جمع شدہ رقم سوخت ہو جاتے گی، پھر اپنی بقیہ رقم جمع کر کے بیمہ دار بن سکتا ہے، لیکن بند کرنے کی صورت میں جمع شدہ رقم کا حقدار نہیں ہے، اس میں جو نئی ترمیمات ہوتی ہیں، ان کے مطابق اگر تین سال تک وہ قسط ادا کرتا رہا ہے اور پھر بند کر دیا تو اس کی کچھ رقم اس کو واپس ہو سکتی ہے مگر کل نہیں۔

انشورنس کی شرعی حیثیت

انشورنس اپنی سادہ صورت میں ایک مفید اسکیم ہے، جس میں بیمہ کرانے والوں کو یا ان کے ورثہ کو تھوڑی سی راحت مل جاتی ہے، مگر جن شرائط کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ بھی اس کے اندر دینی و دنیوی

جو مفاسد پوشیدہ ہیں، ان کی بنا پر وہ اسلامی شریعت کے نزدیک ناجائز ہے، اوپر سود کی معاشی اور اخلاقی برائیوں کی طرف جو اشارہ کئے گئے ہیں، بالکل اس سے کچھ بڑے پیمانہ پر مفاسد موجودہ نظام انشورنس میں پائے جاتے ہیں، سود کی برائی کو ہم براہ راست معلوم کرتے ہیں، مگر انشورنس کی برائی پر انسانی ہمدردی اور تحفظ جان ومال کا پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے، اس لئے وہ ہمیں ظاہری طور پر بہت زیادہ مفید معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس سے ہم کو وہ کراہت محسوس نہیں ہوتی، جو براہِ راست سودی کاروبار میں محسوس ہوتی ہے، حالانکہ دونوں کے نتائج یکساں طور پر شرعی، اخلاقی اور معاشی زندگی کے لئے تباہ کن ہے۔

موجودہ انشورنس کی خرابیاں

اوپر ذکر آچکا ہے کہ موجودہ انشورنس کی اسکیم میں سود وقمار وغیرہ کے بیشمار مفاسد پائے جاتے ہیں، اور یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ اخلاقی ومعاشی اعتبار سے بھی انسانی اخلاق ومروت اور تمدنی زندگی کو سود اور قمار وغیرہ گھن کی طرح چاٹ جاتے ہیں، اقبالؒ نے صحیح کہا ہے ؎

سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات

ربٰو یعنی سود

موجودہ انشورنس کے نظام کی سب سے بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس کا سارا تانا بانا سود سے بنتا ہے، انشورنس میں سود دو صورتوں سے داخل ہوتا ہے، آگے تفصیل آرہی ہے۔

موجودہ انشورنس کے مقاصد ومفاسد

موجودہ نظام انشورنس میں دینی ودنیوی دونوں قسم کے مفاسد پائے جاتے ہیں، لیکن ان کی الگ الگ تقسیم مشکل ہے، کیونکہ اس کا کوئی ایک مفسدہ اگر شرعی لحاظ سے ناجائز ہے، تو وہی مفسدہ دوسری طرف دنیوی لحاظ سے تباہ کن بھی ہے، مثلاً موجودہ نظام انشورنس کا ایک نمایاں مفسدہ سود اگر دینی اعتبار سے حرام ہے تو دوسری طرف وہ معاشی تمدن کو بھی گھن کی طرح چاٹ رہا ہے، لہٰذا ہم یہاں ان مقاصد کا ذکر کریں گے، جن کی حرمت اور تباہ کاری پر تمام علمائے کرام کا اتفاق ہے، چند مفاسد یہ ہیں:

(۱) سود، (۲) قمار، (۳) غیر شرعی شرائط، (۴) سٹہ بازی اور دھوکہ دہی وغیرہ

سود:۔ انشورنس کے کاروبار کا ہر حقیقت شناس یہ بخوبی جانتا ہے کہ اس کاروبار میں شریعت کا اصطلاحی ربوٰ دو صورتوں میں پایا جاتا ہے۔

۱۔ انشورنس کمپنی جو سرمایہ مختلف افراد سے اکٹھا کرتی ہے، اسے کاروباری کمپنیوں یا افراد کو سود پر دیتی ہے، اور ان سے سود وصول کر کے کچھ بیمہ کمپنی کے مالکان کھا لیتے ہیں، اور کچھ بیمہ داروں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

۲۔ انشورنس کمپنی بیمہ دار شخص کو مدت مکمل ہونے پر حادثہ وغیرہ کی شکل میں مقررہ مدت سے پہلے ہی وہ رقم ادا کر دیتی ہے، جس پر بیمہ دار کی زندگی یا جائداد کا بیمہ کیا گیا تھا۔

اب بیمہ کمپنی جو رقم بیمہ دار کو دیتی ہے، اس کی مندرجہ ذیل دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) کمپنی مدت بیمہ کی تکمیل کے بعد بیمہ دار کی اصل رقم فرض کیا ۵۰ ہزار روپے واپس کر دیتی ہے۔

(۲) کمپنی بیمہ دار کو اصل رقم سے زائد ادا کرتی ہے، مثلاً ۷۰ ہزار روپے ان دونوں صورتوں میں اسلام کے اصطلاحی ربوٰ کی دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں، پہلی صورت میں جب کمپنی بیمہ کی مقررہ مدت کے بعد بیمہ دار کی اصل رقم کے برابر رقم ادا کرتی ہے تو یہ ربوٰ بالنّسیہ ہوگا، گویا یہاں نقد کی بیع نقد روپے کے ساتھ کی گئی ہے، یعنی ۵۰ ہزار کے عوض میں ۵۰ ہزار روپے ادا کیے گئے، اور تمام فقہائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر نقد یعنی روپئے پیسے کی بیع نقد کے ساتھ ادھار پر کی جاتے تو یہ ربوٰ بالنسیہ ہوگا[۱]۔ اس صورت کی وضاحت کے لئے ذرا ہم چند سوالات کرتے ہیں (۱) بیمہ دار کمپنی کو جو رقم بالاقساط ادا کرتا ہے، وہ کس چیز کی قیمت ہے، جو اس نے بیمہ کمپنی سے خریدی ہے، یا کون سا قرض اس نے بیمہ کمپنی سے لیا ہے جس کی بالاقساط ادائیگی کی جا رہی ہے؟

(۲) کیا بیمہ کمپنی کی بیمہ پالیسی مال ہے یا قرض حسنہ ہے؟ ظاہر ہے وہ مال ہے نہ قرض حسنہ پھر ادائیگی کس لئے؟ بیمہ کمپنی والے اور بیمہ کے مو[illegible]ین اسے کوئی نام دیں مگر ہے وہ قرض،

---

[۱] ڈاکٹر حسین حامد خاں: حکم الشریعۃ الاسلامیہ فی عقد التامین دار الاعتصام، قاہرہ سنہ ۱۹۶۹ء۔

جسے بیمہ کمپنی بعد میں مع سود کے ادا کرے گی، گویا بیمہ کمپنی نے نقد کی بیع نقد کے ساتھ کی ہے، جسے فقہائے اسلام کی اصطلاح میں ربٰو بالنّسیہ (ادھار پر سود) کہا جاتا ہے۔

دوسری صورت میں اگر مقررہ مدت سے قبل حادثہ کی صورت میں کمپنی بیمہ دار کی ادا کردہ اقساط کی رقم فرض کیا ۲۰، ہزار روپے سے زائد یعنی ۵۰، ہزار روپے جن پر بیمہ ہوا تھا، ادا کرتی ہے تو یہ ۳۰، ہزار روپے زائد بغیر کسی عوض کے ہیں، لہٰذا فقہاء کے نزدیک اس بغیر کسی عوض کے زیادتی کی صورت میں ربٰو بالفضل (نقدین دین میں زیادتی) اور ربٰو بالنسئیہ دونوں پائے جاتے ہیں، ان نظریات کی تائید مندرجہ ذیل اقوال سے ہوتی ہے:

(ا) ربا النسیئۃ محرم فی النقود مطلقاً۔ — نقد کی بین دین میں ربٰو بالنسیہ مطلقاً حرام ہے۔

(ب) ان الزیادۃ الخالیۃ عن عوض ھو مال من الربا الذی لا یخفیٰ علیٰ احد۔ — (کسی عوض کے بغیر جو زیادتی، مال پر دی یا لی جائے، وہ ربو کا مال ہے اور یہ کسی پر مخفی نہیں۔

(ج) اجمع العلماء علیٰ ان بیع الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ ای النقد بالنقد لا یجوز الا مثلاً بمثل ویداً بید۔[1] — علماء کا اس پر اجماع ہے کہ سونے کی بیع سونے کے ساتھ اور چاندی کی چاندی کے ساتھ یعنی نقد کی بیع نقد کے ساتھ ادھار پر جائز نہیں، ہاں اگر برابر برابر ہو، اور دست بدست ہو (تو جائز ہے)

اب ان تینوں اقوال کا اطلاق انشورنس کمپنی کی رقم کی ادائیگی پر کیجئے، مذکورہ بحث کی روشنی میں فرض کریں، بیمہ کمپنی بیمہ دار کو اصل رقم یعنی بغیر کسی زیادتی کے واپس کرتی ہے، تو یہ (ربٰو بالنسیہ) یعنی ادھار پر سود ہے، جو شریعت اسلامی کی رو سے حرام ہے، جیسا کہ قول الف ج سے واضح ہے۔

---

[1] اعلام الموقعین، ج ۲ ص ۹۹ منیریہ قاہرہ۔

مثلاً جب کوئی شخص دوسرے شخص سے یہ کہے کہ تم اپنے تین سو روپے مجھے ایک سال کے لئے تین سو روپے کے عوض فروخت کرو تو یہ حرام ہے، البتہ قرض حسنہ کے نام پر تین سو روپے لینا، دینا ایک سال یا اس سے زیادہ کے لئے نہ صرف جائز ہے بلکہ وہ مستحسن ہے، لیکن بیمہ کمپنی یہ رقم قرض حسنہ کے نام پر نہیں لیتی ہے، بلکہ وہ یہ رقم ایک موہوم بیمہ پالیسی کے عوض حاصل کرتی ہے، فرض کریں ایک بیمہ دار ۵۰ ہزار روپے بالاقساط ادا کر کے ۵۰ ہزار روپے کی بیمہ پالیسی خریدتا ہے، گویا نقد کے بدلے نقد خریدتا ہے، اس کے لئے ایسا معاملہ کرنا حرام ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مبارکہ اس سلسلہ میں ہماری پوری راہ نمائی کرتی ہے:

عن عبادۃ بن صامت رضؓ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواء بسواء یداً بید فاذا اختلفت ھذہ الاصناف فبیعوا کیف شئتم اذا کان یداً بید۔ (مسلم)	حضرت عبادہ بن صامت رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، سونے کا تبادلہ سونے سے اور چاندی کا چاندی سے اور گیہوں کا گیہوں سے اور جَو کا جَو سے، خرمے کا خرمے سے اور نمک کا نمک سے برابر برابر اور دست بدست ہونا چاہیئے، یعنی ناپ تول میں مساوی ہوں، البتہ اگر ان ایک جنس کا تبادلہ ہم جنس کے ساتھ نہ ہو تو کمی بیشی کے ساتھ جس طرح معاملہ کرو لیکن معاملہ ادھار کا نہ ہو، بلکہ دست بدست ہونا ضروری ہے۔

دوسری حدیث جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ان میں یہ الفاظ بھی ہیں:

فمن زاد او استزاد فقد اربیٰ الآخذ والمعطی	جس میں اس نے زیادتی کی، یا زیادتی چاہی اس نے سود کا معاملہ کیا اور اس کے

فیہ سواء۔ (مسلم) گناہ میں لینے والے اور دینے والے دونوں برابر ہیں۔

قرآن پاک کی صریح آیت اور مذکورہ بالا احادیث کو جو حد تواتر کو پہونچی ہوتی ہیں، اور قمار اور غرر وغیرہ کی صورتوں کو سامنے رکھا جائے تو موجودہ نظام انشورنس کو قطعی جائز نہیں کہا جا سکتا۔

قمار بازی انشورنس کی یہ شرط کہ اگر بیمہ شدہ شخص یا شئے اس معینہ مدت (جس میں بیمہ ہوا ہے) سے پہلے مریا تلف ہو جائے تو اصل رقم کے ساتھ جو بونس ملے گا، اس کی شرح زیادہ ہوگی (فرض کریں اس طرح ۵۰ فیصد) اور اگر اس معیّنہ مدت کے بعد تک وہ بیمہ شدہ شخص زندہ رہتا ہے، یا جائداد باقی رہتی ہے، تو شرح بونس کم ہوگی (فرض کریں ۵۴ فیصد) جب کہ تلف ہونے کے وقت کا علم اور تعین کرنا انسان کے بس کا روگ نہیں، اس شرط کے تحت انشورنس کا کاروبار قمار (جوا) سے مشابہ ہے، ہمارے اس نظریے کی دلیل الفرڈ مینز (Alfred Mans) کا وہ قول ہے جو وہ بیمہ کے قواعد وضوابط کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"ایسے معاملات میں انشورنس کے کاروبار میں شرط یا جوا کے عناصر شامل ہو جاتے ہیں"۔ [1]

قمار کے بارے میں علمائے اسلام کا قاعدہ ملاحظہ فرمائیے:

تعلیق الملک علی الخطر والمال فی الجانبین [2] قبضہ کا کسی ایسی شئے پر موقوف رکھنا جس کے ہونے اور نہ ہونے کا برابر کا احتمال ہو، اور مال دونوں طرف ہو۔

اس احتمال کی تفصیل انشورنس کمپنی کے معاہدہ کی روشنی میں یہ ہے کہ اگر بیمہ دار معینہ مدت سے پہلے مر گیا، تو رقم کی اتنی مقدار (فرض کیا ۶۰ ہزار) کا مالک ہوگا، اور اگر معینہ مدت کے بعد زندہ رہا تو اتنی رقم (فرض کیا ۵۴۰۰۰/ روپے) کا مالک ہوگا، مقدار رقم کی تعین میں دونوں

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنس ج، (انشورنس)۔

[2] مفتی محمد شفیع و مفتی علی حسن (بیمہ زندگی)۔

طرح کا احتمال ہے، زیادہ ملنے کا بھی اور کم ملنے کا بھی لہذا بیمہ کا کاروبار جوا ہے، کیونکہ جوا کھیلنے والا نہیں جانتا کہ اسے کتنی رقم ملے گی یا وہ کتنی رقم ہارے گا۔

جوا کی حرمت قرآن مجید میں آئی ہے:

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ	بلاشبہ شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک
وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ	ہیں، کار شیطان ہیں، پس ان سے بچو، شاید
فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ [1]	تم کامیاب ہو جاؤ۔

میسر (جوا) کی تفصیل میں امام ابوبکر الجصاص فرماتے ہیں:

ولا خلاف بين اهل العلم فی تحریم	جوئے کی حرمت کے سلسلے میں اہل علم کے
القمار وان المخاطرة من القمار	درمیان کوئی اختلاف نہیں اس فعل
فقال ان مخاطرة قمار وان اهل	میں "خطرہ" کی ساری صورتوں کے شامل
الجاهلية كانوا يخاطرون على	ہونے پر بھی اتفاق ہے، حضرت عبداللہ
المال والزوجة وقد كان مباحًا	ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں
الى ان ورد الحرمة [2]	کہ خطر (کم یا زیادہ ملنے کا احتمال)، جوا

ہے، اہل جاہلیت اپنے مال اور بیوی ہر دو کو داؤ پر لگاتے تھے، شروع شروع میں اسکی اباحت تھی، مگر پھر تحریم نازل ہوئی۔

انشورنس چونکہ ایک جوا ہے، لہذا غرر کی تشریح کر دی جاتی ہے تاکہ مسئلہ زیادہ واضح ہو جائے۔

خطر اور غرر خطرہ ہے جس کا "ہونا نہ ہونا" معلوم نہ ہو، اور غرر بھی انجام سے بے خبری کو کہتے ہیں، ملک العلماء ابوبکر الکاسانی فرماتے ہیں:

الغرر ما يكون مستور العاقبة [3]	غرر وہ ہے جس میں انجام سے بے خبری ہو،

---

[1] المائدہ، آیت ۹۰۔ [2] ابوبکر جصاص: احکام القرآن، ج ا ص ۳۸۸۔

[3] ابوبکر الکاسانیؒ: بدائع الصنائع ج ۳: قاہرہ ۱۹۱۰ء: ص ۶۸۔

فقہائے مالکیہ کے نزدیک "ما تردد بین السلامۃ والخطف"[1]۔ (غرر وہ شئے ہے جو سلامتی اور ہلاکت کے درمیان ہو) اور شوافع کے نزدیک "کل ما یمکن ان یوجد وان لا یوجد" (غرر وہ شئے ہے جس کے ملنے یا نہ ملنے دونوں طرح کے احتمالات پائے جاتے ہوں)

بیمہ کے کاروبار میں غرر اور خطر دونوں پائے جاتے ہیں، مثلاً بیمہ شدہ شخص یا شئے کا مدّتِ معینہ سے پہلے تلف ہونا یا مرنا باقی رہنا معلوم نہیں ہوتا، اور وہ کتنی رقم پائے گا، یہ بھی نہیں معلوم ہوتا، یعنی زندہ رہا تو کم اور فوت ہوگیا تو زیادہ، مگر موت کا گو وقت معیّن ہے، مگر اس کی کسی کو خبر نہیں، لہٰذا جس کاروبار کو زندگی یا موت کے وقت (جو معلوم نہیں) کے ساتھ مشروط کیا جائے، وہ جوا نہیں تو کیا ہے، اور اس میں غرر اور خطر بھی ہیں، لہٰذا ایسا کاروبار حرام ہے،

امام دار الہجرت حضرت مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ اسی قسم کے ایک معاملہ کی مثال دیکر اس کا حکم لکھتے ہیں:

ان یعد الرجل الی الرجل قد ضلت راحلتہ او دابتہ او غلامہ ثمن ہذہ الاشیاء خمسون دینارًا فیقول انا اخذہا منک بعشرین دینارًا فان وجدہا المتاع ذہب من مال البائع ثلاثین دینارًا وان لم یجدہا ذہب البائع منہ بعشرین دینارًا وہما لا یدریان ایضًا اذا وجدت تلک الضالۃ کیف

ایک شخص دوسرے شخص، جس کی سواری یا سامان سفر یا غلام گم ہوگیا ہے کی اس طرح مدد کرتا ہے کہ اس کے گمشدہ چیز کی قیمت ۵۰ دینار مقرر کر دیتا ہے، اور صاحب مال سے کہتا ہے کہ تیرا یہ گمشدہ مال میں تجھ سے بیس دینار میں لیتا ہوں، گم شدہ مال والا یہ جان کر کہ ملے نہ ملے چلو بیس دینار تو سہی قبول کر لیتا ہے، پھر اگر وہ اس گمشدہ متاع کو پالیتا ہے، تو اس طرح وہ فروخت کرنے والے سے تیس دینار

---

[1] حاشیہ الدسوقی علی الشرح الکبیر: ج ۳ ص ۲۵۔

توخذ وماحدث فيها من امر الله تعالیٰ عز وجل مما يكون فيه نقصها وزيادتها فهذا اعظم المخاطرة[1]

اڑا لیتا ہے اور اگر نہیں تلاش کر پاتا تو پھر بیچنے والا اس سے بیس دینار ہتھیار لیتا ہے، اور دونوں نہیں جانتے کہ جب وہ (سودا کرنے والا) اس گمشدہ چیز کو پاتے گا تو کس طرح پاتے گا، کس حال میں پاتے گا، اور اللہ کا اس چیز پر کیا حکم واقع ہو چکا ہو، جو اس میں نقص یا زیادتی کا موجب بن سکتا ہے، اس طرح کا معاملہ کرنا بہت بڑا خطرہ اور دھوکہ ہے۔

اس مثال میں یہی بتایا گیا ہے کہ ایسا معاملہ جس میں انجام کے اچھے یا برے دونوں طرح کے ہونے کا احتمال ہو، شرعاً درست نہیں، ایسا ہی معاملہ انشورنس کا ہے، جس میں بیمہ دار کو موت کے مدت معینہ سے قبل آجانے کی صورت میں رقم کے زیادہ ملنے کی اور زندہ رہنے کی صورت میں کم ملنے کی دونوں طرح کا احتمال ہوتا ہے، اور یہ جوا ہے، لہذا حرام ہے۔

۳۔ سٹہ بازی اور دھوکہ دہی

موجودہ مروجہ نظام انشورنس میں سٹہ بازی اور دھوکہ دہی بھی ہے، دھوکہ دہی دونوں طرف (بیمہ دار اور انشورنس کمپنی) سے ہوتی ہے، بیمہ دار ایسا بھی کرتا ہے کہ دھوکہ دے کر اپنی جائداد کی مالیت زیادہ ظاہر کر دی، اور جب بیمہ ہو گیا تو سود کی رقم جو اس کی مملوک شئے کی مالیت سے زائد تھی، وصول کرنے کے لئے اس شئے کو مخفی طریقے سے تلف کر دیا[2]

ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی سرمایہ دار نے کارخانہ میں پڑے روئی کے ذخیرہ کا ایک کروڑ کا بیمہ کرایا مگر کاروبار پر زوال آتے دیکھا تو اس ملک وملت کے دشمن نے روئی کو آگ دکھادی اور قوم سے انشورنس کمپنی کی معرفت ایک کروڑ روپیہ وصول کر لیا۔

---

[1] امام مالکؒ: المدونۃ الکبریٰ، ج ۳ ص ۲۵۸، ۱۳۲۴ھ۔

[2] مولانا اسحٰق سندیلوی: سوالنامہ مع بیمہ زندگی، از مولانا مفتی محمد شفیعؒ و مولانا ولی حسن: دارالاشاعت کراچی، ۱۹۷۲ء، ص ۲، ۳۔

دوسری طرف انشورنس کمپنی کا مالک سرمایہ دار ہوتا ہے، جو سبز باغ دکھا دکھا کر قوم کی دولت سمیٹتا ہے، اپنا ناپاک سودی کاروبار چمکاتا ہے، اور لاکھوں روپے کھاتا ہے، مگر اس بھولے بیمہ دار کو صرف کچھ فیصد دے کر خوش کر دیتا ہے، دراصل یہ ایسا قاتل ہے، جس کے ہاتھ میں تلوار بھی نہیں ہوتی، اور اپنے ابنائے جنس کو اس طرح موت کے گھاٹ اتارتا ہے کہ خون کا قطرہ بھی گرنے نہیں دیتا، بلکہ اپنی سرمایہ داری کی قبا کو رنگنے کے لئے اسے پہلے ہی نچوڑ لیتا ہے، اور اگر کبھی اس کو نقصان کا خطرہ ہوتا ہے تو اپنی زبردست عیّاری سے بیمہ داروں کے سر پر ڈال دیتا ہے، جس کا خمیازہ پوری قوم بھگتی ہے،

فاسد شرائط

موجودہ انشورنس کے کاروبار کا ایک مفسدہ اس کی فاسد شرائط ہیں، ایسی شرائط جن کا تعلق غرر، خطر اور جوا سے تھا، ان کا ذکر ہم کر چکے ہیں، لیکن ابھی تک ایک شرط جسے محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے، جسے کوئی بھی منصف مزاج مفکر "انسان دشمن شرط" کہے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ ہے کہ ایک متوسط طبقہ کا شخص جس نے اپنے لختِ جگر کا بیمہ کرایا تھا، ابھی اس نے چند اقساط ہی جمع کرائی تھیں کہ اس کا کاروبار زوال پذیر ہو گیا، اور بقیہ اقساط ادا نہیں کر سکا، اب انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس کو اس کی پہلی جمع شدہ رقم واپس مل جائے، لیکن انشورنس کمپنی والے ایسا نہیں کرتے، بلکہ اس کی رقم سوخت کر لیتے ہیں، اور دنیا کی کوئی عدالت اسے واپس نہیں دلا سکتی، کیا یہ ظلم نہیں ہے؟

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: "تینوں قسم کے بیموں، بیمہ زندگی، بیمہ املاک اور بیمہ فرائض میں جو شرط ہے کہ جو شخص کچھ رقم بیمہ پالیسی کی جمع کرانے کے بعد باقی اقساط کی ادائیگی بند کر دے، اس کی جمع شدہ رقم سوخت ہو جاتی ہے، یہ شرط خلاف شرع اور ناجائز ہے، قواعد شرعیہ کی رو سے ایسے شخص کو (جس نے بیمہ کرایا تھا) تکمیل معاہدہ پر مجبور کیا جا سکتا ہے، اور عدم تعمیل کی صورت میں کوئی تعزیری سزا بھی دی جا سکتی ہے، لیکن ادا کردہ رقم کو اس جرمانہ میں ضبط کر لینا جائز نہیں ہو سکتا"[1]

---

[1] مفتی محمد شفیع ؒ و ولی حسن: بیمہ زندگی، ص ۱۸، دارالاشاعت کراچی ۱۹۷۲ء۔

موجودہ نظام انشورنس کے بعض مؤیدین یہ کہتے ہیں کہ بیمہ دار کی اصل رقم پر زیادتی احسان اور تبرّع ہے، ہم ان سے نہایت ادب سے درخواست کرتے ہیں یہ احسان اور تبرّع صرف بیمہ دار ہی کے لئے کیوں ہے، ان بے نواؤں اور بے سہاروں کے لئے کیوں نہیں ہے، جن کا نہ جہاز ڈوبتا ہے، نہ ان کے روئی کے کارخانے کو آگ لگتی ہے، پھر احسان بھی کتنا سائنٹفک، نپا تلا اور مقررہ شرح کے ساتھ۔ ع

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے؟

سود اور بیمہ کے روپے کا استعمال

اگر مجبوراً آدمی کو بینک وغیرہ میں روپیہ جمع کرنا پڑے اور اسے سود ملے تو اسے اپنی ذات اور بال بچوں پر استعمال نہ کرے بلکہ بغیر ثواب کی نیت کے غریبوں کو دے دے یا کسی معتبر آدمی کے ذریعہ کسی رفاہی کام میں اسے لگادے، مثلاً محلہ یا گاؤں کے راستے اور عام پاخانے وغیرہ میں لگادے اب اگر وہ اس راستہ سے چلے گا یا استنجاخانہ کا استعمال کرے گا تو کوئی گناہ نہ ہوگا، یہ روپیہ انکم ٹیکس میں بھی دے دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

پریمیم اور سود کی رقم ٹیکس میں دینا

گورنمنٹ اس وقت انکم ٹیکس میں آمدنی کا ½ یا ¾ لے لیتی ہے جو سراسر ظلم ہے، جس کی وجہ سے پورے ملک میں ٹیکس ماری اور غلط حساب و کتاب کی وبا چل پڑی ہے، اس کے لئے ایک دوسری مجرمانہ اسکیم یہ چلائی ہے کہ جو لوگ اپنا بیمہ کرالیتے ہیں، ان کو انکم ٹیکس میں چھوٹ دی جاتی ہے، اب اگر ہندوستان وغیرہ کے حالات کے پیش نظر فسادات وغیرہ کی وجہ سے یا کسی مجبوری سے مکان، دوکان، گاڑی یا کاروبار کا بیمہ کرانا پڑے تو بیمہ کے سود کی رقم انکم ٹیکس وغیرہ میں دی جاسکتی ہے، لیکن ٹیکس سے زیادہ جو رقم ہو اسے غرباء میں تقسیم کرادینا چاہیئے۔

بہرحال اوپر جو اصول بیان کئے گئے ہیں، اسی کے پیش نظر جان کا بیمہ تو اہل حق علماء کے نزدیک کسی طرح جائز نہیں معلوم ہوتا، مگر کاروبار وغیرہ میں چونکہ کچھ مجبوریاں حائل ہوتی ہیں، اس لئے اس سلسلہ میں کسی معتمد علیہ عالم سے اپنے حالات کے پیش نظر فتویٰ لینا چاہیئے صرف اپنی عارضی راحت اور خواہش نفس کی بنا پر ایسا کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔

آخر میں ہم شیخ مصطفیٰ زرقاء اور علامہ شیخ ابو زہرہ رحمۃ اللہ علیہ کے مباحثہ کا خلاصہ نقل کرتے ہیں، اور موجودہ دور کے دوسرے علماء میں جو بیمہ کے جواز یا عدم جواز کے قائل ہیں ضمناً اس میں ان کا بھی ذکر آگیا ہے۔

عالم اسلام میں بیمہ کے سلسلہ میں تین گروہ ہیں، ایک گروہ اس کے جواز اور اباحت کا قائل ہے، جس کے سرخیل محمد مصطفیٰ زرقاء اور شیخ عبد الرحمٰن عیسیٰ اور ہندوستان و پاکستان کے کچھ علماء ہیں، دوسرا گروہ وہ جو اس کے عدم جواز یا کراہت کا قائل ہے، ان میں شیخ ابن عابدین اور ان کے بعد عہد عثمانی عہد میں مصر کے اطراف کے مشہور مفتی شیخ محمد بخیت المطیعی الحنفی ہیں، اور موجودہ دور کے عام علمائے اسلام جن میں علمائے عرب میں اس کے سرخیل شیخ ابو زہرہؒ اور شیخ احمد شرباصی وغیرہ اور ہندوستان و پاکستان کے عام علماء اور اہل علم ہیں، تیسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ وہ بیمہ جو بیمہ کمپنی اور پالیسی ہولڈر کے درمیان ہوتا ہے، وہ تو جائز نہیں اس لئے کہ اس میں ربوٰ اور قمار دونوں پایا جاتا ہے، لیکن جس میں پالیسی ہولڈر یا بیمہ کرانے والے خود بیمہ کمپنی کے افراد ہوں گویا ایک کوآپریٹو سسٹم کے طور پر اجتماعی طور پر اس نظام کو چلائیں جیسے ابتدائے اسلام میں مواخاۃ کی صورت تھی تو یہ جائز ہے (عربی میں جسے التامین التعاونی کہتے ہیں)

پہلے گروہ کے جو حامی ہیں، ان میں شیخ عبد الرحمٰن عیسیٰ تو مطلقاً اس کے جواز کے قائل ہیں لیکن شیخ محمد مصطفیٰ زرقاء کہتے ہیں کہ اگر اس میں ربوٰ کی صریح صورت ہو تو یقیناً ناجائز ہے مگر اس میں ربوٰ اور قمار کی صریح صورت نہیں پائی جاتی، اس لئے وہ مباح ہے، اس گروہ نے بیمہ کے جواز کے لئے کچھ دلیلیں دی ہیں، ان میں ایک یہ کہ یہ ایک نیا معاملہ ہے اور جب تک ان کے خلاف کوئی نص صریح نہ ہو تو وہ مباح رہے گا، یہ بیع وفا کے مانند ہے، دوسرے عقد موالات اور معاقلہ کی صورتیں بھی اس میں موجود ہیں، جن میں ایک دوسرے مل جل کر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، انھوں نے لکھا ہے، بیمہ نہ تو قمار ہے اور نہ ربوٰ، ان دلیلوں کا شیخ ابو زہرہ نے مدلل جواب دیا ہے، مگر اس سے پہلے انھوں نے شیخ مصطفیٰ زرقاء اور ان کے ہم نواؤں کی زبان و قلم کی تیز دستیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ منفلوطی نے قاسم امین کی عبارت

کے بارے میں جو جملہ لکھا ہے، وہی میں استاذ مصطفیٰ زرقاء کے بارے میں دہراؤں گا:

ما رأیت باطلا أشبہ بحق من کلام قاسم أمین۔

قاسم امین کی بات جو باطل ہوتے ہوتے حق سے زیادہ مشابہ ہوتی ہے، مجھے اور کہیں نظر نہیں آتی۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ میں ایسی عقل انسانی سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں جو شریعت اسلامی کے ایک ایک کرڑنے کو پاش پاش کردے۔

پھر انھوں نے ان کی ایک ایک دلیل کا جواب دیا ہے، جس کا خلاصہ اوپر آچکا ہے، آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ ہم اس تفصیل سے اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اس کی دو صورتیں ہیں، بیمہ اسکیم اگر اجتماعی تعاون کی بنیاد پر چلائی جائے تو اس کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن غیر تعاونی انداز پر بیمہ کی اسکیم جو اس وقت چل رہی ہے، اس کو ہم مکروہ تحریمی سمجھتے ہیں[1] پھر لکھتے ہیں (۱) اس میں قمار ہے (۲) غرر ہے، (۳) ربوٰ ہے، (۴) عقد صرف ہے، جس میں نقد رقم دے کر مستقبل میں نقد رقم پانے کی امید ہوتی ہے۔

رشوت سود اور جوا کی طرح رشوت بھی حرام ہے، قرآن میں بھی اس کی ممانعت آئی ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سے منع فرمایا ہے، آپؐ نے فرمایا ہے کہ رشوت، لینے اور دینے والے دونوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے[2]، رشوت یہ ہے کہ آدمی ایک کام کے لئے مقرر ہے، اور وہ اس کام کے لئے حکومت سے یا کسی ادارہ یا کسی شخص کی طرف سے تنخواہ پاتا ہے، اور پھر بھی اسی کام کے کرنے کے لئے وہ کچھ اور معاوضہ لیتا ہے، مثلاً ایک دفتر کا کلرک اس لئے مقرر ہے، کہ وہ لوگوں کا پاسپورٹ بنا دیا کرے، اب اگر پاسپورٹ بنانے میں تنخواہ کے علاوہ پاسپورٹ بنوانے والے سے اس نے کچھ لیا تو رشوت ہوگی، کیونکہ اس کو اس کام کا معاوضہ

---

[1] انہوں نے لکھا ہے کہ میں نے مکروہ تحریمی ادباً و احتراماً لکھا ہے، اس لئے کہ اسلاف حرام اس چیز کو کہتے تھے، جس کے حرام ہونے پر دلیل قطعی ہو۔ اور یہ نیا ہونے کی وجہ سے بہرحال اجتہادی مسئلہ ہے۔

[2] لعن اللہ علی الراشی والمرتشی۔ (ابوداؤد، ترمذی) قرآن پاک کی آیت "وتدلوبھا الی الحکام" کا ذکر اوپر آچکا ہے،

مل رہا ہے، اب یہ رقم وہ کس چیز کے بدلہ میں لے رہا ہے، رشوت یہ بھی ہے کہ کسی عہدہ کی وجہ سے اس کو کوئی تحفہ اور ہدیہ ملے، ایک بار ایک آدمی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کی وصول کے لئے مقرر فرمایا، جب وہ واپس ہوا تو اس نے کہا کہ اتنا مال زکوٰۃ کا ہے اور اتنا مجھے ہدیہ ملا ہے، آپؐ نے سنا تو فرمایا کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے پھر دیکھے کہ کون ہدیہ اس کو دیتا ہے، یعنی یہ ہدیہ عہدہ کی وجہ سے ملا ہے[1] اس وقت رشوت نے ایک وبا کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

حَبَلُ الْحُبْلَہ اور مُعَاوَمہ یعنی مستقبل کے سودے

اسی طرح بیع معاومہ اور حبل الحبلہ سے حدیث میں منع کیا گیا ہے، یعنی ایک شخص دو تین سال کے لئے اکٹھا اپنے کھیت کی پیداوار یا باغ کے پھل بیچ دے اس کو معاومہ کہتے ہیں، یا جانور کے ایک یا کئی حمل کو بیچ دے، اس کو حبل الحبلہ کہتے ہیں، مثلاً کسی کھیت میں ایک سال دس من غلہ پیدا ہوا، یا باغ کا پھل سو روپیہ میں بکا تو اسی پر قیاس کر کے یا اندازے سے دو تین سال آئندہ کے لئے معاملہ کر لیا جائے، یا جانور نے بچہ نہیں دیا، مگر اس کو فروخت کر دیا، یا ایامِ حمل کے بچہ کو ماں کے بغیر، یا ماں کو بچہ کے بغیر بیچ دیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے تمام کاروبار سے اس لئے روکا ہے کہ یہ بھی غرر اور میسر کی ایک قسم ہے[2]

موجودہ زمانہ میں چھوٹی تجارت سے لے کر بڑی سے بڑی تجارت میں مستقبل کے سودے کا طریقہ جاری ہے، اس کے ناجائز ہونے کی طرف مسلمان تاجروں کا دھیان بھی نہیں جاتا، اس کے ناجائز اور حرام ہونے کے دو خاص پہلو قابلِ غور ہیں۔

ایک تو یہ کہ اس میں جو چیز بیچی جا رہی ہے وہ سامنے اور قبضہ میں نہیں ہے، دوسرے اس کا فائدہ محض بخت و اتفاق پر مبنی ہے، غرض یہ کہ یہ خصوصیات جس کاروبار میں پائی جائیں گی، وہ ناجائز ہوگا، خاص طور پر مستقبل کے سودوں کی وجہ سے تو کہیں کہیں چھوٹے تاجروں کو بھی

---

[1] ایک حدیث میں ہے کہ "لعن اللہ علی الراشی والمرتشی والرائش"۔ رائش سے مراد جو رشوت لینے دینے کی دلالی کرے،

[2] حدیث میں اس طرح کی بیع سے منع کیا گیا ہے۔ "نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع حبل الحبلۃ وعن بیع الغرر" (مسلم، ترمذی، المنتقی ج ۳ صفحہ ۳۱۵)، اس حدیث کی روشنی میں فقہاء نے لکھا ہے کہ "ولا یجوز بیع الحمل وللانتاج"۔ الجوہرۃ النیرۃ ج ۱ صفحہ ۲۰۲۔

نقصان اٹھانا پڑتا ہے، مگر زیادہ تر اس سے بڑے تاجروں کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ چیزوں کا اسٹاک کر کے گرانی پیدا کریں اور خوب فائدہ اٹھائیں۔

بیع الحبلہ کے بعض اور مسائل

بیع الحبلہ صرف حمل ہی کے بیچنے کو نہیں کہتے بلکہ ہر مجہول چیز کے بیچنے کو کہتے ہیں، مثلاً کسی نے کہا کہ گائے کے تھن میں جو دودھ ہے وہ میں بیچتا ہوں، یا بھیڑ کے بدن پر جتنے بال ہیں وہ سب میں بیچتا ہوں، یہ سب بیع الحبلہ میں داخل اور ناجائز ہے، دودھ کو بیچنا ہے تو دوھ نکال کر بیچے، اور بال کو بیچنا ہے تو کاٹ کر بیچے، اسی طرح جو لکڑیاں یا بالس مکان میں لگے ہوتے ہیں، ان سب کا بیچنا باطل اور حرام ہے، اگر بیچنا ہے، تو ان کو نکال کر بیچنا چاہیے[۱]

جس کاروبار میں فریب یا دھوکہ ہو

جس کاروبار میں دھوکہ یا فریب ہو وہ اسلام میں حرام یا مکروہ ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غش، غرر، نجش اور مُصرّاۃ وغیرہ سے روکا ہے، غرر کے معنی خطرہ برداشت کرنے کے ہیں، وہ کاروبار جس میں کسی فریق کا فائدہ خطرہ میں ہو یا پڑ جائے[۲]، یا جس چیز کی فروخت ہوتی ہے، وہ قبضہ سے باہر ہو تو یہ سب غرر میں شامل ہے، مثلاً کسی نے دریا کی مچھلی فروخت کی، جیسا کہ آج کل حکومتیں ملاحوں کو مچھلی کا ٹھیکہ دیتی ہیں، اسلام میں ان تمام چیزوں کا ٹھیکہ دینا فاسد ہے، جو اس کی ملکیت میں نہ ہوں، اسلامی شریعت میں یہ مچھلیاں ان لوگوں کی ملک ہیں، جو ان کو پکڑتے ہیں، حکومت کا کام یہ نہیں ہے کہ ان سے ٹھیکہ کے ذریعہ فائدہ اٹھائے، بلکہ اس کام میں صرف اتنا ہونا چاہیے کہ ان کو پکڑنے کے لئے وہ آسانی فراہم کرے، اسی طرح وہ کاروبار جس میں خریدار یا بائع کا فائدہ خطرہ میں ہو نا جائز ہے، جیسا کہ اوپر معاومہ، اور حبل الحبلہ وغیرہ کے سلسلہ میں ذکر آچکا ہے، غرر کی چند اور قسمیں ملاحظہ ہوں۔

---

[۱] امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں بیع الغرر یتناول کل ما فیہ مخاطرۃ (فتاوی ابن تیمیہ ج ۲ ص ۴۱۲ قدیم) بیع غرر ان تمام صورتوں کو شامل ہے جو بخت و اتفاق پر مبنی ہے

[۲] نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع حبل الحبلۃ وعن بیع الغرر۔ المنتقی ج ۲ ص ۳۱۸، ایک حدیث میں ہے نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یباع ثمر حتی یطعم او صوف علی ظھر او لبن فی ضرع۔ المنتقی ج ۲ ص ۳۱۹

ایک اور حدیث میں ہے نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع البتن۔ مشکواۃ ج ۱ ص ۲۴۷۔

غِشّ اور مُصَرّاۃ

غش کے معنی کھوٹ کے ہیں، اسی سے دھوکے کا مفہوم نکلا ہے اور مُصَرّاۃ کے معنی ہیں، کسی گائے، بھینس یا بکری کا دو تین وقت کا دودھ تھن میں اس لئے روک لیا جائے کہ خریدار سمجھے کہ یہ بڑی دودھاری گائے یا بکری ہے[1]، اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، اگر ایسا دھوکہ دیا گیا تو خریدار کو واپسی کا حق ہے۔

غش اور مصرّاۃ میں وہ تمام کاروبار آجاتے ہیں، جن میں لوگ غلط پروپیگنڈے، شو، اور دکھاوے کے زور سے اپنا خراب مال بھی اچھی سے اچھی قیمت سے بیچ دیتے ہیں، اور لوگ دھوکے میں پڑکر اسے خرید لیتے ہیں، اگر اسلامی حکومت ہوگی تو وہ غلط پروپیگنڈے اور غلط ذرائع سے کئے گئے اس کاروبار کو ناجائز قرار دے گی، جس میں خراب یا نقلی مال کو عمدہ دکھا کر اور اصلی بنا کر یا ملاوٹ کرکے بیچ دیا جاتا ہے، اور لوگوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے[2]، اور اگر ایسا دھوکہ میں ہوگیا تو ہر ایک کو مال یا قیمت کے واپس لینے کا حق ہے۔

غیر موجود یا اُدھار مال اور غیر موجود یا اُدھار قیمت

ایک طریقہ یہ بھی رائج ہے، کہ مال اور قیمت دونوں غیر موجود یا ادھار ہوتے ہیں، اور خرید و فروخت ہو جاتی ہے، اس کو حدیث میں الکالی بالکالی کہا گیا ہے، اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے[3]، چنانچہ ہندوستان، پاکستان کے ساحلی شہروں مثلاً کلکتہ، بمبئی، کراچی وغیرہ میں اسی طرح لاکھوں روپے کا کاروبار روزانہ صرف زبانی ہوتا ہے، ایسے کاروباریوں کو صرف چند منٹ بات کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑتی ہے، یا پھر کسی مال کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے کہ وہ کہاں ہے اور کہاں سے آرہا ہے

---

[1] عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تصروا الابل والغنم فمن ابتاعھا فھو بخیر النظرین بعد ان یحلبھا ان اضیھا امسکھا وان سخطھا ردھا (بخاری و مسلم، المنتقی ج ۲ ص ۳۵۱)

[2] اذا اغر احد المتبایعین الاخر وتحقق ان فی البیع غبنا فاحشا فللمغبون ان یفسخ البیع حینئذ۔ المجلہ ص ۵۲

[3] عن ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن بیع الکالی بالکالی وھو ان یبیع الدین بالدین۔ (المنتقی ج ۲ ص ۳۲۲) ج ۳ حضور نے فرمایا ہے لا تبع ما لیس عندک ایضاً۔

اپنی جیب سے ایک پیسہ خرچ کیے اور مال کے موجود ہوتے بغیر ہزاروں روپے کا فائدہ یا لاکھوں روپے کا نقصان اٹھاتے ہیں، اور اس فائدہ اور نقصان دونوں کا اثر عام خریداروں کی جیب پر پڑتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ ایک ادھار معاملہ پر دوسرا ادھار معاملہ کرنا جائز نہیں ہے، مثلاً کسی نے ایک مکان خریدا، اور قیمت ادھار لگادی، پھر کچھ دن کے بعد اس نے فروخت کرنے والے یعنی بائع سے کہا کہ اس مکان کی اگر تم اتنی قیمت دے دو تو پھر تم کو واپس کر دوں، یا اتنا روپے لے کر اپنا مکان یا جانور واپس لے لو، تو یہ دونوں صورتیں ناجائز ہیں، یا کوئی مال امریکہ یا روس سے چلا ہے، اور ابھی وہ راستہ ہی میں ہے کہ مال کے ایجنٹوں سے بمبئی یا کلکتہ کا ایک تاجر معاملہ طے کر لیتا ہے، اور پھر وہ تاجر کسی دوسرے تاجر سے کچھ منافعہ لے کر پھر وہ مال بیچ دیتا ہے، آخری خریدنے والے کو کبھی نقصان بھی ہوتا ہے، اور زیادہ تر فائدہ ہوتا ہے مگر اس الٹ پھیر کی وجہ سے وہ چیز جو یہاں دو روپے میں بکتی وہ پانچ روپے میں یقیناً بکتی ہے۔

بیچ سے فائدہ اُچک لینا

کاروبار میں کچھ بیچ کے لوگ بھی ہوتے ہیں، جو بائع اور خریدار کے درمیان واسطہ بن کر اس فائدہ کو جو بائع اور خریدار کو ہوتا خود اچک لیتے ہیں، مثلاً دلال یا وہ تاجر جو بازار میں مال کو آنے سے پہلے ہی مال خرید کر ذخیرہ کرتے ہیں، اور بازار میں براہِ راست مال آنے کی صورت میں جو فائدہ صارفین یعنی عام خریداروں کو ہوتا، وہ مار لیتے ہیں، اسلامی شریعت نے ایسے تمام لوگوں کو انتہائی ناپسند کیا ہے جو واسطہ بن کر فائدہ اچک لیتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ:

نهى النبى صلى الله عليه وسلم ان يتلقى الجلب فان تلقاه انسان فابتاعه فصاحب السلعة فيها بالخيار۔ (المنتقى ص۳۲۵)	آپ نے منع فرمایا بیچ سے فائدہ اُچک لینے سے، اگر کوئی ایسا کرے تو بیچنے والے کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنا مال واپس لے لے۔

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ نے خرید و فروخت کو اچک لینے سے منع فرمایا:

نھی عن تلقی البیوع ایک اور دوسری روایت میں اور زیادہ واضح الفاظ ہیں:

نھی عن تلقی السلع حتی تھبط الاسواق۔ (بخاری ومسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص۲۴۸)	مال کو بازار میں آجانے سے پہلے بیچ سے اچک لینے سے آپؐ نے منع فرمایا ہے۔

اسی طرح آپؐ نے شہری دلالوں کو دیہاتیوں کے مال خریدنے سے منع فرمایا ہے، کسی چیز کے بازار میں آنے سے پہلے جتنے زیادہ واسطے ہوں گے، وہ چیز اتنی ہی زیادہ گراں ہوگی، کیونکہ جتنے ہاتھوں میں سامان جائے گا، وہ سب کے سب کچھ نہ کچھ کمانے کی فکر میں رہیں گے، اس طرح وہ بازار میں آتے آتے کافی گراں ہو جاتا ہے، اور عام خریداروں کو جو چیز ایک دو واسطوں سے ایک روپیہ میں ملتی، اب ان کو ایک روپے چار آنے میں ملے گی۔

اس خرابی کو دور کرنے کے لئے اسلامی شریعت نے ان تمام لوگوں پر پابندی عائد کی ہے، جن کے بیچ میں آجانے کی وجہ سے یا جس طریقۂ تجارت سے عام خریداروں کو مال گراں پڑتا ہے، کیونکہ ان صورتوں میں دو چار آدمیوں کو تو ضرور فائدہ ہوتا ہے، مگر ہزاروں غریب اور متوسط الحال آدمیوں کی جیب سے لاکھوں روپے نکل جاتے ہیں۔

اس طریقۂ بیع یعنی بیچ سے فائدہ اچک لینے کے بارے میں ائمہ فقہ میں تھوڑا سا اختلاف ہے، عام ائمہ فقہ وحدیث تو اس کو بالکل ناجائز قرار دیتے ہیں، یعنی یہ معاملہ کالعدم ہوگا، مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، کہ یہ طریقۂ بیع عام حالت میں تو ناجائز نہیں ہے، لیکن جب عوام اس کی وجہ سے دقّت میں پڑ جائیں، اور سامان گراں ہو جائے تو پھر یہ ناجائز ہے عام حالت میں بھی، اگر بنیئے دیہاتیوں کے مال کو سستے داموں پر یہ کہہ کر خرید لیں کہ شہر میں اس کا بھاؤ یہی ہے، اور وہ بھاؤ نہ ہو تو یہ امام صاحب کے نزدیک بھی ناجائز ہے، غرض یہ کہ عام ائمہ اس طریقۂ بیع کو مطلقاً اس لئے ناجائز قرار دیتے ہیں کہ اس طریقۂ بیع میں عموماً دھوکہ ہوتا ہے، اور یہ بھی ایک طرح کا دھوکہ ہے، جو گرانی کا سبب بنتا ہے، اور امام صاحب اس کو اس وقت ناجائز قرار دیتے ہیں، جب واقعۃً یہ طریقۂ بیع نقصان کا سبب ہو رہا ہو، گویا نقصان اور گرانی کی صورت میں سب ہی اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں، لیکن حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس طریقۂ بیع کو مطلقاً ہی ناجائز ہونا چاہیئے، جیسا کہ عام ائمہ کا مسلک ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے حکیمانہ الفاظ ملاحظہ ہوں"۔ شہری دیہاتی کی خرید و فروخت کا واسطہ نہ بنے لوگوں کو چھوڑ دو وہ خود اپنا معاملہ کریں، اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے ذریعہ بعض لوگوں کو روزی دیتا ہے[1] یعنی اگر وہ خود بیچے گا، تو صرف ایک ہی واسطہ ہوگا، اس لئے یہ مال اس صورت کے مقابلے میں خریداروں کو زیادہ سستا ملے گا، جس میں کئی واسطے ہو جائیں۔

بیع کی چند اور ناجائز صورتیں

(۱) اگر کسی نے بیع میں یہ شرط لگائی کہ اگر تم اپنا مکان میرے ہاتھ بیچ دو، تو میں تمہارے ہاتھ اپنا فلاں کھیت بیچ دوں، تو یہ شرط لگا دینے کی وجہ سے یہ معاملہ ناجائز ہو جائے گا، اس کو حدیث میں ایک بیع کے اندر دوسری بیع کہا گیا ہے۔

(۲) اسی طرح کسی نے اپنا کھیت یا مکان یا کوئی جانور بیچا، اور یہ شرط لگا دی کہ میں اس کھیت میں ایک فصل بولوں گا، تب اس کو تمہارے حوالہ کروں گا، یا مکان میں ایک مہینہ رہ کر چھوڑوں گا، یا جانور کو چار مہینے استعمال کرنے کے بعد دوں گا تو ان تمام صورتوں میں بیع فاسد اور ناجائز ہوگی، اسی طرح کپڑا کسی دوکاندار سے اس شرط پر خریدا کہ اس کو کاٹ سی کر مجھے دو، یا تھوڑا سا غلہ یا پھل خریدا اور یہ شرط لگا دی کہ اس کو ہمارے گھر تک پہونچا دو تو اس شرط کی وجہ سے یہ بیع ناجائز ہوگی، یا کسی نے ایک بھینس یا گائے خریدنا چاہا، اور یہ شرط لگا دی کہ یہ چار سیر دودھ دے گی تو لوں گا، یا بائع نے کہا کہ یہ چار سیر دودھ ضرور دے گی، تو یہ بیع فاسد ہے، کیونکہ جانوروں کا دودھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، ہو سکتا ہے کہ آج وہ چار سیر دودھ دے گی، مگر کل کم دے گی تو اس سے بدمزگی ہوگی، البتہ اگر یہ کہہ دیا کہ گائے دودھاری ہے تو کوئی حرج نہیں ہے، اگر کسی نے بیع میں کوئی زائد شرط لگا دی تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، مثلاً کسی نے مکان بیچتے وقت کہا کہ اس میں پاخانہ نہ بنایا جائے، یا جانور بیچتے وقت کہا کہ اس کو کسی کے ہاتھ فروخت نہ کیجئے گا، تو شرط فضول ہے، مگر بیع میں اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، بیع تمام ہو جائے گی، اور اس شرط پر کوئی دھیان نہیں دیا جائے گا[2]

---

[1] مسلم بحوالہ مشکوٰۃ، ج ۱ ص ۲۴۷۔ لا یبیع حاضر لباد۔

[2] وکذالک لو باع دارًا علیٰ ان یسکنہا او علیٰ ان یقرضہ المشتری درھمًا فالبیع فاسد۔ (ہدایہ ج ۳ صفحہ ۴۴)

شرط کا قاعدہ کلیہ بیع میں شرط لگانے کا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ایسی شرط جو نفس معاملہ سے متعلق ہو اور اس سے کوئی مزید مالی منفعت حاصل کی جا رہی ہو، تو وہ ناجائز ہے، اور اس سے بیع باطل ہو جائے گی، اور جو شرط نفس معاملہ سے متعلق نہ ہو، بلکہ زائد ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں، اگر اس کا تعلق یک طرفہ مالی منفعت سے ہے تو معاملہ فاسد ہوگا، اور اگر اس کا تعلق مالی معاملات سے نہ ہو تو شرط لغو ہو گی اور معاملہ صحیح ہوگا، مثلاً نکاح وغیرہ میں کوئی قید لگائی تو اس کا حکم یہی ہے، حاشیہ[1] میں مزید تفصیل ہے۔

---

[1] جن معاملات میں دو آدمی شامل ہوتے ہیں، خواہ وہ خرید و فروخت ہو یا عقد نکاح ہو یا شرکت و مضاربت ہو، اس میں دونوں فریق اگر کوئی شرط لگاتے ہیں، تو وہ شرط اگر اسلامی شریعت سے ٹکراتی نہیں ہے، تو وہ شرعاً قابلِ قبول ہے، حدیث میں ہے "المسلمون علی شروطھم" مسلمان اپنی شرط کے پابند ہیں لیکن اگر وہ شرط کسی شرعی حکم سے ٹکراتی ہے یا اس کے ذریعہ کوئی زائد مالی منفعت جو اصل معاملہ سے متعلق نہیں ہے حاصل کی جائے تو فقہاء نے اسے ناجائز قرار دیا ہے" کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل" کتاب اللہ سے مراد احکامِ شریعت ہیں "نھی عن بیع شرط" والی ضعیف حدیث کو بھی اس روشنی میں دیکھنا چاہیے مثلاً یہ شرط کہ مال پہونچانے کی ذمہ داری بائع پر ہوگی یا دونوں فریق میں کوئی کسی کو اتنا قرض دے، تو معاملہ مکمل سمجھا جائیگا صحیح نہیں ہے، البتہ اگر یہ شرط غیر مالی معاملات سے متعلق ہو، مثلاً نکاح وغیرہ میں کوئی زائد شرط لگا دی جائے تو شرط بے کار ہو جائے گی اور اصلی معاملہ صحیح سمجھا جائے گا، مگر فقہائے احناف تین طرح کی شرطوں کو خواہ وہ نفس معاملہ سے متعلق ہو، اس سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔

۱۔ وہ شرط جس کی شریعت نے اجازت دی ہے، مثلاً قیمت تاخیر سے ادا کرنا، دونوں میں سے کسی کو خیار شرط دینا، اور اسی پر خیار نقد و تعین کو قیاس کیا گیا ہے۔ گو یہ شرط نفس معاملہ میں ہے، مگر شریعت کی اجازت کی وجہ سے صحیح ہے۔

۲۔ وہ شرط جو اصل معاملہ کے مناسب ہو، مثلاً کسی نے کوئی چیز بیچی اور قیمت ادھار طے ہوئی، مگر بائع نے یہ شرط لگا دی کہ مشتری قیمت کی ادائیگی تک یا تو کوئی چیز رہن رکھ دے یا یہ کہ کوئی ضامن دے، چنانچہ فقہائے احناف کہتے ہیں کہ اگر یہ شرط طے ہو گئی تو قضائے قاضی سے مشتری کو مجبور کیا جائے گا (بقیہ ص پر)

(۳) کسی نے خریدار سے کوئی چیز خریدنے کی خواہش ظاہر کی، اور بائع سے یہ کہا کہ اگر تم ہم کو کچھ روپے قرض دے دو، یا فلاں چیز کو ان کے لئے عاریۃً دے دو تو میں یہ چیز تمہارے ہاتھ بیچ دوں گا، تو یہ بیع فاسد ہوگی، یا کسی نے کسی سے قرض لینے کی ضرورت ظاہر کی، قرض دینے والا قرض

(بقیہ حاشیہ صـ)

اس لئے کہ بائع نے قیمت کی حفاظت کے لئے یہ شرط لگائی ہے اور اس کے مناسب ہے۔

۲۔ وہ شرط جو عرف عام میں خرید و فروخت کے معاملات میں لگائی جاتی ہو، مثلاً ایک سال کی گارنٹی پر بعض چیزیں فروخت ہوتی ہیں، اوپر فقہائے احناف اور دوسرے فقہاء نے جو اصول بیان کئے ہیں مگر عرف عام کی بنا پر یا تراضی طرفین کی بنا پر کسی ایک فریق کا نقصان یا ایک فریق کی منفعت اس میں نہیں پائی جاتی، اس لئے فقہاء نے اسلامی قانون کے مزاج کے مطابق انھیں صحیح قرار دیا ہے، امام ابن تیمیہ نے بہت صحیح لکھا ہے:

ان العقود انما وجب الوفاء بها لایجاب الشارع الوفاء بها مطلقا الا ما خصه الدلیل والاصل فی العقود رضی المتعاقدین و نتیجتها هو ما اوجباه علی انفسهما بالتعاقد (قاعدۃ العقود)

دو آدمی کے درمیان جو معاہدے اور معاملات طے ہوتے ہیں، ان کا پورا کرنا شرعاً اسلئے ضروری ہے کہ جبتک اس کے عدم ایفاء کے لئے کوئی خصوصی دلیل نہ قائم کی ہو، مطلق طور پر اس کا پورا کرنا ضروری ہے، اور عقود میں اصل چیز دونوں کی فریق کی رضامندی ہے، اور اس کا حاصل یہ ہے کہ آپس کے معاملات میں جو شرط دونوں طے کرلیں وہ ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بہت وسیع ہے، ان کے مسلک کی روشنی میں موجودہ دور کے معاملات میں جتنی شرطیں رواج پذیر ہیں، قریب قریب سب جائز ہیں، بشرطیکہ وہ کسی نص شرعی سے صراحۃً نہ ٹکراتی ہو، امام ابن تیمیہ قاعدۃ العقود میں کہتے ہیں:

لیس فی فقهاء الاربعة اکثر تصحیحاً للشروط من احمد۔	فقہاء اربعہ میں امام احمد بن حنبلؒ سے زیادہ شرطوں کو صحیح قرار دینے والا کوئی دوسرا نہیں۔

یہ موقع تفصیل کا نہیں ہے، اس لئے اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

دینے پر راضی تو ہوگیا، مگر یہ شرط لگائی کہ اگر تم میری فلاں چیز خرید لو، یا مجھے اپنی فلاں چیز بیچ دو تو میں تم کو قرض دے سکتا ہوں تو یہ بیع باطل ہوگی، کیونکہ قرض دے کر اس سے کوئی فائدہ حاصل کرنا حرام ہے[1]۔

(۴) اگر کوئی شخص پورا مکان بیچے یا باغ کے پھل فروخت کرے، اور یہ شرط لگا دے کہ ایک کمرہ میں نہیں دوں گا، یا فلاں درخت کا پھل میں خود کھاؤں گا، تو یہ جائز ہے، لیکن اگر اس نے اس کو متعین نہیں کیا اور یہ کہا کہ اس میں سے کچھ پھل یا پانچ سو پھل ہم لیں گے، یا کوئی کمرہ اس میں ہمارا ہوگا، تو یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں اختلاف ہو سکتا ہے، البتہ اگر پھل کی تعداد بتا کر آم کے درخت کی یا آم کی قسم کی تعیین کر دی تو جائز ہے، غرض یہ کہ کوئی بات مجہول یعنی چھپی نہ رہ جائے۔

(۵) **تصویر** ہر طرح کے جاندار کی تصویر بنانا اور اس کا بیچنا حرام ہے، حتیٰ کہ لڑکوں کے کھلونے جو تصویر کی شکل میں ہوتے ہیں، حرام ہیں، اگر ان چیزوں کو کوئی توڑ دے یا خراب کر دے، تو خراب کرنے والے سے کوئی تاوان نہیں لیا جائے گا، کیونکہ اسلامی شریعت میں یہ مال ہی نہیں ہیں، اس کا خراب کرنا اور راستہ کی مٹی کو اِدھر اُدھر کرنا دونوں برابر ہے، اپنے مال کو بیچنے کے لئے عورتوں کی تصویر بنا کر جو رغبت دلائی جاتی ہے، یہ بھی حرام ہے، بلکہ اس میں دوہرا تہرا گناہ ہے، ایک تصویر بنوانے کا، دوسرے عورت کی ذات کو ترغیب کا ذریعہ بنانے کا، تیسرے غلط ترغیب دے کر مال کے بیچنے کا۔

جن چیزوں سے جرائم کی ترغیب ہوتی ہے (۶) اسی طرح جن چیزوں سے کسی جرم یا گناہ کی ترغیب ہوتی ہو ان کا بیچنا اور خریدنا سب حرام ہے، مثلاً کسی سامان سے یا سامان پر بنی ہوئی تصویر سے یا اشتہار سے، زنا کی، سود لینے کی، شراب پینے کی، چوری یا ڈاکے یا کسی اور جرم کی ترغیب ہوتی ہو، ان کی خرید و فروخت اور اشاعت دونوں حرام ہے، سینما کا موجودہ کاروبار، غیر تمدّنی، فلم سازی، عریاں تصویریں،

---

[1] ہدایہ، ج ۳ ص ۴۴۔

فحش گانے اور فحش ناولیں یہ سب حرام ہیں۔

بیع عِینہ

(۷) ایک شخص نے کوئی چیز خریدی، مگر قیمت ابھی ادا نہیں کی ہے کہ پھر بائع نے کہا کہ کچھ قیمت کم لے کر مجھے فروخت کر دو، تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلا معاملہ تو درست ہے، لیکن دوسرا درست نہیں ہے، یعنی یہ بیع فاسد ہے، اور امام مالکؒ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دونوں معاملے باطل ہیں، اس کو شریعت میں بیع عینہ کہتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت فرمائی ہے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پہلے معاملہ کو اس لئے درست فرماتے ہیں کہ وہ بیع نسیہ ہے، بیع عینہ نہیں ہے، وہ بیع عینہ کی تعریف میں دوسرے معاملہ کی وجہ سے داخل ہوا ہے، اس لئے اصل میں دوسرا معاملہ ہی بیع عینہ ہے، پہلا اپنی جگہ پر باقی رہے گا[1]

دام پر دام لگانا

اسی طرح کسی خریدار نے ایک چیز کا دام لگایا، اور بائع تیار بھی ہو گیا، اسی درمیان میں ایک دوسرا شخص آکر مال کی قیمت اس لئے بڑھا دیتا ہے کہ خریدار نہ خرید سکے، یا وہ خود اس کو خرید لے، یا وہ زیادہ قیمت دے کر خریدے، اسی طرح ایک بائع یعنی دوکاندار نے کسی چیز کی قیمت بتائی اور خریدار بالکل لینے کے لئے تیار تھا کہ ایک دوکاندار سی چیز کا نمونہ دکھا کر کہتا ہے کہ میں اس سے کم دام پر دے سکتا ہوں، اب وہ خریدار بدک جاتا ہے،

---

[1] آپؐ نے فرمایا اذا ضنّ الناس بالدینار والدراھم وتبایعوا بالعینة واتبعوا اذناب البقر وترکوا الجھاد فی سبیل اللہ انزل اللہ بھم بلاء فلا یرفعہ حتی یراجعوا دینھم۔ المنتقی ج ۲ ص ۳۴۸

امام ابن قیمؒ نے تہذیب السنن میں بیع عینہ میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، آخر میں لکھا ہے کہ یہ ناجائز ہے، پھر لکھا ہے کہ وانھا من مخادعة اللہ تعالیٰ واتخاذ دینہ ھزواً ولعباً۔ حاشیہ المنتقی ج ۲ ص ۳۴۹۔

کفایہ میں ہے کہ اختراعہ اکلة الربا۔ امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۸۷

عینہ بکسر السین فعلة من العین وھو النقد۔ یعنی عینہ سین کے کسرہ کے ساتھ نقد کا نام ہے۔

شیخ رافعی نے عینہ کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ وبیع العینة ھو ان یبیع شیئاً من غیرہ بثمن موجل ویسلم الی المشتری ثم یشتریہ من قبل قبض الثمن بثمن نقدا اقل۔ حاشیہ المنتقی ج ۲ ص ۳۴۹۔

یہ تمام صورتیں ناپسندیدہ یعنی مکروہ ہیں، اگر اس طریقہ پر خرید و فروخت کا معاملہ کر لیا جائے، تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ بیع باطل ہوگی، اور دوسرے ائمہ کہتے ہیں کہ بیع کالعدم تو نہیں قرار دی جائے گی، مگر یہ بیع مکروہ ہوگی، اس کو حدیث میں نجش بھی کہا گیا ہے، نجش کے معنی کریدنا اور نفرت دلانا۔

بیعانہ یا ایڈوانس کسی چیز کے خریدنے کے لئے خریدار نے کچھ رقم، دوکاندار کے اطمینان کے لئے پیشگی دی، اور دوکاندار نے یہ شرط لگائی کہ اگر آپ یہ چیز نہ لے جائیں تو میں یہ رقم بھی واپس نہ کروں گا، تو یہ باطل ہےلہ، مثلاً کسی نے موچی سے کہا کہ ایک جوڑا جوتہ تیار کر دو، موچی نے کہا کہ کچھ بیعانہ دے دیجئے، اگر آپ نے جوتہ نہ لیا تو بیعانہ واپس نہیں ہوگا تو اس کو یہ شرط لگانے کا حق نہیں ہے، البتہ اگر بغیر شرط کے پیشگی یا بیعانہ لے لے، تو پھر کوئی حرج نہیں ہے، مگر سودا لینے کی صورت میں وہ بیعانہ ہڑپ نہیں کر سکتا اس کو "بیع عربون" کہتے ہیں۔

لہ یہی مسلک امام شافعی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کا ہے، مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابن سیرین وغیرہ اس کو جائز کہتے ہیں، اس سلسلہ میں وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور قاضی شریح کے فیصلے کو نقل کرتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عامل نافع نے حضرت عمرؓ کی خلافت میں سرکاری ضرورت کے لئے ایک قیدخانہ کی جگہ صفوان بن امیہ سے اس شرط پر خریدی کہ اگر حضرت عمرؓ راضی نہ ہوں گے، تو اتنی رقم ہم آپ کو دیں گے، حضرت عمرؓ نے اس شرط کو منظور کر لیا، ہدایۃ المجتہد، ج ۲ ص ۱۳۵۔ امام ابن قیم نے امام بخاری کی اس روایت کی بنا پر اسی کو ترجیح دی ہے، وہ روایت یہ ہے کہ ایک شخص نے جانور کرایہ پر دینے والے شخص سے کہا کہ میرے لئے تم یہ سواری تیار کر دو، میں اگر تمہارے ساتھ فلاں دن نہ جا سکوں گا تو تمہیں سو درہم ادا کروں گا، مگر وہ نہ جا سکا، یہ معاملہ قاضی شریح کے یہاں گیا تو انھوں نے یہ فیصلہ دیا: من شرط علی نفسہ طایعا غیر مکرہ فھو علیہ، جس نے خوشی سے کوئی شرط قبول کر لی وہ شرط جائز ہے، اور اس کو پورا کرنا اس پر ضروری ہے، ان آثار کی بنا پر امام احمدؒ ایڈوانس کی رقم کو ضبط کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ (اعلام الموقعین ج ۳ ص ۳۳۹)

دام کے دام یا نفع لے کر بیچنا

کسی چیز کو اگر دام کے دام بیچ دیا گیا تو اس کو شریعت میں بیع تولیہ کہتے ہیں، اور اگر نفع لے کر بیچا جائے تو بیع مُرابحہ کہتے ہیں، نفع لینے پر اسلامی شریعت نے کوئی پابندی نہیں لگائی ہے، مگر بازار کے بھاؤ سے زیادہ بھاؤ پر بیچنا برا ہے، اور بعض ائمہ کے نزدیک ایسے شخص کو بازار میں کسی چیز کے فروخت کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے شخص کو بازار سے اٹھا دیا کرتے تھے، اس سلسلہ میں چند مسائل ذہن میں رہنے چاہئیں:

(۱) تاجر کے اوپر اپنی خرید کا دام بتانا ضروری نہیں ہے، لیکن اگر کوئی تاجر یہ کہہ دے کہ اس مال کو میں نے اتنے میں خریدا ہے، اور ایک آنہ فی روپیہ نفع لے کر، آپ کو دیدیتا ہوں تو اس کو اس سے زیادہ لینے کا حق نہیں ہے، اگر خریدار کو معلوم ہو جائے کہ اس نے دھوکہ دیا، تو اس کو واپس کر دینے کا اختیار ہے، لیکن اگر خریدار اسی چیز کو دام کم کرا کے اب لینا چاہے تو اس صورت میں امام صاحب کی رائے ہے کہ یہ جائز نہیں ہے، مگر ان کے شاگرد امام ابو یوسف اس کو اس کی اجازت دیتے ہیں، اور امام محمد نے خریدار کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے، یعنی وہ چاہے تو واپس کر دے، اور چاہے تو دام کم کرا کے خرید لے۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۵۵)

(۲) یہ تو اس صورت میں ہے، جب اس نے یہ کہا کہ میں نفع لے کر بیچتا ہوں، لیکن اگر اس نے کہا کہ میں دام کے دام یہ چیز دیتا ہوں تو پھر اس نے دھوکہ دیا، اس صورت میں خریدار کو قیمت کم کرانے کا حق سب کے یہاں ہے۔

(۳) جو مصارف مال کے منگانے میں پڑتے ہیں، مثلاً چنگی، ریل کا خرچ وغیرہ تو ایسے مال میں جب نفع لے کر بیچے تو بائع یہ نہ کہے کہ میں نے اتنے میں خریدا ہے، بلکہ یہ کہے کہ یہ چیز اتنے میں پڑی ہے، تاکہ جھوٹ نہ ہو، اسی طرح اگر کسی چیز کے خریدنے کے بعد اس دوکاندار نے کچھ خرچ کیا ہے تو اس کو یہ حق ہے کہ یہ خرچ بھی اصل قیمت میں شامل کر دے، مثلاً کسی سے رنگ لیا اور اس کی پڑیا بنوائی، یا پیک کرائی، کاغذ لیا اور کاپی بنوائی، کتاب لی اور جلد بنوائی تو اس کو پیکنگ کا، کاپی کی بنوائی کا اور جلد سازی کا خرچ اصل قیمت کے ساتھ لینے کا حق ہے، مگر یہ نہ کہے کہ میں نے اتنے میں خریدا ہے، بلکہ یہ کہے کہ یہ اتنے میں پڑی ہے، ورنہ یہ جھوٹ ہوگا، اور جھوٹ بول کر اپنا

مال بیچنا مکروہ ہے۔ (ہدایہ ج ۳ ص۵۵)

بیع تلجئہ

بیع تلجئہ یہ ہے کہ آدمی کسی دشمن یا حاکم کے خوف سے کسی آدمی سے کہے کہ میں ظاہری طور پر فلاں چیز آپ کے ہاتھ بیچ دی ہے، تو یہ بیع لغو سمجھی جائے گی، گویا اس نے اپنی چیز کی حفاظت کے لئے ایسا کیا ہے، وہ حقیقی بیع نہیں ہے۔ اگر اس نے کوئی تحریر لکھ دی ہے یا رجسٹری کر دی ہے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں وہ چیز دینے والے ہی کی رہے گی۔

بیع کی بعض اور جائز یا ناجائز صورتیں

(۱) مال کے بیچنے کے لئے کمیشن پر یا اجرت پر ایجنٹ مقرر کئے جا سکتے ہیں، ان سے ضمانت بھی لی جا سکتی ہے، مگر ضمانت میں یہ شرط نہ ہو کہ اگر تم نے اتنا مال نہ فروخت کیا یا اتنے دن کام نہ کیا تو یہ ضمانت ضبط ہو جائے گی، ضمانت کا روپیہ صرف اس صورت میں لیا جا سکتا ہے، جب وہ ہدایت کے خلاف عمل کرے اور نقصان ہو جائے، یا وہ کوئی مال یا چیز لے کر غائب ہو جائے۔

(۲) کسی نے ایجنٹ کو ایک مال دیا، اور حکم دیا کہ اس کو ۱۰ روپئے درجن یا ۱۰ روپئے من کے حساب سے بیچو، اس نے دو درجن والی چیز کو ۱۲ روپے میں، چالیس من کی چیز کو چالیس میں بیچ دیا، تو یہ دو یا چار روپے ایجنٹ کے نہیں، مالک کے ہوں گے، ایجنٹ وہ نہیں لے سکتا، البتہ اگر مالک اپنی خوشی سے اس کو دے دے تو جائز ہے،

(۳) باغ کا پھل جس وقت بیچا جائے، خریدار کو اسی وقت توڑ لینا چاہیئے، اور بائع اس کو اس پر مجبور کر سکتا ہے، مگر ہندوستان اور پاکستان میں عام طور پر پھل پکنے تک درخت ہی پر رہتا ہے، اور بائع کی طرف سے اس کی اجازت بھی ہوتی ہے، اس لئے یہاں توڑنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ اس کا تعلق بائع کی رضامندی سے ہے، اور وہ یہاں موجود ہے لیکن اگر کوئی بائع راضی نہ ہو تو پھر وہ توڑنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ (امداد الفتاویٰ)

(۴) کسی چیز کو نیلام کر کے بیچنا جائز ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کا ایک پیالہ اور کمبل نیلام فرمایا تھا۔

(۵) ہنڈی وغیرہ میں بٹہ کاٹنا جائز نہیں ہے اس کا ذکر حوالہ میں آئے گا۔

(۶) ریلوے کی طرف سے اسٹیشن سے مال اٹھا لے جانے کی ایک مدت مقرر ہوتی ہے، اگر اس وقت تک کوئی مال نہ اٹھا لے جائے، تو اس کو فروخت کر کے قیمت ریلوے خود لے لیتی ہے

اس کو لینے کا حق نہیں ہے، وہ قیمت مال والے کو ملنی چاہیئے۔ (امداد الفتاویٰ)

(۷) اگر کوئی یہ اشتہار دے کہ جو لوگ اتنی قیمت یا چندہ بھیج دیں گے، ان کو یہ کتاب یا رسالہ یا یہ مال اتنے روپے میں ملے گا، اور اس کے بعد اس کی قیمت بڑھ جائے گی، تو یہ جائز ہے۔

(۸) لیکن یہ طریقہ ناجائز ہے کہ جو اتنا روپیہ بطور چندہ یا بطور مدد دے، یا اتنی ممبری فیس ادا کرے، اس کو زندگی بھر ادارہ کا رسالہ اور اس کی مطبوعات دی جائیں گی، یہ بیع کئی وجوہ سے ناجائز ہے، یہ بیع مُعاومہ یعنی مستقبل کا سودا ہے، اس کے ناجائز ہونے کی تفصیل اوپر آچکی ہے، دوسرے پوری بیع ابھی وجود میں نہیں آئی ہے، اس لئے یہ بیع الحبلہ میں بھی داخل ہے، اس کا ذکر بھی اوپر آچکا ہے، پھر یہ رعایت اور فائدہ اتفاق پر مبنی ہے، اس حیثیت سے یہ ایک طرح کا جوا ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ ادارہ آیندہ چلے یا نہ چلے ایسی صورت میں کسی کو زندگی بھر کسی رعایت کے دینے کا لالچ دے کر روپیہ وصول کرنا ایک طرح کا دھوکہ ہے۔

(۹) بانڈ وغیرہ کا نفع یا سود بھی حرام ہے۔

(۱۰) بیع فاسد بھی سود کی ایک قسم ہے، اس لئے نتیجہ کے اعتبار سے بیع باطل اور فاسد دونوں حرام ہیں۔ (امداد الفتاویٰ ج ۳)

(۱۱) مشتری کے اوپر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بائع سے جو چیز خرید رہا ہے اس سے یہ دریافت کرے کہ تم نے یہ چیز حرام ذریعہ سے کمائی ہے، یا حلال ذریعہ سے حاصل کی ہے، لیکن اگر یہ معلوم ہو کہ وہ عموماً ایسی چیزیں بیچتا ہے جو چوری کی ہوتی ہیں، یا دھوکہ فریب وغیرہ سے حاصل کی جاتی ہیں، تو پھر احتیاطاً دریافت کر لینا چاہیئے، اور اس کی خریداری سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیئے، مگر ایسا کرنا ضروری نہیں ہے۔

(۱۲) اگر کسی کو ایسا مال وراثت میں یا ہدیہ میں ملے، جس کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ حرام طریقہ سے حاصل کیا گیا ہے، یا فلاں کا حق دبا کر لیا گیا ہے، تو یہ مال جس کا ہے، اس کو واپس کر دینا چاہیئے، اور اگر وہ نہ ملے تو پھر صدقہ کر دینا چاہیئے، مثلاً کسی کے باپ نے کسی کی زمین دبالی ہے، یا اس نے رشوت سے یا چوری کے ذریعہ سے مال کمایا ہے، اور وہ مال یا زمین آپ کو وراثت میں ملتی ہے، تو آپ کو چاہیئے کہ اگر حقدار مل جائے، تو فوراً اسے اس کا حق واپس

کردیں، اگر نہ ملے تو صدقہ کردیں، اگر مورث نے سود، جوا، زنا، گالے، بجانے یا کسی حرام ذریعہ سے یہ روپیہ حاصل کیا ہے، تو بہتر یہی ہے کہ اس روپے کو وہ اپنے اوپر صرف نہ کرے، بلکہ صدقہ کردے، لیکن اگر استعمال کرلے، تو حکومت اس کو کوئی سزا نہ دے، مگر دیانۃً وہ گنہگار ضرور ہوگا، حکومت سزا اس لئے نہیں دے گی کہ حرام طریقہ سے روپیہ کمانے کا جرم اس نے خود نہیں کیا ہے، اور دیانۃً اس لئے وہ گنہ گار ہوگا کہ حرام چیز اس نے رغبت سے کھائی، خواہ دوسرے ہی کی پیدا کردہ کیوں نہ ہو، البتہ اگر وہ بالکل معذور ہے، یا بہت زیادہ تنگدست ہے، تو بقدر کفاف کھانے میں گناہ نہیں ہوگا۔

(۱۳) ناپاکی بھی عیب میں داخل ہے، یعنی اگر کسی نے ناپاک چیز بیچ دی، اور مشتری کو علم ہو، تو وہ اس کو واپس کرسکتا ہے۔

(۱۴) تیل یا گھی وغیرہ ناپاک ہو جائے، تو اس کا بیچنا جائز ہے، اس لئے کہ اگر وہ کھانے کے کام میں نہیں آئے گا، تو دوسرے کام میں آجائے گا، مگر خریدار کو بتا دینا ضروری ہے، تاکہ وہ اسے کھانے میں استعمال نہ کرے۔

(۱۵) عورت کا دودھ بیچنا ناجائز ہے، مگر علاج و معالجہ کے لئے جائز ہے۔

(۱۶) اگر کسی نے کوئی جانور اس شرط پر دیا کہ کھلانے، پلانے اور چرانے کے بعد جب بچے ہونگے تو دونوں بانٹ لیں گے، اسے دیہات میں ادھیا کہتے ہیں، یہ ناجائز ہے، جو بچے ہوں گے، وہ مالک کے ہوں گے، چرانے والے کو کھلانے پلانے اور چرواہی کی اجرت ملے گی۔

اسی طرح کسی نے کہا کہ ہماری زمین میں درخت لگاؤ پھل اور درخت یا صرف درخت یا پھل میں دونوں آدھا آدھا لیں گے، تو یہ بھی ناجائز ہے، لگانے والے کو صرف پودے کی اور محنت کی اجرت ملے گی، درخت اور پھل میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

لیکن اگر اس نے لگے ہوئے باغ کے بارے میں کہا کہ اس باغ کے پھل کی نگرانی کرو، جو پھل ہوگا، وہ دونوں لے لیں گے، تو یہ جائز ہے، اس کا بیان مزارعت میں آئے گا۔

(۱۷) جو کھلونے کسی جاندار کی صورت میں بنائے جاتے ہیں، ان کا بنانا، بیچنا، خریدنا سب حرام ہے اگر یہ چیزیں کوئی توڑ دے تو اس سے کوئی تاوان نہیں لیا جائے گا دوسرے غیر جاندار چیزوں کے کھلونوں کا

بنانا، بیچنا، خریدنا جائز ہے۔

(۱۸) **کتّا کا پالنا** شوق و تفریح کے لئے کتا پالنا حرام ہے، البتہ اگر کھیتی، مکان یا جانور کی حفاظت یا شکار کے لئے پالا جاتے، تو جائز ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے، مگر حتی الامکان گھر کے اندر نہ جانے دینا چاہیئے، الا یہ کہ چوری کا خوف ہو تو کوئی حرج نہیں، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کی خرید و فروخت کی اجازت اس لئے دیتے ہیں کہ جب شریعت نے ضرورت کے وقت اس کے پالنے کی اجازت دی ہے، تو پھر اس کی خرید و فروخت نہ ہوگی، تو یہ مقصد کیسے پورا ہو سکتا ہے، مگر دوسرے ائمہ اُس حدیث کی روشنی میں اس کی خرید و فروخت کو فاسد کہتے ہیں، جس میں آپ نے کتّے کی قیمت کے کھانے سے منع فرمایا ہے[۱]۔

(۱۹) اگر خریدار نے مال کے خریدنے کے بعد واپس کیا تو اگر وہ ایسی چیز ہے، جس کی واپسی میں مزدوری خرچ ہوگی، تو یہ مزدوری خریدار کے ذمہ ہوگی۔

(۲۰) اگر کسی نے مرغ خریدا، جو ناوقت بولتا ہے، یا کوئی جانور خریدا وہ پاخانہ کھاتا ہے تو یہ بھی عیب ہے، وہ واپس کر سکتا ہے۔

(۲۱) اگر جانور دو تین دفعہ بھاگ جاتے تو عیب نہیں ہے، لیکن اگر برابر بھاگتا رہے، تو عیب ہے، مشتری واپس کر سکتا ہے۔

(۲۲) اگر کوئی ایسا مکان خریدا جسے لوگ منحوس کہتے ہیں، تو گو اسلام میں نحوست وغیرہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے، لیکن چونکہ اس شہرت کی وجہ سے اس میں کوئی کرایہ دار نہیں آتے گا، یا اس کو بیچنا چاہے تو قیمت گھٹ جائے گی، اس لئے وہ واپس کر سکتا ہے۔

ٹکٹ کا بیچنا آج کل جو یہ طریقہ رائج ہے کہ بعض صنعتی و تجارتی اداروں کی طرف سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جو اتنے ٹکٹ فروخت کر دے، اس کو ادارہ فلاں چیز بطور انعام دے گا، اس طریقہ سے جو چیز حاصل کی جاتی ہے، وہ ناجائز ہے، اس کے ناجائز ہونیکی بہت سی

---

[۱] والانتفاع بالکلب للحراث والاصطیاد جائز اجماعاً لکن لا ینبغی ان یتخذ فی دارہ الا ان خاف اللصوص۔ (البحر الرائق، ج صـ ۱۷۳)۔

وجہیں ہیں، ایک تو اس میں یہ شرط چھپی ہوتی ہے، کہ اتنے ٹکٹ نہ بکے تو روپیہ ضبط ہو جائے گا، گویا اس کی منفعت بخت و اتفاق پر مبنی ہے، اور یہ جوا ہے، اسی طرح اس میں یہ شرط لگانا کہ تم اتنے ٹکٹ بیچ کر دو، کر خریدار پیدا کر دو تو یہ شرط فاسد ہے، اور شرط فاسد کا حکم سود کا ہے،

راستہ میں مال کا نقصان

مال جب تک مشتری کو نہ مل جاتے، اس وقت تک مال کا جو نقصان ریل، جہاز یا راستہ میں ہوگا، اس کی ذمہ داری بائع پر ہوگی، مگر جب مال اس مقام پر جہاں مشتری نے منگایا ہے، یا اس مقام کے اسٹیشن پر پہنچ گیا، اور اس کی اطلاع مشتری کو ہوگئی، تو اگر اس نے جتنا مال منگایا تھا، وہ پورا تھا، تو اب بائع کی ذمہ داری ختم ہوگئی، یعنی اگر اسٹیشن پر اس کے پا جانے اور دیکھ لینے کے بعد چوری ہو جاتے، یا لوٹ جاتے، یا اسٹیشن سے دوکان تک لانے میں نقصان ہو جاتے، تو بائع پر اس کی ذمہ داری نہیں ہوگی، بلکہ اس کا نقصان مشتری کو برداشت کرنا ہوگا، کیونکہ جب اس نے اپنا مال دیکھ لیا، تو اب مال اس کے قبضے میں آگیا، اور قبضے میں آنے کے بعد بائع کی ذمہ داری ختم ہوگئی، اب بائع اور مشتری دونوں کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے مال کے نقصان ہونے کا تاوان ریلوے سے وصول کریں۔

ویڈیو اور ٹی وی

اوپر ذکر آچکا ہے کہ جو آلات ابتدائہً لہو ولعب کے لئے یا گانے بجانے کے لئے ہی بنائے گئے ہوں، مثلاً طبلہ، ستار، ہارمونیم وغیرہ یہ تو ناجائز ہیں، اور ان کی خرید و فروخت بھی ناجائز ہے، البتہ ٹیپ ریکارڈ، ریڈیو سے کام گانے بجانے کا لیا جاتا ہے، مگر فی نفسہٖ وہ اس کے لئے نہیں، البتہ ٹی وی اور ریڈیو کی ساخت اسلئے ہوتی ہے کہ لوگ تقریر کرنے والے کو یا گانے والے یا کھیلنے والوں کی تصویں بھی دیکھ لیں، ظاہر ہے کہ اس میں نامحرم عورتوں کی تصویریں بھی دیکھی اور دکھائی جاتی ہیں، اس لئے اس کا رکھنا خریدنا اور بیچنا کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا، چاہے وہ کتنا عام کیوں نہ ہو جاتے۔" ولو امسك فى بيته شيئاً من المعازف والملاهى كره ويأثم وان كان لا يستعملها"۔

اِحتکار یعنی ذخیرہ اندوزی

ہر زمانہ میں کچھ ایسے خود غرض لوگ موجود رہے ہیں، اور اس وقت ایسے لوگ کثرت سے ہوگئے ہیں، جو دوسروں کی

تکلیفوں اور زحمتوں کا خیال کئے بغیر اپنے فائدے کے لئے ضروری چیزوں کا ذخیرہ کر لیتے ہیں، اور پھر جب بازار میں اس چیز کی کمی ہوتی ہے، اور اس کی مانگ زیادہ ہوتی ہے، تو پھر وہ من مانے دام پر اسے بیچتے ہیں، اس کو شریعت میں احتکار کہتے ہیں۔

جب تک آمد و رفت اور سامان کے حمل و نقل اور دوسری جگہوں کی چیز منگانے کے ذرائع و وسائل وسیع نہ تھے، تو اس وقت بھی خود غرض تاجروں کی ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے گرانی ہوتی تھی، اور عام انسانوں کو اس سے تکلیف اٹھانی پڑتی تھی، مگر ایک محدود حلقہ میں اس کا اثر ہوتا تھا، لیکن جب سے آمد و رفت کی آسانی، حمل و نقل کی سہولت، تار، ٹیلیفون، وائرلیس، ریڈیو، ٹیلکس کی ایجاد ہوگئی ہے، اس وقت اگر چند خود غرض تاجر جب ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں، تو پورے ملک کو تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں، ہندوستان میں دو سال یعنی ۷۲ء، ۱۹۷۳ء کے اندر غلہ کا بھاؤ اسی لئے ۲۵ - ۳۰ روپے من سے بڑھ کر ۶۰ - ۶۵ روپے من ہوگیا تھا[1]، کہ بڑے بڑے تاجروں نے یہ اندازہ کیا کہ ہندوستان میں سیلاب اور دوسری ارضی و سماوی آفتوں کی وجہ سے غلہ کی پیداوار گھٹ گئی ہے، اور حکومت نے باہر سے بھی غلہ کم منگایا ہے، اس لئے انھوں نے بینک سے بڑے بڑے قرض لے کر غلہ کی خریداری کی، اور اس کا اسٹاک کرنا شروع کر دیا، اور گرانی بڑھنے لگی، یہاں تک کہ جب حکومت نے اپنا تمام ذخیرہ کیا ہوا غلہ باہر نکالا، اور سخت کنٹرول کیا تو پھر غلہ کے بھاؤ میں کچھ اعتدال پیدا ہوا، مگر اس کے باوجود ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کس وقت کون سامان بازار سے غائب ہو جائے، اور گرانی کا دورہ پڑنے لگے، اسی طرح دوسری اشیاء کی گرانی بھی اس احتکار کا نتیجہ ہوتا ہے، اس وقت ۸۰ء میں بھی ملک کے اندر یہی صورتحال قائم ہے، روز بروز گرانی بڑھتی جا رہی ہے، حکومت خود تاجر بن گئی ہے، اسی لئے اس کو اس کی فکر نہیں ہے کہ عوام کتنی مصیبت جھیل رہے ہیں۔

موجودہ قانون میں ذخیرہ اندوزی اور سٹہ بازی کو پسند نہیں کیا گیا ہے، لیکن اس پر کوئی

---

[1] ۱۹۵۷ء میں گیہوں کا بھاؤ ۱۳ - ۱۴ روپے من تھا اور وہ یک بیک بڑھ کر ۲۰ - ۲۲ روپے من ہوگیا تھا، اس کے بعد حکومت کی سختی کی وجہ سے کچھ اعتدال آیا۔

پابندی بھی نہیں لگائی گئی ہے، لیکن اسلامی شریعت نے ذخیرہ اندوزی کو بھی انتہائی ناپسند کیا ہے، اور اس پر پابندی بھی عائد کی ہے، ایسے تمام طریقوں کو ممنوع قرار دیا ہے، جس سے ذخیرہ اندوزی کی صورت پیدا ہو سکتی ہے، مثلاً سٹہ بازی مستقبل کے سودے وغیرہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں سخت الفاظ فرماتے ہیں، آپؐ نے فرمایا ذخیرہ اندوز ملعون ہے، آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص بھاؤ میں گرانی پیدا کرنے کا سبب ہو، وہ ایک مہیب آگ میں ڈالا جائے گا[۱]، ان ہی ارشادات نبوی کی بنا پر چاروں امام اس کی کراہت پر متفق ہیں۔

وَاتَّفَقُوْا عَلٰی کَرَاهَةِ الْاِحْتِکَارِ۔ ذخیرہ اندوزی کے ناجائز ہونے پر سب متفق ہیں

امام ابوحنیفہؒ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی چھوٹی بستی یا شہر میں احتکار کیا جائے، تو اس کا اثر چونکہ پوری بستی پر پڑے گا، اس لئے یہ ناجائز ہے، لیکن اگر کسی بڑی جگہ پر دو ایک تاجروں نے ایسا کیا تو چونکہ اس میں عام ضرر کا اندیشہ نہیں ہے، اس لئے کوئی حرج نہیں ہے، مگر دوسرے ائمہ اس کو مطلقاً ناجائز قرار دیتے ہیں، خواہ بڑی جگہ ہو یا چھوٹی، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص بھاؤ بڑھانے کا سبب ہو، اس کو بازار میں اپنا مال بیچنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، امام صاحب نے چھوٹی جگہ کی قید صرف اس لئے لگائی ہے کہ اس میں نقصان کا اندیشہ ہے اور بڑی جگہ میں یہ اندیشہ نہیں ہے، امام صاحب کے زمانہ میں رسل و رسائل اتنے وسیع نہیں تھے، اس لئے انھوں نے مضرت کو ایک بستی تک محدود کر دیا، لیکن موجودہ دور میں اب ساری دنیا ایک محلہ بن گئی ہے، اور ایک ملک کی گرانی و ارزانی کا اثر دوسرے ملک پر اسی طرح پڑتا ہے، جس طرح پہلے زمانہ میں ایک محلہ کا اثر دوسرے محلہ پر پڑتا تھا، یا ایک بستی کا دوسری بستی پر، مثال کے لئے امریکہ میں اگر روئی گراں ہوتی ہے، تو اس کا اثر فوراً مصر اور پاکستان کی روئی کی منڈی پر پڑتا ہے، چنانچہ روزانہ اخبارات میں اس طرح کی خبریں آتی رہتی ہیں، اس لئے امام صاحب نے مضرت کی جو قید لگائی ہے، اس کے تحت پوری دنیا کو اس کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے، یعنی چھوٹی بڑی جس جگہ بھی ذخیرہ اندوزی کی جائے گی، وہ ضرر پہونچائے گی، اس لئے اس کو

---

[۱] مسلم، ابو داؤد، مسند احمد، ابن ماجہ وغیرہ بحوالہ المنتقی، ج ۲ ص ۳۵۳

ممنوع قرار دیا جائے گا، البتہ اگر ذخیرہ اندوزی سے کوئی مضرت نہ ہو تو پھر یہ ممنوع نہیں ہے خواہ چھوٹی جگہ ہو یا بڑی جگہ، امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں:

فَاِنَّ الْمُحْتَكِرَ الَّذِیْ يَعْمِدُ اِلَى شِرَاءِ مَا يَحْتَاجُ اِلَيهِ النَّاسُ مِنَ الطَّعَامِ فَيَحْبِسُهُ عَنْهُمْ وَيُرِيْدُ اِغْلَاءَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِعُمُوْمِ النَّاسِ وَحِيْنَئِذٍ لِوَلِیِّ الْاَمْرِ اَنْ يُّكْرِهَ الْمُحْتَكِرِيْنَ عَلٰى بَيْعِ مَا عِنْدَهُمْ بِقِيْمَةِ الْمِثْلِ عِنْدَ ضَرُوْرَةِ النَّاسِ اِلَيهِ۔ (الطرق الحکیمہ)	جو ذخیرہ اندوز ضرورت کی چیزیں خرید کر ان کا اسٹاک کرتا ہے اور اس کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو گراں بیچ کر فائدہ اٹھائے تو عوام کے لئے وہ ظالم ہے اس لئے حکومت کو چاہئے کہ اس کو زبردستی مجبور کردے کہ اس مال کی جو مناسب قیمت ہو اس پر فروخت کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان ہی وجوہ کی بنا پر بازار کی خود نگرانی کرتے تھے اور عجمی تاجروں کو بازار میں اپنا غلہ فروخت کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، غالباً اس کی دو وجہ تھی، ایک یہ کہ وہ ان اخلاقی قدروں کا لحاظ نہ کریں گے، جو اسلامی قانون تجارت کا جزو ہیں، دوسرے ان کی ذہنیت کا اثر دوسروں پر بھی پڑے گا۔

ہدایت اپنی پیداوار کو اپنی ضرورت کے لئے روک رکھنا احتکار نہیں ہے، بلکہ اس نیت سے روکنا کہ جب گرانی ہوگی تو بیچوں گا، یا بازار میں قلت ہے اور مزید گرانی کے انتظار میں اپنی چیز روکے ہوتے ہے تو یہ احتکار ہے اور یہ ناجائز ہے، حکومت اس کو بازار بھاؤ یعنی اپنے مقرر کردہ بھاؤ پر بیچنے پر مجبور کر سکتی ہے[1]

---

[1] اثم المحتکر واثم بانتظار الغلاء والقحط لنیۃ السوء وھل یجبر علی بیعہ؟ الظاھر اذا اضطر الناس الیہ (رد المحتار ج ۲ ص ۳۵۲) یعنی قاضی یا جو ذمہ دار ہو وہ احتکار کرنیوالوں کی ذاتی ضروریات کے علاوہ سارا غلہ یا سامان فروخت کر دے گا، اگر دوبارہ پھر وہ اس کا ارتکاب کرے گا تو وہ اسے قید بھی کر سکتا ہے اور دوسری سزائیں بھی دے سکتا ہے، یبیع ما فضل عن قوتہ علی اعتبار السعۃ فی ذالک فان رفع الیہ مرۃ اخری حبسہ وعزرہ علی ما یری زجرا لہ دفعا للضرر عن الناس (ھدایہ ج ۴ ص ۴۵۶)

تسعیر یعنی قیمت یا نرخ مقرر کرنا

اسلامی شریعت نے عام حالات میں کسی چیز کی قیمت یا بھاؤ مقرر کرنے کی اجازت نہیں دی ہے نہ اشخاص کو نہ حکومت کو بلکہ متفقہ طور پر تمام ائمہ نے اس کو مکروہ لکھا ہے، اور ائمہ کا یہ فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوہ کے مطابق ہے، جو آپؐ نے گرانی کے زمانہ میں اختیار فرمایا تھا، ایک بار مدینہ کے بازار میں غلہ بہت گراں ہوگیا تو صحابہؓ نے آپؐ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ غلہ کا بھاؤ مقرر فرما دیجئے، تو آپؐ نے فرمایا، بھاؤ مقرر کرنے کا حق صرف خدا کو ہے، وہی تنگی و فراخی اور رزق دینے والا ہے، میں چاہتا ہوں کہ خدا کے سامنے اس حال میں پیش کیا جاؤں کہ میرے دامن پر کسی کی جان و مال کے ظلم کا دھبّہ نہ ہو۔

عن انس غلاء السعر علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالو یا رسول اللہ لو سعرت؟ فقال ان اللہ ھو القابض الباسط الرازق المسعر وانی لارجوان القی اللہ عزّوجلّ ولا یطلبنی احد لمظلمۃ ظلمتھا ایاہ فی دم ولا مال' (بخاری و مسلم' ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ)	حضرت انسؓ سے روایت ہے، کہ حضورؐ کے زمانہ میں ایک بار غلہ گراں ہوگیا، تو لوگوں نے کہا کہ اگر آپؐ بھاؤ مقرر فرما دیتے تو اچھا تھا، آپؐ نے فرمایا کہ یہ منصب خدا کا ہے، وہ حالات خراب اور اچھے کرتا رہتا ہے، میں ظلم کے ساتھ اس کے حضور میں حاضر ہونا پسند نہیں کرتا۔

اس مفہوم کی روایت حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہے، جسے امام احمد بن حنبلؒ نے مسند میں اور ابوداؤد نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے،

مقصد یہ ہے کہ مستقل طور سے بھاؤ مقرر کر دینا گرانی کو روکنے کا غیر فطری طریقہ ہے، اس کا سب سے بہتر اور فطری طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کی ذہنیت ایسی بنائی جائے کہ وہ اپنے فائدے کے لئے دوسروں پر ظلم نہ کریں، لیکن اس کے باوجود اگر گرانی بڑھتی ہی جائے، اور لوگوں کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جائے تو اگر یہ گرانی تاجروں کی خود غرضی کی وجہ سے ہو تو پھر بھاؤ مقرر کر کے تمام تاجروں کو پابند کیا جائے گا کہ وہ اس قیمت پر اپنا مال فروخت کریں، یا پھر بازار چھوڑ دیں، مگر

جوں ہی یہ اضطراری حالت دور ہو جائے گی، یہ قیمت کی تعیین ختم ہو جائے گی، ایسے ہی کسی موقع پر حضرت حاطب ابن بلتعہ جیسے جلیل القدر صحابی کو بازار چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا گیا تھا، حضرت عمرؓ کو علم ہوا کہ ابن بلتعہ بازار بھاؤ سے زیادہ قیمت پر منقی فروخت کر رہے ہیں، آپ نے ان کو بلاکر کہا کہ:

اما ان تزید فی السعر واما ان ترفع من سوقنا (الطرق الحکیمہ ج۲ ص۳۴)	یا تو سستا کر کے بیچو اور نہیں تو پھر بازار سے اپنا مال لے کر چلے جاؤ۔

ہدایت اوپر کی تفصیلات سے یہ بات ذہن نشین ہوئی ہوگی، کہ قیمت اور نرخ کی تعیین کی جو اجازت فقہاء نے دی ہے، وہ اس وقت کے لئے ہے، جب اس سے عوام کو تکلیف ہو رہی ہو، اور لوگوں کو فقر و فاقہ کی نوبت آگئی ہو، مگر موجودہ دور میں ایک منصوبہ کے تحت خاص طور پر کمیونسٹ ملکوں میں قیمت متعین کر دی جاتی ہے، یا مستقل طور پر لیوی پر چیزیں وصول کی جاتی ہیں، اور حکومت اپنی آقائی میں چیزیں فروخت کرتی ہے، عام حالات میں اسلامی شریعت نے اس غیر فطری طریقہ کی اجازت نہیں دی ہے، یہ اجازت عارضی طور پر محض ایک ہنگامی اصلاح کے لئے دی گئی ہے تاکہ اہلِ ثروت کا کوئی طبقہ عوام کی زندگی سے نہ کھیلنے پاتے، اور جوں ہی یہ صورت ختم ہو جائے گی، یہ پابندی بھی ختم ہو جائے گی، ہندوستان میں آزادی کے بعد دونوں صورتوں کا تجربہ ہو چکا ہے، غلہ کی مصنوعی کمی کی وجہ سے حکومت نے اس پر کنٹرول کر دیا جس سے عوام کو سخت دقّت ہونے لگی اور چور بازاری بھی شروع ہو گئی، جب رفیع احمد قدوائی ۵۱-۱۹۵۰ء میں وزیر غذا بنائے گئے، تو انھوں نے غلہ پر کنٹرول ہٹالیا، اور درآمد، برآمد کی ساری پابندیاں اٹھالیں، چنانچہ دیکھتے دیکھتے بازار غلّے سے پٹ گئے، اور سستے داموں پر آسانی سے غلہ ہر شخص کو ملنے لگا اور لوگوں کو راحت ملی۔

مُضاربت

مُضاربت یعنی ایک کا روپیہ، دوسرے کی محنت دنیا میں سب لوگ برابر نہیں ہوتے، اور نہ آیندہ کبھی برابر ہوں گے،

فطری صلاحیتوں میں کمی اور زیادتی کے ساتھ ذرائع معاش کے لحاظ سے بھی سب لوگ یکساں نہیں ہوتے، کتنے لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس پیسہ تو ہوتا ہے، مگر ان میں محنت کرکے روزی کمانے کی صلاحیت کم ہوتی ہے، یا وہ دوسرے اہم کاموں کی وجہ سے اس کا موقع نہیں پاتے کہ اپنا پیسہ کسی کام میں لگائیں، اور اس سے فائدہ اٹھائیں، اس بناپر اسلامی شریعت نے انفرادی کاروبار جس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے کے علاوہ دوسرے ذرائع بھی انسان کے لئے مہیا کئے ہیں کہ ایک غریب آدمی جس کے پاس پیسہ نہ ہو، وہ گھر بار چھوڑ کر کسی مِل مالک یا کسی کارخانہ دار کا دروازہ کھٹکھٹانے پر ہی مجبور نہ ہو، بلکہ آزاد رہ کر بھی اپنی روزی کا سامان مہیّا کرسکے، اسی لئے اسلام نے اس بات کی اجازت اور ترغیب دی ہے کہ لوگ اپنا پیسہ غریبوں کو دے کر ان سے محنت مزدوری کرائیں، اور وہ بھی فائدہ اٹھائیں، اور یہ بھی، اور اسی طریقہ کا نام مضاربت اور شرکت وغیرہ ہے۔

پہلے زمانہ میں ساہوکار انفرادی طور پر جو سودی کاروبار کرتے تھے، موجودہ دور میں بینکنگ سسٹم نے اس کی جگہ لے لی ہے، یعنی جس طرح ساہوکار سود پر لوگوں کو کاروبار اور دوسری ضروریات کے لئے قرض دیتے تھے، اب وہی کام بینک انجام دیتے ہیں، مگر قرض لینے پر سود کا بار اتنا پڑتا ہے کہ وہ اگر صحیح طور پر کاروبار کرے تو اس کا کاروبار فیل ہوجائے، اس لئے کاروباری وہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ وہ بینک کا سود بھی ادا کرسکے، اور اپنا گھر بھی بھر سکے، ملک کا پورا کاروباری طبقہ اسی غلط انداز پر کام کرتا ہے، اور ساری کاروباری مصیبت اسی کی لائی ہوئی ہے، اگر اس کے بجائے مضاربت کی بنیاد پر بینک قائم کئے جائیں تو سارے مصائب دور ہوسکتے ہیں، اس سلسلہ میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے مضامین قابل مطالعہ ہیں۔

مُضاربت کے معنی

مضاربت کا لفظ ضرب سے نکلا ہے، ضرب کے معنی مارنے اور اگر صلہ کے ساتھ آئے تو چلنے پھرنے کے ہوتے ہیں، اس کے ایک معنی رزق کے لئے زمین میں چلنے پھرنے اور دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں، چونکہ اس میں ایک آدمی پیسہ دیتا ہے، اور دوسرا آدمی اپنی محنت اور دوڑ دھوپ سے مزید پیسہ پیدا کرنے اور فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے اس معاملہ کو مضاربت کہتے ہیں، قرآن پاک میں ہے:

یَضۡرِبُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ یَبۡتَغُوۡنَ   زمین میں دوڑ دھوپ کرکے اپنی روزی

مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۔ (مزمل) حاصل کرتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کا روپیہ لے کر اسی طریقہ سے تجارت کی تھی اور عام صحابہ لوگوں سے روپیہ لے کر یا دوسروں کو روپیہ دے کر خود فائدہ حاصل کرتے اور دوسروں کو فائدہ پہونچاتے تھے۔ حدیث نبوی میں اس کے لئے قراض اور مقارضہ کا لفظ بھی آتا ہے، حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ:

انه كان يشترط على الرجل اذا اعطاه مالا مقارضة ان لا تجعل فی کبد رطبة ولا تحمله فی بحر ولا تنزل بطن المسيل فان فعلت من ذالك فقد ضمنت مالی۔	وہ مضاربت پر مال دیتے وقت یہ شرط کرتے تھے کہ اس کو کسی خطرہ کے کام میں نہ لگانا، مثلاً سمندری تجارت یا جانوروں کی خریداری وغیرہ میں یا سیلاب زدہ جگہ میں اگر تم ایسا کروگے تو میرے مال کے ضامن ہوگے۔

(دارقطنی، المنتقی ج ۲ صفحہ ۳۷۴)

مقارضہ قرض سے نکلا ہے، جس کے معنی کاٹنے کے ہیں، مضاربت ایک آدمی اپنے سرمایہ سے کچھ حصہ کاٹ کر دوسرے کو کاروبار کے لئے دیتا ہے، اس لئے اسے قراض اور مقارضہ بھی کہتے ہیں، گویا مضاربت اور قراض کے لفظ سے اس کاروبار کی پوری نوعیت ظاہر ہوجاتی ہے۔ ایک صحابی رویفع بن ثابت بیان کرتے ہیں کہ:

ان احدنا فی زمن رسول الله صلی الله علیه وسلم لیاخذ نضو اخيه على انه له النصف ولنا النصف۔	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم سے ایک آدمی اپنے دوسرے بھائی کے لئے اس شرط پر تیر لیتا تھا کہ اس سے وہ جو شکار کرے گا، اس میں دونوں برابر شریک رہیں گے۔

(المنتقی ج ۲ صفحہ ۳۷۴)

انہی احادیث نبوی کی روشنی میں صاحب ہدایہ نے لکھا ہے:

بعث النبی صلی الله علیه وسلم والناس يباشرونه فقررهم عليه	یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت لوگ مضاربت کا معاملہ کر رہے تھے،

وتعاملت بہ الصحابہؓ۔ تو آپؐ نے اسے صحیح قرار دیا، اور صحابہ کا
(ہدایہ ج ۳ ص ۲۴۱) اس پر عمل رہا ہے۔

بعض ضروری اصطلاحیں

روپے دینے والے کو ربّ المال اور محنت کرنے والے کو مضارب کہتے ہیں، اور جو روپیہ کام کے لئے دیا جاتا ہے، اسے رأس المال کہتے ہیں، کسی زمانہ میں مسلمان اس طریقہ پر بڑی سے بڑی تجارت کرتے تھے، اور ان کا کاروبار پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔

مضاربت کی تعریف

تجارت کی طرح مضاربت بھی دو آدمیوں کے درمیان ایک معاہدہ کا نام ہے، جس میں ایک شخص اپنا روپیہ دیتا ہے اور دوسرا محنت کرنے کا اقرار کرتا ہے، اور پھر یہ دونوں معاہدہ کرتے ہیں، کہ ایک کے روپیہ اور دوسرے کی محنت سے اس میں جو کچھ فائدہ ہوگا، اس میں آدھا ½ یا ¼ چوتھائی سرمایہ لگانے والا پائے گا، اور ¾ یعنی تین تہائی یا آدھا ½ محنت کرنے والے کو ملے گا[1]، مضاربت کے صحیح ہونے پر تمام ائمہ کا اتفاق البتہ اس کی بعض تفصیلات میں اختلاف ہے۔

مضاربت کی قسمیں

مضاربت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک مقیّد دوسرے مطلق[2]، مقید اس مضاربت کو کہتے ہیں، جس میں روپے دینے والا کسی خاص جگہ کی یا کسی خاص مدت کی یا کسی خاص کاروبار کی قید لگا دے، یعنی وہ یہ کہہ دے کہ اس روپے سے تم صرف لکھنؤ یا لاہور ہی میں کام کر سکتے ہو، دوسری جگہ نہیں، یا یہ کہہ دے کہ صرف ایک سال کے لئے میں مضاربت پر روپے دے رہا ہوں، یا یہ کہہ دے کہ یہ روپے صرف بساتے یا کپڑے ہی کے کام میں لگائے جائیں، دوسرا کام نہ کیا جائے، اور مطلق مضاربت وہ ہے جس میں ان

---

[1] المضاربۃ نوع من الشرکۃ علی ان راس المال من طرف والسعی والعمل من الطرف الآخر۔ رکن المضاربۃ الایجاب والقبول... علی ان الربح بینہما مناصفۃ اوثلثین اوثلثا۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۲۴۱، المجلہ ص ۲۲۵)

[2] المضاربۃ قسمان احدھما مضاربۃ مطلقۃ والآخر مضاربۃ مقیدۃ (المجلہ ص ۲۲۵)

میں سے کوئی قید نہ لگی ہو، بلکہ مضارِب یعنی محنت کرنے والے کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہو۔

معاہدہ توڑنے کا اختیار

اگر مضاربت کا معاہدہ طے ہوگیا، اور مضارب نے اپنا کام ابھی شروع نہیں کیا تو تمام ائمہ متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ دونوں میں سے ہر ایک کو اس معاہدہ کے توڑنے کا اختیار ہے، لیکن اگر اس نے کام شروع کر دیا ہے تو پھر معاہدہ فسخ کرنے کا اختیار ہے، یا نہیں، اس بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اب کسی کو معاہدہ فسخ کرنے کا حق نہیں ہے، اگر مضارب یعنی محنت کرنے والا مر بھی جائے تو اس کے لڑکوں کو اختیار ہوگا کہ وہ اس روپے سے کام کریں اور فائدہ اٹھائیں اور جی چاہے تو فسخ کر دیں، کیونکہ کام شروع کرنے کے بعد معاملہ کو فسخ کر دینے میں مضارب کو تکلیف ہوگی، اور اس کی محنت اور وقت[1] ضائع ہوگا، مگر امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ ان دونوں کو ہر وقت یہ اختیار ہے کہ جب چاہیں وہ معاملہ فسخ کر دیں معاملہ کے ختم ہو جانے کی صورت میں مضارب نے جتنا کام کیا ہے[2]، دستور کے مطابق اس کو اتنی اجرت ملے گی، دستور کے مطابق کا مطلب یہ ہے کہ عام طور پر اتنے کام کی جتنی اجرت ملتی ہے، وہ ملے گی، امام مالک اور دوسرے ائمہ کی رائے میں صرف اتنا فرق ہے کہ کام شروع کر دینے کے بعد امام مالکؒ اس معاہدہ کو اب لازم قرار دیتے ہیں، اور دوسرے ائمہ لازم قرار نہیں دیتے، ان دونوں اماموں کے نزدیک ان میں سے کسی ایک کی موت سے بھی یہ معاہدہ فسخ ہو جائے گا، مگر فسخ کی اطلاع دینی ضروری ہے، اسی طرح وقت کی تعیین کی صورت میں اس مدت کے ختم ہوتے ہی دونوں میں سے ہر ایک کو معاملہ ختم کر دینے کا اختیار ہے۔

---

[1] اجمع العلماء علی ان اللزوم لیس من موجبات عقد القراض وان لکل واحد منہما فسخہ مالم یشرع العامل فی القراض واختلفوا اذا شرع العامل فقال مالک ہو لازم وہو عقد یورث فان مات ... وقال الشافعی وابو حنیفۃ لکل واحد منہم الفسخ اذا شاء۔ (بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۲۴۰ مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

[2] ولا خلاف بینہم ان المقارض انما یاخذ حظہ من الربح (ایضاً ص ۲۴۰)

مضاربت کے صحیح ہونے کی شرطیں

مضاربت کے صحیح ہونے کے لئے ان باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱۔ ایک یہ کہ روپیہ لگانے والے اور روپیہ لینے والے دونوں کا عاقل ہونا ضروری ہے، بالغ ہونا نہیں، عاقل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں معاملات اور ان کے نفع و نقصان کو سمجھتے ہوں۔

۲۔ جو کچھ رقم مضاربت کے لئے مقرر کی جائے، وہ فوراً مضارب یعنی محنت کرنے والے کے حوالے کر دی جائے، مثلاً رب المال نے مضارب سے کہا کہ پانچ سو روپے ہم دیتے ہیں، اس میں تجارت یا کوئی اور کام کرو تو پانچ سو روپے کام کرنے والے کے قبضہ میں دے دینا چاہیئے، صرف وعدہ سے مضاربت نہیں ہوتی۔

۳۔ تیسرے یہ کہ جتنی رقم سے کام شروع کرنے کا ارادہ ہو، وہ اسی وقت بتادی جائے، اگر مجمل رکھا تو مضاربت صحیح نہ ہوگی، یعنی یہ واضح کر دیا جائے کہ سو دو سو، یا پانچ ہزار یا دس ہزار سے کام شروع ہوگا۔

۴۔ چوتھے یہ کہ منافع طے ہو جانا چاہیئے، یعنی یہ کہ کتنا نفع سرمایہ لگانے والے کو ملے گا اور کتنا مضارب کو، اگر رب المال نے صرف یہ کہا کہ ہم دونوں فائدہ میں شریک رہیں گے تو اس سے یہ سمجھا جائے کہ آدھا نفع رب المال کا اور نصف مضارب کا، اگر صرف یہ کہا کہ اچھا جو ہوگا اس میں مناسب طور پر تقسیم کر لیا جائے گا، تو یہ مضاربت فاسد ہوگی، کیونکہ اس میں اختلاف کا خدشہ ہے، بلکہ حصہ کے اعتبار سے منافعہ کی تقسیم طے ہو جانی چاہیئے۔

۵۔ دونوں تحریری طور پر معاملہ کے شرائط لکھ کر اپنے اپنے پاس رکھ لیں تو بہتر ہے تاکہ بعد میں اختلاف نہ ہو، اگر بغیر تحریر کے بھی اطمینان کی کوئی صورت ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

۶۔ مطلق مضاربت میں دونوں یہ بھی طے کر لیں کہ کتنے دنوں کے بعد حساب کتاب کر کے منافعہ تقسیم ہوگا، ایک سال دو سال یا دو ماہ ایک ماہ بعد۔

کن چیزوں سے مضاربت فاسد ہو جاتی ہے

(۱) اگر رب المال یا مضارب نے یہ شرط لگائی کہ نفع میں سو یا دو

سو روپے پہلے میں لوں گا، باقی جو بچے گا، اس میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے، تو ان دونوں صورتوں میں مضاربت فاسد ہو جائیگی غرض یہ کہ کوئی فریق نفع کی کوئی رقم اپنے لئے متعین و مخصوص نہ کرے، بلکہ یوں طے کر لینا چاہیئے کہ آدھا آدھا نفع دونوں کا ہوگا یا رب المال کو ⅓ ملے گا، اور مضارب کو ⅔ یا ⅔ ملے گا اور ⅓ رب المال کو۔

ضروری ہدایت اس قید کے لگا دینے سے کہ مضارب یا مالک فائدہ کا کوئی حصہ اپنے لئے مخصوص نہ کریں، ان کارخانہ داروں کا کاروبار ناجائز ہوگا، جو دوسروں کا روپیہ لے کر مضاربت کے طور پر کوئی کارخانہ قائم کرتے ہیں اور اپنے لئے حق محنت کے طور پر انتظامی دیکھ بھال کے نام سے کچھ منافع خاص کر لیتے ہیں، پھر بقیہ منافع اپنے اور حصہ داروں کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں، اگر مضارب کارخانہ دار نے کوئی باتنخواہ منیجر یا کلرک رکھا تو اس کی تنخواہ وہ نفع سے لے سکتا ہے، یہ تو اس صورت کا حکم ہے جب کارخانہ دار نے اپنا روپیہ نہ لگایا ہو، اگر اس نے اپنا روپیہ بھی اس میں لگایا ہے، تو یہ مضاربت نہیں شراکت ہوگی، اس کا بیان آگے آتا ہے۔

(۲) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ صرف روپے پیسے میں مضاربت صحیح سمجھتے ہیں، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سامان میں بھی مضاربت صحیح ہے، یعنی کسی نے سامان دیا اور یہ کہا کہ اس کو بیچو جو فائدہ ہوگا، ہم لوگ نصف نصف بانٹ لیں گے، تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کو صحیح نہیں سمجھتے، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ صحیح سمجھتے ہیں، لیکن اگر یہ کہا کہ اس سامان کو بیچ کر جو روپیہ ہو اس سے مضاربت کرو تو اس صورت میں امام صاحب کے یہاں بھی مضاربت جائز ہو جائے گی، مقصود یہ ہے کہ سامان دینے کی صورت میں اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے، اس لئے امام صاحب کے یہاں ناجائز ہے، اگر اختلاف کی گنجائش نہیں ہے تو پھر ان کے نزدیک بھی جائز ہے جیسا کہ امام مالکؒ نے فرمایا ہے۔

(۳) رب المال نے روپیہ نقد نہیں دیا بلکہ یہ کہا کہ ہمارا اتنا روپیہ فلاں کے پاس ہے اس سے وصول کر کے کاروبار کرو، نفع میں دونوں شریک ہوں گے تو یہ مضاربت صحیح ہوگی، لیکن اگر یہ کہا کہ تمہارے ذمہ جو روپیہ ہے، اس سے تجارت کرو تو یہ جائز نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ

قرض سے فائدہ اٹھانا ہوا، اور قرض سے فائدہ اٹھانا ناجائز ہے، اسی طرح اگر مضارب نے پورا روپیہ وصول کرنے سے پہلے ہی کام شروع کر دیا تو یہ بھی ناجائز ہے[1]

(۴) مضاربت میں روپیہ لگانے والا روپیہ لگا کر علیحدہ ہو جاتے گا، کام میں اس کی شرکت کی شرط صحیح نہیں ہے، یعنی اگر اس نے مضارب سے کہا کہ میں خود یا میرا کوئی آدمی تمہارے ساتھ کام میں شریک کار رہے گا تو یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی مداخلت سے کام میں خرابی آئے گی، اور بلا وجہ ایک آدمی کے حق محنت کا بار اس پر پڑے گا، اگر مضارب خود چاہے تو کسی کو رکھ سکتا ہے[2]

رب المال اور مضارب کے حقوق و اختیارات

جس نے سرمایہ لگایا ہے، یعنی رب المال اور جو محنت کر رہا ہے یعنی مضارب دونوں کے کچھ حقوق و اختیارات ہیں، ان کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے۔

رب المال یعنی سرمایہ لگانے والے کے حقوق و اختیارات

سرمایہ لگانے والے کو یہ حق ہے کہ وہ یہ شرط لگائے کہ فلاں کاروبار میں روپیہ لگایا جائے، اگر مضارب اس کے خلاف کرے گا، اور اس میں نقصان ہوگا، تو اس کی ذمہ داری مضارب پر ہوگی[3]

۲- وہ یہ شرط بھی لگا سکتا ہے کہ فلاں جگہ پر کاروبار کیا جائے، یعنی لکھنؤ میں، دلی میں، بمبئی میں، یا جہاں کا وہ باشندہ ہے۔

۳- وہ یہ بھی شرط لگا سکتا ہے کہ فلاں وقت تک کے لئے کاروبار کرنے کے لئے روپیہ دیتا ہوں، مثلاً چھ مہینے یا ایک ماہ یا ایک سال۔

---

[1] فلا یجوز ان یکون الدین فی الذمۃ۔ (المجلہ ص۲۲۹)۔

[2] ھدایہ، ج ۳ ص۴۲۹۔

[3] مھما شرط رب المال وقید بالمضاربۃ المقیدۃ یلزم المضارب رعایتہ المجلہ ص۲۳۰)۔

۴۔ اگر مضارب نے اصل سرمایہ میں سے کچھ خرچ کر دیا ہے، تو جو کچھ نفع ہوگا، اس میں اصل سرمایہ کی رقم نکال کر پھر بقیہ نفع تقسیم ہوگا، مثلاً کسی نے ایک ہزار روپیہ دیا مضارب نے اس میں سے سو روپے کھانے پینے یا کاروبار کے انتظام میں خرچ کر دیئے، اور پھر ایک سال یا چھ مہینہ میں دو سو روپے کمائے، تو ایک سو روپے تو اصل سرمایہ میں سے نکل جائے گا، اور بقیہ رقم ایک سو روپے اصل نفع سمجھی جائے گی، اور دونوں کے درمیان معاہدہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔

۵۔ سرمایہ کی تقسیم کے وقت مالک اور مضارب دونوں کا رہنا ضروری ہے۔

۶۔ اگر رب المال یہ شرط لگا دے کہ خسارہ دونوں میں مشترک رہے گا، تو یہ مضاربت فاسد ہوگی، اس کو اس کا حق نہیں ہے[۱] یہ شرط بے کار ہوگی۔

مضارب کے حقوق و اختیارات

(۱) مضارب نے جو سرمایہ لیا ہے اس کا وہ امین بھی ہے، اور تصرف کے لحاظ سے وہ وکیل بھی ہے یعنی سرمایہ لگانے والے کا وہ نمائندہ ہے[۲] امین اس حیثیت سے کہ جس طرح ایک امین امانت کی حفاظت کرتا ہے، اسی طرح اس کو اس سرمایہ کی حفاظت کرنی چاہیئے، لیکن اگر اتفاق سے اس سرمایہ میں نقصان آجائے، یا وہ ضائع ہو جائے تو اس کے اوپر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی، یعنی اس کا تاوان اس سے نہیں لیا جائے گا، لیکن اگر یہ ثبوت مل جائے کہ اس نے قصداً مال کو ضائع کیا ہے، تو اس پر ذمہ داری ہوگی، اگر اس نے سرمایہ لگانے والے کے شرائط کے خلاف کام کیا ہے اور گھاٹا ہوا ہے تو بھی اس پر ذمہ داری ہوگی[۳]

---

[۱] علی کل حال یکون الضرر والخسار عائداً علی رب المال اذا شرط کونه مشترکا بینه وبین المضارب فلا یعتبر ذالک الشرط (المجلة ص ۲۳۱)

[۲] بدایة المجتهد، ج ۲ ص ۲۴۰، المجلة ص ۲۲۹۔

[۳] المضارب امین رأس المال فی یدہ فی حکم الودیعة ومن جهة تصرفه فی رأس المال وهو وکیل رب المال (المجلة دفعه ۱۴۱۳ ص ۲۲۹)۔

۲۔ یہ تو اس کی امین ہونے کی حیثیت تھی، وکیل ہونے کی حیثیت سے اس کو پورا اختیار ہے کہ وہ طے شدہ شرائط کے تحت جو کاروبار چاہے اور جس طرح چاہے کرے، البتہ اگر اس نے کسی مخصوص کاروبار کی شرط لگادی ہے، یا کسی خاص جگہ پر کاروبار کرنے کا اختیار دیا ہے، تو پھر اس سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے، مثلاً اس نے کہہ دیا کہ لکھنؤ میں رہ کر آپ کپڑا خرید یئے اور بیچئے۔ تو مضارب کے اوپر اس کی پابندی ضروری ہوگی۔

۳۔ اگر سرمایہ لگانے والے نے روپیہ دے کر کسی خاص اور محدود کاروبار کی قید نہیں لگائی ہے، تو اس کو نقد یا ادھار مال خریدنے بیچنے، کسی اور کو اپنی مدد کے لئے تنخواہ یا روزانہ اجرت دے کر رکھ لینے کا بھی حق ہے، اس میں مالک کوئی مداخلت نہیں کر سکتا، مثلاً کسی نے کہا کہ میں یہ روپے دیتا ہوں، اس کو لیجائیے، اپنی صوابدید سے جہاں جی چاہے اور جو جی چاہے کاروبار کیجئے تو اب مضارب کو یہ حق ہوگا، کہ جو کاروبار چاہے اور جہاں چاہے کرے، لیکن اگر اس نے خرید و فروخت میں غیر معمولی دھوکہ کھایا تو اس کی ذمہ داری اس کے اوپر ہوگی[1] اسی طرح اجازت کی صورت میں اسے مضاربت کے مال کو قرض دینے یا لینے یا ہبہ کرنے کا حق نہیں ہوگا، اس کے لئے روپیہ لگانے والے کی اجازت کی ضرورت ہوگی اگر اس نے اجازت کے بغیر مضاربت کا روپیہ قرض دے دیا اور مارا گیا، یا اس سے نقصان ہوا تو اس کی ذمہ داری اس کے اوپر ہوگی۔

۴۔ اس کو کسی مال کے رہن رکھنے یا امانت رکھنے حوالہ کرنے یعنی رقم کی ادائیگی ایک جگہ کی بجائے دوسری جگہ کرنے کا اختیار ہوگا، یعنی اگر رہن رکھنے یا امانت رکھنے یا حوالہ کرنے میں کوئی نقصان ہوگا، تو اس کا تاوان مضارب پر نہیں ہوگا، خاص طور پر بڑے اور اکسپورٹ وغیرہ کے کاروبار میں اس کی ضرورت ہر وقت پیش آتی ہے، امانت اور حوالہ کا مفصل بیان

---

[1] المجلہ ص۲۳، اذا اشتری مالا بالغبن الفاحش یکون اخذہ لا یدخل فی حساب المضاربۃ لکن فی ھذہ الصورۃ لا یکون ماذونا بالھبۃ ولا قراض فی مال المضاربۃ ولا بالدخول تحت الدین الاکثر من رأس المال دفعہ ۱۴۱۶۔

آگے آتا ہے۔

۵۔ مضارب اگر اپنے وطن میں کاروبار کرے تو کھانا کپڑا، مضاربت کے مال سے نہیں لے سکتا، البتہ سواری کا خرچ اس صورت میں لے سکتا ہے جب بڑا شہر ہو، اور ایک حصے سے دوسرے حصے کے آنے جانے میں کچھ خرچ ہو، یا اسٹیشن دور ہو، اور مال چھڑانا ہو، یا مال کو سواری پر لانا ہو، تو یہ سب خرچ اس کو ملے گا، اگر اس کو کہیں باہر جاکر کسی مال کے خریدنے یا بیچنے کی ضرورت پیش آجائے، تو وہ کھانے پینے، سواری، کپڑے کی دھلائی کا خرچ لے سکتا ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ دوا کا خرچ بھی وہ لے سکتا ہے، کیونکہ دوا سے اس کی صحت برقرار رہے گی، اور صحت ہی پر کاروبار کا دارومدار ہے، اگر وہ کام تنہا نہ کرسکتا ہو تو اُجرت پر کوئی دوسرا آدمی بھی رکھ سکتا ہے، لیکن اخراجات کے لینے میں اس کو اس کا لحاظ کرنا پڑے گا، کہ جس حیثیت کا وہ خود ہے، اس سے زیادہ خرچ نہ کرے، مثلاً وہ ذاتی سفر میں جتنا خرچ کرتا ہے یا عموماً تاجر جتنا خرچ کرتے ہیں اتنا ہی لینے کا حق ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ اپنا ذاتی سفر تو وہ سکنڈ کلاس میں کرے، اور مضارب کی حیثیت سے سفر کرے تو فرسٹ کلاس میں یا گھر پر اگر وہ دال روٹی کھاتا ہے، تو سفر میں اس کو گوشت روٹی کھانے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے، بلکہ اسی حیثیت کا کھانا کھانا چاہیئے، جس حیثیت کا وہ عموماً کھاتا ہے[1]۔

۶۔ مضاربت کے مال کو جو نقصان ہوگا وہ نفع سے محسوب ہوگا، مثلاً ایک ہزار روپیہ سے مال خریدا اور اس میں دو سو روپے کا نفع ہوا اور اسی اثنا میں ایک سو روپیہ کا مال چوری ہوگیا، یا کسی طرح کا نقصان ہوگیا تو ایک سو روپیہ تو اب اصل سرمایہ میں لیا جائے گا، اور بقیہ ایک سو میں دونوں تقسیم کرلیں گے، اگر یہ نقصان فائدے سے زیادہ ہو تو پھر مضارب پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ وہ نقصان اب رب المال برداشت کرے گا، فرض کیجیے کہ اوپر والی صورت میں پانچ سو روپے کا نقصان ہوگیا، تو نفع والے دو سو روپے تو اصل سرمایہ میں

---

[1] اذا ذهب المضارب بعمل المضاربة الى محل غير البلد التى وجد فيها ياخذ مصرفه بالقدر المعروف من مال المضاربة۔ دفعه ۱۴۱۹۔

ملا دیئے جائیں گے، اب اس کے بعد بھی ایک ہزار پورا نہ ہوتا ہو تو پھر مضارب سے اس کا تاوان نہیں لیا جا سکتا، بشرطیکہ اس کی غفلت سے ایسا نہ ہوا ہو، اگر اس نے غفلت برتی، اور نقصان ہوا تو وہ ذمہ دار ہوگا، یا اس نے مال کے خریدنے میں کوئی بڑا دھوکا کھایا ہو، تو اس کی ذمہ داری اس پر ہوگی، یعنی یہ خسارہ کسی اچانک حادثہ یا کاروبار کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ہو، مثلاً ایک مال اس نے تینتیس ۳۳ روپے من کے حساب سے خریدا اور عام بازار میں اس کا بھاؤ یہی تھا، اور دوسرے دن یک بیک بھاؤ گر گیا تو اس صورت میں جو نقصان ہوگا، اس کی ذمہ داری مضارب پر نہیں ہوگی، لیکن اگر عام طور پر اس چیز کا بھاؤ چالیس روپے من تھا اور اس نے بے جانے بوجھے ۴۵ - ۵۰ میں خرید لیا تو اس نقصان کا وہ ذمہ دار ہوگا یا اس نے اس مال کی حفاظت نہیں کی اور خراب ہو گیا تو اس صورت میں بھی وہ ذمہ دار ہوگا، یا اس نے رب المال کی ہدایت کے خلاف عمل کیا اور نقصان ہوا تو اس کی ذمہ داری بھی مضارب پر ہوگی۔[1]

ذمہ دار ہونے کا مطلب ذمہ دار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تاوان مضارب کو دینا ہوگا، خواہ وہ نفع سے دے یا اپنے گھر سے، تاوان کا اندازہ اس شعبہ کے افراد کریں گے جن میں یہ کاروبار ہو رہا ہے۔

۷۔ اسی طرح اخراجات وضع کر کے پھر نفع تقسیم کیا جائے گا، مثلاً ایک ہزار روپیہ اصل سرمایہ ہے، جس میں اس نے دو سو روپے سفر میں اور دوسری کاروباری ضروریات میں خرچ کیا، اور اس کے بعد اس کو کل چار سو روپے فائدہ ہوا، تو دو سو روپے جو اس نے اصل سرمایہ سے خرچ کئے ہیں وہ وضع کر کے پھر دو سو روپے معاہدہ کے مطابق دونوں تقسیم کر لیں گے، مقصد یہ ہے کہ فائدے کی صورت میں اصل سرمایہ محفوظ رکھا جائے گا، اور نقصان کی صورت میں مضارب پر کوئی ذمہ داری نہیں، بشرطیکہ اس نے غفلت نہ برتی ہو، یا معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کی ہو یا اس نے غیر معمولی دھوکہ نہ کھایا ہو۔

---

[1] ماهلك من مال المضاربة فهو من الربح دون رأس المال فان زاد الهالك على الربح فلا ضمان على المضارب۔ (هدایه ج ۳ ص ۲۵۹)

۸ ۔ اگر یہ معاملہ کسی وجہ سے فسخ ہو جائے تو مضارب نے جتنا کام کیا ہے، اس کی اُجرت اس کو ملے گی[1]۔ لیکن یہ اجرت اس منافع کی مقدار سے زیادہ نہ ہوگی، جو کسی وجہ سے اس نے اب تک کمایا ہے یہ اس صورت میں ہے، جب کچھ فائدہ ہوا ہو، اگر فائدہ ہونے سے پہلے یہ معاملہ ختم ہو جائے تو اس کو کچھ بھی نہ ملے گا، مثلاً کسی نے ایک ہزار روپے سے کاروبار شروع کیا اور دو سو فائدہ ہوا کہ معاملہ فسخ ہو گیا، تو اب اس نے جتنے دن کام کیا ہے، جوڑ کر اس کی اجرت ملے گی، لیکن ابھی کوئی فائدہ نہیں ہوا، اور یہ معاملہ ختم ہو گیا تو مضارب کو کچھ بھی نہیں ملے گا، اور اگر فائدہ ہوا ہے مگر اتنا کم کہ اس کی اجرت اس فائدے سے زیادہ ہو جائے تو پھر اس کو نفع سے زیادہ اجرت نہیں دی جائے گی۔ اگر مالک اپنا معاہدہ ختم کرنا چاہتا ہے تو اس کی مضارب کو اطلاع دینی ضروری ہے، لیکن اس سلسلہ میں جو کام ادھورا رہ گیا ہے اس کو پورا کرسکتا ہے، یجوز له ان یبیعها و یبدله بالنقد ص۲۲۳۔

مضاربت کے تحت بینکنگ مضاربت کی شرائط پر روپیہ فراہم کر کے بینک قائم کئے جاسکتے ہیں، اس کی مزید تفصیل امانت کے بیان میں آئے گی، اور غیر سودی بینکاری پر مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور سے شائع شدہ کتاب، اور نجات اللہ صدیقی کی انگریزی اور اردو کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

شراکت

مضاربت کی طرح اسلامی شریعت نے کاروبار کی بعض اور صورتیں بھی پیدا کی ہیں، جن سے صنعتی و تجارتی کاروبار میں زیادہ سے زیادہ ترقی بھی ہو، اور جو لوگ کم پیسے، یا بالکل پیسے

---

[1] والمضارب فی منزلة اجیر یاخذ اجر المثل لکن لا یتجاوز المقدار المشروط حین العقد و لا یستحق اجر المثل ان لم یکن ربح۔ (المجله دفعه ۱۴۲۶ ص۲۳۱)

نہ رکھتے ہوں وہ بھی آزادی اور اپنی عزّت و آبرو کو باقی رکھتے ہوئے، اپنی روزی کا سامان کرسکیں، ان ہی میں ایک شراکتی کاروبار بھی ہے، شراکت کا کام تجارت وصنعت میں بھی ہوسکتا ہے، اور زراعت اور دوسرے پیشوں میں بھی اور علمی کاموں میں بھی، اس میں دو آدمی سے لے کر جتنے آدمی چاہیں شرکت کرسکتے ہیں، موجودہ دور میں شراکتی کاروبار کا رواج بہت کافی ہے، اور اس کے ذریعہ بڑے سے بڑے تجارتی اور صنعتی کاروبار چل رہے ہیں، لیکن اس دور کی شرکت زیادہ پیسہ رکھنے والوں کی ترقی کا سبب ہوتی ہے، کم پیسہ لگانے والوں کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ ان کو سال بھر میں سو دوسو روپے مل جاتے ہیں اور اس کا بیشتر نفع ان کے منتظموں، ڈائرکٹروں اور مینجروں کی جیب میں چلا جاتا ہے، یا ان کی جیب میں جاتا ہے، جن کا زیادہ پیسہ کاروبار میں لگا ہوتا ہے، ہوتا یہ ہے کہ شراکتی کاروبار کرنے والے لاکھوں آدمیوں کو حصہ دار بناتے اور ان سے روپے حاصل کرتے ہیں، اس کے بعد اپنی تنخواہ مقرر کرتے ہیں، پھر کچھ رقم انتظامی امور کے لئے وضع کرتے ہیں، کچھ کارخانہ کی عمارت، اور مشینوں کی خریداری پر صرف کرتے ہیں، پھر جب کاروبار چل نکلتا ہے، تو عام حصہ داروں کو منافع میں وہ چند روپے ہاتھ لگتے ہیں، جو ان تمام اخراجات اور مراحل کے بعد بچتے ہیں، اور جب کوئی حصہ دار فائدہ نہ دیکھ کر علیحدہ ہونا چاہتا ہے، تو اس کے ہاتھ میں وہی چند روپے آتے ہیں، جو اس نے بحیثیت حصہ دار دیئے تھے، اس کے علاوہ اور کسی چیز کا وہ حق دار نہیں ہوتا، بلکہ بعض کاروباری تو حصّے کے روپے بھی واپس نہیں کرتے، بلکہ یہ شرط لگاتے ہیں کہ اپنا حصہ کسی حصّہ دار کو بیچ دیجئے، اس طرح سارے کاروبار پر آہستہ آہستہ وہ لوگ قابض ہوجاتے ہیں، جنھوں نے اس کو شروع کیا تھا۔

لیکن اسلامی شریعت نے شراکتی کاروبار کے لئے جو شرائط مقرر کئے ہیں، ان کو ملحوظ رکھا جائے تو بڑے سے بڑا شراکتی کاروبار بھی چلایا جاسکتا ہے، اور سارے حصّہ دار اس سے متمتع بھی ہوسکتے ہیں، اور ملک کی صنعت وتجارت کو فروغ بھی ہوسکتا ہے اور اس کے ذریعہ ہزاروں بے وسیلہ لوگوں کی روزی لگ سکتی ہے، ان شرائط کی وجہ سے وہ ساری بے انصافی، زیادتی اور بددیانتی ختم ہوجائے گی، جو اس طرح کے کاروبار کا لازمہ بن گئی ہے اگر کوئی خود غرض

بد دیانتی اور ناانصافی کرنا بھی چاہے گا تو اخلاق اور شریعت دونوں کی نگاہ میں مجرم قرار پائے گا، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "جب دو شریک مل کر کوئی کام کرتے ہیں، تو جب تک وہ آپس میں خیانت و بد دیانتی نہیں کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ ہوتا ہوں، یعنی میں ان کی مدد کرتا رہتا ہوں، اور برکت دیتا ہوں، لیکن جب وہ بد دیانتی شروع کر دیتے ہیں، تو پھر میں ان کی مدد کرنا چھوڑ دیتا ہوں"۔[1]

شرکاء کی حیثیت

عموماً لوگ اشتراک محض مادی فائدہ اور خود غرضی ہی کے لئے کرتے ہیں، ان میں کوئی اخلاقی قدر مشترک نہیں ہوتی، اس لئے ہر شریک اپنی غرض اور مادی فائدہ پیش نظر رکھتا ہے، لیکن اسلامی شریعت نے مادی فائدے کے ساتھ شرکاء کی اصل حیثیت یہ قرار دی ہے کہ ان میں سے ہر ایک شراکت کے مال اور کاروبار کا امین بھی ہے، اور وکیل بھی، امین اس حیثیت سے کہ جس طرح امانت کی حفاظت کی جاتی ہے، اسی طرح ہر شریک شراکت کے مال کی حفاظت کرے، اور اگر غلطی سے کوئی نقصان ہو جائے، تو پھر اس پر تاوان نہ عائد کیا جائے، اور وکیل اس حیثیت سے کہ کوئی شریک اس مال کو، یا مشترکہ کاروبار کو اپنے فائدہ کے لئے نہ استعمال کرے، بلکہ منفعت میں ہر ایک کے حقوق کا خیال رکھے، کسی کو یہ شکایت نہ ہو کہ فلاں نے سارا فائدہ سمیٹ لیا، اور بقیہ سب لوگ نقصان میں رہے، چنانچہ صحابہ کرامؓ نے ارشاد نبوی کی روشنی میں جب شرکت کا کوئی کاروبار کیا تو مسلمان تو مسلمان غیر مسلموں تک سے ایسا انصاف کیا ہے کہ وہ تاریخ میں یادگار رہ گیا ہے، خیبر کے یہودیوں سے طے تھا کہ وہ مسلمانوں کی زمین میں کاشت کریں، جو کچھ پیدا ہوگا، اس میں نصف نصف دونوں فریق بانٹ لیں گے، چنانچہ عبداللہ بن رواحہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندہ کی حیثیت سے غلّہ کی وصولی کے لئے گئے تو انھوں نے محنت کرنے والوں سے کہا کہ یا تو تم لوگ خود بانٹ کر دے دو یا کہو تو میں بانٹ دوں، انھوں نے ان ہی سے بانٹنے کو کہا، عبداللہ بن رواحہ نے پیداوار کے دو الگ الگ حصّے کر دیئے اور کہا کہ ان میں

---

[1] انا ثالث الشریکین مالم یخن احدھما۔ (ابوداؤد، حاکم، المنتقی ۲ ص ۳۷۲)

سے جو چاہو لے لو، یہ انصاف دیکھ کر یہودی پکار اٹھے:

وَبِہٖ قَامَتِ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ۔ (اسی انصاف کی وجہ سے زمین و آسمان قائم ہیں ورنہ قیامت آجاتی)

انہی احادیث و آثار کی روشنی میں فقہاء نے بے شمار مسائل مستنبط کئے ہیں:

شرکت کی قسمیں شرکت دو طرح کی ہوتی ہے، ایک شرکت اَملاک اور دوسری شرکت عُقُود۔

شرکت املاک کی تعریف شرکت املاک یعنی ملکیت کی شرکت یہ اس طرح کی ہوتی ہے کہ چند آدمیوں کو وراثت میں یا بطور ہبہ ایک جائیداد یا نقد روپیہ ملا، یا آدمیوں نے مل کر کوئی چیز خریدی تو یہ تمام صورتیں شرکت املاک کی ہیں یعنی اس چیز کی ملکیت میں دونوں شریک سمجھے جائیں گے، اس میں عقد یعنی ایجاب و قبول نہیں ہوتا، بلکہ وہ غیر ارادی یا ارادی طور پر کسی چیز میں شریک ہو جاتے ہیں[۱] اس کی دو قسمیں ہیں، ایک شرکت جبر، دوسری شرکت اختیار، شرکت جبر کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مرضی کے بغیر وہ کسی چیز میں شریک مان لئے جائیں، مثلاً وراثت میں شریک ہو جائیں، شرکتِ اختیار کا مطلب یہ ہے کہ دونوں اپنا مال ایک جگہ رکھ دیں یا دونوں مل کر کوئی چیز خرید لیں[۲]

شرکت املاک کا حکم شرکتِ املاک کا حکم یہ ہے کہ جتنے لوگ شریک ہوں، ان میں سے کسی شریک کو اس مشترک جائداد یا روپیہ میں بغیر تمام شرکاء کی اجازت کے تصرف کا حق نہیں ہے، مثلاً کسی نے ایک ہزار روپیہ یا چار مکان ترکہ میں چھوڑے تو اس میں جتنے حصّہ دار ہیں، خواہ اس میں کسی کا کم حصّہ ہو یا زیادہ، بغیر سب کی مرضی کے نہ تو ان روپیوں کو کام میں لانے یا مکانوں کے بیچنے یا ان کو کرایہ پر دینے کا کسی کو حق ہے، اور نہ سب کی موجودگی کے بغیر تقسیم کرنے کا، اسی طرح دو آدمیوں یا کئی آدمیوں نے مل کر غلّہ، کپڑا،

---

[۱] فھی عبارۃ عن ان یتملک شخصان او اکثر من غیر عقد الشرکۃ۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۳ ص ۶۳)۔ [۲] ایضاً ھدایہ ج ۲ ص ۶۰۴۔

یا باغ یا پھل یا اور کوئی چیز خریدی تو اس کی دو صورتیں ہیں (۱) ایک یہ کہ وہ چیزیں ایسی ہیں، جن میں عام طور پر کوئی فرق نہیں ہوتا، مثلاً جو، گیہوں، یا کوئی اور غلہ خریدا، یا کسی ایک ہی کپڑے کے بہت سے تھان خریدے تو دوسرے شرکاء کی موجودگی کے بغیر بھی اس کی تقسیم کی جا سکتی ہے، یعنی ایک شریک اپنا حصّہ لے لے، اور ان کا حصہ الگ کر کے رکھ دے تو کوئی حرج نہیں، لیکن دوسرے شریک کے پہونچنے سے پہلے اگر اس کا حصّہ ضائع ہو گیا تو اس کو دوسرے شریک کے حصّے میں سے آدھا لینے کا حق ہے، (۲) دوسری یہ کہ اگر وہ چیزیں ایسی ہیں جن میں کچھ فرق ہوتا ہے، مثلاً مختلف قسم کے دس بیس تھان کپڑے دو آدمیوں نے خریدے، یا پھل، یا جانور خریدے تو چونکہ ان چیزوں میں فرق ہوتا ہے، کوئی تھان اچھا ہوگا، کوئی خراب، کوئی پھل بڑا ہوگا کوئی چھوٹا، کوئی جانور تیز ہوگا کوئی سست، اس لئے دونوں کی موجودگی کے بغیر تقسیم کرنے میں اختلاف کی گنجائش ہے، اس بنا پر دوسرے شریک کی موجودگی کے بغیر اس کو تقسیم نہ کرنا چاہیئے، اور نہ کام میں لانا چاہیئے [1]

شرکتِ عقود

عقود عقد کی جمع ہے، جس کے معنی بندھنے یا باندھنے کے ہیں، اس شرکت کو شرکتِ عقود اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں شرکاء آپس میں ایک معاہدہ کے ذریعے ایک دوسرے سے بندھ جاتے اور اس کی شرائط کے وہ پابند ہو جاتے ہیں۔

شرکتِ عقود کی تعریف

مضاربت اور تجارت کی طرح شرکت میں باہم معاہدہ اور اقرار ضروری ہے، یعنی شرکتِ عقود اس طرح ہوتی ہے، کہ دو یا دو سے زیادہ آدمی تھوڑا تھوڑا سرمایہ فراہم کر کے آپس میں یہ طے کریں کہ ہم سب مل کر اس روپے سے فلاں کام کریں گے، اور جو نفع ہوگا، آپس میں اتنے فی صدی تقسیم کر لیں گے، یا کسی کام کے بارے میں یہ طے کریں کہ آپس میں مل کر سب اس کو کریں گے اس میں جو فائدہ ہوگا، بانٹ لیں گے، یہ اقرار زبانی بھی ہو سکتا ہے، اور تحریری بھی، امام سرخسی جو حنفی فقہ کے امام سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے تحریر پر بہت زیادہ زور دیا ہے [2]

---

[1] المجلہ ص ۱۷۴۔ [2] مبسوط ص ۱۵۶ ج ۱۲۔

موجودہ دور میں ایسا کرنا انتہائی ضروری ہے۔

معاہدہ کب فسخ ہو سکتا ہے

اس معاہدہ کے شرکاء میں سے ہر فرد کو یہ اختیار ہوگا کہ جب چاہے، اپنے معاہدہ کو فسخ کردے اور اس سے علیحدہ ہو جائے، لیکن اس معاہدہ کو فسخ کرنے کا اثر دوسرے شرکاء پر نہیں پڑے گا، البتہ دوسرے شرکاء کو اس سے آگاہ کرنا ضروری ہوگا، شرکاء میں سے اگر کوئی مرجائے تو معاہدہ خود بخود فسخ ہو جائے گا، لیکن اگر ورثہ چاہیں تو اس کی تجدید کر سکتے ہیں[1]۔

شرکتِ عقود کی قسمیں

شرکتِ عقود کی تین قسمیں ہیں، یہ شرکت یا تو مال میں ہوگی یا جسمانی محنت میں یا اپنی ساکھ کی، ان تینوں کی دو دو قسمیں ہیں، یا تو یہ شرکت مفاوضہ ہوگی یا شرکت عنان، اس طرح اس کی چھ قسمیں ہیں، اور ان سب کے احکام جدا ہیں، مگر ان سب میں چند باتیں مشترک ہیں۔

۱۔ ایک تو باقاعدہ شرکت کا قول و قرار ہونا چاہیئے، خواہ زبانی ہو یا تحریری۔

۲۔ منافع کی تقسیم کی مقدار بھی صاف صاف بیان کردی جائے کہ کتنا کس کو ملے گا اور کتنا کس کو، اس کی تفصیل مضاربت کے بیان میں آچکی ہے۔

۳۔ ان میں سے ہر ایک شریک مشترکہ مال کا امین بھی ہوگا، اور وکیل بھی، امین کی حیثیت سے مال کی حفاظت اس پر ضرور ہوگی، اور وکیل کی حیثیت سے ہر ایک کو برابر کاروبار کے نظم اور تصرف میں اختیار حاصل ہوگا۔

۴۔ کام اور سرمایہ برابر ہونے کی صورت میں بھی آپس کی رضامندی سے اگر یہ طے ہو جائے کہ ایک آدمی کو زیادہ اور ایک آدمی کو کم نفع ملے گا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۵۔ ہر ایک کے لئے اس کام میں خود یا اپنے کسی نمائندہ کے ذریعہ حصّہ لینا ضروری ہے لیکن اگر وہ کسی وجہ سے شریک نہ بھی ہو، تب بھی نفع میں شریک رہے گا، کیونکہ اگر گھاٹا ہوگا تو اس کو بھی نقصان برداشت کرنا پڑے گا، خلاصہ یہ کہ کام یا مال اور ضمان میں سے کوئی چیز بھی

---

[1] فلا تنفسخ الشرکۃ ما لم یکن فسخ احدھما معلوماً للآخر ص ۲۱۹۔

پائی جائے گی، تو وہ نفع کا مستحق ہو گا، غرض یہ کہ شرکت میں تین چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے، مال، عمل، ضمانت[1]۔

۶۔ لیکن یہ معاملہ کرتے وقت کسی شریک نے یہ کہہ دیا کہ میں کام میں شریک نہیں رہوں گا تو یہ شرکت اس کے حق میں فاسد ہو گی۔

مجلسِ انتظام شرکت کا کاروبار بڑے پیمانے پر چلانے اور اس کے نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے لئے اگر ضرورت ہو تو وہ اپنے میں سے ایک یا چند آدمیوں کو، یا شرکاء کے علاوہ کسی اور آدمی کو وہ اس کی ذمہ داری سپرد کر سکتے ہیں، لیکن شرکاء میں سے جن لوگوں سے یہ کام لیا جائے گا، تو چونکہ ان کا وقت زیادہ خرچ ہو گا، یا وہ زیادہ صلاحیت رکھتے ہوں گے، اس لئے ان کو منافع سے کچھ زیادہ حصّہ دیا جا سکتا ہے، مگر یہ جائز نہیں ہے کہ وہ متعین تنخواہ بھی لیں، اور منافع میں بھی شریک ہوں[2]، اسی طرح اگر شرکاء کے علاوہ کوئی باہر کا آدمی کاروبار چلانے کے لئے رکھا گیا تو اس کی دو حیثیتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ وہ کام کرے اور منافع کا کچھ حصہ اس کا بھی مقرر کر دیا جائے، تو یہ اس وقت مضارب ہو گا، اس لئے اس کو صرف نفع ہی پانے کا حق ہو گا، اور دوسری حیثیت ہے کہ اس کو تنخواہ دیجائے تو اس صورت میں وہ اجیر ہو گا، یعنی وہ صرف تنخواہ پائے گا، منافع میں شریک نہیں ہو سکتا، مقصد یہ ہے کہ شرکت اور مضاربت وغیرہ میں کوئی شریک یا مضارب تعیین کے ساتھ دوسرا فائدہ حاصل نہیں کر سکتا، یعنی اس کو ایک طرف متعین رقم بھی ملے، اور دوسری طرف غیر متعین فائدہ میں بھی شریک رہے۔

اب ہم شرکت کی تمام قسمیں اور اس کے احکام و شرائط بیان کرتے ہیں۔

---

[1] اذا لم یوجد احد امور الثلاثة یعنی المال والعمل والضمان فلا استحقاق للربح۔ الجملہ ص ۲۱۸

[2] وشرط اعطاء احدهما حصة زائدة من الربح یکون شرطاً جائزاً لانه یجوز ان یکون احدهما فی الاخذ والعطاء امهر وعمله ازید وانفع (المجلہ ص ۲۱۷ دفعہ ۱۳۴۵) البتہ مال میں برابری ضروری ہے ہدایہ میں ہے، فلانه من تحقیق المساواة ابتداءً وانتهاءً وذلك فی المال، البتہ جیساکہ اوپر ذکر ہوا ہے حیثیت اور صلاحیت میں فرق ہو سکتا ہے

۱۔ شرکت مفاوضہ مفاوضہ کے معنی ایک دوسرے کے سپرد کرنے کے ہیں، اس شرکت کو مفاوضہ اس لئے کہتے ہیں کہ ایک شریک دوسرے کو اپنا مال سپرد کر دیتا ہے، اس میں سرمایہ کا ہونا بھی ضروری ہے، اور نفع میں بھی برابری شرط ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسے صحیح نہیں سمجھتے، ان کے علاوہ دوسرے ائمہ شرکت مفاوضہ کو صحیح سمجھتے ہیں[1]، اس شرکت کے لئے حسب ذیل باتیں ضروری ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ اس میں شروع سے آخر تک دونوں کا سرمایہ برابر ہوگا۔

(۲) دونوں نفع میں برابر کے حصہ دار ہوں گے۔

(۳) ہر ایک شریک کو مال کے خریدنے بیچنے اور تصرف کرنے اور قرض دینے کا اختیار ہوگا۔

(۴) اگر کوئی شریک اپنی ذاتی ضرورت کے لئے کوئی چیز خریدے تو اس میں دوسرے شریک کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے، لیکن اگر یہ چیزیں اس نے اُدھار لی ہیں، تو دوکاندار کو دوسرے شرکاء سے بھی تقاضے کا حق ہے۔

(۵) شرکت مفاوضہ میں تمام شرکاء ایک دوسرے کے وکیل بھی ہوتے ہیں اور امین و کفیل بھی۔

(۶) یہ شرکت صرف مسلمان بالغوں ہی کے درمیان ہو سکتی ہے، کیونکہ غیر مسلم ان باتوں کی پابندی نہیں کر سکتا، جو اس کے لئے ضروری ہیں، یہ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے، صاحبین مسلم اور غیر مسلم دونوں میں صحیح سمجھتے ہیں۔ ہدایہ ج ۲ ص ۶۰۵ و لا بین اعلم والکافر۔

۲۔ شرکتِ عنان شرکتِ عقود کی سب سے مشہور قسم شرکتِ عنان ہے، عام طور پر اسی طریقہ شرکت کا کاروبار دنیا میں رائج ہے، اس میں نہ تو سرمایہ کا برابر ہونا ضروری ہے، اور نہ نفع میں برابری شرط ہے، اس کے جائز ہونے میں تمام ائمہ متفق ہیں۔ (بدایۃ المجتہد)

---

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۳ ص ۶۴، صاحب ہدایہ نے یہ جو لکھا ہے کہ امام مالکؒ کہتے تھے "لا اعرف ما المفاوضۃ" یہ صحیح نہیں ہے، ہدایۃ المجتہد میں ہے و اتفق مالک و ابو حنیفۃ بالجملۃ علی جوازها۔ ج ۲ ص ۲۵۴۔ امام شافعیؒ کی طرف یہ جملہ منسوب ہو سکتا ہے اس لئے کہ وہ صحیح نہیں سمجھتے۔

شرکتِ عنان کی تعریف

عنان کے لفظی معنی کسی چیز کے سامنے ظاہر ہو جانے کے ہیں، اسی سے محاورہ ہے "یجریانِ فی عنانٍ" یعنی دو آدمی جب فضل و کمال اور دوسری چیزوں میں برابر ہوتے ہیں، تو یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں، اسی طرح جب کوئی آدمی اپنی پوری کوشش کرلیتا ہے تو بولتے ہیں "امتلأ العنان" گویا عنان میں دو یا دو سے زیادہ آدمی جب شرکت کا کاروبار کرتے ہیں، تو ان کے پیشِ نظر کچھ فائدہ ہوتا ہے، اور دونوں اپنے حقوق اپنی مرضی سے خود طے کرتے ہیں، اور تمام شرکاء اپنی اپنی پوری محنت و کوشش صرف کرتے ہیں کہ اس سے فائدہ ہو۔

اس کے شرائط حسب ذیل ہیں:

۱ - شرکتِ عنان میں ہر شخص شریک ہو سکتا ہے، خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، شرکتِ مفاوضہ میں ہر ایک شریک ایک دوسرے کا وکیل بھی ہوتا ہے، اور کفیل بھی، مگر شرکتِ عنان میں کفیل نہیں ہوتا، بلکہ صرف وکیل ہوتا ہے، اگر کفالت کا ذکر عقد کے وقت کر دیا جائے تو صحیح ہے، وکیل کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کو بیچنے اور خریدنے کا اختیار ہوگا، اور کفیل کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک، ایک دوسرے کا ذمہ دار سمجھا جائے گا۔ کفیل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی نابالغ اس میں شریک نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اس میں کفیل بننے کی صلاحیت نہیں ہو سکتی[1]

۲ - جس طرح مفاوضہ میں سرمایہ اور نفع کا برابر ہونا ضروری ہے، اس طرح عنان میں یہ ضروری نہیں ہے، بلکہ دونوں کا سرمایہ کم یا زیادہ بھی ہو سکتا ہے، اور جس طرح سرمایہ کم یا زیادہ ہو سکتا ہے، اسی طرح نفع میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے، مثلاً کسی نے پانچ ہزار روپے لگائے اور دوسرے نے دو ہزار، اور دونوں نے خوشی سے طے کیا کہ منافع میں دونوں برابر رہیں گے، تو وہ ایسا کر سکتے ہیں، کیونکہ منافع کا تعلق محض سرمایہ سے نہیں ہوتا، بلکہ محنت، دوڑ دھوپ کے علاوہ اس میں ذہنی صلاحیت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ ایک

---

[1] اذا ذكرت الكفالة حين عقد شركة العنان يصير كل واحد من الشركاء كفيل الآخر اگر کفالت نہ ہو فيجوز للصبي المأذون عقد شركة العنان۔ (المجلہ ص۲۱۵)

شخص کا سرمایہ زیادہ ہو، مگر اس میں علمی و ذہنی صلاحیت کم ہو، اور دوسرا کم سرمایہ رکھتا ہو، لیکن علمی اور ذہنی صلاحیتوں میں زیادہ سرمایہ والے سے بڑھا ہوا ہو تو ایسا شخص سرمایہ کی کمی کی تلافی اپنی دوسری صلاحیتوں سے کرسکتا ہے، کیونکہ کاروبار کی کامیابی کا زیادہ تر دارومدار سوجھ بوجھ اور دوڑ دھوپ ہی پر ہوتا ہے، اور پھر زیادہ سرمایہ رکھنے والے میں اگر صلاحیت کم ہے تو اس کے لئے بھی روپیہ بیکار پڑا رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ وہ ایک باصلاحیت آدمی کو سرمایہ کی نسبت سے زیادہ نفع دے کر اس سے فائدہ حاصل کرے[1]۔ لیکن بہرحال اس کا تعلق آپس کی رضامندی ہی سے ہے، کسی کے اوپر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاسکتا۔

۳۔ تمام شرکاء کا سرمایہ تو برابر ہو لیکن نفع میں کمی زیادتی طے ہوتی ہو، اور عام شرکاء کام میں شریک ہونے کے لئے تیار نہ ہوں، بلکہ وہ کاروبار کی پوری ذمّہ داری کسی ایک یا دو آدمی کے سپرد کر دیں، تو جس کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے، اگر یہ وہ شخص ہے، جس کا نفع زیادہ مقرر ہوا ہے، تو پھر یہ شرط لگائی جاسکتی ہے، لیکن اگر یہ شرط اس شخص کے ساتھ لگائی گئی ہے، جس کا نفع کم رکھا گیا ہے، تو یہ شرط جائز نہیں ہے، بلکہ اس کو سرمایہ کے مطابق منافع ملے گا، کیونکہ جس کا منافع زیادہ تھا، وہ تو اپنے سرمایہ اور محنت کا بدلہ پا گیا، لیکن جس کا منافع کم تھا، وہ بیچارہ تو نقصان میں رہے گا، کیونکہ سرمایہ بھی اس نے برابر لگایا، محنت بھی کی اور منافع بھی اس کو کم ملا، اسی طرح اگر کسی کا سرمایہ زیادہ لگا ہے اور نفع کم مقرر ہے، اور تنہا اس کے ذمّہ کاروبار کی نگرانی اور انتظام ہے تو اس صورت میں منافع کی کمی کی شرط بیکار سمجھی جائے گی، اور اس کو سرمایہ کے مطابق حصّہ ملے گا، کیونکہ اس صورت میں اس نے دوہری محنت کی، اور سرمایہ بھی لگایا، پھر بھی نفع کم ملا یہ زیادتی ہے، جسے اسلامی شریعت نے کسی وقت بھی روا نہیں رکھا ہے[2]۔

---

[1] وشرط احدهما حصة زائدة من الربح يكون شرطا جائزا لانه يجوز ان يكون احدهما في الاخذ والعطاء امهر وعمله ازيد وانفع ص ۲۱۷ المجله۔ [2] وان كان العمل مشروطا على الشريك الذي حصته من الربح قليلة فهو غير جائز ينقسم الربح بينهما على مقدار رأس مالهما ص ۲۲۲ المجله

۴ ۔ نفع کی تقسیم کی مقدار طے ہوجانی چاہیئے، یعنی اس طرح کہ ½، ⅓ یا ¼ یا دس فی صدی فلاں کو اور بیس فی صدی فلاں کو یا سب کو برابر حصّہ ملے گا، اگر اس طرح یہ طے کیا گیا کہ ایک ہزار روپے تو فلاں آدمی کے متعین رہیں گے، باقی جو بچے گا، وہ شرکاء کا رکا، تو یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ اتنا ہی نفع ہو، جتنا اس کا مقرر ہے، تو دوسرے شرکاء نقصان میں رہیں گے[1]

۵ ۔ جو نقصان ہوگا وہ اصل سرمایہ سے پورا کیا جائے گا، نفع پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، لیکن یہ اس صورت میں ہے جب نقصان قصداً نہ کیا گیا ہو بلکہ اچانک ہوگیا ہو، اگر کسی شریک نے جان بوجھ کر نقصان اٹھایا، یا نقصان کیا تو پھر اس کی ذمہ داری اس کے سر ہوگی، یعنی وہ اس کے نفع یا اصل سے پورا کیا جائے گا[2] اس کی تفصیل مضاربت کے بیان میں آچکی ہے۔

۶ ۔ نفع و نقصان دونوں میں تمام شرکاء شریک سمجھے جائیں، اگر کسی نے یہ شرط لگائی کہ نقصان ہمارے ذمہ اور نفع میں سب لوگ شریک رہیں گے، تو یہ شرکت ناجائز ہوگی۔

۷ ۔ اگر شرکت کسی وجہ سے فاسد ہوگئی، یا معاہدہ خود ہی فسخ کر دیا گیا، تو منافع سرمایہ کے مطابق تقسیم ہوگا، مثلاً کسی نے ایک ہزار روپیہ لگایا تھا، اور کسی نے دو ہزار، تو ایک ہزار روپے والے کو ⅓ اور دو ہزار روپے والے کو ⅔ ملے گا، اگرچہ شرکت کرتے وقت منافع کے زیادہ و کم لینے ہی کی شرط کیوں نہ لگادی گئی ہو، وہ شرط شرکت کے فاسد و منسوخ ہونے کی صورت میں کالعدم سمجھی جائے گی[3]

۸ ۔ جس غرض کے لئے شرکت کی گئی ہے، اس میں شرکت کے مال کو خرچ کرنے اور تصرّف کرنے کا ہر شریک کو برابر حق ہے، مثلاً اگر دو آدمیوں نے مل کر دو ہزار کی تجارت کی، تو دونوں کو کسی مال کے منگانے، چھڑانے، ادھار مال بیچنے یا ادھار لگانے کا حق ہے، اگر دونوں میں

---

[1] ولا یجوز الشرکۃ اذا شرط لاحدھما دراھم مسماۃ من الربح (ھدایہ ج ۲ ص ۶۱۲)

[2] الضرر والخسار الواقع بلا تعمد ولا تقصیر ینقسم علی مقدار رأس المال ص ۲۲۱ ۔

[3] یقسم الربح فی الشرکۃ الفاسدۃ علی مقدار رأس المال۔ (المجلہ ص ۱۲۱)

سے کسی سے نقصان ہوگا، تو دونوں کی ذمہ داری سمجھی جائے گی، البتہ اگر دوسرے ساتھی نے کسی چیز کے خریدنے سے اس کو منع کیا، اور اس نے پھر بھی خریدا اور اس میں نقصان ہوا تو اس کی ذمہ داری تنہا اس کے اوپر ہوگی، اسی طرح اگر اس نے کسی چیز کے خریدنے یا بیچنے میں بہت شدید قسم کا دھوکہ کھایا ہے، تو اس کی ذمہ داری بھی اسی پر ہوگی، دوسرے شریک کا سرمایہ محفوظ سمجھا جائے گا[1]

۹۔ اپنے ذاتی مال کے ساتھ شرکت کا مال ملانا، یا دونوں کاروبار ملا جلا رکھنا جائز ہے، اگر دوسرا شریک اس کی اجازت دے دے تو پھر کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح تمام شرکاء کی اجازت کے بغیر کسی نئے آدمی کو اس میں شریک نہیں کیا جاسکتا[2]

۱۰۔ جس مشترک کاروبار میں یہ مشترک سرمایہ لگایا ہے، اگر اسی زمانہ میں اسی طرح کا کوئی کاروبار کوئی شریک اپنے ذاتی روپے سے الگ کرنے لگے تو اس کا یہ ذاتی کاروبار بھی مشترک ہی سمجھا جائے گا، اگرچہ وہ باقاعدہ اس بات کا ثبوت ہی کیوں نہ فراہم کردے کہ یہ اس کا ذاتی کاروبار ہے، مثلاً کچھ لوگوں نے مشترک سرمایہ سے کپڑے کی دوکان کھولی، یا شیشہ کا برتن یا کوئی اور سامان بنانے کا کارخانہ کھولا تو اب کسی شریک کو اپنے ذاتی روپے سے دوسری کوئی کپڑے کی دوکان یا شیشہ و برتن کا کارخانہ کھولنے کی اجازت نہ دی جائے گی، چاہے وہ ثابت ہی کیوں نہ کردے، کہ وہ اس کا ذاتی کاروبار ہے، البتہ اگر وہ اپنے ذاتی روپے سے دوسرا کوئی کاروبار کرے تو اس کی اجازت ہے، مثلاً اگر وہ کپڑے کے بجائے جوتے کی دوکان کھولے تو اس کی اجازت ہوگی، یہ قید اس لئے بڑھائی گئی ہے کہ وہ مشترک سرمایہ کے کاروبار

---

[1] یجوز لکل واحد من الشریکین ان یبیع مال الشرکۃ سواء کان بالنقد او بالنسئۃ بما قل او کثر۔ لکن اذا اشتری مالا بالغبن الفاحش لا یکون مالہ للشرکۃ بل یکون لہ۔ المجلہ ص۲۲۲

[2] لیس لہ ان یخلط مال الشرکۃ بمالہ ولا ان یعقد شرکۃ مع آخر بدون اذن شریکہ۔ المجلہ ص۲۲۳

کو اپنے ذاتی کاروبار سے نقصان نہ پہونچا دے، یا مشترک سرمایہ کو غلط طور پر اپنی منفعت کے لئے نہ استعمال کر سکے[1]

۱۱۔ تمام شرکاء کی اجازت کے بغیر کوئی شریک کسی دوسرے آدمی کو مشترک سرمایہ سے قرض نہیں دے سکتا۔ (المجلہ دفعہ ۱۳۸۰ ص ۲۲۴)

۱۲۔ اگر سرمایہ قرض لے کر دو یا بہت سے آدمی کوئی مشترک کاروبار کریں، تو یہ جائز ہے، مگر یہ قرض سودی نہ ہو[2]

۱۳۔ مشترک کاروبار کے سلسلہ میں، سفر میں مزدوری یا دوکان کے کرایہ وغیرہ میں یا کارخانہ کے بنانے یا مشین کے لگانے میں جو کچھ خرچ ہوگا، وہ مشترک سرمایہ میں سے لے لیا جائے گا[3]

۱۴۔ اگر کسی ایک شریک نے دوسرے شریک کو یا چند شرکاء نے ایک شریک کو مشترک سرمایہ سپرد کر کے کہا کہ تم تجارت یا صنعت کا جو کام چاہو کرو تو پھر اس کو اختیار ہے کہ وہ جو کاروبار چاہے کرے، اور جس طرح چاہے کرے، لیکن اگر وہ قصداً سرمایہ برباد کرے گا، یا فضول کاموں یا اپنے تعیشات میں خرچ کرے گا تو اس کی ذمہ داری اس کے اوپر ہوگی، یعنی تمام شرکاء اس کا تاوان اس کے سرمایہ سے وصول کریں گے[4]

۱۵۔ اگر کسی شریک نے دوسرے شریک سے یا چند شرکاء نے کسی ایک شریک سے یا ایک شریک نے چند شرکاء سے یہ کہا کہ کاروبار اس شہر میں کرنا بہتر ہوگا، لیکن دوسرے شرکاء نے کسی دوسری

---

[1] اذا عقد الشركة اثنان على تجارة البز فاشترى احدهما حصانا بمال نفسه يكون له لكن اذا اشترى ثوب بز يكون للشركة ولو اشهد حال شرائه لا يفيد ويكون ذلك الثوب مشتركا بينه وبين شركائه ـ المجلہ ص ۲۲۳۔

[2] لكن له ان يستقرض لاجل الشركة ـ (المجلہ ص ۲۲۴)

[3] اذا ذهب احد الشريكين الى ديار اخرى لاجل امور الشركة ياخذ مصرفه من مال الشركة ـ ص ۲۲۴ ـ

[4] شرح المجلہ ص ۲۲۵، دفعہ ۱۳۸۲۔

جگہ یہ سرمایہ لگایا تو اگر اس میں نقصان ہوگا، تو اس کی ذمہ داری صرف ان ہی لوگوں پر ہوگی، جنہوں نے اپنی رائے سے ایسا کیا ہے، اور نفع میں وہ شخص اسی طرح شریک ہوگا، جس طرح معاہدہ ہوا ہے، غرض یہ کہ ہر شریک کی رضامندی ضروری ہے[1]

۳۔ شرکتِ اعمال یا شرکتِ صَنائع

شرکتِ عقود کی تیسری قسم شرکتِ اعمال یا شرکتِ صنائع ہے، یعنی وہ شرکت جس میں سرمایہ کے بغیر دو ہم پیشہ یا دو مزدور اس بات کا معاہدہ کریں کہ فلاں کام ہم مل جل کر کریں گے، جو کچھ اس سے پیسہ ملے گا، وہ دونوں بانٹ لیں گے، مثلاً دو مزدور اسٹیشن پر سامان ڈھونے کے لئے یہ طے کریں کہ دونوں کے کام سے جو پیسہ ملے گا، اس کو برابر یا کم و بیش بانٹ لیں گے، یا ایک مکان یا ایک موٹر یا ہوائی جہاز کے بنانے کا ٹھیکہ لیں، اور یہ شرط ٹھہرائیں کہ جو پیسہ ملے گا، بانٹ لیں گے، اسی طرح دو سُناروں نے یا دو موچیوں نے یہ معاہدہ کیا کہ جس کے پاس بھی کام یا آرڈر آئے گا، وہ اسے قبول کرلے گا، اس کو دونوں مل کر یا علیحدہ علیحدہ کریں گے، اور دونوں کے کام سے جو فائدہ ہوگا، اس فائدہ میں دونوں شریک ہوں گے، یہ تمام صورتیں جائز ہیں، اس کو شرکتِ اعمال یا شرکتِ صنائع اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں نقد سرمایہ مشترک نہیں ہوتا، بلکہ عمل اور پیشہ (صنعت) مشترک ہوتا ہے، اس کا نام شرکتِ تَقَبُّل بھی ہے، یعنی دو آدمی مشترک طور پر ایک کام کو قبول کرلیتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہ اس طرح کی شرکت کرتے تھے، حدیث میں ہے کہ حضرت ابو عبیدہ، حضرت سعد بن وقاص اور حضرت عمّار نے غزوۂ بدر میں یہ معاہدہ کیا تھا کہ جو کچھ مالِ غنیمت ملے گا، وہ سب کا مشترک حصّہ ہوگا، خواہ ایک ہی آدمی کیوں نہ پائے[2] اس شرکت کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے لئے چند ضروری شرطیں ہیں۔

۱۔ شرکتِ عنان کی طرح اس میں بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کام برابر کرے، اور

---

[1] المجلہ دفعہ ص۲۲۶، دفعہ ۱۳۸۳، اذا نہی احد الشریکین الاخر ... فلم یسمع یضمن حصۃ شریکہ

[2] اما شرکۃ الصنائع وبسمی شرکۃ التقبل کالخیاطین والصباغین یشترکان علی ان الاعمال والکسب بینھما فیجوز۔ (ھدایہ ج ۳ ص۶۱۲)

مزدوری کی رقم میں برابر کا شریک ہو، بلکہ اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے، مثلاً چند مزدوروں نے مشترک طور پر ایک نہر کھودنے کا کام کیا، تو اب ضروری نہیں ہے کہ ہر مزدور برابر کام کرے، اور برابر نفع پائے، اس لئے کہ ہر انسان کی صلاحیت اور طاقت جدا جدا ہوتی ہے ایک جوان آدمی بوڑھے سے زیادہ کام کرے گا، تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی محنت کے مطابق مزدوری بھی پانے کا حقدار ہوگا، کیونکہ اس شرکت میں اصل سرمایہ محنت اور صلاحیت ہی ہے، اسی طرح دو درزی مل کر یہ معاہدہ کرتے ہیں، جو کپڑے دونوں کے پاس سینے کے لئے آئیں گے وہ دونوں کے مشترک ہوں گے، اور مزدوری دونوں تقسیم کریں گے، تو یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں کے پاس کام برابر آویں، یا دونوں کام برابر کریں، اور نفع بھی برابر لیں، کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک اگر سلائی میں محنت زیادہ کرتا ہے، تو دوسرا کپڑے کترنے میں زیادہ ماہر ہے، اور اسی کی وجہ سے کپڑے زیادہ سلنے کے لئے آتے ہیں، یا دونوں میں سے ایک کا ہاتھ زیادہ صاف اور باریک سے باریک کام کر لیتا ہے، اور دوسرا موٹا ہی کر سکتا ہے، تو ظاہر ہے کہ دونوں کی مزدوری میں بھی تفاوت ہو سکتا ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ دونوں کی رضامندی سے ایسا ہو[1]

۲۔ جو شخص کام دے گا، اس کو ان میں سے ہر ایک شریک سے تقاضے کا حق حاصل ہوگا، خواہ کسی کی مزدوری کم ہو یا زیادہ۔

۳۔ شرکاء میں سے جو بھی کوئی کام یا کام کا آرڈر لے گا، وہ تمام شرکاء کی طرف سے سمجھا جائے گا، اس کی ذمہ داری سب پر ہوگی، شریک سُناروں میں سے کسی ایک نے زیور بنانے کا آرڈر لیا تو وہ آرڈر دوسرے شرکاء کی طرف سے بھی سمجھا جائے گا، دوسرا یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ آرڈر تو میرے شریک نے لیا ہے، اس لئے مجھ سے کوئی مطلب نہیں[2]

---

[1] تقسیم الشرکاء الربح بینهم علی الوجه الذی شرطوه - اذا شرط التساوی فی العمل والتفاضل فی الکسب کان جائزًا لانه یجوز ان یکون احدهما امهر فی صنعة، المجلہ ص ۲۲۶ -

[2] لیس لاحدهما ان یقول هذا العمل تقبله شریکی فانا لا اخالطه - المجلہ ص ۲۲۵ -

۴ - ان میں سے ہر ایک شریک کام یا کام کا آرڈر دینے والے سے پوری مزدوری مانگ سکتا ہے، اور جس نے کام دیا ہے، اگر اس نے کسی ایک کو بھی مزدوری دے دی تو دوسرے کو اب اس سے کچھ کہنے سننے کا حق نہیں ہے، مثلاً اوپر والی مثال میں معاہدہ کرنے والے مزدوروں میں سے کسی مزدور کو نہر کھودنے کی مزدوری دے دی گئی ہے تو وہ ادا ہو جاتے گی، البتہ اگر مزدوروں نے یہ کہہ دیا ہو کہ فلاں آدمی ہی کو مزدوری دے دی جائے تو پھر مالک کو دوسرے مزدور کو مزدوری نہ دینی چاہیئے۔

۵ - اگر کسی شریک نے کام کیا اور کسی نے نہیں کیا تو کام دینے والے یعنی مستاجر کو اس پر اعتراض کا حق نہیں ہے، البتہ اگر اس نے شرط لگا دی ہو کہ تم ہی کرو تو پھر اس کو کرنا ضروری ہوگا، مثلاً دو کاریگروں نے ایک مکان کی تعمیر کا ٹھیکہ لیا، تو دونوں میں سے اگر ایک ہی کام کرے تو بھی تعمیر کرانے والے کو اس میں اعتراض کا حق نہیں ہے، اگر اس نے ٹھیکہ دیتے وقت یہ کہہ دیا ہو کہ دونوں آدمی کام میں عملاً شریک رہیں گے، تو پھر پابندی ضروری ہے[1]

۶ - اگر شرکاء میں سے کسی نے کسی مجبوری کی وجہ سے کوئی کام نہیں کیا، مثلاً بیمار پڑ گیا، یا کسی اور وجہ سے نہ کر سکا تو بھی وہ فائدہ اور اجرت میں شریک رہے گا[2]

۷ - اگر کوئی نقصان ہوگا، تو اس کے ذمہ دار تمام شرکاء ہوں گے، مثلاً چند آدمیوں نے ایک پُل بنانے کا ٹھیکہ لیا اور اس میں نقصان ہوگیا تو تمام شرکاء اپنے حصّہ کے مطابق اس کو برداشت کریں گے، مثلاً جس کو فائدہ میں ½ حصّہ تھا، وہ ½ خسارہ برداشت کرے گا، اور جو ⅔ کا مستحق

---

[1] لا یجبر احد الشریکین علی ایفاء ما تقبله من العمل بالذات ان شاء یعمله بیده و ان شاء یعطیه إلی شریکه - لکن ان شرط المستاجر علیه بالذات یلتزمه حینئذ عمله ص ۲۲۵ المجله -

[2] الشریکان بضمان العمل یستحقان الاجرة کما لو مرض او جلس بطالا یقسم الربح و الاجرة بینهما علی الوجه الذی شرطوه ص ۲۲۶ المجله -

تھا، وہ اتنا برداشت کرے گا[1]

۸ - اگر دو پیشہ ور اس طرح شرکت کریں کہ دوکان تو ایک آدمی کی ہوگی، اور اوزار یا کام دوسرے کا ہوگا تو یہ شرکت بھی جائز ہوگی۔

۹ - اگر دو آدمیوں کے پاس دو ٹرک ہوں، اور وہ یہ معاہدہ کریں کہ جو مال لادنے کے لئے ملے گا، اس کو دونوں میں سے کوئی پہونچا دے گا، اور جو کرایہ ملے گا، دونوں تقسیم کرلیں گے، تو یہ جائز ہے، دونوں برابر منافع تقسیم کرلیں، لیکن اگر یہ شرکت اس طرح ہو کہ دونوں جو کچھ کمائیں گے، اس میں بانٹ لیں گے، تو جائز نہیں ہے، یعنی معاہدہ شرکت کام اور اجرت دونوں کے لئے ہونا چاہیئے، محض اجرت میں نہیں[2]

۱۰ - اگر گھر کے مالک نے کوئی کام کیا، اور اس میں گھر کے بچے عورتیں بھی شریک ہوں، تو یہ قانونی شریک نہیں سمجھے جائیں گے، بلکہ یہ اس کے مددگار شمار ہوں گے، ان کو الگ سے کوئی حصہ نہیں دیا جائے گا، مثلاً کسی شریک سے سینے کے لئے کپڑا لیا اور اس کی سلائی میں گھر کی عورتوں اور بچوں نے بھی ہاتھ بٹایا تو ان کو الگ سے کوئی اجرت نہیں دی جائے گی[3] البتہ وہ اس سے الگ رہتا ہے، اور اس نے اس کے کام میں ہاتھ بٹایا تو اس کو اجرت الگ سے ملے گی۔

۴ - شرکت الوجوہ

شرکت عقود کا چوتھا طریقہ شرکت الوجوہ ہے، یعنی دو یا اس سے زیادہ آدمی نہ تو کاروبار میں سرمایہ لگائیں، اور نہ دونوں کسی کام اور پیشہ میں شریک ہوں، بلکہ اپنی ساکھ اور وجاہت کی بنا پر یہ معاہدہ کریں کہ تاجروں سے ادھار مال

---

[1] ویقسم الخسار بین الشریکین علی مقدار الضمان مثلاً اذا عقد الشرکة علی تقبل الاعمال وتعهدها مناصفة یقسم الخسار ایضاً مناصفة ص ۲۲۶ المجلہ۔

[2] اذا لم یعقد الشرکة علی تقبل العمل بل ایجار البغل والجمل عینا وتقسیم الاجرة الحاصلة بینهما فالشرکة فاسدة ص ۲۲۶ المجلہ۔

[3] اذا عمل شخص فی صنعة هو وابنه الذی فی عیاله فکافة الکسب لذلك الشخص وولده لا یعد معینا له۔ (المجلہ ص ۲۲۶)

لے کر ہم فروخت کریں گے، اور جو کچھ فائدہ ہوگا، مال کی قیمت ادا کرنے کے بعد بانٹ لیں گے،
اس کو شرکتِ وجوہ اس لئے کہتے ہیں کہ اپنی ساکھ اور وجاہت سے وہ ادھار مال حاصل کر لیتے
ہیں، اگر ان کی ساکھ نہ ہو تو پھر ان کو ادھار مال نہ مل پاتے۔

۱۔ اس شرکت کے لئے بھی وہی شرائط ہیں جو شرکۃ الصنائع کے ہیں، یعنی اس میں دونوں
جو منافع طے کریں گے، وہ ملے گا، اور جو گھاٹا ہوگا، وہ منافع کے لحاظ سے دونوں برداشت
کریں گے، البتہ ایک شرط اس میں زیادہ ہے کہ جو اپنی ساکھ اور وجاہت کی وجہ سے جتنا زیادہ
حاصل کرے گا، اور جتنے مال کی ذمہ داری یعنی ضمانت لے گا، وہ اتنا ہی زیادہ نفع پانے کا
حق دار ہوگا، اور اگر یہ شرط کی گئی کہ مال دونوں برابر حاصل کریں، یا کم یا زیادہ حاصل کریں،
مگر ہر صورت میں فائدہ میں برابر شریک ہوں گے، تو یہ شرط لغو سمجھی جائے گی[1] جس نے جتنا
مال زیادہ حاصل کیا ہے، اسی اعتبار سے اس کو نفع میں حصہ ملے گا، یا کوئی فریق یہ شرط کرے
کہ ہم نصف مال کے ذمہ دار ہیں، مگر فائدہ زیادہ لیں گے، تو شرط لغو ہے' دونوں میں آدھا
آدھا نفع تقسیم ہوگا۔

۲۔ جو نقصان ہوگا، اس کا خسارہ دونوں کو نفع کے اعتبار سے برداشت کرنا پڑے گا، یا
یوں کہیے کہ جتنا مال انھوں نے حاصل کیا ہے، یا جتنے کی ذمہ داری لی ہے، اسی تناسب سے ان کو
گھاٹا برداشت کرنا پڑے گا، مثلاً اگر کسی نے دو حصہ مال حاصل کیا ہے اور وہ اس کا ذمہ دار
ہے، اور کسی نے ایک حصہ حاصل کیا، اور وہ اس کا ذمہ دار ہے تو خسارہ کی صورت میں اسی
اعتبار سے دونوں خسارہ برداشت کریں گے۔ (المجلہ ص ۲۲۷)

اگر اس میں شرکتِ مفاوضہ کے طور پر دونوں' مال برابر حاصل کرنے اور نفع کی شرط لگائیں
تو یہ بھی جائز ہے، اس وقت دونوں وکیل بھی ہوں گے اور کفیل بھی، لیکن اگر اسے مطلق رکھیں گے
تو یہ شرکتِ عنان کی صورت ہو جائے گی، (ہدایہ ج ۲ ص ۶۱۴)

---

[1] فان اشترطا ان المشتری بینھما نصفان والربح کذلک یجوز ولا یجوز ان
یتفاضلا فیہ۔ (ھدایہ ج ۲ ص ۶۱۴)

ہدایت ذمہ دار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اتنے مال کا ضامن ہے، اگر وہ ضائع ہوگیا، یا اس میں گھاٹا آگیا، تو اسی اعتبار سے اس کو تاوان دینا پڑے گا اور اس ضمانت وذمہ داری کے اعتبار سے منافع تقسیم کیا جائے گا۔

شرکت کی ان تمام قسموں کو ائمہ ثلثہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ صحیح سمجھتے ہیں، البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ شرکتِ عنان کے علاوہ کسی اور شرکت کو صحیح نہیں سمجھتے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۳)

شرکت کی ان تمام ہی قسموں کے تحت ہر طرح کا مشترکہ کاروبار کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، اور اس کی گنجائش ائمہ اربعہ کے مسلک میں موجود ہے، مگر امام مالکؒ سے اس سلسلہ میں جو تفصیلات مذکور ہیں، ان کا کچھ ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

علاج ومعالجہ کی شرکت دو یا دو سے زیادہ ڈاکٹر اور طبیب مشترکہ طور پر علاج کے لئے مشترکہ شفاخانہ قائم کرسکتے ہیں، یا مشترکہ سرمایہ سے یا شرکۃ الوجوہ کے تحت دو کمپنیوں سے دوا منگا کر کاروبار کرسکتے ہیں، اور نفع میں برابر یا جو فی صد طے ہوجائے نفع لے سکتے ہیں۔

تعلیمی شرکت طبی شراکت کی طرح دو یا دو سے زیادہ اساتذہ بچوں کی تعلیم وتربیت کے ٹٹوریل کلاسز چلا کر شرکۃ الوجوہ کے تحت اپنی روزی کما سکتے ہیں، اور مضمون اور سبجکٹ کے اہم اور غیر اہم ہونے کی بنیاد پر آپس میں نفع تقسیم کرسکتے ہیں[1]

شرکتِ زراعت کوآپریٹو سسٹم زراعت کا رواج کمیونسٹ ملکوں میں عام طور پر رائج ہے، اور بعض جمہوری ملکوں میں جیسا کہ ہمارے ملک میں بھی تجربہ کیا جارہا ہے مگر اس کے لئے ذہنی تبدیلی کی ضرورت ہے، اگر معاشرہ کی اخلاقی ذہنیت بلند نہ ہوگی تو یہ چیز بہت سی خرابیوں کو جنم دے گی، پھر اس کے ساتھ ذاتی ملکیت جو انسان کی فطرت میں داخل ہے اس کو جبراً نہ ختم کیا جائے، تو پھر شراکتی کاروبار مفید ہوسکتا ہے، اور اسلامی شریعت اجازت بھی

---

[1] المدونۃ الکبریٰ ج ۴ ص ۲۶ شرکۃ الاطباء والمعلمین۔

دیتی ہے، آگے مزارعت کا بیان آرہا ہے، مگر یہاں شرکت کے بیان کی مناسبت سے مشترکہ کاشت کے بارے میں چند باتیں لکھی جارہی ہیں۔

مشترکہ سرمایہ سے یا شرکۃ الوجوہ کی بنا پر مویشی، زراعت کے آلات، سامان اور بیج وغیرہ حاصل کرکے اپنی اپنی زمین کی ملکیت کو باقی رکھتے ہوئے مشترکہ کھیتی کی جائے تو یہ جائز ہے[1]، اسی طرح معدنی اشیاء کے نکالنے یا باربرداری وغیرہ کے لئے مشترکہ کاروبار کیا جاسکتا ہے[2]

ائمہ ثلاثہ کے یہاں یہ تفصیل تو نہیں نظر سے گذری، مگر ان کے جو اصول اوپر بیان کئے ہیں، ان کی بنا پر کم سے کم حنفی اور حنبلی فقہ میں بھی اس کی گنجائش ہے۔

قرض

دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے، جن کو کبھی نہ کبھی قرض اور اُدھار لینے کی ضرورت نہ پیش آجاتی ہو، یہ ضرورت صرف بے سہارا غریب و مجبور افراد ہی کو نہیں، بلکہ بڑے بڑے دولت مندوں اور بڑی بڑی حکومتوں کو بھی پیش آجاتی ہے، ایک شخص گھر پر لاکھوں روپے کا مالک ہوتا ہے، مگر سفر میں کبھی کبھار وہ چند پیسے کے لئے مجبور و محتاج ہو جاتا ہے، ایک آدمی ہزاروں روپے ماہوار کماتا ہے، اور اس کے بیوی بچے نہایت آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے رہتے ہیں، مگر ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ وہ یک بیک مرجاتا ہے، اور اس کے بال بچے اپنی بنیادی ضرورتوں کے لئے بھی ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، بڑی بڑی حکومتیں، جو دوسروں کو قرضے دیتی ہیں، جنگ کے زمانے میں معمولی آمدنی رکھنے والے افراد تک سے قرضہ لیتی ہیں، غرض یہ کہ قرض ضرورت مندوں کے لئے ایک ایسا سہارا ہے، جس سے وہ اپنی بہت سی انفرادی، اجتماعی، معاشی

---

[1] ایضاً باب الشرکۃ فی الزرع۔

[2] المدونہ ج ۴ ص ۲۷،۲۸، الشرکۃ فی حفر القبور و المعادن و شرکۃ الحمالین علی رؤسہما ادوابہما۔

اور سیاسی ضروریات میں کام لیتے ہیں، مگر یہ سہارا اسی وقت تلاش کرنا چاہیئے جب آدمی معاشی، معاشرتی، سیاسی حیثیت سے بالکل مجبور ہو جائے، یا اس کی عزّت و آبرو یا جان خطرے میں پڑ جائے، یا کوئی شدید دینی ضرورت پیش آجائے، ورنہ عام حالت میں قرض کو ایک بلا سمجھ کر اس سے جس قدر ہو سکے، دور ہی رہنا چاہیئے، یہ بلا ایسی بلا ہے بے درماں ہے، کہ ایک بار جس گھر کو دیکھ لیتی ہے، یا جس شخص کا دامن تھام لیتی ہے، تو مرنے کے بعد بھی اس کا دامن مشکل سے چھوڑتی ہے، دنیا میں بہت سے افراد ہی نہیں بلکہ بڑی بڑی حکومتیں اس کا شکار ہو چکی ہیں اور اب بھی آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔

یوں تو قرض بذاتِ خود ایک مصیبت ہے، مگر اس کے دامن میں ایک اور چیز ہمیشہ لپٹی رہی ہے، اور آج پہلے سے زیادہ اس سے لپٹی ہوئی ہے، وہ ہے سود یا منفعت پرستی، یعنی جن لوگوں کو خدا نے آسودہ حال بنایا ہے، وہ جب کسی پریشان حال آدمی کو قرض دیتے ہیں، تو یہ جذبہ ان میں بہت کم پیدا ہوتا ہے کہ قرض دینا ان کا ایک انسانی فریضہ تھا، جسے انھوں نے ادا کیا، بلکہ خود غرضی اور منفعت پرستی ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا کرتی ہے کہ قرض دار جب اس سے روپے لے کر اپنی ضرورت پوری کر رہا ہے، یا اس سے کوئی فائدہ اٹھا رہا ہے تو وہ بھی کیوں نہ اس کے بدلہ میں کوئی مادّی یا غیر مادی فائدہ حاصل کرے، جلبِ منفعت کا یہ جذبہ اس کو اس روپیہ کا سود لینے پر آمادہ کرتا ہے، چنانچہ اگر وہ اس سود میں کمی واقع ہوتے دیکھتا ہے، یا اس کے مارے جانے کا خطرہ ہوتا ہے، تو اصل کی طرح اس کے بچانے کی بھی فکر کرتا ہے، بلکہ اس کی وجہ سے کبھی کبھار وہ قرضدار کی عزّت و آبرو سے بھی کھیلنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اور اگر کسی اخلاقی یا معاشی یا قانونی دباؤ کی وجہ سے وہ سود لینے سے باز رہا، اور اس کی عزت و آبرو سے نہ کھیلا تو پھر کم سے کم قرضدار کی طرف سے اس وقت تک ممنونیت کا اظہار چاہتا رہتا ہے، جب تک وہ قرض ادا نہ کرے، بلکہ بسا اوقات زندگی بھر قرضدار اس کی ممنونیت کے بارِ گراں سے سبکدوش نہیں ہوتا، وہ اپنی منفعت پرستی میں اتنا اندھا ہو جاتا ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ بات نہیں سوچتا کہ جو شخص اصل رقم دینے کی قدرت نہ رکھتا ہو، وہ سود کہاں سے دے گا، پھر یہ خیال بھی اس کو دامن گیر نہیں ہوتا کہ ممکن ہے کہ زندگی میں اس کے لئے بھی کبھی کوئی وقت آجائے، اور اسے بھی دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا

پڑجاتے، اور یہ مجرمانہ ذہنیت صرف اشخاص و افراد ہی کی نہیں، بلکہ حکومتوں کی بھی ہوتی ہے، کوئی ملکی حکومت جب باشندگانِ ملک کو ان کی معاشی یا معاشرتی ترقی کے لئے کوئی قرضہ دیتی ہے تو دس بیس سال تک اصل رقم کے ساتھ اس رقم کا سود بھی وصول کرتی رہتی ہے، اس طرح ایک قرض لینے والے کو اصل رقم کی ڈیڑھ گنا ۱۱/۲ یا کم از کم سوائی ۱۱/۴ دینی پڑتی ہے، اسی طرح ایک حکومت جب کسی دوسری حکومت سے قرضہ لیتی ہے، تو قرض لینے والی حکومت کو اصل روپے کے ساتھ سود بھی دینا پڑتا ہے، اور پھر سود کے ساتھ کچھ اور سیاسی اور تجارتی حقوق بھی اس کو دینے پڑجاتے ہیں، جن کی وجہ سے قرض دار حکومت قرض خواہ حکومت کا ایک ضمیمہ بن کر رہ جاتی ہے، اس کی مثال تلاش کرنی تو مشرق وسطیٰ کے ممالک، ہندوستان اور خاص طور پر پاکستان میں روس و امریکہ کی مالی امداد اور قرضوں کی بھرمار پر ایک نظر ڈال لیجئے، قرض کی بلا نے ان ممالک کو کس قدر پابہ زنجیر کر دیا ہے، قرض کا معاملہ ایک اور حیثیت سے بھی قابلِ غور ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ قرض دار قرض لے کر اس کو چکا بھی دے، اس لئے قرض خواہ کو اس کے بچاؤ کے لئے بہت سی تدبیریں اختیار کرنی پڑتی ہیں، مگر پھر بھی بسا اوقات اس کا روپیہ مارا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں کچھ انسانی ہمدردی ہوتی ہے، اور وہ سود لینے سے بھی گریز کرتے ہیں مگر وہ بھی اکثر قرض دینے سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ کہیں ان کا روپیہ مارا نہ جائے، یہی صورت حکومتوں کی بھی ہے۔

اسلامی شریعت کی ہدایات

قرض چونکہ ایک ناگزیر انسانی ضرورت اور برے وقت کا ایک سہارا ہے، اس لئے اسلامی شریعت نے آڑے وقت پر اس سہارے سے کام لینے کی اجازت تو دی ہے، مگر اسی کے ساتھ اس نے قرضدار اور قرض خواہ دونوں پر کچھ ایسی اخلاقی اور قانونی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ اگر ان کو برتے کار لایا جائے تو ضرورت مندوں کو آسانی سے قرض بھی مل جائے، اور وہ سود کی لعنت اور قرض خواہ کی ممنونیت سے بھی نجات پا جائیں، اور قرض دار اور قرض خواہ دونوں ان تمام دوسرے مادی و غیر مادی نقصانات سے بچ جائیں، جو قرض دینے اور لینے کی صورت میں عام طور پر اٹھانے پڑتے ہیں۔

قرآن میں قرض کے بیان کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ:

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ (بقرہ)	نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پائے گا،

حدیث میں ہے:

لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ۔	نہ خود نقصان اٹھاؤ اور نہ دوسروں کو نقصان پہونچاؤ۔

اسلامی شریعت نے آسودہ حال لوگوں کو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ وہ ضرورت مندوں غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی معاشی ضرورت وحاجت کا خود خیال رکھیں، اگر وہ سوال کریں تو بغیر کوئی معاوضہ لئے ان کی مدد کریں، اور اگر وہ شرم وحیا سے سوال نہ کر سکیں، تو وہ خود ان کی ضرورت معلوم کر کے ان کی ضرورت پوری کریں، اگر وہ اس طرح کوئی مدد نہیں کر سکتے تو اگر کوئی اپنے کسی آڑے وقت پر ان سے قرض طلب کرے تو اس کو کم از کم قرض تو دے ہی دیں، قرآن پاک میں ہے کہ "مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُضَاعِفُہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرًا"، یعنی ایک بندہ دوسرے بندہ کو جو قرض دیتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ کو قرض دینے سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

مَا مِنْ مُسْلِمٍ یُقْرِضُ مُسْلِمًا[1] قَرْضًا مَرَّتَیْنِ اِلَّا کَانَ کَصَدَقَتِھَا مَرَّۃً۔ (ابن ماجہ)	کوئی مسلمان جب کسی مسلمان کو دو بار قرض دے دیتا ہے، تو اس کا ثواب وہی ہوتا ہے، جو ایک بار صدقہ دینے کا ہوتا ہے۔

---

[1] یہاں مسلمان کے لفظ سے یہ دھوکہ نہ ہو کہ غیر مسلم کو قرض حسنہ دینا ثواب نہیں ہے، اس لئے اسے قرض دینا جائز نہیں ہے، جس طرح مسلمان کو قرض دینا ثواب ہے اسی طرح غیر مسلم کو بھی قرض دینا ثواب ہے جس طرح کسی مسلمان سے قرض لینا جائز ہے، اسی طرح غیر مسلم سے بھی لیا جاسکتا ہے، البتہ سودی قرض چاہے مسلمان سے لیا جائے یا غیر مسلم سے ناجائز ہے، دونوں کا ایک حکم ہے۔

یعنی ایک آسودہ حال مسلمان کی ذمہ داری تو یہی ہے کہ وہ ضرورت مند کی ضرورت بغیر اس کی واپسی کی امید کے پوری کر دے (اسی کو صدقہ کہتے ہیں) لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو کم سے کم اس کو بغیر سود کے قرض ہی دے دے، اس سے بھی وہ کسی نہ کسی حد تک اپنی صدقہ والی ذمہ داری پوری کر لے گا، اس لئے وہ اسی اعتبار سے اجر کا بھی مستحق ہوگا، اور جب وہ بار بار ایسا کرے گا تو اس کا یہ تھوڑا تھوڑا اجر اُس کو اس اجر کا مستحق بنا دے گا، جو اس کو ایک صدقہ کی صورت میں ہوتا، مقصد یہ ہے کہ قرض دینے میں بھی ثواب ہے، مگر صدقہ سے کم اور قرض دے کر اس کی ادائیگی کی مہلت دینا اگر غریب ہو تو معاف کر دینا ایسا غیر معمولی کام ہے کہ اس کا اثر آخرت میں مغفرت کی شکل میں نمودار ہوگا، قرآن میں ہے کہ:

وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ۔ (بقرہ ۳۸)

اگر قرضدار تنگدست ہے تو کشادگی تک مہلت دینا چاہیئے، اور اگر بالکل معاف (صدقہ) کر دو تو یہ بات زیادہ بہتر ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت سے پہلے ایک نیک آدمی کا واقعہ بیان فرمایا کہ:

اِنَّ رَجُلًا كَانَ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ اَتَاهُ الْمَلَكُ لِيَقْبِضَ رُوْحَهٗ فَقِيْلَ لَهٗ هَلْ عَمِلْتَ مِنْ خَيْرٍ قَالَ مَا اَعْلَمُ قِيْلَ لَهٗ اُنْظُرْ قَالَ مَا اَعْلَمُ غَيْرَ اَنِّيْ كُنْتُ اُبَايِعُ النَّاسَ فِى الدُّنْيَا وَاُجَازِيْهِمْ فَاُنْظِرُ الْمُوْسِرَ وَاَتَجَاوَزُ عَنِ الْمُعْسِرِ فَاَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ۔ (بخاری ومسلم)

صحابہ کرام سے آپ نے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں ان میں ایک آدمی تھا جب موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کر کے لے گیا تو اس سے پوچھا گیا کہ تم نے کوئی نیک کام کیا ہے؟ بولا مجھے تو اپنے نامۂ اعمال میں کوئی نیک کام نظر نہیں آتا، پھر کہا گیا کہ غور کرو، غور کرنے کے بعد اس نے کہا کہ مجھے اس کے علاوہ اپنا کوئی نیک کام نظر نہیں آتا کہ میں لوگوں سے ادھار لین دین کرتا تھا اور ان کو معاف کرتا تھا، یعنی اگر کوئی ادھار مال لے گیا تو اگر وہ خوش حال ہے تو اس کو قیمت کی ادائیگی کی مہلت دیتا تھا، اور اگر وہ تنگ حال ہوا تو اس کو معاف کر دیتا تھا، آپؐ نے

فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس نیکی کے بدلہ میں اس کو جنّت میں داخل کر دیا۔

ایک روایت اور ہے، آپؐ نے فرمایا:

مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یُّنَجِّیَہُ اللّٰہُ مِنْ کُرَبِ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ فَلْیُنَفِّسْ عَنْ مُعْسِرٍ اَوْیَضَعْ عَنْہُ (مسلم)

جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ وہ قیامت کی المناک سختیوں سے نجات پا جائے تو اس کو چاہیئے کہ تنگدست مقروض کو زیادہ سے زیادہ مہلت دے یا پھر پورا قرضہ ہی معاف کر دے۔

بلاضرورت قرض لینے کی مذمّت

اسلامی شریعت نے شدید معاشی ضرورت یا اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے قرض لینے کی جو اجازت دی ہے، وہ اجازت ایسی ہی ہے جیسے کسی مجبور آدمی کے لئے مُردار کھانے کی اجازت کہ وہ کسی طرح جسم و جان کا رشتہ باقی رکھ سکے، لیکن اگر وہ سدرمق سے زیادہ کھا جائے تو اسلام میں اس کا یہ فعل حرام ہوگا، اور قانوناً وہ سزا کا مستحق ہوگا، بالکل اسی طرح قرض کی اجازت مجبوری کی اجازت ہے، اب کوئی شخص فضول خرچی تعیش یا اپنی عرفی ساکھ اور مصنوعی معیارِ زندگی کو قائم رکھنے کے لئے قرض لے، یا قرض لے تو کسی مجبوری ہی سے مگر اس کی ادائیگی سے بے خبر ہو جائے یا استطاعت کے باوجود ٹال مٹول کرے تو وہ اخلاقاً بھی مجرم ہوگا، اور قانوناً بھی، یعنی وہ آخرت میں بھی پکڑا جائے گا، اور دنیا میں بھی اس کو سزا ملنی چاہیئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاوجہ قرض لینے اور پھر اس کی ادائیگی نہ کرنے کو انتہائی ناپسند فرمایا ہے، آپؐ کے پاس جب کوئی جنازہ لایا جاتا تھا تو آپؐ دریافت فرماتے کہ اس نے کوئی قرض تو نہیں چھوڑا ہے، اگر وہ قرض چھوڑ کر مرا ہوتا اور ادائیگی کے لئے کوئی ترکہ بھی نہ چھوڑ گیا ہوتا تو آپؐ اس کی نماز جنازہ ادا نہیں فرماتے تھے، ایک بار ایک صحابی کا جنازہ لایا گیا، آپؐ نے لوگوں سے دریافت فرمایا کہ ھَلْ عَلَیْہِ دَیْنٌ اس پر کوئی قرض تو نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ہاں دو دینار کا مقروض مرا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ ان کی نماز جنازہ تم لوگ پڑھ لو، حضرت ابو قتادہ صحابی بولے کہ یا رسول اللہ! اس کے دونوں دینار کی ادائیگی کا میں ذمہ دار ہوں، اس

کے بعد آپؐ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی [1]

آپؐ قرض کو اتنی مذموم اور قابلِ نفرت چیز تصوّر فرماتے تھے "کہ سوتے وقت اور پنج وقتہ نمازوں کے آخر میں دوسرے گناہوں کے ساتھ اس سے بھی پناہ مانگتے تھے، اَعُوْذُ مِنَ الْمَاثَمِ وَالْمَغْرَمِ" میں گناہ اور قرض کے بارِ گراں سے پناہ مانگتا ہوں"۔

ایک بار آپؐ نے کفر اور قرض دونوں سے پناہ مانگی، ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کیا آپؐ قرض کو کفر کے برابر قرار دیتے ہیں، فرمایا، ہاں۔ (نسائی، حاکم)

ایک مومن کو اسلام کسی حال میں بھی ذلیل دیکھنا نہیں چاہتا، اور قرض ایسی بلا ہے، کہ اس میں آدمی ذلیل ہو جاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب خدائے تعالیٰ کسی بندہ کو ذلیل کرنا چاہتا ہے، تو اس کی گردن پر قرض کا بار رکھ دیتا ہے۔ (حاکم)

قرض دار آدمی کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو ایک قیدی کی ہوتی ہے، یعنی جس طرح قیدی میں بلندی، عزت اور آزادی کے بجائے احساسِ کمتری ذلّت اور غلامی کا تصور پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح مقروض میں یہ باتیں پیدا ہو جاتی ہیں، حدیث میں آتا ہے کہ:

صَاحِبُ الدَّیْنِ مَأْسُوْرٌ بِدَیْنِہٖ (مشکوٰۃ) — قرض دار آدمی میں اپنے قرض کا قیدی ہوتا ہے۔

ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کچھ نصیحت فرمائی، جس میں یہ بھی بیان فرمایا کہ قرض کم لیا کرو، آزاد ہو کر زندہ رہو گے۔ (بیہقی)

آپؐ صحابہ کو قرض کی ادائیگی کی دُعا کی تلقین فرمایا کرتے تھے، حضرت علیؓ کو ایک بار یہ دُعا سکھائی:

اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ بِحَلَالِكَ	اے اللہ! اپنے حلال رزق کے ذریعہ حرام
عَنْ حَرَامِكَ وَاَغْنِنِیْ بِفَضْلِكَ	سے بچا اور اپنے فضل سے مجھ کو ان لوگوں سے
عَمَّنْ سِوَاكَ۔ (ترمذی، بیہقی)	بے نیاز کر دے جو تیرے سوا ہیں۔

---

[1] قال ابو قتادۃ صلّ علیہ یا رسول اللہ و علی دینہ فصلی علیہ۔ (بخاری)

آپؐ نے سونے جاگنے، نماز پڑھنے اور دوسرے اوقات میں قرض سے پناہ مانگنے اور اس کی ادائیگی کی تعلیم کئی مقصد سے فرمائی، ایک یہ کہ مقروض آدمی کے ذہن میں ہر وقت یہ بات تازہ رہے کہ اس کو قرض ادا کرنا ہے ــــ دوسرے یہ کہ وہ صرف اپنی قوتِ بازو ہی پر اعتماد نہ نہ کرے، بلکہ اس کو خدا سے توفیق بھی طلب کرتے رہنا چاہیئے، ورنہ ممکن ہے کہ وہ ادا کرنے کی کوشش کرے اور کامیاب نہ ہو۔

قرض کے سلسلہ میں اسلامی حکومت کی ذمہ داری

قرض دینے کے سلسلہ میں اسلامی حکومت پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ضرورت مندوں کو بیت المال (سرکاری خزانہ) سے غیر سودی قرضے دے اور اگر وہ ادا نہ کرسکیں تو اصل رقم بھی معاف کردے، ابتدائے اسلام میں جب تک مہاجرین وانصار تنگدست تھے، اور اسلامی حکومت کا بیت المال خالی تھا، اس وقت تک آپ مردہ مقروض کے جنازہ میں اس لئے توقف فرماتے تھے کہ اعزّا و اقارب یا معاشرہ کے خوش حال افراد سبقت کرکے اس کا قرض ادا کردیں، لیکن جب بیت المال میں کچھ رقم جمع ہونے لگی، تو پھر آپؐ نے تنگدست مقروض کے قرض کی ادائیگی حکومت کے ذمہ دار اور نبی کی حیثیت سے اپنے ذمہّ لے لی، حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ ابتدا میں تو آپؐ مقروض مردہ کی نماز جنازہ میں اس وقت تک توقف فرماتے تھے، جب تک کوئی ادا نہ کردے مگر

فَلَمَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ قَالَ اَنَا اَوْلٰى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهٖ فَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا فَعَلَيَّ وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهٖ۔

(ابوداؤد، نسائی)

جب اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح دی، اور آپؐ کے پاس مال آنے لگا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں (یعنی حکومت) ہر مومن کا اس کی جان اور اپنوں سے بھی زیادہ ذمہ دار اور ہمدرد ہوں، تو جو شخص قرض چھوڑ کر مرے، اس کی ذمہ داری مجھ پر یعنی حکومت پر ہے، اور جو کچھ وہ مال چھوڑ کر مرے وہ اس کے ورثہ کا حق ہے۔

حکومت کی یہ بھی ذمہّ داری ہے کہ جو لوگ دوسروں سے قرض لے کر ادائیگی کی قدرت ہوتے ہوتے

ٹال مٹول کرتے ہیں، ان سے بجبر قرض وصول کراتے۔

یعنی حکومت نہ تو خود کسی کا حق مارے گی اور نہ دوسروں کے حق کو حتی الامکان ضائع ہونے دے گی۔

حکومت کی یہ ذمہ داری صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی تک نہیں تھی، بلکہ عہدِ خلافتِ راشدہ اور بعد کے زمانوں میں بھی اس پر عمل کیا گیا ہے، اس تعلیم ہی کا یہ اثر ہے کہ آج بھی مسلم معاشرہ میں بلا سودی قرض دینے کا جتنا رواج ہے، اتنا کسی دوسرے معاشرہ میں نہیں ہے۔

قرض کے معنی اور اس کی تعریف قرض اور اُدھار کے لئے عربی میں دو لفظ استعمال ہوتے ہیں، ایک قرض، دوسرے دَین، دَین کے لفظی معنی بدلہ کے ہیں، یعنی اس لفظ میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ قرض دے کر آدمی صرف اس کا پورا پورا بدل ہی لے سکتا ہے، زیادہ یا کم نہیں، قرض کے معنی کاٹ دینے کے ہیں، اسی لئے قینچی کو عربی میں مِقراض کہتے ہیں، جو آدمی قرض یا ادھار کوئی چیز یا رقم دیتا ہے وہ اپنی آمدنی یا جمع شدہ رقم کا ایک حصہ کاٹ کر اس کو دیتا ہے، اور غالباً اس لئے بھی اس کو قرض کہتے ہیں کہ اگر قرض خواہ اور قرض دار شرعی حدود کی پابندی نہ کریں، تو پھر دونوں کے تعلقات کو یہ چیز کاٹ دینے کا سبب بھی ہوتی ہے، اس لئے یہ ضرب المثل بن گئی ہے کہ القرض مقراض المحبۃ (قرض محبت کی قینچی ہے) دَین کا لفظ ذرا عام ہے، اور قرض کا لفظ خاص ہے، یعنی قرض محض اس نقد یا جنس کو کہیں گے جو کسی کو واپسی کے لئے دی جاتے اور دَین ہر طرح کے بقایا کو کہتے ہیں، مثلاً آپ نے کوئی چیز خریدی اور قیمت باقی ہے تو اس کو قرض نہیں دَین کہیں گے، اسی طرح آپ نے قیمت لے لی، مگر مال ابھی نہیں دیا تو یہ مال آپ کے ذمہ دَین ہوا، اس کو قرض نہیں کہیں گے، غرض یہ کہ ہر قرض کو دَین تو کہہ سکتے ہیں، مگر ہر دین کو قرض نہیں کہہ سکتے، اوپر قرض خواہ اور قرض دار دونوں کی اخلاقی ذمہ داریوں اور ہدایتوں کا ذکر کیا گیا ہے، اب دونوں کی قانونی ذمہ داریوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

قرض اور اُدھار کا معاملہ لکھ لینا چاہیئے قرآن وحدیث دونوں میں قرض و اُدھار معاملہ کو

لکھ لینے کی تاکید آئی ہے، گو کہ نہ لکھنے میں کوئی گناہ نہیں ہے، کیونکہ یہ تاکید صرف اس لئے دی گئی ہے کہ دونوں کو اطمینان رہے، اگر بغیر لکھے ہوتے بھی یہ اطمینان حاصل ہو جاتے تو اس کی ضرورت نہیں ہے، قرآن پاک میں سب سے بڑی آیت اسی کے حکم میں نازل ہوئی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ (بقرہ)

اے ایمان والو! جب قرض وادھار کا معاملہ ایک مقررہ مدت تک کے لئے کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

اس آیت میں قرض کے لین دین کو لکھ لینے کا بھی حکم ہے، اور اسی سے بیع سلم کا بھی حکم نکلتا ہے، آگے لکھنے کا طریقہ اور گواہوں وغیرہ کا بیان ہے، پھر کہا گیا ہے کہ اس میں کوتاہی نہ کرو، تاکہ لین دین میں ایک دوسرے سے بے اعتمادی نہ ہو، اس آیت کے نزول کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من اسلف فليسلف في كيل معلوم و وزن معلوم إلى اجل مسمى۔ (بخاری و مسلم)

جو شخص کوئی ادھار معاملہ کرے تو اسے پیمانہ، وزن اور مدت مقرر کرکے ادھار کا معاملہ کرنا چاہیئے۔

قرض دینے والے کو ہدایتیں

(۱) اوپر قرض دینے کی فضیلت اور اس سلسلہ میں اسلامی حکومت کی جس ذمہ داری کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ افراد کے لئے قرض دینا تو ان کی طرف سے ایک تبرّع اور انعام ہے، اگر کوئی شخص استطاعت کے باوجود قرض نہ دے تو اخلاق و دیانت کے اعتبار سے وہ مجرم ضرور قرار پائے گا، مگر اس پر کوئی قانونی جبر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ لامحالہ قرض دے ہی دے، مگر اجتماعی ذمہ داری جس کی نمایندگی حکومت کرتی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ بہر حال بے سہارا افراد کی مدد کرے، خواہ اعانت و صدقہ دے کر یا قرض دے کر۔

(۲) قرض خواہ چاہے حکومت ہو یا افراد، ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس قرض پر سود نہ لیں، سود سے مراد وہ متعین رقم ہے، جو آدمی کسی مال یا چیز کے بدلہ میں بغیر کسی عوض کے دیتا یا لیتا ہے، اوپر سود کی تعریف آچکی ہے، سود خواہ قرض دینے کے عوض میں لیا جائے، جیسے مہاجنی سود، یا روپے سے منفعت اٹھانے کی وجہ سے، کوئی شخص یا کوئی ادارہ یہ رقم دے، جیسے تجارتی کمپنیوں

کا سود، انشورنس کا سود، اور بینک و ڈاک خانہ کا سود، یہ سب ناجائز ہے، اسلامی شریعت کا یہ اصول ہے:

كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبًا۔ جو قرض بغیر عوض نفع کھینچ لاوے، وہ سود ہے۔

(۳) نفع اٹھانے کی کچھ صورتیں تو وہ ہیں، جو اوپر بیان ہوتی ہیں، اس کی اور بھی بے شمار قسمیں ہیں، غرض قرض سے نفع اٹھانے میں ہر طرح کا مادّی یا غیر مادّی نفع سود میں داخل سمجھا جائے گا، مثلاً قرض خواہ قرض دار سے اپنی نیاز مندی کرانا چاہے، یا تحفہ تحائف کا طلبگار ہو، تجارت اور دوسرے معاملات میں رعایت چاہے تو یہ تمام صورتیں ناجائز اور بعض حرام ہیں، اوپر ذکر آچکا ہے کہ ایسی تجارت یا خرید و فروخت مکروہ یا باطل ہے، جس میں مقروض سے فائدہ اٹھایا جاتے، قرآن میں قرضِ حسنہ کی تعریف بیان کی گئی ہے، یعنی ایسا قرض جس میں نہ سود ہو اور نہ مدّت کی تعیین ہو، اور نہ اظہارِ احسان ہو، اس طرح قرآن میں کسی کی مدد کرکے یا کسی کی ضرورت پوری کرکے احسان کرنے والوں کے مال کو چٹان کے اوپر کی مٹی سے تشبیہ دی گئی ہے کہ ایک ہلکی سی بارش سے وہ دُھل جاتی ہے۔ (بقرہ)

اسی طرح حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

إِذَا أَقْرَضَ أَحَدُكُمْ قَرْضًا	جب کوئی کسی کو قرض دے تو مقروض اگر
فَأَهْدَى إِلَيْهِ أَوْ حَمَلَهُ عَلَى	اس کے پاس کوئی ہدیہ بھیجے یا اسے اپنی
الدَّابَّةِ فَلَا يَرْكَبْهُ وَلَا يَقْبَلْهَا	سواری پر سوار کرے تو اس کو نہ تو سواری
إِلَّا أَنْ يَكُونَ جَرَى بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ	استعمال کرنا چاہیئے، اور نہ اس کا ہدیہ قبول
قَبْلَ ذَالِكَ۔ (ابن ماجہ، بیہقی)	کرنا چاہیئے، البتہ اگر قرض دینے سے پہلے

سے تعلقات ہوں، اور تحفہ تحائف دینے کا معمول رہا ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

محدثین نے اس حدیث کو قرض کے بیان میں نہیں بلکہ سود کے بیان میں ذکر کیا ہے، گویا مقروض کا ہدیہ بھی ایک طرح کا سود ہے۔

(۴) قرض خواہ نے قرض ادا کرنے کی اگر کوئی مدّت مقرر کر دی ہے، تو مدّت گزرنے سے پہلے بھی وہ تقاضا کر سکتا ہے، گو اخلاقاً ایسا نہ کرنا چاہیئے، مگر قانوناً اس کو اس کا حق ہے، کیونکہ ممکن

ہے کہ اس کو شدید ضرورت پیش آگئی ہو، قرض دار قرض ادا نہ کرسکے تو قرض خواہ اگر اس کو مزید مہلت دینا نہیں چاہتا، تو اس کو یہ حق ہے کہ وہ سختی سے وصول کرے، گو اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ جو شخص ابھی دینے کے قابل نہ ہوا ہو اس کو مزید مہلت دے، مگر قانوناً اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، ایک بار خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے کوئی جانور قرض لیا تھا، ادائیگی کی مدت گزر گئی، تو اس نے ذرا سختی سے تقاضا کیا، صحابہؓ کو اس کی یہ بدتمیزی بری معلوم ہوئی مگر آپؐ نے فرمایا کہ:

دَعُوْهُ اِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالاً — صاحب حق کو سخت کلامی کا حق حاصل ہے۔

اس کے بعد آپؐ نے صحابہ سے کہا کہ ایک جانور اس سے اچھا خرید کر اس کو دے دو، چنانچہ دے دیا گیا۔ (بخاری ومسلم)

(۵) اگر مقروض قرض ادا کر دینے کی قدرت رکھتا ہے، اور اس کے باوجود ادا نہیں کرتا ہے، تو پھر اس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ:

مَطْلُ الْغَنِیِّ ظُلْمٌ۔ (بخاری ومسلم) — غنی کی ٹال مٹول ظلم ہے۔

لَیُّ الْوَاجِدِ یُحِلُّ عِرْضَهٗ وَعُقُوْبَتَهٗ۔ (ابوداؤد ونسائی) — روپے رکھتے ہوئے ٹال مٹول کرنے والے کی عزت اور سزا حلال ہو جاتی ہے۔

یعنی قرض خواہ ایسے شخص کو بُرا بھلا کہہ سکتا ہے، اس کے ساتھ سختی کرسکتا ہے، اس کو مشتہر کرسکتا ہے، اس کے خلاف دعویٰ کر کے سزا دلوا سکتا ہے، عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں بیان کی ہے:

قال ابن المبارك يحل عرضه يغلظ له وعقوبته يحبس له (مشکوٰۃ) — یعنی اسے زبان سے لعنت ملامت کی جائے گی، اور سزا یہ ہے کہ اسے قید کیا جائیگا۔

چنانچہ اسی بنا پر فقہاء نے لکھا ہے کہ جو شخص تنگدست یا مجبور ہو، اس کو تو کوئی سزا نہیں دی جاسکتی، لیکن اگر قرض کی ادائیگی کی صلاحیت رکھتے ہوئے کوئی شخص ٹال مٹول کرے تو پھر اس کو قید بھی کیا جاسکتا ہے، اس بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو کہتے ہیں کہ خوش حال اور بدحال میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا، بلکہ دونوں حالت میں سزا دی جاسکتی ہے مگر دوسر

ائمہ تنگدست اور بدحال کو قید کرنے کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ یہ سزا انھوں نے صاحب قدرت ہی کے لئے مقرّر کی ہے، حدیث نبوی سے بظاہر ان ائمہ کرام ہی کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے بشرطیکہ کسی غریب نے ہڑپ کر جانا ہی اپنا پیشہ نہ بنالیا ہو، اگر ایسا ہے تو اس کو امام صاحب کے قول کے مطابق بھی بہرحال سزا دی جائے گی۔

قرض لینے والے کو ہدایتیں

۱- قرض کسی ہنگامی یا انتہائی شدید معاشی ضرورت کے وقت لینا چاہیئے، اگر کوئی شخص بغیر کسی شدید ضرورت کے، یا فضول خرچی یا تعیش کے لئے قرض لینا چاہے تو اس کو نہ تو معاشرہ کے افراد کو قرض دینا چاہیئے، اور نہ حکومت اس کو قرض دے گی، بلکہ ایسے شخص کو حکومت سزا بھی دے سکتی ہے، کیونکہ تعیش پسند اور فضول خرچ آدمی قرض لینے کے بعد اس کو مشکل ہی سے ادا کر سکتا ہے، اور اس طرح بہت سے لوگوں کا حق اور روپیہ مارا جائے گا۔

۲- جوں ہی قرض ادا کرسکنے کے قابل ہو، فوراً اسے ادا کر دینا چاہیئے، اوپر حدیث آچکی ہے کہ جس کو مقدور رہو، اور وہ ادا نہ کرے تو وہ ظالم ہے، اس کی بے عزّتی و بے آبروئی بھی کی جاسکتی ہے۔

۳- اگر قرض خواہ خود ضرورت مند ہو جائے، تو قرض دار کو اپنی جائداد اور گھر کا اثاثہ بیچ کر بھی اس کا قرض ادا کرنا چاہیئے، حضرت معاذؓ طبعاً بڑے سخی تھے، ان کے پاس کچھ رقم آئی، انھوں نے خرچ کر دیا، چنانچہ وہ بالکل قرض میں ڈوب گئے، ہر طرف سے قرض خواہوں نے مطالبہ شروع کیا، آپ نے ان لوگوں سے غالباً قرض چھوڑ دینے کے لئے کہا مگر وہ راضی نہیں ہوئے، چنانچہ معاملہ خدمتِ نبوی میں آیا، ان کے پاس جو کچھ تھا، آپ نے وہ سب فروخت کر کے قرض خواہوں کا قرض ادا کیا، اور حضرت معاذؓ کے پاس کچھ باقی نہ رہا۔ (مشکوٰۃ ص ۲۵۲ بحوالہ المنتقیٰ)

۴- اگر ضرورت ہو تو معاشرہ کے افراد سے چندہ کر کے بھی قرض خواہ کی رقم واپس کی جا سکتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ایک صحابی کا قرض صحابہ کی مدد سے ادا کرایا تھا۔ (مسلم)

یہ اس وقت کا حکم ہے، جب کوئی اجتماعی ادارہ یا حکومت اس کی ذمّہ داری نہ لے اور پھر ایسا کرنا اسی وقت صحیح ہوگا، جب قرضدار کے حالات ایسے ہوں کہ وہ دے نہ سکتا ہو اور قرض خواہ

کو شدید ضرورت ہو، اور دوسرا کوئی ذریعہ نہ ہو۔

۵۔ معاشرہ کے آسودہ حال افراد کی ذمّہ داری یہ بھی ہے کہ اگر کوئی تنگدست قرض خواہوں سے بچنے کے لئے ان کو ذمّہ دار اور ضامن بنائے، تو وہ ضامن بن جائیں، اس کا مفصّل بیان آگے آئے گا۔

کون سی چیزیں قرض میں لی دی جا سکتی ہیں

قرض کے لینے یا دینے میں یہ شرط ہے کہ جیسی چیز لی جائے، حتی الامکان ویسی ہی واپس کی جائے، اس لئے ایسی تمام چیزیں، جن کے مثل دوسری چیزیں گن کر، یا تول کر، یا ناپ کر آسانی سے واپس کی جا سکتی ہیں، ان کو قرض کے طور پر لیا دیا جا سکتا ہے، مثلاً آپ کسی سے چند روپے یا چند آنے قرض لیں، تو آپ اتنے روپے یا آنے آسانی سے واپس کر سکتے ہیں۔

یا مثلاً آپ کے گھر میں مہمان آگیا، اور آپ نے اپنے پڑوس سے گھی، تیل، آٹا تول کر یا ناپ کر یا روٹی انڈا، یا اور کوئی چیز بطور قرض منگالی، اور پھر بازار سے منگا کر دے دیا، تو بھی جائز ہے، اور آپ نے اس کی قیمت ادا کر دی تو یہ بھی جائز ہے، اسی طرح اگر آپ نے کسی سے ایک من گیہوں، یا دس گز کپڑا ادھار لیا، تو آپ اسی طرح کا ایک من گیہوں بھی واپس کر سکتے ہیں، اور دس گز کپڑا بھی، اور اگر آپ نے گیہوں یا کپڑا نہ ادا کیا تو قیمت بھی ادا کر سکتے ہیں، لیکن اگر وہ کپڑا ایسا ہے کہ بازار میں اس کی طرح کا کپڑا ملنا مشکل ہے، تو آپ وہ کپڑا قرض نہیں لے سکتے، مقصد یہ ہے کہ ایسی چیز جو بازار میں مل سکتی ہو، اور اس کی قیمت آسانی سے لگائی جا سکتی ہو، وہی قرض میں لی اور دی سکتی ہے[1]

کون سی چیز قرض میں نہیں لی یا دی جا سکتی

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پھلوں، اور حیوانات میں قرض کے لین دین کے قائل نہیں، اور دوسرے ائمہ کہتے ہیں کہ جس چیز کی قیمت لگائی جا سکتی ہے، وہ قرض میں

---

[1] وصح القرض فی مثلی کالمکیل والموزون والمعدود والمتفاوت کالجوز والبیض لافی غیرہ من القیمیات کحیوان وحطب وعلفہ وکل متفاوت۔ (درمختار مع رد المحتار، ج ۴ ص ۱۷۱)

لی یا دی جا سکتی ہے۔[1]

راقم الحروف کے خیال میں ائمہ ثلٰثہ کی رائے اس میں زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔ فقہائے احناف اس میں اسلئے قرض کے قائل نہیں ہیں کہ اگر یہ ہلاک ہو جائیں تو ان کے مثل ضمان کا لینا مشکل ہے، دوسرے ان کا اسی کے مثل واپس کرنا مشکل ہے، صاحب درمختار مِثلی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ھو کل ما یضمن بالمثل عند الاستھلاك۔	ہلاک ہونے کی صورت میں ان کے مثل تاوان لیا جاسکے۔

پھر آگے لکھتے ہیں:

لا فی غیرہ من القیمیات کحیوان وحطب۔	لیکن قیمت سے فروخت ہونے والی چیزوں میں جائز نہیں، جیسے جانور یا لکڑی وغیرہ،

اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوتیں، ایک یہ کہ قرض میں دی ہوئی چیز کی پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہیئے کہ جب وہ چیز خراب ہو جائے، تو اس کی واپسی اسی کے مثل ممکن ہو، مثلاً روپیہ پیسہ آدمی قرض لے کر خرچ کر دیتا ہے، اور پھر اسے ویسا ہی واپس کر دیتا ہے، گیہوں یا آٹا لیتا ہے، اور اس کے مثل واپس کر دیتا ہے، دوسری خصوصیت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ایسی چیز نہ ہو، جو قیمت ہی سے فروخت ہوتی ہو، اور اس کے مثل واپس کرنا دشوار ہو۔

اب اس پر علامہ ابن عابدین نے جو حاشیہ لکھا ہے، وہ ملاحظہ ہو، پہلے وہ مثلی پہ لکھتے ہیں کہ جو چیز ناپی جاسکے یا وزن کی جاسکے، یا گن کر دی جاسکے، گن کر دینے والی چیزوں میں مثلاً اخروٹ انڈے وغیرہ ہیں، پھر لکھتے ہیں:

وحاصلہ ان المثلی ما لا تتفاوت احادہ تختلف فیہ القیمۃ فان نحو الجوز	حاصل یہ کہ مثلی کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اجزاء میں اتنا تفاوت نہ ہو کہ اس سے اس کی قیمت میں فرق ہو جائے، مثلاً

---

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۳ ص ۳۳۵ تا ص ۳۴۴۔

تتفاوت احادہ تفاوتاً یسیراً، وقال فی البحر ولا یجوز فی غیر المثلی لانہ لا یجب دیناً فی الذمہ۔ (ج ۳ ص ۱۷۱)	اخروٹ کے دانوں میں تھوڑا سا تفاوت ہے، اس لئے اس کو قرض میں لیا دیا جاسکتا ہے، اور بحرالرائق میں ہے غیر مثلی کا قرض لین دین صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ وہ کسی کے ذمہ اس کا دین بننا واجب نہیں ہے،

ان عبارات سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ قرض کا لین دین ایسی چیز میں ہونا چاہیئے، جس کے مثل واپس کرنا دشوار نہ ہو۔

۲۔ اگر تھوڑا بہت فرق جس سے قیمت میں زیادتی کمی نہ ہو تو ان چیزوں کا قرض لینا یا دینا جائز ہے، جیسے انھوں نے اخروٹ اور انڈے کی مثال دی ہے۔

۳۔ چونکہ قرض میں دی ہوئی چیز خرچ ہو جاتی ہے، اس لئے اسی چیز کی واپسی ممکن نہیں ہوتی، اس لئے اس کے ذمہ اس کے مثل واپس کرنا ضروری ہوگا۔

اب ان دلائل پر غور کیجئے تو خلاصہ یہ ہوگا کہ حیوانات، لکڑی، کپڑے وغیرہ کو قرض میں اس لئے نہیں دیا جاسکتا کہ ان کے مثل واپس کرنا ممکن نہیں ہے، تو عرض یہ ہے کہ اگر گوشت قرض میں لے لیا جائے یا انڈا اور میوے وغیرہ قرض میں لے لئے جائیں، تو ان کی واپسی میں جب تھوڑے سے فرق کو نظر انداز کیا جاتا ہے، تو پھر جانور کی اگر قسم نہ بدلے تو اس میں بھی تھوڑے سے فرق کو کیوں نہ برداشت کیا جائے، پھر لکڑی وغیرہ تو وزنی چیزیں بن گئی ہیں، کپڑا کو مکیل کی قسم میں داخل کیا جاسکتا ہے، اور اس وقت تو جانور کے گوشت کی طرح جانور کو بھی کانٹے پر تولا جاسکتا ہے۔

غرض یہ کہ ان حالات کے لحاظ سے موزون، مکیل اور معدود کی حیثیت بدل گئی ہے بہت سی موزون چیزیں معدود اور معدود موزون اور مکیل موزون بن گئی ہیں، البتہ عقار کے مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس میں رہن کی صورت موجود ہے، اس کے ہلاک ہونے کا بھی امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔

ضروری ہدایتیں اس سلسلہ میں حسب ذیل باتیں ذہن نشین رہنی چاہئیں۔

(۱) قرض میں لی ہوئی چیز اگر بازار میں گراں یا ارزاں ہو جائے، تو اس کا اثر قرض پر نہیں پڑے گا، مثلاً کسی نے دو من گیہوں یا ایک من شکر یا گڑ قرض لیا، اور اس وقت گیہوں، شکر اور گڑ کا بھاؤ سستا تھا، اس کے بعد پھر جب ادائیگی کا وقت آیا تو گراں ہو گیا، تو اس کا کوئی اثر ادائیگی پر نہیں پڑے گا، قرض دار کو اتنا ہی گیہوں، شکر، گڑ، ادا کرنا ضروری ہوگا، اور اگر قرض خواہ راضی ہو جائے تو پھر قیمت بھی وہ لے سکتا ہے[۱]

(۲) اگر کسی نے ایک ایک روپے کے سو نوٹ یا ریزگاری قرض میں لی تو یہ ضروری نہیں ہے کہ قرضدار ریزگاری یا ایک ایک کے نوٹ ہی دے، بلکہ اس کو روپے دینا چاہیئے، خواہ نوٹ دے یا دھات کے روپے، یا سو روپے کا نوٹ سب جائز ہے، یا پھٹے نوٹ دے کر کہے کہ ہم بالکل نیا نوٹ لیں گے، تو یہ ناجائز ہے، اگر وہ خود اچھا نوٹ دے تو یہ شرط لگانا جائز ہے[۲]

(۳) جو چیز جہاں جس طرح بکتی یا لی دی جا سکتی ہو، اسی طرح دینی اور لینی چاہیئے، مثلاً اگر کوئی چیز کہیں گن کر بکتی ہے، مثلاً انڈے، سنترے وغیرہ تو یہ چیزیں گن ہی کر واپس کی جانی چاہئیں، اگر کوئی چیز تول کر بکتی ہے، مثلاً گیہوں، تیل، مسالہ، میدہ وغیرہ تو تول ہی کر واپس کی جائیں، اسی طرح جو چیزیں جہاں ناپ کر بکتی ہیں، مثلاً کپڑا، سمینٹ، چونا وغیرہ، وہ ناپ ہی کر واپس کی جائیں گی[۳]

(۴) اگر کوئی چیز دونوں طرح سے بکتی ہے، تو جس طرح بکتی ہے، اسی طرح سے واپس کی جائے گی، مثلاً کاغذ اگر دو چار دستے بکتے ہیں تو گن کر اور ریم کے اعتبار سے بکتے ہیں تو وزن کر کے، تو جس طرح لیا ہے، اسی طرح واپس کرنا چاہیئے، یا آٹا اگر وزن کے بجائے ناپ کر قرض لیا تو ناپ ہی کر واپس کرنا چاہیئے۔

---

[۱] انه مضمون بمثله فلا عبرة بغلائه ورخصه۔ (درمختار ج ۳ ص ۱۷۲)

[۲] فلو استقرض من الدراهم المسكورة على ان يودى صحيحا كان باطلا، (ج ۳ ص ۱۷۳ درمختار)۔

[۳] صح استقراض جوز وبيض عددا ولحم وزناً۔ (شرح التنوير بحوالہ بہشتی زیور، ج ۵ ص ۳۲)

(۵) جس جگہ پر قرض لیا گیا ہے، قرض خواہ اپنا وہ قرض دوسری جگہ بھی لے سکتا ہے، مثلاً اگر کسی نے لکھنؤ میں قرض لیا اور قرض خواہ نے بمبئی میں اس سے مطالبہ کیا تو قرض دار یا تو وہیں قرض ادا کر دے، یا پھر کوئی ضامن دے کہ میں لکھنؤ جا کر قرض ادا کر دوں گا، یہ اس صورت میں ہے، جب قرض روپے پیسے ہوں، لیکن اگر قرض نقد کے بجائے جنس ہے، مثلاً غلّہ، کپڑا، اینٹ، پتھر وغیرہ تو پھر قرض خواہ دوسری جگہ مثلاً اگر بمبئی میں مطالبہ کرتا ہے تو قرضدار کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ وہی جنس وہاں ادا کرے، بلکہ وہاں وہ قیمت بھی دے سکتا ہے، قرض خواہ اگر لینا چاہے تو قیمت لے لے، کیونکہ کسی غیر جگہ پر کسی جنس کا ادا کرنا دشوار ہے، البتہ اگر قرض دار وہی جنس دینا چاہتا ہے، مگر لکھنؤ پہونچ کر تو اس کو ضامن دینا پڑے گا کہ وہاں جا کر ضرور دے دے گا، قیمت ادا کرنے کی صورت میں اس کو وہی قیمت دینی پڑے گی، جو اس چیز کی لکھنؤ میں ہے، بمبئی کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، مثلاً اگر ایک من غلّہ اس نے لکھنؤ میں قرض لیا اور قرض خواہ نے اس کا مطالبہ بمبئی میں کیا، تو گیہوں کا جو بھاؤ لکھنؤ میں ہوگا، اسی کا اعتبار کیا جائے گا، بمبئی کے بھاؤ کا نہیں [1]

(۶) جو چیز قرض لی ہے، اگر وہ بازار میں نہیں ملتی، تو اگر کچھ دن میں مل جانے کی امید ہے تو پھر قرض خواہ یا تو اس وقت کا انتظار کرے، یا پھر اگر دونوں قیمت دینے اور لینے پر راضی ہو جائیں، تو پھر قیمت ادا کر دی جائے۔

(۷) قرض دار جو چیز قرض میں لیتا ہے، وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے، اس لئے قرض لی ہوئی چیز کو قرض خواہ کو یا کسی اور کے ہاتھ بیچنا چاہے، تو وہ بیچ سکتا ہے، کیونکہ جو چیز وہ بیچ رہا ہے، وہ اس کا مالک ہے، لیکن اگر قرض خواہ چیز بیچنا چاہے، جو اس نے قرض میں دے دی، تو وہ نہیں بیچ سکتا، کیونکہ وہ اب مالک نہیں ہے، اسی طرح قرض دار دوسرے تصرفات بھی کر سکتا ہے۔

---

[1] اذا استقرض طعاماً بالعراق فاخذه صاحب القرض بمكة فعليه قيمته بالعراق وليس عليه ان يرجع معه إلى العراق فيأخذ طعامه۔

(در مختار، ج ۳ ص ۱۷۲)

(۸) قرض میں کوئی شرط لگانا گناہ ہے، یہ شرط بیکار سمجھی جائے گی، مثلاً کسی نے یہ شرط لگائی کہ میں اس شرط پر قرض دیتا ہوں کہ تم مجھ کو فلاں چیز دینا، یا میرے ہاتھ فلاں چیز فروخت کر دینا، یا یہ قرض مجھے فلاں جگہ ادا کر دینا، یہ سب شرطیں بے کار ہیں، قرض داران میں سے کسی کا پابند نہیں ہے[1]

(۹) جو چیز قرض میں لی تھی، اس سے بہتر یا کمتر چیز اگر قرضدار واپس کرتا ہے، تو یہ قرض خواہ کی مرضی پر ہے کہ وہ اسے لے یا نہ لے۔

(۱۰) قرضدار اگر قدرت کے باوجود قرض نہیں ادا کرتا تو قرض خواہ اس کی اسی طرح کی کوئی چیز اگر چاہے تو اجازت کے بغیر بھی اپنے قرض میں لے سکتا ہے، مثلاً کسی نے گیہوں یا روپیہ قرض لیا ہے مگر ہوتے ہوئے ادا نہیں کر رہا ہے تو اگر کہیں اس کا گیہوں یا روپیہ ہاتھ لگ جائے تو لے سکتا ہے، لیکن اگر اس سے بہتر یا اس جنس کی چیز نہ ہو تو نہیں لے سکتا، مثلاً گیہوں کے بجائے کپڑا یا روپیہ کے بدلے گیہوں نہیں لے سکتا۔ حدیث نبوی سے اس کی اجازت ثابت ہے۔

(۱۰) عورت کا مہر بھی شوہر پر دین (قرض) ہوتا ہے۔

کِفالت

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو روپے قرض لینے کی ضرورت ہوتی ہے، یا اس کو کوئی چیز ادھار خریدنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے، اور وہ لے لیتا ہے، مگر اس کو ادائیگی کی استطاعت نہیں ہوتی، قرض خواہ پریشان کر رہا ہے، تو اس تقاضے سے بچنے کے لئے دوسرے آدمی کو بطورِ ضمانت پیش کرتا ہے، اور دوسرا آدمی یہ ذمہ داری لے لیتا ہے کہ اگر اس نے نہ دیا تو میں دوں گا، اب قرض خواہ کو کچھ اطمینان ہو جاتا ہے کہ میرا روپیہ مارا نہیں جائے گا، اسی طرح ایک مجرم ہے، جس کو عدالت اس وقت تک قید رکھنا چاہتی ہے، جب تک اس کے جرم کی تحقیق نہ ہو جائے، اب وہ مجرم ایک آدمی کو بطور ضمانت پیش کرتا ہے، اور عدالت اس کی ضمانت مان کر اس کو رہا کر دیتی ہے،

---

[1] القرض بالشرط حرام۔ (درمختار، ج ۳ ص ۱۷۴)

کہ جب ضرورت ہوگی، ضامن حاضرِ عدالت کر دے گا، اس طرح وہ کچھ دنوں کے لئے آزاد ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر کسی نے بے سہارا آدمی کے اخراجات کی کوئی ذمہ داری اٹھالے تو اسے کفیل کہتے ہیں، غرض اسی طرح کی ضمانت لینے کو شریعت میں کفالت کہتے ہیں، کفالت کو ضمان بھی کہتے ہیں' اس لئے کہ کفالت میں ضمانت کا ہونا ضروری ہے۔

کفالت کا ذکر قرآن وحدیث دونوں میں ہے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ حضرت قتادہؓ نے ایک مقروض صحابی کے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری لے لی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی، مگر جب بیت المال میں فراخی آگئی، تو آپؐ نے اعلان فرمایا کہ ہر مقروض کے قرض کی کفالت بیت المال کے اوپر ہے۔

کفالت کے لفظی معنی اور اس کی تعریف

کفالت کے لفظی معنی ملانے اور چمٹانے کے ہیں، اور اصطلاح میں "ضم الذمۃ إلی الذمہ فی المطالبۃ" یعنی کسی مال کی ادائیگی یا قرض کی ادائیگی یا کسی شخص کے وقت پر حاضر کر دینے کی ذمہ داری لینے کو کفالت کہتے ہیں۔

اس کی تین قسمیں ہیں، کفالت بالنفس کفالت بالدّین اور کفالت بالعین، کفالت بالعین کا مطلب یہ ہے کہ جو سامان یا مال اس کے ذمہ ہے، اس کی پوری حفاظت کرے، گویا امین کے ہم معنی ہے۔ کفالت بالدین اور کفالت بالنفس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

اصطلاحات

۱۔ کفیل ذمہ داری وضمانت لینے والے شخص کو کہتے ہیں۔

۲۔ اَصیل یا مکفول عنہ جس کے ذمہ رقم باقی ہو' اور وہ کسی کو کفیل بنائے۔

۳۔ مکفول لہٗ جن کا مطالبہ یا قرض باقی ہو۔

۴۔ مکفول بہٖ۔ وہ مال یا وہ شخص جس کی کفالت کی گئی ہو۔

کفالت کا طریقہ

کفالت کا طریقہ یہ ہے کہ کفیل یعنی ذمہ داری لینے والا، مکفول لہٗ، یعنی حقدار سے کہے کہ آپ کی جو رقم یا جو مال فلاں کے ذمہ باقی ہے، یا فلاں مجرم کا میں ذمہ دار ہوں، تو اب اس کی ذمہ داری ہوگئی، اب اگر اصیل یعنی قرض دار اس کو ادا نہ کرے تو اس کے ادا کرنے کی ذمہ داری کفیل پر ہوگی، اور کبھی دو آدمی کوئی معاملہ شرکت کا

کرتے ہیں، تو ان میں سے ہر ایک رقم اور مال کا کفیل ہوتا ہے، مقصد یہ ہے کہ کفیل اور مکفول لہٗ میں ایجاب وقبول کا ہونا ضروری ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں:

۱۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ مطلقاً یہ ذمہ داری لے لے کہ میں اس کو ادا کر دوں گا، تو اب حقدار چاہے کفیل سے مطالبہ کرے یا اصیل سے اس کو دونوں کا حق ہے[1]

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے کہا کہ اگر اس نے نہ دیا تو میں دوں گا تو مکفول لہٗ یعنی حقدار پہلے اصیل سے مطالبہ کرے، اگر وہ ادا نہ کرے تو اس کے بعد پھر کفیل سے مانگے۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ مکفول لہٗ نے اصیل کو ایک ماہ کی مہلت دی ہے، یا ایک سال کے وعدہ پر اس نے قرض دیا، تو وہ ایک ماہ تک یا ایک سال کفیل سے مطالبہ نہیں کر سکتا، اس مدت کے بعد تو وہ کفیل سے مطالبہ کر سکتا ہے۔

کفالت کے صحیح ہونے کے شرائط

(۱) کفالت اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے، جب کفیل، اور اصیل دونوں عاقل اور بالغ ہوں[2]

(۲) اگر مکفول بہ کوئی شخص ہے تو اس کا نام پتہ اچھی طرح معلوم ہونا چاہیئے، لیکن اگر مکفول بہ مال ہے تو اس کی مقدار کا معلوم ہونا اور بتانا ضروری نہیں ہے، بلکہ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ میں فلاں کے قرض کا ذمہ دار ہوں یا فلاں مال کا ذمہ دار ہوں[3]

(۳) مکفول بہ یعنی وہ مال ایسا ہو کہ اصیل خود اس کا ضامن بن سکے، اب اگر کوئی رہن رکھی ہوئی چیز یا عاریۃً لی ہوئی چیز میں کفالت کرے تو صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ مرتہن اور مستعیر پر اس کے تلف ہو جانے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، راہن اور رعایت دینے والے کو خود سمجھ بوجھ کر دینا چاہیئے، کسی کو کفیل بنانا صحیح نہیں ہے، اسی طرح امانت و ودیعت میں بھی کفالت صحیح نہیں

---

[1] الطالب مخیر فی مطالبتہ ان شاء طلب الاصیل وان شاء طلب الکفیل۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۹۵)

[2] کون الکفیل عاقلا بالغا والمکفول عنہ ان یکون عاقلا بالغا۔ (المجلہ)

[3] ان کان المکفول بہ نفسا یشترط ان یکون معلوما وان کان مالا لایشترط ان یکون معلوما ص ۹۲۔

ہے۔ (المجلہ ص۹۲)

کفیل کی ذمہ داریاں

(۱) اگر کفیل نے کسی شخص کی ضمانت لی ہے، تو وقتِ مقررہ پر اس کو حاضر کرنا ضروری ہوگا، اگر اس نے حاضر نہ کیا تو اس وقت تک وہ قید کر لیا جائے گا، جب تک وہ اس کو حاضر نہ کر دے، یہ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمہا اللہ کی رائے ہے، اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس نے حاضر نہ کیا تو اس کو سزا نہیں دی جائے گی، بلکہ اس سے کچھ مال بطور تاوان لیا جائے گا۔[1]

(۲) اگر کفیل یا اصیل یعنی جس کی کفالت کی ہے، وہ مر جاتے تو کفالت کی ذمہ داری ختم ہو گئی اس لئے کہ نہ ذمہ داری لینے والا باقی رہا اور نہ ذمہ داری دینے والا باقی رہا۔

(۳) لیکن اگر مکفول لہٗ یا مدّعی مر جاتے تو اس کی کفالت ختم نہیں ہوگی۔ (المجلہ ص۹۹)

(۴) حدود و قصاص و سزا میں کسی کی نیابت و کفالت صحیح نہیں ہے، یعنی قاضی مدعا علیہ کو کفیل لانے پر مجبور نہیں کر سکتا، البتہ صاحبین قصاص اور قذف میں کفالت ضروری سمجھتے ہیں، اس لئے کہ یہ بندوں کے حقوق ہیں۔ (شرح وقایہ ج ۳ ص۹۶)

البتہ دیت وغیرہ کی ادائیگی کی ذمہ داری لے سکتا ہے۔

مالی کفالت کے سلسلہ میں کفیل کی ذمہ داریاں

(۱) کفیل کفالت کے مال کا ضامن ہوتا ہے، یعنی اصیل ادا نہ کرے گا تو اس کو دینا پڑے گا۔

(۲) حقدار یعنی مکفول لہٗ چاہے اصیل سے مطالبہ کرے، چاہے کفیل سے چاہے دونوں سے، کسی ایک کے مطالبہ کرنے میں اس کا حق دوسرے کے بارے میں ختم نہیں ہوتا۔ (المجلہ ص۹۵)

(۳) اگر چند آدمیوں نے مل کر قرض لیا، مگر اس میں کوئی ایک آدمی ذمہ دار ہے تو صرف ذمہ دار ہی سے اس مشترک قرض کا مطالبہ نہیں ہوگا، بلکہ ان میں سے پوری رقم کا ہر ایک سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایک آدمی نے ذمہ داری ضرور لی ہے، مگر وہ ذمہ داری اس نے سب کے لئے

---

[1] بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۲۹۵ و المجلہ ص ۹۵ ' الکفیل ضامن فان احضرہ الاحبسہ الحاکم' ہدایہ ج ۳ ص ۹۶۔

لی ہے، محض اپنی ذات کے لئے نہیں لی ہے۔ (المجلہ ص۹۵ یطالب کل منہم مجموع الدین)

(۴) اگر ایک کے بجائے کئی آدمی کسی کے کفیل بن جائیں، تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ الگ الگ دو یا تین آدمیوں نے یہ کہا کہ ہم اس کے کفیل ہیں، تو مکفول لہٗ ان میں سے ہر ایک سے پوری رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ چند آدمیوں نے مل کر اکٹھا ذمہ داری لے لی، کہ فلاں کے قرض کے ہم ذمہ دار ہیں، تو ان میں سے ہر ایک پر وہ قرض بانٹ دیا جائے گا، اور جس کے حصّہ میں جتنا آئے گا، ان سے وہ وصول کیا جائے گا، مثلاً خالد کے ایک ہزار روپے احمد کے ذمّہ باقی ہیں، احمد کے چار دوستوں نے الگ الگ خالد سے کہا کہ اگر احمد نے نہ دیا تو ہم اس کے ذمّہ دار ہیں، تو خالد ان میں سے جس سے چاہے ایک ہزار روپے مانگ سکتا ہے، لیکن اگر وہ چاروں دوست ساتھ آئے اور انھوں نے مل کر خالد سے کہا کہ ہم سب ایک ہزار کے ذمّہ دار ہیں، تو اب ہر ایک کے ذمّہ ڈھائی سو روپیہ کی کفالت ہوتی، خالد ان میں سے ہر ایک سے ڈھائی سو روپے کا مطالبہ کر سکتا ہے، کسی ایک سے ایک ہزار کا مطالبہ نہیں کر سکتا[1]

(۵) اگر کفیل نے اپنے پاس سے دینے کی ذمّہ داری نہیں لی، مگر یہ کہا کہ میرے پاس مقروض کی امانت رکھی ہوئی ہے، اگر وہ نہ دے گا، تو میں اس کی امانت سے دے دوں گا، تو اب وہ کفیل ہو گیا، اور اب وہ امانت سے حق دار کا روپیہ دینے پر مجبور ہے، اگر یہ امانت اس کے پاس سے چوری ہو گئی، یا کسی اور طرح ضائع ہو گئی تو اب کفیل پر ذمّہ داری نہیں ہے، لیکن اگر اس نے کفالت کرنے کے بعد وہ امانت رکھنے والے کو واپس کر دی، تو پھر اس کو اپنے پاس سے وہ رقم دینی ہوگی[2]

(۶) اگر کفیل نے کسی شخص کو عدالت میں حاضر کرنے کی ضمانت لی اور اس شخص کے ذمّہ عدالت کا کوئی مطالبہ ہے تو اگر وہ وقت پر حاضر نہ کر سکا، تو اس مطالبہ کے ادا کرنے کی ذمہ داری کفیل

---

[1] لو کان للدین کفلاء متعددۃ فان کان کل منہم قد کفل علی حدۃ یطالب کل منہم مجموع الدین و ان کان قد کفلوا معًا یطالب کل منہم بمقدار حصتہ من الدین ص۹۲۔

[2] المجلہ ص۹۶۔

پر ہوگی۔ جو دَین کہ مُعجّل ہو، یعنی اس کی ادائیگی بر وقت کرنی ہو، اس کی کفالت بھی مُعجّ
اور جو دین کے مُوجّل ہو، یعنی اس کی ادائیگی کے لئے ایک یا دو ماہ یا سال دو سال کا وہ
مقرر ہو تو اس کی کفالت بھی موجّل ہوگی، غرض یہ کہ جن قیود کے ساتھ قرض یا بقایا ہوگا، اسی قید
کے ساتھ کفیل کی ذمّہ داری ہوگی۔[1]

(۷) اگر مکفول لہٗ یعنی حقدار نے اصیل کو ادائیگی کی ایک مقررہ مدت دے رکھی ہے، اور اس
قرض کی کسی نے کفالت کرلی، مگر ادائیگی سے پہلے اصیل اپنے وطن سے دور کہیں باہر جانا چاہتا
ہے، اور واپسی کی مدّت مقرر نہیں ہے، تو اگر مکفول لہٗ نے حکومت کے سامنے درخواست
دی کہ میرا قرض اسی وقت مل جانا چاہیئے، تو کفیل قانونی طور پر مجبور کرسکتا ہے کہ وہ روپے دے کر
باہر جائے۔[2]

(۸) کفیل نے جس طرح کی چیز کفالت میں ادا کی ہے، اسی طرح کی چیز وہ اصیل سے واپس لے
سکتا ہے، خواہ اس نے دائن یعنی مکفول لہٗ کو اچھی چیز دی ہو یا بری مثلاً اس نے ایک من لال
گیہوں کی ضمانت لی، اور اس نے ایک من سفید گیہوں دائن کو دیا تو اب کفیل اصیل سے سفید گیہوں
نہیں لے سکتا، بلکہ لال ہی گیہوں لے گا، اس لئے کہ اسی کی کفالت اس نے لی تھی، اب اگر اس نے
اپنی مرضی سے اچھا دے دیا تو اس کی ذمہ داری اصیل پر نہیں ہے، اسی طرح اس کے برعکس، یعنی
اگر اس نے خراب دیا اور مکفول لہٗ نے لے لیا تو کفیل اصیل سے وہی وصول کرے گا، جس کی اس
نے کفالت لی ہے۔

(۹) مالی کفالت میں کفیل یا اصیل یا دائن کے مرنے کا کوئی اثر کفالت پر نہیں پڑتا، کفیل کو بہرحال
ادا کرنا ہوگا، اگر نہ ادا کرے گا، تو اس کے ترکہ سے وہ وصول کیا جائے گا۔

(۱۰) اگر کفیل اپنی ذمہ داری اٹھالے تو اس سے اصیل کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی، لیکن اصیل
اس کو ادا کردے تو پھر کفیل بری الذمّہ ہو جائے گا۔ (المجلہ ص۹۸)

کفالت کن چیزوں میں ہوسکتی ہے

(۱) جس طرح کسی شخص یا مال کی ادائیگی اور حاضری کی ضمانت و کفالت صحیح ہے، اسی طرح نقل و حمل

---

[1] المجلہ ص۹۶ دفعہ ۶۹۲ - [2] المدیون موجلا لو اراد الذھاب الی دیار اخری۔ المجلہ ص۹۷

کی بھی کفالت صحیح ہے۔

ریلوے ضامن اور کفیل ہے

(۲) جو لوگ ریل سے سفر کرتے ہیں، انھوں نے جہاںتک کا ٹکٹ لیا ہے، یا اپنا مال جہاں لے جانے کے لئے بُک کرایا ہے، ریلوے اس مقام تک پہونچانے کی ذمہ دار یعنی کفیل ہے، اب اگر گاڑی ٹھہر جائے یا گر پڑے، اور مسافروں کی جان یا مال کا نقصان ہو جائے، یا ان کا ٹکٹ ریل کے حادثہ میں گم ہو جائے، تو اس کے نقصان کی تلافی ریلوے کو کرنی ہوگی، اور اس کو بغیر ٹکٹ اس مقام تک پہونچانا ہوگا، اگر وہ اس کی تلافی نہ کرے تو قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے، البتہ اگر کسی کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ بلا ٹکٹ تھا، تو اس کو پہونچانے کی کوئی ذمہ داری ریلوے پر نہیں۔

(۳) اسی طرح جو مال یا سامان تاجر ریلوے کے ذریعہ منگاتے ہیں یا بھیجتے ہیں، ان سب کی ذمہ داری ریلوے پر ہے، یعنی اگر وہ گم ہو جائے یا ٹوٹ پھوٹ جائے، تو اس کے نقصان کا ہرجانہ ریلوے کو دینا ہوگا، اگر وہ نہ دے تو مال بھیجنے والا قانونی کارروائی کے ذریعہ لے سکتا ہے[1]، اسی کو شریعت میں اَلْکِفَالَۃُ بِالتَّسْلِیْمِ (کفالت نام ہے سپرد کر دینے کا) کہتے ہیں۔

ڈاک خانہ بھی کفیل ہے

اسی طرح جو خطوط، رجسٹری، منی آرڈر، بیمے، پارسل، ڈاک خانہ کے ذریعہ بھیجے جاتے ہیں، ڈاک خانہ ان سب کا کفیل ہے، یعنی اگر وہ گم ہو جائیں، اور ان کا ثبوت مل جائے تو ڈاک خانہ کو ان کا ہرجانہ ادا کرنا ہوگا اس لئے کہ اَلْکِفَالَۃُ بِالدَّرْكِ، کفالت نام ہے تسلیم ثمن کا یعنی جس مال یا سامان کی اس نے ذمّہ داری لی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ مکفول لہٗ تک پہونچائے۔

کسی چیز کے پہونچانے کا بیمہ

اسی طرح اگر کوئی جہاز راں کمپنی یا بیمہ کمپنی اس بات کی ذمہ داری لے کہ یہ مال فلاں جگہ پہونچا دے گی، اور اتنی فیس لے گی، اور اگر مال ضائع ہو گیا، تو اس کا تاوان اس کے ذمّہ ہوگا، تو یہ بیمہ جائز

---

[1] المجلہ ص۹۰ و امداد الفتاوی ج ۳ ص۳۲۱۔

ہے، جہاز راں کمپنی یا بیمہ کمپنی اس کی ذمہ دار ہوگی، البتہ جہاز راں کمپنی اور بیمہ کمپنی کی ذمہ داری میں تھوڑا سا فرق ہے، جہاز راں کمپنی بعض صورتوں میں اجیر مشترک اور بعض صورتوں میں امین بالاُجرت ہوتی ہے، اور بیمہ کمپنی ہر حال میں کفیل ہوگی۔

ضروری ہدایتیں

مگر اس سلسلہ میں دو باتیں ملحوظ رہنی چاہئیں۔

ایک یہ کہ جتنا مال ہو صحیح صحیح اتنا ہی درج کرایا جائے، اگر اس نے غلط طور پر زیادہ مال دکھایا تو گناہ گار ہوگا۔

دوسرے یہ کہ اس پر جان و مال کے اس بیمہ کو قیاس نہ کیا جائے، جو آج کل عام طور پر رائج ہے، اس کی حقیقت سود و قمار ہے، جس کی تفصیل سود کے بیان کے سلسلہ میں آچکی ہے۔

مُردہ کی طرف سے کفالت

اگر کوئی مقروض مرجائے اور اس کے قرض کی ذمہ داری مرنے کے بعد دوسرا آدمی لے لے تو اس کی ادائیگی ضروری ہے یا نہیں، اس بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃُ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ ترکہ میں کچھ چھوڑ گیا ہے تب تو اس کی کفالت صحیح ہے، اگر کچھ چھوڑ نہیں گیا ہے تو اس کی کفالت صحیح نہیں ہے، یعنی کفیل کو ادا نہ کرنا پڑے گا، مگر دوسرے ائمہ کہتے ہیں کہ مُردہ کی طرف سے بھی کفالت جائز ہے، اس کے ثبوت میں یہ حضرات یہ حدیث نبوی پیش کرتے ہیں کہ بعض صحابہ نے مُردہ مقروض کی ذمہ داری لی تھی، اور آپؐ نے ان سے ادا کروا دیا تھا، حالانکہ اس مردہ نے کوئی ترکہ نہیں چھوڑا تھا، اور یہ اس لئے بھی جائز ہونی چاہیئے کہ مردہ کے قرض کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ "جب تک مُردہ کا قرض ادا نہیں کیا جاتا وہ ایک قیدی کے مانند پابند رہتا ہے"، اس صورت میں ایک مسلمان اگر اس کو اس قید سے نجات دے دیتا ہے، یہ انتہائی مناسب بات ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حَوالہ

جس طرح ایک غریب اور ضرورت مند آدمی کی حاجت روائی کے لئے اسلامی شریعت نے قرض لینے کی اجازت دی ہے، اور جس طرح مدیون اور مقروض کے بار کو ہلکا پھلکا کرنے کے

لئے اس نے کفالت کی اجازت دی ہے، اسی طرح قرض میں پھنسے ہوتے آدمی کے لئے آسانی کی ایک اور صورت بھی پیدا کی ہے، اس کو حَوالہ کہتے ہیں۔

حَوالہ کے معنی اور اس کی شرعی تعریف

حوالہ کے لفظی معنی اپنی ذمہ داری کو کسی دوسرے پر ڈال دینے کے ہیں، مگر شریعت میں:۔

نَقْلُ الدَّیْنِ مِنْ ذِمَّۃٍ اِلٰی ذِمَّۃٍ اُخْرٰی [۱]

اپنے قرض کی ذمہ داری کو دوسرے کی طرف منتقل کر دینے کو حوالہ کہتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امتِ مسلمہ کے آسودہ حال افراد کو یہ حکم فرمایا کہ اگر کوئی اپنے قرض کی ذمہ داری اس کے سر ڈالے تو ان کو یہ ذمہ داری قبول کر لینی چاہیئے، آپؐ نے فرمایا کہ:

مَطْلُ الْغَنِیِّ ظُلْمٌ وَ اِذَا اُتْبِعَ اَحَدُکُمْ عَلٰی مَلِیٍّ فَلْیَتْبَعْ۔ (ابوداؤد)

مال دار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے، اور جب کوئی نادار کسی آسودہ حال کے ذمہ اپنا قرض ڈالنا چاہے، تو آسودہ حال کو یہ ذمہ داری قبول کر لینی چاہیئے۔

حوالہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے

اگر کوئی آدمی کسی دوسرے کا حوالہ قبول نہ کرے تو اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی تو نہیں کی جا سکتی، لیکن کسی نے یہ ذمہ داری اٹھانے سے پہلوتہی کی تو اس نے ایک اخلاقی فرض میں کوتاہی کی، اس کو ایک اخلاقی فرض سمجھ کر ادا کرنا چاہیئے تھا، خواہ اس میں کچھ مالی نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے، اور جب وہ قبول کر لے گا، تو پھر اس کی ادائیگی اس پر ضروری ہو گی، پھر اس سے بچنے کی بعض صورتیں ہیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

بعض ضروری اصطلاحیں

اس سلسلہ میں بعض ضروری اصطلاحوں کا یاد کر لینا ضروری ہے، ان کا ذکر بار بار آئے گا، اور ان کے بغیر حوالہ ہو ہی نہیں سکتا۔

---

[۱] الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج ۲ ص ۲۲۰، المجلہ ص ۱۰۲۔

۱۔ مُحِیل یا مَدیون یعنی وہ شخص جو اپنے ذمّہ کی رقم دوسرے کے ذمّہ ڈالنا چاہتا ہے۔
۲۔ مُحتال یا محال لہٗ یا دائن یعنی رقم پانے والا، یا وہ شخص جس کی رقم مُحِیل کے ذمّہ باقی ہے۔
۳۔ مُحتال علیہ یا محال علیہ جس نے مُحِیل کی بقایا، یا قرض رقم کی ادائیگی کی ذمّہ داری لی ہے۔
۴۔ مُحتال بہٖ یا محال بہٖ یعنی وہ رقم جس کا حوالہ کیا گیا ہو۔

مثال کے طور پر خالد کے ذمّہ احمد کے ایک ہزار روپے باقی ہیں، اب خالد نے ایک تیسرے آدمی طارق سے یہ کہا کہ آپ احمد کے روپے کی ذمّہ داری لے لیجئے، میں اس وقت ادا نہیں کر سکتا، اب اگر طارق نے اسے قبول کر لیا، تو خالد کو مُحِیل اور احمد کو مُحتال لہٗ طارق کو مُحتال علیہ اور ایک ہزار روپے کو مُحتال بہٖ کہیں گے اور پورے معاملہ کو حوالہ کہیں گے۔

کفالت اور حوالہ میں فرق

کفالت اور حوالہ میں فرق یہ ہے کہ کفالت میں حق دار اصیل اور کفیل دونوں سے مطالبہ کر سکتا ہے، اور حوالہ میں مقروض سے کوئی مطلب نہیں، حق دار صرف مُحتال علیہ یعنی جس نے ذمہ داری لی ہے، اسی سے مطالبہ کر سکتا ہے، چنانچہ اسی وجہ سے اگر کفالت میں یہ شرط لگا دی کہ اصیل سے کوئی مطالبہ نہیں ہوگا، اور اُس کو سب نے قبول کر لیا، تو اب یہ کفالت نہیں رہی، بلکہ حوالہ ہو گیا، اسی طرح حوالہ میں یہ شرط لگا دی کہ مُحتال علیہ کے ساتھ وہ مُحِیل سے مطالبہ کر سکتا ہے، یہ حوالہ نہیں رہا، بلکہ اب یہ کفالت ہو جائے گی۔

حوالہ کی قسمیں

حوالہ کی دو قسمیں ہیں (۱) ایک حوالہ مقیَّدہ یعنی مُحِیل کا جو روپیہ کسی دوسرے کے ذمّہ باقی ہے، وہ اپنے قرض میں مُحتال کو دلا دے، اس کی یہ صورت ہے کہ خالد احمد کا ایک ہزار روپے کا مقروض ہے، اور احمد طارق کا ایک ہزار کا مقروض ہے، احمد نے خالد سے تقاضا کیا، خالد نے احمد سے کہا کہ میرے اتنے روپے طارق کے ذمّہ باقی ہیں، تم ان سے لے لو، اب اگر احمد اور طارق نے منظور کر لیا تو یہ حوالہ ہو گیا، اب احمد خالد سے نہیں طارق سے روپیہ طلب کرے گا، اب اگر جو روپیہ خالد نے طارق سے احمد کو دلوایا ہے، وہ اتنا ہی ہے، جتنا کہ احمد کا اس کے ذمہ باقی تھا، تو اب خالد سے کچھ مانگ نہیں سکتا، لیکن اگر کم ہے، تو اتنا وضع کرنے کے بعد بقیہ کا مطالبہ احمد خالد سے کرے گا، اور اگر خالد کا روپیہ احمد کے

مطالبے سے زیادہ ہے تو بقیہ کا مطالبہ خالد طارق سے کرے گا۔

۲ - دوسری قسم حوالہ مطلقہ ہے، یعنی اس صورت میں محیل کا کسی کے ذمہ کچھ باقی نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے قرض کی ادائیگی کسی کے حوالہ کرتا ہے، مثلاً خالد احمد کا مقروض ہے، اس نے طارق سے کہا کہ تم ہماری طرف سے اس کا روپیہ ادا کر دو، جب ہوگا میں دوں گا، تو طارق نے اگر قبول کرلیا، تو اب اس پر اس کی ادائیگی ضروری ہوگی [۱]

حوالہ کے ارکان

۱- حوالہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ مُحتال (یعنی جس کو رقم دلانا ہے) اور محتال علیہ (جس سے دلانا ہے) دونوں کو خبر ہو اور دونوں راضی ہوں اگر ان میں سے کسی کو خبر نہ ہو تو پھر یہ حوالہ صحیح نہ ہوگا۔

۲ - حوالہ کرتے وقت مُحیل اور مُحتال کا موجود ہونا ضروری ہوگا، لیکن اگر محتال علیہ موجود نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اس کو اطلاع دے کر اجازت منگا لینی ضروری ہے، جب تک اس کی اجازت نہ آجائے [۲] حوالہ صحیح نہیں ہوگا - (قاضی خاں، باب الحوالہ)

حوالہ کے صحیح ہونے کی شرطیں

(۱) حوالہ کے صحیح ہونے کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ محیل، محتال اور محتال علیہ تینوں عاقل بھی ہوں، اور بالغ بھی، یعنی اگر ان میں سے کوئی بچہ یا پاگل ہوگا یا جس کو حکومت نے اپنی ملکیت میں تصرف سے روک دیا ہو، یعنی (مجھُور) تو ان سب کا حوالہ باطل ہوگا [۳]

(۲) جس قرض کی کفالت صحیح نہ ہوگی، اس کا حوالہ بھی صحیح نہ ہوگا، مثلاً رہن رکھی ہوئی چیز کا نہ تو حوالہ صحیح ہے اور نہ کفالت [۴]

(۳) کفالت میں رقم کی یا دَین کی مقدار معلوم ہو یا نہ ہو، کفالت صحیح ہو جاتی ہے، مگر حوالہ میں اگر رقم معلوم نہ ہو تو پھر حوالہ صحیح نہ ہوگا، مثلاً کسی نے کہا کہ یہ جو کچھ خریدیں گے، اگر یہ ادا نہ کریں گے، میں ادا کروں گا، تو یہ کفالت صحیح ہے، لیکن اگر محیل، محتال سے یہ کہے کہ جو میں

---

[۱] المجلہ ص۱۰۲ ، [۲] المجلہ ص۱۰۳ ، [۳] المجلہ ص۱۰۴ -

[۴] کل دین لم تصح الکفالۃ لا تصح حوالتہ ایضاً ص۱۰۴ -

خریدوں یا جو میں قرض لوں، اس کی ذمہ داری آپ لے لیجئے، اور اس نے لے لیا تو صحیح نہیں ہے بلکہ اس کو بتانا ضروری ہے کہ کس چیز کی کتنی رقم کا یہ حوالہ کر رہا ہے[1]

(۴) جس طرح وہ قرض جو اس نے اپنی ذات کے لئے لے لیا ہے، اس کا حوالہ کر سکتا ہے اسی طرح وہ اگر کسی کا کفیل یا محتال علیہ ہے، اور رقم ادا نہیں کر پاتا ہے، تو وہ بھی اس رقم کو کسی کے حوالہ کر سکتا ہے[2]

حوالہ کا حکم

(۱) حوالہ کرنے کے بعد اب محتال صرف محتال علیہ سے مطالبہ کر سکتا ہے محیل سے کوئی مطلب نہیں، اگر محیل کا کوئی کفیل ہے، تو وہ بھی حوالہ سے بری ہے۔

۲۔ محال علیہ محیل کی رقم ادا کرنے کے بعد اپنی رقم محیل سے وصول کر سکتا ہے، اگر محیل بغیر ادا کئے ہوئے مر جائے تو اس کے ترکہ سے یہ رقم وصول کی جائے گی، اگر اس کے مال کے کچھ اور دائن یا حقدار نکلیں تو ان سب کو محال علیہ کے رقم دینے کے بعد ہی دیا جائے گا۔

۳۔ اگر محیل کا روپیہ کسی کے یہاں امانت رکھا ہے، اور اس نے اسی کو محال علیہ بنایا، یعنی اپنے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری سونپی تو محال علیہ اس کا روپیہ ادا کر کے امانت کے روپیہ سے اپنا روپیہ وصول کر سکتا ہے، اگر اس اثناء میں امانت کے روپے محتال علیہ سے ضائع ہو گئے، تو اب حوالہ باطل ہو گیا، اب محتال محیل سے طلب کرے گا، لیکن اگر یہ امانت باضمانت تھی، تو پھر حوالہ اپنی جگہ پر باقی رہے گا[3]

۴۔ اگر زید احمد کا مقروض ہے، اور زید کا کچھ مال خالد کے پاس رکھا ہے، اور زید خالد سے کہتا ہے کہ وہ اس کو بطور حوالہ لے لے، اور بیچ کر اس سے احمد کا قرض ادا کر دے، تو اگر خالد نے منظور کر لیا، تو اب خالد محتال علیہ ہو گیا، اب اس کو احمد یعنی محتال کا روپیہ ادا کرنا

---

[1] یلزم ان المحتال بہ معلوماً لا تصح حوالۃ الدین المجهول۔ المجلہ

[2] تصح حوالۃ الدیون التی تترتب فی الذمۃ من جہ الکفالۃ۔ (المجلہ ص۱۰۰)

[3] ولو کانت الامانتہ مضمونتہ باتلافہ فلا تبطل الحوالۃ المجلہ ص۱۰۵۔

ضروری ہوگا، اور اگر ادا نہ کرے گا، تو قانونی طور پر اس کو اس پر مجبور کیا جائے گا۔[1]

۵۔ محال علیہ حوالہ کی رقم ادا کرنے سے پہلے محیل سے اس رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

۶۔ محیل نے محال علیہ سے جو چیز دینے کے لئے کہا تھا، وہی چیز محیل سے واپس لے سکتا ہے، اگر اس نے اپنی طبیعت سے کوئی چیز دی ہے تو وہ محیل سے نہیں لے سکتا، مثلاً محیل نے کہا کہ چار تولہ چاندی فلاں کو میری طرف سے دے دیجئے، اس نے چاندی کے بجائے، اتنی ہی قیمت کا سونا دے دیا تو اب وہ چار تولہ کی قیمت کا سونا یا ایک تولہ سونا محیل سے مانگے تو یہ جائز نہیں ہے، وہ چار تولہ چاندی یا اس کی قیمت ہی لے سکتا ہے، اسی طرح دوسری چیزیں بھی ہیں۔

۷۔ اگر حوالہ کرنے کے بعد خود محیل ہی نے رقم ادا کر دی تو ادا ہو گئی، اب محتال کو محتال علیہ سے مانگنے کا حق نہیں ہے۔

۸۔ محتال علیہ کے مرنے سے حوالہ کا مطالبہ جاتا نہیں، محتال علیہ کے ترکے سے وہ رقم محتال دی جائے گی، بشرطیکہ وہ بالکل مفلس ہو کر نہ مرا ہو۔[2]

غیر ملکی تجارت میں حوالہ اور کفالت کا فائدہ

روز مرّہ کی ضروریات کے علاوہ دور دراز اور غیر ملکی تجارتوں میں تبادلۂ زر اور تبادلۂ جنس دونوں میں حوالہ اور کفالت دونوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں ہنڈیوں اور طلائی زر کے تبادلہ میں جو بٹّہ کاٹنے کا عام رواج ہے، اسلامی شریعت کی رو سے یہ جائز نہیں ہے، بلکہ یہ سود ہے، اگر بغیر بٹّہ کاٹے ہوتے کوئی رقم یا کوئی چیز کسی دوسرے ملک میں حوالہ کی جائے تو یہ صحیح ہے، اس حوالہ میں محتال علیہ کا ہر وقت موجود ہونا ضروری نہیں، بلکہ بعد میں بھی اس کی اجازت منگائی

---

[1] ویجبر المحال علیہ علی بیع ذالك المال واداء الحوالة من ثمنه ایضاً ص۱۰۵۔

[2] شرح وقایہ ج ۳ ص۱۱۹۔

جا سکتی ہے [1]

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ بین الاقوامی تجارت میں قرضوں اور بقایا رقموں کی ادائیگی میں حوالہ فارن بل آف ایکسچینج (Bill of Exchange) کا نعم البدل ثابت ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ہنڈی میں کٹوتی کی شرط نہ ہو تو ہر طرح کے تجارتی قرضوں کی ادائیگی حوالہ کے ذریعہ ہو سکتی ہے [2]، اوپر ذکر آچکا ہے کہ حوالہ میں محتال علیہ کے مجلس میں موجود ہونے کی بھی کوئی لازمی شرط نہیں ہے، اگر وہ بعد میں بھی اسے منظور کرے تو حوالہ صحیح ہو جائے گا، مثال کے طور پر جن ملکوں میں غلّہ یا روئی کی پیداوار کم ہوتی ہے، اب اگر ہندوستان سے پاکستان ایک لاکھ ٹن غلّہ یا روئی بھیجی جائے، تو اس کی ایک صورت تو تبادلہ اشیاء کی ہوتی ہے، مثلاً روئی کے بدلہ غلّہ اور غلّہ کے بدلہ روئی، اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے، اس کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کی قیمت یا نقد ادا کی جائے، روئی کی قیمت کی نقد ادائیگی میں سود کے ساتھ ہنڈی وغیرہ

---

[1] مولانا عبدالحیٔ رحمۃ اللہ علیہ نے شرح وقایہ کے حاشیہ "وکرہ السفاتجۃ" کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر اس میں قرض دینے والے کا فائدہ ہے تو یہ جائز نہیں، اسی طرح بٹہ کاٹنے کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ علامہ عینی نے لکھا ہے کہ اذا کان النفع مشروطا فی القرض وکذالک اذا کان متعارفا فیحرم والا فلا، ج ۳ ص ۱۱۹۔

[2] آگے سفتجہ کی بحث میں آئے گا، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی رقم ادا کر کے اس سے ایک ہنڈی بنوا لیتا ہے، اور وہ تیسرے کے پاس ہنڈی بھیجتا ہے اور اسے قبول کرتا اور ادائیگی کا اقرار کرتا ہے، مگر حوالہ کی نوعیت عام طور پر قرض کی ذمہ داری لینے کے آتے ہیں، اس لئے فقہاء کہتے ہیں "انما اختصت بالدیون"۔ اوپر اس کی تعریف آچکی ہے، جرمن مستشرق جان کریمر نے مسلمانوں کے حوالہ کے طریقہ کو بین الاقوامی تجارت کے لئے بہت مفید قرار دیا۔ (بحوالہ اسلام کے معاشی نظریے، ج ا ص ۲۱۴)

سفتجہ فارسی زبان سے معرب ہو کر آیا ہے، سفتجہ کھوکھلی ہڈی کو کہتے ہیں، پہلے زمانہ میں عموماً روپے کی حفاظت کے لئے اپنی چھڑی کو کھوکھلا کر کے اس میں روپیہ رکھ لیتے تھے، تاکہ وہ راستے کے خطرہ سے محفوظ رہے پھر یہ لفظ کسی تحریر کے ذریعہ بھجوانے پر بولا جانے لگا۔

(ہدایہ ج ۳ ص ۱۱۴ کتاب الحوالہ)

میں کٹوتی کا رواج ہے، اس کے معائب سے بچنے کے لئے اور رقم کو باقی دار تک پہونچانے کے لئے اسلامی شریعت میں حوالہ بہترین طریقہ ہے۔

اس مسئلہ میں سفتجہ کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، جسے فقہاء مکروہ تحریمی کہتے ہیں، ہدایہ میں ہے:

ویکرہ السفاتج وھی قرض	سفتجہ مکروہ ہے، یہ اس قرض کا نام ہے
استفاد بہ المقرض سقوط	جس سے قرض دینے والا راستہ کے تمام
خطر الطریق وھذا نوع نفعٍ	خطرہ سے بچنے کا فائدہ اٹھاتا ہے اور قرض
وقد نھی الرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ	سے اس طرح نفع اٹھانے کو حضور صلی اللہ
علیہ وسلم عن قرض جرّ نفعاً۔	علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رقم بھیجنے میں راستہ میں جو خطرات پیش آتے تھے، ان سے بچاؤ کے لئے ایک تحریر لکھ دی جاتی تھی، اسے سفتجہ کہتے تھے۔

اس عبارت کے اوپر ہدایہ اور شرح وقایہ کے حاشیہ میں مولانا عبدالحئی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر قرض کی ادائیگی میں اُجرت کی شرط نہ لگائی جائے تو یہ جائز ہے، جیسا کہ حوالہ میں ہوتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر ہنڈی وغیرہ کے ذریعہ روپیہ کی ادائیگی اجرت لے کر نہ کی جائے تو

تعطلت الامور وکسدت التجارات	بہت سے تجارتی معاملات معطل ہو کر رہ
وانقلبت الاحوال من الیسرالی	جائینگے اور آسان صورت دشواری میں تبدیل
العسر فلا یضاق علی الناس	ہو جائیگی تو لوگوں پر تنگی نہیں کیجا سکتی اور اس
ولا یفتن بالفتنۃ بمجرد التاویل	فتنہ میں ڈالنے کا فتویٰ محض تاویل وتعبیر کے
والتعبیر فیجب ان لا یسمع	بنا پر نہیں دیا جاسکتا، تو ضروری ہے کہ بغیر فیصلہ
قول قائلٍ بلا وجہٍ فاصل	کن رائے اور نص صریح کے کسی کی رائے
ونص ناطق۔	نہ سنی جائے۔

مگر اس بحث کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اسے کس عقد میں شامل کیا جائے، پھر اس کا جواب خود ہی دیتے ہیں:

ای عقد یحسب ھی فیاخذ حکمہ	اس کو کس عقد میں شامل کیا جائے، میں
قلتُ انہا حوالۃ وانت تعلم	کہتا ہوں کہ یہ حوالہ ہے اور یہ نہیں معلوم
ان الحوالۃ قد تکون بمعنی	ہے کہ حوالہ کبھی وکالت کے معنی میں استعمال
الوکالۃ وقد تکون ان یحتال	ہوتا ہے، اور حوالہ کبھی قرض دار کے لئے ہوتا
للدائن وقد یحتال بغیر الدائن[1]	ہے اور کبھی بغیر قرض ہی کے حوالہ ہوتا ہے،
ولا روایۃ ان الوکیل والمحتال	اور کوئی ایسی روایت نہیں ملتی کہ وکیل
علیہ حرام علیہ الاجرۃ	اور محتال علیہ پر موکل اور محیل سے اگر اس
والاخذ من الموکل والمحیل	نے کچھ کام کیا ہے تو اجرت لینا حرام ہو، اگر
ان عمل فیہ عملا فلا باس فیہ	اس نے کچھ کام کیا ہے تو اجرت لینے میں
انشاء اللہ۔[2]	کوئی حرج نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں عہد صحابہؓ کے بعض معاملات اور بعد کے دور کے فقہاء کی کچھ رایوں کو نقل کیا جاتا ہے، جس سے اندازہ ہوگا، موجودہ دور میں قرضہ کی ادائیگی کا جو طریقہ رائج ہے، اگر اس سے بٹہ کاٹنے کی شرط اور سود کی آمیزش ختم کر دی جائے تو حوالہ سے بین الاقوامی تجارت میں پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اور سفاتج کے ذریعہ حوالہ کو غالباً فقہا نے اسی لئے مکروہ لکھا ہے کہ بغیر کسی زائد عمل کے قرض سے فائدہ اٹھانا حرام ہے۔

عہدِ نبوی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے کاروبار کا پھیلاؤ اس عہد میں زیادہ بڑھا ہوا نہیں تھا، مگر عہد صحابہ میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں،

---

[1] مولانا عبد الحئی صاحب نے حوالہ کو قرض کے ساتھ مخصوص کرنے کو بھی صحیح نہیں سمجھا ہے جیسا کہ ان کی عبارت "وقد یحتال بغیر الدائن" سے معلوم ہوتا ہے اور یہ صحیح ہے۔

[2] شرح وقایہ، ج ۳ ص ۱۹۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ لوگوں کو مکہ میں رقم دیتے تھے، اور اس کے بارے مصعب بن زیدؓ کو عراق میں لکھتے تھے، کہ اتنی رقم دے دی جائے، اور لوگ ان سے وہاں وصول کر لیتے تھے[۱]

ابن ابی شیبہ متوفی ۲۹۷ھ نے بھی اپنے مصنف میں عبداللہ بن زبیرؓ کے اس معاملہ کا ذکر کیا ہے[۲]، مصنف ابن شیبہ میں امام حسن کا بیان بھی درج ہے، کہ وہ حجاز میں رقم لے لیا کرتے تھے، اور عراق میں ادا کرتے تھے، اور عراق میں لیتے تھے، اور حجاز میں ادا کرتے تھے[۳]، عہدِ فاروقی میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ بیت المال میں رقم دوسری جگہوں سے معتبر تاجروں کے ذریعہ بھیجی جاتی تھیں، اور اس رقم سے وہ تاجر درمیان میں کچھ سامان خرید کر فائدہ بھی اٹھا لیتے تھے، ایک بار حضرت عمرؓ کے دونوں صاحبزادے عبداللہ و عبیداللہ ایک فوج کے ساتھ عراق گئے، واپسی میں بصرہ کے حاکم حضرت ابو موسیٰ اشعری نے فرمایا کہ بیت المال کی کچھ رقم میرے پاس ہے، جو آپ لوگوں کو دے رہا ہوں، اس روپیہ کو میں بطور قرض دیتا ہوں، آپ لوگ اس سے عراق سے سامان خرید لیں، اور مکہ میں اسے فروخت کر دیں، جو فائدہ ہو، وہ آپ لے لیں، اور اصل رقم امیر المومنینؓ کے حوالہ کر دیں، چنانچہ ابو موسیٰ نے ایسا ہی کیا، اور ساتھ میں ایک تحریر لکھ دی کہ ان سے یہ رقم وصول کر لیجئے گا، وہ لوگ مدینہ واپس آئے، اور مال فروخت کر کے نفع رکھ لیا، اور اصل رقم حضرت عمرؓ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوتے، غالباً حضرت فاروقؓ نے تفصیل پوچھی ہوگی، تو انھوں نے بتایا ہوگا، حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ فوج میں جتنے لوگ تھے، سب کو اسی طرح قرض دیا گیا تھا، دونوں صاحبزادوں نے کہا کہ نہیں، تب حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ تم کو امیر المومنین کا لڑکا سمجھ کر قرض دیا گیا ہے، اس لئے تم لوگ نفع اور اصل دونوں بیت المال میں داخل کرو، حضرت عبداللہ بن عمر تو کچھ نہیں بولے، مگر حضرت عبیداللہ نے کہا کہ اگر مال تلف ہو جاتا، یا نقصان ہو جاتا تو ہم تاوان دیتے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کچھ نہیں، تم پورا مال داخل کرو، مجلس میں ایک شخص نے

---

[۱] سنن بیہقی کتاب البیوع باب ماجاء فی السفاتج، ج ۵ ص ۳۵۲۔

[۲] مصنف میں ابن ابی شیبہ باب الحوالہ۔ [۳] ایضاً۔

کہا کہ امیرالمومنین اسے آپ مضاربت کردیں تو بہتر ہے، حضرت عمرؓ نے اسے منظور کرلیا اور نفع میں آدھا بیت المال میں داخل کر دیا، اور نصف صاحبزادوں کے حوالہ کر دیا۔[1]

امام بیہقی نے حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی رائے نقل کی ہے کہ سفاتج (ہنڈی) کے ذریعہ رقم بھیجنے میں وہ کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، اس طرح انھوں نے ابن سیرین متوفی سنہ ۱۱۰ھ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں، انہ لا یری بالسفتجات باسًا اذا کان علی الوجہ المعروف۔[2]

ابن شیبہ نے مصنف میں حضرت علی کی یہ رائے نقل کی ہے، ان علیا قال لاباس ان یعطی المال بالمدینۃ ویاخذ بافریقۃ۔[3]

ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ روپیہ کی ادائیگی کے لئے سفتجہ یا ہنڈی لکھ دینے کا جو رواج تھا، اس میں اسلاف کی دو رائیں ہیں، عام طور سے فقہائے احناف اس لئے اس کو مکروہ تحریمی لکھتے ہیں کہ اس میں کوٹی وغیرہ کی شرط ہوتی تھی، مگر اوپر صحابۂ کرام کی جو رائیں اور ان کے تعامل نقل کئے گئے ہیں، اور امام مالکؒ اور دوسرے مجتہدین کی جو رائیں نقل کی گئی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ رقم کی ادائیگی اگر کچھ اجرت یا نفع لے کر بھی وہ اصل حق دار تک پہونچا دی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، حنفی فقہاء میں قاضی خاں متوفی سنہ ۵۹۲ھ نے درمیان کی رائے دی ہے، وہ لکھتے ہیں:

رجلٌ اقرض رجلاً علی ان یکتب لہ بذالك الی بلد کذا لایجوز • وان اقرض بغیر شرط وکتب لہ بذالك الی بلد اٰخر سفتجۃً جاز۔[4]	ایک شخص نے اس شرط پر قرض دیا کہ وہ فلاں شہر میں میرے لئے یہ لکھ دے یعنی کوئی فائدہ کی بات تو یہ جائز نہیں اور اگر بغیر شرط وہ قرض دے اور پھر قرض لینے والا اس کے لئے ہنڈی لکھ دے تو یہ جائز ہے۔

---

[1] موطا امام مالک کتاب القراض ومبسوط سرخسی ج ۱۲، کتاب الحوالہ [2] سنن بیہقی ج ۵ ص ۳۵۲۔
[3] مصنف ابن شیبہ کتاب البیوع فتاویٰ قاضی خاں ج ۳ ص ۴۷۷۔ [4] ج ۳ ص ۴۷۷۔

پہلی صورت میں قرض سے کچھ فائدہ متوقع تھا، اس لئے اسے انھوں نے ناجائز لکھا ہے، لیکن دوسری صورت میں بغیر کسی شرط کے معاملہ ہوا، اس لئے انھوں نے جائز لکھا ہے۔

سفتجہ کے بیان میں مولانا عبدالحیؒ صاحبؒ نے شرح وقایہ کے حاشیہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا کچھ حصہ ہم اوپر نقل کر چکے ہیں، انھوں نے ایک مثال سے اسے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

فاذا دفع المحیل مالا الی	جب محیل کوئی رقم محتال علیہ کے حوالہ کرے اور
المحتال علیہ وقال ادفعہ	اس کو فلاں جگہ پہونچادو، میں اس کے
الی فلان فی البلد الفلانی	پہونچانے اور حساب کتاب کی اتنی اجرت
ولک اجرۃ فی ایصالہ وحسابہ	دوں گا، تو اس میں کونسا شرعی مانع ہے کہ
فای محذور یلزم لیحکم بالمنع	اس کے عدم جواز کا حکم لگایا جائے اور کوئی
ولا روایۃ ان الوکیل والمحتال	ایسی روایت نہیں ہے کہ وکیل اور محتال علیہ
علیہ حرام علیہ الاجرۃ	کو موکل سے یا محیل سے اجرت لینا حرام ہو،
والاخذ من الموکل والمحیل	جبکہ اس نے اس میں کچھ عمل بھی کیا ہو،
ان عمل بہ ولا باس بہ انشاء اللہ	اس لئے میرے خیال میں انشاء اللہ اس
لاسیما فی ھذا الزمان[1]	میں کوئی حرج نہیں ہے، خاص طور پر
	اس زمانہ میں۔

اس لئے رقم کی ادائیگی کا طریقہ جو اس وقت چک، ڈرافٹ اور ہنڈی وغیرہ کے ذریعہ رائج ہے، اس میں اگر براہِ راست سود کی آمیزش نہ ہو، اور کٹوتی اور اجرت مشروط نہ ہو، مگر معروف[2] ہو تو راقم الحروف کے خیال میں جو روایتیں اوپر نقل کی گئی ہیں، ان کی بناپر حوالہ کے اس طریقہ کو جائز ہونا چاہیئے، گوکہ اوپر اجرت کے ساتھ رقم کے حوالہ کرنے کا ذکر بھی موجود ہے،

---

[1] شرح وقایہ ج ۳ ص ۱۱۹ باب الحوالہ۔

[2] گوکہ اصول ہے کہ المعروف کالمشروط مگر شرط میں چونکہ ارادہ پایا جاتا ہے، اور معروف میں صراحۃً قصد اور ارادہ نہیں پایا جاتا، اس لئے عموم بلویٰ کے تحت اسے لایا جاسکتا ہے۔

لیکن قرض سے فائدہ اٹھانے کا تعلق براہِ راست سود سے مل جاتا ہے، اس لئے یہ مسئلہ بہرحال قابلِ غور ہے، جیساکہ آخر میں مولانا عبدالحیؒ صاحبؒ نے لکھا ہے۔ "لکن الاحتیاط فی مثل ذالك المعاملات من الربو واجب"۔

البتہ اگر غیر قرض کا حوالہ ہو تو پھر اس میں ربا کا شبہہ بھی باقی نہیں رہتا۔

رہن

ایک آدمی سفر میں ہے، اور اس کو روپے کی ضرورت پیش آگئی ہے یا وہ اپنے وطن میں موجود ہے، اور اس کو روپے کی ضرورت ہوگئی مگر اس کو کوئی جانتا نہیں، یا اس سے ادائیگی کی امید نہیں ہے اس لئے کوئی قرض نہیں دیتا تو اس کے لئے قرض ملنے کی ایک صورت شریعت نے یہ نکالی ہے کہ وہ اپنی کوئی چیز کسی کے پاس گروی رکھ کر اس سے روپے لے لے، اس طرح دائن یعنی قرض دینے والے کو بھی اطمینان ہوجائے گا، کہ اس کا روپیہ مارا نہیں جائے گا، اور مدیون یعنی قرض لینے والے کی بھی ضرورت پوری ہوجائے گی۔

رہن ایک اخلاقی ذمّہ داری ہے

کسی شخص کو رہن رکھ کر روپے دینے پر مجبور تو نہیں کیا جاسکتا، مگر اسلامی شریعت کے ہر آسودہ حال فرد کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے موقع پر اپنے ضرورت مند بھائی کی اگر بغیر ضمانت لئے مدد نہیں کرتا تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ اس کی کوئی چیز رہن رکھ لے اور اس کی مدد کردے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ	اگر تم (قرض کا معاملہ کرتے وقت) سفر میں ہو، اور کوئی لکھنے والا نہ ملے تو (ایسی صورت میں اطمینان کا ذریعہ) رہن رکھنے والی چیزیں ہیں جو حقدار کے قبضہ میں دیجائیں،

اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللهَ رَبَّهٗ ۔ (بقرہ)　　　　اور کوئی کسی کا اعتبار کرلے (اور رہن میں کوئی چیز طلب نہ کرے) تو قرضدار یا مدیون کو چاہیئے کہ وہ قرض کی امانت صاحبِ حق تک پوری پوری پہونچادے اور اپنے رب سے ڈرتا رہے۔

اس آیت میں سفر کی حالت میں رہن کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ عموماً سفر میں ایسی ناگہانی ضرورت پیش آتی ہے، ورنہ حضر میں بھی اسی طرح رہن جائز ہے جس طرح سفر میں۔

اس آیت میں جو بات دائن یعنی قرض دینے والے کے لئے کہی گئی ہے کہ اس کو اطمینان اگر بغیر رہن ہو جائے، تو اس کو قرض دے دینا چاہیئے، مگر اس صورت میں چونکہ روپے کے مارے جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے قرض دار کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جس طرح اس نے اعتبار کر کے روپے دے دیا، تو تمہاری ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ اس روپیہ کو ایک امانت سمجھ کر، جب ہو جائے فوراً واپس کر دو، مار نہ بیٹھو۔

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہؓ نے ضرورت کے وقت رہن رکھ کر قرض لیا ہے، حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ غلّہ کی ضرورت ہوئی تو آپؐ نے ایک یہودی سے تیسؔ صاع یعنی تقریباً ڈھائی من غلّہ ادھار لیا، اور اس کے اطمینان کے لئے اپنی لوہے کی زرہ رہن رکھ دی، چنانچہ جب آپؐ کی وفات ہوئی تو وہ زرہ یہودی کے یہاں رہن تھی[1] (بخاری)

آپؐ نے فرمایا ہے کہ "رہن رکھ دینے سے راہن اس فائدے سے محروم نہیں کیا جاسکتا، جو اس چیز سے حاصل ہو۔" اور اسی کے اوپر اس کے نقصان کی ذمہ داری ہے[2]

آپؐ کا یہ ارشاد مبارک ایک قانونی دفعہ بھی ہے اور اخلاقی ہدایت بھی، قانونی دفعہ یہ ہے کہ مرتہن کو رہن سے کوئی فائدہ اٹھانا جائز نہیں، اگر وہ اٹھائے گا، تو اس کو اس کا تاوان دینا ہوگا، اس کی قانونی حیثیت کی تائید آپؐ کے اُس ارشاد سے بھی ہوتی ہے جس کا ذکر اوپر

---

[1] توفی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و درعه مرهونة عند یهودی بثلاثین صاعًا من شعیر (بخاری ومسلم)

[2] حضورؐ نے فرمایا ہے کہ لایغلق الرهن من صاحبه له غنمه وعلیه غرمه ۔ (دارقطنی، المنتقی ج ۲ ص ۳۶۱)

آچکا ہے، یعنی آپؐ نے فرمایا کہ قرض سے جو فائدہ اٹھایا جائے وہ سود ہے، اور اس میں اخلاقی ہدایت یہ ہے کہ مرتہن منفعت کی غرض سے قرض دے کر کوئی چیز رہن نہ لے، بلکہ خالص انسانی ہمدردی کی بنا پر ایسا کرے، کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا ہی وقت اس کے اوپر بھی آجائے، اور پھر اس کو اس لئے بھی رہن کی چیز سے فائدہ نہ اٹھانا چاہیئے کہ اس کو رہن لینے کے بعد اس کے پیسے روپے کے نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

رہن کی شرعی تعریف

رہن کے لفظی معنی کسی چیز کو کسی سبب کی بنا پر روک لینے، یا پابند کر دینے کے ہیں، شریعت میں اس کی تعریف یہ ہے کہ کسی کی کوئی چیز کسی مطالبہ، یا قرضہ کے بدلے اس لئے روک لینا کہ وہ حق، مطالبہ، یا قرضہ وصول ہو جائے، مارا نہ جائے[1]

اصطلاحیں

(۱) اِرتہان، رہن لینا۔

(۲) راہن، رہن رکھنے والا یعنی مقروض یا مدیون

(۳) مرتہن، رہن لینے والا یعنی دائن، حقدار۔

(۴) مرہون، وہ چیز جو رہن میں رکھی جائے۔

(۵) عدل، وہ شخص جس کے یہاں وہ چیز امانت رکھ دی جائے۔

رہن کے ارکان و شرائط

(۱) رہن ایک طرح کا معاہدہ ہے، اس لئے رہن کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ راہن اور مرتہن دونوں راضی ہوں یعنی راہن یہ کہے کہ میں نے فلاں قرض کے بدلہ میں یہ چیز رہن رکھی، اور مرتہن اپنی رضامندی، اور قبولیت کا اظہار کرے، اس ایجاب و قبول میں لفظ رہن کا استعمال ضروری نہیں ہے[2]

۲۔ رہن کا دوسرا ضروری رکن قبضہ ہے، یعنی راہن نے جو چیز مرتہن کو رہن میں دے دی ہے،

---

[1] الرھن ھو حبس مال و توقیفہٗ فی مقابل حق یمکن استیفائہ منہٗ۔ المحلہ ۷۰۱

[2] ھدایہ ج ۳ باب الرہن ینعقد الرھن بایجاب الراھن والمرتھن وقبولھما ولکن لا یتم الرھن ولا یلزم مالم یکن تم قبض الرھن۔ (المحلہ ۷۰۶)

اس پر اس کا قبضہ بھی دے، مثلاً اس نے کوئی کھیت رہن میں رکھا، مگر اس پر دوسرے کا قبضہ ہے تو یہ رہن صحیح نہ ہوگا۔

۳۔ تیسری شرط یہ ہے کہ راہن اور مرتہن دونوں عاقل ہوں، یعنی معاملات کو سمجھتے ہوں، بالغ ہونا ضروری نہیں ہے، ہوشیار بچے کوئی چیز رہن رکھ سکتے ہیں۔ ولا یشترط ان یکونا بالغین (المجلہ ص ۱۰۹)

۴۔ جو چیز رہن میں رکھی جائے، وہ اس قابل ہو کہ بیچ کر اس سے قیمت وصول کی جاسکے، یعنی وہ چیز موجود ہو، یعنی رہن کے وقت اس پر قبضہ ہوسکے، اور اس کو اسلامی شریعت قابل استعمال مال تسلیم کرتی ہو، مثلاً اگر کسی نے رہن میں تالاب کی مچھلی یا پھل آنے سے پہلے باغ کا پھل رہن رکھا، یا کسی دوسرے ملک میں کوئی مال ہے، جس کے آنے میں دقت یا خرچ ہے، تو ان تمام چیزوں کو رہن میں رکھنا صحیح نہ ہوگا۔[1]

مرہونہ چیز کی حیثیت

جو چیز رہن رکھی جائے، وہ مرتہن کے ہاتھ امانت باضمانت ہے، امانت باضمانت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح امانت کی حفاظت کی جاتی ہے، اسی طرح وہ خود اس کی حفاظت کرے، یا کسی ایسے شخص کی حفاظت میں دے، جو اس کے امین ہیں، مثلاً گھر کے بال، بچے اور عورتیں، لیکن امانت کے گم ہوجانے پر اس کی ذمہ داری امین پر نہیں ہوتی، لیکن اگر یہ ضائع ہوجائے گی، تو اس کی ذمہ داری مرتہن کے اوپر ہوگی[2] بشرطیکہ اس نے قصداً ایسا کیا ہو، اس کی کئی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ضائع شدہ مرہون چیز کی قیمت اتنی ہی تھی، جتنی رقم اس نے قرض میں دی ہے تو پھر اب راہن سے مرتہن اپنے روپے کا مطالبہ نہیں کرسکتا، دونوں کا حساب برابر سرابر سمجھ لیا جائے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ گم شدہ مرہون چیز کی قیمت اصل سے کم ہے تو مرہون کی قیمت محسوب کرنے کے بعد بقیہ روپے کا مطالبہ مرتہن راہن سے کرسکتا ہے، تیسری صورت یہ ہے کہ مرہون کی قیمت اصل روپے سے زیادہ ہو، تو پھر

---

[1] یشترط ان یکون المرہون صالحاً للبیع ای یکون موجوداً مالاً متقوماً مقدور التسلیم فی وقت الرہن۔ (المجلہ ص ۱۰۹)

[2] علی المرتہن ان یحفظ الرہن بنفسہ او بمن ہو امینہ کعیالہ وخادمہ۔ (المجلہ ص ۱۱۰)

قرض کی رقم محسوب کرلی جائے گی، اور بقیہ رقم کا نقصان راہن کو برداشت کرنا پڑے گا، کیونکہ مرہون چیز کے بقدر جو نقصان ہوا ہے، اس کا ذمہ دار تو مرتہن تھا، مگر جو زیادہ رقم بچی، وہ اس کے پاس امانت بے ضمانت تھی، اور امین سے امانت بے ضمانت کا تاوان نہیں لیا جاسکتا، مثلاً ایک شخص نے ایک ہزار روپے قرض لئے اور ایک زیور بطورِ رہن مرتہن کے پاس رکھ دیا، اور وہ چوری ہوگیا، تو اگر یہ زیور ایک ہی ہزار روپے کی قیمت کا تھا، تو پھر دونوں کا حساب برابر ہوگیا، اب کوئی کسی سے مطالبہ نہیں کرسکتا، لیکن اگر یہ آٹھ سو روپے کا تھا، تو یہ سمجھا جائے گا کہ آٹھ سو روپے مرتہن نے پالئے، اب صرف دو سو روپے کا مطالبہ راہن سے کرسکتا ہے، اور اگر یہ زیور بارہ سو کے تھے، تو ایک ہزار روپے تو قرض میں محسوب سمجھے جائیں گے، اور دو سو روپے راہن کے ضائع ہوئے، اس کا وہ مرتہن سے مطالبہ نہیں کرسکتا، کیونکہ ایک ہزار روپے کا تو وہ ضمانت دار تھا، بقیہ دو سو بطور امانت اس کے پاس تھے، اور امانت اگر قصداً، یا غفلت سے ضائع نہ کی ہو تو پھر امین پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی [1]

راہن کی ذمہ داریاں اور حقوق

(۱) راہن کو چاہیئے کہ جو چیز رہن رکھنی ہو، اس کو مرتہن کے حوالہ کردے۔

(۲) جب تک وہ مرہونہ چیز مرتہن کے قبضہ میں نہیں دیتا ہے، اس وقت تک وہ معاہدۂ رہن فسخ کرسکتا ہے۔

(۳) مرہونہ چیز کو قبضہ میں دے دینے کے بعد بغیر مرتہن کی رضامندی کے راہن معاہدۂ رہن فسخ نہیں کرسکتا [2]

(۴) مکفول عنہ کفیل کو کوئی چیز اس کے اطمینان کے لئے بطورِ رہن دے سکتا ہے، اور خود کفیل رہن کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

---

[1] اذا اتلف الراهن الرهن او عابه يضمن وكذالك المرتهن اذا اتلفه وعابه يسقط من الدين مقدار قيمته ص۱۱۳۔

[2] ليس للراهن فسخ عقد الرهن بدون رضا المرتهن۔ (المجله ص۱۱۱)

(۵) اگر دو آدمیوں نے مشترک طور پر علیحدہ علیحدہ ایک آدمی کو قرض دیا ہے، تو وہ دونوں مشترک طور پر اور علیحدہ علیحدہ ایک ہی چیز کو دونوں قرضوں کے بدلے رہن رکھ سکتے ہیں، اسی طرح مرتہن دو مقروضوں سے ایک ہی مشترک چیز رہن میں لے سکتا ہے[1]

(۶) راہن کو مرہونہ چیز کے تبدیل کرنے کا اختیار رہے، یعنی اگر اس نے کوئی چیز رہن میں رکھی، اس کے بعد وہ چیز واپس لے لی، اور اس کے بدلے دوسری چیز مرتہن کی رضامندی سے اس کے حوالہ کر دی، تو یہ جائز ہے[2]

(۷) مدّت رہن میں مرہونہ چیز میں جو کچھ اضافہ ہوگا، یا منافعہ ہوگا، اصل کے ساتھ وہ منافعہ اور اضافہ بھی راہن ہوگا، مثلاً باغ میں پھل آئے، کھیت میں پیداوار ہوئی، جانور نے بچّہ دیا، مکان سے کرایہ ملا، زمین میں درخت پیدا ہوگئے، تو یہ سب چیزیں راہن کی ہوں گی، مگر یہ تمام منافعہ مرہون چیز کے ساتھ مرتہن کے پاس رہن رہے گا، جو چیزیں ان میں جلد خراب ہوجانے والی ہوں، مثلاً پھل اس کو مرتہن فروخت کرکے ان کی قیمت اپنے پاس رکھے گا، اور جو چیزیں خراب ہونے والی نہیں ہیں، وہ اسی طرح محفوظ رکھے گا، جب مرہونہ چیز واپس ہوگی، تو اس کے ساتھ یہ سب چیزیں بھی واپس ہوں گی[3]

(۸) مرہونہ چیز کا نفع چونکہ راہن کا ہوگا، اس لئے اس کے بقا اور اس کی منفعت پر جو کچھ خرچ ہوگا، وہ راہن کے ذمّہ ہوگا، مثلاً اگر جانور رہن رکھا ہے، تو اس کے چارہ کا خرچ، اس کی چرواہی کی مزدوری یہ سب راہن کو دینا ہوگا، اسی طرح اگر کھیت ہے تو اس کی بوائی جتائی سینچائی کا خرچ راہن کو دینا ہوگا، اور پیداوار کا منافعہ مرتہن کے پاس رہے گا، جب وہ روپیہ ادا کرکے مرہونہ چیز چھڑائے گا، تو یہ منافعہ بھی اس کو ملے گا، اسی طرح باغ اور مکان کے منافعہ کو بھی سمجھنا چاہیئے۔

---

[1] یجوز ان یاخذ الدائنان من المدیون رھناً (المحلہ ص۱۱۱)۔

[2] یجوز تبدیل الرھن برھن آخر (ایضاً ص۱۱۱)۔

[3] الزائد الذی یتولد من المرھون یکون مرھوناً مع الاصل۔

(۹) راہن مرتہن کی رضامندی کے بغیر مرہونہ چیز بیچ نہیں سکتا، اگر بیچ دے گا، تو وہ بیع مرتہن کی رضامندی پر موقوف رہے گی، البتہ اس کی حفاظت اور نگرانی کا خرچ مرتہن برداشت کرے گا[۱]

(۱۰) راہن اگر مرجائے تو رہن کا معاملہ فسخ سمجھا جائے گا، اس کے ورثہ اگر بالغ ہیں، تو ان پر ضروری ہے کہ وہ اس کے ترکہ سے قرض ادا کر کے مرہونہ چیز واپس لے لیں، یا مرہونہ چیز کے بیچنے کی اجازت دے دیں، اور اگر ورثہ نابالغ ہیں، یا بہت دور دراز مقام پر ہیں، تو جو شخص اس کے ترکہ کا ذمہ دار ہو، اس کو چاہیئے کہ وہ مرتہن کو مرہونہ چیز کے بیچنے اور اس سے اپنا قرض وصول کر لینے کی اجازت دے دے، یا اس کی اجازت سے وہ خود فروخت کر کے قرض ادا کر دے، اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہو تو قانونی چارہ جوئی کے ذریعہ مرتہن مرہونہ چیز کو بیچ کر اپنا قرض وصول کرنے کی اجازت حاصل کر سکتا ہے، مگر ولی، وارث یا عدالت کی اجازت کے بغیر اس کو بیچنے کا حق نہیں ہے[۲]

مرتہن کی ذمہ داریاں اور اس کے حقوق

(۱) مرتہن کو یہ اختیار ہے کہ وہ تنہا اپنی مرضی سے رہن کے معاملہ کو فسخ کر دے۔

۲۔ مرتہن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مرہونہ چیز کو ایک امانت سمجھ کر خود اس کی حفاظت کرے، اور اس کے گھر کے تمام افراد اس پر نگاہ رکھیں۔

۳۔ اس کی دیکھ بھال میں اگر کچھ خرچ ہوگا تو اگر اس کے خرچ کا تعلق اس چیز کی حفاظت سے ہے، تو اس کی ذمہ داری مرتہن پر ہوگی، مثلاً سو من غلہ ہے، تو اس کے لئے مکان کی ضرورت ہوگی، تو مکان کی ذمہ داری مرتہن پر ہے، اسی طرح زیور یا سونا چاندی، یا اور کوئی قیمتی چیز ہے جس کی

---

[۱] المصارف اللتی تلزم لمحافظة الرهن کاجرة المحل والناظر علی المرتهن الرهن ان کان حیوانا فعلفه واجرة راعیه علی الراهن وان کان عقاراً مصارفه اللتی لاصلاح بقائه ومنافعه عائدالی الراهن ص۱۱۱۔

[۲] المحلہ ۵۱۱، ص۱۱۶۔

حفاظت ونگرانی کے لئے کچھ خرچ کرنا پڑے گا، تو اس کو بھی مرتہن برداشت کرے گا، اسی طرح رہن کے جانور کے علاج معالجہ میں جو کچھ خرچ ہوگا، اس کو بھی مرتہن ہی کو برداشت کرنا پڑے گا، لیکن اگر اس خرچ کا تعلق اس کی بقا اور منافعہ سے ہو تو وہ راہن کے ذمہ ہوگا، کیونکہ جو کچھ اس سے فائدہ ہوگا، وہ راہن ہی لے گا، اس لئے اس کو اس کا خرچ بھی برداشت کرنا پڑے گا، مثلاً رہن کے جانور کے چارہ میں، کھیت کی سینچائی میں، پھل کی نگرانی میں جو کچھ خرچ ہوگا، وہ سب راہن کے ذمہ ہوگا، یعنی مرتہن یا تو اپنے پاس سے خرچ کرے اور اصل روپے کے ساتھ یہ بھی وصول کرلے، یا راہن سے وہ لیتا جائے [۱]

۴ ۔ مرتہن مرہونہ چیز سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، یعنی اگر مکان ہے تو اس میں رہ نہیں سکتا اس کا کرایہ نہیں لے سکتا، کھیت کی پیداوار نہیں کھا سکتا، جانور کا دودھ نہیں پی سکتا، اگر وہ جانور سواری باربرداری کے لئے ہے، تو اس پر سوار نہیں ہوسکتا، اور نہ لاد سکتا ہے، اگر نقد روپیہ یا سونا چاندی ہے، تو اس سے تجارت یا کاروبار نہیں کرسکتا، البتہ کسی شدید ضرورت پر مرتہن کسی چیز کے استعمال کی اجازت راہن سے مانگے، اور وہ بخوشی دے دے تو اس کو استعمال کرنے کی اجازت ہے، مگر اس کو نہ تو اپنا حق سمجھے، اور نہ اس طرح استعمال کرے کہ وہ خراب ہوجائے، مثلاً کسی نے گھڑی رہن رکھ دی، مرتہن نے راہن سے یہ اجازت مانگی کہ مجھے چند دن لگانے کی اجازت دیجئے، اگر اس نے اجازت دے دی تو وہ استعمال کرسکتا ہے، لیکن اگر یہ شرط رہن لیتے وقت لگادی کہ ہم اس گھڑی کو لگائیں گے تو یہ شرط مکروہ ہوگی، اور اگر اس نے بغیر اجازت استعمال کی تو حرام ہے، اگر نقصان ہوگا، تو اس کو تاوان دینا پڑے گا۔

۵ ۔ اگر راہن اس کی بقا یا منفعت کے حصول کا خرچ نہیں دیتا ہے، تو مرتہن اس پر جو کچھ خرچ کرے گا، وہ نفع سے محسوب کرلے گا۔

مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھانا

(۶) موجودہ دور میں راہن یعنی رہن رکھنے والے، مرتہن یعنی رہن لینے والے، دونوں کے ذہن میں یہ بات ہوتی

---

[۱] اُوپر اس کا حاشیہ گزر چکا ہے۔

ہے کہ اس کا فائدہ مرتہن اٹھاتے گا، یہ سراسر سود ہے، کیونکہ سود نام ہے کسی چیز سے اس کا عوض دیتے بغیر فائدہ اٹھانے کا، اور یہاں مرتہن قرض میں محسوب کئے بغیر مرہون چیز سے فائدہ اٹھاتا ہے، مثلاً رہن کے کھیت کا غلّہ یا رہن کے باغ کا پھل جو مرتہن کھاتا ہے، تو اس کے بدلہ میں راہن کو تو کچھ ملتا نہیں، بلکہ الٹے اس کا نقصان ہوتا ہے، جس طرح ایک سود خور بسا اوقات ایک سو روپے کا سود ایک ہزار تک وصول کرلیتا ہے، اسی طرح یہ مرتہن ایک سو قرض دے کر بسا اوقات مرہون چیز سے کئی کئی سو کا فائدہ اٹھالیتا ہے، ظاہر ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، رہن میں استعمال کی جو اجازت راہن دیتا ہے، وہ مجبوری سے دیتا ہے، اگر اس کو اس سے بچنے کا موقع ہو تو وہ کبھی اجازت نہیں دے سکتا، اور مجبوری کی اجازت کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے، پھر اوپر ذکر آچکا ہے کہ قرض سے کوئی فائدہ اٹھانا سود ہے، حتّٰی کہ اگر مقروض کوئی ہدیہ دے تو وہ بھی لینا جائز نہیں، البتہ اگر پہلے سے ان میں ہدیہ دینے لینے کا معمول رہا ہو تو کوئی حرج نہیں، قرض دینا ایک اخلاقی فریضہ ہے، اس لئے اس سے مفاد پرستی کو نہ جوڑنا چاہیئے، اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ اور عام محدثین متفق ہیں کہ مرہونہ چیز سے مرتہن کو فائدہ نہ اٹھانا چاہیئے، علامہ ابن رشد لکھتے ہیں:

والجمھور علی ان لیس للمرتھن ان ینتفع بشیٔ من الرھن[1]۔	جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مرہونہ چیز سے مرتہن کو فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

البتہ امام احمد اور اسحاق بن راہویہ جانور کے بارے میں اس حدیث کی روشنی میں الرّھن مرکوبٌ ومحلوبٌ یہ کہتے ہیں کہ اپنے چارہ اور اخراجات کے بقدر وہ جانور کا دودھ استعمال کرسکتا ہے، اور ضرورت کے وقت سواری کرسکتا ہے[2]، مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کسی صورت میں نفع اٹھانے کے قائل نہیں ہیں، شرح وقایہ میں ہے:

لا الانتفاع بہ ما ستخدام ولا سکنی ولا لبس[3]۔	خدمت لے کر یا مکان میں رہ کر یا کپڑے پہن کر کسی صورت میں مرہون کو فائدہ اٹھانا جائز نہیں،

---

[1] بدایۃ المجتہد، ج ۲ ص ۲۷۴۔ [2] ایضاً۔ [3] ج ۴ ص ۲۷۔

مگر المجلہ کے مرتبین ترکی علماء نے اس میں بیچ کی رائے اختیار کی ہے، نہ تو مطلق استعمال کی اجازت دی ہے، اور نہ بالکل منع کیا ہے، بلکہ راہن کی اجازت پر موقوف رکھا ہے۔

للمرتهن استعمال الرهن واخذ ثمرة وبنه اذا اذنه الراهن واباح له ذالك ولا يسقط من الدين شئ فى مقابل هولاء[1]

اگر راہن اجازت دے دے تو مرتہن رہن کی چیز کو استعمال کر سکتا ہے، جیسے درخت کا پھل کھا سکتا ہے، اور جانور کا دودھ پی سکتا ہے، اور یہ فائدہ قرض میں وضع نہیں ہوگا، بلکہ مباح ہوگا۔

اسی رائے کو الفقہ علی المذاہب الاربعہ کے مصنف نے عام فقہائے احناف کی طرف منسوب کیا ہے، اور صاحبِ ہدایہ کی بھی یہی رائے معلوم ہوتی ہے، یعنی "الا باذن المالك" کی قید انھوں نے بھی لگائی ہے، مگر مولانا عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس جزیہ پر شرح وقایہ کے حاشیہ میں جو لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہائے احناف کسی صورت میں مرہون سے فائدہ اٹھانے کو جائز نہیں سمجھتے، باوجودیکہ وقایہ کے مصنف نے بھی عاریۃً استعمال کی اجازت دی ہے، مولانا کے حاشیہ کی عبارت یہ ہے:

المقام يقتضى بسطا لان الناس قد اكبوا اليه والذى لا يخاف الله ورسوله ولا يؤمن بالله واليوم الاخر يحسبه حلالا والله انه الربوا حرام خبيث واعلم ان منافع الرهن حرام فى كل حال كما قاله العلامه ابن العابدين الشامى معزيا الى المنح انه لا يحل

یہ موقع بہت تفصیل کا ہے، اس لئے کہ لوگ اس پر گرے پڑ رہے ہیں اور جسے اللہ اور اس کے رسول کا خوف نہیں ہے اور اسے آخرت پر پورا یقین نہیں ہے، وہ اسے حلال سمجھتا ہے، خدا کی قسم یہ ہر حال میں حرام اور خبیث ہے، جیسا کہ علامہ ابن عابدین منح کی طرف نسبت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ مرہون سے کسی طرح کا کسی صورت میں

---

[1] آخری ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ اگر فائدہ قرض سے وضع ہوتا رہے تو اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ المجلہ ۱۱

له ان ينتفع بشئ بوجه من الوجوه	فائدہ اٹھایا جائے، خواہ راہن نے اجازت
وان اذن له الراهن لانه	کیوں نہ دے دی ہو، اس لئے کہ اس نے
اذن له فی الربا فان الرهن	اجازت سود کے استعمال کی دی ہے اور
وثيقة والدين دين فای شئ	اس کے لئے جائز نہیں، رہن ایک معاہدہ
بينهما يجوز المنافع عليه وما	ہے، اور قرض اپنی جگہ قرض ہے، تو ان
بنوا عليه الحيلة فليس بشئ ۔	دونوں کے درمیان کونسی چیز ہے جو اس
(حاشیہ ج ۴ ص۲۶)	سے فائدہ اٹھانے کو جائز کرسکتی ہے، اور

جن لوگوں نے اس سلسلہ میں بہت سے حیلہ بناتے ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

جو چیز غیر منقولہ ہیں، مثلاً زمین، مکان وغیرہ، یا وہ منقولہ ہیں مگر ان کے استعمال سے ان کی حیثیت کم ہوتی ہے، مثلاً زیور، گھڑی، سائیکل، موٹر وغیرہ، تو ان سے انتفاع تو کسی حال میں جائز نہ ہونا چاہیئے، لیکن جانور وغیرہ میں جیسا کہ امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما حدیث کی روشنی میں کہتے ہیں، ان سے اپنے خرچ کے بقدر راہن کی اجازت سے وہ استعمال کرسکتا ہے، اس لئے کہ جانوروں کے چارہ کی ذمہ داری موجودہ زمانہ میں ایک دقّت طلب بات ہے، اس لئے وہ چارہ اور اخراجات کے بقدر استعمال کرے تو یہ ربوٰ کی حد میں داخل نہیں ہوگا، بشرطیکہ اس کے استعمال سے اس میں عیب پیدا نہ ہو، اس میں استعمال کی حد مقرر کی جاسکتی ہے، جیسا کہ امام مالکؒ فرماتے ہیں"، اسی طرح مکان کو اگر بالکل مقفل کردیا جائے، تو اس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے، اس لئے اس کی صفائی اور مرمّت کے بقدر رہنے کی اجازت دینے کی گنجائش ہونی چاہیئے۔

" یہ بات موجودہ دور کے لحاظ سے کہی گئی ہے، ورنہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، یہ ایک انسانی ہمدردی کی اخلاقی ذمہ داری ہے، اس لئے اس کو منفعت سے جوڑنا اس کی روح کے منافی ہے، جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے، مگر چونکہ حدیث میں بعض چیزوں کا استثناء موجود ہے اس لئے یہ بات عرض کی گئی ہے۔

اس کی بہترین صورت تو یہ ہے کہ مرہونہ چیزیں خواہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، اگر استعمال سے ان میں عیب پیدا نہیں ہوتا ہے، تو استعمال اور منفعت کے لحاظ سے مرتہن کو راہن کے قرض میں

محسوب کرتے رہنا چاہیئے، اور جب قرض کی رقم پوری ہو جائے، تو اسے راہن کے حوالہ کردینا چاہیئے۔

۷۔ رہن کے زمانہ میں مرہونہ شے سے جو فائدہ ہوگا، یا اس میں زیادتی ہوگی وہ سب ملکیت تو راہن کی ہوگی، مگر اس پر قبضہ مرتہن ہی کا رہے گا، یعنی وہ بھی مرہون سمجھی جائے گی، اور مرہون چیز کی واپسی کے وقت یہ چیز بھی واپس کر دی جائے گی۔

۸۔ اگر راہن کچھ روپے ادا کردے اور کچھ باقی رہیں، تو جب تک پورا روپیہ وصول نہ ہو جائے اس وقت تک مرتہن کو اختیار ہے کہ وہ مرہونہ چیز کو واپس نہ دے[۱]

۹۔ اگر مرہونہ چیز کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو راہن عدالتی چارہ جوئی کے بعد اسے بیچ کر اس کی قیمت[۲] اپنے پاس رہن رکھ سکتا ہے۔

۱۰۔ مرہونہ چیز میں اگر کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے، تو اس کی ذمہ داری مرتہن پر ہوگی، یعنی قرض ادا کرتے وقت راہن کو اختیار ہوگا کہ وہ نقصان کے بقدر روپیہ کاٹ لے۔

۱۱۔ اگر مرہونہ چیز کو راہن مرتہن کی اجازت سے یا مرتہن راہن کی اجازت سے کسی دوسرے کے یہاں رہن رکھنا چاہے تو وہ کر سکتا ہے، اس صورت میں پہلا رہن باطل ہو جائے گا۔

۱۲۔ مرتہن مرہونہ چیز کو راہن کی مرضی و اجازت کے بغیر فروخت نہیں کر سکتا، اگر بغیر اجازت بیچ دے گا، تو دو باتوں میں سے ایک بات کرنی ہوگی، یا تو وہ بیع منسوخ کر دے، یا پھر راہن سے اس کی اجازت حاصل کر کے اس کو نافذ کرے[۳]، اسی طرح راہن بھی مرتہن کی مرضی کے بغیر مرہونہ چیز کو فروخت نہیں کر سکتا۔

۱۳۔ اگر رہن کی مدت ختم ہو جائے، اور راہن رقم ادا کر کے اپنی چیز نہ لے جائے، تو مرتہن کو اسے بیچ کر اپنی قیمت وصول کرنے کا حق ہوگا، اور جہاں پر اسلامی حکومت ہوگی، وہاں مرتہن جج (قاضی) کے سامنے معاملہ پیش کر کے بیچنے کی اجازت لے گا، پھر فروخت کرے گا[۴]

---

[۱] اوپر حاشیہ آچکا ہے۔

[۲] المجلہ ص۱۱۳، [۳] ص۱۱۶، [۴] ایضاً ص۱۱۴۔ [۵] اذا احل وقت الاداء وامتنع الراھن عن ادائہ فالحاکم یامر ببیع الرھن۔ (المجلہ ص۱۱۶)

۱۴۔ اگر راہن موجود نہ ہو تو مرتہن بغیر حکومت کی اجازت کے اس کو بیچ نہیں سکتا۔

۱۵۔ راہن یا مرتہن کے مرجانے سے رہن باطل نہ ہوگا، بلکہ ان کے ورثہ مرہون چیز کے راہن و مرتہن ہوں گے۔

چند اور مسائل (۱) مشترک چیز کی جب تک تقسیم نہ ہو جائے، کوئی ایک حصہ دار اپنا حصہ رہن نہیں کر سکتا۔

۲۔ باغ کا پھل جو درخت پر موجود ہے، یا کھیتی جو کھیت میں لگی ہے، ان کا رہن کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح محض درخت کا رہن رکھنا بھی جائز نہیں ہے، اگر درخت رہن کرنا ہے تو اس کی زمین بھی رہن ہونا چاہیئے۔

۳۔ جس طرح جو چیزیں مبیع میں داخل سمجھی جاتی ہیں وہ رہن میں داخل سمجھی جائیں گی، مثلاً درخت کو بغیر پھل کے، زمین کو بغیر کھیتی کے رہن رکھنا جائز نہیں ہے، یہ چیزیں رہن میں خود بخود داخل ہوں گی، اس کا علیحدہ کرنا صحیح نہیں ہے[۱]

امانت، عاریت، مضاربت اور شرکت کی چیزوں کو رہن رکھنا جائز نہیں ہے۔

۴۔ اسی طرح (درک) یعنی استحقاق کے خوف سے رہن لینا جائز نہیں، مثلاً کسی نے کوئی چیز فروخت کی، اور مشتری نے اس کی قیمت دے کر اسے خرید لیا، مگر مشتری کو یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ بائع نے جو چیز بیچی ہے اس کا کوئی مستحق نہ پیدا ہو جائے، اس وہم کی بنا پر وہ بائع سے کہتا ہے کہ تم کوئی چیز رہن رکھ دو تاکہ ضرورت کے وقت ہم اس سے قیمت وصول کر سکیں، اس کو درک کہتے ہیں، یہ رہن ناجائز ہے، البتہ درک کی بنا پر کفالت ہو سکتی ہے، کفالت کے بیان میں اس کا ذکر آچکا ہے[۲]

امانت اور ودیعت

دنیا میں ہر انسان کو کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور پیش آجاتا ہے کہ اس کو خود اپنی چیز یا اپنے

---

[۱] کما ان المشتملات الداخلة فی البیع بلا ذکر تدخل فی الرهن کذالک لو رهنت عرصة الدار تدخل فی الرهن اشجارها و اثمارها ص۱۱۱ ۔ [۲] شرح وقایہ ج ۴ ص۷۶ ۔

روپے پیسے یا سامان وغیرہ کی حفاظت کے لئے دوسروں سے مدد لینی پڑتی ہے، اس موقع پر ہر انسان کا اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ جب اس سے مدد مانگی جائے، تو وہ اس سے دریغ نہ کرے، بلکہ خندہ پیشانی سے اس کے روپے پیسے یا سامان کی حفاظت کی تکلیف کو گوارا کرلے، کیوں کہ یہی ضرورت کبھی اس کو بھی پیش آسکتی ہے، اس کو شریعت میں امانت وودیعت کہتے ہیں۔

امانت وودیعت میں فرق

امانت اور ودیعت میں تھوڑا اصطلاحی فرق ہے، ودیعت میں قصد وارادہ کا پایا جانا ضروری ہے، اور امانت قصد وارادہ کے ساتھ بھی ہوتی ہے، اور بغیر قصد وارادہ کے بھی، مثلاً آپ راستہ میں کوئی چیز پڑی پائیں تو یہ چیز آپ کے ہاتھ میں امانت ہوگی، اس کو ودیعت نہیں کہیں گے، لیکن اگر کوئی چیز دوسرا آپ کے پاس حفاظت کی غرض سے رکھ جاتا تو اس کو ودیعت بھی کہہ سکتے ہیں، اور امانت بھی، غرض یہ کہ ہر ودیعت کو امانت کہہ سکتے ہیں، مگر ہر امانت کو ودیعت نہیں کہہ سکتے[1] امانت کے مفہوم میں چونکہ ودیعت کا مفہوم بھی شامل ہے، اس لئے قرآن میں امانت وودیعت دونوں کے لئے امانت ہی کا جامع لفظ استعمال ہوا ہے، مگر حدیث میں دونوں لفظوں کا استعمال ایک دوسرے کے مفہوم میں ہوا ہے، کہیں امانت کو ودیعت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اور کہیں الگ الگ مفہوم میں، اسی بنا پر فقہائے بھی دونوں لفظوں کو عام طور پر علیحدہ علیحدہ مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے، اور ایک مفہوم میں بھی۔

امانت کا مفہوم قرآن وحدیث میں

جیساکہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے کی کوئی چیز اگر بغیر قصد وارادہ بھی ہاتھ لگ جائے تو وہ امانت ہوگی، اگر آپ نے کوئی چیز یا رقم پڑی پائی، یا بطور رہن رکھی، یا مانگ کر لاتے، یا آپ نے کوئی چیز کرایہ پر لی، یا اس نے خود آپ کی نگرانی وحفاظت میں دی، یا آپ کو کسی چیز کا ذمہ دار یا ولی یا وکیل بنا دیا، غرض ان تمام صورتوں میں آپ اس چیز یا رقم کے امین ہی کہے

---

[1] فحیث کان ذالک بدون عقد لایکون ودیعة بل امانة فقط۔ المجلہ، ص ۱۱۸، الودیعة خاصة والامانة عامة (حاشیہ ہدایہ کتاب الودیعة)

جائیں گے، یعنی آپ کو اس کی اسی طرح حفاظت کرنی چاہیئے، جس طرح اپنی ذاتی چیز کی کرتے ہیں، یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اپنی چیز کی حفاظت تو آپ بکس میں یا الماری یا کمرہ میں بند کر کے کریں، اور دوسرے کی چیز کو کھلی جگہ رکھ دیں، اگر آپ ایسا کریں گے، تو یہ امانت میں خیانت ہوگی، امانت کے معنی ہیں مامون و محفوظ ہونا، یعنی وہ چیز امین کے ہاتھ میں پہونچ کر محفوظ و مامون ہو جاتی ہے، اگر وہ محفوظ نہ ہوتی تو یہ خیانت ہوگی، مثلاً ایک یتیم کی جائداد یا ایک لاوارث کے مال کا آپ کو ذمہ دار بنایا گیا تو آپ کی ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ آپ ٹھیک ٹھیک اس کی دیکھ بھال کریں[1] اور جس کا جو حق ہو اس تک پہونچا دیں، اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ خائن کہے جائیں گے، قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُوَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (نساء)	اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ امانتوں اور حقوق کو ان کے مالکوں تک پہنچا دو۔

مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ:

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمَانَاتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رَاعُوْنَ (مومنون)	جو لوگ اپنے ذمہ لی ہوئی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس و خیال رکھتے ہیں۔

اس کے برخلاف خیانت کرنے والوں کی بڑی مذمّت کی گئی، فرمایا گیا کہ:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ۔ (الحج)	خدا تعالیٰ خیانت کرنے والے ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔

یہودیوں کے بارے میں فرمایا کہ ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ اگر ایک خزانہ ان کے پاس امانت رکھدیا جائے تو وہ واپس کر دیں گے، اور بعض ایسے ہیں کہ ایک دینار بھی ان کے پاس رکھ دو تو جب تک سر پر سوار نہ ہو وہ واپس نہ کریں گے، (آل عمران آیت ۷۵)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس میں امانت داری نہیں ہے، اس کا دل ایمان سے خالی ہے، لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَۃَ لَہٗ قرآن نے امانت داری مومن کی خصوصیت بتائی ہے،

---

[1] للمستودع ان یحفظ الودیعۃ فی محل الذی تحفظ فیہ مالہ۔ (المجلہ ص ۱۲۲)

اس کی تفسیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیانت کو منافق کی نشانی بتائی ہے، فرمایا کہ منافق کی پہچان تین باتوں سے ہوتی ہے، ان میں ایک بات یہ ہے کہ:

وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔ (بخاری) — جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے

اَدِّ الْاَمَانَةَ اِلٰی مَنِ ائْتَمَنَكَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ۔ (مشکوٰۃ) — (آپ نے فرمایا، جو تمہارے پاس امانت رکھتے ہیں اس کی امانت ادا کردو، اور اگر تمہاری خیانت کوئی کر بھی لے تو تم اس کی خیانت نہ کرنے لگو۔

آخری جملہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اگر خائن آدمی بھی تمہارے پاس کوئی امانت رکھے تو تم اس کے ساتھ بھی خیانت نہ کرو، کیونکہ اس نے اپنی ذمہ داری ادا نہیں کی تو یہ چیز خیانت جیسی غیر ذمّہ دارانہ حرکت کے لئے دلیل نہیں بن سکتی۔

امانت کا حکم

۱۔ امانت ایک اخلاقی فریضہ اور حسن سلوک کا نام ہے، اسی لئے قانوناً کسی کو امانت رکھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، اور اگر کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے وہ امانت ضائع ہو جائے تو امین پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی[1] البتہ اگر اس نے قصداً اس کو ضائع کرنے کی کوشش کی ہے، یا اس نے اس کی حفاظت میں غفلت برتی ہے، تو اس صورت میں اس کو اس کا تاوان دینا پڑے گا، مثلاً کسی نے راستہ میں کوئی پڑی چیز پائی تو اگر وہ جانتا تھا کہ یہ فلاں کی ہے، اور اس نے اس کو واپس کرنے کے خیال سے اٹھا لیا تو یہ چیز اس کے ہاتھ میں امانت ہوگی، اب اگر وہ اتفاقی طور پر ضائع ہو گئی تو اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اگر وہ اس چیز کے مالک سے واقف نہیں ہے تو اس کا حکم لُقطہ یعنی گری پڑی چیز کا ہے۔

لُقطہ کا حکم

۲۔ لقطہ یعنی اگر کسی نے کوئی پڑی ہوئی چیز پائی تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ اس چیز کو امانتہً اپنے پاس رکھے، اور برابر ایک سال تک یہ اعلان کرتا رہے، کہ فلاں چیز میں نے فلاں جگہ پائی ہے، جس کی ہو وہ لے جائے، جب اس کا مالک مل جائے تو فوراً

---

[1] الامانته لا تکون مضمونة اذا هلکت او ضاعت بلا صنع امین او تقصیر۔ (المجلہ ص ۱۱۹)

اس کے حوالے کر دے، اگر اس نے اسے ضائع کر دیا تو تاوان دینا پڑے گا، اگر وہ کہتا ہے کہ میں نے قصداً ضائع نہیں کیا، تو اس سے قسم لی جائے گی، اگر وہ قسم کھالے تو پھر اس پر تاوان نہیں ہے اگر اس نے اپنے پاس رکھ لیا تو وہ غاصب شمار ہوگا، اگر وہ ضائع ہو جائے تو وہ ہر حال میں ضامن ہوگا[1]

اگر ایک سال تک کوئی مالک نہ ملے تو بیت المال میں جمع کر دے، اگر اسلامی بیت المال نہ ہو تو پھر اس کو صدقہ کر دے، اپنے استعمال میں نہ لائے، البتہ اگر وہ خود مفلس ہے، تو استعمال کر سکتا ہے۔

امانت کا وسیع مفہوم

امانت کا مفہوم اتنا ہی نہیں ہے کہ آپ کے پاس کوئی آدمی کوئی چیز یا کوئی رقم بطورِ امانت رکھ دے، اور آپ اسے حفاظت سے واپس کر دیں، اس کا مفہوم بہت وسیع ہے، قرآن پاک نے تکلیف شرعی کی ساری ذمہ داری کو امانت قرار دیا ہے، یہی امانت ہے جس کو زمین و آسمان نہ اٹھا سکے اور انسان نے اٹھالیا:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔

بیشک ہم نے تکلیف شرعی کی ذمہ داری آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تو انھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور ڈر گئے مگر انسان نے اس کی ذمہ داری کو اٹھالیا۔

اوپر جو آیتِ قرآنی نقل کی گئی ہے (اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا) اس میں امانات کا لفظ جمع استعمال ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امانت کی بہت سی قسمیں ہیں، یہاں اس کی تھوڑی سی تفصیل کی جاتی ہے، اس آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں تمام مفسرین نے عثمان بن طلحہؓ جو کعبہ کے کلید بردار تھے کے واقعہ کو نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے ایک بار ہجرت سے پہلے ان سے کعبہ کی کنجی مانگی تو انھوں نے دینے سے انکار کیا، اس پر آپ نے فرمایا کہ

---

[1] اذا وجد شخص فی الطریق او محل آخر شیئاً فاخذہ علی سبیل التملک یکون حکمہ حکم الغاصب وعلی هذا اذا هلك ذالك المال او ضاع ولو بلا صنع او تقصیر منه یصیر ضامناً۔ (المجلہ ص۱۱۹)

ایک دن یہ کنجی میرے ہاتھ میں آئے گی، چنانچہ فتح مکہ کے دن آپ نے عثمان بن طلحہؓ کو بلایا اور کنجی طلب کی تو انھوں نے کنجی آپ کے حوالہ کر دی، آپ اندر تشریف لے گئے اور تصویروں اور بتوں کو توڑ کر باہر تشریف لائے۔ مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی، اور پھر کنجی عثمان بن طلحہؓ کے حوالہ کر دی [1] پھر یہی آیت تلاوت فرمائی۔

ظاہر ہے کہ یہ کنجی کوئی مال نہیں تھا، بلکہ یہ ایک منصب اور عہدے کی علامت تھی مگر آپ نے اسے امانت کے لفظ سے تعبیر فرمایا، حدیث میں آتا ہے "المجالس بالامانة" مطلب یہ ہے کہ مجلس میں اگر کوئی راز کی بات کہی جائے تو اس کی حفاظت کرنی چاہیئے، اس کو پھیلانا نہیں چاہیئے، اسی طرح حدیث میں آتا ہے "المتشار موتمن" یعنی جس سے مشورہ کیا جائے تو اس کو صحیح مشورہ دینا چاہیئے، اگر اس نے غلط مشورہ دیا تو یہ خیانت ہے، جیساکہ دوسری حدیث ہے "من اشار بغیر رشد فقد خان" جس نے غلط مشورہ دیا اس نے خیانت کی، ذیل کی حدیثِ نبوی بھی اس عمومی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے:

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته فالامام الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیته ورجل راع علی اھل بیته والمرأة راعیة علی بیت زوجھا وولدہ وعبد الرجل راع علی مال سیدہ وھو مسئول رعیته الا کلکم راع وکلکم مسئول رعیته [2]	خبردار کہ تم میں سے ہر شخص نگراں اور ذمہ دار ہے، اور وہ اپنی ذمہ داری کے بارے میں پوچھا جائے گا، امام (حکومت) لوگوں کا نگراں اور ذمہ دار ہے وہ اپنے ماتحتوں اور رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا، ایک مرد اپنے گھر والوں کا نگراں اور ذمہ دار ہے، اور عورت شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگراں اور ذمہ دار ہے اور خادم

اپنے مالک کے مال اور چیزوں کا ذمہ دار ہے اور وہ اس بارے میں پوچھا جائے گا، ہوشیار کہ ہر شخص اپنے اپنے دائرہ میں ذمہ دار ہے اور وہ اس کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر تفسیر آیت مذکور۔ [2] بخاری ومسلم، مشکوٰۃ باب الامارہ ص ۳۲۱۔

قرآن کی آیت اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا کی تفسیر میں حافظ ابن کثیرؒ نے یہ حدیث نقل کی ہے:

اَدِّ الامانۃ الی من ائتمنک ولا تخن من خانک۔	امانت ادا کرو اس کی طرف جس نے تمہارے پاس امانت رکھی ہے اور اگر کوئی خیانت

کرے تو تم خیانت نہ کرو یعنی اگر دوسرا خیانت کرے جب بھی تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔

پھر لکھتے ہیں:

وھو یعم جمیع الامانات الواجبۃ علی الانسان من حقوق اللہ عزوجل علی عبادہ من الصلوٰۃ والزکاۃ والصیام والکفاوات والنذور وغیر ذالک مما ھو موتمن علیہ لا یطلع علیہ العباد ومن حقوق العباد بعضھم علی بعض۔ (تفسیر ابن کثیر)	یہ عام ہے تمام امانات واجبہ کے لئے، جو انسان پر ضروری ہیں، حقوق اللہ میں جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، کفارے اور نذر وغیرہ، اور وہ تمام چیزیں جس کا وہ امین ہے، اور اس سے عام لوگ واقف نہیں ہیں، اور حقوق العباد میں وہ تمام حقوق امانت ہیں جس کی ادائیگی ایک دوسرے پر ضروری ہے۔

پھر متعدد صحابہ و تابعین کی رائیں نقل کی ہیں، حضرت ابو ہریرہؓ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت کی اور اپنے دونوں انگوٹھے کانوں میں اور دونوں شہادت کی انگلیاں آنکھ پر رکھ کر فرمایا، میں نے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت "اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا" پڑھتے اور اپنی انگلیوں کو کان اور آنکھ پر رکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

مقصد یہ تھا کہ کان اور آنکھ اور سارے اعضا اللہ کی امانت ہیں، ابو العالیہ کہتے ہیں:

الامانۃ ما امروا بہ وما نھوا عنہ۔	جس کے کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اور جس چیز سے روکا گیا ہے وہ سب مومن کے لئے امانت ہے۔

ان تمام تفصیل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی شریعت میں امانت کا مفہوم کتنا

وسیع ہے۔

اگر کوئی حکومت کا ذمّہ دار اپنے آرام وآسائش عوام کی ضروریات اور تکلیفوں کا خیال نہیں کرتا، تو وہ امانت میں خیانت کرتا ہے، اور اگر وہ اہل لوگوں کے بجائے رشوت، خوشامد اور سفارش کی بنا پر کسی نااہل کو کوئی عہدہ دیتا ہے، تو اس امانت میں خیانت کرتا ہے، بلکہ ایک حدیث میں ایسے شخص پر لعنت کی گئی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ:

اذا وسد الامر الیٰ غیر اہلہ	جب عہدے نااہلوں کے ہاتھوں میں جانے
فانتظر الساعۃ[۱]	لگیں تو بس قیامت ہی کا انتظار کرنا چاہیئے۔

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی نعمتیں انسان کو دی ہیں، خواہ وہ مادی اور جسمانی ہوں، یا غیر مادی ہوں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں، اس میں کوتاہی دنیا میں بھی قابل گرفت ہے، اور آخرت میں بھی وہ باز پُرس کا سبب بنیں گی۔

اگر کوئی کسی ادارے میں یا کسی دفتر میں یا کسی کام پر مقرّر ہے تو جتنی چیزیں اس کے چارج اور قبضہ میں ہیں، مثلاً فرنیچر، کاغذ، قلم، دوات یا چپراسی وغیرہ، وہ سب چیزیں اس کے ہاتھ میں امانت ہیں، ان کو اپنے ذاتی استعمال میں نہ لانا چاہیئے، یا جس وقت کی وہ تنخواہ پاتا ہے، اس وقت میں اپنا ذاتی کام نہ کرنا چاہیئے، اگر کرے گا تو خائن قرار پائے گا، اور اس سے تاوان بھی لیا جا سکتا ہے، اسی طرح جو وقت کام کے لئے مقرر ہے وہ بھی ایک امانت ہے، اس میں مفوضہ کام کرنے کے بجائے گپ لڑانا، تفریح کرنا یا وقت گذاری کرنا یہ سب وقت کی امانت میں خیانت ہے، اگر امانت کی اس ذمہ داری کو حکومت کے تمام ذمّہ دار، اس کے کارکن، کارخانے کے اور دوسرے اداروں کے ملازمین محسوس کرلیں، تو پھر کم وقت میں کام بھی زیادہ ہونے لگے، اور ہر حکومت ، ہر کارخانے اور ادارے کے ہزاروں لاکھوں روپے بچ بھی جایا کریں، مگر افسوس یہ ہے کہ موجودہ مادی نظاموں نے ان اخلاقی تصورات سے پیچھا چھڑا لیا ہے جو ان کے لئے مادّی حیثیت سے بھی مفید ہیں۔

---

[۱] بخاری کتاب العلم۔

وَدلیعت کے لفظی معنی ودیعت کا لفظ اضداد میں ہے، یعنی اس کے معنی کسی کو حفاظت کے لئے کوئی چیز یا مال دینے کے لئے بھی آتے ہیں، اور قبول کرنے کے بھی آتے ہیں۔

ودیعت کی تعریف اوپر ذکر آچکا ہے کہ امانت اور ودیعت دونوں لفظاً ہم معنی بھی ہیں، اور دونوں الگ مفہوم و حکم بھی رکھتے ہیں، ودیعت کی تعریف شریعت میں یہ کی گئی ہے:

اِحَالَۃُ الْمَالِکِ مُحَافَظَۃَ مَالِہِ الْاٰخَرَ[1]	اپنی کسی چیز یا مال کو حفاظت کی غرض سے دوسرے کے حوالے کرنا۔

مقصد یہ ہے کہ جو چیز ودیعت رکھی جائے، وہ ودیعت رکھنے والے کی ملک بھی ہو، اور اپنے قصد و ارادہ سے وہ کسی کے سپرد کرے، تب ودیعت کا رکھنا صحیح ہوگا۔

ودیعت ایک معاہدہ ہے ودیعت میں دوسرے معاملات کی طرح ایجاب و قبول ضروری ہے خواہ صراحۃً ہو، یا دلالۃً[2]

ودیعت کا حکم جس کے پاس امانت و ودیعت رکھی جا رہی ہے، اگر وہ اس کو منظور کرلے تو اب دونوں میں گویا ایک معاہدہ ہوگیا، اب امین جب تک اس کو اپنی امانت میں رکھے گا، اس کی حفاظت اس کے اوپر اپنے مال کی طرح واجب ہوگی، اگر اس نے اس کی حفاظت میں کوتاہی کی تو اس کو اس کا تاوان دینا پڑے گا۔

معاہدہ و ودیعت کے ختم ہونے کی مدّت دو صورتوں میں معاہدۂ و ودیعت ختم ہوجاتا ہے، (۱) ایک یہ کہ جتنے دن کے لئے اس نے امانت رکھی تھی وہ مدت ختم ہوگئی (۲) دوسرے امین یا مُودِع یعنی امانت رکھنے والے میں سے کوئی معاہدہ فسخ کردے، کیونکہ ان دونوں کو ہر وقت اختیار ہے کہ وہ اس کو جب چاہیں

---

[1] البحر الرائق و المجلہ ص۱۱۱۔

[2] ینعقد الایداع بالایجاب والقبول صراحۃً او دلالۃً۔ (المجلہ ص۱۲۰)

ختم کردیں[1]

چند اصطلاحیں ودیعت اور امانت رکھنے کو شریعت میں ایدَاع اور ودیعت رکھنے والے کو مُودِع یا مستودِع (دال کو زیر کے ساتھ) اور جو امانت رکھ لے اس کو امین یا مستودَع (دال کو زبر کے ساتھ کہتے ہیں۔

ودیعت دو طرح سے ہوتی ہے ودیعت دو طرح سے رکھی جاتی ہے، ایک تو صَراحۃً مودع کسی سے یہ کہے کہ میرا یہ مال امانت رکھ لیجئے، اور امین نے ہاں کر لیا تو اب وہ امین بن گیا، دوسرے یہ کہ ایک آدمی نے کسی دوکان پر اپنی کوئی چیز رکھ دی اور دوکاندار نے رکھتے ہوئے دیکھا، مگر کچھ بولا نہیں، یا ایک شخص پلیٹ فارم پر یا ریل دموٹر میں یہ کہہ کر کسی ضرورت سے کہیں چلا گیا کہ ذرا میرا سامان دیکھتے رہئیے گا، اور دوسرا آدمی کچھ بولا نہیں تو وہ چیز اس کی امانت میں آگئی، اب اس کی نگرانی اس پر لازم ہوگی، اگر اس نے چھوڑ دیا اور وہ چیز چوری ہوگئی تو مودع (سپرد کرنے والا) اس سے تاوان لینے کا حق رکھتا ہے، البتہ اگر اس نے اسی وقت یہ کہہ دیا کہ میں نہیں دیکھ سکتا، یا دوکاندار نے کہہ دیا کہ آپ دوکان پر سامان نہ رکھیئے، اور اس کے بعد اس نے چھوڑ دیا، تو اس پر کوئی ذمّہ داری نہیں ہوگی[2]

ودیعت کے شرائط (۱) اسی چیز کو بطور امانت رکھنا صحیح ہوگا، جس پر امین کا قبضہ ہوسکے، اگر کسی نے ہوا کے پرندے، تالاب کی مچھلیاں، یا دوسرے کے قبضہ میں جو چیز ہو اس کی حفاظت کے لئے کہا تو یہ صحیح نہیں ہے، خواہ امین قبول کرے یا خاموش ہو جائے۔

(۲) مودِع اور امین دونوں عاقل یعنی لین دین کے معاملات کی سمجھ رکھتے ہوں، بالغ ہونا

---

[1] لکل من المودع و المستودع فسخ عقد الایداع۔ (المجلہ ص۱۲۱)

[2] الاذن دلالۃ کالاذن صراحۃ و اما اذا وجد النہی صراحۃ فلا عبرۃ با الاذن دلالۃ (المجلہ ص۱۲۰) الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۳ ص۲۵۱۔

شرط نہیں ہے، ناسمجھ بچّے اور پاگل نہ تو کوئی چیز امانت رکھ سکتے ہیں، نہ رکھوا سکتے ہیں یعنی نہ تو وہ امین ہو سکتے ہیں اور نہ مودِع [1] البتہ سمجھ دار لڑکے مودع اور امین بن سکتے ہیں۔

(۳) ودیعت کی مدّت میں اس سے جو کچھ فائدہ حاصل ہوگا، وہ مودِع کا ہوگا، مثلاً کسی نے ایک جانور امانت رکھا، اگر وہ بچّہ دے یا اس کا اون کاٹا جائے یا دودھ ہو، وہ سب مودِع کا ہوگا، امین اگر بغیر اجازت ان میں سے کوئی چیز استعمال کرے گا، تو اس کو خیانت کرنے کا گناہ بھی ہوگا اور اس کو تاوان بھی دینا پڑے گا۔[2]

امین کی قانونی ذمہ داریاں

(۱) امین کو امانت کی اسی طرح حفاظت کرنی چاہیئے، جس طرح وہ اپنی چیز کی کرتا ہے، اوپر ذکر آچکا ہے۔

(۲) امین چاہے خود اس کی حفاظت کرے، چاہے گھر کے ان افراد سے کرائے، جن سے خونی یا دائمی رشتہ ہے، مثلاً ماں باپ، بیٹے بیٹی، بیوی، بہن یا گھر میں ہر وقت آنے والے نوکر چاکر سے اس کی دیکھ بھال کرائے، اس کو دونوں باتوں کا اختیار ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ شرط ہے کہ ان میں سے کوئی خائن نہ ہو، اگر ان میں سے کوئی غیر ذمہ دار یا خائن ہے تو اس کی نگرانی میں اس کو نہ دینا چاہیئے، اگر دے گا اور وہ امانت ضائع ہو جائے گی، تو اس کو تاوان دینا پڑے گا۔[3]

(۳) امین اگر امانت کو کسی غیر آدمی کے پاس حفاظت کے لئے رکھ دے، یعنی وہ دوسرے آدمی کو اس امانت کا امین بنا دے تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ امین نے مودِع سے دوسرے کے پاس رکھنے کی اجازت لے لی ہے، دوسری یہ کہ وہ ایسا آدمی ہے، جس کے یہاں وہ خود اپنی چیزیں رکھ دیا کرتا ہے، تو ان دونوں صورتوں میں کسی غیر آدمی کو امین بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً امانت کے روپے کو اسی طرح بینک میں رکھ دے جس طرح اپنا روپیہ

---

[1] یشترط کون المودع والمستودع عاقلین ممیزین۔ (المجلہ ص ۱۲۱)۔

[2] منافع الودیعة لصاحبها مثلاً نتاج حیوان الودیعة وشعرہ ولبنه ص ۱۲۵۔

[3] للمودع ان یحفظها بنفسه وبمن فی عیاله (ھدایہ ج ۳ ص ۲۵۷)۔

رکھتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن ان دو صورتوں کے علاوہ اگر وہ امانت کسی دوسرے کے پاس حفاظت کے لئے رکھے گا، تو پھر اس کی ذمہ داری امین پر ہوگی، یعنی اگر امانت ضائع ہو جائے گی یا اس میں خرابی آ جائے گی، تو اس کا تاوان امین اوّل کو دینا پڑے گا، برخلاف مذکورہ دونوں صورتوں کے ان میں اس کو تاوان نہ دینا پڑے گا۔[1]

(۴) امانت کی چیز کو، امین نہ تو استعمال کر سکتا ہے، اور نہ اس کو اپنی چیز کے ساتھ ملا سکتا ہے البتہ اگر مودِع اس کی اجازت دے دے تو پھر جائز ہے، مثلاً کسی نے سو روپے امانت کے رکھے، تو بعینہٖ وہی روپیہ اس کو واپس کرنا چاہیئے، اگر امین نے اس خیال سے خرچ کر ڈالا یا اس کو کسی تجارت میں لگا دیا کہ جب اس کو ضرورت ہوگی، اپنے روپے سے دے دیں گے تو یہ امانت میں خیانت ہوگی، اور امین گنہ گار ہوگا، اگر وہ ایسی چیز ہے جس کے ملانے سے علیحدہ کرنا دشوار ہو تو پھر کسی طرح جائز نہیں، امانت دار کو اس کا تاوان دینا ہوگا، اسی طرح کسی نے کپڑا، زیور، یا جوتا امانت رکھا تو اس کا پہننا گناہ ہے، اسی طرح کسی نے کرسی، میز یا پلنگ یا برتن امانت رکھ دیا تو ان میں سے کسی چیز کے استعمال کا حق نہیں ہے، اگر مودِع اجازت دے دے تو ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے[2] البتہ اگر تھوڑے استعمال سے اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آئے تو کوئی حرج نہیں، مگر تھوڑا استعمال بھی بہتر نہیں ہے۔

(۵) جہاں امین نے امانت لی ہے، اس کو وہیں ادا کرنا ضروری ہے، مودِع اس کو دوسری جگہ وصول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا، کسی نے لکھنؤ میں امانت رکھنے کے لئے دی ہے تو اس کو یہ حق نہیں کہ وہ دلّی میں اس سے مانگے، البتہ اگر امین نے یہ کہہ دیا ہو کہ میں اس کو دلّی میں رکھوں گا، تو پھر اب امانت رکھنے والے کو لکھنؤ میں مانگنے کا حق نہیں ہے[3]

---

[1] لیس للمستودع ایداع الودیعۃ عند اٰخر بدون اذن واذا اودعہا فہلکت صار ضامنًا۔ (المحلہ ص۱۲۴)۔

[2] وان خلطہا المودع بمالہ حتی لا یتمیز ضمنہا (ہدایہ ج ۳ ص۲۵۷)۔

[3] المحلہ ص۱۲۵ یعتبر مکان الایداع فی تسلیم الودیعۃ۔

(۶) اگر کئی آدمیوں کو ایک چیز کا امین بنا دیا جائے تو یہ بھی صحیح ہے، اگر سب نے اقرار کر لیا ہے تو اب سب اس کے ذمہ دار ہوں گے، ان کو باری باری یا جس طرح ہو امانت کی حفاظت کرنی چاہیئے [۱]

امین اُجرت بھی لے سکتا ہے امین کو اگر امانت کی دیکھ بھال کے لئے کچھ دقّت یا محنت صرف کرنی پڑتی ہے، تو وہ اجرت بھی لے سکتا ہے، یا نہیں، اس بارے میں ائمہ فقہ میں تھوڑا سا اختلاف ہے، بعض ائمہ اس کی اجازت نہیں دیتے، اور بعض دیتے ہیں، مگر کچھ شرائط کے ساتھ، حنفی فقہ کی متداول کتابوں میں صراحۃً تو اس بارے میں کوئی جزیہ راقم کو نہیں ملا، مگر مجلۃ الاحکام میں یہ دفعہ ملی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ودیعت پر اُجرت لی جاسکتی ہے، اس میں ہے کہ:

إِذَا أَوْدَعَ رَجُلٌ مَالَهُ عِنْدَ آخَرَ وَأَعْطَاهُ أُجْرَةً عَلَى حِفْظِهِ فَضَاعَ الْمَالُ بِسَبَبٍ يُمْكِنُ التَّحَرُّزُ مِنْهُ كَالسَّرِقَةِ يَلْزَمُ الْمُسْتَوْدَعَ الضَّمَانُ [۲]	اگر کسی نے اپنا مال کسی کے پاس امانۃً رکھا اور اس امانت کی دیکھ بھال کی اجرت بھی اس کو دیتا ہے، ایسی حالت میں اگر وہ ضائع ہو جائے، تو اگر ایسی حالت میں وہ ضائع ہو جائے کہ اس کو ضائع ہونے سے بچانا ممکن تھا، مثلاً چوری ہو گیا تو اس کو تاوان دینا پڑے گا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی اس شرط کے ساتھ اُجرت لینے کی اجازت دیتے ہیں کہ جب امین کو اس کے لئے کافی جگہ دینی پڑتی ہو، یا اس میں خرچ کرنا پڑتا ہو، امام شافعیؒ مطلقاً

---

[۱] اذا کان المستودع جماعۃ متعددین یحفظھا احدھم باذن الباقین ویحفظونھا مناوبتہ۔ (المجلۃ ص ۱۳۲)

[۲] بعد میں کتاب الاجارہ میں صاحب ہدایہ کی اس ضمنی تشریح پر بھی نظر پڑی فیضمنہ کالودیعۃ اذا کانت باجر یعنی اجیر مشترک کے پاس جو چیزیں ہوتی ہیں وہ ان کا اسی طرح ضامن ہوتا ہے جس طرح اس امانت کی ضمانت دینی پڑتی ہے، جس کی اُجرت امین لیتا ہو۔ (ہدایہ کتاب الاجارہ ج ۳ ص ۲۹۲)۔

اجرت لینے کی اجازت دیتے ہیں۔ (بدایۃ المجتہد ج ۲ صـ ۳۱۴)

موجودہ زمانہ میں اس کی ضرورت اتنی عام ہوگئی ہے کہ اس کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے مثال کے طور پر آلو کے بیج کو لیجئے کہ آلو کے تاجر، اگر آلو کے بیج بڑے گوداموں اور کولڈ اسٹورج کے حوالہ کرکے ان کی حفاظت نہ کرائیں، تو اس کی کاشت کے وقت اس کے بیج کا ملنا دشوار ہو جائے گا اب تو مختلف قسم کے پھل اور غلّہ وغیرہ بھی کولڈ اسٹورج میں رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح اس کے ذریعہ بے شمار چیزیں محفوظ کی جاتی ہیں، غرض یہ کہ ایسا کرنا اسلامی شریعت کے اعتبار سے صحیح ہے۔

کولڈ اسٹورج میں متعدد ہال ہوتے ہیں، آلو کا بیج یا غلہ یا پھل رکھنے والے نے اسٹورج کے مالک سے کہا کہ آپ ہمارا سامان فلاں ہال میں رکھیئے، لیکن اس نے دوسرے ہال میں رکھ دیا اور اتّفاق سے بیج وغیرہ میں کوئی خرابی آگئی یا اس میں آگ لگ گئی، تو اسٹورج کے مالک پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، یعنی اسے ضمان دینا نہ ہوگا[۱] لیکن اگر اس کے پاس دو کولڈ اسٹورج ہیں، اس نے دوسرے میں اس کا سامان رکھ دیا اور نقصان ہوا، یا کوئی خرابی پیدا ہوئی تو مالک کو اس کا تاوان دینا پڑے گا، اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے اسٹورج کی عمارت زیادہ اچھی نہ بنی ہو اور وہ کمزور ہو، جس سے ہوا وغیرہ پاس ہو جاتی ہو یا پوری ٹھنڈک نہ پہنچتی ہو، اس لئے اس کا وہ ضامن قرار دیا جائے گا، اسی طرح پہلی صورت میں اگر اسٹورج مختلف ہالوں میں پختگی اور کمزوری کے لحاظ سے فرق ہوگا تو اس صورت میں بھی مالک کو نقصان کا تاوان دینا ہوگا[۲]

بینک و ڈاک خانہ میں اجرت دیکر امانت رکھی جا سکتی ہے

موجودہ بینک اور ڈاک خانہ میں بھی

---

[۱] وان قال احفظها فی هذا البیت فحفظها فی بیت آخر من الدار لم یضمن وحفظها فی دار اخری ضمن۔ (هدایہ ج ۳ صـ ۲۵۷) [۲] واما اذا کان بین الحجر تفاوت کان کانت احد الحجرین بنیت بالاحجار والاخری بالاخشاب یعتبر الشرط۔ (المجلہ صـ ۳۳۴)۔

اُجرت دے کر روپے، پیسے، زیور اور دوسری قیمتی چیزیں اجرت دے کر امانۃً رکھی جاسکتی ہیں، مگر خود اس سے سود لے کر روپے یا کوئی چیز جمع کرنا حرام ہے، اوپر تصریح آچکی ہے، جس امانت کی حفاظت پر کچھ خرچ ہوتا ہو، اس کی ذمّہ داری مودع (امانت رکھنے والے) پر ہے، اگر وہ ادا نہ کرے، تو مستودع اس کا ہر سامان روک سکتا ہے اور اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے[1]

امانت میں تجارت

امانت کے روپے میں تجارت کی جاسکتی ہے، یا نہیں، اس بارے میں فقہائے احناف کی تصریحات تو نہیں مل سکیں، البتہ صحابہؓ کے دور میں ایسی مثالیں ملتی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ امانت کے روپے سے تجارت کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، سے منقول ہے کہ وہ یتیموں کے والیوں کو، ان کے مال سے تجارت کرنے کی ترغیب اس لئے دیا کرتے تھے کہ زکوٰۃ دیتے دیتے ان کا مال ختم نہ ہو جائے[2]

خود صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ یُقرِضُ القَاضِیُ اَمْوَالَ الیَتَامیٰ قاضی کو چاہیئے کہ وہ یتیموں کے مال کو مضاربت میں لگا دیا کرے، تاکہ وہ ضائع ہونے سے بچ جائے، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم نے بدلائل لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امانت کے روپے سے امانت رکھنے والے کی اجازت سے تجارت کیا کرتے تھے[3] (امام صاحب کی سیاسی زندگی)

---

[1] والودیعۃ اللتی تحتاج الی النفقۃ ... نفقتہا علی صاحبہا۔ (المجلہ ص ۱۲۰)

[2] امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یتیم کے مال میں زکوٰۃ کے قائل ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یتیم کے مال پر زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہے۔

[3] بدایۃ المجتہد میں ابن رشد نے اس کی کچھ تفصیل کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ کوئی شخص اپنا روپیہ کسی کے پاس امانت رکھے اور وہ اس کی اجازت کے بغیر اپنی خود رائی سے اس کو تجارت میں لگا دے اور اس میں اسے فائدہ بھی ہو تو یہ فائدہ اس کے حق میں حرام ہوگا یا حلال، تو امام مالک، لیث بن سعد اور امام ابو یوسف اور فقہاء کی ایک اور جماعت کی رائے ہے کہ اگر وہ اصل سرمایہ امانت رکھنے والے (مودع) کو واپس کر دے تو نفع اس کے لئے حلال ہو جائے گا، اگر وہ

(باقی حاشیہ ص پر)

اس بنا پر راقم کا خیال ہے کہ اگر امانت کے روپے سے بغیر اجازت تجارت کی جائے اور اصل سرمایہ کو کوئی نقصان نہ ہو تو اسے مضاربت میں تبدیل کر کے نفع مودع اور مستودع ہی پر تقسیم کر دینا چاہیئے۔

اجازت ہونی چاہیئے لیکن اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ مودِع کی اجازت کے بغیر امانت کا روپیہ تجارت میں لگانا صحیح نہیں ہے، اجازت سے لگایا جا سکتا ہے، اس صورت میں یہ روپیہ امین کے ہاتھ میں امانت تو ہوگا مگر اس کی حیثیت امین ہونے کے ساتھ ساتھ مضارب کی بھی ہو جائے گی، یعنی اگر وہ اس روپے سے تجارت کرتا ہے تو نفع میں بھی مودع کو شریک کرنا چاہیئے، جیساکہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، اگر کوئی آدمی کسی یتیم کا ولی ہے تو اس کو بھی یہی چاہیئے کہ وہ سارا نفع خود نہ سمیٹ لے، بلکہ اس میں یتیم کا حصّہ بھی لگا دے۔

(بقیہ حاشیہ صہ کا)

غاصب ہوتا جب بھی یہ نفع اس کے لئے جائز ہوتا اور اس وقت تو وہ مستودع یعنی اس کے پاس امانت رکھی گئی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ، امام زفرؒ اور امام محمدؒ کی رائے ہے کہ وہ اصل سرمایہ مودع کو واپس کر دے، اور نفع صدقہ کر دے یعنی اس کے لئے یہ حلال نہیں ہے۔

بعض لوگ حضرت عمرؓ کے اسوہ کی بنا پر جس میں یہ ہے کہ ان کے صاحبزادے عبداللہؓ اور عبیداللہؓ کو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے بیت المال کی ایک رقم عراق میں دی کہ وہ مدینہ پہونچا دیں، انھوں نے راستہ میں اس سے کچھ مال خرید کر بیچ لیا، جس سے کچھ فائدہ ہوا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب علم ہوا تو انھوں نے پوری رقم بیت المال میں داخل کرنے کے لئے کہا، لیکن ایک صاحب کے کہنے سے آپ نے اسے مضاربت قرار دے کر نصف فائدہ ان لوگوں کو دے دیا اور نصف بیت المال میں داخل کر دیا۔ (بدایۃ المجتہد ج ۲ صہ ۲۱۲)

بہر حال مالک (مودع) کی اجازت لے تو یہ جائز ہی ہے، البتہ اگر اصل سرمایہ کو کوئی خطرہ نہ ہو تو حضرت عمرؓ کے اس اسوہ کی روشنی میں اسے مضاربت قرار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن امانت کی ذمہ داری کے پیش نظر احتیاط امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تاوان کے واجب ہونے یا نہ ہونے کی صورتیں

امانت اگر امین کی غفلت یا تساہلی کے بغیر ضائع ہوگی، تو امین کے اوپر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اگر اس نے تفریط یا تعدّی کی یعنی اس کی حفاظت میں تساہلی کی یا مودِع کی ہدایت کے خلاف اس نے کوئی قدم اٹھایا یا اس کو مودِع کی اجازت کے بغیر استعمال کر لیا تو ان تمام صورتوں میں اس کو تاوان دینا پڑے گا، اسی طرح جب اس نے امانت رکھنے کی اجازت کی اجرت لے لی، تو اس پر تاوان بھی واجب ہو گیا[۱] جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، مثال کے لئے چند صورتیں تاوان کے واجب ہونے یا نہ ہونے کی لکھی جاتی ہیں۔

(۱) اگر کسی نے امانت کا روپیہ یا چیز استعمال کر لی، اور اس کے بعد وہ چیز خراب ہوگئی یا ٹوٹ گئی یا روپیہ چوری ہو گیا، تو اس کو تاوان دینا پڑے گا، مثلاً کپڑے یا زیور کو پہن لیا، گھڑی تھی اس کو کلائی پر لگا لیا، یا وقت دیکھنے[۲] کے لئے جیب میں رکھ لیا، یا دیوار پر لٹکا دیا، یا سائیکل یا موٹر تھی، اس پر سواری کر لی، فرنیچر تھا اس کو استعمال کر لیا تو اب استعمال کے بعد اس میں جو نقص آئے گا اس کا تاوان اسی کو دینا پڑے گا، البتہ اگر اتفاق سے اس نے استعمال کر لیا پھر ندامت ہوئی اور اس میں کوئی خرابی نہیں آئی اور حفاظت سے اس کو رکھ دیا اور اس کے بعد وہ چیز نقصان ہوگئی یا ٹوٹ گئی یا چوری ہوگئی، تو اس پر تاوان نہیں ہوگا[۳]۔

---

[۱] اذا كان الايداع باجرة على حفظ الوديعة فهلكت اوضاعت يمكن التحرز منه لزام المستودع ضمانها (المجلہ ص۱۲۱)۔ [۲] اگر حفاظت کے خیال سے جیب میں رکھ لے یا دیوار پر لٹکا دے تو پھر یہ تعدی اور تفریط نہیں ہوگی۔ [۳] اذا هلكت الوديعة او نقصت قيمتها بسبب تعدي المستودع او تقصيره لزمه الضمان مثلا اذا صرف المستودع نقود الوديعة فى امور نفسه واستهلكها ضمنها۔ [۴] وكذا لو ركب دابة الوديع بدون اذن المودع فهلكت وهو ذاهب بها ضمن قيمتها سواء كان هلاكها بسبب سرعة السير فوق الوجه المعتاد او بسبب آخر او بلا سبب وكذا اذا وقع حريق ولم ينقل الوديعة الى محل آخر مع قدرته على ذالك ضمنها۔ (المجلہ ص۱۲۳)

(۲) جو چیز بکس، تجوری، یا کمرے کے اندر رکھنے کی ہے، اس کو بے احتیاطی سے باہر رکھ دیا یا باہر چھوڑ دیا، اور وہ ضائع ہو گئی، تو تاوان دینا پڑے گا، مثلاً روپیہ پیسہ کو بکس یا تجوری میں رکھا، اور ضائع ہو گیا، تو تاوان نہیں، لیکن اگر اس کو بکس یا تجوری کے باہر چھوڑ دیا، یا رکھ دیا تو اس پر تاوان ہو گا، البتہ اگر وہ اپنے روپے زیور وغیرہ بکس کے بجائے طاق وغیرہ پر رکھتا ہے، یا اس کے گھر میں کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے، تو پھر اس پر نقصان کی ذمہ داری نہیں ہو گی [1]

(۳) غلطی سے بکس کا قفل کھلا رہ گیا اور اس کی وجہ سے امانت کا مال چوری ہو گیا، یا اس کو چوہے نے کاٹ دیا یا اور کوئی نقصان پہونچ گیا، تو اسے تاوان دینا پڑے گا۔

(۴) خریدار دوکاندار کی اجازت سے شیشے کا گلاس اٹھا کر دیکھنے بھالنے لگا، اگر وہ ٹوٹ گیا، تو اس کو تاوان نہیں دینا پڑے گا، لیکن اگر بغیر اجازت کوئی چیز اٹھا کر دیکھے گا، اور ٹوٹ جائے گی یا خراب ہو جائے گی تو تاوان دینا پڑے گا [2]

(۵) اگر مودِع نے کوئی ایسی شرط لگائی جس کا پورا کرنا ممکن ہو، اور اس کے خلاف امین نے کیا تو اس کو تاوان دینا پڑے گا، لیکن اگر اس کا پورا کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہو تو پھر تاوان نہیں دینا پڑے گا، مثلاً اس نے کہا کہ تمہارے علاوہ تمہارے بال بچوں میں گھر کا کوئی دوسرا آدمی امانت کی حفاظت نہ کرے، تو یہ شرط لغو ہے، کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک آدمی ہر وقت اس کی نگرانی کرتا رہے [3]۔ البتہ ان کی مدد کے بغیر اس کی حفاظت وہ خود کر سکتا ہو تو پھر اس کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔

---

[1] المجلہ ص ۱۲۱ ۔ [2] ایضاً۔

[3] الشرط الواقع فی عقد الایداع اذا کان ممکن الاجراء ومفیداً یکون معتبراً والا فھو لغو، مثلاً اذا امر المودع المستودع بحفظ الودیعۃ دنہا ہ ان یسلمہا لزوجتہ او ابنہ او خادمہ او لمن یامنہ علی حفظ مال نفسہ فاذا کان ثم امر مجبر علی تسلیم الودیعۃ لاحد ھولاء کان ذالک النہی غیر معتبر واذا سلمہا بلا مجبوریۃ فہلکت لزمہ الضمان۔ المجلہ ص ۱۲۱۔

(۶) ناگہانی حادثہ کی وجہ سے اگر امانت کا مال یا چیز ضائع ہوجائے، تو امین پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، مثلاً گھر میں آگ لگ گئی، سیلاب میں مکان گر گیا، یا ڈاکہ پڑ گیا۔

(۷) اگر مودِع یہ شرط لگادے کہ میری امانت گھر والوں کے علاوہ کسی دوسرے کے پاس نہ رکھی جائے، تو اس کو اس شرط کے لگانے کا حق ہے، اگر امین اس کی خلاف ورزی کرے گا، تو نقصان کی ذمہ داری اس پر ہوگی، لیکن اگر کسی ناگہانی صورت میں اس نے دوسری جگہ امانت رکھدی اور ضائع ہوگئی، تو پھر اس پر تاوان نہیں ہے، مثلاً گھر میں آگ لگ گئی، یا سیلاب آگیا، تو امین کو امانت دوسری جگہ منتقل کر دینا ضروری ہے، اس صورت میں وہ قصداً دوسری جگہ منتقل نہ کرے اور نقصان ہوجائے تو اس کو تاوان دینا پڑے گا[1]

ودلیعت کی واپسی کا اختیار

اوپر ذکر آچکا ہے کہ (۱) امین اور مودِع دونوں میں سے ہر ایک کو یہ اختیار ہے کہ وہ امانت کا معاہدہ جب چاہیں فسخ کر دیں (۲) اسی طرح جب امانت کی مدت ختم ہوگئی تو خود بخود معاہدہ فسخ ہوگیا ان دونوں صورتوں میں امین کو فوراً امانت مودِع کے حوالہ کر دینی چاہیئے۔

(۳) ان میں سے کسی کا انتقال ہوجائے تو اس صورت میں بھی یہ معاہدہ فسخ ہوجائے گا، اب مودِع کے ورثہ کو اپنی امانت واپس لے لینی چاہیئے، اور امین کے ورثہ کو واپس کر دینی چاہیئے، اگر ان کو پھر امانت رکھنی ہے تو دوسرا معاہدہ کرنا چاہیئے۔

ودلیعت کی واپسی سے انکار

(۱) اگر مودع نے کسی وقت اپنی امانت واپس مانگی، یا مدت ختم ہوگئی، اور اس نے کہا کہ میری امانت واپس کردو، تو اس کو فوراً واپس کر دینا چاہیئے، اگر اس نے کہا کہ اچھا کل لے جانا اور کل تک وہ چیز ضائع ہوگئی تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کسی مجبوری کی بنا پر واپس نہیں کیا اور مودِع خوشی سے واپس چلا گیا اور کل تک وہ چیز ضائع ہوگئی تو اس پر تاوان نہیں ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ مودِع اسی وقت اپنی امانت چاہتا تھا، مگر

---

[1] فنقلها المستودع الی محل اٰخر بسبب حریق فی داره لا یعتبر ذالك الشرط۔ المجلہ ص۱۲۳

امین کے ٹال مٹول کی وجہ سے ناراض ہوکر واپس ہوگیا، اور اس صورت میں وہ ضائع ہوگئی، تو امین ذمہ دار ہوگا، کیونکہ پہلی صورت میں گویا مودِع نے اپنی خوشی سے ایک دن کے لئے اس کو اور امین بنادیا اس لئے امین پر ذمہ داری نہیں ہے، اور دوسری صورت میں اس نے امانت کو ناخوشی سے اس کے پاس چھوڑ دیا تھا، گویا اس نے اس کو امانت کی ذمہ داری سے معزول کر دیا تو اب امین کو اپنے پاس امانت کا مال یا چیز رکھنے کی اجازت نہیں تھی، مگر رکھا اس لئے تاوان دینا پڑے گا[1]

(۲) اگر مودع نے کسی دوسرے آدمی کو بھیجا کہ فلاں امانت فلاں آدمی کے یہاں سے لے آؤ تو امین کو اختیار ہے کہ وہ اسے دے یا نہ دے اگر وہ سچا سمجھ کر دیدے اور مودع کہے کہ ہم نے نہیں بھیجا تھا تو وہ اگر ضائع ہو جائے تو مودع اس سے لے سکتا ہے اور وہ لیجانے والے سے مطالبہ کرے۔

امانت پر گواہ (۳) امانت دیتے وقت اور لیتے وقت بہتر ہے کہ دو آدمیوں کو گواہ بنالیا جائے، قرآن میں ان مواقع پر شاہد بنانے کی تاکید آئی ہے، چنانچہ ناسمجھوں اور یتیموں کے مال کی واپسی کے وقت یہ حکم دیا گیا ہے۔

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ — جب ان کا مال ان کے حوالے کرو، تو
فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ۔ (نساء) — ان پر گواہ بنالو۔

تحریر اگر کسی کی موت کے بعد اس کے بہی کھاتہ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ فلاں کا اتنا روپیہ یا فلاں چیز میرے یہاں امانت ہے، اور اس کا علم اس کے ورثہ یا منشی وغیرہ کو نہ ہو تو امین کے ورثہ کو اتنا مال یا وہ چیز تحقیق کے بعد واپس کر دینی چاہیئے۔

امانت تھی یا خود میت کا کوئی اقرار نامہ مل جائے، یا وہ کسی سے کہہ گیا ہو، یا ورثہ کو خود علم ہو تو پھر بغیر تحقیق کے جس کی چیز یا مال ہے، اس کے حوالہ کر دینا چاہیئے[2]

---

[1] واذا طلبها المودع فلم يسلمها له المستودع وهلكت اوضاعت ضمنها المستودع لكن اذا كان عدم تسليمها وقت الطلب ناشئاً عن عذر..... لايلزم الضمان۔ المجلہ ص ۱۲۴

[2] اذا مات المستودع ووجدت الوديعة عيناً فى تركته تكون امانة فى يد وارثه فيردها الى صاحبها۔ المجلہ ص ۱۲۵۔

تاوان کی مقدار جس صورت میں امین پر تاوان واجب ہوگا، اس میں تاوان کی ادائیگی کس طرح اور کس انداز سے ہوگی، اس کے بارے میں فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر امانت نقد رقم نہیں، بلکہ کوئی جنس ہے، مثلاً گھڑی، برتن، میز، کرسی وغیرہ ہے، تو اس کو اسی طرح کی چیز تاوان میں دینی چاہیئے، اور اگر نقد رقم یا قیمت والی چیزیں ہوں، مثلاً سونا، چاندی یا ان کے بنے ہوئے زیور تو اتنی ہی نقد رقم یا اتنی ہی قیمت کا زیور یا اس کی قیمت دینی ہوگی، اسی طرح اگر جنس میں کوئی ایسی چیز ہے جس کا ملنا دشوار ہے تو پھر اس کی قیمت کا اندازہ کر کے دینا ہوگا، مثلاً ویسٹرن گھڑی امانت تھی، اور وہ ضائع ہوگئی، تو ویسی ہی گھڑی منگا کر اس کو دینا چاہیئے، اگر وہ بازار میں نہ مل سکے، تو پھر قیمت بھی دی جا سکتی ہے، قیمت یا اس کے مثل جو چیز دی جائے گی، اس میں لحاظ اس وقت کی قیمت کا کرنا پڑیگا، جس وقت وہ نقصان ہوا ہے[1]

۲۔ تاوان میں وہی قیمت لی جائے گی جو اس چیز کی، تاوان کے دن تھی، مثلاً اگر کسی نے دسمبر کی پانچ تاریخ کو، کوئی چیز ضائع کی، تو پانچ دسمبر کو بازار میں اس کی جو قیمت تھی وہی دینی پڑے گی، خواہ دیتے وقت وہ سستی ہو یا مہنگی۔

امانت کی واپسی کا خرچ امانت کی واپسی کا خرچ مودع کو برداشت کرنا ہوگا[2]

عاریت

دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کو ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز حاصل ہو، زیادہ تر لوگ ایسے ہی ملیں گے، جو بہت سی چیزیں نہ تو خرید سکتے ہیں اور نہ کرایہ پر لے سکتے ہیں، ان کو زندگی کے بہت سے کاموں میں بہت سی چیزیں دوسروں سے منگنی مانگنی پڑتی ہیں،

---

[1] الودیعة اذ السزام ضمانها فان کانت من المثلیات تضمن بمثلها وان کانت من القیمیات تضمن بقیمتها یوم لزوم الزمان۔ المجلة ص۱۲۶۔

[2] مؤنة الرد والتسلیم ای مصارفها عائدة علی المودع۔ (المجلة ص۱۲۵)

اسی مانگنے کو شریعت میں عاریت کہتے ہیں۔

جس طرح کفالت کرنا، قرض دینا، امانت رکھ لینا اسلامی معاشرہ کا ایک اخلاقی فرض ہے، اسی طرح اگر کوئی حاجتمند اپنی کسی ضرورت پر کوئی منگنی مانگتا ہے تو معاشرہ کے افراد کا اخلاقی فرض[1] ہے کہ وہ چیز بغیر کسی عذر اور معاوضہ کے فراہم کر دیں خاص طور پر معمولی اور روزمرّہ کے استعمال کی چیزیں تو بغیر کسی تامل کے دے دینی چاہئیں، قرآن نے ان لوگوں کی مذمّت کی ہے، جو ماعون کے دینے میں تامل کرتے ہیں، چنانچہ اسی مناسبت سے ایک سورہ کا نام ہی الماعون پڑ گیا، ان میں جن باتوں پر تہدید کی گئی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ۔ (الماعون)	خرابی ہو ان لوگوں کی جو اپنی نماز وں سے غفلت برتتے ہیں، یہ لوگ صرف دکھاوے کے لئے نماز پڑھتے ہیں اور معمولی روزمرّہ کے استعمال اور برتنے کی چیزوں کے دینے میں تامل کرتے ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ ایسی دکھاوے کی نماز سے کیا فائدہ جس سے دل میں نہ تو خالق کی محبت پیدا ہو اور نہ مخلوق کی، اگر ان لوگوں کے دل میں خدا کی محبت ہوتی تو پھر وہ مخلوق

---

[1] اخلاقی فرض کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنا مستحب ہے، یعنی اس فرض کی ادائیگی پر اس کو ثواب ملے گا اور نہ دینے کی صورت میں وہ قابل ملامت ٹھہرے گا، مگر قانوناً عاریت دینے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا مگر کبھی عاریت کا دینا واجب ہو جاتا ہے، اور کبھی حرام، مثلاً ایک شخص شدید پیاسا ہے اور آپ کے پاس پانی ہے تو آپ پر واجب ہے کہ اپنا پانی اسے پلا دیں، ایک مریض میدان میں تڑپ رہا ہے آپ سے اسپتال تک جانے کے لئے سواری مانگتا ہے تو آپ پر واجب ہے کہ آپ سواری عاریۃً دے دیں، اسی طرح ایک شخص آپ سے آپ کی خادمہ کو اپنی شہوت پوری کرنے کیلئے مانگتا ہے، تو آپ پر اس کا دینا حرام ہے اسی طرح دوسری حرام چیزوں کا لینا دینا حرام ہے۔

سے بھی محبت کرتے، اور مخلوق کی محبت کا ادنیٰ تقاضہ یہ تھا کہ وہ معمولی برتنے کی چیزیں مانگنے پر ان کو ضرور بے عذر دے دیتے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے عاریت لی بھی ہے، اور دوسروں کو اپنی چیز بطور عاریت دی بھی ہے، حضورؐ نے غزوۂ حنین کے موقع پر صفوان سے کچھ زرہیں عاریۃً لی تھیں، ایک موقع پر حضرت ابوطلحہؓ سے ان کا گھوڑا عاریۃً لیا تھا۔ (بخاری و مسلم مشکوٰۃ ص۲۵۶)۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک اچھی قطری چادر تھی، جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی تھی تو عورتیں عاریۃً دولہن کو سنوارنے کے لئے لے جاتی تھیں۔ (ابوداؤد، کتاب العاریہ، المنتقی ج۲ ص۲۹۴)

ماعون؟

ماعون میں ہر وہ چیز داخل ہے، جس کے لینے دینے میں کوئی بڑا نقصان یا حرج نہ ہو، مثلاً کسی کے یہاں مہمان آگئے، آپ سے چارپائیاں مانگیں، بستر مانگا، برتن مانگا، یا ضرورت پر کسی نے رسی مانگی، نمک مانگا، دیاسلائی یا آگ مانگی، چھری مانگی، صابن مانگا، پڑھنے کے لئے کتاب مانگی تو آدمی کو بے تکلف دے دینا چاہیئے، صحابۂ کرامؓ کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ حضرات ماعون کے دینے میں کبھی عذر نہ کرتے تھے، ان کی زندگی نہایت سادہ تھی، اس لئے وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کے درمیان ماعون میں جو چیزیں لی یا دی جاتی تھیں، ان میں سوئی تاگا، ڈول رسّی وغیرہ شامل تھیں [1]

عاریت کے لفظی معنی

عاریت کا لفظ تعاور سے ماخوذ ہے جس کے معنی تداول کے ہیں یعنی عاریت کا لینا دینا گویا عام طور پر لوگوں میں رائج اور متداول ہے، اس کے دوسرے معنی کسی چیز کے جلد جانے اور جلد واپس آنے کے ہیں کہا جاتا ہے، اعارہ الشئی و اعارہ منہ بمعنی اخذہ و ذھب یعنی اس نے اس سے لیا اور پھر وہ چیز اس کے پاس چلی گئی، گویا عاریت کی چیز کی حقیقت یہ ہے کہ وہ جس تیزی کے ساتھ آتی ہے، اس تیزی کے ساتھ واپس چلی جاتی ہے، بعض حضرات سے اسے عار سے مشتق مانا ہے، یعنی

---

[1] صحابہ بیان کرتے ہیں کہ کنا نعد الماعون علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عاریۃ الدلو والقدار (تفسیر ابن کثیر) ہم ڈول اور پتیلی وغیرہ کو ماعون میں شمار کرتے تھے۔

عاریت کے لینے دینے میں آدمی کو کچھ شرم و عار محسوس ہوتا ہے، مگر یہ قول کمزور ہے اس لئے کہ عاریت کا لفظ یائی نہیں واوی ہے جو ی سے بدل گیا ہے اور عار کا لفظ یائی ہے۔

عاریت کی تعریف

شریعت میں کسی کو بغیر معاوضہ اپنی کسی چیز سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دینا عاریت ہے[۱]۔ عاریت دینے کو (۱) اعارہ، اور عاریت لینے کو (۲) استعارہ کہتے ہیں، اور عاریت دینے والے کو (۳) مُعیر اور عاریت لینے والے کو (۴) مُستعیر کہتے ہیں، جو چیز عاریت میں لی جائے اس کو (۵) مُستعار کہتے ہیں۔

عاریت کا حکم

(۱) کسی نے اپنے کسی پڑوسی یا کسی دوسرے آدمی سے کہا کہ مجھے دو دن کے لئے ایک پلنگ یا کرسی یا برتن یا اپنی سواری منگنی دے دیجئے اور اس نے دے دیا تو یہ چیز عاریت ہو گئی۔

(۲) عاریت کی چیز جب تک مستعیر کے یہاں رہے گی وہ امانت[۲] بے ضمانت ہوگی، یعنی اس کی

---

[۱] ھو تملیک المنافع بغیر عوض۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۲۶۳)

[۲] العاریۃ امانۃ فی ید المستعیر (المجلہ ص ۱۲۵) یہ مسلک امام ابوحنیفہؒ کا ہے، امام صاحبؒ نے اس کو ودیعت پر قیاس کیا ہے۔ یہی رائے امام شافعیؒ کی ہے، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اسے رہن کے مانند امانت قرار دیتے ہیں، یعنی اگر یہ چیز ایسی چھوٹی موٹی ہو کہ اس کا خراب ہونا عام لوگ نہ دیکھ سکیں، مثلاً کپڑا، روپیہ، گھڑی، فاؤنٹن پن وغیرہ، تو ان میں ضمانت نہیں ہوگی، اور اگر یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا نقصان ہر شخص دیکھ سکتا ہے، مثلاً سواریاں، جانور اور بڑی بڑی چیزیں تو مستعیر پر ضمانت ہوگی، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قبضہ کے بعد جس صورت سے بھی نقصان ہوگا مستعیر ضامن قرار دیا جائے گا خواہ وہ چھوٹی چیز ہو یا بڑی وہ قصداً نقصان کرے یا بغیر قصد کے ان کا استدلال اس حدیث نبوی پر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ عَارِیَۃٌ مَضْمُوْنَۃٌ امام صاحبؒ بغیر تعدی و تقریط ضامن قرار نہیں دیتے امام صاحب کے استدلال کی بنیاد ماعون کے سلسلے میں قرآن کی عمومی ہدایت اور نہ دینے پر تہدید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عام طرز عمل پر ہے عاریۃ مضمونۃ والی حدیث کو وہ اسی صورت پر محمول کرتے ہیں جب وہ قصداً نقصان کرے، غرض تعدی اور تقصیر کی صورت میں تمام ائمہ تاوان کے قائل ہیں۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۳، ص ۲۸۳ تا ۲۸۷)

حفاظت مستعیر پر اسی طرح ضروری ہے، جس طرح امانت کی ہوتی ہے، لیکن اگر وہ چیز اتفاق سے ٹوٹ گئی یا خراب ہوگئی تو اس پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

(۳) اس پر تاوان کی ذمہ داری اس صورت میں نہ ہوگی، جب وہ چیز اتفاق سے خراب ہوگئی یا ٹوٹ گئی ہو، لیکن اگر اس نے غلط طریقہ سے استعمال کیا، یا غیر ذمہ دار آدمیوں کے ہاتھ میں دے دیا اور وہ چیز خراب ہوگئی یا قصداً اس نے خراب کر دیا، یا توڑ دیا تو تمام ائمہ کے یہاں مستعیر کو اس کا تاوان دینا پڑے گا، مثلاً کسی نے چارپائی لی اور اس پر دس بیس آدمی لد گئے اور ٹوٹ گئی، گھڑی لی اور چابی سخت ہاتھ سے یا الٹے طریقہ پر دے دی اور اسپرنگ ٹوٹ گئی، کہیں جانے کے لئے سائیکل مانگی اور سیدھے اور اچھے راستے کے بجائے اس کو خراب راستہ سے لے گیا یا جتنے میل کے لئے کہا تھا اس سے زیادہ لے گیا اور اس کا ٹائر ٹیوب یا کوئی اور چیز خراب ہوگئی، فاونٹن پن لیا اور اس کو غلط طریقہ پر استعمال کیا اور ٹوٹ گیا تو ان تمام صورتوں میں اس کو اس کی پوری قیمت یا نقصان کے بقدر قیمت دینی پڑے گی۔ یا مرمّت کرانی پڑے گی، اسی طرح چینی کی پلیٹ کہیں سے لایا اور اس نے چھوٹے بچے یا غیر ذمہ دار آدمی کے ہاتھ میں دے دی اور ٹوٹ گئی تو اس کا تاوان دینا پڑے گا، لیکن اگر اس نے گھڑی یا شیشے کا گلاس عاریۃً منگایا اور اتفاق سے نوکر کے یا اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور ٹوٹ گیا یا پیر پھسل گیا اور عاریت کی چیز گر کر ٹوٹ گئی، یا کسی نے دری فرش منگایا اور اس پر اگالدان گر گیا اور پیک پڑ گئی تو ان تمام صورتوں میں اس پر کوئی تاوان نہیں ہے، لیکن اگر اس کے اوپر کسی نے دیا سلائی کی تیلی جلا کر ڈال دی، یا سگریٹ بیڑی کا ٹکڑا جلتا ہوا پھینک دیا اور فرش یا دری جل گئی تو اس کو تاوان دینا پڑے گا، غرض یہ کہ غلط استعمال سے یا قصد و ارادہ سے جو چیز خراب کی جائے گی اس کا تاوان لیا جائے گا[1]

(۴) جتنے دن کے لئے عاریت لی ہے، اس کے بعد فوراً واپس کر دینی چاہیئے، اگر اس نے واپس کرنے میں دیر کی اور وہ چیز غائب ہوگئی یا ٹوٹ پھوٹ گئی تو نقصان کی قیمت اس کو

---

[1] اذا حصلت من المستعیر تعدی او تقصیر بحق العاریۃ ثم ھلکت او نقصت یلزم المستعیر الضمان (المجلہ ص۱۲۷)۔

دینی پڑے گی۔

(۵) جو چیز مانگ کر لائی گئی ہے، اس کو اپنے ہی استعمال میں لانا چاہیئے، دوسرے کو نہ دینا چاہیئے، البتہ اگر مالک نے دوسرے کو دینے کی اجازت دے دی ہے یا اس سے ایسے تعلقات ہیں کہ اگر دے دی جائے گی تو اس کو برا نہ معلوم ہوگا تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر اس نے منع کر دیا ہو کہ یہ چیز کسی دوسرے کو نہ دی جائے تو پھر دینا گناہ بھی ہے، اگر وہ چیز نقصان ہوگی تو اس کا معاوضہ بھی مستعیر کو دینا پڑے گا[1]

(۶) اگر معیر یعنی منگنی دینے والے نے وقت، جگہ یا طریقۂ استعمال کی کوئی قید نہ لگائی ہو، تو مستعیر یعنی عاریت لینے والے کو اختیار ہے کہ وہ جس وقت تک چاہے اور جس طرح چاہے استعمال کرے، اس صورت میں اگر کوئی نقصان ہوگا تو مستعیر پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اگر عام طور پر جس طرح وہ چیز استعمال کی جاتی ہے، اس کے خلاف استعمال کرے گا، تو اجازت کے باوجود تاوان دینا پڑے گا، مثلاً کسی نے کسی سے سائیکل یا موٹر منگنی مانگی، اس کو مجمع میں بے تحاشہ یا اس رفتار سے زیادہ تیز چلانا شروع کر دیا جو عام طور پر اس کی مقرر ہے، اور وہ ٹکرا گئی تو اس کے نقصان کی ذمہ داری مستعیر پر ہوگی، اسی طرح اس سے ٹکرا کر جس دوسری چیز کا نقصان ہوگا، اس کی ذمہ داری بھی اسی پر ہوگی، مثلاً کسی کو چوٹ لگ گئی، یا کسی کا کوئی مالی نقصان ہو گیا تو اس کا تاوان اسی کو دینا پڑے گا، اسی طرح کسی سے پلنگ کی چادر مانگی اور اس کا دسترخوان بنا دیا اور اس پر شوربے یا کسی چیز کا ایسا دھبہ لگ گیا، جس سے اس کی قیمت گھٹ گئی تو اس کی ذمہ داری مستعیر پر ہوگی، غرض یہ کہ جو چیز عام طور پر جس طریقہ سے یا جس کام کے لئے استعمال کی جاتی ہے، اس کو اس کے خلاف استعمال کرے گا تو تاوان پڑے گا[2]

---

[1] الا انہ ان کان المعیر نہی المستعیر ان یعطیہ لغیرہ۔ (المجلہ ص ۱۲۷)

[2] یعتبر تعین المنتفع فی اعارۃ الاشیاء اللتی تختلف باختلاف المستعملین ولا یعتبر فی اعارۃ الاشیاء اللتی لا تختلف بہ، المجلہ ص ۱۲۹ ولہ ان یعیرہ اذا کان لا یختلف باختلاف المستعملین ہدایہ ج ۳ ص ۲۶۴

(۷) اسی طرح اگر آپ نے کوئی چیز اپنے استعمال کے لئے منگائی اور معیر نے دوسرے کو دینے یا برتنے سے منع نہیں کیا یا آپ سے کسی دوسرے نے کوئی چیز مانگی اور آپ نے دوسرے کے برتنے اور استعمال کرنیسے صراحۃً منع نہیں کیا تو اس کی دو صورتیں ہیں کہ اگر عاریت کی چیز ایسی ہے کہ دوسروں کے استعمال سے اس میں کوئی خاص فرق نہیں آتا، مثلاً مکان، برتن، گلاس، چمچے، تخت وغیرہ تو اس کو دوسرے کو دے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اس صورت میں اس پر تاوان کی ذمہ داری نہیں ہوگی، لیکن اگر وہ ایسی چیز ہو کہ دوسرے کے استعمال سے اس میں فرق آجاتا ہے تو پھر دینا جائز نہیں ہے، مثلاً گھڑی، فاونٹن پن، موٹر سائیکل، یا کوئی اور سواری، کپڑا، جوتہ، چھتری وغیرہ - یہ چیزیں ایسی ہیں کہ کئی ہاتھوں میں جانے سے خراب ہو جاتی ہیں، اس لئے ایسی تمام چیزوں کو دوسرے کو نہ دینا چاہیئے بلکہ خود ہی استعمال کرنا چاہیئے، اگر دے گا اور خراب ہوگی یا گم ہوگی تو اس کا تاوان دینا پڑے گا۔ المجلہ ص۱۲۹۔

(۸) اگر معیر کی ہدایت کے خلاف مستعیر اس کو استعمال کرے گا، تو اس پر تاوان ہوگا۔

(۹) اگر کسی نے عورت سے کوئی ایسی چیز مستعار مانگی جو اس کے شوہر کی ہے اور عورت نے شوہر سے پوچھے بغیر دے دیا تو اگر وہ ایسی چیز ہے جو گھر کے اندر ہی رہتی ہے اور عموماً عورت ہی کے قبضہ میں رہتی ہے، مثلاً جنس، نمک، زیور، تیل گھی، شکر، برتن وغیرہ تو ان چیزوں کو بھی عورت کو بغیر شوہر کی اجازت کے دینا تو نہ چاہیئے، لیکن اگر اس نے دے دیا اور وہ چیز ضائع ہوگئی تو پھر عورت پر یا مستعیر پر کوئی تاوان عائد نہیں کیا جا سکتا، لیکن اگر یہ چیز ایسی ہے جو گھر کے باہر رہتی ہے اور عموماً عورتوں سے ان کا تعلق نہیں ہوتا، مثلاً جانور، مردانے مکان کا فرنیچر، سواری وغیرہ، تو ان چیزوں کے ضائع ہونے کی صورت میں شوہر یعنی مالک کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہے عورت سے تاوان لے یا مستعیر سے [۱]

---

[۱] اذا کان ذالك الشئ بما هو داخل البیت فی ید الزوجة عادة لا یضمن الزوجة ولا المستعیر وان لم یکن ذالك الشئ من الاشیاء اللتی لا یکون فی ید النساء کالفرس فالزوج مخیر ان شاء ضمنه لزوجه او للمستعیر۔ (المجلہ ص۱۲۹)

کھانے پینے پر جو کچھ خرچ ہوگا، اس کو برداشت کرنا پڑے گا، یا مکان عاریۃً لیا تو جب تک رہے گا اس کی مرمت مستعیر کے ذمہ ہوگی [۱]

(۹) مستعیر، مستعار چیز کو نہ تو بیچ سکتا ہے نہ رہن رکھ سکتا ہے، اور نہ کرایہ پر چلا سکتا ہے، البتہ اگر کوئی ضرورت ہو تو دوسرے کسی کے یہاں اس کو بطور امانت رکھ سکتا ہے، مثلاً کسی نے ہتھ پھیر روپیہ لیا، اور کسی کے یہاں امانت رکھ دیا تو اگر وہ اتفاق سے ضائع ہوگئے تو اس پر اس کا تاوان عائد نہیں ہوگا، لیکن اگر اس کی غلطی سے یا امین کی غلطی سے روپے ضائع ہوئے ہیں تو تاوان عائد ہوگا [۲] البتہ معیر کی اجازت سے تصرف کر سکتا ہے۔

(۱۰) عاریت کی مدت ختم ہونے کے بعد فوراً چیز واپس کر دینی چاہیئے، اگر واپس نہ کی تو اس مدت میں جو نقصان ہوگا اس کی ذمہ داری مستعیر پر ہوگی [۳]

(۱۱) عاریت کی چیز خود جا کر واپس کرنی چاہیئے، یا اپنے معتبر آدمی کے ذریعہ واپس کرنی چاہیئے، اگر اس نے کسی دوسرے کے ذریعہ بھیجا اور خراب ہوگئی یا ضائع ہوگئی تو اس کو تاوان دینا ہوگا [۴]

(۱۲) عاریت کی چیز کے لے جانے اور اس کے واپس کرنے میں جو کچھ مصارف پڑیں گے وہ سب مستعیر کو برداشت کرنے ہوں گے [۵]

(۱۳) اگر کسی نے کوئی زمین باغ لگانے یا مکان بنانے کے لئے عاریت لی تو معیر جب چاہے اس سے خالی کرا سکتا ہے، مستعیر کو چھوڑنا پڑے گا، البتہ اگر کوئی مدت متعین کر دی ہے تو اس صورت

---

[۱] نفقه المستعار علی المستعیر ص ۱۲۸۔

[۲] لیس للمستعیر ان یواجر العاریة ولا ان یرھنھا بدون اذن المعیر ص ۱۳۱۔

[۳] المجله ص ۱۳۰۔

[۴] المستعیر یرد العاریة الی المعیر بنفسه او علی ید امینه وان ردھا علی ید غیر امینه فھلکت صار ضامنا۔ المجله ص ۱۳۰۔

[۵] مصارف رد العاریة علی المستعیر۔ المجله ص ۱۳۰۔

میں بھی معیر کو اپنی زمین کو خالی کرانے کا اختیار رہوگا، مگر قبل از وقت اس کے خالی کرانے کا جو نقصان مستعیر کو ہوگا معیر اس کا معاوضہ مستعیر کو ادا کرے گا، مثلاً دس برس کے لئے کسی نے کسی کو باغ لگانے کے لئے زمین دی، اور پانچ ہی برس میں معیر کو اس کی ضرورت پیش آگئی تو مستعیر کو چاہیئے کہ درخت کاٹ لے اور زمین خالی کر دے، اب اگر دس برس باغ رہتا تو اس کے درختوں کی قیمت پانچ سو روپے ہوتی، اور جس وقت خالی کر رہا ہے، اس وقت اس کی قیمت دو سو روپے ہے تو یہ تین سو روپے معیر کو نقصان کے معاوضہ میں دینے پڑیں گے، اور اگر معیر درخت بھی لینا چاہے، اور مستعیر دینا بھی چاہے تو اس کی جو قیمت ہوگی وہ پوری قیمت دینی پڑے گی [1]

(۱۴) لیکن اگر کسی کو کھیت جوتنے بونے کے لئے عاریۃً دیا تو اس میں مدّت مقرر ہو یا نہ ہو، جب تک فصل کٹ نہیں جاتی وہ خالی نہیں کرا سکتا [2]

ہبہ اور ہدیہ

عاریت کی طرح ہبہ، ہدیہ اور صدقہ بھی غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کا ایک بہترین طریقہ ہے، کتاب و سُنّت میں اس کی بے حد ترغیب آئی ہے، صدقہ کا بیان

---

[1] استعارۃ الارض لغرس الاشجار والبناء علیہا صحیحۃ یکن للمعیر یرجع بالاعارۃ متی شاء فاذا رجع لزم المستعیر قلع الاشجار ورفع البناء ثم اذا کانت موقتۃ فرجع المعیر قبل مضی الوقت ضمن للمستعیر تفاوت قیمتہا بین وقت القلع وانتہاء مدۃ الاعارۃ۔ المجلہ ص۱۳۱۔

[2] اذا کانت اعارۃ الارض للزارع سواءً کانت موقتۃ او غیر موقتۃ لیس للمعیر ان یرجع بالاعارۃ قبل وقت الحصاد ص۱۳۱۔

زکوٰۃ کے سلسلہ میں اوپر آچکا ہے جس میں تفصیل سے یہ بات بتائی جاچکی ہے کہ اسلامی شریعت نے اس کی کتنی ترغیب دی ہے، خاص طور پر ہدیہ اور عطیہ کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آپس میں ہدیے اور عطیے بھیجا کرو، اس سے محبت بڑھتی ہے، اور دلوں کی کدورت دور ہوتی ہے"۔ تہادوا تحابوا۔ (ترمذی الادب المفرد)

آپ نے فرمایا کہ ہدیہ خواہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ بھیجا جائے، اس کو قبول کر لینا چاہیئے اور اسی طرح معمولی عطیہ کے بھیجنے میں بھی شرم محسوس نہیں کرنی چاہیئے، آپ نے فرمایا کہ اگر مجھے کوئی گوشت کا ایک ٹکڑا یا کھر بھی بھیجے تو میں اسے بخوشی قبول کر لوں گا۔ (مسند احمد و ترمذی)

ہدیہ کا بدلہ

ایک آدمی جب کسی کو کوئی ہدیہ بھیجے یا کوئی چیز ہبہ یا صدقہ کر دے، تو اس کو اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہ کہنی چاہیئے اور نہ کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے کہ دوسرا شخص یہ محسوس کرے کہ وہ احسان جتا رہا ہے یا اس کا اظہار چاہتا ہے، قرآن و حدیث میں اس کی بڑی مذمت آئی ہے، قرآن میں کہا گیا ہے کہ "احسان دھرنے والے یا دکھاوا کرنے والے شخص کے عمل کی مثال اس چٹان کی ہے، جس پر مٹی جمی ہوتی ہے، مگر ایک ایک ہلکی سی بارش سے دھل جاتی ہے، ایسا شخص نہ تو خدا پر ایمان رکھتا ہے اور نہ آخرت پر"[1]۔ حدیث میں کہا گیا ہے کہ "قیامت کے دن جو لوگ رحمتِ الٰہی کے سایہ سے دور ہوں گے، ان میں احسان جتانے والا بھی ہے"۔ غرض یہ کہ نمود و نمائش اور احسان جتانے کے لئے کسی کو ہدیہ و صدقہ نہ دے مگر اسی کے ساتھ جس کو ہدیہ دیا گیا ہے اس کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ بھی اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق ہدیہ، صدقہ اور ہبہ کا بدلہ چکائے، اگر وہ کوئی چیز نہیں دے سکتا تو کم از کم زبان سے اس کا شکریہ ہی ادا کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کو کوئی ہدیہ دیا جاتا ہے، اس کو بھی چاہیئے کہ وہ اس کا بدلہ چکائے، اگر وہ اس کی قدرت نہیں رکھتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ اس کی تعریف اور شکریہ ادا کرے، اور اگر کسی نے یہ بھی نہ کیا، تو

---

[1] لَا تُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى۔ (سورہ بقرہ، رکوع ۳۵)

احسان ناشناسی اور کفرانِ نعمت کیا ہے[1]

غیر مسلم کو ہدیہ دیا بھی جاسکتا ہے اور اس سے لیا بھی جاسکتا ہے

جس طرح تمام معاملات میں جب تک کہ حرام و حلال کی کوئی حد نہ ٹوٹے مسلم و غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں ہے، اسی طرح مسلم و غیر مسلم کے ہدیہ میں بھی کوئی فرق نہیں ہے، اس سے ہدیہ لیا بھی جاسکتا ہے اور دیا بھی جاسکتا ہے، خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کا ہدیہ قبول فرمایا ہے قرآن پاک میں بھی اس کی صراحت موجود ہے:۔

لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ (الممتحنہ)

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں نہ تو لڑائی کی اور نہ تم کو گھر سے نکالا، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

ہبہ، ہدیہ اور عاریت میں فرق

عاریت میں جو چیز یا روپیہ پیسہ کسی کو دیا جاتا ہے اس میں واپسی کی شرط ہوتی ہے، یعنی مستعیر اتنی مدت کے لئے اس چیز کا مالک نہیں، بلکہ امین ہو جاتا ہے، مگر بطورِ ہبہ یا بطورِ ہدیہ وصدقہ جو چیز یا جو رقم کسی کو دی جاتی ہے وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے، اب ہبہ کرنے والے یا ہدیہ کرنے والے یا صدقہ کرنے والے کو اس کے واپس لینے کا اختیار نہیں ہوتا، اگر وہ واپس کر لینا چاہتا ہے تو بعض صورتوں میں قانوناً دوبارہ وہ چیز اس کو مل جائے گی، مگر ایسا کرنا اخلاقی اعتبار سے بڑا گناہ ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص ہبہ، ہدیہ یا صدقہ دے کر

---

[1] من اعطا عطاءً فوجد فليجز به ومن لم يجد فليثن فان من اثنى فقد شكر ومن كتم كفر۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد و ترمذی)

واپس لے لیتا ہے، اس کی مثال اس کتے کی ہے جو پیٹ بھر کھانے کے بعد قے کر دیتا ہے اور پھر اسی قے کو دوبارہ نگل لیتا ہے[1] اس لئے آدمی کو دینے سے پہلے دینے یا نہ دینے کے بارے میں خود سوچ سمجھ لینا چاہیئے تاکہ بعد میں اس کو نہ تو ندامت ہو اور نہ واپسی کی ضرورت محسوس کرے، اگر واقعی کسی دی ہوئی چیز کی واپسی کی ضرورت ہی پیش آجائے تو شریعت میں اس کی اجازت ہے کہ وہ واپس لے لے، اس تمہید کے بعد اس کی قانونی تفصیل لکھی جاتی ہے۔

ہبہ، ہدیہ اور صدقہ میں دوسرا فرق ہے
ہبہ، ہدیہ اور صدقہ کا اس حیثیت سے تو ایک ہی حکم ہے کہ ان کے ذریعہ آدمی اپنی کسی چیز کا دوسرے کو مالک بنا دیتا ہے اور پھر عام حالت میں اس کی واپسی کا اختیار اس کو باقی نہیں رہتا، لیکن ان میں سے ہر ایک میں دینے کا جذبہ کچھ مختلف ہوتا ہے یا مختلف ہونا چاہیئے، اس لئے تھوڑا سا فرق ہے، ورنہ نتیجہ کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ہدیہ کی تعریف
ہدیہ اس چیز کو کہتے ہیں جو آدمی کسی کی عزت افزائی اور محبت کے جذبہ سے اس کے پاس بھیجتا ہے۔[2]

صدقہ کی تعریف
صدقہ وخیرات اس مال یا چیز کو کہتے ہیں، جو کسی کو محض ثواب کی خاطر دیا جائے[3]

ہبہ کی تعریف
ہبہ کے لفظی معنی دینے کے ہیں اور اسلامی شریعت میں بغیر کسی معاوضہ کے اپنی کسی چیز یا کسی مال کو دوسرے کی ملکیت میں دینے کا نام ہبہ ہے[4]

نوٹ
صدقہ کی تعریف میں جو یہ کہا گیا ہے کہ وہ محض ثواب کی خاطر دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہبہ اور ہدیہ میں ثواب نہیں ملتا، اگر کوئی شخص ہدیہ

---

[1] یہ روایت بخاری مسلم، ابوداؤد وغیرہ میں آئی ہے، کسی روایت میں ہبہ کا لفظ ہے، کسی میں صدقہ کا، اور کسی میں عطیہ وہدیہ کا۔ ان سب الفاظ کو جمع کر کے اس کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

[2] الهدية هي المال الذي ارسل لاحد اكراما له المجلہ ص۱۳۳۔ [3] الصدقة هي المال الذي وهب لاحد لاجل الثواب ص۱۳۳۔ [4] الهبة هي تمليك مال لآخر بلا عوض المجلہ ص۱۳۳۔

وہبہ بھی ثواب کی نیت سے کرے تو اس کو بھی ثواب ملے گا، یہاں یہ بات صرف اس لئے کہی گئی ہے کہ صدقہ دیتے وقت محض یہی جذبہ ہوتا ہے، یا یہی جذبہ ہونا چاہیئے، اس نیت کے بغیر وہ صدقہ نہیں کہا جائے گا، ورنہ حقیقتاً صدقہ اور ہدیہ تو خود ہی ہبہ کی دو قسمیں ہیں، البتہ صدقہ کی واپسی کسی حال میں جائز نہیں[1]، اس لئے کہ اس کا عوض اسے مل چکا ہے، اس لئے وہ چیز اس کی ملکیت سے نکل گئی[2]

ہبہ کی اصطلاحات

ہبہ کرنے والے کو واہب اور جس کو ہبہ کیا جائے اس کو موہوب لہ اور جو چیز ہبہ کی جائے اس کو موہوب کہتے ہیں۔

ہبہ کے ارکان وشرائط

(۱) ہبہ کے لئے ایجاب وقبول اور قبضہ کا ہونا ضروری ہے ایجاب سے مراد یہ ہے کہ واہب اپنی رضامندی سے کوئی چیز دے اور موہوب لہ خوشی سے اسے قبول کر کے اس پر قبضہ کر لے تو ہبہ ہو گیا[3]، اب وہ چیز واہب یعنی دینے والے کی ملک سے نکل کر موہوب لہ یعنی پانے والے کے ملک میں آگئی، مقصد یہ ہے کہ ہبہ کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے، (۱) ایجاب (۲) قبول (۳) قبول کرنے والے کا قبضہ۔

(۲) ایجاب وقبول میں ہبہ کا لفظ صراحتہً کہنا ضروری نہیں ہے، بلکہ جس لفظ یا جس طرز عمل سے بھی ملکیت ہو جاتی ہو وہ ایجاب وقبول شمار کیا جائے گا، مثلاً کسی نے کہا کہ میں اپنی یہ کتاب آپ کو ہدیہ دے رہا ہوں اور آپ نے شکریہ ادا کر کے لے لیا تو یہ چیز ہبہ ہو گئی یا آپ نے کچھ نہیں کہا اور لے لیا تو بھی وہ چیز آپ کی ملکیت میں آگئی، یا آپ نے کوئی چیز کسی اپنے دوست سے مانگی اور اس نے بخوشی دے دی تو یہ چیز ہبہ ہو گئی، مگر حتی الامکان کسی سے

---

[1] ہدایہ ج ۳ ص ۲۷۷، لایصح الرجوع من الصدقة بعد القبض۔

[2] شرح وقایہ ج ۳ ص ۲۸۹۔

[3] تصح بالایجاب والقبول والقبض قبضہ کی شرط اس حدیث نبوی ﷺ کی بنا پر لگائی گئی ہے، جس میں ہے لا تجوز الهبة الا مقبوضة۔ مصنف عبدالرزاق۔

کوئی چیز بطور ہبہ یا ہدیہ مانگنی نہ چاہیئے، عاریۃً مانگنے میں کوئی حرج نہیں ہے[1]

(۳) اسی طرح کسی نے کپڑا خریدا یا زیور بنوایا اور اپنی بیوی سے کہا کہ اس کپڑے میں سے اپنے لئے ایک جوڑا بنوالو، یا یہ زیور پہن ڈالو تو یہ ہبہ ہو گیا، اب یہ چیز عورت کی ملک ہوگئی، اب کسی ناراضگی کے وقت اس کو واپس لینا گناہ ہے[2]

(۴) واہب کا عاقل اور بالغ ہونا ضروری ہے، اگر کوئی نابالغ بچہ کوئی چیز ہبہ کر دے تو اس کے والدین یا اس کے مربّی واپس لے سکتے ہیں[3]

(۵) ہبہ میں واہب کی رضامندی ضروری ہے، اگر اس کی رضامندی کے بغیر کوئی چیز زبردستی ہبہ کرالی گئی یا کسی سے زبردستی یا اصرار کرکے ہدیہ لیا گیا تو یہ صحیح نہیں ہے، ایسا کرنا گناہ ہے[4]

(۶) واہب نے جب ہبہ کی ہوئی چیز کو واضح الفاظ میں ہبہ کیا ہے، مثلاً یہ کہا ہے کہ یہ گھڑی میں آپ کو دیتا ہوں، آپ اسے لیجئے تو پھر موہوب لہ نے اسی وقت لے لیا یا بعد میں، دونوں جائز ہیں، لیکن اگر اس نے مبہم الفاظ میں کہا کہ میں یہ گھڑی آپ کو دوں گا یا دینا چاہتا ہوں، مگر یہ نہیں کہا کہ آپ لے لیجئے تو اس صورت میں اگر موہوب لہ اسی وقت اپنے قبضہ میں لے لے تو گھڑی اس کی ہوگئی، لیکن اگر اس نے اس وقت نہ لیا بلکہ دوسرے وقت اپنے قبضہ میں لے لیا تو یہ درست نہیں ہے، دوبارہ واہب سے اجازت لینی چاہیئے[5]

(۷) خریدار کو یہ حق ہے کہ اپنے مال پر قبضہ سے پہلے اس کو ہبہ کر دے۔ (المجلہ ص۱۲۵)

(۸) ہبہ یا ہدیہ کی ہوئی چیز کو قبضہ میں دے دینا ضروری ہے، اگر کوئی چیز دوسرے کے قبضہ میں ہے تو واہب کو چاہیئے کہ اس کے قبضہ سے نکال کر موہوب لہ کے حوالہ کر دے۔

---

[1] والتعبیرات تدل علی التملیک مجاناً ایجاب للهبة تنعقد الهبة بالتعاطی المجلہ ص۱۳۴

[2] کاعطاء الزوج زوجته اللتی قرطاً او قلباً وقوله خذی هذا او علقیه المجلہ ص۱۳۴۔ [3] یشترط ان یکون الواهب عاقلاً بالغاً ص۱۳۶۔ [4] یلزم فی الهبة رضاء الواهب ص۱۳۶۔

[5] یلزم ان یکون الموهوب معلوماً ومعیناً واما اذنه بالقبض دلالة فمقید بالمجلس ص۱۳۵۔

(۹) جو مال کسی کے قبضہ میں ہو اسی کو وہ ہبہ کر دیا گیا، تو ہبہ ہو گیا، واہب کو اب اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ دوبارہ اس پر قبضہ بھی دلا دے۔ (المجلہ ص۱۳۵)

(۱۰) اگر کسی نے اپنا قرض یا مطالبہ ہبہ کر دیا اور مقروض یا مدیون نے اسے قبول کر لیا تو اب مدیون و مقروض کے سر سے قرض اتر گیا اب واہب قرض کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ (المجلہ ص۱۳۵)

(۱۱) اگر موہوب یعنی جو چیز ہبہ کی گئی ہے، اس پر قبضہ سے پہلے واہب یا موہوب لہ مر جائے تو ہبہ باطل ہو گیا، کیونکہ ہبہ قبضہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، یعنی واہب کی ملکیت سے وہ چیز موہوب لہ کے قبضہ کے بغیر نہیں نکلتی اور قبضہ سے پہلے ہی جب وہ مر گیا تو اب اس کے مالک اس کے ورثہ ہو گئے، اس کا حق موت سے جاتا رہا، اب ورثہ کو اختیار رہے کہ وہ دیں یا نہ دیں۔ اسی طرح ہبہ چونکہ قبضہ سے مکمل ہوتا ہے، اور قبضہ سے پہلے جب موہوب لہ مر گیا تو اب اس پر قبضہ کون کرے گا۔ (المجلہ ص۱۳۵)

(۱۲) نابالغ بچے خود ہبہ تو نہیں کر سکتے مگر خود ان کو ہبہ کیا جا سکتا ہے۔

بچوں کو ہبہ

اگر باپ دادا اپنے لڑکے یا پوتے کو کوئی چیز یہ کہہ کر دیں کہ یہ چیز میں تم کو دیتا ہوں تو بس دے دینے سے وہ چیز لڑکے کی ملک ہو گئی، اب واپس لینا درست نہیں ہے، اسی طرح اگر کوئی بھائی یا بہن اپنے چھوٹے بھائی بہن کو کوئی چیز دے دے تو وہ اس کی ملک ہو گئی، مثلاً کسی نے اپنے چھوٹے بچہ کو کپڑا بنوایا، اس کے لئے کتاب اور قلم خریدا، تو یہ چیزیں اس کی ہو گئیں، اب باپ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ چیزیں اپنے دوسرے بچوں کو دے دے، لیکن اگر یہ چیزیں خرید کر کسی خاص بچے کو دی نہیں، یا یہ کہہ دیا کہ سب لوگ استعمال کریں تو پھر وہ کسی کی ملک نہیں ہو گی۔[1]

(۱۳) لوگ چھوٹے ناسمجھ بچوں کو عیدی یا عقیقہ، ختنہ وغیرہ کے موقع پر انعام وغیرہ کے نام سے جو روپیہ پیسہ یا کوئی چیز دے دیا کرتے ہیں، اس سے مقصود بچوں کو دینا نہیں ہوتا، بلکہ ماں باپ ہی کو دینا ہوتا ہے، مگر اتنی کم رقم وہ ان کو براہِ راست دے دینا مناسب نہیں سمجھتے اسی لئے

---

[1] یملك الصغير المال الذی وهبه ابا هو وصيه اومربيه المجلہ ص۱۳۵ اذا وهب احد شيئاً لطفل تتم الهبة بقبض وليه او مربيه ص۱۳۵۔

بچہ کے بہانے سے دے دیتے ہیں تو ایسی تمام چیزیں والدین کی ملک سمجھی جائیں گی، بچوں کی نہیں، لیکن اگر کسی نے صراحۃً یہ کہہ کر دیا کہ یہ بچے ہی کو دے رہا ہوں، اگر بچہ سمجھ دار ہے تو اس کی دو صورت ہے، اس کا قبضہ کر لینا کافی ہے، یہ چیز اس کی ملک ہوگئی اور اگر وہ ناسمجھ ہے تو پھر اس کے باپ یا دادا کا قبضہ کر لینا کافی ہے، اگر وہ نہ ہوں تو وہ بچہ جس کی پرورش میں ہو اس کا قبضہ کر لینا کافی ہے، لیکن ان دونوں صورتوں میں باپ دادا یا اس کے مربّی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس چیز کو اپنے استعمال میں لے آئیں۔

غرض یہ کہ جو چیز نابالغ یا بالغ بیٹے کی ملک ہوگئی، اس کو اسی کے کام میں لگایا جائے کسی دوسرے بچہ کو نہ دی جائے[1]

(۱۴) اپنے لڑکوں کو اگر کوئی چیز ہبہ کرنی ہو تو سب کو برابر دینا چاہیئے، یعنی لڑکے، لڑکی سب کو برابر دینا چاہیئے، عموماً گھروں میں لڑکوں کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے اور لڑکیوں کا کم، یہ صحیح نہیں ہے، امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ... تینوں اماموں کا یہی مسلک ہے، البتہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ جس طرح وراثت تقسیم ہوتی ہے اسی طرح ہبہ بھی کرنا چاہیئے یعنی لڑکوں کو دو حصّہ اور لڑکیوں کو ایک حصّہ[2]

(۱۵) ہبہ میں مدت کی تعیین صحیح نہیں ہے، مثلاً کسی نے یہ کہا کہ ایک ماہ میں یا ایک سال کے لئے میں فلاں چیز ہبہ کرتا ہوں، تو یہ ہبہ ناجائز ہے[3]

---

[1] الهدایا اللتی ترد فی عرس الختان والزفاف هی لمن ترد باسمه من المختون والوالد والوالدة المجلہ ص۱۳۵۔ [2] ائمہ ثلثہ حضرت نعمان بن بشیر کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں یہ ہے کہ نعمان کے والد بشیر نے ان کو اپنی کچھ جائداد ہبہ کرنی چاہی اور خدمتِ نبوی میں پہونچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصدیق چاہی آپ نے فرمایا کہ اکل ولدك نحلته مثل هذا۔ کیا تم نے اپنے سارے بچوں کو اتنا ہی ہبہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں آپ نے ناگواری کے انداز میں فرمایا کہ جاؤ کسی اور کو اس پر گواہ بناؤ، دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو (بخاری ومسلم بحوالہ المنتقیٰ ج ۲ ص۴۲۹) امام احمدؒ نے قرآن پاک کی آیت للذکر مثل حظ الانثیین کے پیش نظر یہ رائے دی ہے۔ [3] الهبة المضافة لیست صحیحة ص۱۳۵۔

(۱۶) ہبہ میں واہب نے اگر عوض یا فائدہ کی شرط لگادی تو یہ صحیح ہے، مثلاً اس نے کہا کہ میں یہ مکان تمہیں دیتا ہوں، مگر میں بھی اسی میں رہوں گا، یا اس کے بدلے میرا فلاں قرض تم ادا کر دو، یا فلاں زمین میں اس شرط پر ہبہ کرتا ہوں کہ تم زندگی بھر میرے کھانے کپڑے کے ذمہ دار رہو، تو یہ ہبہ درست ہے، اب اگر مشروط ہبہ میں واہب کو کچھ دن بعد یہ خیال ہوا کہ ہبہ غلط ہوا ہے تو اس کی وہ شرط جب تک پوری ہوتی رہے گی، اس کو ہبہ سے رجوع کرنے کا حق نہیں ہوگا، البتہ اگر وہ شرط پوری نہ ہو تو وہ رجوع کر سکتا ہے [۱]

(۱۷) جو چیز ہبہ کی جائے، اس کا موجود ہونا ضروری ہے، اگر وہ ابھی وجود میں نہیں آئی ہے تو پھر یہ ہبہ ناجائز ہے، مثلاً کسی نے کہا کہ اس کھیت میں جو کچھ پیدا ہوگا، وہ میں ہبہ کرتا ہوں، یا باغ میں آئندہ سال جو پھل آئیں گے یا اس جانور سے جو بچے پیدا ہوں گے وہ میں ہبہ کرتا ہوں تو یہ ناجائز ہے [۲]

(۱۸) جو چیز ہبہ کی جائے وہ واہب کی ملکیت ہونی ضروری ہے، دوسرے کی چیز اگر کسی کو دے دی گئی تو یہ دینا ناجائز ہے۔ (المجلہ ص ۱۳۵)

(۱۹) موہوب یعنی جو چیز ہبہ کی جائے، اس کی تعیین ضروری ہے، مثلاً کسی کے پاس چند سائیکلیں یا چند گھڑیاں یا چند جانور ہیں، تو ان میں سے اگر کسی کو ہبہ کرنا چاہے تو اس کو متعین طور پر بتادے کہ یہ فلاں سائیکل یا فلاں جانور یا فلاں گھڑی میں آپ کو دیتا ہوں، اگر کسی سے یہ کہا کہ ایک سائیکل لے لیجئے تو صحیح نہیں ہے، البتہ اگر یہ کہا کہ جو چاہے لے لیجئے تو پھر موہوب لہ اپنی پسند سے جو چاہے لے سکتا ہے، لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ وہ اسی وقت لے لے، اگر وہ چلا گیا اور پھر آیا تو اب اس کو دوبارہ واہب سے اجازت لینی پڑے گی [۳]

ہبہ اور ہدیہ کی واپسی

اوپر ذکر آچکا ہے کہ دی ہوئی چیز کو واپس لینا گناہ ہے لیکن کسی کا شدید نقصان ہو رہا ہو تو بعض صورتوں میں موہوب

---

[۱] تصح الهبة بشرط عوض ويعتبر الشرط ص ۱۳۵ ۔ [۲] یشترط وجود الموهوب فی وقت الهبة ص ۱۳۶ المجلہ
امام احمدؒ معلوم اور مجہول سب ہی میں ہبہ جائز سمجھتے ہیں۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۳ ص ۲۹۲ ۔

[۳] یلزم ان یکون الموهوب معلوماً ومعیناً المجلہ ص ۱۳۶ ۔

چیز واپس لے سکتا ہے، وہ صورتیں یہ ہیں۔

(۱) واہب نے کوئی چیز ہبہ کی مگر موہوب لہ نے ابھی اس پر قبضہ نہیں کیا ہے، تو اگرچہ دیانتہً وہ اخلاقاً ایسا کرنا مناسب نہیں ہے مگر قانوناً وہ اپنے ہبہ کو واپس لے سکتا ہے، اگر اس نے ہبہ کے بعد موہوب لہ سے کہہ دیا کہ آپ اس کو نہ لیجئے گا تو گویا اس نے ہبہ سے رجوع کر لیا۔

(۲) قبضہ کے بعد ہبہ کی واپسی کی دو صورت ہے، ایک یہ کہ موہوب لہ خوشی سے واپس کر دے، اگر موہوب لہ خوشی سے واپس نہ کرے تو اگر وہ اجنبی شخص ہے تو پھر واہب قانونی چارہ جوئی کر کے واپس کرا سکتا ہے، اگر دوسرے قانونی موانع نہ ہوں گے تو اسلامی عدلیہ اس ہبہ کو فسخ کر دے گی[1] یہ واپسی قانوناً تو ہو جائے گی مگر دیانتہً اس میں کراہت باقی رہے گی[2]

جن صورتوں میں ہبہ کی واپسی نہیں ہو سکتی

وہ صورتیں اور موانع جن کی موجودگی میں ہبہ کی ہوئی چیز واپس نہیں ہو سکتی، حسب ذیل ہیں۔

(۱) اگر کسی نے اپنے ماں، باپ، دادا، دادی، بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسا، نواسی، بھائی، بہن، بھانجے، پھوپھی، پھوپھا، چچا وغیرہ کو کچھ دیا تو واپسی کا حق نہیں ہے، یعنی جن لوگوں سے خون کا رشتہ بھی ہو اور نکاح کرنا بھی حرام ہو، ان میں سے کسی کو اگر کوئی چیز دے دی گئی تو پھر واپس لینے کا حق نہیں ہے[3] اب اگر کسی نے اپنے رضاعی بھائی بہن، ساس سسر کو

---

[1] و لا یصح الرجوع الا بتراضیهما او بحکم الحاکم اذا وهب هبة لاجنبی فله الرجوع هدایہ ج ۳ ص ۲۷۳۔ [2] اما الکراهة فلازمة ہدایہ ج ۳ ص ۲۷۴، ایسا اس لئے ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہبہ کی واپسی کو ناپسند فرمایا ہے۔ ائمہ ثلثہ باپ کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ ہبہ کی ہوئی چیز اپنے لڑکے یا لڑکی سے واپس لے ورنہ عام حالت میں وہ ہبہ کی واپسی کے قائل نہیں ہیں، لیکن اس کی واپسی میں بنیادی شرط ان کی بہی خواہی اور ثواب آخرت ہے یعنی واپسی میں اولاد کی بہی خواہی کا جذبہ ہو، یا اس سے کسی کا حق جا رہا ہو تو ثواب آخرت کے لحاظ سے واپسی ضروری ہے۔

[3] اذا وهب هبة لذی رحم محرم منه لم یرجع فیها من وهب لاصوله وفروعه او لاخیه او اخته او لاولادهما او لعمه ولعمته فلیس له الرجوع المجلہ ص ۱۳۷۔

کوئی چیز دی تو اخلاقاً تو واپس نہ لینا چاہیئے مگر قانوناً ان سے واپس لے سکتا ہے کیونکہ ان سے نکاح تو حرام ہے مگر خون کا راشتہ حرام نہیں ہے۔

اگر بیوی نے شوہر کو یا شوہر نے بیوی کو کوئی چیز دی تو قبضہ کے بعد پھر واپسی کا حق نہیں ہے۔

اگر ہبہ کی ہوئی چیز میں موہوب لہ نے کوئی ایسا اضافہ کر دیا ہے جو اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا یا اس میں کوئی چیز بنالی ہے یا اس کی شکل و صورت تبدیل کر دی ہے تو پھر واہب کو واپسی کا حق نہیں ہے مثلاً کسی نے ایک جانور بطور ہبہ دیا اور ہبہ پانے والے نے اس کو کھلا پلا کر موٹا تازہ کیا تو چونکہ اس کے موٹاپے کو اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس کو واپس لینا صحیح نہیں ہے۔

اسی طرح کسی نے زمین ہبہ کی اور موہوب لہ یعنی ہبہ پانے والے نے اس میں مکان بنا لیا یا باغ لگا لیا تو اب ہبہ کی واپسی نہیں ہو سکتی، اس طرح اگر کسی نے گیہوں دیا اور اس نے پسوا لیا تو اب اس کی واپسی نہیں ہو سکتی لیکن اگر یہ زیادتی ایسی ہوئی ہے جو اصل چیز سے جدا ہے یا ہو سکتی ہے تو پھر وہ اصل چیز واپس ہو سکتی ہے، اور زیادتی موہوب لہ کی ہو گی۔ مثلاً کسی نے ایک بکری یا گائے کسی کو ہبہ کی اور بکری گائے نے بچے دیئے تو واہب اگر گائے یا بکری واپس لینا چاہے تو یہ گائے اور بکری تو واپس کر دی جائے گی، بچے موہوب لہ کے ہوں گے۔

اگر ہبہ کی ہوئی چیز کو موہوب لہ نے فروخت کر دیا تو اس کی واپسی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اگر ہبہ کی ہوئی چیز موہوب لہ کے پاس سے ضائع ہو گئی تو بھی واہب کو واپسی کا حق نہیں ہے۔

اگر واہب (یعنی دینے والا) یا موہوب لہ یعنی (لینے والا) مر جائے تو ہبہ کی واپسی اس کے ورثہ نہیں کر سکتے۔

ہدیہ و صدقہ

جو احکام ہبہ کی واپسی کے ہیں، وہی صدقہ و ہدیہ کے ہیں۔

ضروری ہدایات

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اگر موہوب لہ یعنی لینے والا رضامندی سے واپس کر دے تو پھر یہ چیز واپس ہو سکتی ہے مگر ایسا کرنا اخلاقاً درست نہیں ہے اس میں بڑا گناہ ہے لیکن اگر موہوب لہ یعنی لینے والا واپس کرنے پر راضی نہ ہو تو پھر واہب زبردستی نہیں کر سکتا، اس کے لیے اب ایک ہی صورت ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی عدلیہ (سول کورٹ) سے قانونی طور پر اس معاہدہ کو فسخ کرائے، اور جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں اس کو دوسرے غیر قانونی اور غیر اخلاقی طریقہ سے واپس لینے کی کوشش نہ کرنا چاہیے ورنہ دہرا گناہ ہو گا۔ ایک واپسی کا دوسرے غلط طریقہ پر واپسی کی کوشش کا۔

اجارہ یعنی اسلامی قانونِ اجرت

اوپر کفالت، ودیعت، عاریت اور ہبہ وغیرہ کا بیان ہوا ہے جس میں ایک شخص اپنی کوئی ذمہ داری بغیر کسی منفعت یا معاوضہ کے دوسرے پر ڈالتا ہے یا کوئی چیز دوسرے کو بغیر کسی عوض کے دیتا ہے، اب اس صورت کا بیان کیا جاتا ہے جس میں دونوں فریق ایک دوسرے سے فائدہ حاصل کرتے ہیں، اسی کو شریعت میں اجارہ کہتے ہیں، یہی چیز بیع وشرا اور خرید وفروخت میں بھی ہوتی ہے، مگر بیع وشرا اور اجارہ میں فرق یہ ہے کہ بیع وشرا میں دونوں طرف سے مال یا جنس کا لین دین ہوتا ہے، یعنی ایک طرف سے سودا ہوتا ہے، دوسری طرف کوئی قیمت یا جنس ہوتی ہے، مگر اجارہ میں ایک طرف مال ہوتا ہے دوسری طرف محنت، کام یا منفعت ہوتی ہے۔

اجارہ انسانی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے، انسان کو دنیا میں چاہے جتنے زیادہ ذرائع زندگی حاصل ہوں مگر زندگی کے بے شمار معاملات میں اسے دوسروں سے مدد لینی پڑتی ہے، مثلاً انسان کو مکان بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے پاس مکان بنانے کے لیے زمین، روپیہ پیسہ سب موجود ہے مگر وہ خود اپنی محنت سے مکان کی تعمیر نہیں کر سکتا، بلکہ اس کو کاریگر اور مزدور کی ضرورت ہوگی، اس کو تعمیر کے سامان اور دوسری چیزوں کی ضرورت ہوگی، اس کے پاس کپڑا موجود ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر طرح کا کپڑا وہ خود یا اس کے گھر والے سل سکتے ہوں، اسے کسی نہ کسی صورت میں درزی سے مدد لینی پڑے گی، میلے کپڑے وہ خود بھی دھو سکتا ہے اور پریس کر سکتا ہے، مگر بہت سے ایسے کپڑے ہیں جن کو دھلانے کے لیے اسے دھوبی کی ضرورت ہوتی ہے، یا لانڈری سے اسے مدد لینی پڑتی ہے، وہ اپنے وطن میں اپنے گھر میں رہتا ہے مگر جب وہ کسی کام سے سفر پر جاتا ہے یا اسے دوسری جگہ ملازمت یا کسی اور کام سے رکنا پڑتا ہے تو اسے ہوٹل کا کمرہ یا مستقل مکان کرایہ پر لینا پڑتا ہے، شریعت نے اسی طرح کی ضروریات کی تکمیل کے لیے اجارہ کی اجازت دی ہے، آپ دوسروں

سے کام لیں تو اس میں آپ کی اور کام کرنے والوں کی حیثیت کیا ہو، آپ ان سے کس طرح اور کتنا کام لیں اور اس کی اجرت کس طرح اور کتنی دیں، اگر آپ کرایہ پر کوئی سواری یا مکان یا کوئی چیز لیں تو اس کے استعمال اور کرایہ کے لینے دینے کے حدود کیا ہوں؟ یہ سب تفصیل آپ کو اجارہ کے بیان میں ملے گی۔

اجارہ کے معنی اور اس کی تعریف

اجارہ مصدر سماعی ہے، اور یہ ضَرَبَ یَضرِبُ اور نَصَرَ یَنصُرُ دونوں سے آتا ہے، اور باب اِفعال اور مفاعلۃ سے بھی آتا ہے، ان سب کے لغوی معنی جزار اور بدلہ اور ٹھکانا دینے اور اجرت دینے وغیرہ کے آتے ہیں، بعض محققین حضرات اسے باب اِفعال اور ضَرَبَ یَضرِبُ سے مصدر قیاسی قرار دیتے ہیں، اور زیادہ صحیح یہی ہے، اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے، ہدایہ میں ہے۔

الإجارة عقد يرد على المنافع بعوض (ہدایہ ج ۳ ص)	اجارہ وہ عقد (معاہدہ) ہے جو کسی عوض کے بدلہ منفعت پر کیا جاتا ہے

المجلّہ کے مرتبین نے ذرا اور زیادہ واضح تعریف کی ہے:

بيع المنفعة المعلومة في مقابلة عوض معلوم (ص ۶۰)	کسی معلوم منفعت کے مقابلہ میں کسی متعین عوض کا معاملہ (بیع) کرنے کو اجارہ کہتے ہیں۔

"بیع منفعت" کے لفظ سے بیع وشرار سے یہ علیٰحدہ ہو گیا اس لیے کہ اس میں دونوں طرف عوض اور مال ہوتا ہے، اور ہبہ، ہدیہ اور عاریت وغیرہ سے بھی یہ علیٰحدہ ہے، اس لیے کہ ہبہ وغیرہ میں منفعت کا معاہدہ نہیں بلکہ اعیان یعنی اشیاء کا معاہدہ ہوتا ہے، اس کی کچھ اصطلاحوں کا ذکر اجیرِ مشترک اور اجیرِ خاص کے بیان میں آئے گا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ اجارہ میں مقصود منفعت ہوتی ہے، اب اس کی دو۲ قسمیں ہیں، ایک منفعت اشیاء سے حاصل کی جاتی ہے، اس کی تین صورتیں ہیں: (۱) زمین یا مکان کرایہ پر دیا جائے یا لیا جائے، (۲) دوسرے سامان جیسے برتن، شامیانہ فرنیچر وغیرہ کرایہ پر دیا یا لیا جائے (۳) تیسرے سواریاں، سائیکل، موٹر، ٹیکسی وغیرہ کرایہ پر دی یا لی جائیں۔

دوسرے منفعت کا معاملہ عمل سے متعلق ہو یعنی جیسے ہم مختلف قسم کے کاریگروں سے

کام لیتے ہیں یا مزدوروں سے کام لیتے ہیں، اس کی بھی ۲ دو قسمیں ہیں، ایک اجیرِ خاص، دوسرے اجیرِ مشترک[1]، اجیرِ خاص جیسے اساتذہ، دفتر کے ملازمین یا گھریلو خادم وغیرہ، اجیرِ مشترک جو کسی ایک شخص یا ادارہ کا پابند نہ ہو بلکہ وہ آزادانہ اپنا کام کرتا ہو، جیسے مختلف قسم کے کاریگر، ٹیکسی ڈرائیور، قلی، درزی، رنگریز، دھوبی، بنکر، دلال وغیرہ اور دوسرے پیشہ ور۔

اجیرِ خاص ہو یا اجیرِ مشترک یا کرایہ دار، جو چیز ان کے تحت دی جاتی ہے وہ امانت[2] ہوتی ہے مثلاً مزدور کے سپرد جو کام ہے وہ امانت ہے، کاریگر کے یہاں جو سامان ہے وہ اس کے یہاں امانت ہے، اسی طرح کرایہ دار کے تصرف میں جو مکان یا دوکان ہے وہ امانت ہے، اس کی حفاظت ان پر ضروری ہے۔

اجارہ میں تین طرح کے احکام ہوتے ہیں

فقہ کی تمام کتابوں میں کتاب الاجارۃ کے نام سے ایک باب ہوتا ہے جس میں تین ۳ قسم کی اجرتوں کا بیان ہوتا ہے، ایک تو وہ اجرت جو آدمی کرایہ کی صورت میں لیتا یا دیتا ہے، دوسری وہ اجرت جو آدمی پیشہ ور اجیروں مثلاً سنار، درزی، لوہار، بڑھئی، دھوبی وغیرہ کو دیتا ہے، تیسری وہ اجرت جو آدمی بحیثیت ملازم یا مزدور دوسروں کو دیتا ہے یا لیتا ہے، فقہاء چونکہ تینوں قسم کے مسائل کو ایک ہی باب میں بیان کرتے ہیں، اس لیے ان میں سے ہر ایک قسم کے مسائل کو علحدہ کرکے ان کے تمام مالہٗ وما علیہ کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے، اس لیے راقم نے تینوں کو الگ الگ کرکے بیان کیا ہے[3]۔

کرایہ پر لینا یا دینا

اپنی کسی چیز کو کرایہ پر دینا یا کسی دوسرے کی چیز کو کرایہ پر لینا جائز ہے، اس کے بارے میں چند ضروری مسائل لکھے جاتے ہیں:

(۱) کرایہ کا معاملہ آمنے سامنے بھی طے ہو سکتا ہے اور خط و کتابت سے بھی، اگر کوئی گونگا ہے تو اشارہ سے بھی معاملہ طے ہو سکتا ہے، اسی طرح تعاطی یعنی بات چیت کے بغیر طرزِ عمل سے بھی معاملہ

---

[1] آگے ان کی تعریف اور تفصیل آرہی ہے [2] الماجور أمانۃ فی ید المستأجر ان کان عقد الإجارۃ صحیح او لم یکن (ص ۸۷ المجلۃ) [3] تفصیل کیلئے راقم الحروف کی کتاب اسلامی قانون اجرت کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس کا بالم بی ترجمہ ہو چکا ہے اور انگریزی اور عربی ترجمہ پیش نظر ہے۔

طے ہو سکتا ہے، مثلاً آپ بس یا ٹیکسی پر بیٹھ گئے، اور بس اور ٹیکسی والے نے کوئی اعتراض نہیں کیا، جو کرایہ مقرر تھا آپ نے اسے دے دیا اور کوئی بات نہیں ہوئی، اسی کو تعاطی کہتے ہیں[۱]۔

(۲) کرایہ پر دینے والے اور لینے والے دونوں کا عاقل ہونا ضروری ہے، یعنی وہ برے بھلے اور نقصان فائدہ کی تمیز کر سکتا ہو، بالغ ہونا ضروری نہیں ہے[۲]۔

بیع وشراء کی طرح اس میں ماضی کے صیغہ سے معاملہ طے ہونا چاہیے، مستقبل کے صیغہ سے جائز نہیں[۳]۔

(۳) اگر کوئی چیز کرایہ پر لی جائے تو دو باتیں طے ہونی چاہئیں، ایک یہ کہ اس کا کرایہ کتنا ہوگا؟ دوسرے یہ کہ وہ کتنے دنوں کے لیے یا کس کام کے لیے کرایہ پر لے رہا ہے، مثلاً اگر کوئی مکان کرایہ پر لیا، یا سواری، برتن یا کپڑا کرایہ پر لیا تو اس کا کرایہ بھی طے ہونا چاہیے اور مدت بھی، یعنی ایک سال، دو سال، یا ایک ماہ دو ماہ یا ایک دن دو دن کے لیے لے رہا ہے، یا گھنٹے دو گھنٹے کے لیے، سواری میں کرایہ اور مدت کے ساتھ یہ بھی طے ہونا چاہیے کہ وہ سواری کس کام کے اور کتنی مسافت کے لیے لے رہا ہے، مثلاً کسی نے موٹر سائیکل یا رکشہ کرایہ پر لیا تو یہ بتا دینا چاہیے کہ سوار ہونے کے لیے لے رہا ہے یا سامان ڈھونے کے لیے، اور وہ اسے کہاں تک یا کتنے میل لے جائے گا، تاکہ بعد میں دونوں میں کوئی اختلاف نہ ہو[۴]۔

(۴) اگر کسی نے مکان کرایہ پر لیا، اور کرایہ اور مدت نہیں طے کی، یا یہ کہا کہ میں اس کی مرمت کرا دیا کروں گا، یا سفیدی کرا دیا کروں گا تو یہ معاملہ عاریت کا ہوا، کرایہ کا نہیں، اس لیے عاریت کے جو شرائط ہیں، اس کے مطابق معاملہ کرنا چاہیے۔

(۵) اگر سو روپیے ماہوار کے حساب سے کرایہ طے ہوا تو یہ معاملہ صرف ایک مہینہ کے لیے سمجھا جائیگا

---

[۱] "ان الاجارۃ تنعقد بالمشافہۃ کذلک بالکتابۃ وباشارۃ الاخرس المعروفۃ وتنعقد بالتعاطی"، (المجلۃ ص ۶۴ دفعہ ۴۳۶) [۲] اہلیۃ العاقدین یعنی کونہما عاقلین ممیزین (المجلۃ ص ۶۵)

[۳] الاجارۃ کالبیع ایضاً تنعقد بصیغۃ الماضی ولا تنعقد بصیغۃ المستقبل ص ۶۴ دفعہ ۴۳۵،

[۴] یشترط ان تکون الاجرۃ معلومۃ وان تکون المنفعۃ معلومۃ بوجہ یکون مانعاً للمنازعۃ ببیان مدۃ الاجارۃ مع بیان المسافۃ (المجلۃ ص ۶۶)

دوسرے مہینہ میں دونوں کو پھر سے معاملہ کرنا چاہیے، اگر مالک مکان چاہے تو ایک ماہ کے بعد کرایہ دار سے مکان خالی کرا سکتا ہے، البتہ اگر مالک مکان نے دوسرے مہینہ کی پہلی تاریخ کو کوئی اعتراض نہ کیا تو پھر وہ دوسرے مہینہ میں اسی کرایہ پر رہ سکتا ہے[1]

گویا اس صورت میں ہر ماہ مالک مکان کرایہ بڑھا بھی سکتا ہے اور اپنا مکان خالی بھی کرا سکتا ہے لیکن اگر کرایہ دار نے سال دو سال یا دس بیس سال کے لیے کوئی مکان یا زمین مدت مقرر کر کے کرایہ پر لی، تو پھر اس مدت تک مالک کو نہ تو کرایہ بڑھانے کا حق ہے، اور نہ اس کو نکالنے کا[2]

(۶) مکان یا دوکان کرایہ پر لے لیا مگر اس نے اسے استعمال نہیں کیا تو جتنے دن اس کو اپنے قبضہ میں رکھے گا اتنے دن کا کرایہ دینا پڑے گا[3]

(۷) اگر سواری کرایہ پر کی تو اس پر اتنے ہی آدمی سوار ہو سکتے ہیں جتنے آدمی سوار ہونے کے لیے وہ بنائی گئی ہے، یا اس میں عام طور پر جتنے آدمی سوار ہوتے ہیں، مثلاً آپ نے رکشا کرایہ پر کیا تو اس پر صرف دو ہی آدمی کو بیٹھنا چاہیے، یا ریل کے ڈبہ میں جتنے آدمیوں کی جگہ ہو اتنے ہی آدمیوں کو بیٹھنا چاہیے، اسی طرح موٹر، بس یا سائیکل وغیرہ کا حکم ہے، اگر خود مالک زیادہ آدمیوں کو بٹھائے تو اس کو یہ حق ہے، مگر سیٹ سے زیادہ اگر وہ سواری بٹھائے گا تو دوسری سواریوں کو اعتراض اور کرایہ میں کمی کرنے کا حق ہوگا، اور حکومت بھی اس میں مداخلت کر سکتی ہے[4]

(۸) مشترک مکان، دکان یا کوئی مشترک چیز کرایہ پر نہیں دی جا سکتی۔

(۹) مکان کی آرائش و زیبائش کے لیے کوئی چیز کرایہ پر لینا ناجائز ہے، البتہ اگر کسی کام کے لیے

---

[1] ومن استاجر دارا کل شہر بدرھم فالعقد صحیح فی شہر واحد فاسد فی بقیۃ الشھور الا ان یسمی جملۃ الشھور معلومۃ (ھدایۃ ج ۳ ص ۲۸۶ [2] فان سکن ساعۃ من الشھر الثانی صح العقد ولیس للمؤاجران یخرجہ الی ان ینقضی (ایضاً ص ۲۸۶) [3] واذا قبض المستاجر الدار فعلیہ الأجر وان لم یسکنہا (ھدایۃ ج ۳ ص ۲۷۹ [4] لو استکریت دابۃ عن نوع حملھا ومقدارہ یصح تحمیلہا حملا اخر مماثلا لہ او اھون فی المضرۃ ولکن لا یصح تحمیل شیٔ ازید فی المضرۃ، ص ۸۰ المجلۃ، ھدایۃ ج ۳ ص ۲۸۲۔

لائی گئی ہو، اور ضمناً اس سے آرائش وزیبائش بھی ہوجائے تو کوئی حرج نہیں ہے [۱]

(۱۰) کتاب یا قرآن پاک کرایہ پر دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، کیونکہ یہ عام افادہ کی چیز ہے، اس کو مفت دینا چاہیے، البتہ حفاظت کے خیال سے اس کی ضمانت لی جاسکتی ہے، ضمانت خواہ مالی ہو یا جانی، یعنی کوئی کفیل اور ضامن بن جائے، مگر امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کتابوں کو کرایہ پر دینے لینے کی اجازت دیتے ہیں، موقع ومحل اور ضرورت کے لحاظ سے ان دونوں رایوں میں سے کسی ایک پر عمل کیا جاسکتا ہے [۲]

(۱۱) گائے بھینس یا بکری کو دودھ کھانے کے لیے کرایہ پر دینا درست نہیں ہے، بلکہ عاریۃً دینا مناسب ہے، اسی طرح درخت کو کرایہ پر دینا کہ وہ پھل کھایا کرے گا، یا ادھیا پر جانور کو دینا کہ جو بچے پیدا ہوں گے اس میں دونوں نصف نصف لیں گے، یا مرغی کو دینا کہ جو انڈے ہوں گے وہ دونوں کے آدھے آدھے ہوں گے، یہ سب ناجائز ہے، ان چیزوں کو اجرت پر دینا چاہیے، یعنی بکری یا گائے دی، اور اس کی چرواہی طے کرلی کہ سال میں ہم تم کو اتنا روپیہ یا ایک جوڑا کپڑا دیں گے تم ان کو چرایا کرو، دیہاتوں میں دونوں صورتیں رائج ہیں، مگر شریعت میں پہلی صورت ناجائز ہے اور دوسری جائز ہے، پہلی صورت ناجائز اس لیے ہے کہ جو چیز ابھی وجود میں نہ آئی ہو اس کی خرید وفروخت اور کرایہ پر دینا ناجائز ہے، اس لیے کہ اس میں اختلاف کی بڑی گنجائش ہے [۳]

کرایہ کا معاملہ کب ختم ہوسکتا ہے؟

(۱) جب کوئی چیز کرایہ پر لی یا دی جاتی ہے تو کرایہ پر لینے والے اور دینے والے دونوں آپس میں گویا کرایہ کا معاہدہ کرتے ہیں، اگر صحیح طریقہ پر معاملہ طے ہوگیا ہے تو اب ان میں سے کسی کو بغیر کسی عذر یا مجبوری کے اس معاہدہ کو توڑنا جائز نہیں، مثلاً کرایہ پر دینے کے بعد مالک کو اس کا کرایہ زیادہ ملنے لگے تو کرایہ دار کو پریشان

---

[۱] رجل استاجر آنیۃ یضعھا فی البیت یتجمل بھا ولا یستعمل فالاجارۃ فاسدۃ ولا اجر لہ (عالمگیری ج ۵ ص ۲۷۷) [۲] وکذ الا یصح الاجارۃ لو استاجر کتبًا لیقرء ھا ولا اجر لہ ان قرأ وکذلک اجارۃ المصحف (عالمگیری ج ۵ ص ۲۷۴، الافصاح ابن ھبیرہ کتاب الاجارۃ [۳] بہشتی زیور ج ۵ ص ۵۰۔

کر کے معاہدہ ختم کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے[1] اسی طرح کرایہ دار کو بھی بغیر کسی عذر کے معاملہ کو ختم نہ کرنا چاہیے۔

(۲) کہیں جانے کے لیے رکشہ، موٹر یا اور کوئی سواری منگائی، پھر ارادہ بدل گیا تو رکشے اور موٹر کو واپس کر سکتے ہیں، لیکن اگر رکشہ والے کا وقت زیادہ ضائع ہوا ہے، یا موٹر کئی میل سے چل کر آئی ہے تو رکشہ والے کو اتنے وقت کی مزدوری اور موٹر والے کو پٹرول کی قیمت اور اتنے وقت کی اجرت دینی چاہیے[2]

(۳) کرایہ دار یا مالک میں سے کوئی مر جائے تو اب پچھلے کرایہ کا معاملہ ختم ہو گیا (بشرطیکہ یہ معاملہ انھوں نے اپنے لیے کیا ہو، اگر کسی دوسرے کے لیے معاملہ کیا ہے تو ان کی موت سے دوسرے کا معاملہ ختم نہیں ہو گا صاحب ہدایہ نے اسی لیے **عقد الاجارۃ لنفسہ** کی قید لگادی ہے) اب اس کے ورثہ کو نئے سرے سے معاملہ کرنا چاہیے[3] ائمۂ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے یہاں کسی کی موت سے اجارہ ختم نہیں ہوتا، ان کے ورثہ اسے پورا کریں[4]۔

(۴) اس شرط پر کرایہ کا ایڈوانس دینا یا لینا جائز نہیں ہے کہ اگر میں کرایہ پر نہ لوں گا یا اگر سواری سے نہ جاؤں گا تو پھر ایڈوانس کی رقم مالک مکان یا سواری والے کی ہو جائے گی، یہ مالک کی زیادتی ہے، ریل کا ٹکٹ لینے کے بعد اگر اس کو واپس کیا جائے تو اس میں کچھ رقم کاٹ لی جاتی ہے، اسلامی حکومت میں ایسا نہ کیا جائے گا، اس کی واپسی میں گورنمنٹ کا کوئی نقصان نہیں ہے[5]

پگڑی کا لینا دینا

آج کل عام طور پر مکان یا دوکان کو کرایہ پر لینے یا ان کو خالی کرانے کے لیے مالک کرایہ دار سے کچھ رقم لے کر جسے پگڑی کہا جاتا ہے اپنا مکان یا دوکان اسے کرایہ پر دیتا ہے، اسی طرح جب اسے خالی کرانا ہوتا ہے تو مالک کرایہ دار کو کچھ پگڑی کی رقم دے کر اسے خالی کراتا ہے، اور اتنا ہی نہیں بلکہ کرایہ دار مالک کی مرضی کے بغیر دوسرے کسی کرایہ دار سے پگڑی

---

[1] لیس لاحد الطرفین فسخہا بغیر عذر (المجلۃ ص ۶۰) یعنی اگر خیار شرط، خیار عیب یا خیار رویت کی صورت نہ ہو تو اسے عذر یا مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔ [2] الاجیر المشترک لایستحق الاجرۃ الا بالعمل (المجلۃ ص ۶۳) [3] واذا مات احد المتعاقدین وقد عقد الاجارۃ لنفسہ انفسخت الاجارۃ۔ (ھدایۃ ۳ ص ۲۹۹) [4] الفقہ علی المذاھب الاربعۃ، کتاب الاجارۃ ص۳/ ۱۶۱-۱۶۲ [5] لایجوز لرجل من اھل الاسلام قبض مال احد بلاوجہ شرعی (عالمگیری ج ۴ ص ۴۵۴)

کی رقم لے کر مکان خالی کر کے اس کے حوالہ کر دیتا ہے، اور یہ رقم نہ تو کرایہ میں محسوب ہوتی ہے اور نہ بعد میں ادا کی جاتی ہے، یہ تمام صورتیں ناجائز ہیں، اور پگڑی کی رقم لینے والے کے لیے حرام ہے، اور دینے والا رشوت دینے کا مرتکب ہوا، اس طرح کا معاملہ کرنا صریح ظلم اور معصیت کا معاملہ ہے قرآن پاک میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے:

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (بقرہ) — نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

اس کی تشریح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے:

لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ — نہ تو نقصان اٹھایا جائے اور نہ نقصان پہونچایا جائے۔

دوسری حدیث میں ہے:

ملعون من ضار مومناً او مکر بہ۔ (مشکوٰۃ ص ۴۲۸) — وہ شخص ملعون ہے جو کسی مسلمان کو نقصان پہونچائے یا اس کے ساتھ دھوکہ وفریب کرے۔

ان ہی آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی روشنی میں فقہاء نے یہ اصول بنا دیا ہے:

لایجوز لرجل من اھل الاسلام قبض مال احد بلا وجہ شرعی۔ — کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی کا مال بغیر کسی شرعی سبب کے لیلے

(فتاویٰ عالمگیری ج ۴ ص ۴۵۴)

مولانا مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا مفتی عبدالرحیم مدظلہٗ دونوں حضرات نے اسے ناجائز قرار دیا ہے، پگڑی کی رقم دو سبب سے ناجائز ہے، ایک تو غیر شرعی طریقہ پر کسی کا مال لے لینا، دوسرے اس پر رشوت کی تعریف بھی صادق آتی ہے، اور رشوت کا حکم اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔

اگر مالک کرایہ دار سے کہتا ہے کہ مکان خالی کر دیجئے تو کچھ مہلت لے کر اسے خالی کر دینا چاہیے، البتہ اگر کرایہ دار کو دوسرا مکان نہیں مل رہا ہے، یا بہت گراں مل رہا ہے اور فوراً خالی کر دینے کی صورت میں اس کے لیے اور اس کے بال بچوں کے لیے کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں ہے تو اسلامی اخوت کا تقاضا کہ مالک مکان اسے دوسرا انتظام کرنے تک مہلت دے، اللہ تعالیٰ تقاضے میں مہلت

دینے والے کو پسند کرتا ہے، حدیث میں آتا ہے کہ جو کسی مسلمان کی تکلیف کو دور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیف کو دور کر دے گا (ابوداؤد و ترمذی) البتہ اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ مالک مکان کے پاس دو مکان تھے، ایک میں وہ خود رہتا تھا اور ایک کرایہ پر دے رکھا تھا اتفاق سے ایک مکان گر گیا، اب اس مجبوری سے مکان خالی کرانا چاہتا ہے تو کرایہ دار کو کسی طرح مکان خالی کر دینا چاہیے، یا اس کو کاروبار کے لیے دوکان کی ضرورت ہے اور کوئی دوسری دوکان کرایہ پر لینا اسکی قوت سے باہر ہے تو اس صورت میں کرایہ دار کو دوکان خالی کر دینا چاہیے۔

کرایہ کے بعض اور ضروری مسائل

(۱) مکان، دوکان یا جو چیز بھی کرایہ پر لی ہے، اسکی مدت ختم ہونے کے بعد کرایہ دار کو مکان یا دوکان فوراً واپس کر دینا چاہیے، اگر کرایہ دار کہے کہ میں فلاں وقت مکان یا دوکان خالی کر دوں گا تو مالک کو خود جا کر اس مکان یا چیز کو اپنے قبضہ میں لے لینا چاہیے، کرایہ دار پر اس کی واپسی کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ آکر اس کے حوالہ کرے[1]۔

(۲) کرایہ کی چیز کی واپسی میں جو کچھ خرچ ہوگا، وہ مالک کو دینا پڑے گا، کرایہ پر لینے والے کو نہیں، مثلاً کسی نے برتن کرایہ پر منگایا تو اس کی واپسی کا جو خرچ ہوگا وہ مالک کو دینا پڑے گا، البتہ لے جانے کا خرچ لینے والے پر ہوگا[2]۔

(۳) اگر کسی نے کوئی مکان یا دوکان کرایہ پر لیا اور یہ نہیں بتایا کہ اس میں کون رہے گا تو یہ جائز ہے کہ دوسرے کو بھی اس میں رکھ لے۔ البتہ اگر وہ یہ شرط کر دے کہ آپ ہی رہ سکتے ہیں یا آپ ہی کاروبار کر سکتے ہیں تو پھر دوسرے کو شریک کرنا جائز نہیں[3]۔

(۴) جو مکان یا دوکان کرایہ پر دینا طے ہو گئی ہو اس کو فوراً خالی کر کے کرایہ دار کے حوالہ کر دینا چاہیے

---

[1] لا یلزم المستاجر رد الماجور و اعادتہ و یلزم الآجر ان یاخذ عند انقضاء الاجارۃ مثلاً لو انقضت اجارۃ دار یلزم صاحبھا الذھاب الیھا و تسلیمھا۔ (المجلۃ ص ۸۵) [2] ان احتاج رد الماجور و اعادتہ الی الحمل و المئونۃ فاجرۃ نقلہ علی الآجر، (المجلۃ ص ۸۵) [3] المجلۃ ص ۷۷۔ ھدایہ ج ۳ ص ۲۸۰۔

(۵) مکان یا دوکان کو کرایہ پر لیا مگر یہ نہیں بتایا کہ اس میں کون رہے گا، یا وہ کس چیز کی دکان کرے گا تو مکان میں چاہے خود رہے یا دوسرے کو اس میں رکھے، یا اس میں سامان رکھے یا کوئی دوکان کرے اس کو اختیار ہے، اسی طرح دوکان میں جس چیز کی چاہے دوکان کرے، مگر مکان یا دوکان میں کوئی ایسا کام نہیں کیا جائے گا جو مکان کو خراب کر دینے یا اس کو کمزور کر دینے کا سبب ہو، اس کے لیے مالک سے دوبارہ اجازت لینی ضروری ہے، مثلاً اس نے دوکان میں بھٹی لگا دی، یا مکان میں آٹا پیسنے کی چکی نصب کی تو اس کو اجازت لے لینی چاہیے، کیونکہ دونوں کاموں سے مکان اور دوکان کے خراب اور کمزور ہونے کا اندیشہ ہے، اسی طرح اگر کرایہ کے مکان میں جانور رکھنے کی ضرورت ہو تو اس بارے میں وہاں کا عام رواج دیکھا جائے گا، اگر عام طور پر جانور مکانوں میں رکھے جاتے ہوں جیسا کہ دیہاتوں میں ہوتا ہے تو رکھنا جائز ہوگا، اور اگر عام طور پر نہ رکھے جاتے ہوں مثلاً شہروں میں تو شہر کے مکانات میں ان کے رکھنے سے مالک مکان روک سکتا ہے، یوں اجازت دے دے تو پھر ہر جگہ رکھے جا سکتے ہیں۔[1]

(۶) کرایہ کے مکان کی درستگی اور مرمت، راستہ کی آسانی اور جو باتیں کرایہ دار کے لیے تکلیف دہ ہوں، ان سب کو دور کرنا مالک مکان پر ضروری ہے، ان سب چیزوں پر جو خرچ ہوگا وہ مالک کو ادا کرنا ہوگا، لیکن اگر وہ خرچ نہ کرے اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اگر کرایہ دار نے مکان لیتے وقت اس کو اسی برے حال میں پایا تھا اور پھر بھی رہنے پر راضی ہو گیا تو اب وہ مالک کو مرمت پر مجبور نہیں کر سکتا، دوسرے یہ کہ لیتے وقت تو وہ اچھے حال میں تھا اب خراب ہو گیا، یا کرایہ پر دیتے وقت خراب حال میں تھا اور مالک نے کہا تھا کہ میں بنوا دوں گا تو دونوں صورتوں میں مالک کو کرایہ دار کی سہولت کا خیال کرنا پڑے گا، یعنی اس کو اس کی مرمت کرانی چاہیے، اگر نہ کرائے گا تو کرایہ دار کو قانونی چارہ جوئی کرنے کا حق ہوگا۔[2]

---

[1] ولکن لیس لہ ان یفعل ما یورث الضرر والوھن للبناء الا باذن صاحبہا واما فی الخصوص ربط الدواب فعرف البلدۃ وعادتہا معتبر (المجلۃ ص ۷۷) [2] اعمال الاشیاء التی تخل بالمنفعۃ المقصودۃ عائدۃ الی الاٰجر مثلاً تعمیر الدار (مرمت مراد ہے) وطرق الماء واصلاح منافذہ وسائر الامور التی تتعلق بالبناء کلہا لازمۃ وان شاء الاشیاء التی تخل بالسکنیٰ الا ان یکون (بقیہ اگلے صفحہ)

(۷) اگر کرایہ دار اپنی طرف سے اپنی آسانی کے لیے کوئی چیز بنوالے تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مالک نے اس کو اس کی اجازت دی ہے، یا اجازت نہیں دی ہے، اگر اجازت نہیں دی ہے تو تمام اخراجات کرایہ دار کو برداشت کرنے پڑیں گے، ورنہ یہ اس کا تبرع سمجھا جائیگا، مالک سے وہ نہیں مانگ سکتا، اور اگر اجازت سے اس نے خرچ کیا ہے تو پھر وہ تمام خرچ مالک سے لے سکتا ہے[۱]۔

(۸) اگر کرایہ دار کرایہ کی زمین میں اپنی مرضی سے کوئی درخت لگالے یا کوئی اور چیز اپنے خرچ سے بنالے تو مکان چھوڑتے وقت مالک کو یہ اختیار ہے کہ وہ چاہے تو درخت کٹوادے اور بنی ہوئی چیز کو ڈھادے یا پھر قیمت دے کر خرید لے، مگر کرایہ دار مالک کو اس کی قیمت دینے پر مجبور نہیں کرسکتا[۲]۔

(۹) مکان کی روزمرہ صفائی یعنی جھاڑو اور کوڑا کرکٹ وغیرہ پھینکنے کی ذمہ داری کرایہ دار پر ہے، اسی طرح گرد و غبار اور جالے وغیرہ کی صفائی بھی کرایہ دار پر ہے[۳]۔

(۱۰) اگر کرایہ دار نے مکان خراب کردیا ہے یا بہت زیادہ گندہ کردیا ہے تو مالک کو علٰحدہ کرنے کا اختیار ہے، اگر وہ خالی نہیں کرتا ہے تو قانونی چارہ جوئی کے ذریعہ[۴] خالی کراسکتا ہے۔

(۱۱) اگر کوئی کپڑا یا برتن یا فرنیچر کرایہ پر لے آیا، مگر گھر پر لاکر اس نے استعمال نہیں کیا تو بھی کرایہ دینا پڑے گا، لیکن اگر ابھی صرف معاملہ ہوا تھا اور وہ چیز ابھی دوکاندار ہی کے پاس تھی اور اس کو ضرورت نہیں رہی تو کرایہ نہ دینا پڑے گا، مگر دوکاندار کو فوراً اطلاع دے دینا چاہیے[۵]۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) حین استیجارها ایاها کانت علی هٰذا الحال (المجلۃ ص ۷۷)

[۱] المجلۃ ص ۷۷۔ [۲] لو احدث المستاجر بناءً فی العقار او غرس شجرۃ فالاجر مخیر عند انقضاء مدۃ الاجارۃ ص ۷۷۔ [۳] ازالۃ التراب والزبل الذی یتراکم فی مدۃ الاجارۃ والتطهیر عنهما علی المستأجر (المجلۃ ص ۷۷) [۴] ان کان المستأجر یخرب الماجور ولم یقتدر الآجر علی منعہ راجع الحاکم وفسخ الاجارۃ۔ (المجلۃ ص ۷۷) [۵] فبعد قبضها یلزمہ اعطاء الاجرۃ وان لم یسکنها۔ (المجلۃ ۶۹)

(۱۲) اگر اس نے خاص اپنے استعمال کے لیے کوئی چیز کرایہ پر لی ہے تو دوسرے کو کرایہ پر یا منگنی نہ دینا چاہیے۔

(۱۳) اگر سواری اس شرط پر لی ہے کہ فلاں مقام تک وہ پہونچا دے گا تو راستہ میں اگر سواری خراب ہوجائے یا بگڑ جائے تو مالک پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو اس مقام پر پہونچائے جہاں کا اس نے وعدہ کرلیا ہے، اگر سوار ہونے والوں کو دیر ہورہی ہو، اور وہ انتظار نہ کرسکتے ہوں تو پھر وہ جتنی مسافت طے کرچکے ہیں اس کا کرایہ ادا کرنے کے بعد دوسری سواری سے جاسکتے ہیں، سواری کا مالک ان کو مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ اپنا حرج کرکے خواہ مخواہ سواری کے بننے کا انتظار کریں، مثلاً کوئی شخص موٹر یا ریل سے سفر کررہا ہے، اور راستہ میں کوئی خرابی آگئی اور سوار کو یہ خیال ہے کہ اس کے بنانے میں دیر لگے گی، اور اس کو جلد کہیں پہونچنا ہے تو اسلامی شریعت کی رو سے وہ جتنا سفر طے کرچکا ہے، اتنا پیسہ دینے کے بعد باقی کرایہ واپس لے سکتا ہے، اور دوسری سواری سے جاسکتا ہے، موجودہ دور میں اگر راستہ میں سواری خراب ہوجائے یا کوئی حادثہ پیش آجائے تو سواری کرنے والے کے لیے سوائے اس کے کوئی صورت نہیں ہے کہ وہ اپنے پورے کرایہ کا خون کرے اور دوسری سواری سے جائے اور اگر کرایہ واپس لینا چاہتا ہے تو پھر ریلوے سے مقدمہ لڑے[۱] جو اس زمانہ میں جوئے شیر لانے کے مرادف ہے۔ اسلامی قانون کی رو سے یہ صحیح نہیں ہے بلکہ ایسی صورت میں کرایہ واپس کرنا ضروری ہے

(۱۴) جس جگہ کے لیے سواری کی ہے یا سواری کا ٹکٹ لیا ہے وہیں تک جانا چاہیے، اگر اس سے زیادہ جائے گا تو اس کا تاوان دینا پڑے گا (شرح المجلہ دفعہ ۵۴۴)

(۱۵) کوئی ایسی جگہ ہے جہاں دو اسٹیشن ہیں، تو ایک اسٹیشن کی تعیین ضروری ہے، مثلاً بنارس میں ۲ دو اسٹیشن ہیں، یا بمبئی میں کئی اسٹیشن ہیں تو اس نے پہلے اسٹیشن کا ٹکٹ لیا، اور اترا بعد والے اسٹیشن پر تو اس کو اتنا تاوان دینا پڑے گا، مگر تاوان بس اتنا ہی دینا پڑے گا جتنا پہلے

---

[۱] لو استاجر دابۃ معینۃ الی محل معین وتعبت فی الطریق فالمستأجر مخیر، ان شاء انتظرھا حتی تستریح وان شاء نقض الاجارۃ وبھذا یلزم المستاجر علی ان یعطی حصۃ ما اصاب تلک المسافۃ (المجلہ ص ۷۸)

اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن کا کرایہ ہے، مزید جرمانہ نہیں لیا جائے گا[1]

خیار شرط، خیار رویت اور خیار عیب

جس طرح بیع و شرا میں خیار شرط، خیار رویت اور خیار عیب کی آسانی دی گئی ہے، اسی طرح اجارہ میں بھی یہ جائز ہے، مثلاً ایک شخص ایک مکان یا دوکان کرایہ پر لینا چاہتا ہے اور مالک مکان کرایہ وغیرہ کی بات چیت سے طے ہو چکی ہے، مگر مالک یا کرایہ دار نے کہا کہ کل آخری جواب دوں گا، تو جس نے بھی یہ کہا ہے اسے دوسرے دن تک اس کے جواب کا انتظار کرنا چاہیے، اسی طرح کرایہ دار نے ایک مکان یا دوکان کا معاملہ کر لیا مگر اس نے دیکھا نہیں تھا، اب دیکھنے کے بعد اسے وہ مکان یا دوکان پسند نہیں آئی، یا کرایہ زیادہ محسوس ہوا تو اسے معاملہ کو فسخ کر دینے کا اختیار ہوگا، اسی طرح مکان یا دوکان میں آنے کے بعد اس میں کوئی ایسا عیب نظر آیا جس سے رہائش میں یا دوکان کرنے میں شدید پریشانی نظر آتی ہے تو اسے معاملہ کو فسخ کر دینے کا اختیار ہے، اب جتنے دن وہ رہ چکا ہے، اسے اتنے دن کا کرایہ دینا ہوگا[2]

ریل اور دوسری سواریوں کے احکام

(۱) کفالت کے بیان میں ذکر آچکا ہے کہ ریل، جہاز اور دوسری سواریوں کے ذریعہ کہیں جانے کے لیے جو ٹکٹ لیا جاتا ہے اس کی وجہ سے ریلوے اور جہاز کمپنی اس کے پہونچانے کی ذمہ دار ہو جاتی ہے، اسی طرح اگر آپ نے کوئی سامان بک کرا دیا ہے تو اس کے لے جانے اور جب تک نہیں پہونچ جاتا اس وقت تک ٹوٹنے پھوٹنے اور نقصان کی ساری ذمہ داری ریلوے یا جہاز کمپنی پر ہوگی، چونکہ ریلوے یا جہاز کمپنی کی حیثیت محض کفیل ہی کی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت کفیل بالاجرت کی ہوتی ہے اس لیے جن شرائط پر اس نے اجرت لی ہے وہ پوری

---

[1] لو استکریت دابة من استانبول الی "چکمجہ" ولم یصرح الی کبیرها او صغیرها فایهما قصدت یلزم اجر المثل بنسبة مسافتها (المجلة ص ۷۹) [2] یجری خیار الشرط فی الاجارة کما جری فی البیع للمستاجر خیار الرویة فی الاجارة ایضاً خیار العیب کما فی العیب ص ۷۲ - ۷۴ - ۷۵ المجلة

کرنی ہوگی، اور بعض باتیں ایسی ہیں جن کا ذکر کیا جائے یا نہ کیا جائے ان کی ذمہ داری محکمہ پر ہوتی ہے[1] مثلاً خراب ہونے والے مال کو بند بوگی کے بجائے کھلی بوگی میں نہ بھیجیں، اسٹیشن پر اتار کر حفاظت سے رکھیں ورنہ نقصان کا تاوان محکمہ ریلوے کو دینا ہوگا۔

مثلاً اگر کسی نے ریلوے سے مال بک کرایا تو اب جہاں مال پہونچانا ہے وہاں کے اسٹیشن پر مال اتارنے کی ذمہ داری ریلوے پر ہوگی[2] اور بعض شرائط ایسے ہیں جن کا ذکر ہو یا نہ ہو اس کی ذمہ داری مال والے پر ہوگی، مثلاً اس نے جانور، بیل، بھینس، بکری، مرغی وغیرہ ریل کے ذریعہ کہیں بھیجا، تو اس کے کھلانے پلانے کی ذمہ داری مالک پر ہوگی، یا اس نے مچھلی بھیجی تو برف میں رکھنا یا انڈا بھیجا تو اس کو ٹھنڈا رکھنے کا انتظام کرنا اس کی ذمہ داری ہوگی، ریلوے یا جہاز کمپنی سے کوئی مطلب نہیں ہے، خلاصہ یہ کہ مال کی حفاظت کی ساری ذمہ داری ریل و جہاز کمپنی کی ہے، اور اس چیز کے بقاء کے سلسلہ کی ذمہ داری مالک پر ہے۔

(۲) جس قسم کی چیزوں کے لادنے کے لیے اور جتنی مقدار پر لادنے کے لیے ریلوے کا آرڈر ہو اتنا ہی لادنا چاہیے، اس سے زیادہ لادنا درست نہیں ہے، مثلاً کسی نے ایک مال گاڑی کا ڈبہ لیا جس میں ۲۸ ٹن مال لادنے کی اجازت ہے تو اتنا ہی لادنا چاہیے، اس سے زیادہ لادنا درست نہیں ہے، اسی طرح ٹرک، ٹھیلے وغیرہ کا حکم ہے، اسی طرح مسافروں کو جتنا سامان لیجانے کا حکم ریلوے کمپنی نے دیا ہے، چوری سے زیادہ لے جانا درست نہیں ہے، خواہ اسلامی حکومت کی ریلوے ہو یا غیر اسلامی حکومت کی، اگر اس کے خلاف کرے گا تو نقصان کی ذمہ داری محکمہ پر نہیں ہوگی[3]

اجیروں کی قسمیں

اوپر ذکر آچکا ہے کہ اجرت تین طرح سے ادا کی جاتی ہے، یا لی جاتی ہے، ایک کرایہ کے ذریعہ جس کا بیان اوپر ہو چکا، اب باقی دو قسموں کا بیان کیا جاتا ہے:

---

[1] لو اشترط ایصال حمل معین الی محل معین وتعبت الدابۃ فی الطریق فالمکاری مجبور علی تحمیلہ علی دابۃ اخری لو تلف الماجور بتقصیر المستاجر فی امر المحافظۃ او طرأ علی قیمتہ نقصان یلزم الضمان (المجلۃ ص ۸۷-۸۷) [2] وضع الحمل عن الدابۃ علی المکاری ص ۸۱ [3] حرکۃ المستاجر علی خلاف المعتاد وتعد یضمن الضرر والخسار الذی یتولد منہا (المجلۃ ص ۸۷)

عام طور پر جو انسان دوسروں کا کام کر کے اپنی روزی کماتے ہیں، وہ ۲ قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو عموماً دوسروں کے پاس جا کر اپنا کام تلاش کرتے ہیں اور پھر جو کام ان کو مل جاتا ہے اس کو پورا کر کے کام لینے والے سے اپنی محنت کی مزدوری وصول کرتے ہیں، مثلاً مزدور، خانگی ملازم کاتب دفتروں اور کارخانوں کے کلرک وغیرہ اور کسی محکمہ کے ذمہ دار، دوسرے وہ پیشہ ور لوگ جو کوئی ہنر جانتے ہیں، عموماً ایسے لوگ خود کسی کے پاس نہیں جاتے، اور نہ وہ کسی خاص آدمی کے ملازم ہوتے ہیں، بلکہ دوسرے لوگ اپنی ضرورت پوری کرانے کے لیے ان کے پاس خود جاتے ہیں یا ان کو بلا کر اپنی ضرورت پوری کراتے ہیں، جیسے گھڑی ساز، قلعی، موچی، ملاح، لوہار، سُنار، درزی، حجام، بہشتی، رنگریز، دھوبی، مہتر وغیرہ، پہلی قسم کے لوگوں کو شریعت میں اجیر خاص اور دوسری قسم کے لوگوں کو اجیر مشترک کہا جاتا ہے[۱] اس کا کچھ بیان فقہاء بیع استصناع میں بھی کرتے ہیں۔

اجیر مشترک

(۱) اجیر مشترک کی اصلی حیثیت تو امین کی ہوتی ہے، یعنی جو چیزیں ان کو بنانے یا درست کرنے یا صاف کرنے یا رنگنے کے لیے دی جاتی ہیں وہ بطور امانت ان کے پاس[۲] ہوتی ہیں، لیکن یہ امانت امانت باضمانت ہوتی ہے، یعنی ان کی حیثیت کفیل یا اس امین کی ہوتی ہے جو امانت کی حفاظت کے لیے اجرت لیتا ہے، اور پھر اس حیثیت سے بھی اس کی ذمہ داری اہم ہے کہ وہ کسی ایک آدمی کی چیزوں کا امین نہیں ہوتا، بلکہ بہت سے آدمیوں کی چیزیں اس کے قبضہ میں ہوتی ہیں، اس لیے اس کو اگر ذمہ دار قرار نہ دیا جائے تو پھر وہ بد دیانتی کر کے بہت سے لوگوں کی چیزوں کو ہڑپ کر سکتا ہے

(۲) چونکہ امین ہونے کے ساتھ یہ ضامن بھی ہو جاتا ہے اس لیے اگر اس کی غفلت سے کوئی چیز گم ہو گئی یا خراب ہو گئی تو اس سے اس کا تاوان لیا جائے گا، مثلاً دھوبی نے کپڑا گم کر دیا، یا نیا کپڑا تھا،

---

[۱] المجلۃ ص ۶۲ [۲] المجلۃ ص ۸۷، الماجور امانۃ فی ید المستاجران کان عقد الاجارۃ صحیحا اولم یکن لا یلزم الضمان اذا تلف الماجور مالم یکن بتقصیرہ۔

پھاڑ لایا، یا اس کے گدھے نے چبا ڈالا، یا سُنار نے زیور گم کر دیا، یا مرمت کے لیے کوئی چیز دی گئی تھی، اس نے اس میں اس سے زیادہ خرابی پیدا کر دی، یا نان بائی کو روٹی پکانے کے لیے دی، اور اس نے روٹی جلا دی یا خراب کر دی، یا درزی کو کپڑا سینے کے لیے دیا گیا، اس نے کپڑا اتنا چھوٹا کر دیا کہ پہننے میں تکلیف ہو رہی ہے یا قمیص سینے کے لیے کہا گیا، کرتہ سی دیا، رنگ ریز سے سبز رنگ میں رنگنے کیلیے کہا گیا تھا اس نے زرد رنگ دیا، تو ان تمام صورتوں میں ان سے تاوان لیا جا سکتا ہے، یوں جس کی چیز ہے وہ تاوان نہ لے تو یہ اس کا احسان ہوگا، مگر قانونی طور پر اس کو اس کا حق ہوگا، البتہ اگر کوئی آفت ناگہانی آگئی اور کوئی چیز اجیر مشترک کے پاس سے گم ہوگئی یا ضائع ہوگئی یا خراب ہوگئی تو تاوان لینا درست نہیں ہے، مثلاً اس کا گھر گر پڑا، گھر میں آگ لگ گئی یا گھر میں چوری ہوگئی تو ان صورتوں میں تاوان لینا درست نہیں ہوگا، البتہ اگر اس بات کا ثبوت مل گیا کہ وہ چیز گم یا ضائع نہیں ہوئی ہے تو پھر مالک مطالبہ کر سکتا ہے، مثلاً دھوبی کے کپڑے کی ایک لادی چوری ہوگئی تو اس صورت میں یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ ہر گاہک کا کپڑا چوری ہو گیا، اس لیے دھوبی کو اس کا ثبوت دینا پڑے گا کہ فلاں فلاں کپڑا چوری ہو گیا، ورنہ تاوان لیا جائے گا، البتہ اس کے گھر کا پورا اثاثہ چوری ہو گیا تو پھر اس سے کوئی گاہک تاوان نہیں لے سکتا، چوری کی صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ اس نے اسے بے احتیاطی سے تو نہیں رکھا تھا بلکہ پوری حفاظت سے رکھا تھا مگر تالا توڑ کر یا نقب لگا کر چوری کر لیا گیا۔[1]

---

[1] امام ابوحنیفہؒ ضمان کے قائل نہیں ہیں، اس لیے کہ اس کا حکم امانت کا ہے، اور صاحبین اور ائمہ ثلثہ آفت ناگہانی کے علاوہ ہر صورت میں ضمان کے قائل ہیں، صاحبین اور دوسرے ایمہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے اسوہ سے استدلال کرتے ہیں کہ انھوں نے جب پیشہ وروں اور کاریگروں کی بددیانتی کا مشاہدہ کیا تو انھوں نے ان پر تاوان عائد کر دیا، مگر یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب اس کی طرف سے تعدی پائی جائے یا عمداً اس نے نقصان کیا ہو، اگر کسی دوسرے نے نقصان کر دیا ہو تو اس صورت میں تمام ائمہ ضمان کے قائل ہیں، ذاتی طور پر کی مثال درزی وغیرہ کے کپڑے کاٹنے اور سینے کی دی جا چکی ہے، دوسرے سے نقصان کی مثال جیسے کسی غیر ذمہ دار آدمی کو وہ کام سپرد کر دے اور وہ اسے خراب کر دے اگر وہ خود کرتا تو خراب نہ ہوتا، جیسے کسی نوآموز آدمی کو کپڑا کاٹنے یا گھڑی بنانے کیلیے دیا اور اس نے غلط کپڑا کاٹ دیا یا گھڑی کا پرزہ توڑ دیا تو اس پر بہرحال ضمان ہے، بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۲۳۱ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۳ ص ۱۴۶، ہدایہ ج ۳ ص ۲۹۲۔

بعض اور شرائط

(۱) کام کرنیوالے اجیر اور کام لینے والے مستاجر دونوں کا عاقل اور سمجھ دار ہونا ضروری ہے، اگر کوئی ناسمجھ بچہ کوئی کام دے یا کوئی کام لے تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ بالغ ہونا شرط نہیں ہے۔

(۲) اجیر و مستاجر دونوں کی رضامندی ضروری ہے۔

(۳) جو کام لینا ہے اس کی پوری تفصیل بتادی جائے، مثلاً اگر جوتا بنوانا ہے تو اس کا پیمانہ دے دیا جائے یا نمبر بتادیا جائے، پھر اس کی قسم یعنی یہ بتادیا جائے کہ شو ہوگا یا پمپ، یا نیوکٹ ہوگا، اسی طرح اگر سنار سے کوئی زیور بنوانا ہے تو اس کی بھی پوری تفصیل بتادی جائے[۱]

ہر کام کرنے کے لیے کچھ چیزیں ضمنی ہوتی ہیں، مثلاً سلائی کا تاگا، بٹن کون دے گا، یا جوتے کا فیتہ یا زپ کون دے گا، اس کا تعلق اس مقام کے عرف و عادت سے ہے[۲] جیسا رواج ہو اسی پر عمل کیا جائے گا۔

(۴) چیز کی قیمت پہلے سے طے کرلی جائے، اور یہ بھی طے کرلیا جائے کہ قیمت اُدھار ہوگی، یا نقد؟ اوپر ذکر آچکا ہے کہ کام اور اجرت کی کیفیت معلوم ہونی چاہیے۔

اجیر مشترک کی اجرت اور بعض دوسرے مسائل

(۱) اجیر مشترک اجرت کا مستحق اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنا کام پورا کرلے، کام پورا کرنے سے پہلے وہ اجرت کا مستحق نہیں ہے، مثلاً آپ نے گھڑی بنانے کیلئے دی، موچی کو جوتا بنانے کے لیے دیا، یا دھوبی کو کپڑا دھلنے یا درزی کو کپڑا سینے کے لیے دیا، یا رنگریز کو کپڑا رنگنے کے لیے دیا، یا نیا کپڑا بُننے کا آرڈر دیا تو جب تک آپ کا کام پورا نہیں ہوجاتا آپ سے وہ قانوناً اجرت نہیں مانگ سکتا، آپ دے دیں تو آپ کو اس بات کی اجازت ہے۔ البتہ اگر ارجنٹ کام ہے یا کچھ سامان خریدنا ہے تو اجرت وہ پہلے مانگ سکتا ہے[۳]۔

---

[۱] ان یقول للصانع اصنع لی من مالک خفا من هذا الجنس بهذه الصفة (شرح وقایہ ج ص ۸۳) [۲] کل ما کان من توابع العمل یعتبر فیه عرف البلدة (المجلہ ص ۸۲) [۳] الاجیر المشترک لایستحق الاجرة الا بالعمل (المجلہ ص ۶۳) الا ان یشترط التعجیل (ہدایہ ج ۳ ص ۲۹۵)

(۲) اگر کوئی پیشہ ور ماہوار تنخواہ پر کام کرتا ہے تو مہینہ پورا ہونے سے پہلے وہ اجرت نہیں مانگ سکتا، مثلاً دھوبی، بہشتی، مہتر، چپراسی اور تمام ماہوار تنخواہ پانے والے ملازمین کا بھی یہی حکم ہے[1]

(۳) آج کل عام طور پر اجیر مشترک یعنی پیشہ ور بیعانہ یا کچھ اڈوانس رقم اس شرط پر لے لیتے ہیں کہ آپ اگر وہ چیز نہ لیں گے تو وہ اڈوانس کی رقم آپ کو واپس نہیں ملے گی، یہ ناجائز ہے[2]

(۴) اجیر مشترک اگر کوئی وقت مقرر کر دے کہ میں یہ چیز فلاں وقت دوں گا تو اس کی پابندی اس پر ضروری نہیں ہے، کیونکہ قانوناً وہ کام کا پابند ہے، وقت کا نہیں، البتہ اخلاقاً اس کو وعدہ خلافی نہ کرنی چاہیے، البتہ اگر اس نے جلدی دینے کے وعدہ پر کچھ اجرت زیادہ لی ہے تو اس کو وقت پر دینا ضروری ہوگا۔

(۵) اجیر مشترک کو جب تک اپنی مزدوری یا اجرت نہ مل جائے وہ چیز جو اسکے قبضہ میں ہے روک سکتا ہے، اگر اس کے روکنے کی مدت میں وہ مال ضائع ہو جائے یا خراب ہو جائے تو اسکی ذمہ داری اس پر نہیں ہے، کیونکہ یہ کام لینے والے یعنی مستاجر کی غلطی ہے کہ اس نے اجرت نہیں دی، اور اجیر مال روکنے پر مجبور ہوا، یہ مسلک امام مالک اور دوسرے ائمہ کا ہے، مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کی دو قسم کرتے ہیں، ایک وہ پیشہ ور جن کے کام سے اصل چیز میں کوئی تبدیلی ہو جاتی ہے، مثلاً راج گیر عمارت بناتا ہے، درزی کپڑا کاٹ کر سی دیتا ہے تو اصل کپڑے کی صورت بدل جاتی ہے، اسی طرح رنگ ریز جب کپڑا رنگ دیتا ہے تو اس کی صورت بدل جاتی ہے، یا دھوبی جب کپڑا دھو دیتا ہے تو اس میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، تو ایسے تمام ہنرمندوں اور پیشہ وروں کو امام صاحب یہ حق دیتے ہیں کہ جب تک اجرت نہ مل جائے وہ چیز مالک کے حوالہ نہ کریں، اگر اس حالت میں وہ چیز ضائع ہو جائے تو اس پر کوئی تاوان نہیں ہے، صاحبین کہتے ہیں کہ کام لینے والے کو اختیار ہے کہ اگر صانع نے کام پورا نہیں کیا تھا تو اس کی قیمت اس سے واپس لے لے، اور اس کو کوئی اجرت

---

[1] ان كانت الاجرة موقوتة بوقت معين كالشهرية او السنوية مثلاً يلزم ايفاءها عند انقضاء ذلك الوقت (المجلة ص ٦٩) [2] اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ جائز ہے، بشرطیکہ کام آرڈر کے مطابق ہو۔ دوسرے ائمہ کے یہاں جائز نہیں۔

نہیں ملے گی، اور اگر اس نے کام پورا کر دیا تھا اور وہ ضائع ہو گئی تو اس کو سامان کی قیمت ملے گی، اور صانع کو اجرت[1] یہ اس شرط پر ہے کہ اس نے معاملہ ادھار نہیں کیا تھا، اگر ادھار قیمت پر کام کرنے کا وعدہ کیا تھا تو اسے روکنے کا حق نہیں ہے[2] دوسرے وہ پیشہ ور جن کے کام سے اصل چیز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تو ان کے بارے میں امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ان کو اجرت میں کوئی چیز روکنے کا حق نہیں ہے، مثلاً قلی، ملاح، ریلوے، جہاز کمپنی، موٹر، تانگے، رکشہ والے، اگر یہ چاہیں کہ اجرت میں وہ مال روک لیں جس کو انھوں نے پہونچایا ہے تو امام صاحبؒ کے نزدیک ان کو یہ حق نہیں ہے، اگر وہ مال ضائع ہوگا تو وہ اس کے ضامن ہوں گے، راقم کے نزدیک موجودہ دور میں امام مالکؒ اور دوسرے ائمہ کے مسلک پر عمل درآمد ہی زیادہ مناسب ہے، اس لیے یہاں اسی کو ترجیح دی گئی ہے، اگر اس زمانے میں یہ اجازت دے دی جائے کہ اجرت میں سامان نہیں روکا جائے گا تو لوگ قلیوں اور سواریوں پر خوب سامان لاد کر لے جائیں گے اور قصداً ان کی مزدوری ہڑپ کر جائیں گے، اس طرح قلیوں، رکشے والوں اور ریلوے وغیرہ کے ہزاروں اور لاکھوں روپیے لوگ مار لیں گے، خاص طور پر اس دور کے خود غرض تاجر تو اس سے خوب فائدہ اٹھائیں گے، کیونکہ ان کو یہ خطرہ تو ہوگا نہیں کہ ان کا مال اجرت میں روکا جا سکتا ہے، اور مال لیکر نکل جانے کے بعد تو قانونی کارروائی کی ان کو کوئی خاص فکر نہیں ہوتی، وہ جھوٹ سچ بول کر اس سے بچ ہی جاتے ہیں[3] اور دس بیس پچاس روپیے کے لیے قانونی کارروائی ممکن بھی نہیں ہے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس ماحول کو سامنے رکھ کر یہ فتویٰ دیا تھا جس میں قانون کے ساتھ دلوں پر بھی اخلاق کی حکومت تھی، جب لوگ کسی کا حق مار لینے کو کارنامہ نہیں بلکہ مجرمانہ اور ظالمانہ فعل سمجھتے تھے۔

---

[1] ہدایہ ج ۳ ص ۲۸۰ [2] ان لم یشترط نسئتہا (المجلہ ص ۷۰) [3] کل صانع لعملہ اثر فی العین کالقصار والصباغ فلہ ان یحبس العین بعد الفراغ عن عملہ حتی یستوفی الاجر، وکل صانع لیس لعملہ اثر فی العین فلیس لہ ان یحبس العین کالحمال والملاح، ہدایہ ج ۳ ص ۲۸۰ وبہذا الحال لوحبس الاجیر المال وتلف فی یدہ لضمن (المجلہ ص ۷۰)

اجیر مشترک اجیر خاص بھی ہو جاتا ہے

اجیر جب تک کسی ایک آدمی کا کام نہیں کرتا وہ اجیر مشترک ہے، لیکن اگر اسکو کوئی آدمی کچھ دیر کے لیے یا کچھ دن کے لیے مخصوص کرلے کہ اس وقت میرا فلاں کام کردے، دوسرا کوئی کام نہ کرے تو اس وقت وہ اجیر مشترک نہیں بلکہ اجیر خاص ہوجائے گا[1] اب اس پورے وقت میں وہ دوسرا کام نہیں کرسکتا، مثلاً آپ نے کسی بڑھئی کو دن بھر کے لیے اپنے یہاں رکھا، یا کسی سنار، درزی یا کسی اور پیشہ ور کو کچھ دن کے لیے گھر پر بلایا کہ اتنا کام تم کردو، تو وہ اس وقت تک کے لیے اجیر خاص ہوجائے گا، اسی طرح آپ نے ایک گھنٹہ کے لیے رکشہ کرلیا، یا دو گھنٹے کے لیے کسی متعین جگہ تک جانے کے لیے موٹر رزرو کرالیا، یا ریل کی کوئی سیٹ رزرو کرالی تو آپ کو حق ہے کہ آپ اتنی دیر تک یا اتنی مسافت تک کسی اور کو سوار نہ ہونے دیں۔ (المجلۃ ص ۶۲)

اجیر خاص

یعنی

مزدوروں کے حقوق و فرائض

دنیا میں ہمیشہ ایسے لوگوں کی کثرت رہی ہے اور آج بھی ہے جو محض محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں[2]، اگر وہ دن بھر خون پسینہ بہاکر کچھ نہ کمائیں تو نہ شام کو انھیں

---

[1] لو استاجر احد هؤلاء على ان يعمل للمستاجر الى وقت معين يكون اجيرا خاصًا (المجلۃ ص ۶۴) [2] موجودہ اعداد و شمار کے مطابق دنیا کی پانچ ارب کی آبادی میں ڈیڑھ ارب آبادی مزدوروں اور محنت کشوں کی ہے، صرف ہندوستان میں ایسے لوگوں کی آبادی ۳۰ کروڑ ہے۔

پیٹ بھر کر کھانا ملے نہ ان کے بال بچوں کو، اس لیے موجودہ دور میں ہر حکومت مزدوروں کے مسئلہ پر خاص توجہ دے رہی ہے، اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے سبیل سوچتی رہتی ہے، مگر اس کے باوجود مزدوروں میں اطمینان کے بجائے روز بروز بے چینی بڑھتی جا رہی ہے، اور ان کی بے چینی کا پتہ ان ہڑتالوں سے ہوتا ہے جو آئے دن وہ کرتے رہتے ہیں، یہ ہڑتالیں صرف ہندوستان اور پاکستان جیسے ترقی پذیر ملکوں ہی میں نہیں بلکہ برطانیہ، فرانس، جاپان اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ اور مالدار ملکوں میں بھی ہوتی رہتی ہیں، ان ہڑتالوں سے جتنا مالی نقصان ملک کو پہونچتا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ۵۵ء میں کانپور کی کپڑا مل کے مزدوروں نے جو چند دن اسٹرائک کی تھی اس سے ستر لاکھ گز کپڑے کا نقصان ہوا، اور ۵۶ء میں مختلف کارخانوں میں جو ہڑتالیں ہوئیں اس سے سات لاکھ دن بے کار گئے، ۱۹۷۴ء میں جو ریلوے ہڑتال ہوئی تھی اس سے ملک کا کروڑوں روپیہ کا نقصان ہوا۔

اور اس سے بھی کچھ زیادہ ہی بے چینی ان کمیونسٹ ملکوں میں مثلاً روس، چین، ہنگری وغیرہ میں پائی جاتی ہے، جہاں کی حکومت کو خالص مزدوروں کی حکومت یا مزدور راج کہا جا سکتا ہے، مگر وہاں کی بے چینی آسانی سے اس لیے نہیں معلوم ہونے پاتی کہ ان ملکوں کے مزدوروں کی اصل حالت معلوم کرنا بہت دشوار ہے، وہاں کی حکومتیں اپنے ملک کی ان ہی خبروں کو باہر جانے دیتی ہیں جن میں حکومت کی تعریف ہو، ادھر[1] چند برسوں سے وہاں کے مزدوروں کی حالت معلوم کرنے کے لیے ایک اور ذریعہ وفود کی آمد و رفت سے پیدا ہو گیا ہے، مگر اس ذریعہ سے بھی جو باتیں ہم تک پہونچتی ہیں ان سے بھی مزدوروں کی حالت کی پوری کیفیت کا اندازہ لگانا دشوار ہے، کیونکہ دوسرے ملکوں کے جو وفود روس یا چین جاتے ہیں، ان کو اس بات کی آزادی نہیں ہوتی کہ وہ جہاں چاہیں اور جس وقت چاہیں چلے جائیں، بلکہ وہ وہیں جا سکتے ہیں جہاں حکومت ان کو جانے یا لیجانے کی اجازت دے، اگر وہ اپنی خواہش سے کہیں جانا چاہیں تو ان کو حکومت سے اجازت لینی پڑیگی، ایسی صورت میں وفد کے ارکان ان ہی چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں جو حکومت دکھائے یا جہاں حکومت

---

[1] اسٹالن کے مرنے کے بعد سے

لے جائے، ظاہر ہے کہ حکومت اپنی نیک نامی کے لیے انھیں وہیں لے جائے گی جہاں بڑے بڑے کارخانے ہوں گے، جن کے مزدوروں کے لیے مکان بھی نظر آئیں گے اور کھیل و تفریح کے میدان بھی، اور ان کے بچے مدرسوں میں تعلیم پاتے بھی دکھائی دیں گے، لیکن اگر ان کارخانوں کے پیچھے آپ کو کچھ دور جانے کی اجازت مل جائے تو پھر آپ کو نظر آئے گا کہ وہ تمام سہولتیں چند ہزار یا چند لاکھ آدمیوں کے لیے ہیں، مگر آبادی کی اکثریت کا حال بالکل وہی ہوگا جو ہندوستان کے مزدوروں کا ہے، یا شاید اس سے کچھ اچھا، خود ہمارے ملک میں باہر کے ملکوں سے جو وفود آتے ہیں وہ بھاکڑا ننگل بند، دامودر ویلی، ریہانند باند، بمبئی اور کلکتہ کے کارخانوں کے مزدوروں کے کوارٹر اور کھیل کے میدان اور اسکول دیکھ کر ہندوستان کی ترقی کی تعریف کا پُل باندھ دیتے ہیں، مگر چند میل کے فاصلہ پر عام مزدور آبادی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ان کو دو وقت روٹی بھی مشکل سے میسر ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ اگر بڑے بڑے کارخانوں کے چند ہزار یا دو چار لاکھ مزدوروں کو سہولت دے بھی دی گئی تو اس سے ان کی پوری آبادی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ جب بھی کمیونسٹ ملکوں میں مزدوروں کو موقع ملتا ہے وہ اسٹرائک کرتے ہیں گو کہ قانوناً اس کی اجازت ان کو نہیں ہے، چنانچہ مشرقی جرمنی اور ہنگری کی مثال سامنے موجود ہے[۱] عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسٹرائک کے ذریعہ مزدور اپنے حقوق خود بخود حاصل کر لیتے ہیں، مگر یہ ایک دھوکا ہے، اور اگر بفرض محال ان کو کچھ حقوق مل بھی گئے تو اس کا فائدہ چند ہزار یا چند لاکھ آدمیوں کو پہونچے گا، مگر یہ دنیا کی کئی ارب آبادی کو تو کسی کارخانہ کی ملازمت حاصل نہیں ہے جو کسی کے خلاف اسٹرائک کرکے اپنی دو وقت کی روٹی کا انتظام کرے گی۔

مزدور آبادی کا مسئلہ اس حیثیت سے بھی قابل غور ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی عام مزدوروں اور پیشہ وروں کو معاشرت اور سوسائٹی میں وہ مرتبہ نہیں مل سکا ہے جو غیر مزدوروں اور غیر پیشہ ور طبقہ کو

---

[۱] ۱۹۵۶ء میں ہنگری میں مزدوروں نے جس شد و مد کے ساتھ اپنی بے چینی کا اظہار کیا اور کمیونسٹ حکومت نے اور روس نے فوج بھیج کر ان کے اوپر جو ظلم و تشدد کیا اس کی مثال مشکل سے کسی ملک میں ملے گی، وہاں آج بھی مزدوروں کی یونین پر پابندی عائد ہے، اسی طرح پولینڈ میں ۱۹۸۳ء کے درمیان جو بے چینی پیدا ہوئی وہ سب کے سامنے ہے اور اس وقت تو روس و چین میں مزدور راج کے عوام جو کشمکش کر رہے ہیں اس سے کمیونزم کا سارا بھرم ختم ہو چکا ہے۔

حاصل ہے، چنانچہ مزدوروں اور مالکوں میں جو آئے دن کشمکش ہوتی رہتی ہے، اس کا ایک سبب یہ چیز بھی ہے۔

غرض یہ کہ جس حیثیت سے بھی دیکھا جائے موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی مزدور کو معاشی اور معاشرتی حیثیت سے اطمینان حاصل نہیں ہے، کہیں وہ سرمایہ داروں کے ہاتھوں سے پس رہا ہے اور کہیں حکومت کی اجارہ داری (اسٹیٹ کنٹرول) کے تحت اس کی صلاحیتوں کا خون ہو رہا ہے، فرق اتنا ہو گیا ہے کہ صنعتی انقلاب سے پہلے وہ ذرا زیادہ میلے کچیلے کپڑوں میں رہتا تھا، اور اب قدرے صاف ستھرے کپڑوں میں دکھائی دیتا ہے۔

مزدوروں کے مسائل اور اسلامی شریعت کی ہدایات

مزدوروں کی معاشی اور معاشرتی پریشانیوں اور الجھنوں کے رفع کرنے کے لیے اسلامی شریعت نے جو اخلاقی ہدایتیں اور قانونی بندشیں عائد کی ہیں اگر ان پر عمل کیا جائے تو مزدور معاشی حیثیت سے بھی مطمئن ہو جائے گا اور معاشرتی حیثیت سے بھی اس پر کوئی ظلم نہ ہو سکے گا۔

چند اصطلاحیں

(۱) اجرت: جو چیز محنت کے بدلہ میں دی جائے، اس کو موجَر اور مستاجَر (زبر کے ساتھ) بھی کہا جاتا ہے۔ (۲) اجیر: محنت کرنے والا۔ (۳) مستاجِر یا آجِر: کام لینے والا (۴) اجرت مثل: وہ اجرت جو حکومت مقرر کر دے، یا مزدوروں کے حالات و ضروریات سے واقف کار لوگ مقرر کر دیں[1] اور یہ لوگ ایسے ہوں جن کا کوئی مفاد ان سے وابستہ نہ ہو، قرآن میں اس کی تعبیر معروف کے لفظ سے کی گئی ہے، اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ جس معیار سے تم زندگی گذارتے ہو اسی میں ان کو بھی شریک کرو۔ (۵) ماجور: وہ چیز جو کرایہ وغیرہ پر دی جائے (۶) اجرت مسمّٰی وہ اجرت جو آجر اور مستاجر کے درمیان مقرر ہو جائے[2] اسے موجودہ معاشیات کی اصطلاح میں اجرت صحیحہ اور اجرت متعارفہ کہتے ہیں۔

---

[1] اجرة المثل هي الاجرة التي قدرتها اهل الخبرة لمن لا غرض لهم (المجلة ٦١)

[2] الاجر المسمى هو الاجرة التي ذكرت وعينت حين العقد ص ٦١۔

اس لیے انھوں نے ان کو بلوایا کہ اس نیکی کے بدلہ میں وہ بھی کچھ ان کی خاطر تواضع کر سکیں، چنانچہ حضرت موسیٰؑ آئے تو حضرت شعیبؑ نے پورا اخلاق صرف کیا، اثنائے گفتگو میں لڑکیوں نے کہا کہ اباجان! ان سے زیادہ قوی اور امین[1] آدمی نہیں مل سکتا، اس لیے آپ ان کو مستقل طور پر اپنے یہاں اجیر رکھ لیجیے، چنانچہ حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے اس کا اظہار کیا، اور انھوں نے اسے منظور کر لیا۔

حضرت شعیبؑ چونکہ یہاں مستاجر تھے اور مستاجر کی طرف سے عموماً ظلم و جبر ہوتا ہے اسلیے انھوں نے معاملہ کرتے وقت یہ بات واضح کر دی کہ:

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ	میں تم پر کوئی زیادتی کرنا نہیں چاہتا،
سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ	ان شاء اللہ تم مجھ کو خوش معاملہ
مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (قصص ۲۷)	پاؤ گے۔

چونکہ یہ معاہدہ ہو رہا تھا، اس میں دونوں فریق کو اپنی رضامندی اور شرائط کے ذکر کرنے کا حق تھا اس لیے حضرت موسیٰؑ نے جواب میں کہا:

ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ اَيَّمَا	یہ بات میرے اور آپ کے درمیان
الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا	طے ہو گئی ہے کہ دونوں مدتوں میں سے
عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا	جسے بھی میں پورا کروں گا اس کے بعد
نَقُوْلُ وَكِيْلٌ۔	مجھ پر کوئی زیادتی نہ کی جائے گی، اور
	اس معاہدہ میں جو باتیں ہم طے کر رہے
(سورۃ القصص آیت ۲۸)	ہیں، اس پر خدا گواہ ہے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ کا مقصد یہ ہے کہ ظلم و زیادتی سے باز رکھنے یا روکنے اور

---

[1] امین کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے پانی پلانے کے درمیان میں ان لڑکیوں کے ساتھ انتہائی عفت و پاکبازی کا سلوک کیا تھا، یعنی ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں، اس لیے انھوں نے ان کی اس صفت کا خاص طور پر ذکر کیا، اور قرآن نے ان صفتوں کا ذکر اس لیے کیا کہ انہی دونوں صفتوں یعنی قوی و امین کی بنا پر ایک مستاجر اجیر کی اجرت میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ اسلامی شریعت نے ہر معاملہ میں اخلاقی ہدایتیں بھی دی ہیں اور قانونی بھی، چنانچہ اجرت کے معاملہ میں بھی دونوں طرح کی ہدایتیں دی گئی ہیں۔

قرآن و حدیث کی ہدایتیں

قرآن میں دودھ پلانے والی عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر تم کسی غیر عورت سے اپنے بچے کو دودھ پلواتے ہو تو چونکہ وہ تمھارے بچے کو اپنے جسم کا خون جلا کر دودھ پلاتی ہے، اور اسکی پرورش کرتی ہے اس لیے تمھارا فرض ہے کہ اپنی گاڑھی کمائی سے اس کی ضروریات زندگی کا خیال رکھو اور اس بارے میں دونوں کو ایک دوسرے کی تکلیف کا خیال ہونا چاہیے:

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَ	جس کا بچہ ہے اس کے اوپر قاعدہ کے
كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ	مطابق دودھ پلانے والی کا کھانا کپڑا ہے،
نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا۔	کسی شخص کو اس کی برداشت سے زیادہ
(بقرہ ع ۲۹)	بار نہیں ڈالا جا سکتا۔

لفظ معروف اور تکلیف کی مزید تشریح آگے آئے گی۔

دوسری جگہ قرآن نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت شعیب کا واقعہ نقل کیا ہے جس میں حضرت شعیبؑ مستاجر اور حضرت موسیٰؑ اجیر ہیں۔

حضرت موسیٰ نبوت سے پہلے مدین کی طرف سے گذر رہے تھے کہ راستہ میں انھوں نے دیکھا کہ ایک کنویں پر جانوروں کے چرواہوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے، ان ہی میں دو[۲] لڑکیاں بھی ہیں جو اپنے جانور لیے الگ کھڑی ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کو ان کی بیچارگی پر رحم آیا، اور انھوں نے اس کی وجہ پوچھی، تو بولیں کہ میرے باپ بوڑھے ہو چکے ہیں، وہ آ نہیں سکتے، یہ چرواہے جب ہٹ جائیں گے تو ہم اپنے جانوروں کو پانی پلائیں گے حضرت موسیٰؑ آگے بڑھتے ہیں، اور ڈول کھینچ کر ان کے جانوروں کو پانی پلا دیتے ہیں، یہ لڑکیاں حضرت شعیبؑ کی تھیں، جانور لے کر جب یہ گھر پہونچتی ہیں تو اس واقعہ کا تذکرہ اپنے والد سے کرتی ہیں، حضرت موسیٰؑ نے یہ سمجھ کر پانی نہیں پلایا تھا کہ ان کو اس کی کوئی مزدوری ملے گی، مگر حضرت شعیبؑ نبی تھے اس لیے وہ کسی کی محنت خواہ رضاکارانہ ہی کیوں نہ ہو ضائع نہیں کر سکتے تھے،

دونوں کو جوڑے رکھنے کے لیے محض منفعت ہی درمیان میں نہ ہو، بلکہ یہ تصور بھی ہو کہ یہ معاملہ گویا خدا کے سامنے طے ہو رہا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چھپے کھلے کا جاننے والا ہے۔

ان آیات کی تشریح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشادات فرمائے ہیں وہ ملاحظہ ہوں:۔

سب سے پہلے آپؐ نے یہ بات واضح فرمائی ہے کہ محنت مزدوری کوئی گری پڑی چیز نہیں ہے، آپؐ نے فرمایا کہ تمام انبیاء نے بکریاں چرائی ہیں، صحابہؓ نے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ نے بھی؟ فرمایا: ہاں! میں بھی چند قیراط پر اہل مکہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ (بخاری)

مزدوروں کی اجرت کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ:

اَعْطُوا الْاَجِيْرَ قَبْلَ اَنْ يَّجِفَّ عَرَقُهٗ۔ (ابن ماجہ)	مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو۔

اگر کسی نے مزدوری نہ دی یا کم دی یا ٹال مٹول کیا تو اس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جن تین آدمیوں کے خلاف میں مدعی ہوں گا ان میں ایک:

رَجُلٌ اِسْتَاجَرَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهٖ اَجْرَهٗ۔ (بخاری)	وہ شخص جو کسی کو مزدور رکھے اور اس سے پورا پورا کام لے، مگر مزدوری پوری نہ دے۔

مزدوری پوری نہ دینے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اس کی مزدوری مار بیٹھے اور نہ دے، بلکہ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ جتنی اجرت اس کام کی ملنی چاہیے وہ نہ دے اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر کم سے کم اجرت پر کام لے لے، چنانچہ محدثین نے اس کی تشریح میں فرمایا ہے:[1]

وَلَمْ يُعْطِهٖ اَجْرَهٗ وَافِيًا۔	یعنی پوری پوری مزدوری نہ دے۔

دوسری حدیث میں ہے:

كفىٰ بالمرأ اثما ان يضيع مَن يقوت	آدمی کیلئے یہ گناہ کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضائع

---

[1] مرقاۃ: باب الاجارۃ۔

کر دے جن کی پرورش ان کے ذمہ ہے

مقصد یہ ہے کہ جس آدمی نے جن لوگوں کی معاشی ذمہ داری لی ہے وہ ان پر اتنی تنگی نہ کرے کہ ان کی جسمانی طاقت اور ذہنی صلاحیت برباد ہو جائے۔

ضروری ہدایات

آگے چند اور حدیثیں نقل کی جائیں گی جو زیادہ تر غلاموں سے متعلق ہوں گی، لیکن ان کو یہاں اس لیے نقل کیا جا رہا ہے کہ عرب میں اس وقت عام طور پر اسی طبقہ سے ذاتی ملازمت اور محنت مزدوری کا کام لیا جاتا تھا اسلئے ان کے بارے میں جو احکام آپ نے دیے ہیں ان کے مصداق ہمارے زمانہ کے ذاتی ملازم، اجیر، مزدور اور تمام محنت کش افراد ہیں، ایک بار حضرت ابوذر رضؓ نے کسی غلام کو سخت سُست کہہ دیا، آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ:

هُمْ اِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ فَمَنْ جَعَلَ اَخَاهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَ لَا يُكَلِّفْهُ مِنَ الْعَمَلِ مَا يَغْلِبُهٗ فَاِنْ كَلَّفَهٗ مَا يَغْلِبُهٗ فَلْيُعِنْهُ عَلَيْهِ۔

(بخاری و مسلم)

یہ تمہارے بھائی ہیں جن کو خدا نے تمہارا ماتحت بنا دیا ہے، تو اگر کسی کا بھائی اس کے ماتحت ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے، اور وہی پہنائے جو خود پہنے، اور اس سے ایسا کام نہ لے کہ وہ بالکل نڈھال ہو جائے اور اگر ان سے کوئی سخت یا زیادہ کام لینا ہے تو پھر اس کام میں اس کی اعانت کرو،

اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوئیں:۔

(۱) ملازموں اور مزدوروں کو اپنا بھائی سمجھا جائے۔

(۲) ان کو اتنی مزدوری دی جائے کہ جس طرح کا معیار زندگی مستاجر کا ہے اس سے قریب تر اجیر کا بھی ہو، یعنی دونوں میں زمین آسمان کا فرق نہ ہو، حتیٰ کہ ائمہ حدیث نے لکھا ہے کہ اگر کوئی مالک بخل کی وجہ سے بہت موٹا جھوٹا کھاتا پیتا اور پہنتا ہے تو اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے ملازموں اور اجیروں کو بھی اس پر مجبور کرے۔ (مرقاۃ)

(۳) ان سے اتنا کام نہ لیا جائے کہ وہ تھک کر نڈھال ہو جائیں یا وقت سے پہلے ان کی صحت خراب ہو جائے، اگر کبھی زیادہ کام لینے کی ضرورت پیش آجائے تو ان کی عملی اور مالی مدد کی جائے،

آپؐ نے فرمایا کہ آدمی کے لیے یہ گناہ کافی ہے کہ جس کی روزی اس کے ذمہ ہو اس کو وہ روک لے یا اس کو ضائع کر دے۔ (مسلم)

ظاہر ہے کہ ایک مزدور کی زندگی کا سارا دارومدار اس کے پیشہ کی کمائی پر ہوتا ہے، اس لیے اگر اس کو اس کی ضرورت سے کم مزدوری دی گئی تو گویا اس کی مزدوری روک لی گئی یا ضائع کی گئی۔

آپؐ نے فرمایا کہ اپنے ماتحتوں سے بدخلقی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ (ترمذی)

آپؐ نے اس محنت کش طبقہ کے بارہ میں یہاں تک فرمایا کہ:

وَاَكْرِمُوْهُمْ كَكَرَامَةِ اَوْلَادِكُمْ وَاَطْعِمُوْهُمْ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ابن ماجہ)	ان کی دیکھ بھال اس طرح کرو جس طرح اپنے لڑکوں کی کرتے ہو، جو تم کھاتے ہو اس میں سے ان کو بھی کھلاؤ۔

ایک صحابی نے پوچھا کہ اگر ملازم غلطی کرے تو کتنی بار اس کو معاف کیا جائے، آپؐ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، انھوں نے دوبارہ پوچھا، آپؐ پھر خاموش رہے، انھوں نے تیسری بار پوچھا، تو فرمایا کہ:

كُلَّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (ابوداؤد)	اگر ستر بار بھی روزانہ غلطی کرے تو معاف کرو۔

آپؐ کو اس مظلوم طبقہ کا اتنا خیال تھا کہ آپؐ نے مرض وفات میں جو آخری نصیحتیں فرمائیں ان میں ایک یہ تھی:

اَلصَّلٰوةُ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (ابوداؤد۔ مسند احمد)	نماز اور اپنے ماتحتوں کا خیال رکھنا۔

ان ارشادات نبویؐ کے تحت ائمہ حدیث نے صرف غلاموں، ملازموں اور مزدوروں ہی کو نہیں بلکہ محنت کش جانوروں کو بھی داخل کیا ہے جن کے قانونی حقوق کا ذکر آگے آئے گا۔

اجرت کی تفصیل اور اجیر و مستاجر کے قانونی حقوق

قرآن اور حدیث کی ان ہی ہدایات کی روشنی میں فقہاء نے مسئلۂ اجرت

کی قانونی تشریح اور اجیر ومستاجر کے قانونی حقوق واختیارات کی تفصیل کی ہے۔

اجرت کا معاملہ ایک معاہدہ ہے

اجیر ومستاجر یا مزدور ومالک کے درمیان کام لینے اور مزدوری دینے کا جو معاملہ ہوتا ہے اسلامی شریعت اس کو اسی طرح کا ایک معاہدہ قرار دیتی ہے[1] جس طرح خرید وفروخت کو ایک معاہدہ قرار دیتی ہے، یعنی ایک اجیر اپنی محنت پیش کرتا ہے، اور مستاجر یعنی کام لینے والا اس کے بدلہ میں اجرت و مزدوری دینے کا وعدہ کرتا ہے، اور دونوں اپنی رضامندی سے یہ طے کرتے ہیں کہ ہم کو یہ معاملہ منظور ہے، چنانچہ جس طرح بیع وشراء میں ایک دوکاندار مال دیتا ہے اور خریدار اس کی قیمت ادا کرتا ہے، ان میں سے کوئی کسی پر احسان نہیں کرتا، بلکہ دونوں کی حیثیت برابر ہوتی ہے، اسی طرح اجیر محنت پیش کرتا ہے، اور مستاجر اس کی محنت کی مزدوری دیتا ہے، ان میں سے کوئی کسی پر احسان نہیں کرتا، بلکہ معاملہ کے اعتبار سے دونوں کی حیثیت برابر ہوتی ہے، اس لیے نہ تو اجیروں اور مزدوروں کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی محنت ہی کو اصل چیز سمجھ کر مستاجر کو پریشان کریں، اور نہ مستاجر کو یہ حق ہے کہ وہ سرمایہ کو اصل چیز سمجھ کر محنت کشوں کو پریشان کرے یا ان کی حق تلفی کرے، بلکہ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "دونوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں اور ان سے اسی طرح کا معاملہ کریں جو ایک بھائی دوسرے بھائی کے ساتھ کرتا ہے۔" اجرت کے معاملہ کو ایک معاہدہ قرار دینے کے بہت سے فائدے ہیں، چند کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

یہ معاہدہ جس طرح زبانی ہوسکتا ہے اسی طرح خط وکتابت سے بھی ہوسکتا ہے[2]

معاہدہ قرار دینے کا فائدہ

(۱) اجرت کے معاملہ کو معاہدہ قرار دینے کا سب سے بڑا فائدہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے دونوں کو مساوی درجہ دینا ہے تاکہ معاشی اعتبار سے مزدور پیشہ طبقہ کو معاشرہ میں اوپر اٹھایا جاسکے، اور معاشرتی اعتبار سے بھی ان کو وہی مرتبہ حاصل ہو جو ایک مستاجر کو حاصل ہوتا ہے۔

---

[1] تنعقد الاجارة بالایجاب والقبول کالبیع، ص ۶۴ [2] کما ان الاجارة تنعقد بالمشافهة کذلك تنعقد بالمکاتبة وباشارة الاخرس ص ۶۴۔

(۲) معاہدہ قرار دینے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ دونوں فریق معاملہ کرتے وقت ایک دوسرے کی ضرورت اور معاشی حالت کا پورا خیال رکھیں، صرف اپنی غرض میں باؤلے نہ ہو جائیں، اگر ان میں سے کوئی فریق ایسا کرے گا تو حکومت مداخلت کرے گی، چنانچہ قرآن میں اجرت کے سلسلہ میں ایک بنیادی شرط لگی ہوئی ہے، وہ یہ کہ وہ اجرت بطور معروف دی جائے، معروف کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو وہ اجرت ایسی زیادہ ہو کہ اجرت دینے والے کی قدرت سے باہر ہو اور نہ اتنی کم ہو کہ اجرت پانے والے کی ضروریات پوری نہ ہو سکیں۔

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ	اور بچے والے پر قاعدے اور دستور
وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ	کے مطابق ان کا کھانا کپڑا ہے، کسی جان
لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا	کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں
(بقرہ: رکوع ۲۹)	کیا جا سکتا۔

حدیث میں معروف کے ساتھ اخوان (بھائی) اور اولاد کے الفاظ بھی منقول ہوئے ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ مستاجر کو اجیروں کی اجرت دینے میں وہی جذبہ رکھنا چاہیے جو ایک بھائی اپنے بھائی کے ساتھ یا ایک باپ اولاد کے ساتھ رکھتا ہے، اسی طرح اجیروں کو کام کرنے اور اجرت طلب کرنے میں وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو ایک بھائی دوسرے بھائی کے مقابلہ میں اختیار کرتا ہے، محض فائدہ اور خود غرضی ہی دونوں کو جمع کرنے اور جدا کرنے کا سبب نہ ہو۔

دودھ پلانے والی عورتوں کے سلسلہ میں قرآن میں جو لفظ معروف وارد ہوا ہے اس کی تشریح کرتے ہوئے امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

کھانے کپڑے کی تعیین مرد کی حالت کے پیش نظر ہوگی، اگر وہ خوش حال ہے تو اسی اعتبار سے اس کو دودھ پلانے والی کو کھانا، کپڑا دینا ہوگا، اگر وہ غریب ہے تو اس اعتبار سے وہ اس کو اجرت دے گا، اسی طرح لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اگر عورت اجرت مثل یعنی عام طور پر جتنی اجرت پر دوسری عورتیں دودھ پلاتی ہیں، اس سے زیادہ اجرت مانگے تو اس کو اجرت مثل سے زیادہ اجرت نہ دی جائے گی، اور اگر بچہ والا اجرت مثل سے کم اجرت دے تو اس کو مجبور کیا جائے گا کہ اس کو پوری اجرت ادا کرے۔ (ج ۱ ص ۴۰۴)

اور باتوں کے ساتھ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اجرت کے معاملہ میں حکومت کو دخل دینے کا پورا حق ہے، اگر یہ حق نہ ہو تو پھر اجرت مثل یا معروف اجرت کی تعیین کون کرے گا، اور تعیین کے بعد بھی اگر کوئی زیادتی ہو رہی ہے تو اس کو کون طاقت دور کر سکتی ہے؟

معروف اور اجرت مثل کی تعیین کے سلسلہ میں حکومت مزدوروں کی ضرورت کے ساتھ مستاجروں کے مالی فائدہ اور منافع کو بھی سامنے رکھ سکتی ہے، اگر ایک مِل مالک کو سال میں ایک لاکھ کا فائدہ ہوتا ہے، اور وہ صرف پچاس ہزار روپیہ اجرت میں تقسیم کرتا ہے اور اس سے مزدور مطمئن نہیں ہیں، یا ان کی واقعی بنیادی ضرورتیں پوری نہیں ہوتی ہیں تو مزدور اس سے مزید اجرت کا مطالبہ کر سکتے ہیں، اور اگر وہ نہ دے تو حکومت اس میں مداخلت کر کے ان کی اجرت میں اضافہ کرا سکتی ہے، کیونکہ یہ اجرت معروف کے خلاف بھی ہے، اور پھر ارشاد نبویؐ میں دونوں کو بھائی قرار دیا گیا ہے، اور یہ بات بھائی چارہ کی اسپرٹ کے خلاف ہے کہ ایک بھائی تو عیش و آرام کرے، اور اس کے دوسرے بھائی جن کی محنت سے اس کو یہ عیش و آرام حاصل ہوا ہے، اپنی بنیادی ضرورتوں کے لیے بھی مجبور ہوں۔

(۳) معاہدہ کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ جس طرح ایک خریدار کو یہ حق ہے کہ وہ جو چیز لے رہا ہے، اسے اچھی طرح دیکھ بھال لے اور غور و فکر کر کے لے اور دوکان دار قیمت کے بارے میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے، اسی طرح ایک اجیر اور مستاجر کو بھی حق ہے کہ وہ دونوں اجرت اور محنت کو دیکھ کر اور اسی کا اندازہ کر کے فیصلہ کریں، مثلاً آجر نے مزدور سے کہا کہ فلاں جگہ سے اتنی مٹی ڈھو کر میرے گھر پر لادو، یا تمھیں کارخانہ میں اتنی دیر تک مشین چلانی ہوگی اور اتنی اجرت ملے گی، اجیر نے منظور کر لیا، مگر اس نے مٹی کاٹنی شروع کی تو وہ بہت سخت نکلی اور اس محنت کے اعتبار سے اجرت کم مقرر ہے تو اس کو یہ حق ہوگا کہ وہ اس معاملہ کو فسخ کر دے، یا پھر مالک سے مزید اجرت طلب کرے، اسی طرح اس نے آٹھ گھنٹے مشین چلائی تو اس نے اندازہ کیا کہ میں یہ کام نہ کر سکوں گا، یا اتنی دیر تک مثلاً آٹھ گھنٹے تک مشین چلانے کی مزدوری جتنی ہونی چاہیے اس سے کم پر آجر نے کام کا وعدہ لے لیا ہے تو اس کے بعد اس کو حق ہوگا کہ وہ مزید اجرت طلب کرے، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ اس صورت میں وہ اجرت معروف اور اجرت مثل کا مستحق ہوگا[1]

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر۔

(۴) اسی طرح اگر آجر نے ایک مزدور کو رکھا، اور جب اس نے کام شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ کام اس سے نہ ہو سکے گا تو پھر اس کو چاہیے کہ اس سے دوسرا ہلکا کام لے، اور اگر اس کے پاس دوسرا کام نہیں ہے، تو پھر وہ اس کو علٰحدہ کر سکتا ہے، لیکن ان دونوں صورتوں میں اگر کوئی فریق یہ سمجھتا ہے کہ دوسرا فریق اس پر زیادتی کر رہا ہے تو وہ حکومت کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

(۵) معاہدہ کا پانچواں فائدہ یہ ہے کہ اجیر و مستاجر دونوں انسانی حیثیت سے بھائی ہیں اس لیے مستاجروں کی یہ ذہنیت نہ ہونی چاہیے کہ اجیر کوئی کمتر درجے کے انسان ہیں، اور وہ ان سے کچھ برتر ہیں، اس بھائی چارہ کا اثر اجرت کی ادائیگی میں بھی ہونا چاہیے، جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم ان کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو، اور وہی پہناؤ جو تم پہنتے ہو، اور معاشرتی حیثیت سے بھی ان کو سوسائٹی میں برابر کا درجہ ملنا چاہیے، محنت مزدوری کرنے سے وہ معاشرتی حقوق سے محروم نہیں ہو جائے گا، موٹے موٹے معاشرتی حقوق یہ ہیں، ان کے ساتھ کھانے میں عار نہ سمجھو، ان کو سلام کرنے میں سبقت کرو، ان کی خوشی و غم میں اسی طرح شریک ہو جس طرح تمہاری خوشی و غم میں وہ شریک ہوتے ہیں۔

معاہدہ کے بعد معاہدہ

اوپر بتایا گیا ہے کہ اجیر و مستاجر دونوں کی حیثیت برابر ہے، دونوں کو یہ حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں سوچ سمجھ کر اور کام اور اجرت کی تعیین کر کے پھر معاہدہ اجرت مکمل کریں، لیکن اگر معاہدہ طے ہونے کے بعد بھی کام یا اجرت کے بارے میں دونوں کو کوئی اعتراض ہے، اور وہ دوسرا معاہدہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ دوبارہ معاہدہ کر سکتے ہیں، اب پہلا معاہدہ فسخ ہو جائے گا۔

معاہدہ کب فسخ ہو سکتا ہے

لیکن جب آجر اور مستاجر ایک بار اجرت کا معاہدہ کر لیں تو پھر ان میں سے کسی کو اس کے فسخ کرنے کا حق اس وقت تک نہیں ہو گا جب تک کہ ان میں سے کسی کو کوئی ایسا عذر نہ پیش آجائے جس میں مستاجر

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) کل عمل یختلف ذاتا باختلاف المحل فللاجیر فیہ خیار الرویۃ، فلو ساوم خیاطا لیخیط لہ جبۃ فالخیاط بالخیار عند رویۃ الجوخ او الشال (شرح المجلۃ ص ۲۸۱)

کام لینے سے اور مزدور کام کرنے سے معذور ہو جائے، چنانچہ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے:

وَتُفْسَخُ الْإِجَارَةُ بِالْأَعْذَارِ۔ — اجرت کا معاملہ اعذار کی بنا پر فسخ کیا جا سکتا ہے۔

اسٹرائک اور کارخانہ بندی

مگر عذر کے یہ معنی نہیں کہ مزدور جب چاہیں بہانہ کر کے کام کرنا چھوڑ دیں، یعنی اسٹرائک کر دیں، اور مالک اور کارخانہ دار جب چاہیں اپنا پھاٹک بند کر کے مزدوروں کو بیکار کر دیں، بلکہ اس عذر سے مراد یہ ہے کہ

وَهُوَ عِجْزُ الْعَاقِدَيْنِ عَنِ الْمُضِيِّ فِي مُوجَبِهِ إِلَّا بِتَحَمُّلِ ضَرَرٍ لَمْ يَسْتَحِقَّ بِهٖ وَ هٰذَا هُوَ مَعْنَى الْعُذْرِ (ہدایہ ج ۳ ص ۲۹۹) — عذر کا مطلب یہ ہے کہ معاہدہ کرنے والا اس معاہدہ کو اسی وقت پورا کر سکے جب اسکو ایسا نقصان برداشت کرنا پڑے جو اس معاہدہ کی روح کے بالکل خلاف ہو، عذر کے یہی معنی ہیں۔

المجلہ میں ہے:

لَوْ حَدَثَ عُذْرٌ مَانِعٌ لِإِجْرَاءِ مُوجَبِ الْعَقْدِ تَنْفَسِخُ الْإِجَارَةُ (ص ۶۵) — اگر ایسا عذر جو معاہدہ کو پورا کرنے میں حارج ہو تو اجارہ کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔

اب یہ معاہدہ کیسے فسخ ہو تو اس بارے میں قدرے اختلاف ہے، صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ یہ بغیر قانونی چارہ جوئی کے ممکن نہیں ہے، اور بعض ائمہ کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ بغیر قانونی چارہ جوئی کے بھی یہ ممکن ہے، مگر ان دونوں رایوں کے درمیان ایک بیچ کی راہ بعض ائمہ نے پیدا کی ہے کہ اگر یہ عذر ظاہر ہو جس کو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے تو پھر قانونی چارہ جوئی کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر یہ عذر ظاہر نہیں ہے، بلکہ اس کو اجیر و مستاجر ہی سمجھ سکتے ہیں تو پھر اس میں قانونی چارہ جوئی کے بغیر معاہدہ فسخ نہیں کیا جا سکتا، مثلاً اگر کارخانہ میں آگ لگ گئی یا اور کوئی ارضی یا سماوی آفت آگئی تو کارخانہ دار حکومت کو اطلاع دیے بغیر بھی اپنا کارخانہ بند کر سکتا ہے، اور مزدوروں کو جواب دے سکتا ہے، لیکن اگر اسکو اپنی مصنوعات میں گھاٹا آرہا ہے، یا آگیا ہے تو وہ اس کا ثبوت حکومت کے سامنے پیش کرے، اگر حکومت اسے معقول عذر سمجھے گی تو فسخ کرا دے گی،

ورنہ نہیں۔

اسی طرح اگر مزدور بیمار پڑ گیا یا کسی حادثہ کا شکار ہو گیا جس کی وجہ سے وہ کام کرنے سے معذور ہے تو پھر وہ بغیر قضائے قاضی بھی کام چھوڑ سکتا ہے، لیکن اگر وہ اس جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہتا ہے، یا اس کام کے بجائے دوسرا کام کرنا چاہتا ہے، یا اس کو اجرت کم اور کام زیادہ معلوم ہوتا ہے تو وہ اس صورت میں نہ کوئی غیر قانونی حرکت کر سکتا ہے اور نہ اسٹرائک کر سکتا ہے، بلکہ اس کے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ یا تو وہ مستاجر کو فسخ معاہدہ پر راضی کرے، اگر وہ راضی نہیں ہوتا تو پھر حکومت کے سامنے اپنے مطالبات اور اپنی معذوریاں رکھے، جو مناسب ہو گا وہ فیصلہ کرے گی۔

غرض یہ کہ معاہدہ کے بعد مستاجر و اجیر دونوں محض اپنی اپنی خود غرضی اور منفعت کوشی ہی کو پیش نظر نہیں رکھیں گے، بلکہ دوسرے کے فائدہ و نقصان کو بھی سامنے رکھیں گے، اور جہاں اس میں کسی طرف سے کوئی زیادتی ہو گی وہاں حکومت مداخلت کرے گی۔

نوٹ حکومت کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی فریق کو دیوانی میں دعویٰ کرنا ہو گا، اور مہینوں کچہری کی خاک چھاننی پڑے گی، بلکہ صنعتی دیکھ بھال کے لیے ایک مستقل محکمہ ہو گا جو پورے ملک کے اجیروں اور مستاجروں کے حقوق کی نگہداشت کریگا اور ان میں جو اختلافاتی معاملات پیش آئیں گے وہ چند گھنٹے یا چند دن میں اس کے بارے میں فیصلہ کر دے گا۔ آج بھی یہ محکمے قائم ہیں، مگر فیصلہ کی دیر کی وجہ سے انصاف بے انصافی بن جاتی ہے۔

معاہدۂ اجرت کے صحیح ہونے کی قانونی شرائط

عام طور پر دنیا میں اجیر و مستاجر کے درمیان جو معاملہ طے ہوتا ہے، اس کی بنیاد صرف مادی فائدہ پر ہوتی ہے، یعنی عام طور پر اجیر کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ مستاجر اور آجر سے ہمارا تعلق صرف یہ ہے کہ اس سے ہمیں زیادہ سے زیادہ اجرت وصول ہونی چاہیے، خواہ اس کو فائدہ ہو یا نقصان، اسی طرح

لہ لو حدث فی الماجور عیب فالمستاجر بالخیار ان شاء استوفی المنفعة مع العیب واعطی تمام الاجرة وان شاء فسخ الاجارة (شرح المجلة ص ۲۴۲)

مستاجر اور آجر یہ سوچتا ہے کہ اجیروں کی محنت سے ہمیں اسی وقت تک سروکار ہے، جب تک کہ ان کی محنت ہمارے لیے مفید ہے، لیکن جب ان کی محنت ہمارے لیے بار آور نہ ہو تو پھر ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، یعنی جس طرح ایک مشین بے کار ہونے کے بعد پھینک دیجاتی ہے، اسی طرح وہ بھی پھینک دینے کے قابل ہیں، وہ یہ بھی سوچتا ہے کہ اصل فائدہ اس کو مزدوروں کی محنت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنے سرمایہ کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، اس لیے فائدہ کا اصل حق اس کو ہے، اور ضمنی فائدے کے مستحق مزدور ہیں۔

اسلامی نظام اجرت میں بھی قانونی اعتبار سے اصل چیز منفعت ہی ہے، مگر ہر قدم اور ہر ہر موقع پر یہ بات پیش نظر رکھی گئی ہے کہ دونوں کا تعلق محض ایک مشین اور مشین کے چلانے والے کا نہ ہو، بلکہ ایسا تعلق ہو جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے ساتھ ہونا چاہیے، جس طرح مستاجر کے سینے میں دل ہے، اسی طرح مزدور کے سینہ میں بھی دل ہوتا ہے، جس طرح اس کے دل میں احساسات وجذبات پیدا ہوتے ہیں اسی طرح مزدور کے دل میں بھی احساسات وجذبات پیدا ہوتے ہیں، اس لیے دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اسی حیثیت سے تعلق رکھنا چاہیئے اور معاملہ کرنا چاہیئے۔

مستاجر کو خاص طور پر سوچنا چاہیئے کہ سرمایہ بغیر محنت کے بالکل بے کار ہے، اور محنت سرمایہ کی محتاج ضرور ہے مگر بغیر سرمایہ کے وہ بالکل بے کار نہیں ہے، لیکن یہ تعلق کیسے پیدا ہو، اور پھر کیسے باقی رہے، اس کے لیے اخلاقی ہدایتیں بھی دی گئی ہیں اور قانونی ہدایتیں بھی، اخلاقی ہدایتوں کا ذکر اوپر آچکا ہے، اور قانونی ہدایتوں کے سلسلہ میں معاہدۂ اجرت اور اسکے فسخ کرنے کے طریقہ کا ذکر آچکا ہے، اب آگے یہ بتایا جائے گا کہ اس معاہدہ کے صحیح ہونے کے کون ایسے شرائط ہیں جن کی رعایت سے اجیر ومستاجر کے درمیان کش مکش کی کم سے کم صورت پیش آسکتی ہے۔

(۱) معاہدہ کرنے کے سلسلہ میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اجیر ومستاجر دونوں عقل و ہوش رکھتے ہوں، دونوں کا بالغ ہونا ضروری نہیں ہے، اس لیے بالکل نادان بچے یا پاگل و بے عقل بالغوں کے درمیان اجرت کا معاملہ نہیں ہو سکتا، نادان بچوں کے ولی اگر چاہیں تو انکو

اپنے کام میں شریک کر سکتے ہیں، مگر وہ براہ راست نہ تو اجیر ہو سکتے ہیں اور نہ مستاجر[1]

(۲) دونوں کی رضامندی ضروری ہے، یعنی نہ تو سرمایہ دار اپنے سرمایہ کا دباؤ ڈال کر ان سے کم اجرت پر کام لینے کی کوشش کرے اور نہ اجیر اپنی محنت کے ذریعہ کوئی دباؤ ڈال کر آجر سے زیادہ اجرت حاصل کرنے کی کوشش کرے، مثلاً مظاہرہ یا اسٹرائک کی دھمکی وغیرہ کے ذریعہ[2]

(۳) اجرت متعین و معلوم ہونی چاہیے، یعنی یہ طے ہو جانا چاہیے کہ روزانہ یا ماہانہ کتنی اجرت ملے گی، اس طرح طے کرنا صحیح نہیں ہے کہ مناسب اجرت دے دی جائے گی، اگر بغیر طے کیے ہوئے کسی سے کام کرا لیا تو یہ معاہدۂ اجرت صحیح نہیں ہے، اور اس کو اجرت مثل دینی پڑے گی، البتہ اگر پہلے سے کسی کام کی اجرت عام طور پر متعین ہے، یا جیسا کام اور جتنا کام وہ لے رہا ہے، اتنے کام کی اجرت پہلے سے مقرر ہے تو بغیر طے کیے ہوئے بھی معاملہ ہو سکتا ہے، مگر اس صورت میں آجر کو اتنی ہی اجرت دینی اور اجیر کو اتنی ہی اجرت لینی پڑے گی جتنی کہ اس کام پر عام مزدوروں کو دی جاتی ہے، البتہ مقام کے لحاظ سے کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے، مثلاً ایک مزدور کو کلکتہ میں جتنی مزدوری ملتی ہے اتنی کسی چھوٹے شہر میں نہیں ملتی تو کلکتہ کے مزدور کو چھوٹے شہر کے مزدوروں کی مزدوری نہیں دی جا سکتی، اور نہ چھوٹے شہر کے مزدوروں کو بڑے شہر کی مزدوری دی جا سکتی ہے۔[3]

(۴) اجرت کے ساتھ کام کی نوعیت، جگہ اور وقت بھی معلوم ہونا چاہیے، مثلاً جو کام لینا ہے، اسے وہ کام اور جگہ بتا دینی چاہیے یا پھر وقت یا کام کی مقدار بتا کر اجرت طے کرنی چاہیے یعنی اگر آپ ایک مزدور رکھتے ہیں تو اس کو بتا دینا چاہیے کہ تم کو اتنی اجرت ملے گی، روزانہ اتنا کام کرنا ہوگا، اور یہ کام تم کو فلاں کارخانہ اور فلاں مقام پر کرنا ہوگا یعنی کلکتہ میں، بمبئی میں یا لکھنؤ میں اور کپڑے کے کارخانہ میں یا جوتے کے کارخانہ میں، یا سیمنٹ یا پٹ سن یا موٹر یا جہاز کے

---

[1] یعنی کونہما عاقلین ممیزین (المجلۃ ص ۶۵) [2] یشترط فی الاجارۃ رضا العاقدین فلا تصح اجارۃ المکرہ (شرح المجلۃ ص ۲۵۴) [3] یشترط ان تکون الاجرۃ معلومۃ بتعیین مقدارہ ان کان نقداً و قدراً و وصفاً ان کان من العروض او المکیلات (شرح المجلۃ ص ۶۰)۔

کارخانہ میں، کیونکہ مقام اور کام کی نوعیت کی وجہ سے اجرت میں کمی اور زیادتی ہوجاتی ہے[1]

کام کی مقدار بتاکر بھی اجرت طے کی جاسکتی ہے، یعنی اس طرح طے ہو کہ اتنا کام کروگے، تو اتنی اجرت ملے گی، جیساکہ عام طور پر ٹھیکہ میں ہوتا ہے، لیکن اگر اجرت کے مقابلہ میں کام زیادہ ہوگا یا سخت ہوگا تو اتنے کام کی عام طور پر جو اجرت ملتی ہے وہ دینی پڑے گی، اسی کو اجرت مثل کہا جاتا ہے اسی طرح ماہوار تنخواہ پر بھی مزدور رکھا جاسکتا ہے، مگر اس میں بھی کام کی نوعیت اور مقام بتانا ضروری ہے۔

غرض یہ کہ اجارہ میں چار چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے: (۱) اجیر (۲) مستاجر (۳) اجرت (۴) اگر سامان ہو تو بدل اجارہ۔

ھدایت

اگر ان میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے گی تو یہ معاہدہ فاسد سمجھا جائے گا، معاہدہ کے فسخ ہوجانے کی صورت میں اجیر کو جتنے دن اس نے کام کیا ہے اس کی اجرت ملے گی۔

اجیر اور مستاجر کے حقوق اور انکی ذمہ داریاں

اسلامی قانون اجرت میں نہ تو سرمایہ کو اصل بنیاد بناکر محنت کو اس کا تابع بنادیا گیا ہے، جیساکہ موجودہ جمہوری نظاموں میں عملاً ہوتا ہے، اور نہ محنت اور تنظیم کو اصل قرار دیکر انفرادی سرمایہ کو یا تو بالکل اسی کے تابع کردیا گیا ہے، یا اس کے وجود کو ختم کردینے کی کوشش کیگئی ہے، بلکہ اس میں دونوں کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے دونوں کے امتزاج سے ایک نئی صورت پیدا کی گئی ہے، جیساکہ اوپر معاہدہ کے ضمن میں اس کی وضاحت کی گئی ہے، اب چونکہ اسلامی قانون اجرت میں دونوں کے وجود کو تسلیم کرلیا گیا ہے، اس لیے دونوں کے حقوق اور ذمہ داریاں بھی متعین کردی گئی ہیں۔

---

[1] یلزم تعیین الماجور ویشترط ان تکون الاجرة معلومة وان تکون المنفعة معلومة فی استیجار اهل الصنعة ببیان العمل یعنی بتعیین مایعمل الاجیر (المجلة ص ٦٦)

مستاجر کے حقوق اور ذمہ داریاں

(۱) مستاجر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس صنعتی، تجارتی یا زراعتی و خانگی و ذاتی کام کے لیے چاہے روزانہ اجرت پر یا ماہوار تنخواہ پر ایک دو یا ہزار دو ہزار، لاکھ دو لاکھ مزدوروں سے ان شرائط پر کام لے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، اگر ان کے خلاف وہ کرے گا تو وہ قانونی طور پر بھی سزا کا مستحق ہوگا، اور اگر کوئی طاقت اس کو قانونی سزا دینے والی نہ بھی ہو تو آخرت میں اس کا مواخذہ اس سے ہوگا، حضرت موسیٰ نے اجرت کا معاہدہ کیا تو قانونی شرائط طے کرنے کے بعد فرمایا تھا کہ:

وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ (قصص) — ہم جو کچھ طے کر دیتے ہیں اس کا حقیقی نگراں خدا تعالیٰ ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ (بخاری و مسلم) — ہر ایک تم میں سے چرواہا اور نگراں ہے اور اس سے اپنی رعیت اور ماتحت کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائیگا

(۲) اجیر کی معاشی مجبوری، بےبسی اور بے روزگاری سے فائدہ اٹھا کر اس کو اجرت کم دے کر کام زیادہ لینے کی کوشش نہ کرنی چاہیے، اگر وہ ایسا کرے گا تو اخلاقاً و دیانۃً بھی مجرم ہوگا اور قانوناً بھی، یعنی آخرت میں بھی اس کا وبال اس کو بھگتنا پڑے گا اور اسلامی حکومت بھی اس معاملہ میں مداخلت کرنے کی مجاز ہوگی، خواہ حکومت خود اس بات کو معلوم کر لے کہ ایک مستاجر مزدوروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان پر ظلم کر رہا ہے، یا مزدوروں کے توجہ دلانے پر اس کو معلوم ہو، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔

(۳) اگر مستاجر یہ محسوس کرتا ہے کہ ایک مزدور نے کام بگاڑ دیا، یا دل لگا کر کام نہیں کرتا تو اس کو یہ حق ہوگا کہ وہ اس کو علیحدہ کر دے، مگر علیحدہ کرنے سے پہلے دو باتیں دیکھنی ہوں گی ایک یہ کہ یہ بات کسی جسمانی عذر کی وجہ سے تو نہیں ہے، اس صورت میں اس پر کوئی دار و گیر نہیں کی جا سکتی[۱] دوسرے اس کی عدم دلچسپی کا سبب اجرت کی کمی تو نہیں ہے، تو یہ کمی اگر

---

[۱] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اجر مثل سے کم ہے تو پھر اس کو اجر مثل کے مطابق اجرت کر دینی ہوگی، اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہ ہو تو پھر مستاجر قانوناً اس کو زیادہ کام کرنے پر مجبور کر سکتا ہے، اور قصداً کام بگاڑنے کی صورت میں اس سے تاوان لے سکتا ہے، یا حکومت کے ذریعہ معاملہ کو فسخ کرا سکتا ہے[1]

(۴) اگر مستاجر کسی دن کام نہ لے تو اس دن کی اجرت اس کو دینی پڑے گی یا نہیں؟ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اگر اس نے ماہوار تنخواہ پر مزدوروں کو رکھا ہے، اور مزدور کام پر حاضر تھا مگر اس سے کام نہیں لیا گیا تو اس صورت میں کام نہ لینے یا چھٹی کے دن کی بھی اجرت اس کو دینی پڑے گی، لیکن اگر اس نے روزانہ کی مزدوری پر رکھا ہے تو وہ جس دن کام لے گا اس دن مزدوری دے گا، اور جس دن کام نہیں لے گا مزدوری نہیں دے گا[2]

(۵) اجرت دینے کے لیے مستاجر نے جو وقت مقرر کیا ہے اس وقت اس کو اجرت دے دینا ضروری ہے، اگر اتفاق سے کسی دن یا کسی ماہ میں تاخیر ہوگئی تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر عادۃً وہ ایسا ہی کرتا ہے تو قانونی اور اخلاقی دونوں حیثیت سے وہ مجرم ہوگا، اجیر کی اجرت میں تاخیر کرنا انتہائی برا ہے، اوپر ارشاد نبوی ﷺ گذر چکا ہے کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی دے دینا چاہیے۔

علاج وامداد

(۶) کسی ملک کے بے کار، اپاہج اور بیمار افراد کی دیکھ بھال کی سب سے زیادہ ذمہ داری تو حکومت کے اوپر ہوتی ہے، لیکن معاشرہ کے افراد پر بھی اس کی ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں، اگر کوئی فرد بیکاری کی وجہ سے بھوکوں مر جائے، یا علاج میسر نہ ہونے کی وجہ سے وہ لقمۂ اجل ہو جائے تو محض حکومت ہی قصوروار نہ ہوگی، بلکہ معاشرہ کے وہ تمام افراد گنہگار

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ) لان الاجارة کما تنقض الاجارة بالاعذار تبقی بالاعذار .. (شرح المجلة ص ۲۵۱) [1] ان کان المستاجر یخرب ولم یقتدر الاجر علی منعه راجع الحاکم (المجلة ص ۷۷) [2] الاجیر الخاص یستحق الاجرة اذا کان فی مدة الاجارة حاضراً للعمل ولا یشترط عمله بالفعل ولکن لیس له ان یمتنع من العمل، واذا امتنع لا یستحق الاجرة (المجلة ص ۶۳)

ہوں گے، اور اس کے ذمہ دار قرار دیے جائیں گے جنھوں نے قدرت کے باوجود اس کی دیکھ بھال نہیں کی، اور یہ ذمہ داری اس شخص پر اتنی ہی زیادہ ہوگی جو اس سے جتنا قریبی تعلق رکھتا ہوگا خواہ وہ تعلق خون کا ہو، عزیزانہ ہو یا محلہ پڑوس کا، مستاجر جن مزدوروں سے یا کوئی مالک جن نوکروں سے کام لیتا ہے وہ ان سے سب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، اس لیے ان کی جملہ ضروریات کی دیکھ بھال ان کے ذمہ ہونی چاہیے، یعنی راقم کے خیال میں مزدوروں کے علاج معالجہ کی اخلاقی ہی نہیں بلکہ قانونی ذمہ داری بھی مستاجروں پر ہونی چاہیے، جس طرح ایک مضارب کام کے اخراجات کے علاوہ علاج کا خرچ بھی مضاربت کے روپیے سے لے سکتا ہے جس کا اثر براہ راست روپیہ لگانے والے کے سرمایہ پر پڑتا ہے، اسی طرح ایک مزدور جس کی حیثیت عملاً ایک مضارب کی ہے، اس کے علاج کی ذمہ داری بھی سرمایہ لگانے والے پر ڈالی جانی چاہیے[1]

اجرت کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات اور مضاربت کے احکام کی روشنی میں راقم نے یہ رائے قائم کی ہے، مگر بہرحال یہ راقم کا قیاس ہے، اگر اس میں کوئی غلطی ہے تو اہل علم حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اس غلطی کی طرف توجہ دلادیں، مگر یہ گذارش ضرور ہے کہ جو بات کہی جائے وہ دلائل کے ساتھ کہی جائے۔

(۷) عام طور پر مزدوروں سے جو کام جتنے گھنٹے لیا جاتا ہے اس سے زیادہ کام نہ لیا جائے اگر کوئی مستاجر قدرت سے زیادہ کام لینے کی کوشش کرے گا تو خواہ مزدور اپنی مجبوری کی وجہ سے اس پر راضی ہی کیوں نہ ہو جائے اس سے روکا جائے گا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیا جائے، حتیٰ کہ آپؐ نے جانوروں کے بارے میں بھی یہی حکم دیا ہے اوپر حدیث نقل کی جاچکی ہے اور جانوروں کے احکام کا ذکر آگے آرہا ہے۔

(۸) مستاجر ملازموں یا مزدوروں کو متنبہ تو کرسکتا ہے، مگر گالی گفتہ یا زدوکوب نہیں کرسکتا،

---

[1] عیادت مریض کے سلسلہ میں جو تاکید حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اور دوسروں کو علاج و معالجہ کا جو مشورہ دیا ہے، اور خود دوسروں کیلئے اہتمام فرمایا ہے اس کی بنا پر اس کو قانونی حیثیت دینے کی بات راقم نے کہی ہے۔

اگر کرے گا تو حکومت اس کو سزا بھی دے سکتی ہے، اور جرمانہ بھی کر سکتی ہے[۱] اگر وہ کرے گا اور وہ زخمی ہو جائے یا مر جائے تو اس کو تاوان دینا ہوگا۔

(۹) کسی آدمی کو اپنے والدین، اپنے چچا اور اپنے بڑے بھائی سے نہ خدمت لینی چاہیے اور نہ انھیں اجیر کی حیثیت سے کام لینا چاہیے، اگر والدین کافر ہوں جب بھی ان سے خدمت لینا جائز نہیں ہے[۲] اسی طرح ماں باپ بھی اپنے لڑکے یا لڑکی کو مزدوری کی حیثیت سے نہیں رکھ سکتے، اس لیے کہ ماں باپ کے اوپر لڑکے لڑکیوں کی کفالت کی ذمہ داری ہے، اور ماں باپ اگر معذور رہیں تو ان کی کفالت کی ذمہ داری لڑکوں پر ہے، اور اگر وہ لڑکا معذور نہیں ہے تو ان سے خدمت لینا یا مزدوری کرنا ان کی توہین ہے، اور شریعت میں ماں باپ کی توہین جائز نہیں۔

مزدوروں اور ملازموں کے حقوق اور انکی ذمہ داریاں

(۱) مستاجر کی طرح اجیر کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس نے مستاجر سے کام کرنے کا جو معاہدہ کیا ہے اس معاہدہ کی پابندی صرف اس پر قانونی حیثیت ہی سے ضروری نہیں ہے، بلکہ اخلاقی حیثیت سے بھی ضروری ہے، اگر وہ اس میں کوئی کوتاہی کرکے یا کوئی کام بگاڑ کر کے قانونی چارہ جوئی سے بچ بھی جائے تو قیامت کے مواخذہ سے نہ بچے گا، جس طرح خدا مستاجر کے کھلے چھپے ہر طرح کے ظلم کو دیکھتا ہے، اسی طرح اس کی کھلی اور چھپی کوتاہیوں اور غفلتوں پر بھی نگاہ رکھتا ہے ذٰلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ یعنی اس معاہدہ کے ساتھ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُولُ وَكِيلٌ پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ خدا تعالیٰ اس معاہدہ کو پورا کرنے اور نہ کرنے کو دیکھ رہا ہے

(۲) اوپر ذکر آچکا ہے کہ اجیر مشترک یعنی پیشہ وروں کی حیثیت تو امین یا ضمانت کی ہوتی ہے، مگر اجیر خاص کی حیثیت ایک امین اور بے ضمانت کی ہوتی ہے، یعنی جس طرح ایک امین کی یہ

---

[۱] وقد اتفقوا على عدم جواز ضرب الانسان المستاجر للخدمة فإذا ضربه وعتبه كان عليه الضمان لأن الإنسان الكبير يومر وينهى ويفهم فلا معنى لضربه (الفقه على المذاهب الأربعة ج ۳ ص ۱۲۴)۔

[۲] لا يصح للإنسان ان يستاجر أبويه ولو كافرين (ايضاً ص ۱۲۵)

ذمہ داری ہے کہ جو امانت اس کے سپرد کی جائے اس کی پوری حفاظت کرے، اور حفاظت کے باوجود اتفاق سے اگر وہ ضمانت ضائع ہوجائے یا اس میں نقص آجائے تو اس سے اس کا تاوان نہ لیا جائے گا، لیکن اگر وہ قصداً وہ چیز ضائع کردے تو پھر اس سے تاوان لیا جائے گا، اسی طرح ہر اجیر و مزدور مستاجر کی طرف سے دو چیزوں کا امین ہوتا ہے، ایک تو کام کا، دوسرے اُن چیزوں کا جو اس کے چارج یا استعمال میں ہوتی ہیں، یعنی اگر اس نے کسی عذر کی بنا پر یا اتفاق سے کام میں کوئی کوتاہی کردی یا جو چیز اس کے استعمال یا چارج میں تھی، اتفاق سے وہ ٹوٹ گئی، یا اس میں کوئی نقص آگیا تو اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، مثلاً کوئی مزدور مشین چلا رہا تھا وہ ٹوٹ گئی یا اس کا کوئی پرزہ خراب ہوگیا یا کوئی ملازم گلاس میں پانی پی رہا تھا، اتفاق سے اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر ٹوٹ گیا، یا چینی کا برتن دھو رہا تھا ٹوٹ گیا، تو اس سے تاوان نہیں لیا جائے گا، لیکن اگر اس نے قصداً مشین سیدھی چلانے کے بجائے الٹی چلادی، یا اس کی گرمی اور ٹھنڈک کا لحاظ کیے بغیر دھندھا اس کو چلا دیا اور وہ ٹوٹ گئی، یا اس نے دیا سلائی جلادی اور مشین میں آگ لگ گئی، یا ملازم نے گلاس یا برتن کو قصداً توڑ دیا، یا اس کو ایسی جگہ رکھ دیا جہاں بچے یا بلیاں آسانی سے پہونچ سکتی ہیں اور وہ ٹوٹ گیا، تو اس سے اس کا تاوان لیا جائے گا، کیونکہ ان تمام صورتوں میں خود اجیر نے ایسی صورت پیدا کردی ہے جس کی وجہ سے یہ نقصان ہوا ہے، اسی طرح کسی دن اتفاق سے اس نے کام اس مقدار سے کم کیا جتنا اسے کرنا چاہیے، یا وہ بیمار تو نہیں ہے مگر اس کی طبیعت کچھ سست ہے، یا اسے رنج و غم درپیش ہے، تو ایسی صورت میں مستاجر کو اس سے بازپرس نہ کرنی چاہیے، لیکن اگر وہ عادۃً ایسا کرتا ہے تو پھر اس کو بازپرس اور اخراج کا حق بھی حاصل ہے۔[1]

(۳) اگر مستاجر کی ہدایت کے خلاف کوئی کام کرے گا اور نقصان ہوگا تو اس صورت میں بھی اس کو تاوان دینا ہوگا۔[2]

---

[1] حرکۃ المستاجر علی خلاف المعتاد تعد یضمن الضرر والخسار الذی یتولد منہا [2] تعدی الأجیر ھو ان یعمل عملا او یتحرک حرکۃ مخالفین لامر الآجر صراحۃ او کان دلالۃ، تقصیر الاجیر ھو قصورہ فی محافظۃ المستاجر فیہ بلاعذر۔ (المجلۃ ۔۸۶۔۸۸)

معاہدہ کی رو سے اجرت کا جو وقت مقرر ہے اس سے پہلے اجرت مانگنے کا حق اجیر کو نہیں ہے، اگر آجر خود دے دے تو اس کو اس کا حق ہے، لیکن اس صورت میں اجیر پر یہ ذمہ داری ہوگی کہ جتنی مدت کی وہ اجرت لے چکا ہے اتنی مدت تک وہ کام کرے، البتہ اگر اجرت اجر مثل سے کم ہو تو پھر وہ اتنی مدت کا پابند ہے جتنے دن کی اجرت اجر مثل کے اعتبار سے اس کے ذمہ باقی ہو

(۴) جتنے دن کے لیے یا جتنے کام کے لیے اجرت کا معاہدہ کیا گیا ہے اس کے اختتام سے پہلے اجیر کو یہ حق نہیں ہے کہ بغیر کسی عذر کے کام چھوڑ دے، عذر کی تفصیل اوپر کی جا چکی ہے، اسی طرح اس کو مظاہرہ کرنے، اسٹرائک کرنے کا بھی حق نہیں ہوگا، البتہ اگر مستاجر کوئی ظلم کر رہا ہے تو وہ عدالت کی طرف رجوع کر سکتا ہے، البتہ اگر اس کی اجرت مستاجر روک لے تو اس کو کام بند کرنے اور مطالبہ کرنے کا حق ہوگا یا نہیں، اس بارے میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے عام اصول کی بنا پر تو اس کو اس کی اجازت نہیں ہے، لیکن ائمہ ثلاثہ کے اصول کے مطابق اس کی اجازت اسے ہے۔

اسٹرائک

جب مزدوروں کو اجرت مثل سے کم اجرت مل رہی ہو تو وہ اسٹرائک کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس بارے میں علماء کو غور کرنا چاہیے، راقم کا رجحان اسٹرائک کی تائید کی طرف ہے، اور اس کی بنیاد دو چیزوں پر ہے، ایک ائمہ ثلاثہ کی اس رائے پر جس میں انھوں نے اجیر خاص اور اجیر مشترک کو اجرت نہ ملنے کی صورت میں وہ مال یا چیز روک لینے کی اجازت دی ہے جو اس کے قبضہ میں ہے، دوسرے خود امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق کم از کم صنعتی مزدوروں کو اس حیثیت سے ان اجیروں کے حکم میں داخل کرنا پڑے گا جن کے کام سے اصل چیز میں کوئی تبدیلی آجاتی ہے، کیونکہ کپڑا بننے والا مزدور سوت کو کپڑے کی شکل دیتا ہے، چمڑے کے کارخانہ میں کام کرنے والے مزدور اس کو سکھا کر اور رنگ کر دوسری شکل دیتے ہیں، ایک لالٹین بنانے والا مزدور ایک دھات کو دوسری شکل دیتا ہے، غرض یہ کہ یہ سب اس کلیہ کے تحت اس میں داخل ہوتے ہیں۔

لیکن چونکہ راقم کو اس سلسلہ میں علماء کی کوئی رائے نہیں مل سکی ہے، اس لیے اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی رائے سے آگاہ کریں، ضرورت ہے کہ فقہ حنفی کے ساتھ

ائمۂ اربعہ کے مسلک کی کتابیں بھی سامنے رکھی جائیں، ان مسائل میں ذرا وسعت نظر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

(۵) اگر مستاجر نے کسی کام کے بارے میں یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم ہی یہ کام کرنا تو اس صورت میں اجیر اپنے عوض دوسرے مزدور سے بھی مستاجر کا کام کرا سکتا ہے، لیکن اگر اسی کے کام کرنے کی قید لگادی ہے تو اسی کو کرنا چاہیے، دوسرے سے اگر وہ کام لے گا تو وہ ضامن ہوگا، یعنی اگر کوئی نقصان ہو جائے گا تو خواہ اتفاقی طور پر کیوں نہ خراب ہوا ہو اجیر کو اس کا تاوان دینا پڑے گا

اجرت کی بعض جائز و ناجائز صورتیں

(۱) اگر کسی نے اپنے لڑکے کو تعلیم کیلئے اسکول میں یا کسی چیز کی ٹریننگ کیلئے کسی کارخانہ یا کسی شخص کے پاس بھیجا تو اسکول کا ذمہ دار، کارخانہ دار یا وہ شخص اس کی اجرت لے سکتا ہے یا نہیں، اور اگر لے گا تو کتنی اجرت لے گا، اس کی کئی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ تعلیم اور ٹریننگ دینے کی مدت بھی مقرر تھی اور اجرت بھی، تو اس مدت تک لڑکے کے سرپرست کو جو اجرت مقرر ہے وہ دینی پڑے گی، خواہ اس کا لڑکا اس سے کام سیکھے یا نہ سیکھے، مثلاً اسکول میں جو ماہانہ فیس لی جاتی ہے وہ اس کو دینی پڑے گی، خواہ اس کا لڑکا اسکول جائے یا نہ جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ اجرت کی تعیین تو کی مگر مدت مقرر نہیں کی تو یہ اجارہ کا معاہدہ ناقص ہوا، اب لڑکا جتنے دن کام سیکھے گا اتنے دن کی اجرت اسکول والوں یا کارخانہ دار کو دی جائے گی، اور جتنے دن وہ تعلیم حاصل نہ کرے گا ان کو اجرت نہیں ملے گی، تیسری صورت یہ ہے کہ اس نے تعلیم یا ٹریننگ کے لیے لڑکے کو حوالہ کیا، مگر اجرت کا تقرر دونوں میں سے کسی نے نہیں کیا تو تعلیم دینے والے کو اجرت ملے گی یا نہیں؟ اس کا فیصلہ عرف عام کے مطابق کیا جائے گا، اگر عام طور پر اس کام کے سیکھنے پر اجرت لی جاتی ہوگی تو استاد مطالبہ کرسکتا ہے، اور اگر نہیں لی جاتی ہوگی تو نہیں کرسکتا[1]

---

[1] لو استوجر أستاذ لتعليم علم أو صنعة فإن ذكرت مدة انعقدت الإجارة على المدة حتى ان الأستاذ يستحق الأجرة بكونه حاضرا و مهيئًا للتعليم قرأ التلميذ أو لم يقرأ، وان لم تذكر المدة انعقدت إجارة فاسدة (المجلہ ص ۸۲)

(۲) جن اداروں یا محکموں میں کوئی ایک شخص مالک نہیں ہوتا، بلکہ حکومت یا پبلک کی طرف سے کچھ لوگوں کو یا ایک شخص کو وکیل یعنی ذمہ دار بنا دیا جاتا ہے، مثلاً اسکول، مدرسے، تصنیفی ادارے، ان میں چھٹی یا بیماری کی اجرت یا تنخواہ دی جا سکتی ہے، بشرطیکہ جس کی طرف سے وہ ذمہ دار بنایا گیا ہے اس کی اجازت شامل ہو۔

(۳) مستاجروں کی طرف سے جو رقم بطور انعام، عطیہ، بونس، پراویڈنٹ وغیرہ کے نام سے ملتی ہے، اس کو کسی وقت بھی اجرت میں محسوب نہیں کیا جا سکتا[1]

(۴) اجرت میں جنس کے بجائے نقد رقم کو معیار بنایا جائے، اسی طرح کھانے کپڑے وغیرہ پر ملازم نہ رکھا جائے۔ آجر کے اوپر مزدوروں کے کھانے پینے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے الا یہ کہیں اس کا رواج ہو، یا کام مقررہ وقت سے زیادہ لیا جائے، جیسا کہ اوور ٹائم کام لینے میں ہوتا ہے[2]

(۵) کسی سفارش پر اجرت لینا درست نہیں ہے۔

(۶) اگر کہیں حافظ نہ ہو تو اجرت دے کر کسی حافظ سے تراویح سننے سے بہتر یہ ہے کہ چھوٹی سورتیں پڑھ کر تراویح پڑھ لی جائے۔

(۷) لہو و لعب یا ناجائز چیزوں کی مرمت کر کے یا تیار کر کے اجرت لینا درست نہیں ہے، اسی طرح ہر غیر اسلامی کام پر اجرت لینا حرام ہے۔

حکومت کی ذمہ داری

اجیر و مستاجر کے بنیادی حقوق کی تعیین اور ان پر عمل در آمد نہ ہونے کی صورت میں ان کے عمل در آمد کی کوشش کرنا اور پھر اجیروں کے بیکار، معذور ہو جانے کی صورت میں ان کی دیکھ بھال کا انتظام، یہ سب حکومت کی ذمہ داری ہے، تفصیل کے لیے راقم کی کتاب اسلامی قانون اجرت دیکھی جائے۔

---

[1] العطية التى اعطيت للخدمة من الخارج لاتحسب من الإجارة۔ ص ۸۲۔ [2] لايلزم المستأجر اطعام الأجير الا ان يكون عرف البلدة۔ ص ۸۳

محنت کش جانوروں کے حقوق

جس طرح محنت مزدوری کا کام انسان سے لیا جاتا ہے، اسی طرح جانوروں سے بھی لیا جاتا ہے، اسلامی شریعت میں صرف محنت کش انسانوں ہی کے نہیں بلکہ ان بے زبان جانوروں کے حقوق بھی مقرر ہیں جن سے ہم کام لیتے یا کوئی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

قرآن پاک نے سب سے پہلے انسان کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح تم خدا کی جاندار مخلوق ہو اسی طرح جانور بھی خدا کی مخلوق ہیں، مخلوق ہونے کی حیثیت سے تم میں ان میں کوئی فرق نہیں، مگر چونکہ دنیا کی ہر مخلوق کو خدا نے انسان ہی کے فائدہ کے لیے پیدا کیا ہے، اور ان کو اس کا تابعدار بنا دیا ہے، ان ہی میں یہ جانور بھی ہیں، اس لیے ان سے وہ کام بھی لے سکتا ہے اور فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے، مگر اس کو یہ سمجھ کر کام لینا چاہیے کہ وہ اینٹ پتھر کی طرح بے جان چیز نہیں ہیں کہ ان سے جس طرح اور جتنا کام چاہیں لیتے جائیں، ان کو اس کا کوئی احساس نہیں ہوگا، بلکہ ہماری ہی طرح تکلیف و آرام کا اثر ان پر بھی پڑتا ہے، قرآن میں کہا گیا ہے کہ یہ تمھاری ہی طرح ایک امت ہیں:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ۔ (الانعام)	زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور ہوا میں اڑنے والی ہر چڑیا جو اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتی ہے تمھاری طرح ایک امت ہیں

قرآن کی یہ ہدایت محض اخلاقی تعلیم ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک قانونی دفعہ بھی ہے، اس کی قانونی حیثیت پر اس واقعہ سے روشنی پڑتی ہے کہ ایک بار حضرت عبید اللہ حضرت عبداللہ ابن بشر کی خدمت میں آئے اور پوچھا کہ ایک شخص گھوڑے پر سواری بھی کرتا ہے اور بلا وجہ اس کو کوڑے بھی مارتا ہے، اس کے متعلق آپ کو کوئی ارشاد نبوی معلوم ہے؟ بولے: مجھے نہیں معلوم، اندر سے

ایک خاتون بولیں: خود اللہ تعالیٰ کہتا ہے "یہ تمھاری جیسی ایک مخلوق ہے"، پھر انھوں نے مذکورہ آیت تلاوت کی، عبداللہ نے کہا کہ یہ میری بڑی بہن ہیں جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا ہے، مقصد یہ تھا کہ ان کو بلا وجہ سزا دینا جرم ہے۔ سواری پر سوار ہوتے وقت اسی لیے یہ دعا سکھائی گئی ہے:

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ۔ (زخرف)	پاک ہے وہ ذات جس نے اس کو ہمارا تابعدار بنا دیا، ہم ان کو قبضہ میں نہیں لا سکتے تھے۔

تاکہ یہ بات ذہن میں تازہ رہے کہ یہ جانور جو تمھارے قابو میں ہیں اور تمھاری تابعداری کر رہے ہیں محض خدا کا فضل اور اس کی کرشمہ سازی ہے ورنہ تمھارے بس کی یہ بات نہیں تھی کہ تم ان کو قبضہ میں لے لیتے، ہاتھی اور اونٹ جیسی لحیم شحیم مخلوق کو ایک معمولی جسم کا انسان قابو میں کیے رہتا ہے۔

ان ہدایات کی روشنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جانوروں سے جن سے ہم کوئی کام لیتے ہیں یا معاشی فائدہ حاصل کر رہے ہیں حسب ذیل حقوق مقرر فرمائے ہیں:

(۱) جو جانور جس کام کے لیے پیدا کیے گئے ہیں ان سے وہی کام لینا چاہیے، چنانچہ آپؐ نے ایک تمثیل دیتے ہوئے فرمایا کہ ایک شخص بیل پر سوار ہوا اور اس کو مارنا شروع کیا تو اس نے مڑ کر کہا کہ میں سواری کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہوں[2]

آپؐ نے فرمایا کہ سواری کے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ، خدا نے ان کو تمھارا فرماں بردار اسلیے بنایا ہے کہ وہ تمھیں ان مقامات تک جہاں تم بڑی مشقت سے پہونچ سکتے ہو آسانی سے پہونچادیں

سواری کے جانور کی پیٹھ کو منبر بنانے کا دو مطلب ہے، ایک یہ کہ بلا ضرورت سواری پر بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے، جس طرح بلا ضرورت کوئی شخص منبر پر بیٹھا نہیں رہتا، دوسرے یہ کہ جتنی دیر سفر کرنا ہے اتنی دیر اس کی پیٹھ کو ضرور استعمال کیا جائے، لیکن استعمال کرنے کے بعد ان کی آسایش و آرام کے لیے وہی سب کچھ کرنا چاہیے جو ایک جاندار کے لیے کیا جاتا ہے، جاندار سواری

---

[1] الدر المنثور ج ۳ ص ۲۱۷ دار الفکر بیروت [2] بخاری باب استعمال البقر للحراثۃ۔

لکڑی، پتھر کا تخت یا چبوترہ نہیں ہے کہ اس کو استعمال کرنے کے بعد پھر اس کی غذا اور آسایش و آرام کا سامان کرنا نہیں پڑتا۔

(۲) جس طرح آدمی کام کرنے کے بعد تھک جاتا ہے اور اس کو آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اسی طرح حیوان بھی تھکتے ہیں اور ان کو آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، آدمی کی زبان میں گویائی کی طاقت ہوتی ہے، اس لیے وہ اپنے احساس کا اظہار کرلیتا ہے مگر حیوانات چونکہ گویائی سے محروم ہوتے ہیں، اس لیے ان کی تکلیف و آرام کا خود ہی خیال کرنا چاہیے، ایک بار آپ نے ایک اونٹ کو دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے بیٹھ گیا تھا، فرمایا: بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، ان پر سوار ہو تو اچھی حالت میں سوار ہو، اور چھوڑو تو اچھی حالت میں چھوڑو: (فَارْكَبُوْهَا صَالِحَةً وَاتْرُكُوْهَا صَالِحَةً) [1]

اچھی حالت میں سوار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سوار ہونے سے پہلے اچھی طرح کھلا پلا لو، یہ بھی دیکھ لو کہ وہ بیمار تو نہیں ہے، اس کا جسم اور تمام اعضا درست اور صاف ستھرے ہیں یا نہیں، اسی طرح سوار ہونے کے بعد پھر ان کی دیکھ بھال کرتے رہو، تاکہ دوبارہ وہ سواری کے قابل رہیں۔

ایک انصاری اپنے اونٹ سے کام زیادہ لیتے تھے، اور چارہ کا خیال کم رکھتے تھے حضور نے ان کو بلا کر یہ تنبیہ فرمائی:

أَفَلَا تَتَّقِي اللهَ فِي هٰذِهِ الْبَهِيْمَةِ الَّتِي مَلَّكَ اللهُ إِيَّاهَا إِنَّكَ تُجِيْعُهُ وَتُدْئِبُهُ۔ (مشکوٰۃ)	اس بے زبان جانور کے بارے میں اس خدا سے ڈرتے نہیں جس نے محض اپنے فضل سے اس کو تمھارا تابعدار بنایا ہے، اس سے کام زیادہ لیتے ہو اور پھر بھوکا بھی مارتے ہو۔

حضرت انس بن مالکؓ عام صحابہ کا اسوہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "ہم لوگ جب منزل پر اترتے تھے تو نماز پڑھنے سے پہلے سواریوں کا کجاوہ کھول دیتے تھے"

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد، مشکوٰۃ: حق المملوک ص ۲۹۲۔

اس اسوۂ صحابہ کی روشنی میں علمائے حدیث نے لکھا ہے کہ اپنے کھانے پینے اور آرام سے پہلے جانوروں کے کھانے پینے اور آرام کا سامان کرنا چاہیے۔[۱]

(۳) جانوروں کو ہلکی پھلکی سزا دی جا سکتی ہے، مگر آپؐ نے منہ پر مارنے اور ان کے داغنے کی ممانعت فرمائی ہے، ایسے شخص کو آپؐ نے ملعون قرار دیا ہے۔

(۴) جانوروں کو لڑایا نہ جائے، آپؐ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے۔

(۵) جس طرح کسی انسان کو گالی دینا اور خواہ مخواہ تکیۂ کلام کے طور پر ملعون و مردود قرار دینا صحیح نہیں ہے اسی طرح جانوروں کو بھی گالی دینا، ان کو لعنت ملامت کرنا برا ہے، آپؐ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے۔

غور کیجئے آپؐ نے ان کے احساس کا کتنا زیادہ خیال فرمایا ہے۔

قانونی حیثیت

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، ان ہدایات کی حیثیت محض اخلاقی تعلیم ہی کی نہیں ہے، بلکہ ان کو قانونی حیثیت بھی حاصل ہے، یعنی ان ہدایات کی خلاف ورزی کرنے والے کو سزا بھی دی جا سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ تو فرماتے ہیں کہ حکومت بطور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جانوروں کے مالکوں سے کہے کہ وہ ان کے چارہ کا اچھا انتظام کریں، اور ان کو آرام پہونچانے کی کوشش کریں، مگر ان پر کوئی جبر نہ کرے، مگر ائمۂ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ متفقہ طور پر فرماتے ہیں کہ اگر مالک نے جانور کو ٹھیک طور سے چارہ نہیں دیا تو

لہ ان تجبر علی نفقتها او بیعها۔	حاکم جانور کے مالک کو مجبور کرے کہ وہ اس کو ٹھیک سے یا تو چارہ دے یا بیچ ڈالے

امام مالکؒ اور امام احمدؒ تو یہ بھی فرماتے ہیں کہ

انه یمنع من حملها ما لا تطیق[۲]	اگر کوئی شخص جانور سے اس کی استطاعت سے زیادہ کام لیتا ہے یا اس پر زیادہ بوجھ

---

[۱] معالم السنن للخطابی [۲] الافصاح لابن ہبیرہ متوفی سنہ ۵۶۰ھ ج ۲ ص ۱۸۹

... لادتا ہے تو حاکم اس کو اس سے روک دینے کا حق رکھتا ہے۔

خود امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی جانور پر سوار ہو کر جا رہا ہے اور وہ جانور راستہ میں کسی دوسرے کی چیز کا نقصان کر دے، مثلاً کھیت کھا جائے یا کسی پالتو جانور یا کسی کی کوئی چیز توڑ دے یا خراب کر دے تو مالک کو اس کا تاوان دینا پڑے گا۔
اس کلیہ سے یہ بات خود بخود نکل آتی ہے کہ اگر مالک اس نقصان کا ذمہ دار ہے جو اس کے جانور کے جسم کے کسی عضو سے ہو گیا ہے تو پھر اس کے اوپر جو زیادتی اور ظلم ہو گا اور اس کی وجہ سے خود اس کے جسم و جان کو جو نقصان ہو گا اس کا ذمہ دار کیوں نہ قرار دیا جائے۔

زراعت

اوپر ذکر آچکا ہے کہ جن وسائل و ذرائع سے انسان کو روزی اور دوسری ضروریات زندگی مہیا ہوتی ہیں، ان میں تین بڑے ذریعے ہیں، ایک تجارت، دوسرا صنعت اور تیسرا زراعت، تجارت و صنعت کی تفصیل اوپر آچکی ہے، اب تیسرے ذریعہ یعنی زراعت کا بیان کیا جاتا ہے۔

زراعت کی ۲ صورتیں ہیں: (۱) ایک یہ کہ آدمی خود کوئی زمین جائز طریقہ سے حاصل کرے یا اس کو وراثت میں ملے اور اس میں اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کرے، اور اس سے اپنی ضروریات پوری کرے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ کسی معذوری یا مشغولیت کی وجہ سے خود کھیتی باڑی نہیں کر پاتا تو اسلامی شریعت اس کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں دوسروں سے مدد لے، اس مدد کی تین صورتیں ہیں (۲) ایک یہ کہ کوئی اپنا کھیت کسی کو بٹائی پر دے، یعنی زمین اور بیج وغیرہ اس کا ہو اور محنت اور ہل بیل دوسرے شخص کا ہے، اور اس اشتراک سے جو کچھ پیدا ہو دونوں بانٹ لیں۔ (۳) دوسری صورت یہ ہے کہ نقد لگان طے کر کے اپنی زمین کسی کو دیدی جائے اور مقررہ لگان مالک اس سے وصول کرتا رہے، اور لگان دینے والا لگان ادا کر کے پوری پیداوار سے خود فائدہ اٹھائے۔ (۴) تیسری صورت یہ ہے کہ زمین، بیج، ہل، بیل سب کچھ ایک آدمی کا ہو

اور وہ دوسروں سے مزدوری پر کام لے، کام کرنے والے اپنی مزدوری لے لیں اور جو کچھ پیداوار ہو وہ مالک لے لے۔

گویا اب کل چار صورتیں ہوئیں، ان میں سے آخری دو صورتوں کا بیان ضمنی طور پر اوپر ہو چکا ہے، بقیہ دو صورتوں کا بیان یہاں کیا جائے گا، جن دو صورتوں کا بیان ہو چکا ہے ان میں ایک تو کرایہ پر کسی چیز کے لینے اور دوسرے مزدوری پر کام کرنے کا ہے، جن شرائط کے ساتھ آپ مکان یا اور کوئی چیز کرایہ پر لیتے یا دیتے ہیں، ان ہی شرائط کے تحت آپ زمین بھی کرایہ پر لے اور دے سکتے ہیں، اس سلسلہ میں چند اور باتوں کا ذکر آگے آئے گا، اسی طرح جن شرائط پر ایک خانگی ملازم یا کارخانہ کے مزدور سے محنت لی اور مزدوری دی جاتی ہے، ان ہی شرائط کے تحت زراعت میں بھی آپ کسی سے محنت لے کر مزدوری دے سکتے ہیں، اس سلسلہ کی بعض اور باتوں کا ذکر آگے آئے گا۔

جس طرح خدا تعالیٰ نے تمام مخلوق کو انسان کے فائدہ کے لیے مسخر کر دیا ہے اسی طرح زمین کی بھی تخلیق اسی مقصد کے لیے فرمائی ہے، قرآن میں ہے:

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ	خدا نے زمین مخلوق کے فائدہ کے لیے پیدا
فِيهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ	کی ہے، اس زمین میں میوے اور کھجور کے
ذَاتُ الْاَكْمَامِ وَالْحَبُّ	درخت جن پر غلاف ہوتا ہے اور بھوسے دار
ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ (رحمٰن)	غلہ اور پھل پھول وغیرہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں

قرآن میں اس طرح کی بے شمار آیتیں ہیں جن میں انسان کو خطاب کر کے یہ بات کہی گئی ہے کہ خدا نے زمین کو تمھاری روزی اور معاش کا ذریعہ بنایا ہے:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ	اور وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے زمین
ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا	تمھارے لیے ہموار بنائی ہے، تو تم اسکے
وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ (الملک)	اوپر چلو اور اس کا اگلا ہوا رزق کھاؤ۔

ان آیات میں ایک طرف انسان کو زمین سے فائدہ حاصل کرنے اور اس کے ذریعہ اپنے سامان رزق کی فراہمی کی ترغیب دی گئی ہے تو دوسری طرف یہ بات بھی ذہن نشین کرا دی گئی ہے

کہ ہماری طرح زمین کو بھی خدا ہی نے پیدا کیا ہے، اور زمین ہی کو نہیں بلکہ وہ سامان غذا جسے بظاہر تم اپنے دست و بازو اور دوسرے مادی وسائل سے بہم پہونچاتے ہو وہ سب بھی خدا کی قدرتِ تخلیق کی ادنیٰ کرشمہ سازی ہے، ورنہ اگر اس کی خفیہ و پوشیدہ مدد شامل حال نہ رہے تو پھر ایک دانہ بھی تم اُگا نہ سکو گے:

اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ	ذرا غور کر کے بتاؤ کہ جو کچھ تم بوتے ہو
تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ	اس کو تم اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں

(الواقعة)

سائنس کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ ایک ایکڑ زمین میں اگر ظاہری طور پر دو آدمی محنت کر کے اس کو جوتتے بوتے، کھاد دیتے اور پانی پہونچاتے ہیں تو خدا تعالیٰ اپنی ایک خفیہ فوج یعنی چھوٹے چھوٹے کیڑوں (بیکٹیریاز) کے ذریعہ کئی آدمیوں کی طاقت ان کو پہونچاتا ہے، اور پھر ہوا، فضا، سورج کی گرمی اور موسم کی سازگاری ان کا ساتھ دیتی ہے، تب وہ پودے اُگتے ہیں، اور پھر ہم ان سے غلّہ اور پھل حاصل کرتے ہیں، اگر خدائے رب العالمین کی یہ خفیہ فوج اپنا کام چھوڑ دے تو ہماری ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔

زراعت کا سارا دارومدار ہوا اور پانی کے اوپر ہے، اگر وہ سمندر سے کھارا پانی بھاپ میں تبدیل کر کے میٹھا پانی بنا کر نہ برسائے تو یہ ساری کھیتی پانی برسنے کے باوجود تباہ و برباد ہو جائے گی

اِنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ	ہم خشک زمین پر پانی برساتے اور پھر
الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا	اس سے کھانے کی چیزیں اُگاتے ہیں
تَأْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ	جس کو تمہارے جانور بھی کھاتے ہیں
اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ. (السجدة)	اور تم بھی کھاتے ہو۔ کیا تمھیں نظر نہیں آتا

اوپر قرآن پاک کی جو آیت نقل کی گئی ہے: اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ اس کی تفسیر کرتے ہوئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لَا يَقُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ زَرَعْتُ وَلْيَقُلْ حَرَثْتُ (تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میں نے اپنی محنت سے کھیتی اگائی ہے، بلکہ اتنا کہو کہ میں نے کھیت میں بیج ڈال دیا ہے، اگانے والا تو اللہ ہے۔

غرض یہ کہ جب انسان کی یہ زمین کی کھیتی باڑی اور اس کا سارا سامان حیات خدا کی قوت تخلیق ہی کا عطیہ ہے تو پھر انسان کو خود اپنی ذات کے بارے میں ان حدود کا پابند ہونا چاہیے جو اس کے اور پوری کائنات کے خالق کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا۔ (کہف)	ہم نے زمین کی چیزوں کو اس کے لیے رونق کا سبب بنایا ہے، تاکہ ہم ان لوگوں کو آزمائیں کہ کون اچھے عمل کرتا ہے۔

جن حدود کے تحت آدمی کو زمین سے فائدہ حاصل کرنا چاہیے، قرآن نے اصولی طور پر ان کی طرف اجمالاً بھی اشارہ کیا ہے اور صراحۃً بھی، قرآن میں وراثت کے تفصیلی ذکر کے بعد کہا گیا ہے:

وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا۔ (نساء)	جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریگا، اور اس کے مقررہ حدود سے تجاوز کریگا، اللہ تعالیٰ اس کو ایسی آگ میں داخل کریگا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

پھر تمام قسم کی پیداوار کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ چونکہ یہ خدا کا عطیہ ہے اس لیے اس میں اس کا مقرر کردہ حق نہ بھولو، اور نہ اس میں آزاد ہو کر کوئی تصرف ہی کرنے لگو:

وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ۔ (انعام)	اس کا حق کٹائی کے دن دے دو، اور اسراف نہ کرو، اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

وَآتُوا حَقَّهُ اور وَلَا تُسْرِفُوا دونوں لفظ قابل غور ہیں، حق میں ہر طرح کا وہ انسانی حق آگیا جو خدا نے اس کے لیے مقرر کیا ہے، اور اسراف میں ہر طرح کی زیادتی اور اسراف کا سدّباب کر دیا گیا، اسراف کہتے ہیں حدود اللہ سے تجاوز کرنے کو، اس کے اندر وہ تمام زیادتیاں، حق تلفیاں بے احتیاطیاں آگئیں جو زمین کے سلسلہ میں آدمی کرتا ہے۔

ان اصولی ہدایات کی پوری تفصیل آپ کو ارشادات رسول اور اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ملے گی۔

حدیث نبویؐ میں سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ اسی زمین کو اپنے لیے روزی کا وسیلہ بناؤ جو تمھیں حلال اور جائز ذریعہ سے ملی ہو، یا تم نے خود جائز اور حلال ذریعہ سے حاصل کی ہو، اگر تم ایسا نہ کرو گے تو ممکن ہے کہ یہاں قانونی گرفت سے بچ جاؤ، مگر قیامت کی سزا سے نہ بچ سکو گے، آپؐ نے فرمایا کہ :

مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِّنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا فَاِنَّهٗ يُطَوَّقُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ اَرَضِيْنَ ۔ (بخاری و مسلم)

جو شخص ایک بالشت زمین بھی ظلم سے کسی کی دبا لے، اس کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس زمین کا سات گنا بوجھل طوق ذلت اس کے گلے میں ڈال دے گا۔

ظلم سے کوئی زمین حاصل کرنے کی صرف یہی صورت نہیں ہے کہ آپ زبردستی کسی کی زمین کے مالک بن جائیں، بلکہ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ آپ کسی کی زمین دھوکے سے اپنے نام کرالیں، کچھ روپیہ قرض دے دیا اور اس کا دباؤ ڈال کر اونے پونے کم قیمت پر اس کی زمین یا مکان لکھوالیا، جھوٹے مقدمات داخل کر کے قانونی داؤ پیچ سے اس کے مالک بن بیٹھے، غرض یہ کہ جو زمین کسی دباؤ یا فریب سے حاصل کی جائے گی وہ سب ظلم میں داخل ہوگی۔

پھر ایک طرف تو آپؐ نے یہ تنبیہ فرمائی کہ کوئی زمین ناجائز طریقہ سے حاصل نہ کی جائے، دوسری طرف آپؐ نے فرمایا کہ اس زمین سے آدمی کو اتنا ہی تعلق ہونا چاہیے جتنی اس کو معاشی ضرورت ہے، لیکن اگر یہ تعلق اتنا بڑھ گیا کہ آدمی خدا کو خدا کے دین کو اور دین کے کام کو چھوڑ بیٹھے اور وہ یہ بھی بھول جائے کہ اس نے غلط طریقہ سے حاصل کیا ہے یا صحیح طریقہ سے تو پھر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ زمین سے اس کا یہ تعلق اور محبت اس کو ذلت و پستی میں مبتلا کیے بغیر نہیں رہے گی، ایسے ہی لوگوں کیلئے آپؐ نے فرمایا ہے کہ کھیتی باڑی جس گھر میں داخل ہوتی ہے اس میں خدا تعالیٰ ذلت بھی داخل کر دیتا ہے[1]

---

[1] عن ابی امامۃ سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلّم یقول لا یدخل ھٰذا فی بیت قوم الا ادخلہ الذل (بخاری، مشکوٰۃ ص ۲۵۰)

لیکن اگر ان حدود کا خیال کر کے کوئی شخص خود کھیتی کرتا یا دوسروں سے کراتا ہے تو اس کی یہ کھیتی باڑی اس کے لیے صدقۂ جاریہ ہے، انسان یا حیوان جو لوگ بھی اس کھیتی باڑی سے اپنا آذوقہ حاصل کریں گے یا کسی درجہ میں اس سے فائدہ اٹھائیں گے اس کا ثواب کھیتی کرنے والے کو ملے گا حتیٰ کہ اگر پرندے اس کھیت سے چند دانے چُگ لیں گے یا اس کے باغ کا کوئی پھل کھالیں گے تو یہ بھی اس کے حق میں ایک صدقہ ہوگا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

مَا مِنْ مُّسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا	کوئی مسلمان جب کوئی درخت لگاتا ہے یا
اَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَأْكُلُ	کوئی کھیتی کرتا ہے تو اس سے اگر کوئی پرندہ
مِنْهُ طَيْرٌ اَوْ اِنْسَانٌ اَوْ بَهِيْمَةٌ	یا انسان یا چوپایہ کچھ کھا پی لیتا ہے تو اسکے
اِلَّا كَانَ لَهٗ بِهٖ صَدَقَةٌ (بخاری)	لیے یہ صدقہ ہو جاتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اس کو اس کا ثواب دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی ملے گا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسی جذبہ کے ساتھ کھیتی باڑی کرتے تھے اور اس سے اپنا حلال رزق حاصل کرتے تھے،

زراعت زیادہ بہتر ہے یا تجارت

تجارت وزراعت دونوں مبارک پیشے ہیں، اور قرآن وحدیث میں دونوں کی ترغیب آئی ہے، لیکن چونکہ دونوں کے ذریعہ انسان کی معاشی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اس لیے بعض فقہاء نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ان میں زیادہ بہتر اور افضل پیشہ کون ہے، مشہور حنفی عالم امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سوال پر بحث کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد

خَيْرُ النَّاسِ مَنْ هُوَ	بہتر آدمی وہ ہے جو عام لوگوں کے لیے
اَنْفَعُ النَّاسِ۔	بہتر ہے۔

کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

فَالْاَشْغَالُ بِمَا يَكُوْنُ نَفْعُهٗ	وہ کام جس کا فائدہ زیادہ عام ہو وہی زیادہ
اَعَمَّ يَكُوْنُ اَفْضَلَ[1]	افضل ہے۔

---

[1] ج ۳۰ ص ۲۵۹ کتاب الکسب۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ملک میں غلہ زیادہ پیدا ہو مگر تجارت کا نظام درست نہ ہو تو اس کو صحیح طریقہ پر لانا زیادہ بہتر اور مقدم کام ہوگا، اور اگر ملک میں غذا کی کمی ہو تو سب سے ضروری کام زراعت قرار پائے گا۔

اپنے ہاتھ سے اگر کھیتی نہ کر سکے تو بہتر ہے کہ زمین اپنے دوسرے بھائی کو دیدے

اوپر ذکر آچکا ہے کہ اگر آدمی اپنے ہاتھ سے کھیتی نہ کر سکے تو اس کو لگان یا بٹائی پر دینے یا اجرت پر مزدوروں سے کام کرانے کی قانونی طور پر اجازت ہے، کیونکہ اسلام زمین، جائداد اور دوسری تمام چیزوں پر انفرادی طور پر ہر شخص کا حق ملکیت بھی تسلیم کرتا ہے اور ان کو اس سے اپنی ذاتی منفعت کے لیے اس وقت تک فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتا ہے جب تک اس کی منفعت طلبی اجتماعی مفاد کو نقصان نہیں پہونچاتی، لیکن اس قانونی اجازت کے باوجود اخلاقی اعتبار سے یہ بات زیادہ پسندیدہ ہے کہ اگر وہ کھیتی باڑی نہیں کر پاتا اور اس کے پاس دوسرا ذریعہ معاش بھی موجود ہے، اور اس کا کوئی دوسرا بھائی بالکل بے سہارا اور بے وسیلہ ہے تو وہ اپنی زمین بغیر کسی معاوضہ کے اپنے دوسرے بھائی کو عاریۃً یا بطور ہبہ دے دے، تاکہ وہ اپنی ضروریات اس سے پوری کر سکے، آپ نے فرمایا کہ:

مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا	جس کے پاس زمین ہو وہ یا تو خود کھیتی کرے
أَوْ يَمْنَحْهَا أَخَاهُ۔ (بخاری و مسلم)	یا پھر اس کو اپنے کسی دوسرے بھائی کو دیدے

آپ کے ارشادات کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اب جو کسی وجہ سے بھی کھیتی نہ کر سکے تو اس کو لامحالہ اپنی جائداد دوسرے کو دے ہی دینا چاہیے۔

بعض صحابہؓ نے ارشاد گرامی سے یہ سمجھ لیا تھا کہ اب دوسروں کو لگان یا بٹائی پر زمین دینا قانوناً بھی منع ہے، یا تو آدمی خود کھیتی کرے یا دوسروں کو مفت زمین دے دے، حضرت ابن عباسؓ کو اس غلط فہمی کا علم ہوا تو انھوں نے اس ارشاد گرامی کی وضاحت کی، آپ نے فرمایا کہ:

إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت کو قانوناً
لَمْ يُحَرِّمِ الْمُزَارَعَةَ وَلٰكِنْ	حرام نہیں قرار دیا ہے، بلکہ آپ نے
أَمَرَ أَنْ يَرْفُقَ بَعْضُهُمْ	ایک دوسرے سے نرمی اور سلوک کا برتاؤ

بَعْضًا۔ (ترمذی) کرنے کا حکم دیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک دوسری روایت ہے جس میں مزید وضاحت ہے، انھوں نے فرمایا کہ:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم ینہ عنہ ولکن قال ان یمنح احدکم اخاہ خیر لہ من ان یأخذ علیہ خراجا معلوما۔ (بخاری ومسلم)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا ہے، بلکہ فرمایا کہ ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کو خوشی سے اپنی زمین بغیر کسی معاوضہ کے دے دے، یہ اس سے بہتر ہے کہ اس سے متعین لگان یا غلہ وصول کرے۔

حضرت ابن عباسؓ کی اس تفسیر سے ارشاد نبویؐ کی اخلاقی حیثیت کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے

اپنے ہاتھ سے کھیتی کرنے کا حکم اور اس کا ثواب

انسان کی سب سے بنیادی ضرورت کھانا ہے، اس لیے جو لوگ اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کر کے اپنے بال بچوں کی پرورش کرتے ہیں اور ان کی ضرورت سے جو بچ جاتا ہے دوسرے بندگان خدا کے ہاتھ اس کو فروخت کر کے ان کو فائدہ پہونچاتے ہیں، وہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا بنیادی کام کرتے ہیں، اس لیے وہ قابل صد مبارکباد ہیں خاص طور پر خدا کی ایک بے زبان مخلوق یعنی پرندے تو سال کے بیشتر حصہ میں کسان ہی کی محنت سے اپنا آذوقہ حاصل کرتے ہیں، یہ صدقۂ جاریہ کسی دوسرے پیشہ میں اتنا عام نہیں ہے، لیکن عام طور پر زراعت پیشہ لوگ اپنی شدید محنت اور زراعت کی ان تمام خوبیوں اور فائدوں کو ذرا سی بدنیتی اور زیادتی کی وجہ سے اکارت کر دیتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اوپر قرآن وسنت کی روشنی میں اس کے جو حدود بیان کیے گئے ہیں، ان کا لحاظ کیا جائے، تاکہ ان کی محنت دنیا میں بھی بارآور ہو اور آخرت میں بھی۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کھیتی باڑی کا کام تنہا ایک آدمی کے بس کا نہیں ہے، اسمیں دوسروں سے بہرحال مدد لینی پڑتی ہے، اس لیے اگر وہ بحیثیت مستاجر یا بحیثیت مالک دوسروں سے مدد لے تو اس کو ان تمام شرائط واحکام کی پابندی کرنی چاہیے جو اوپر کرایہ اور اجیر خاص کے بیان

کے سلسلہ میں لکھے جا چکے ہیں، اب اس کے بعد لگان اور مزارعت یعنی بٹائی کا بیان کیا جاتا ہے اس کے ضمن میں مزدوری کے بعض مسائل کا ذکر بھی آجائے گا۔

اجارۂ ارض اور مزارعت کی تعریف اور حکم

اگر آدمی کسی وجہ سے خود کھیتی باڑی نہیں کرتا ہے، یا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے، تو اس کو یہ حق ہے کہ وہ دوسروں کو لگان یعنی کچھ نقد لے کر اپنی زمین دے دے، اس صورت میں مالک لگان پائے گا اور مزارع یعنی کاشتکار پوری پیداوار کا مالک ہوگا، یا اگر وہ لگان پر نہیں دیتا یا کوئی لگان پر نہیں لیتا تو دوسری صورت یہ ہے کہ وہ بٹائی پر دے دے، یعنی غلہ میں آدھا مالک کا اور آدھا کاشتکار کا، یا کم و بیش، پہلی صورت یعنی لگان پر دینے کو شریعت میں اجارۂ ارض، اور دوسری صورت یعنی بٹائی پر دینے کو مُزَارَعَت کہتے ہیں، مزارعت یعنی بٹائی پر زمین دینے کو بعض صحابہ اور ایمۂ اربعہؒ میں بیشتر حضرات نے مطلقاً تو اسے ناپسند کیا ہے[1] البتہ کچھ شرائط کے ساتھ جائز کہا ہے، لیکن اجارۂ ارض یعنی زمین کو لگان پر دینے میں سب کا اتفاق ہے

مزارعت کی حیثیت

مزارعت کا معاملہ اپنی ابتدا میں تو اُجرت اور کرایہ کا معاملہ ہوتا ہے، مگر نتیجہ کے اعتبار سے یہ شرکت کا معاملہ ہے، جس طرح اُجرت اور کرایہ کے معاملہ میں کسی چیز کا فائدہ آدمی کچھ معاوضہ دے کر حاصل کرتا ہے اسی طرح مزارعت میں ایک مزارع یعنی کاشتکار مالک زمین سے ایک متوقع فائدے کے پیش نظر اپنی زمین اس کے حوالہ کرتا ہے، لیکن اس معاملہ کے نتیجہ میں جو پیداوار ہوتی ہے اس کی تقسیم ان ہی اصولوں پر ہوتی ہے جن اصولوں کی بنا پر کوئی شراکتی کاروبار کے فائدے کی تقسیم ہوتی ہے[2] اس لیے مزارعت کے معاملہ میں اجرت و شرکت دونوں کے شرائط و قیود کا لحاظ ضروری ہے۔

---

[1] امام ابو حنیفہؒ اسے ناجائز قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ اس میں اجرت مجہول ہے، یعنی ان کے چوتھائی یا نصف غلہ کی شرط مجہول ہے، صاحبین اور دوسرے ائمہ اسے جائز قرار دیتے ہیں، یہی حدیث دوسرے ائمہ کے سامنے بھی ہے، مگر وہ حضرات چوتھائی یا نصف کی شرط کو اجرت معلوم قرار دیتے ہیں اس لیے انھوں نے اسے جائز رکھا ہے، فقہ حنفی میں فتویٰ صاحبین کے مسلک کے مطابق ہے۔ [2] (آئندہ صفحہ پر)

مزارعت کا خاص حکم

چونکہ مزارعت نتیجہ کے اعتبار سے شرکت کا حکم رکھتی ہے، اس لیے اس کا سب سے خاص اور امتیازی حکم یہ ہے کہ پیداوار کی تقسیم حصہ کے اعتبار سے ہو، تعداد کے تعین کے اعتبار سے نہ ہو، یعنی دونوں میں سے کوئی یہ تعیین نہ کرے کہ فلاں حصہ کی پیداوار یا اتنے بورے یا اتنے من پیداوار تو میری ہوگی اور باقی جو کچھ بچے گا وہ تمہارا ہوگا، بلکہ یوں طے کرنا چاہیے کہ چوتھائی (¼) یا نصف (½) یا دو تہائی (⅔) فلاں کو ملے گا، اور بقیہ فلاں کو ملے گا، دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے، پہلی صورت یعنی کوئی مقدار مقرر کرنے کی صورت میں اگر بفرض محال اتنا ہی غلہ پیدا ہو جتنا کہ مالک زمین کا حصہ ہے تو وہ سراسر فائدہ میں رہے گا اور کاشتکار بالکل گھاٹے میں رہیگا لیکن اگر حصہ کے اعتبار سے تقسیم ہوگا تو کم و بیش جتنا پیدا ہوگا دونوں کو اپنے حصہ کے مطابق ملے گا اگر فائدہ ہوگا تو دونوں کو ہوگا اور نقصان ہوگا تو دونوں کو ہوگا۔

مزارعت کے ارکان و شرائط

(۱) مزارعت اور اجارۂ ارض کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ معاملہ کرنے والے دونوں عاقل ہوں، اپنی مرضی سے معاملہ کریں، دونوں کا بالغ ہونا ضروری نہیں ہے، یعنی دونوں ایجاب و قبول کریں یہی شرط مزارعت کا رکن بھی ہے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ جو زمین مزارعت کے لیے دی جائے وہ قابل کاشت ہو، اگر کوئی اپنی اوسر بنجر زمین دے کر یہ کہے کہ تم اس کو قابل کاشت بناؤ اور بنا کر اس میں کھیتی کرو جو

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) :

بدائع الصنائع ج ٦، ص ١٧٧

المزارعة نوع شركة على كون الأراضي من طرف والعمل من طرف آخر، والحاصلات تقسم بينهما.

(المجلة ص ٢٣٢)

پیداوار ہوگی دونوں بانٹ لیں گے، تو یہ صحیح نہیں ہے[1] اور سراور بنجر زمین کسی کی ملکیت نہیں ہوتی اس کا ذکر آگے آئے گا۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے، جس کا ذکر اوپر تفصیل سے آچکا ہے کہ مالک اور مزارع دونوں اپنا حصّہ طے کرلیں، کہ کس کو کتنا حصّہ ملے گا، دونوں میں سے کوئی بھی نہ تو اپنے لیے کوئی کھیت مخصوص کرکے معاملہ طے کرے اور نہ وزن، اور پیمانہ کی مقدار مقرر کرکے یہ کہے کہ زیادہ پیدا ہو یا کم ہو، اتنے من یا اتنے بوجھ ہم لے لیں گے، اور جو بچے گا وہ تمھارا ہوگا، تو مزارعت صحیح نہ ہوگی اگر دونوں کے حصہ کا تذکرہ نہ ہو تو کاشتکار کے حصہ کا ذکر ضرور ہونا چاہیے[2] کہ اتنا کاشتکار کا ہوگا بقیہ مالک کا۔

اگر زمین لگان پر دینی ہے تو لگان طے ہو جانی چاہیے کہ کتنی ہوگی، اس صورت میں کاشتکار کو غلہ اور مالک کو نقد لگان ملے گی۔

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ زمین، ہل، بیل، بیج کے بارے میں یہ طے ہو جانا چاہیے کہ کس کی کون سی چیز ہوگی، یعنی یہ کہ مالک صرف زمین دے کر علٰحدہ ہو جائے گا، اور ہل بیل محنت اور بیج وغیرہ سب کاشتکار کے ہوں گے یا کوئی اور صورت ہوگی، اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، ان میں بعض جائز اور بعض ناجائز ہیں۔ مثلاً:

۱۔ زمین ایک شخص کی ہو اور تمام چیزیں یعنی ہل بیل، بیج اور کام وغیرہ کاشتکار کے ہوں۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ زمین، ہل، بیل اور بیج سب چیزیں ایک کی ہوں، اور صرف محنت کاشتکار کی ہو۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ زمین اور بیج ایک آدمی کا ہو، اور ہل بیل اور محنت

---

[1] یشترط کون الأراضی صالحۃ للزراعۃ (المجلۃ ص ۲۳۲) [2] یشترط حین العقد تعیین حصۃ الفلاح جزءًا شائعا من الحاصلات، فان شرط احدھما قفزانا مسماۃ فھی باطلۃ۔ (ھدایۃ ج ۴، ص ۴۱۰)

دوسرے کی ہو، عام طور پر فقہائے احناف اس کو جائز نہیں سمجھتے، مگر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اس کو بھی جائز کہتے ہیں، امام ابو یوسف چونکہ قاضی رہ چکے تھے اور ان کے سامنے اس طرح کے معاملات آتے رہتے تھے، اس لیے ان کی رائے اس سلسلہ میں زیادہ وزنی ہے۔

(۵) پانچویں صورت یہ ہے کہ بیج اور ہل بیل ایک کا ہو، اور محنت اور زمین دوسرے کی ہو، تو یہ متفقہ طور پر ناجائز ہے۔

(۶) چھٹی صورت یہ ہے کہ بیج ایک آدمی کا ہو اور تمام چیزیں دوسرے کی ہوں، یہ بھی ناجائز ہے[1]

(۵) پانچویں شرط یہ ہے کہ زمین دیے جانے کی مدت متعین کر دی جائے کہ اتنے مہینے یا اتنے سالوں کے لیے دی جائے گی[2]

(۶) چھٹی شرط یہ ہے کہ جو چیز بونی ہو وہ بتا دی جائے، مزارع یہ بتا دے کہ گیہوں بوئے گا یا ترکاری بوئے گا، یا تمباکو، کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ زمین کا مالک کسی چیز کی کاشت کو اپنی زمین میں بونا پسند نہ کرتا ہو، اور بعد میں اختلاف ہو، اور پھر حصّہ کی تعیین میں بھی اس سے مدد ملتی ہے، البتہ اگر مالک زمین یہ اجازت دے دے کہ جس چیز کی چاہو کاشت کرو، تو پھر اس کو اختیار ہے کہ جو چیز چاہے بوئے[3]

(۷) ساتویں شرط یہ ہے کہ زمین کو خالی کر کے کاشتکار کے حوالہ کر دیا جائے۔

(۸) آٹھویں شرط یہ ہے کہ بٹائی پر دینے کے بعد دونوں کو طے شدہ حصہ کے مطابق پیداوار میں شریک رہنا پڑے گا، ایسا نہیں ہو سکتا کہ فصل کٹنے کے بعد کوئی فریق یہ کہے کہ ہم غلہ کے بجائے روپیہ لیں گے، یا کوئی دوسری جنس لیں گے۔

اجارۂ ارض کے شرائط

(۱) کرایہ کے بیان میں اجارۂ ارض کا ذکر آچکا ہے، اجارۂ ارض یعنی نقد لگان پر کسی کھیت کے دینے کے لیے وہی

---

[1] شرح وقایہ، جلد ۴ ص ۲۰ [2] ہدایہ ج ۴ ص ۴۱۰ [3] یشترط تعیین ما یزرع الفلاح ما شاء۔ ص ۲۳۲ المجلۃ۔

تمام شرائط ہیں جو کسی چیز کو کرایہ پر دینے کے ہیں، ان کے علاوہ اس میں مزارعت کی پانچویں اور آٹھویں شرط کے علاوہ تمام شرائط پائی جانی چاہئیں۔

مزارعت کی تیسری شرط یہ ہے کہ مزارع اور مالک دونوں کو اپنا اپنا حصہ طے کر لینا چاہیے، اور کرایۂ ارض میں حصہ کے بجائے لگان طے ہو جانی چاہیے کہ کتنی ہوگی، اور چونکہ لگان کی تعیین کا زیادہ تر دار و مدار زمین اور بوئی جانے والی چیز کی نوعیت پر ہے، اس لیے دونوں باتوں کو خاص طور پر واضح ہونا چاہیے کہ کون سی زمین کاشتکار کو لگان پر دی جا رہی ہے اور کیا چیز بوئی جائے گی ظاہر ہے کہ بھٹے، باجرے اور تمباکو اور آلو کی کاشت میں فائدے کے لحاظ سے کافی فرق ہوتا ہے، اس لیے اگر کاشتکار واضح طور پر نہ بتائے گا تو بعد میں اختلاف ہو سکتا ہے، اگر مالک زمین مطلقاً یہ اجازت دے دے کہ جو چاہو بوؤ تو پھر کاشتکار کو اختیار ہے کہ چاہے وہ آلو و تمباکو بوئے یا زعفران، اسی طرح اگر مالک زمین واضح طور پر یہ نہ بتائے کہ فلاں زمین یا فلاں کھیت ہم لگان پر دے رہے ہیں تو کاشتکار لگان کے اندازے میں دھوکا کھا سکتا ہے، اور اس کی وجہ سے بعد میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

(۲) اگر کوئی شخص لگان پر زمین لے لے تو اس کو اختیار ہے کہ سال میں جتنی فصل چاہے بوئے اور کاٹے، مالک کو روکنے کا حق نہیں، البتہ اگر اس نے یہ قید لگا دی ہے کہ بس ایک فصل بونے کے لیے ہم دے رہے ہیں تو اس صورت میں اس کو قانونی طور پر روکنے کا حق حاصل ہوگا، مگر اخلاقاً ایسا کرنا اچھا نہیں ہے[1]۔

مساقات

زمین کو بٹائی پر دینے کا نام مزارعت اور پھلدار درختوں کو بٹائی پر دینے کو مساقاۃ کہتے ہیں۔

مساقات کے معنی اور تعریف

اگر کوئی شخص اپنا تیار شدہ درخت یا باغ کسی شخص کو اس شرط پر دے کہ

---

[1] من استاجر ارضًا على ان يزرعها ما شاء فله ان يزرعها مكررًا طرف السنة صيفيا او شتائيا۔ ص ٦، المجلة۔

تم اس کی گڑائی، سنچائی اور نگرانی کرو، جو پھل ہوگا دونوں بانٹ لیں گے، تو اس کو شریعت میں مساقاۃ کہتے ہیں، سَقْی کے معنی پانی دینے کے ہیں، اسی سے **مساقاۃ** بنا ہے، گویا اصل کام اس میں پانی دینا اور پانی دے کر گوڑنا ہے، مزارعت کی طرح مساقات میں بھی کم از کم دو۲ آدمیوں کا پایا جانا ضروری ہے، چنانچہ مساقات میں بھی دو۲ آدمی ہوتے ہیں، اس کو عقد معاملہ بھی کہتے ہیں۔

مساقاۃ کے شرائط

مساقاۃ کے ارکان و شرائط بھی وہی ہیں جو مزارعت کے ہیں[1] مثلاً: (۱) معاملہ کرنے والے عاقل ہوں (۲) مدت مقرر ہو۔ (۳) دونوں کا حصہ مقرر ہو (۴) درخت کو حوالہ کردیا جائے، تھوڑے سے جزئی اختلاف کے ساتھ ائمۂ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ بھی اسے صحیح سمجھتے ہیں، مساقات کے مسائل کی سب سے زیادہ تفصیل امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ملتی ہے۔ البتہ دو تین باتوں کی وجہ سے مزارعت[1] اور اس میں فرق ہوجاتا ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مساقات کا معاملہ لگے لگائے باغ یا درخت میں جائز ہے[2] اس شرط پر یہ معاملہ کرنا جائز نہ ہوگا کہ درخت یا باغ لگاؤ، تیار ہونے کے بعد دونوں پھل میں شریک رہیں گے، مزارعت میں بوتے اور غلہ پیدا ہونے کی شرط پر زمین دینا اس لیے جائز ہے کہ اس کی منفعت جلد سامنے آجاتی ہے، اس لیے کاشتکار کا اس میں فائدہ بھی ہے، اور مدت کم ہونے کی وجہ سے اختلاف کی گنجائش بھی کم ہے، اور یہ بات بھی ہے کہ اگر ان میں سے کسی کو اپنا فیصلہ بدلنے کی ضرورت پیش آجائے تو اس کی گنجایش رہتی ہے کہ وہ دو چار ماہ میں اپنا فیصلہ بدل دے لیکن درخت اور باغ کے معاملہ میں ان میں سے کوئی بات حاصل نہیں ہے۔

(۲) مزارعت اور مساقات میں دوسرا فرق یہ ہے کہ مساقات کا معاملہ ہوجانے کے بعد بغیر کسی عذر شدید کے دونوں میں سے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ علٰحدہ ہوجائے، اگر کوئی فریق علٰحدہ ہوگا تو قانوناً اس معاہدہ کی تکمیل پر مجبور کیا جائے گا، لیکن مزارعت میں جس فریق نے بیج دیا ہے

---

[1] وهی المزارعة حکمًا وخلافًا وشروطًا (شرح وقایہ ج ۴ ص ۳۰) [2] المساقاة هی المعاملة فی الأشجار (ہدایہ ج ۴ ص ۳۱) الکلام فیها کالکلام فی المزارعة۔

اگر وہ معاہدہ بغیر عذر کے بھی توڑنا چاہے تو توڑ سکتا ہے، لیکن جس نے بیج دیا ہے وہ تو معاملہ باقی رکھنا چاہتا ہے، مگر دوسرا فریق بھاگ رہا ہے، تو اس کو قانوناً مجبور کیا جائے گا، پہلی صورت میں اس کو علیحدہ ہونے کی اس لئے اجازت ہے کہ اگر وہ علیحدہ ہوگا تو اس کے بیج کا نقصان ہوگا، اس لئے بیج دینے کے بعد خود بیج کی لالچ اس کو کاشت کرنے یا کرانے پر مجبور کرے گی، اس لئے قانون کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن دوسری صورت میں چونکہ بیج والے کا نقصان ہے اس لئے اس کے نقصان کی تلافی کے لئے قانون کا سہارا لینا پڑے گا، یہی صورت مساقاۃ میں ہے کہ اگر باغ والا باغ دینے کے بعد بغیر عذر باغ لینے والے کو علیحدہ کرتا ہے تو اس بیچارے کا وقت اور محنت برباد ہوئی، اور مالک باغ کا کوئی نقصان نہیں ہوا تو ایک فریق کو بغیر کسی وجہ کے نقصان پہنچانا صحیح نہیں ہے، اسی طرح اگر باغ لینے والا علیحدہ ہوتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ دوسرا آدمی مالک باغ کو بروقت نہ ملے، اور اس کا شدید مالی نقصان ہوجائے گویا اس کی علیحدگی سے ایک طرف اس کی محنت ضائع ہوگئی، اور دوسری طرف باغ کے مالک کو بلا وجہ مالی نقصان اٹھانا پڑا، اسی لئے دونوں میں سے کسی کو اجازت اس بات کی نہیں ہے کہ وہ بلا وجہ کسی کو نقصان پہونچائے[1]

(۳) مساقات ان درختوں اور ترکاریوں وغیرہ میں جائز ہے، جس کی جڑ زمین ہو، اور اسے پانی دینے اور حفاظت کی ضرورت ہو، پھل چاہے آئے یا نہ آئے[2]

(۴) اگر مساقات کی کوئی ایسی مدت متعین کی، جس مدت میں عموماً پھل نہیں آتا تو یہ معاملہ صحیح نہیں ہے، مگر وقت تو پھل آنے کا تھا، مگر پھل آنے میں دیر ہوگئی تو اگر پھل آگیا تو دونوں بقدر حصہ بانٹ لیں گے، اور نہ آیا تو معاملہ ختم ہوگیا اور کام کرنے

---

[1] لیس لصاحب الکرم ان یخرج العامل بغیر عذر وکذا لیس للعامل ان یترک العمل بغیر عذر بخلاف المزارعۃ (ہدایہ ج ۴ ص ۴۱۶) [2] وتجوز المساقات فی النخیل والشجر والکرم واصول الباذنجان (ہدایہ ج ۴ ص ۴۱۶)۔

کو اجرت مثل ملے گی۔ (ہدایہ ج ۴ صفحہ ۴۱۶)

مزارعت، مساقات اور اجارۂ ارض کے بعض اور ضروری مسائل

(۱) اگر یہ بیان نہ کیا گیا کہ زمین میں کسی چیز کی کاشت ہوگی اور نہ مالکِ زمین نے کسان کو یہ اجازت دی کہ جس چیز کی چاہو کاشت کرو، تو یہ مزارعت یا اجارۂ ارض کا معاملہ کالعدم سمجھا جائے گا، البتہ اگر معاملہ فسخ کرنے سے پہلے پہلے اس کی وضاحت ہوئی تو معاملہ صحیح ہو جائے گا۔ (شامی ج ۵ صفحہ ۲۴۰)

۲۔ اگر لگان پر زمین دے دی، تو جتنی مدّت کے لئے دی ہے، اتنی مدّت میں کسان جتنی فصل چاہے بوئے، کاٹے، لگان بڑھانے کا اختیار نہ ہوگا، البتہ مدّت ختم ہونے کے بعد پھر وہ لگان بڑھا سکتا ہے، اوپر تفصیل آچکی ہے۔

۳۔ لگان پر کوئی زمین چار مہینے کے لئے دی ہے، مگر چار ماہ میں فصل تیار نہ ہو، تو فصل کٹنے تک مالک کو زمین خالی کرانے کا حق نہ ہوگا، مگر جتنی مدّت زیادہ کسان نے زمین کو پھنسا رکھا ہے، اتنی مدّت کی مزید لگان دینی پڑے گی، اس مدت کی لگان کا اندازہ طے شدہ لگان کے مطابق کیا جائے گا۔

۴۔ مزارعت، مساقات، یا اجارۂ ارض میں اگر کاشت کار نے مالک زمین سے بھی کام کرنے کی شرط لگا دی تو یہ معاملہ فاسد ہو جائے گا، فصل کی تیاری میں جتنی محنت صرف ہوگی، وہ سب کاشت کار کے ذمّہ ہوگی، مالک سے وہ محنت نہیں لے سکتا، یوں وہ خود کرے تو اس کو اختیار ہے۔

۵۔ کھیتی کے اخراجات اور اس کے کاٹنے، ڈھونے، مالش یا دانہ نکالنے کی ذمّہ داری اگر کاشت کار پر ڈالی جائے، تو یہ معاملہ صحیح نہ ہوگا، بلکہ اپنے اپنے حصّہ کے بقدر خرچ برداشت کرنا ہوگا، یہ امام صاحب کا مسلک ہے، مگر امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ سارے زرعی اخراجات، اور کاٹنے اور مالش کرنے کی ذمہ داری کاشت کار پر ڈالی جا سکتی ہے، امام سرخسی نے تعامل کی وجہ سے اسی کو ترجیح دی ہے، ہمارے دیار میں بھی یہی تعامل

ہے، البتہ غلہ پیدا کرنے کیلئے کھاد وغیرہ ڈالنے میں دونوں کو شریک کرنا ضروری ہے۔

۶۔ غلہ تقسیم ہو جانے کے بعد ہر شخص اپنا غلہ اٹھا کرلے جائے، کاشت کار پر مالکِ زمین کا غلہ پہونچانے کی ذمہ داری نہیں ہے، اگر اس سے یہ کام لیا جائے گا تو مزدوری دینی پڑے گی۔

۷۔ جس کا بیج ہو وہ یہ شرط نہیں لگا سکتا کہ بیج کے بقدر غلہ لے لینے کے بعد پھر دونوں تقسیم کریں گے، اگر یہ شرط لگائی گئی تو یہ معاملہ فاسد ہو جائے گا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اتنا ہی غلہ پیدا ہو جتنا بیج ڈالا گیا ہے، اس لئے دوسرا بالکل محروم ہو جائے گا اور یہ شراکت کے اصول کے خلاف ہے کہ کوئی فریق بالکل محروم رہ جائے۔

۸۔ اسی طرح جتنی زمین بطور مزارعت کسی کو دی گئی ہے، اس زمین کا یا کھیت کا یا فصل کا کوئی حصہ کوئی فریق مخصوص نہیں کر سکتا، ورنہ یہ معاملہ باطل ہو جائے گا، مثلاً یہ کہ کھیت کا مالک کھیت کے دو ٹکڑے کر دے، اور یہ کہے کہ فلاں ٹکڑے میں جو پیدا ہوگا، وہ میرا اور دوسرے ٹکڑے میں جو پیدا ہوگا وہ تمہارا یا گیہوں اور جو بونے کے لئے معاملہ ہوا اور ایک نے یہ شرط لگا دی کہ گیہوں ہمارا ہوگا اور جو تمہارا تو یہ بھی ناجائز ہے، اسی طرح کسی کھیت میں لوکی اور آلو بویا گیا اور یہ شرط کسی فریق نے لگائی کہ آلو ہمارا اور لوکی تمہاری، یا لوکی ہماری اور آلو تمہارا، تو یہ سب صورتیں ناجائز ہوں گی [۲]

اسی طرح بطور مساقات باغ یا کوئی کھیتی دی اور یہ شرط لگا دی کہ فلاں درخت یا

---

[۱] ونفقة الزرع عليهما بالحصص مثل اجرة السقي وغيره من العمل يكون عليهما بقدر الحصة كاجرة الحصاد والرفاع والدوس والتذرية ... فان شرط على العامل فسدت وعن ابي يوسف يصح الشرط ولزمه للتعامل قال الامام السرخسي هو الاصح في ديارنا (شرح وقايه ج ۴ ص ۳ ہدایہ ج ۴ ص ۴۱۴)۔

[۲] وعلى هذا (اي لا يجوز) اذا شرط احدهما ما يخرج من ناحية معينة وللآخر ما يخرج من ناحية اخرى (ہدایہ ج ۴ ص ۲۱۶)۔

فلاں پھل مثلاً لنگڑا، ثمر بہشت یا دسہری یا خاص الخاص یا فلاں بیجو کے درخت کا پھل ہمارا ہوگا، یا فلاں چیز کی فصل ہماری ہوگی، بقیہ تمہاری تو یہ شرط لگادینے سے بھی یہ معاملہ ناجائز ہوجائے گا۔

۹۔ غلّہ کی طرح بھوسہ بھی دونوں میں تقسیم ہوگا، اگر یہ شرط لگادی کہ غلہ ایک کا اور بھوسہ دوسرے کا تو یہ صحیح نہیں ہے، لیکن جس نے بنیگا، یعنی بیج دیا ہے، اس نے اگر یہ شرط لگادی کہ کل بھوسہ ہم لیں گے تو یہ شرط صحیح ہے، لیکن اگر یہ شرط وہ فریق لگادے جس نے بیج نہیں دیا ہے، تو یہ معاملہ باطل ہوجائے گا، فقہاء نے بیج کی قید اس لئے لگائی ہے کہ بھوسہ ایک ضمنی نتیجہ ہے، بیج کا اس لئے بیج والے کو اتنی رعایت دی جاسکتی ہے کہ وہ یہ شرط لگاسکے[1]

مزارعت کا معاملہ طے کرتے وقت اگر بھوسہ کے بارے میں کچھ طے نہیں ہوا تھا تو پھر غلہ کی تقسیم کے مطابق بھوسہ کی تقسیم بھی ہوگی۔ (ہدایہ ج ۴ ص ۴۱۴)

۱۰۔ مزارعت میں بفرض محال کچھ نہ پیدا ہو تو پھر عامل یعنی کاشت کار کو کچھ نہ ملے گا، لیکن اگر مالک نے سب کچھ دے کر کسی کاشت کار سے بطور اجیر کھیتی کرائی تھی، اور یہ شرط لگائی تھی کہ جو پیداوار ہوگی، اس میں اتنا حصّہ تم کو دیں گے، تو کچھ پیدا نہ ہونے کی صورت میں اتنے دن کی مزدوری مالک کو دینی پڑے گی۔

۱۱۔ کاشت کار مزارعت کی زمین میں کچھ محنت کرچکا ہے، مثلاً دو ایک بار ہل چلاچکا ہے یا کیاریاں بنارہا ہے یا گھاس وغیرہ صاف کرکے اس میں کھاد وغیرہ ڈال چکا ہے مگر ابھی تک اس نے کھیت میں بویا نہیں ہے، تو مالک زمین کو اس وقت تک معاملہ فسخ کرنے کا حق ہے، مگر اتنے دن کی محنت کی مزدوری اس کو دینی پڑے گی اور جو خرچ اس نے کیا ہے وہ واپس کرنا پڑے گا[2]

---

[1] ولو شرط الحب نصفین والتبن لصاحب البذر صحت لایجوز اذا شرط احدھما التبن وللآخر الحب (ہدایہ ج ۴ ص ۴۱۱)۔ [2] کیونکہ اس نے کاشت کار کو ایک طرح کا دھوکا دیا اور وعدہ خلافی کی ہے اس لئے اس کی تلافی اسی طرح ہوسکتی ہے کہ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ اس کو اخلاقاً و دیانتہً ایسا کرنا چاہیئے، مگر موجودہ حالات میں قانوناً بھی اس کی پابندی ضروری ہے۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۴۱۴)

۱۲. اگر مالک اپنی زمین بوجوت کر کسی کے سپرد کر دے کہ اس کی نگرانی کرو، یا اس میں پانی چلاؤ جو کچھ پیدا ہوگا اس کا ½ یا ⅓ تمھیں ملے گا تو یہ صحیح ہے، اسی طرح اگر مزارع کسی دوسرے کو اپنا شریک کرنا چاہتا ہے تو اس کی کئی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ بیج مالک زمین ہی کا ہے، تو پھر اس کو اس سے اجازت لینی ضروری ہے لیکن اگر بیج مزارع کا ہے، یا اس شرط پر شریک کر رہا ہے کہ میں اپنے حصہ سے اتنا غلہ دوں گا تو ان دونوں صورتوں میں اسے دوسرے کو شریک کر لینے کا حق ہے[1]

۱۳۔ غیر اسلامی قوانین میں جو کاشت لگ جانے کا قانون ہے وہ صحیح نہیں ہے، کسی کا کھیت، باغ، یا کوئی اور چیز کتنے دن بھی کرایہ لگان یا بٹائی پر کاشتکار کے پاس رہے، اسلامی شریعت کی رو سے اس پر اس کا حق ملکیت تسلیم نہیں کیا جاسکتا، اگر کوئی حق ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ حرام، ظلم اور غصب قرار دیا جائے گا[2]

۱۴۔ جب کھیتی پک کر بالکل تیار ہو جائے، یا باغ کے پھل کا بڑھنا رک گیا ہو، وہ پکنے لگے ہوں، اس وقت مزارعت یا مساقات پر کھیتی یا باغ کو دوسرے کو دینا جائز نہیں ہے، مثلاً اگر گیہوں کی بالیاں زرد پڑ گئی ہوں، یا آم کے پھل میں پورے طور پر گٹھلی پڑ کر سخت ہو گئی ہو تو اس وقت بٹائی پر دینا نہ چاہیے، لیکن جب تک بالیاں ہری ہوں اور پھل کی گٹھلیاں سخت نہ ہوئی ہوں بلکہ نرم ہوں، اس وقت تک ان کو مزارعت یا مساقات پر دینا صحیح ہے[3]

---

[1] اذا اراد المزارع ان يدفع الأرض إلى غيره من مزارعة فإن كان البذر من قبل رب الأرض ليس له ان يدفع الأرض إلى غيره۔ (فتاوی ہندیة ج ۲ ص ۲۵۰)۔ [2] وأما مجرد وضع اليد على الدكان و نحوها وكونه ليستاجر عدة سنين بدون شيئ مما ذكر فهو غير معتبر، فللموجر إخراجها من يده (شامی ج ۴ ص ۲۴ بحوالہ بہشتی زیور ج ۱۱ ص ۱۱۷) [3] وإن كان باقيته ثمرًا لامدركا كالمزارعة (شرح وقاية ج ۴ ص ۳۱)

فسخ ہونے کی صورتیں

حسب ذیل صورتوں میں یہ معاملات فاسد یا فسخ ہوجائیں گے

(۱) اوپر اجارۂ ارض، مزارعت اور مساقات کے صحیح ہونے کی جو شرطیں بیان کی گئی ہیں، اگر ان میں سے کوئی نہ پائی جائیگی تو یہ معاملہ فاسد ہوکر فسخ سمجھا جائے گا۔

(۲) اگر مالک زمین یا مزارع میں سے کوئی مرجائے تو مزارعت اور مساقات وغیرہ کا معاملہ خود بخود فسخ ہوجائے گا، البتہ اگر ابھی کھیتی تیار نہ ہو یا باغ کے پھل پکے نہ ہوں، اور مالک زمین مرجائے تو مزارع کو یہ حق ہوگا کہ تیار ہونے تک وہ اس کی دیکھ بھال کرے، اور کٹنے کے بعد اپنا حصہ اس سے لے لے، مالک زمین کے ورثہ کو روکنے کا حق نہ ہوگا، اسی طرح اگر مزارع یعنی کاشتکار مرجائے تو اس کے ورثہ کو یہ حق ہوگا کہ وہ کھیتی یا پھل تیار ہونے تک اس میں محنت کریں، اور جو حصہ مزارع کے لیے مقرر تھا وہ لے لیں، مالک زمین کو مزارع کے ورثہ کو اس حق سے روکنے یا محروم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، البتہ اگر کسان یا اس کے ورثہ کام کرنا چھوڑ دیں تو پھر کسی چیز کے مستحق نہ ہوں گے[1]

کن صورتوں میں مالک یا مزارع خود معاملہ فسخ کرسکتے ہیں

مزارع یا مالک کو جب تک کوئی شدید عذر پیش نہ آجائے مزارعت، مساقات یا اجارۂ ارض کے معاملہ کو فسخ نہ کرنا چاہیے، عذر شدید کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں (۱) مثلاً ایک شخص نے اپنی زمین بٹائی پر دی، یا باغ کو نگرانی کے لیے دیا، لیکن ابھی اس نے کھیت میں بیج نہیں ڈالا تھا یا باغ میں پھل نہیں آیا تھا کہ مالک زمین یا باغ کو کسی شدید ضرورت کی بنا پر بیچنے کی ضرورت پیش آگئی، تو وہ معاملہ کو فسخ کرکے اپنی زمین بیچ سکتا ہے، لیکن اگر مزارع نے اس میں بیج ڈال دیا ہے، یا باغ میں پھل وغیرہ آچکے ہیں تو اس کی تین صورتیں ہیں، وہ کھیتی یا پھل بالکل تیار ہوچکے ہیں یا نہیں؟ اگر تیار ہوچکے ہوں تو پھر اس کو کھیتی کاٹ کر اور پھل توڑ کر زمین

---

[1] اذا مات صاحب الأرض والزرع أخضر فالفلاح يداوم على العمل إلى ان يدرك الزرع فلايسوغ لورثة المتوفى منعه وكذا الفلاح (المجلة ۲۳۳)

بیچ دینے کا حق ہے، لیکن اگر کھیتی ابھی پکی نہیں ہے، یا پھل بہت زیادہ کچے ہیں تو پھر اس صورت میں جب تک کہ کھیتی اور پھل پک نہ جائیں معاملہ فسخ کرنے اور بیچنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں مزارع کا سراسر نقصان ہے، اگر وہ مقروض ہے اور اس کے پاس زمین کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے بیچ کر وہ قرض ادا کرے تو پھر قرض خواہوں کو کھیتی کٹنے یا پھل کے پک جانے کا انتظار کرنا پڑے گا، اگر وہ نہ کریں گے تو قانوناً ان کو اس پر مجبور کیا جا سکتا ہے[1]. البتہ اگر مزارع نے ابھی بیج نہیں ڈالا ہے، صرف اس میں ہل چلایا اور نالی وغیرہ بنائی ہے تو مزارع کو کچھ نہ ملے گا، اور وہ اپنی زمین بیچ سکتا ہے، اس لیے شدید ضرورت میں معاملہ فسخ کرنے کا اسے حق ہے۔

(۲) اگر مزارع اتنا شدید بیمار پڑ جائے کہ وہ کھیتی کا کام یا باغ کی نگرانی نہ کر سکے تو اس کو حق ہوگا کہ وہ معاملہ فسخ کر دے، لیکن اگر وہ دوسرے کے ذریعہ کام لے کر معاملہ کو فسخ نہ کرے تو اس کا بھی اس کو حق ہے[2] بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اگر معاملہ میں اپنے ہاتھ سے کرنے کی قید لگی ہو تو وہ معاملہ فسخ ہو سکتا ہے، اور اگر یہ قید نہ ہو تو اسے دوسرے سے کام لے کر معاہدہ پورا کرنا چاہیے۔

(۳) اسی طرح اگر مزارع کھیتی باڑی چھوڑ کر کسی کارخانہ میں ملازمت کرنے کے لیے یا کوئی اور کام کرنے کے لیے دوسری جگہ جانا چاہتا ہے تو اس صورت میں بھی اس کو معاملہ فسخ کرنے کا حق ہے، بشرطیکہ یہ صورت اختیار کرنے پر وہ معاشی حیثیت سے مجبور ہو، یعنی اس کی گذر اوقات اس کھیتی باڑی کے ذریعہ نہ ہوتی ہو تو وہ ایسا کر سکتا ہے ورنہ نہیں۔ (بدائع الصنائع)

فسخ ہو جانے کی صورت میں کس کو کیا ملے گا؟

اوپر مزارعت اور مساقات کے صحیح نہ ہونے کی جو صورتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے اگر کوئی بھی نہ پائی جائے گی تو وہ معاملہ فسخ سمجھا جائے گا، یعنی یہ سمجھا جائے گا کہ گویا ہوا ہی نہیں۔

---

[1] اذا فسخت المزارعة بدين فادح لحق صاحب الأرض فاحتاج إلى بيعها فباع جاز، وليس للعامل ان يطالبه بما كرب الأرض وحفر الأنهار ولو نبت الزرع ولم يستحصد لم تبع الأرض في الدين حتى يستحصد الزرع (ہدایہ ج ۴، ص ۴۱۳) [2] ومنها مرض العامل اذا كان يضعفه عن العمل (ہدایہ ج ۳ ص ۴۱۷)

اب اگر معاملہ فسخ اس وقت ہوا جب مزارعت کا کام شروع ہو چکا تھا، یعنی ہل چلا کر غلہ بو دیا گیا تھا، یا باغ لینے والے نے اس میں پانی دے دیا تھا، اور درخت میں پھول یا بور آنا شروع ہو گئے تھے، تو ان تمام صورتوں میں غلہ بیج والے کا اور پھل باغ والے کا ہوگا، اور محنت کرنے والے کو دستور کے مطابق اتنے دن کی مزدوری ملے گی، لیکن اگر بیج کاشتکار نے دیا ہے تو مالک زمین کو وہاں کے دستور کے مطابق زمین کی لگان ملے گی، دستور کے مطابق اجرت یا کرایہ ملنے کی تشریح اوپر آ چکی ہے۔[1]

اگر ابھی کوئی کام شروع ہی نہیں ہوا تھا تو پھر کسی کو کچھ نہ ملے گا۔

اجرت کی بعض ناجائز صورتیں

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ بیع اور اجارہ میں فرق یہ ہے کہ بیع میں تملیک عین بعوض ہوتی ہے، اور اجارہ میں تملیک منفعت بعوض ہوتی ہے، یعنی بیع میں کوئی چیز دے کر اس کا عوض لیا جاتا ہے، اور اجارہ میں نفع اور محنت کو کچھ عوض دے کر اسے خریدا جاتا ہے، مگر بعض منفعتیں ایسی ہیں جن کا اجارہ پر لینا دینا جائز نہیں: (۱) مثلاً کسی جانور کو جفتی کے لیے اجرت پر لینا دینا جائز نہیں، اس لیے کہ حدیث میں ہے:

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن عسب الفحل.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جفتی کیلئے جانور کو کرایہ پر لینے دینے سے منع فرمایا ہے۔

(۲) اسی طرح گانے بجانے یا ناچنے، یا بندر بھالو وغیرہ کے نچانے یا مُردوں پر نوحہ کرنے کی اجرت لینا اور دینا جائز نہیں، اس لیے کہ اگر ان کو اجرت لینا دینا جائز قرار دیا جائے تو پھر ان چیزوں کے معصیت (گناہ) ہونے کی حیثیت ختم ہو جائے گی، اوپر حظر و اباحت کے بیان میں تفصیل آ چکی ہے

(۳) اس طرح جتنی چیزیں اسلام میں حرام ہیں ان پر اجرت لینا دینا ناجائز ہے، جیسے شراب اور دوسری نشہ کی چیزیں۔

---

[1] واذا فسدت فالخارج لصاحب البذر، ولو كان البذر من قبل رب الأرض فللعامل أجر مثله وإن كان من قبل العامل فلصاحب الأرض أجر مثل أرضه (ہدایہ ج ۴ ص ۴۱۲)

(۴) موجودہ دور میں ہوٹلوں میں جو فسق و فجور کا کاروبار ہوتا ہے وہ سب بھی لغویات میں داخل ہے، اس لیے یہ کاروبار اگر ان معائب سے پاک نہیں ہے تو ناجائز ہے، اگر ان معائب سے پاک ہے تو جائز ہے۔

(۵) اگر کوئی شخص کسی آدمی کو اجرت دے کر کسی کو گالی دلوائے یا پٹوائے یا قتل کرائے تو یہ فعل چونکہ گناہ کبیرہ ہے اس لیے اس پر اجرت لینا دینا حرام ہے۔ ہدایہ میں ہے:

لا یجوز الإستیجار علی الغناء والنوح وکذا سائر الملاھی لأنه استیجار علی المعصیة و المعصیة لا تستحق العقد. (ھدایہ ج ۳ ص ۲۸۷)	گانے، نوحہ و ماتم کرنے، اور اسی طرح سارے بے مقصد اور گناہ والے کاروبار اور کھیل کے لیے اجرت لینا دینا جائز نہیں اس لیے کہ یہ اجرت کا لین دین گناہ کے کام پر ہوا ہے، اور گناہ کا کام معاملہ کرنے کے لائق نہیں ہوتا۔

...

بعض مشرک قوموں میں آج تک یہ رواج ہے، سنگاپور میں راقم الحروف نے خود کرایے پر نوحہ کرنے والوں کو دیکھا ہے، ہمارے ملک کے شیعوں میں رواج ہے کہ وہ محرم میں ماتم کے لیے کرایہ کے آدمی لاتے ہیں۔

(۶) اسی طرح طاعت مقصودہ[1] پر اجرت لینا صحیح نہیں ہے، مثلاً تعلیم دین پر، اذان واقامت پر اجرت لینا دینا جائز نہیں ہے، جیسا کہ قرآن وحدیث میں وارد ہوا ہے، احناف کا اور ائمہ ثلاثہ کا اصل مسلک یہی ہے، لیکن متاخرین فقہاء نے تعلیم دین کے اور نماز باجماعت اور اذان کے ضائع ہونے کے خوف سے اس کو جائز قرار دیا ہے، صاحب ہدایہ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بعض مشائخنا استحسنوا علی استیجار علی تعلیم القرآن لانه ظھر التوانی فی الأمور الدینیة	قرآن کی تعلیم پر اجرت لینا ناجائز ہے، لیکن ہمارے بعض مشائخ نے جب دیکھا کہ دینی فرائض کی انجام دہی میں سستی پیدا ہو گئی ہے

---

[1] یعنی جس کام کا اس کے اہل پر ادا کرنا ضروری ہے۔

وفی الإمتناع یضیع حفظ القرآن۔

(ہدایہ ج ۳ ص ۲۸۷)

تو اگر اجرت لے کر تعلیم قرآن کی اجازت نہ دی گئی تو قرآن پاک کی حفاظت نہ ہوسکے گی، اس لیے انھوں نے اس کی اجازت دی۔

اسی طرح دوسرے علوم دینیہ اور اذان واقامت پر بھی اجرت لینے کو جائز قرار دیا گیا ہے اور اب اسی پر فتویٰ ہے۔ (ہدایہ ج ۴)

لیکن شادی وغم کے موقع پر اجرت دے کر قرآن پڑھوانا جائز نہیں ہے، اسی طرح تراویح میں اجرت لے کر قرآن سننا سنانا ناجائز ہے، اسی طرح کسی حافظ کو اجرت دے کر چالیس دن یا اس سے کم و بیش اس نیت سے قرآن پاک پڑھوانا کہ وہ مردہ کو اس کا ثواب پہونچائے صحیح نہیں ہے، اس سے نہ پڑھنے والے کو ثواب ملے گا اور نہ مردہ کو، اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، اس لیے جو اجرت لے کر قرآن پڑھتا ہے اور وہ خود ثواب سے محروم ہوتا ہے تو وہ مردوں کو کیا ثواب پہونچائے گا۔

گویا جن امور دینیہ کا تعلق فرائض سے ہے ان پر اجرت لی جاسکتی ہے، لیکن جو چیزیں مستحب ہیں ان پر قرآن پڑھ کر اجرت لینا اور دینا صحیح نہیں ہے۔

لا یصح الإستیجار علی القراءة وإهداءها إلی المیت لأنه لم ینقل عن أحد من الأئمة الاذن فی ذٰلك، فقد قال العلماء إن القاری إذا قرأه لأجل المال فلا ثواب له، فأی شیئ یهدیه الی المیت۔

(ردالمحتار ج ۵، ص ۵۲)

قرآن کی تلاوت اور اس کا ثواب مردہ کو پہونچانے کے لیے اجرت دے کر کسی شخص کو مقرر کرنا جائز نہیں ہے، ائمۂ اربعہ میں سے کسی سے اس کا جائز ہونا منقول نہیں ہے، فقہاء نے کہا ہے کہ جب کوئی شخص مال کے لیے قرآن پڑھتا ہے تو اس کو کوئی ثواب نہیں ملتا، تو جب خود اس کو ثواب نہیں ملتا تو وہ پھر میت کو کون سی چیز پہونچا رہا ہے؟

الفقه علی المذاهب الأربعة کے مصنف نے بھی یہی لکھا ہے:

أما قراءة القرآن خصوصًا

قرآن کی تلاوت اجرت لے کر خاص طور پر قرونِ

علی المقابر وفی الولائم والمأتم لایصح الإستیجار علیها إذلاضرورۃ تدعوا إلیھا۔ (ج ۳ ص ۱۲۷)

اور شادی وغمی کے مواقع پر کرانا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اس کی کوئی شرعی ضرورت نہیں ہے

...

بعض لوگ اس حدیث سے قرآن پڑھ کر اجرت لینے پر استدلال کرتے ہیں جس میں ایک صحابی کو آپؐ نے جھاڑ پھونک پر اجرت لینے کی اجازت دی تھی، مگر وہ پڑھنا علاج ومعالجہ کی غرض سے تھا، کسی دوسرے کو ثواب پہونچانے کی غرض سے نہیں تھا، اس لیے یہ جائز ہے

(۸) شادی بیاہ یا خوشی کے موقع پر جو گھر سجانے کے لیے بجلی کے قمقمے اور راڈ وغیرہ یا دوسرے سامان کرائے پر لیے جاتے ہیں تو ان کا کرایہ پر لینا درست نہیں ہے، البتہ صرف روشنی کے لیے دو چار بلب یا راڈ لگا دیے جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے، حوالہ اوپر آچکا ہے۔

اسی طرح شادی بیاہ اور خوشی کے موقع پر اونٹ گھوڑے وغیرہ صرف شان وشوکت اور دکھاوے کے لیے کرایہ پر لائے جاتے ہیں، یہ درست نہیں ہے، البتہ اگر اس کو سواری وغیرہ کی ضرورت سے لایا جائے تو درست ہے، حوالہ اوپر آچکا ہے۔

(۹) اسی طرح جو لوگ پامسٹوں کو ہاتھ دکھلا کر اپنے مستقبل کی باتیں دریافت کرتے ہیں یا کوئی چیز کھو گئی ہے اس کو پیسہ دے کر معلوم کرتے ہیں، اگر وہ بتا دے جب بھی اس پر اجرت لینا دینا صحیح نہیں ہے۔ (عالمگیری ج ۴ ص ۴۵۴)

ملکیت

انفرادی ملکیت اور قومی ملکیت

اسلامی شریعت انسان کو انفرادی طور پر مال، جائداد رکھنے اور کاروبار کرنے کی پوری اجازت دیتی ہے اسی کو انفرادی ملکیت کہا جاتا ہے، لیکن ادھر ایک صدی سے قومی ملکیت کے فلسفہ کی آواز بہت سنائی دینے لگی ہے، اور اس مدت میں انفرادی ملکیت کو بجبر ختم کر کے کسی چیز کو قومی ملکیت میں لینے کا

فلسفہ جو کارل مارکس نے دنیا کو دیا تھا، کمیونسٹ ملکوں میں اس کی کوشش جاری ہے، اس فلسفہ کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ معاشی ناہمواری کا اصل سبب انفرادی ملکیت ہے، جس میں ایک شخص جتنی دولت چاہے غلط و صحیح طریقہ سے سمیٹ لیتا ہے، اور دوسرے طبقات خاص طور پر مزدور پیشہ طبقہ اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لیے بھی مجبور ہوتا ہے، ان کے نزدیک معاشیات کے تین بنیادی عوامل ہیں: (۱) سرمایہ (۲) محنت (۳) تنظیم۔ کارل مارکس کے نزدیک معاشی ناہمواریوں کا اصل سبب سرمایہ اور سرمایہ دار ہے، اس لیے ذرائع آمدنی اس کے ہاتھ سے نکال کر محنت اور تنظیم کے حوالہ کر دیا جائے، دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ سارے ذرائع معاش پر محنت اور تنظیم کی نمائندہ حکومت کا کنٹرول ہو، اس کے نزدیک معاشی مساوات قائم کرنے اور معاشی نابرابری کو دور کرنے کی صرف یہی صورت ہے، اس فلسفہ کے مطابق قومی ملکیت کے ذرائع کو جو لوگ کنٹرول کریں گے وہ گویا عام انسانوں میں سے کوئی بلند، بے غرض، مخلوق ہوگی جو اپنے کو عام انسانوں کی خدمت کے لیے وقف کر دے گی، جس معاشی مساوات کیلئے لاکھوں آدمیوں کو ان کی ملکیت سے محروم کیا گیا اور لاکھوں آدمیوں کو ملک بدر کیا گیا، اور ہزاروں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا آج وہاں ستر برس گذر جانے کے بعد بھی معاشی مساوات کا کوئی وجود نہیں دکھائی دے رہا ہے، اس لیے کہ اس فلسفہ کی بنیاد انسان کی فطرت کے خلاف ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعہ انسان کو سنت الٰہی سے ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ اب انفرادی ملکیت کا دائرہ وہاں بھی وسیع کیا جارہا ہے، اس وقت گورباچوف نے جن تبدیلیوں کا اعلان کیا ہے اگر وہ بروئے کار آئیں تو پھر کمیونزم کے سارے فلسفہ کو دریا برد کرنا پڑے گا۔

معاشی مساوات نہیں بلکہ معاشی انصاف

اس کے برخلاف اسلام سرمایہ، محنت اور تنظیم یعنی مزدور، سرمایہ اور حکومت کو برابر حیثیت دیتا ہے، سرمایہ کے ذریعہ محنت کی جو حق تلفی ہوتی ہے، یا محنت کے ذریعہ سرمایہ کی جو حق تلفی ہوتی ہے وہ اسے نظر انداز نہیں کرتا ہے، اسلام سارے سرمایہ داروں کو ختم کر کے ایک بڑے سرمایہ دار یعنی حکومت کو وجود میں لانے کا قائل نہیں ہے، بلکہ وہ ہر طبقہ کو اس کا حق دلاتا ہے، اور دوسروں کی حق تلفی سے روکتا ہے، وہ معاشی مساوات کا جھوٹا نعرہ نہیں دیتا بلکہ معاشی انصاف کا اصول دیتا ہے،

معاشی معاملات کے بیان میں اور خاص طور پر اجرت کے بیان میں اس کی کچھ تفصیل آچکی ہے اور مزید تفصیل راقم الحروف کی کتاب "اسلامی قانون اجرت" میں دیکھی جاسکتی ہے، اسلام نے انفرادی ملکیت کے صحیح یا غلط استعمال کے جو حدود مقرر کیے ہیں ان کو اگر پورے طور پر کام میں لایا جائے تو انفرادی ملکیت کی فطری خواہش بھی مجروح نہیں ہونے پائے گی اور سرمایہ اور سرمایہ دار کے ظلم اور ان کی حقیقی حق تلفی سے بھی محنت کش طبقہ کو نجات مل جائے گی، اس کی کچھ تفصیل حجر کے بیان میں آئے گی، اور کچھ کتاب کے آخر میں وراثت کے بیان میں آئے گی، یہاں صرف اس کی تھوڑی سی تفصیل اس حیثیت سے کردی جاتی ہے کہ ملکیت کے حق کے استعمال و تصرف کو اسلام نے کن حدود کا پابند کیا ہے وہ حدود یہ ہیں

(۱) مال کو بے جا صرف کرنے یا ضائع کرنے کی ممانعت قرآن پاک میں بھی آئی ہے، اور حدیث نبویؐ میں بھی بار بار اضاعت مال سے منع کیا گیا ہے۔

(۲) غیر شرعی امور میں مال صرف کرنے کی ممانعت آئی ہے، حرام کاموں یا معاشرہ کو خراب کرنے والے فحش لٹریچر یا باطل نظریات کی اشاعت میں صرف کرنا، یہ سب اسی میں آتا ہے، حضرت ابن مسعودؓ سے کسی نے فضول خرچ (مبذّرین) کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: الذین ینفقون فی غیر حق (الادب المفرد) جو ناحق جگہ میں مال صرف کرتا ہے وہ مُسرف ہے۔

(۳) **اِسراف**: قرآن و حدیث میں جائز دولت کو بھی بے جا نمود و نمائش میں صرف کرنے سے منع کیا گیا ہے، قرآن پاک میں ہے:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا	اللہ کی دی ہوئی نعمت کو کھاؤ پیو۔ مگر اس میں فضول خرچی نہ کرو۔

حدیث میں ہے:

کلوا واشربوا والبسوا و تصدقوا من غیر إسراف ولا مخلیۃ۔	کھاؤ پیو اور پہنو، اور صدقہ و خیرات کرو، مگر اسراف اور فخر و غرور کے خرچ کرنے سے بچو۔

(۴) عیش پرستی: اسراف ہی کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے کھانے اور پینے اور

اور مکان بنانے اور ضروریات پوری کرنے کے بجائے بے جا عیش پرستی کے کاموں میں دولت صرف کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا ہے، اور حضرت عمرؓ تو تمام امراء کو اس کی خصوصی ہدایت دیتے تھے۔

(۵) اپنی ملکیت سے دوسرے کو تکلیف پہونچانے کی ممانعت: انفرادی ملکیت پر سب سے بڑی پابندی یہ عائد ہے کہ وہ کوئی ایسا کاروبار یا کام نہ کرے جس سے پڑوسیوں کو یا دوسرے باشندگان ملک کو نقصان پہونچے، قرآن پاک میں ان جملوں میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے:

لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ — نہ ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

حدیث میں آتا ہے کہ

لا ضرر ولا ضرار۔ — نہ تکلیف اٹھاؤ اور نہ دوسروں کو تکلیف دو

فقہائے کرام نے ان ہی ہدایات کی روشنی میں یہ اصول بنا دیا کہ

(۱) الضرر یزال — تکلیف پہونچانے کی صورتوں کو دور کیا جائیگا

(۲) یتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام۔ — عام لوگوں کو تکلیف سے محفوظ کرنے کیلئے خاص لوگوں کے نقصان کو برداشت کیا جائیگا

اسی اصول پر اناڑی ڈاکٹر کو علاج سے روکا جائے گا، اسی اصول کے تحت احتکار (ہولڈنگ) کرنے والوں کی وجہ سے عام لوگوں کو ضروریات زندگی کی چیزیں نہ مل رہی ہوں تو حکومت ان کا سامان مناسب قیمت پر بکوا دے گی، کپڑے کی دوکانوں کے درمیان کوئی روٹی اور کھانا پکانے کا ہوٹل قائم کرے اور اس سے اگر کپڑے کو نقصان پہونچ رہا ہو تو اس سے منع کیا جائیگا اسی اصول کے تحت حجر کیا جاتا ہے، یعنی بچوں، نادان اور بیوقوف آدمیوں کو اور مسرف افراد کو ان کی دولت کے استعمال سے عارضی طور پر روک دیا جاتا ہے۔

اسی طرح ذی روح جانوروں کے استعمال کے لیے کچھ حدود مقرر کیے گئے ہیں، جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے، ظاہر ہے ان پابندیوں کے بعد سرمایہ سے محنت کو اور محنت سے سرمایہ کو یا دوسرے عوامل پیدایش کو نقصان پہونچنے کا جو امکان ہے وہ بڑی حد تک اس سے محفوظ بھی ہو جائیں گے اور انسان کی انفرادی ملکیت کی فطری خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔

اوپر بار بار یہ بات کہی گئی ہے کہ انفرادی ملکیت انسان کی ایک فطری خواہش ہے، اس کے ثبوت کے لیے روس کی مثال کافی ہے کہ قومی ملکیت کے ستر سالہ تجربے کی ناکامی کے بعد آج روس میں انفرادی ملکیت کے اس فطری حق کو بڑی حد تک تسلیم کرلیا گیا ہے۔

اسلام میں بھی ضرورت کے وقت عارضی طور پر تنظیم یعنی حکومت کو دوسرے عوامل پیدائش پر ترجیح دی گئی ہے، مگر اسے زندگی کا مستقل فلسفہ بنا کر دوسرے عوامل کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، اس تمہید کے بعد ملکیت کے اسلامی تصور کی وضاحت کی جاتی ہے۔

اسلامی شریعت میں ملکیت کی حیثیت

اسلامی شریعت میں کسی زمین، جائداد یا مال پر آدمی کی ملکیت تین طریقہ سے ثابت ہوتی ہے، جب ان میں سے کسی ذریعہ سے بھی آدمی کسی چیز کا مالک ہو جائے تو پھر اس کی ملکیت کو نہ تو اس کی مرضی کے بغیر کوئی شخص یا حکومت لے سکتی ہے، اور نہ اس کی مرضی کے خلاف تصرف کر سکتی ہے، البتہ ایسی ملکیت کے تصرف کرنے میں کچھ پابندیاں حکومت اس وقت لگا سکتی ہے جب وہ فضول خرچی میں ضائع کر رہا ہو، یا اس میں سلیقہ سے خرچ کرنے کی صلاحیت نہ ہو، یا اس سے کسی دوسرے شخص یا معاشرہ کا کوئی نقصان ہو رہا ہو، بغیر ان وجوہ کے تصرف میں کوئی مداخلت کا حق نہ تو کسی شخص کو ہے اور نہ حکومت کو۔

کن صورتوں سے کوئی چیز ملکیت میں آجاتی ہے؟

عام طور سے تین صورتوں سے کوئی چیز کسی کی ملکیت میں آتی ہے، وہ یہ ہیں: (۱) اپنی ملکیت کو خوشی سے کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف منتقل کردے خواہ معاوضہ لے کر منتقل کرے، مثلاً کوئی شخص اپنی کوئی چیز کسی کے ہاتھ قیمت لے کر فروخت کردے یا بغیر کسی معاوضہ کے دوسرے کو دے دے، مثلاً ہبہ کردے یا بطور انعام دے دے، تو ان طریقوں سے دوسرا شخص اس کا مالک ہو جائے گا، اب پہلا شخص اس میں کوئی مداخلت نہیں کرسکتا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی کوئی چیز وراثت میں پائے اس سے بھی وارث کی ملکیت قائم ہو جاتی ہے۔

(۳) تیسری صورت یہ کہ اپنی محنت مزدوری سے کسی مباح چیز یا جس چیز کا کوئی مالک نہ ہو اسے حاصل کرلے

ملکیت کی پہلی صورت کا بیان اوپر ہو چکا ہے، اور دوسری صورت کا بیان کتاب کے آخر میں ہوگا، البتہ تیسری صورت کی کچھ تفصیل یہاں بیان کی جاتی ہے، ایک چوتھی صورت بھی ملکیت کی ہوتی ہے، وہ یہ کہ ملکیت سے جو چیز پیدا ہو وہ بھی اسی میں شامل سمجھی جائے گی مثلاً جانور کا بچہ، درخت کا پھل وغیرہ، اس کی تفصیل بیع کے بیان میں آچکی ہے۔

مباح چیزیں خدا نے اس کائنات میں جو چیزیں پیدا کی ہیں وہ سارے انسانوں کا مشترکہ سرمایہ ہیں، ان میں سے بہت سی چیزوں پر انسان نے محنت مشقت کر کے اپنی ملکیت قائم کرلی ہے، مگر اب بھی خدا کی بنائی ہوئی اس کائنات میں بیشمار چیزیں ایسی ہیں جو پوری انسانی آبادی کا مشترک سرمایہ ہیں اور ان کا استعمال ہر فرد کے لیے اس وقت تک مباح ہے، جب تک ان میں سے کوئی ان پر اپنی محنت یا اپنا سرمایہ صرف کر کے ان کو اپنے قبضہ میں نہ لے لے، مثلاً پانی، ہوا، آگ، روشنی، خودرو گھاس، جنگلات، زمین کے پوشیدہ خزانے، یعنی رکاز، آبادی سے دور بے کار، بنجر اور پرتی زمینیں (موات) وغیرہ،

قرآن پاک میں ہے:

خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا. (البقرۃ)	جو کچھ زمین میں ہے وہ سب اللہ تعالیٰ نے تمھارے فائدہ کیلئے پیدا کیا ہے۔
وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ (ابراهيم)	تمھارے لیے اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے، اور وہ برابر گردش کر رہے ہیں۔
وَسَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا. (النحل)	تمھارے لیے اللہ تعالیٰ نے سمندروں کو مسخر کر دیا ہے، تاکہ تم تروتازہ مچھلیاں شکار کر کے کھاؤ۔

حدیث میں ہے:

الناس شركاء في الثلث، في الماء والكلأ والنار[1].	تین چیزوں میں سارے انسان شریک ہیں، پانی، خودرو گھاس اور آگ اور روشنی

[1] کتاب الاموال ابو عبید ص ۲۹۵۔

دوسری حدیث میں الناس کے بجائے المسلمون[1] کا لفظ آیا ہے۔ ایک حدیث میں مِلح (نمک) کا لفظ بھی آیا ہے۔ یعنی نمک[2] بھی انسانوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔

ان چیزوں پر کب اور کیسے ملکیت قائم ہو سکتی ہے

ان میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جن پر کسی کی ملکیت اسلام تسلیم نہیں کرتا، مثلاً سمندر، بڑے دریا، ہوا، فضا اور روشنی کو دنیا کا ہر انسان اس وقت تک استعمال کر سکتا ہے جب تک اس کا استعمال دوسروں کے لیے نقصان دہ نہ ہو، البتہ اگر اس کا استعمال دوسروں کے لیے نقصان دہ ہوگا تو پھر اس سے روکا جائے گا، مثلاً سمندر میں ہر ایک حکومت اپنا تجارتی جہاز بھیج سکتی ہے، بحری بیڑہ رکھ سکتی ہے، فضا میں ہر حکومت کا جہاز اڑ سکتا ہے، سورج اور چاند کی روشنی سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے، خواہ وہ فائدہ دھوپ چولھا بنا کر اٹھائے، یا کوئی خلائی اسٹیشن قائم کرے، یا اور کسی طرح سے، لیکن سمندر میں جہاز رکھنے کا مقصد یا فضا میں ہوائی جہاز اڑانے کا مقصد کسی ملک پر حملہ کرنا ہو تو اسلامی شریعت کی رو سے ایسی حکومت کو ظالم قرار دیا جائے گا، اور اس کو ضرور اس سے روکا جائے گا، تاکہ خدا کی اس نعمت اور رحمت عام کو وہ دوسرے انسانوں کے لیے مصیبت نہ بنا سکے، اسی طرح اگر کوئی شخص سورج سے دھوپ چولھا تیار کرتا ہے، یا کوئی اور آلہ بناتا ہے تو اس کو اس کا حق ہے، لیکن اگر وہ کوئی ایسا آلہ تیار کرتا ہے جو انسانی زندگی کے لیے مہلک ثابت ہو تو پھر اس سے اس کو ضرور روکا جا سکتا ہے، موجودہ دور میں اگر اسلام برسر قوت ہوتا تو کم از کم ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور کیمیائی مہلک ہتھیاروں کے بنانے پر تو ضرور پابندی عائد کرتا۔

لیکن اگر اپنی محنت سے یا سرمایہ لگا کر کوئی شخص دریا کے پانی یا سورج کی روشنی کو اپنے قبضہ میں لے آتا ہے تو وہ اتنی چیز کا مالک سمجھا جائے گا، مثلاً اگر کسی نے دریا سے کوئی نہر نکالی یا سورج کی روشنی سے کوئی آلہ تیار کیا تو اس آلے اور اس نہر کے پانی پر اس شخص یا اس حکومت

---

[1] ابو داؤد۔ ابن ماجہ۔ مشکوٰۃ ص ۲۵۹۔ [2] اس سے مراد نمک کی زمین اور اس کی کان ہے

کی ملکیت قائم ہو جائے گی، جس نے محنت کر کے یا سرمایہ لگا کر اس کو بنایا ہے، اب وہ جسے چاہے اس نہر سے گذرنے دے اور جسے چاہے نہ گذرنے دے، لیکن وہ کسی کو پانی لینے اور آبپاشی کرنے سے نہیں روک سکتا، کرایہ لے سکتا ہے۔

اسی طرح دوسری مباح چیزیں بھی محنت و سرمایہ لگانے کے بعد ملکیت میں آجاتی ہیں، اب ان میں سے ہر ایک کا بیان ہم الگ الگ کر رہے ہیں:

۱۔ پانی

پانی کی حیثیت چار یا پانچ طرح کی ہوتی ہے: (۱) ایک تو سمندروں اور بڑے بڑے دریاؤں کا پانی، جس کا بیان اوپر ہوا، کہ جب تک ان کا استعمال دوسروں کے لیے نقصان وہ نہ ہو اس کے استعمال سے روکا نہیں جا سکتا، ان میں ہر شخص اور ہر ملک کا باشندہ شکار کر سکتا ہے، اس کے اندر کے خزانہ کی تلاش کر سکتا ہے، اپنی کشتیاں اور جہاز چلا سکتا ہے، اس وقت جن لوگوں نے سمندروں کو بانٹ کر ان پر اپنا اقتدار جما رکھا ہے، وہ اسلامی شریعت کے منشا کے خلاف ہے، خاص طور پر شکار کرنے اور مال بردار جہازوں کے لے جانے میں تو کسی طرح پابندی صحیح نہیں، البتہ جنگی جہازوں کے سلسلہ میں پابندی عائد کی جا سکتی ہے[۱]

(۲) دوسرے بڑے قدرتی تالاب، ندی، نالے کا پانی، ان کا حکم بھی قریب قریب وہی ہے جو بڑے دریاؤں کا ہے، یعنی یہ کسی کی ملکیت نہیں ہیں۔

(۳) تیسرے وہ تالاب، حوض، پوکھرے، نہریں اور کنویں جن کو کسی شخص نے یا حکومت نے اپنی محنت سے بنایا، یا سرمایہ لگا کر بنوایا ہے، ان کے پانی کا حکم یہ ہے کہ اس پر محنت یا سرمایہ لگانے والے کی ملکیت ثابت ہو جائے گی، لیکن اس کو یہ حق نہیں ہوگا کہ لوگوں کو پانی پینے، یا

---

[۱] اوپر قرآن کی جو آیات اور احادیث نبویؐ نقل کی گئی ہیں ان کی روشنی میں فقہاء نے یہ اصول بنا دیا ہے کہ یجوز لکل احد الانتفاع بالمیاہ، لکنہ مشروط بعدم الضرر إلی العامة (المجلة ص ۲۰۳) الإنتفاع بماء البحر کالإنتفاع بالشمس والقمر والهواء فلا یمنع من الانتفاع به علی وجه شاء (هدایة ج ۴ ص ۴۶۸)

جانوروں کو پانی پلانے سے روک دے، یا پانی پینے پلانے کا کوئی کرایہ وصول کرے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، اور اگر دوسرا ذریعہ پانی لینے کا نہ ہو اور انسان یا جانوروں کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو تو حضرت عمرؓ نے ایسے لوگوں سے جنگ کرنے کی اجازت دی ہے یعنی بجبر اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے (بدائع ج ۶ ص ۱۸۹ - ہدایہ ج ۴ ص ۴۷۰)

اگر جانوروں کے کثرت سے آنے کی وجہ سے حوض یا تالاب کے کناروں کے ٹوٹ جانے یا خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو تو وہ ان پر پابندی عائد کر سکتا ہے کہ وہ احتیاط سے باری باری پلائیں، اور خلاف ورزی کی صورت میں اس کو بالکل روک دینے کا بھی حق ہے[1]

البتہ اگر وہ اس سے آبپاشی کرنا چاہیں تو اس کو حق ہے کہ وہ اس سے منع کرے، یا اس کا کرایہ لے کر ان کو پانی دے، اسی طرح جو ٹیوب ویل یا کنویں یا نہر سے آبپاشی کے لیے چھوٹی چھوٹی نالیاں بنائی جاتی ہیں ان کا پانی بھی آدمی کے پینے اور جانوروں کے پلانے کے لیے مباح ہے کوئی روک نہیں سکتا، مگر کسی حکومت کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ عوام کے پیسے سے بنائی ہوئی نہروں یا ٹیوب ویلوں کے پانی کا کرایہ لے، اسلامی حکومت میں لوگوں سے زراعتی ٹیکس تو لیا جاتا تھا، مگر اس کی مثال نہیں ملتی کہ آب پاشی کا کوئی کرایہ لیا جاتا ہو۔

(۴) چوتھے وہ پانی جو آدمی اپنے برتن میں یا بھشتی مشک میں بھر لیتا ہے، وہ اس کا مالک ہے، اس کو وہ فروخت بھی کر سکتا ہے اور دوسروں کو پینے سے منع بھی کر سکتا ہے لیکن اگر کوئی شخص پیاس سے تڑپ رہا ہے، اور اس کے پاس پینے سے زیادہ پانی ہے، اور وہ پانی نہیں دے رہا ہے تو پھر اس سے زبردستی پانی لیا جا سکتا ہے[2]

(۵) پانچویں زمین کے نیچے جو پانی ہے وہ بھی کسی کی ملک نہیں ہے، اس سے ہر شخص فائدہ حاصل کر سکتا ہے، البتہ کسی دوسرے کی زمین میں کنواں کھود کر یا ہینڈ پائپ لگا کر یا ٹیوب لگا کر فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

---

[1] ان لم یخش من تخریبہا بحسب کثرۃ الحیوانات۔ (المجلۃ ص ۲۰۴۔ [2] بدائع الصنائع ج ۶ ص ۱۸۹۔

۶۔ مشترکہ پانی

اگر کئی آدمی مل کر کوئی نہر کھودیں یا ٹیوب ویل لگائیں تو ایک دوسرے کی اجازت ہی سے نالیاں بنائیں اور جو دن جس کے لیے مقرر ہے اسی دن وہ آب پاشی کریں، اگر دوسرے شرکاء اجازت دے دیں تو دوسرے دن بھی آپ پاشی ایک شریک کرسکتا ہے [۱]

پانی کا شکار

دریا، تالاب وغیرہ کی مچھلیاں کسی کی ملکیت نہیں ہیں، جس کا جی چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے اور ان کا شکار کرسکتا ہے، اگر کسی نے دریا کی مچھلی پکڑنے پر کسی کو مزدور رکھا تو یہ صحیح ہے، جو مچھلیاں وہ مزدور شکار کرے گا وہ متاجر کی ملکیت ہوں گی، البتہ اگر کسی نے مچھلیاں اپنے ذاتی تالاب میں یا حوض میں پالی ہوں، یا تالاب اس کا ذاتی نہ ہو مگر اس نے اس میں مچھلیاں لاکر ڈالی ہوں اور ان کے پالنے پر خرچ کیا ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ حوض اتنا چھوٹا ہے' یا تالاب تو بڑا ہے مگر مچھلیاں اتنی زیادہ ہیں کہ بغیر کسی محنت کے آدمی ان کو پکڑ سکتا ہے، ایسی مچھلیاں اس کی ملکیت ہیں، اور ان کو وہ حوض و تالاب میں رہتے ہوئے بھی بیچ سکتا ہے، دوسرے یہ کہ مچھلیوں کو پکڑنے میں کچھ تدبیر اور محنت کرنی پڑتی ہے مثلاً جال ڈالنا پڑتا ہے، یا شست لگانی پڑتی ہے تو مچھلیاں اس کی ملکیت ہیں، دوسروں کو شکار کرنے اور پکڑنے سے وہ منع کرسکتا ہے، لیکن اگر وہ ان کو پانی ہی میں بیچ دینا چاہے جیسا کہ عام طور پر دستور ہے تو اس کو اس کا حق نہیں ہے، اگر وہ بیچنا چاہتا ہے تو پہلے ان کا شکار کرے پھر بیچے [۲] قرآن پاک نے اس کی صراحت کردی ہے:

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ. (المائدة)	حلال ہے تمھارے لیے سمندر کا شکار کرنا اور اس کا کھانا اور جو وہاں سے دور ہیں اور ان کے لیے سفر کرکے آتے ہیں ان کے لیے بھی۔

۲۔ گھاس

خودرو گھاس خواہ کسی کی ذاتی زمین ہی میں کیوں نہ ہو، جب تک اس نے

---

[۱] المجلة ص ۲۰۵ [۲] المجلة ص ۲۰۹ دفعہ ۱۳۰۱۔

اس پر کوئی محنت نہ کی ہو، یا کچھ خرچ نہ کیا ہو اس وقت تک وہ کسی کو اس کے کاٹنے یا جانوروں کو چرنے یا چرانے سے روک نہیں سکتا، اور نہ وہ اس کو بیچ سکتا ہے، البتہ اس کو یہ حق ہے کہ اپنی زمین کے احاطہ میں وہ کسی کو آنے نہ دے، لیکن اگر اس نے اس گھاس کے اُگانے پر خرچ کیا ہے یا محنت کی ہے تو پھر اس کو یہ حق ہوگا کہ وہ دوسروں کو کاٹنے اور چرانے سے روک دے، اور اس کو یہ بھی حق ہے کہ وہ خود کاٹ کر یا مزدوری پر کٹوا کر یا بغیر کاٹے ہوئے اس کو بیچ دے[1]

۳۔ جنگلات

خودرو جنگلات بھی کسی کی ملکیت نہیں ہیں، بلکہ ان سے ہر انسان کو لکڑی کاٹنے اور کاٹ کر لے جانے کا حق ہے، البتہ اگر وہ جنگلات کسی نے لگائے ہیں، یا کسی کی زمین میں اُگے ہیں تو وہ اس شخص کی ملکیت ہوں گے۔

اگر کسی نے خودرو جنگل سے لکڑی کاٹی یا مزدوری دے کر کٹوائی تو اس کو اب کوئی دوسرا نہیں لے سکتا۔ (المجلۃ ص ۲۰۳)

آگ

اوپر ذکر آچکا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تین چیزیں سارے انسانوں کے لیے مباح کی ہیں ان میں آگ بھی ہے، آگ کے مباح ہونے کی فقہاء عموماً یہ صورت لکھتے ہیں کہ اگر کسی نے آگ جلائی تو دوسرے کو اس کی روشنی سے فائدہ اٹھانے، اپنا ہاتھ پیر سینکنے، اس کی گرمی سے اپنا کپڑا سکھانے کی اجازت ہے اسی طرح کسی نے چراغ جلایا تو دوسرا اس کے چراغ سے اپنا چراغ جلالے تو اس کو اس کا حق ہے، اسی طرح اس وقت کوئی دیا سلائی جلائے یا لائٹر جلائے تو دوسرے کو اس سے اپنا چولھا جلا لینے کی اجازت ہے، لیکن امام خطابی نے معالم السنن میں لکھا ہے کہ:

فقد فسّره بعض العلماء وذهب إلى أنه اراد به الحجارة التى	بعض علماء نے یہ تفسیر کی ہے، اور اس طرف گئے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ چقماق وغیرہ

---

[1] المجلۃ

تورى النار ۔ کے جن پتھروں کو رگڑ کر آگ جلائی جاتی ہے

(ج ۵ ص ۱۲۴) وہ مراد ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس چیز سے بھی گرمی اور روشنی مل سکتی ہو وہ انسان کا مشترکہ سرمایہ ہے، بشرطیکہ اس سے کسی دوسرے کو کوئی نقصان نہ پہونچتا ہو۔ جیسے کوئی سورج کی روشنی اور گرمی سے کوئی مشین یا چولھا بنائے تو اس کو اس کا حق ہے، سڑک کی لائٹ میں اگر پڑھنا چاہے تو وہ پڑھ سکتا ہے، لیکن اس پر تار پھینک کر اپنے گھر میں روشنی نہیں لے جاسکتا اس لیے کہ بجلی کے محکمہ کا نقصان ہے۔

رکاز زمین کے اندر جو خزانے پوشیدہ ہیں ان کو شریعت میں **رکاز** کہا جاتا ہے اسکی ۲ دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو خود بخود زمین کے اندر پیدا ہوتے ہیں، مثلاً کوئلہ، پٹرول، ابرق، گندھک، سونا، چاندی، لوہا، تانبا، پیتل اور نمک وغیرہ، دوسرے وہ جس کو کسی نے زمین میں دفن کر دیا ہو، پہلی قسم کو معدن کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کو کنز اور **رکاز** کہتے ہیں، معدن کی ۲ دو صورتیں ہیں، ایک تو وہ منجمد چیزیں جو آگ میں ڈالنے سے نرم ہو جاتی ہیں، مثلاً لوہا، چاندی، سونا، تانبا وغیرہ، دوسرے وہ چیزیں جو فطرۃً سیال ہوں مثلاً پٹرول، تیل وغیرہ، یا وہ سیال تو نہیں ہیں مگر آگ میں ڈالنے کے بعد ویسے ہی باقی رہتی ہیں مثلاً جواہرات۔ تو پہلی قسم یعنی معدن کو اگر کوئی شخص پا جائے یا معلوم کر لے تو اگر اس نے ایسی زمین میں پایا ہے جو اس کی ملک ہے تو اس معدن کا ۱/۵ حصہ تو اسلامی حکومت لے لے گی، اور بقیہ ۴/۵ اس کا ہوگا، لیکن اگر وہ زمین اس کی ملک نہ ہو تو اس کی ۲ دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کسی کی ملکیت اس پر ہو ہی نہیں تو اس صورت میں بھی ۱/۵ بیت المال لے لیگا اور بقیہ ۴/۵ پانے والے یا دریافت کرنے والے کا ہوگا، لیکن اگر وہ زمین عام لوگوں کی ملکیت ہو، یعنی ان کا مفاد اس سے وابستہ ہو تو پھر وہ پورا معدن اسلامی حکومت کا ہوگا، یہ رائے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، دوسرے ائمہ رکاز کا اطلاق صرف دفینوں پر کرتے ہیں، اور وہ معدنی ذخائر کو رکاز سے الگ سمجھتے ہیں، مگر اس میں ائمہ ثلاثہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا اتفاق ہے کہ جس شخص کی زمین میں یہ معدن پایا جائے گا وہ اس کا مالک ہوگا، اسی طرح اگر وہ کسی مباح زمین میں

دریافت کرے گا تو وہ بھی اس کی ملکیت سمجھی جائے گی، لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مباح زمین میں پائے جانے والے معدن کو ریاست کی ملکیت قرار دیتے ہیں، زکوٰۃ کے بیان میں اس کی مزید تفصیل آچکی ہے۔

اگر کوئی حکومت کسی ماہر کے ذریعہ کوئی معدن دریافت کرائے تو وہ اسلامی حکومت کی ملکیت ہوگا، کنز کا حکم یہ ہے کہ اگر معلوم ہو جائے کہ یہ کسی مسلمان نے دفن کیا تھا تو اس کا حکم لقطہ کا ہوگا، اور اگر نہ معلوم ہو تو پھر ۱/۵ حکومت کا اور بقیہ پانے والے کا۔

موات

موات کے لفظی معنی مری ہوئی یا بیکار چیز کے ہیں، اور شریعت میں اس زمین کو کہتے ہیں جو اب تک مردہ پڑی ہوئی ہو، یعنی آباد نہ کی گئی ہو، یا آباد کی گئی ہو مگر اب اس کا کوئی مالک باقی نہ رہا ہو، وہ یونہی پڑی ہو[۱] ایسی زمین کو جو آباد کریگا وہ اس کی ملکیت ہو جائے گی، اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من أحيا ارضا ميتة فهي له۔ (ترمذی)	جس نے کسی بیکار اور غیر آباد زمین کو آباد کیا وہ اس کا مالک ہو جائے گا۔

ایک دوسرا ارشاد ہے:

من عمّر أرضا ليست لأحد فهو أحق بها (بخاری)	جس زمین کا کوئی مالک نہ ہو، اس کو جس نے آباد کیا ہے وہی اس کا حق دار ہے۔

موات ہونے کی شرطیں

۱. وہ بیکار، بنجر او سرزمین موات قرار دی جائیگی جو آبادی کے اندر نہ ہو اور نہ آبادی کے آس پاس ہو بلکہ آبادی سے ایک دو کلومیٹر[۲] دور ہو، آبادی کے اندر کی بے کار زمینیں آدمیوں اور جانوروں کی ضروریات

---

[۱] الموات مالا ينتفع به من الأراضي لانقطاع الماء اولغلبة الماء. (هداية ج ص (۴۶۱) [۲] فقہاء نے اس کا اندازہ یہ بتایا ہے کہ اگر آبادی کے باہر ایک آدمی کھڑا ہو کر بغیر کسی آلے کے آواز دے تو اس کی آواز جہاں تک پہونچے گی وہاں تک کی زمین کو موات نہیں کہا جا سکتا۔ راقم نے اندازاً ایک دو کلومیٹر لکھ دیا ہے۔

کے لیے مخصوص ہوں گی، مثلاً مکان بنانے کے لیے یا کوئی اور اجتماعی کام کے لیے یا جانوروں کے چراگاہ کے لیے مخصوص ہوں گی ان پر کوئی قبضہ نہیں جا سکتا، البتہ وہ زمین جو آبادی سے قریب تو ہو مگر زراعت کے علاوہ کسی اور کام نہ آسکتی ہو تو اس پر حکومت سے اجازت لے کر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی مالک یا تو رہا ہی نہ ہو، یا اگر رہا ہو تو اب موجود نہ ہو، اگر وہ موجود ہے اور اس میں کھیتی باڑی کر سکتا ہے، لیکن تین برس تک اس نے پرتی چھوڑ دیا ہے تو حکومت اس کو کورٹ آف اوارڈ (حجر) کر کے دوسرے کو دے دے گی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لیس للمحتجر بعد ثلث سنین حق [1]	تین سال تک زمین بے کار چھوڑ دینے والے کا اس زمین پر کوئی حق نہیں ہے

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ حکومت سے اجازت لے کر کسی بیکار زمین کو آباد کرے، اگر حکومت کی اجازت کے بغیر ایسا کرے گا تو وہ مالک نہیں ہوگا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

لا حمی إلا للہ ورسولہ (بخاری بحوالہ مشکوٰۃ ص ۲۵۹)	کسی بے کار زمین کو اپنانے کا حق صرف اللہ اور رسولؐ (حکومت) کو ہے۔

جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ لوگ جہاں کوئی ایسی بے کار زمین دیکھتے تھے جس میں زرخیزی کی صلاحیت ہوتی تھی اسے اپنے اور اپنے جانوروں کے لیے مخصوص کر لیتے تھے، چنانچہ جب آپؐ کو اس کا علم ہوا تو فرمایا کہ ایسی زمین پر کسی کو حکومت کی اجازت کے بغیر قبضہ جمانے کی کوشش نہ کرنا چاہیے۔ مذکورۂ بالا ارشاد نبویؐ کا یہی مفہوم ہے۔ (حاشیۂ مشکوٰۃ بحوالہ مرقاۃ)

اس سلسلہ میں دوسرا ارشاد ہے کہ:

لیس للمرأ إلا ما طابت نفس إمامہ [2]۔ (معجم طبرانی)	کوئی آدمی امام یعنی حکومت کی رضامندی کے بغیر کسی بیکار چیز کا مالک نہیں ہو سکتا۔

---

[1] یہ روایت ضعیف ہے، مگر حضرت عمرؓ کے تعامل سے اس کو تقویت ہوتی ہے۔ [2] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۰۱ ۷، فتح القدیر ابن ہمام، کتاب احیاء الموات۔

ان ہی احادیث نبویؐ کی روشنی میں فقہاء نے بیشمار مسائل مستنبط کیے ہیں۔ حکومت کی اجازت سے کسی بیکار زمین کے آباد کرنے کی جو رائے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، مجلۃ الاحکام العدلیہ میں اسی کو قانونی حیثیت دی گئی ہے، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو زمینیں صحرا اور بیابان میں ہیں، یا آبادی سے بہت دور ہیں، ان کو اگر حکومت کی اجازت کے بغیر بھی قبضہ میں لے لے تو اس کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے گا، کیونکہ اس صورت میں ایک عامی اور دیہاتی آدمی کے لیے حکومت سے اجازت لینے میں بڑی دقتیں ہیں، البتہ آبادی کے اندر اجازت کی ضرورت ہے، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے دونوں ممتاز شاگرد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ (جن کو صاحبین کہا جاتا ہے) فرماتے ہیں کہ غیر آباد زمین کے آباد کرنے میں حکومت کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے، خواہ وہ وہاں سے قریب ہو یا دور ہو۔[1]

---

[1] الإفصاح عن معاني الصحاح ج ۲ ص ۴۹ ابن قدامہ متوفی ۶۲۰ھ المغنی میں لکھتے ہیں: وجملة ذلك أن إحياء الموات لم يفتقر إلى إذن الإمام وبهذا قال الشافعي وأحمد وأبو يوسف ومحمد، وقال أبو حنيفة يفتقر إلى إذنه لأن الإمام مدخل في النظر في ذلك بدليل أن من تحجر مواتا فلم يحيه فإنه بالإحياء أو الترك فافتقر إلى إذنه كمال بيت المال، ولنا قوله عليه السلام من أحيا ارضًا فهي له، ولأن هذا عن مباحة فلا يفتقر تملكها إلى إذن الإمام كأخذ الحشيش والحطب (المغنی ۵ ص ۵۹۰ - ۵۹۱) تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی بیکار زمین کے آباد کرنے میں حکومت کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے، یہ رائے امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی ہے (اوپر امام مالکؒ کی رائے نقل کی جا چکی ہے) لیکن امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ بے کار زمین کے آباد کرنے میں حکومت سے اجازت ضروری ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ حکومت ہی اس کی مصلحت کو سمجھ سکتی ہے، اس لیے اس کے علم میں ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ اگر ایک آدمی ایک زمین پر قبضہ کرے اور تین سال تک اسے آباد نہ کرے تو اس کو حکومت کے سامنے اس کی وجہ بیان کر کے پھر اجازت لینی ہوگی یا پھر اسے چھوڑ دینا ہوگا، دونوں صورتوں میں بیت المال کے مال کی طرح اجازت لینے کی ضرورت ہوگی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

عام تمدنی اور انتظامی اعتبار سے تو امام صاحبؒ کی رائے مرجح ہے، خاص طور پر اس زمانہ میں، لیکن ایسے حالات بھی پیش آسکتے ہیں کہ ملک میں غلہ کی شدید ضرورت ہو اور بہت سی بیکار زمینیں ملک میں ایسی ہوں جن میں غلہ پیدا ہو سکتا ہے تو حکومت یہ کر سکتی ہے کہ ہر ہر ٹکڑے کی اجازت دینے کے بجائے عام اعلان کر دے کہ جو جتنی بیکار زمین چاہے آباد کر کے غلہ پیدا کر لے، غرض یہ کہ ائمہ کا اختلاف تمدنی اور انتظامی حالات کے اختلاف کی بنا پر ہے۔

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ جس زمین کو آباد کرنا چاہتا ہے وہ اس کی جُتائی، گڑائی شروع کر دے، یا پانی دینے کے لیے نالیاں وغیرہ بنا دے یا اسے گھیر دے یعنی اسے آباد کرنے کا کام شروع کر دے۔

یہ چار شرطیں اگر پائی جائیں گی تو اس غیر آباد زمین کو آباد کرنے والا اس کا مالک ہوگا ورنہ نہیں۔

(ہدایہ ج ۴ ص ۴۶۳)

مفادِ عامّہ کی چیزوں کا حکم

جو چیزیں مفادِ عامہ کی ہیں ان کو حکومت کسی خاص فرد کی ملکیت میں نہیں دے سکتی[۱] مثلاً نمک کی کان، کوئلہ کی کان یا دوسرے معدنی ذخائر یا تارکول پٹرول وغیرہ کے چشمے، یا ندی اور تالاب وغیرہ کو

(بقیہ صفحہ گذشتہ) (امام صاحبؒ نے اسے مالِ غنیمت پر قیاس کیا ہے) دوسرے ائمہ کی دلیل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ جو بیکار زمین آباد کرلے وہ اس کی ہے، آپؐ نے اس میں حکومت کی قید نہیں لگائی ہے، جس طرح مباح چیزوں پر قبضہ کرنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی اسی طرح اس کے لیے بھی اجازت کی ضرورت نہیں ہے، جیسے گھاس، جنگل کی لکڑی وغیرہ، راقم الحروف کے خیال میں گھاس اور لکڑی وغیرہ کی اباحت اور زمین کی اباحت میں بڑا فرق ہے، یہ سب چیزیں وقتی ہوتی ہیں اور زمین ایک مستقل چیز ہے، اس لیے امام صاحبؒ کی رائے زیادہ وزنی ہے۔

[۱] لأن ما كان مرافق أهل البلدة فهو حق أهل البلدة، وكذلك أرض الملح والقار والنفط ونحوهما لما لا يستغني عنها المسلمون لا تكون أرض موات (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۱۹۴)

کسی کی ملکیت میں نہ دینا چاہیے، اسی طرح وہ تالاب یا پوکھرا جس کو کسی نے اپنے خرچ سے کھدوا کر رفاہ عام کے لیے وقف کر دیا اور اپنا حق ملکیت نہ قائم کیا ہو، راقم الحروف کے نزدیک اسی حکم میں ہیں، اس وقت معاشرہ میں بہت سے اختلافات اسی بنا پر ہیں، پردھان یا ایس ڈی ایم وغیرہ رفاہ عام کی چیزوں کو کسی کے نام الاٹ کر دیتے ہیں، عام طور پر فقہا اس میں موات کے لیے بستی کے باہر ہونے کی قید لگاتے ہیں، مگر علامہ کاسانی نے لکھا ہے کہ اگر وہ کسی کی خاص ملکیت نہ ہو تو وہ خواہ آبادی کے اندر کیوں نہ ہو اسے حکومت کسی خاص شخص کو الاٹ نہیں کر سکتی، وہ لکھتے ہیں:

فإذا لم يكن ملكا لأحد ولا حقا خاصًا لم يكن منتفعًا به كان بعيدا او قريبا منها (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۱۹۴)

بعض اور ضروری مسائل

(۱) اگر حکومت کسی بیکار یا پڑی ہوئی زمین کے بارے میں کسی کو یہ اجازت دے کہ اس سے صرف فائدہ اٹھاؤ، مگر اس پر تمہارا حق ملکیت نہ ہوگا تو اس کو اس کا حق ہے (مجلہ ص ۲۰۵) لیکن ملکیت میں دے دینے کے بعد پھر حکومت بغیر کسی وجہ کے واپس نہیں لے سکتی۔

(۲) اگر کسی نے دس ایکڑ زمین آباد کرنے کے لیے حکومت سے لی، مگر ۵ ایکڑ اس نے آباد کی اور ۵ ایکڑ بیکار چھوڑ دی ہے تو اگر معذوری سے اس نے ایسا کیا ہے تو خیر ورنہ تین برس کے بعد حکومت دوسرے کو دے سکتی ہے، اگر اس نے تمام زمین آباد کر دی ہے اور بیچ میں تھوڑی سی چھوڑ دی ہے تو اس سے کوئی حرج نہیں ہے، وہ اس کی ملکیت میں رہے گی، حکومت دوسرے کو نہیں دے سکتی۔[۱]

۳۔ اگر کسی نے کوئی زمین آباد کی اور پھر دوسرے لوگوں نے آکر اس کے ارد گرد کی زمین آباد کر لی تو پہلے آدمی کے آنے جانے کے لیے بھی لامحالہ ان کو راستہ چھوڑنا پڑے گا، اور اس کے جانوروں کے آنے جانے کے لیے بھی۔ (المجلہ ص ۲۰۵)

۴۔ اگر کسی نے زمین کو جوتا بویا تو نہیں مگر اس کے گرد چار دیواری یا کھاواں[۲] بنا دیا،

---

[۱] وترك باقيها فما احياه يكون مالكا له وباقيه ليس له (المجلة ص ۲۰۵)

[۲] یوپی کے مشرقی اضلاع میں کھایاں یا کھاواں اس اونچی منڈیر کو کہتے ہیں جو وہ کھیت کے گرد بنا دیتے ہیں۔

یا لوہے کے تار سے گھیر لیا، یا درخت کی شاخیں، بانس وغیرہ گاڑ دیا ہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے آباد کر دیا، خواہ کھیتی کرے یا نہ کرے، لیکن اگر اس نے اس کے گرد صرف کانٹے دار یا بغیر کانٹے کی جھانگ پات رکھ دی، یا چند پتھر ادھر اُدھر گاڑ دیے، یا اس کی گھاس وغیرہ صاف کر دی، یا اس کے پاس کنواں کھود دیا، اور تین برس تک کھیتی نہیں کی تو اس پر آباد ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا، اب حکومت اگر چاہے تو وہ زمین دوسرے کو دے سکتی ہے، یا پھر اگر وہی لینا چاہتا ہے اور حکومت یہ سمجھتی ہے کہ یہ کسی معذوری کی وجہ سے آباد نہ کر سکا تھا تو اس کو بھی دے سکتی ہے، اس بارے میں حدیث نبویؐ اور آثار صحابہؓ دونوں موجود ہیں[1]

۵۔ جو کنواں اس نے غیر آباد زمین میں کھودا ہے وہ اسی کی ملکیت ہوگا، خواہ زمین اسکی ملکیت میں نہ رہے[2]

غیر مسلم کا حکم

جس طرح مسلمان کسی زمین کو آباد کرے گا تو اس کا مالک ہو جائے گا، اسی طرح اگر غیر مسلم بھی کوئی زمین آباد کرے گا تو وہ اسی کی ملکیت ہو جائے گی، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے[3]

آب پاشی کا انتظام

۱۔ آب پاشی کے لیے ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی زمین پر کنواں کھودے یا کوئی اور کام کرے، اسی طرح ندی، تالاب وغیرہ سے بھی ہر شخص کو آب پاشی کا حق ہے، ندی تالاب میں ایک ہی گھاٹ ہو اور پہلے یا بعد میں آبپاشی کرنے میں اختلاف ہو تو جس کا زیادہ نقصان ہوگا وہ پہلے آبپاشی کرے گا، ندی تالاب میں مشین فٹ کر کے بھی آبپاشی کرنے کا حق ہے، بشرطیکہ اس کی وجہ سے دوسروں کا نقصان نہ ہوتا ہو، مثلاً

---

[1] اوپر حدیث نبویؐ نقل کی جا چکی ہے، حضرت عمرؓ کے بارے میں عمرو بن شعیب (ہدایہ ج ۴ ص ۴۶۳) نقل کرتے ہیں کہ إن عمر جعل التحجر ثلث سنين فان تركها فى مضى ثلث سنين فاحياها غيره فهو أحق بها (کتاب الخراج یحییٰ ابن آدم ص ۹۱) وکتاب الخراج امام ابو یوسف

[2] من حفر بئرا فى اراضى الموات باذن السلطان فهو ملكه (المجلہ ۲۰۶)

[3] ويملكه الذمى بالإحياء كما يملكه المسلم (ہدایہ ج ۴ ص ۴۶۳)

بالکل پانی ختم ہوجانے کا اندیشہ ہو، اور غریب اور کم آمدنی والے لوگوں کی آب پاشی کا کوئی دوسرا انتظام نہ ہو، یا جانوروں کے پانی پینے کا کوئی دوسرا انتظام نہ ہو، یا اس سے دوسری اجتماعی ضرورتیں وابستہ ہوں، تو مشین فٹ کر کے پانی نکالنے سے روکا جائے گا[1]

(۲) جہاں آب پاشی کا انتظام نہ ہو، یا ہو تو مگر ضرورت پوری نہ ہوتی ہو تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے، البتہ اگر حکومت کے خزانے میں اس کی گنجایش نہ ہو تو پھر عام پبلک سے یہ کام رضاکارانہ لیا جا سکتا ہے، اگر لوگ رضاکارانہ نہ کریں تو حکومت اس کے لیے ٹیکس لگا سکتی ہے اس لیے کہ اس سے عوام کا فائدہ ہے، نہر کی کھدائی اگر حکومت کے خزانہ سے ہو تو اس میں وہ عام آمدنی کا پیسہ خرچ کر سکتی ہے، عشر و زکوٰۃ کا پیسہ نہیں خرچ کر سکتی، (ہدایہ ج ۴ ص ۱۷۴) لیکن اس صورت میں حکومت ان سے پانی کا کرایہ نہیں لے سکتی۔

(۳) جن تالابوں، نہروں اور کنوؤں سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اگر وہ پٹ جائیں، یا خراب ہوجائیں تو ان کے استعمال کرنے والوں پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مل کر اس کو درست کریں یا کرائیں اگر وہ نہ کریں گے تو حکومت ان سے بجبر اس کی مرمت کرا سکتی ہے، اور اگر حکومت خود اس کی مرمت کراتی ہے تو وہ عام لوگوں کی ملکیت ہوجائیگی، جو لوگ اس سے پہلے فائدہ اٹھاتے تھے ان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ کسی دوسرے کو فائدہ اٹھانے سے منع کر دیں[2]

کنویں کے گرد کی زمین

اگر کوئی کنواں کھودا گیا ہے تو جس کی زمین میں کھودا گیا ہے اس نے کھودنے سے پہلے منع نہیں کیا ہے یا اجازت دے دی ہے تو اس کے گرد اتنی زمین کنویں کی ملکیت سمجھی جائے گی جتنی کہ اس سے

---

[1] لكل أحد ان يسقى أراضيه من الأنهر التى ليست مملوكة وله أن يشق جدولا لسقى الأراضى وإنشاء الطاحون لكن عدم المضرة للعامة شرط، (المجلة ص ۲۰۴) [2] يجبر صاحب الملك على إخراج الماء لذلك الطالب أو اعطاءه الرخصة بالدخول لاجل أخذ الماء لكن بشرط السلامة (المجلة ص ۲۰۴)

کام لینے والوں کو ضرورت ہوگی، مثلاً اگر صرف آدمیوں یا جانوروں کے پانی پینے کے لیے ہے تو کنویں کے گرد تقریباً دس گیارہ گز زمین کنویں کی سمجھی جائے گی، اور اگر اس سے آب پاشی بھی کی جائے تو پھر ضرورت کے مطابق اس میں کچھ اور اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے، اگر کسی زمین میں کنواں ہے تو وہ کنویں سے پانی لینے سے نہیں روک سکتا، البتہ اگر کنویں کے ارد گرد اسی کی زمین ہے تو وہ اپنی زمین سے گذرنے سے روک سکتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص پانی پینے کے لیے پریشان ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اسے پانی پینے کی اجازت دے، اگر نہیں دیتا تو زبردستی اس کے کنویں یا مشک سے وہ پانی لے سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا کوئی نقصان نہ ہو، اسی طرح اگر کسی نے پرتی زمین میں نہر کھودی اور بغل میں کسی دوسرے کی زمین ہے تو اُسے نالی بنانے اور اس کے کناروں پر منڈیر بنانے کی اجازت ہے، اس لیے کہ اس کے بغیر نہر بنانے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا، یہ رائے صاحبین کی ہے، امام صاحبؒ اس کی اجازت نہیں دیتے[1]

راستہ اور گذرنے کا حق

اسلامی شریعت میں راستہ اور گذرنے اور پانی بہانے کے لیے بھی کچھ قاعدے مقرر کر دیے گئے ہیں، تا کہ آپس میں اختلاف نہ ہو:

(۱) راستہ میں جو چیزیں گذرنے والوں کے لیے تکلیف دہ ہوں گی ان کو دور کیا جائے گا، خواہ وہ قدیم زمانہ سے کیوں نہ ہوں، مثلاً کھڑکیاں اور دروازے جو عام راستہ پر کھلتے ہوں یا بارجہ نکلا ہو، اگر ان سے چلنے والوں کو یا سواری کو لے جانے میں تکلیف ہو تو اس سے روکا جائے گا[2]

(۲) اگر کسی شخص کو مٹی، بالو یا اینٹ اپنے مکان کی تعمیر کے لیے رکھنے کی ضرورت ہو تو وہ ایک کنارے پر رکھے اور پھر جلد ہی اٹھا لے، اور اگر ان کے رکھنے سے گذرنے والوں کو تکلیف

---

[1] لأن النهر لا ينتفع به إلّا بالحريم لحاجة المشي لتسييل الماء (ہدایہ ج۴ ص۴۶۶)

[2] ترفع الأشياء المضرة بالمارين ضررا فاحشا ولو قديمة كالغرفة والبروز على الطريق (المجلہ ص ۱۹۷ دفعہ ۱۴-۱۲)

ہو رہی ہو تو رکھنے کی اجازت نہیں ہے[1]

(۳) عام گذرگاہ اور گلی میں ہر شخص کو اپنے مکان کا نیا دروازہ اور کھڑکی کھولنے کی اجازت ہے، لیکن اگر کسی شخص کا وہ خاص راستہ ہو تو پھر اس میں کھڑکی اور دروازہ کھولنا جائز نہیں ہے[2]

(۴) اگر کوئی خاص راستہ چند آدمیوں کے درمیان مشترک ہو تو دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر نیا راستہ بنانے کی اجازت نہیں ہے[3]

(۵) خاص راستے سے جن لوگوں کی آمد و رفت ہوتی ہے ان میں سے کسی دوسرے آدمی کو اپنے چھت کا پانی گرانا یا ناب دان کھولنا دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے[4]

(۶) اگر عام راستے میں کسی وقت بہت زیادہ بھیڑ بھاڑ ہو جائے تو پھر خاص راستہ سے گذرنے کی اجازت ہے، ان لوگوں کو جن کا وہ راستہ ہے راستہ روکنے کا حق نہ ہوگا، اور نہ اس کو فروخت کرنا جائز ہوگا[5]

(۷) اگر راستے کے دونوں طرف کسی کے دو مکان یا دو کمرے ہوں تو اس کو دونوں

---

[1] اذا أراد أحد وضع الطين لأجل تعمير داره فله وضعه فی طرف منه وصرفه سريعًا إلى بنائه بشرط عدم ضرر المارين (ص ۱۹۷) [2] يجوز لكل أحد أن يفتح بابا مجددا إلى الطريق العام ولا يجوز لمن لم يكن له حق المرور فی طريق خاص أن يفتح إليه بابا (المجلة ص ۱۹۸)

[3] الطريق الخاص كالملك المشترك لمن لهم فيه حق المرور فلا يجوز لأحد أصحاب الطريق الخاص أن يحدث فيه شيئا كان مضرا أو غير مضر الا باذن الباقين (ص ۱۹۸ المجلة) [4] ليس لأحد أصحاب الطريق الخاص أن يجعل ميزاب داره التى بناها مجددا إلى ذلك الطريق إلّا باذن سائر أصحابه (ص ۱۹۸) [5] للمارين فی الطريق العام حق الدخول فی الطريق الخاص عند الازدحام (ص ۱۹۸)

کے درمیان راستے کے اوپر چھت ڈال کر راستہ بنانے کا حق نہ ہوگا، اس سے اسے روکا جائیگا[1]

(۸) اگر راستہ چوڑا کرنے کے لیے کسی کا گھر یا زمین کا لینا ضروری ہو تو حکومت لے سکتی ہے، مگر اس کو قبضہ کرنے سے پہلے قیمت دینا ضروری ہے[2]

(۹) اگر کوئی پرانا عام راستہ ہے تو اس پر ہر شخص کو چلنے اور اس میں نابدان کھولنے کی اجازت ہوگی، لیکن اگر کوئی غیر شرعی کام ہو یا چلنے والوں کے لیے تکلیف دہ ہو، مثلاً گانے بجانے والے گذریں یا بہت گندا بدبودار پانی کوئی بہائے تو اس سے روکا جائے گا[3]

(۱۰) اگر کسی کو اپنے مکان کی مرمت یا تعمیر کی ضرورت ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ پڑوسی کے گھر یا صحن میں سے ہو کر نہ جائے تو پڑوسی کو اجازت دینی ہوگی، اگر نہ دے گا تو یا تو خود بنوا دے یا پھر حکومت اس کو اجازت دینے پر مجبور کرے گی[4]

(۱۱) اسی طرح اگر بارش کا پانی بہت زمانہ سے کسی پڑوسی کے صحن سے بہ رہا ہے تو دوسرے کو روکنے کا حق نہیں ہے، البتہ اگر اس کی وجہ سے گندگی ہوتی ہے تو گندگی کا دور کرنا ضروری ہوگا، ورنہ وہ روک سکتا ہے[5] اگر مکان کئی منزلہ ہوں اور راستہ میں بہت سے لوگوں کے نابدان بہتے ہیں تو جس کا گھر سب سے نچلی سطح پر ہے، اس کو کسی کے نابدان کے روکنے کی اجازت نہ ہوگی، اگر روکے گا تو حکومت اس کو اس سے باز رکھے گی۔

(المجلۃ ص ۱۹۹ دفعہ ۱۲۳۰)

(۱۲) اگر کوئی نیا گھر بنائے تو اس کو دوسرے کے گھر سے نابدان لیجانے کی اجازت نہ ہوگی[6]

---

[1] اذا کان علی طرفی الطریق لاحد داران فاراد انشاء جسر من واحدۃ إلی الاخریٰ یمنع (ص ۱۹۷) [2] لذی الحاجۃ یوخذ ملک کائن من کان بالقیمۃ بامر السلطان ویلحق بالطریق ولکن لایؤخذ من یدہ مالم یؤد الثمن (ص ۱۹۷) [3] یعتبر القدم فی حق المرور وحق المجری وحق المسیل، أما القدیم المتخالف للشرع فلا اعتبار لہ، ویزال إذا کان فیہ ضرر فاحش (ص ۱۹۹ المجلۃ) [4] أما اذا لم یکن أمر التعمیر الا بالدخول فی العرصۃ نصاحبہا یأذن لہ بالدخول، فإن لم یأذن یجبر من طرف الحاکم (ص ۱۹۹) [5] لدار مسیل مسطر علی دار الجار من القدیم و إلی الأن، فلیس للجار منعہ (ص ۱۱۹) [6] لیس لأحد ان یجری مسیل دارہ المحدث الی دار اخر (ص ۱۹۸)

حجر

یعنی کورٹ آف اوارڈ (COURT OF AWARD)

اوپر امانت کے بیان میں ذکر آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جسم و جان کی جو صلاحیت اور مال و دولت کی جو نعمت دی ہے، اور عہدہ اور حیثیت سے جو کچھ نوازا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمت بھی ہے اور امانت بھی، نعمت کا تقاضا ہے کہ ہم میں جذبۂ شکر پیدا ہو، اور امانت کا تقاضا ہے کہ ہم امانت رکھنے والے کی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کریں، اگر ہم ایسا کریں گے تو امین کہلائیں گے، اور اگر اس میں اپنی خواہش نفس کے تحت تصرف کریں گے تو یہ امانت میں خیانت ہوگی، قرآن پاک نے اس حقیقت کو بار بار انسانوں کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جانوں اور
أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ	ان کے مالوں کو جنت کے بدلے
الْجَنَّةَ (توبہ)	میں خرید لیا ہے۔

جس طرح بیچی ہوئی چیز ایک آدمی کی ملکیت سے نکل کر دوسرے کی ملکیت میں چلی جاتی ہے، اسی طرح ہماری جان و مال کا معاملہ ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے ہم سے خرید لیا ہے اور خریدنے کے بعد پھر ہمیں واپس دے کر اس کا امین بنا دیا ہے، اب ہم اپنی جان و مال کے مالک نہیں بلکہ امین ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جن نعمتوں سے ہم کو نوازا ہے ان میں ایک بڑی نعمت مال و دولت بھی ہے، جس سے ہم اپنے اور بال بچوں کے جسم و جان کے رشتۂ حیات کو قائم رکھتے ہیں، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت اس کی ایک امانت بھی ہے، اس لیے جب تک ہم خدا کے قائم کردہ حدود کے اندر صحیح تصرف کرتے رہیں گے، اسلامی شریعت ہمارے تصرف میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی

لیکن جہاں اس کے قائم کردہ حدود سے ہم تجاوز کریں گے یا اس کے غلط طور پر استعمال کا خدشہ ہوگا تو وہاں شریعت کچھ پابندیاں عائد کر دیتی ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور امانت ضائع نہ ہونے پائے، ان ہی پابندیوں کا نام اسلامی شریعت میں حجر ہے۔

حجر کے لغوی معنیٰ

علامہ ابن قدامہ الحجر کے لغوی معنیٰ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الحجر فی اللغة المنع والتضيق ومنه يسمى العقل حِجرًا، قال الله تعالیٰ "وَهَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ" ای عقل، سمی حِجرًا لأنه يمنع صاحبه من ارتكابه ما يقبح وتضر عاقبته وهو فی الشريعة منع الإنسان من التصرف فی المال[1]

حجر کے لغوی معنی ہیں منع کرنا، روکنا اور تنگی پیدا کرنا، اسی لیے عقل کو حجر کہتے ہیں، قرآن پاک میں ہے: اس میں عقل والوں کے لیے کوئی قسم ہے؟ عقل کو حجر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ آدمی کو خراب کاموں سے روکتی ہے، اور نقصان دہ کاموں کے انجام سے بچاتی ہے، اور شریعت میں انسان کو مالی تصرف سے روکنے کا نام حجر ہے

...

یہ لفظ حَجر فتحہ (زبر) کے ساتھ اور کسرہ (زیر) کے ساتھ دونوں طرح سے آتا ہے، قرآن پاک میں زیادہ تر یہ زیر (کسرہ) کے ساتھ استعمال ہوا ہے، اور اس کے مفہوم میں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے، رکاوٹ ڈالنے اور منع کرنے اور کاٹ دینے کے معنی آتے ہیں، دوسری جگہ قرآن پاک میں ہے:

وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا۔ (الفرقان)

ان کے درمیان ایک پردہ اور رکاوٹ ڈال دی ہے۔

سورۂ انعام میں ہے:

---

[1] المغنی لابن قدامۃ ج ۴ ص ۵۰۵۔

قَالُوْا هٰذِهٖٓ أَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ إِلَّا مَنْ نَّشَآءُ۔ (الانعام)

یہ کچھ خاص جانور اور کچھ خاص کھیتیاں ہیں، جن کا استعمال ہر شخص کے لیے صحیح نہیں ہے، مگر جس کو ہم چاہیں وہ کھا سکتا ہے۔

اسی لیے حطیم کو بھی حجر کہتے ہیں کہ وہ کعبہ کی عمارت سے علٰحدہ جگہ کا نام ہے۔

حجر کا شرعی مفہوم

حجر کے شرعی مفہوم میں اس کے اسباب کے لحاظ سے ائمہ کے درمیان تھوڑا اختلاف ہے، مگر اس کے شرعی حکم ہونے میں سب کا اتفاق ہے، جیساکہ مغنی المحتاج میں ہے:

الحجر هو لغة المنع و شرعًا المنع من التصرفات المالية (ج۲ ص ۱۶۵)

حجر کے لغوی معنی روکنے کے ہیں، اور شریعت میں مالی تصرف سے روکنے کو حجر کہتے ہیں۔

فقہ حنفی میں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے:

هو منع نفاذ قولی [۱] ...

زبانی اقرار وانکار سے روکنے کا نام حجر ہے۔

تصرف قولی سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ بیع وشراء، ہبہ اور اجارہ وغیرہ معاملات میں مجور آدمی کا اقرار یا لین دین کا معاملہ کرنا صحیح نہیں سمجھا جائے گا اور اس کا نفاذ نہیں ہوگا اسی طرح اس کی تحریر کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہوگا، لیکن اگر مجور آدمی کسی کا کوئی نقصان کر دے تو اس کا تاوان اس کے مال سے دلایا جائے گا، اس لیے کہ اعضاء وجوارح پر کوئی پابندی عائد نہیں ہو سکتی، مثلاً کوئی مجور بچہ کسی دوسرے آدمی کا نقصان کر دے تو اس کے ولی کو اس کا تاوان دینا پڑے گا، یا کوئی مجور بے وقوف یا پاگل کوئی نقصان کر دے تو اس کا تاوان دلایا جائے گا، لیکن اگر یہ لوگ کوئی معاملہ کریں گے تو وہ کالعدم سمجھا جائے گا، اسی لیے فقہ حنفی میں قولی تصرف کی قید لگائی گئی ہے۔

---

[۱] شرح وقایہ ج ۳، ص ۳۴۳۔

حجر کے اسباب

حجر کے کچھ اسباب قانونی ہیں اور کچھ اخلاقی ہیں، حجر کے اخلاقی اسباب دو ہیں، ایک یہ کہ انسان کو جو کچھ مال و دولت حاصل ہے وہ اس کا مالک نہیں بلکہ امین ہے، اس لیے امانت کا تقاضا ہے کہ اس میں غلط تصرف نہ کرے، دوسرے اس میں یہ جذبہ کار فرما ہے کہ انسان کو جو کچھ مال و دولت حاصل ہے اس میں صرف تنہا اس کا حق نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت سے بندگان خدا کے حقوق ہیں، اگر کوئی شخص اپنی دولت کو غلط طریقہ سے خرچ کرتا ہے تو وہ صرف اپنا ہی نقصان نہیں کرتا ہے بلکہ بہت سے بندگان خدا کا حق مارتا ہے، اس لیے اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسا نہ ہونے دے، قرآن پاک میں ایک فقرہ میں اس حیثیت کو واضح کر دیا گیا ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَّارْزُقُوهُمْ ـ

(نساء)

اور تم نہ دو نادانوں کو وہ مال جسے اللہ تعالیٰ نے تمہاری زندگی کی بقا کا ذریعہ بنایا ہے، اور کھلاتے پلاتے رہو۔

اس میں بتایا گیا کہ جو مال و دولت انسان کو حاصل ہے، بظاہر وہ اس کا مالک ہے، مگر ہر مال و جائداد اور کاروبار میں خدا کا اور بہت سے بندگانِ خدا کے حقوق بھی ہوتے ہیں اس حیثیت سے وہ پوری ملت کا مشترکہ سرمایہ بھی ہے، اس لیے وہ اپنی ملکیت کے خرچ کرنے میں پورے طور پر آزاد نہیں، اسی لیے قیامت میں مال کے بارے میں دو سوال ہوگا

من أين اكتسبته وفيما أنفقته؟

کیسے اور کہاں سے کمایا اور کہاں اور کیسے خرچ کیا۔

حجر کے اس اخلاقی پہلو کی وضاحت کرنے کے بعد اس کے قانونی پہلو کی تفصیل کی جاتی ہے، یعنی قانوناً کن لوگوں پر یہ پابندی عائد کی جائے گی:

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ صرف نابالغ بچے اور پاگل اور غلام پر حجر کے قائل ہیں، وہ کسی بالغ پر حجر کے قائل نہیں، مگر صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد اور ائمہ ثلثہ، سفیہ (بیوقوف)

اور مُبذِّر (فضول خرچ) پر بھی حجر کے قائل ہیں، ہدایہ میں ہے اور المجلۃ کے مرتبین نے اسی کو ترجیح دیا ہے:

قال أبو حنيفة رحمة الله عليه لا يحجر على الحر العاقل البالغ السفيه وتصرفه فى ماله جائز وإن كان مبذرا مفسدا يتلف ماله فيما لا غرض له فيه ولا مصلحة وقال أبو يوسف ومحمد رحمهما الله وهو قول الشافعي يحجر على السفيه ويُمنع من التصرف فى ماله لانه مبذر ماله لصرفه لا على الوجه الذى يقتضيه العقل فيحجر عليه نظرًا اعتبارًا بالصبي بل أولىٰ لان الثابت فى حق الصّبىّ احتمال التبذير، وفى حقه حقيقة۔

(هدايه ج ٣ ص ٣٣٨)

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ کسی عاقل بالغ، بیوقوف پر حجر نہیں کیا جا سکتا، اور اس کا مالی تصرف جائز ہے اگرچہ وہ فضول خرچ ہی کیوں نہ ہو اور اپنا مال ایسی جگہ برباد کر رہا ہو جس سے نہ کوئی فائدہ ہو اور نہ کوئی مصلحت ہو مگر صاحبینؒ اور امام شافعیؒ بیوقوف پر حجر کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اسے اپنے مال میں تصرف سے روکا جائے گا، اس لیے کہ وہ فضول خرچ ہے اور وہ اپنا مال ایسے طریقہ سے ایسی جگہ صرف کر رہا ہے کہ جہاں صرف کرنا عقلاً صحیح نہیں ہے، تو جس طرح بے عقلی کی وجہ سے بچہ کو مالی تصرف سے روکا جاتا ہے اسی طرح اسے بھی روکا جائے گا، بلکہ اس کو روکنا اور زیادہ ضروری ہے، اس لیے کہ اس سے فضول خرچی کا احتمال ہے اور اس کے سلسلہ میں تو یہ ایک حقیقت ہے۔

...

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی عاقل بالغ پر یہ پابندی عائد کر دی جائے تو قرآن میں مال دینے کے لیے رشد (یعنی عقل و ہوش) کی جو قید لگی ہے وہ بے کار ہو جائے گی

اور پھر ہم اس کے اس حق ولایت واختیار کو سلب کر کے حیوانوں کی صف میں کھڑا کر دیں گے، اس لیے ایسا کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ :

حتی لوکان فی الحجر دفع ضرر عام کالحجر علی المتطبب الجاهل والمفتی الماجن والمکاری المفلس جاز۔	لیکن اگر حجر کرنے سے عام لوگوں کو نقصان سے بچانا مقصود ہو تو پھر حجر کیا جائے گا، یعنی پابندی عائد کی جائے گی، مثلاً کوئی اناڑی ڈاکٹر دوا علاج کرنے لگے تو اسے اس سے روکا جائے گا، اسی طرح کوئی غیر ذمہ دار مفتی غلط صحیح فتویٰ دینے لگے تو اسے روکا جائے گا، اسی طرح کوئی مفلس آدمی لوگوں سے کرایہ پر سامان لے کر ضائع کرنے لگے تو اسے روکا جائے گا۔
(هدایه) ج ۳ ص ۳۳۸	

نتیجہ کے اعتبار سے صاحبین، ائمۂ ثلٰثہ اور امام صاحب کی رائے میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، یعنی امام صاحبؒ اصولاً کسی بالغ پر مالی تصرف کے سلسلہ میں پابندی کے قائل نہیں ہیں، لیکن اگر ضرر عام کا خطرہ ہو تو پابندی عائد کی جا سکتی ہے، علامہ ابن رشد نے لکھا ہے کہ امام مالک کے یہاں اسباب حجر چھ ہیں، جن میں (۱) صغر (بچپن)۔ (۲) سفیہ (بیوقوف) (۳) عبد (غلام) (۴) مفلس۔ (۵) مریض (۶) زوجہ۔ یعنی ان سب کے مالی تصرف میں رکاوٹ ڈالی جائے گی۔

غرض یہ کہ نابالغ بچہ، پاگل اور غلام کے حجر پر سب کا اتفاق ہے، بقیہ لوگوں کے بارے میں قدرے اختلاف ہے۔

شیخ ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ حجر کی دو قسمیں ہیں : (۱) ایک یہ کہ جس شخص کو مالی تصرف میں پابند کیا جا رہا ہے وہ اسی کی خیر خواہی اور مفاد میں ہو، جیسے بچہ، پاگل، بیوقوف، مُسرف یعنی فضول خرچ وغیرہ۔ دوسرے اس پر پابندی دوسروں کی حق تلفی سے بچانے کے لیے

بچانے کے لیے لگائی جائے، جیسے مقروض غلام اور مفلس مُکاری وغیرہ پر۔

اوپر زیادہ تر ان لوگوں کا بیان ہوا ہے جن پر حجر ان کے مفاد میں کیا جانا چاہیے، مگر جن لوگوں پر دوسروں کو نقصان سے بچانے کے لیے حجر کیا جانا چاہیے ان میں (۱) ایک مقروض پر پابندی قرض خواہوں کی وجہ سے (۲) مکاتب غلام پر مالک کی وجہ سے (۳) راہن پر مرتہن کی وجہ سے (المغنی ج ۴، ص ۵۰۵)

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کسی شخص کو عارضی طور پر اس کی ملکیت[1] میں تصرف کرنے سے روک دینے کو حجر کہتے ہیں، اور قرآن اور حدیث دونوں سے اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

چند اصطلاحیں

صَبِیّ یعنی نابالغ بچہ (۲) مجنون یعنی جو بالکل پاگل ہو (۳) معتوہ جس میں عقل کی کمی اتنی ہو کہ اپنے نفع و نقصان کو نہ سمجھ سکتا ہو (۴) سفیہ یعنی وہ شخص جو اپنی دولت نہایت بے دردی سے صرف کرتا ہو، یا عیاش اور بدچلن ہو، سفیہ میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو اپنی غفلت و حماقت کی وجہ سے اپنے معاملات میں ہمیشہ نقصان ہی اٹھاتے ہوں (۵) مُسرف و مُبذّر فضول خرچ جو بے ضرورت اپنی دولت برباد کر رہا ہو[2] (۶) رَشید جس کے اندر اپنے مال کی حفاظت اور نفع و نقصان کی تمیز پیدا ہو جائے۔

کن اسباب کی بنا پر تصرف سے روکا جا سکتا ہے؟

تین اسباب کی بنا پر حجر کیا جا سکتا ہے، ایک تو کسی کے اندر تصرف کی صلاحیت ہی نہ ہو، دوسرے صلاحیت تو ہو مگر اس کا استعمال غلط ہو رہا ہو، اور اس سے کوئی تمدنی یا معاشرتی بگاڑ پیدا ہو رہا ہو، مثلاً کوئی نابالغ بچہ ہو، یا

---

[1] ملکیت سے محروم کرنے اور عارضی طور پر تصرف سے روک دینے میں جو فرق ہے اس کو ذہن میں تازہ رکھنا چاہیے تاکہ کمیونزم کی جبری طور پر ملکیت سے محروم کرنے کی پالیسی اور اسلامی طرزِ فکر کا فرق معلوم ہو جائے [2] الصغیر والمجنون والمعتوہ محجورون لذاتہم بدون حاجۃ إلی حجر الحاکم (شرح المجلۃ ص ۵۲۸)

کوئی پاگل ہوگیا ہو، یا اس میں عقل کی اتنی کمی ہو کہ وہ اپنے معاملات کو سمجھ نہ پاتا ہو، تو ایسے تمام لوگوں کو ان کی جائداد اور مال میں تصرف کرنے سے روکا جائے گا، اسی طرح کوئی عاقل بالغ بھی ہے اور معاملات کو سمجھتا بھی ہے لیکن وہ اپنی دولت کو بیجا صرف کرتا ہے، اسراف کرتا ہے، یا اپنی غفلت وحماقت کی وجہ سے ہمیشہ معاملات میں نقصان اٹھاتا ہے، ایسے آدمی کو بھی تصرف سے روک دیا جائے گا، تیسرے وہ شخص جس کے مالی تصرف سے دوسرے لوگوں کا نقصان ہورہا ہو، جیسے کوئی مقروض آدمی ہو تو اسے مزید قرض لینے روکا جائیگا اس سے قرض خواہوں کا نقصان ہوگا۔

حجر کا حق کس کو ہے؟

(۱) نابالغ بچہ (صبیّ)۔ پاگل اور بے عقل کو اس کے مال وجائداد میں تصرف سے روکنے کا حق سب سے پہلے ان کے ولی کو ہے، اگر ولی نہ ہوں تو ولی جس کو مربی اور وصی بنا دے وہ ان کے مال وجائداد کی نگرانی کرے اور ان کی ضرورت پوری کرے، اور جب نابالغ بالغ ہوجائے اور وہ یہ محسوس کرے کہ اس میں ذمہ داری پیدا ہوگئی ہے تو وہ اس کا مال یا جائداد اس کے حوالہ کردے، اگر کوئی ولی اور مربی ووصی نہ ہو تو پھر حکومت اپنی نگرانی میں ان کی جائداد اور مال ودولت کو لے لے گی، اور جس طرح ولی نگرانی کرتا ہے اور ان کی ضرورت پوری کرتا ہے وہ پوری کرے گی۔ اور عقل وہوش کے بعد واپس کردے گی۔

مجنون کی ۲ دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ مستقل پاگل ہوگیا ہے، دوسرے یہ کہ کبھی اس پر جنون کی کیفیت ہوتی ہے اور کبھی ٹھیک ہوجاتا ہے، جب افاقہ ہوجائے اس وقت اس کا تصرف صحیح سمجھا جائے گا[1] بشرطیکہ افاقہ کے وقت جنون کا کوئی اثر اس پر نہ رہے، ورنہ پھر اس کا حکم سمجھدار بچے کا ہوگا۔ (شرح المجلہ میں اسے علامہ شامی کی تحقیق بتایا گیا ہے)۔

(۲) **سفیہ**: یعنی جو اپنی دولت کو بیجا صرف کرتا ہے، اس کو اپنی دولت و جائداد میں تصرف کرنے سے روکنے کا قانونی حق ولی یا وصی کو نہیں ہے، خواہ والدین ہوں یا

---

[1] تصرفات المجنون غیر المطبق فی حال افاقتہ کتصرف العاقل (شرح المجلہ ص ۵۴۰)

کوئی اور، اس کو تصرف سے روکنے کا حق صرف حکومت کو ہے۔

(۳) فاسق و فاجر آدمی پر صرف اس کے فسق و فجور کی بنا پر حجر کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف اس کے فسق و فجور کی بنا پر حجر نہیں کیا جا سکتا، البتہ اگر اسراف اور فضول خرچی کر رہا ہے تو اس پر اسراف و تبذیر کی بنا پر حجر کیا جائے گا، یا اس سے دوسروں کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو، مگر صاحبین یعنی امام ابویوسفؒ و محمدؒ اور امام شافعی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں کہ جب تک اس کے اندر دینی صلاحیت اور مال خرچ کرنے کی صلاحیت نہ پیدا ہو جائے اس وقت تک حجر کیا جائے گا، امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس کے اندر دینداری نہیں ہے مگر مال کے خرچ کرنے میں وہ اسراف نہیں کر رہا ہے تو اس پر حجر نہیں کیا جائے گا، غرض یہ کہ اگر وہ مسرف و مبذر ہے تو قریب قریب تمام ائمہ کے یہاں وہ حجر کا مستحق ہے، البتہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں تنبیہاً فاسق و فاجر پر بھی حجر کیا جائے گا[1] خواہ وہ مبذر ہو یا نہ ہو، مگر یہ حق صرف حکومت کو ہے، عام آدمی اس کی شکایت حکومت تک پہونچا سکتا ہے، مگر وہ قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔

(۴) ان لوگوں کے علاوہ حجر کی ایک قسم کا ذکر حدیث نبویؐ میں آیا ہے، یعنی مقروض کے مال و جائداد کا حجر، اگر کوئی مقروض قرض ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، مگر وہ قرض دینے والوں کو پریشان کرتا ہے تو دائن یعنی قرض دینے والوں کی درخواست پر حکومت اس کی جائداد، اس کے ڈاکخانہ یا بینک کے روپیے یا اثاث البیت پر قبضہ کر کے اس کو مجبور کرے گی کہ وہ قرض ادا کر دے، اگر وہ قرض ادا نہ کرے گا تو خود حکومت اس کو فروخت کر کے دائن کا قرض ادا کرے گی۔

---

[1] الفقہ علی المذاهب الأربعة ج ۲ ص ۳۵۰-۳۵۲) عام طور پر فاسق پر حجر کرنے کے سلسلہ میں صاحبین کی رائے کا ذکر کتابوں میں نہیں ہوتا، مگر شرح المجلۃ کے مصنف علامہ رستم باز نے شرح التنویر کے واسطے سے لایحجر علی الفاسق پر جو حاشیہ لکھا ہے اس میں ہے وهذا علی قول الإمام وأما علی قول صاحبیه فیحجر علیه وبقولهما یفتی کما فی التنویر (ص ۴۰۵)

نابالغ بچے، سفیہ اور مسرف وغیرہ کے بارے میں قرآن میں بڑی تفصیل سے احکام دیے گئے ہیں، ان کے ولیوں اور نگرانوں کو ہدایت دیتے ہوئے کہا گیا ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا.

اور وہ مال جسے اللہ تعالیٰ نے تمھاری زندگی کا سہارا بنایا ہے کم عقلوں کو نہ دو، (کہ وہ اسے ضائع کردیں) ان کو کھانا، کپڑا دیتے رہو، اور ان کو سمجھاتے بجھاتے رہو

(نساء ع ۱)

وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا

(نساء ۔ ۱)

...

اسی طرح نابالغ یتیموں کو بھی آزماتے رہو یہاں تک کہ جب وہ بالغ ہوجائیں اور تم ان میں (سنبھالنے کی) اہلیت اور ذمہ داری محسوس کرو تو ان کے مال انکے حوالہ کردو، اور (جب تک وہ مال تمھارے قبضے میں رہے) تم ان کے مال ضرورت سے زیادہ اور جلدی جلدی اس خوف سے نہ کھا ڈالو کہ وہ بڑے ہوجائیں (اور تم سے اپنا حق مانگنے لگیں)۔

ان آیات میں حسب ذیل باتوں کی ہدایت کی گئی ہے:

(۱) پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ آدمی کو اپنی ملکیت میں تصرف کا اسی وقت تک حق ہے، جب تک وہ اپنی ملکیت کو صحیح طور پر استعمال کر رہا ہے، لیکن جہاں وہ اس حد سے تجاوز کرے گا اس کے سارے حقوق سلب کرلیے جائیں گے کیونکہ گو وہ مال ایک آدمی کا ہے مگر اس کو اللہ نے بہت سے لوگوں کے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے، وہ فضول خرچی کر کے اپنا ہی مال نہیں بلکہ بہت سے لوگوں کا مال برباد کر رہا ہے، البتہ اس کی بنیادی ضرورتیں ہر حال میں پوری کی جائیں گی

(۲) دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ یتیم نابالغ بچے جن میں اپنے نفع ونقصان کے

سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، ان کے مال کی نگرانی ان کے مربی اور ولی کرتے رہیں اور جب ان میں دو۲ باتیں پیدا ہوجائیں تو ان کا مال ان کے حوالے کر دیں، ایک تو یہ کہ وہ بالغ ہوجائیں اور ساتھ ہی ان میں رُشد پیدا ہوجائے، رشد کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اندر اس کے تصرف کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو، ایسا نہ ہو کہ وہ دولت کو برباد کر کے رکھ دیں[1]۔

(۳) دوسری آیت کے آخری ٹکڑے میں ولیوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ ان کے اموال کی نگرانی ایک امین کی حیثیت سے کریں، اگر ان کی نگرانی میں ان کو کچھ زحمت اور پریشانی اٹھانی پڑ رہی ہے تو وہ اپنی محنت مزدوری لے سکتے ہیں، لیکن ان کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ ان کے بالغ ہونے تک سارا مال اڑا پڑا کر برابر کر دیں، اور اگر کوئی خوش حال ہے، خدا نے اس کو کھانے پینے کے لیے دیا ہے تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ اس کے مال سے کچھ بھی نہ لے۔

حجر کی بعض اور صورتیں

(۱) اگر کوئی معلم صحیح تعلیم دینے کے بجائے بچوں کو غلط تعلیم دیتا ہے، یا کوئی شخص لوگوں کے اخلاق سدھارنے کے بجائے بگاڑتا ہے، یا کوئی ادارہ گندی و فحش کتابیں شائع کرتا ہے، یا کوئی مفتی غلط فتوے دیتا ہے، یا کوئی جاہل ڈاکٹر یا حکیم اپنا مطب کھول کر لوگوں کی صحت کو برباد کرتا ہے، یا کوئی پیشہ ور لوگوں کو دھوکا دیتا ہے تو ایسے تمام لوگوں کو ان کے پیشہ سے روک دیا جائے گا، لیکن یہ حق صرف اسلامی حکومت ہی کو ہے، پبلک حکومت تک اپنی شکایت پہونچا سکتی ہے، مگر قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتی، ایسے لوگوں کو بھی صرف پیشہ کرنے سے روکا جائے گا، دوسرے تمام معاملات میں ان کو ہر طرح کی آزادی ہوگی[2]۔

---

[1] وحد الرشد هو أن يثبت صالحا لإدارة ماله فلا يضيعه إذا اسلم اليه (الفقه على المذاهب الأربعة ج ۳ ص ۳۵۰) [2] بل مُفتٍ ماجن وطبيب جاهل ومُكارٍ مفلس (شرح وقاية ج ۳ ص ۳۴۵) لكن المراد من الحجر منع (بقیہ اگلے صفحہ)

مجحور کی موجودگی

جس کو کسی تصرف سے روکا جائے، حجر کے وقت اس کی موجودگی ضروری نہیں ہے، بلکہ حکومت اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کی جائداد یا مال کو حجر کر سکتی ہے، البتہ اس کو اطلاع دے دی جائے گی[1]

بعض اور ضروری مسائل

(۱) ولی کو کسی ناسمجھ نابالغ بچہ کو مالی تصرف کی اجازت نہ دینی چاہیے، ورنہ اگر اس نے کوئی نقصان اٹھایا یا نقصان پہونچایا تو اس کی ذمہ داری ولی پر ہوگی، کیونکہ اس نے اجازت دے کر مال ضائع کرنے کا راستہ کھول دیا، خواہ وہ ضائع ہو یا نہ ہو، اور اس کی اجازت قانوناً معتبر بھی نہیں سمجھی جائے گی[2]

(۲) اگر کوئی نابالغ سمجھدار بچہ ہے تو اس کے معاملہ کی کئی صورتیں ہیں، اگر اس نے کوئی ایسا معاملہ کیا جس میں نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں تھا، بلکہ فائدہ ہی متوقع تھا تو ولی کی اجازت کے بغیر بھی اس کا معاملہ کرنا صحیح ہے، مثلاً کسی نے اس کو ہدیہ دیا، یا کسی نے کوئی چیز اس کو ہبہ کی اور اس نے قبول کرلیا، تو یہ ہدیہ اور ہبہ کی ہوئی چیز اس کی ملک میں آجائے گی، لیکن اگر اس نے ایسا معاملہ کیا جس میں فائدہ کی توقع نہیں تھی، بلکہ نقصان ہی کا اندیشہ تھا تو ایسے معاملہ کی اجازت اگر ولی دے بھی دے تو جائز نہیں ہے، اس کا معاملہ باطل قرار پائیگا،

(بقیہ صفحہ گذشتہ) إجراء العمل لا منع التصرفات القولية (شرح المجلة ص ۵۴۱) یہاں صرف تین طرح کے اشخاص مراد نہیں ہیں، بلکہ يحجر على بعض الأشخاص الذين يضرون بالعامة (شرح المجلة ص ۵۴۱) مولانا عبدالحیؒ شرح وقایہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: ليس المراد من الثلث عددًا، فمن في معناهم فعلى السلطان الحجر عليه، نحو المفتي والواعظ الكاذب و الشيخ الزنديق (حاشیہ ص ۳۴۴) [1] لا يشترط حضور من أريد حجره من طرف الحاكم (المجلة ص ۱۵۴) [2] يضمن وصي الصغير إذا دفع إليه ماله قبل ثبوت رشده فضاع المال في يد الصغير أو أتلفه (شرح المجلة ص ۵۴۹)

مثلاً اس نے کوئی چیز بیچی یا خریدی تو اس میں چونکہ اصلاً نفع و نقصان دونوں متوقع ہیں اس لیے بیع و شرا کو اگر ولی صحیح قرار دے تو یہ صحیح ہو جائے گی، خواہ نقصان ہی کیوں نہ ہو، اور اگر یہ صحیح نہ قرار دے تو باطل قرار پائے گی، خواہ اس میں فائدہ ہی کیوں نہ ہو[1]

(۲) یہی حکم معتوہ کا بھی ہے، یعنی جن حدود کے اندر سمجھدار نابالغ لڑکے کو تصرف کی اجازت ہے، ان ہی حدود کے اندر کم عقل کو بھی اجازت ہے۔

(۳) بالغ ہو جانے کے بعد جب ولی اس کی جائداد یا مال اس کے حوالہ کرنا چاہے تو تجربۃً پہلے تھوڑا سا مال یا جائداد دے کر اس کا تجربہ کرے کہ وہ اس کو سنبھالنے کے قابل ہو گیا ہے یا نہیں، جب اس کی اہلیت (رُشد) کا ثبوت مل جائے تو پوری جائداد یا مال جو کچھ ہو وہ اس کے حوالہ کر دے۔

(۴) ہوشیار و سمجھدار نابالغ کو اجازت دینے کے بعد اگر ولی یہ محسوس کرے کہ وہ تصرف صحیح نہیں کر رہا ہے تو پھر وہ حجر کر سکتا ہے، لیکن بالغ ہونے کے بعد پھر ولی کو حق نہیں رہتا، اب صرف حکومت ہی حجر کر سکتی ہے۔

(۵) اجازت کبھی صراحۃً الفاظ سے دی جاتی ہے اور کبھی طرز عمل سے مثلاً کسی ہوشیار نابالغ کو خرید و فروخت کرتے ہوئے دیکھ کر ولی نے کوئی روک ٹوک نہیں کی، تو یہ اجازت سمجھی جائے گی، اور وہ جو کچھ تصرف کرے گا وہ صحیح ہوگا[2]

بالغ ہونے کی عمر

لڑکے کے بالغ ہونے کی عمر بارہ[12] برس سے شروع ہو جاتی ہے، اور لڑکیوں کی ۹ برس سے، اگر لڑکے ۱۲، اور ۱۴ برس

---

[1] یعتبر تصرف الصغیر الممیز اذا کان فی حقه نفع محض وإن لم یأذن به الولی، ولا یعتبر تصرفه الذی هو فی حقه ضرر محض وإن أذن بذلك ولیه، واما العقود الدائرة بین النفع والضرر فی الاصل فتنعقد موقوفة علی إجازة ولیه ۔ (المجلة ص ۱۵۵) [2] کما یکون الإذن صراحة یکون دلالة أیضًا. (المجلة ص ۱۵٦)۔

کے درمیان اور لڑکیاں ۹ تا ۱۴ برس کے درمیان بالغ نہ ہوجائیں تو ۱۵ برس کی عمر میں ان پر بالغ ہونے کا حکم جاری کر دیا جائے گا، خواہ بالغ ہونے کی علامتیں ظاہر ہوں یا نہ ہوں، بالغ ہونے کی علامت لڑکوں کے لیے احتلام ہونا یا مباشرت میں منی نکلنا ہے اور عورتوں کیلئے حیض آنا یا حاملہ ہوجانا ہے، اگر بغل یا چہرہ پر بال نکل آئیں تو اس سے بالغ ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا، بارہ برس کی عمر ہو جائے اور بالغ نہ ہو تو اسے مُراہق کہیں گے۔[۱]

رشید کب سمجھا جائے

اوپر قرآن پاک کی آیت نقل کی جا چکی ہے، جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ نادانوں (سفہاء) اور یتیم بچوں کو ان کا مال ان کے حوالہ نہ کیا جائے، جب وہ بالغ ہو جائیں تو اندازہ کرو کہ ان میں رُشد پیدا ہوا ہے یا نہیں؟ اگر تجربہ سے اندازہ ہو جائے کہ ان میں رُشد یعنی مال کے استعمال کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو، یہ ہدایت بچوں کے ولیوں کے لیے بھی ہے اور حکومت کے لیے بھی۔

رُشد اور رشید کے بارے میں صحابہ مفسرین اور فقہاء کی کچھ رائیں نقل کی جا رہی ہیں جن سے اس کی پوری وضاحت ہو جائے گی، علامہ قرطبی نے رُشد کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ کی رائے نقل کی ہے:

---

[۱] يثبت حد البلوغ بالإحتلام و الإحبال والحيض والحبل لا اعتبار لنبات العانة واللحية وشعر الساق والشارب، مبدأ سن البلوغ فی الرجل اثنتا عشرة سنة تامة و فی المرأة تسع سنين تامة، و منتهاه فی كليهما خمس عشرة سنة، وإذا اكمل اثنتى عشرة سنة ولم يبلغ يقال له المراهق۔

شرح المجلة

ص ۵۰ - ۵۴۹

صلاح فی العقل وحفظ المال (احکام القرآن ج ۲ ص ٦٣)

(رُشد یہ ہے کہ) عقل وشعور اور مال کی حفاظت کی صلاحیت پیدا ہو جائے

سنن کبریٰ بیہقی میں ان کی رائے ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے:

الرشد ھو صلاح فی الدین والمال (ج ۲ ص ۵۹)

رشد یہ ہے کہ اس کے اندر دین اور مال کی حفاظت کی صلاحیت پیدا ہو جائے

زمخشری اور حافظ ابن کثیر نے سعید بن جبیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

صلاحًا فی دینھم وحفظًا لأموالھم، وکذا روی عن ابن عباس والحسن البصری وغیر واحد من الائمۃ، و ھکذا قال الفقھاء.

دین اور مال کی حفاظت کی صلاحیت پیدا ہو جائے، یہی رائے ابن عباسؓ حسن بصری اور بہت سے ائمہ کی نقل کی گئی ہے، اور یہی رائے فقہاء کی بھی ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۵۳ والکشاف ج ۱ ص ۵۰۱)

عبد الرحمٰن جزیری نے تمام فقہاء کے اقوال کی روشنی میں یہ تعریف کی ہے:

وحد الرشد ھو أن یثبت صالحا لإدارۃ مالہ فلا یضیعہ إذا اسلم إلیہ.

رشد کی تعریف یہ ہے کہ مال کے استعمال کی صلاحیت پیدا ہو جائے، اور جب اس کے حوالے کیا جائے تو وہ اسے ضائع نہ کرے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۲ ص ۳۵۰)

المجلۃ کے مرتبین نے بھی قریب قریب یہی الفاظ استعمال کیے ہیں۔

اگر بالغ ہونے کے بعد بھی اس کے اندر رُشد نہ پیدا ہو تو امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ پچیس ۲۵ برس کی عمر تک انتظار کیا جائے، اس کے بعد اس کا مال اس کے حوالے کر دیا جائے اور امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور ائمہ ثلاثہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ ابن حنبل فرماتے ہیں کہ جب تک اس میں رشد نہیں پیدا ہوگا اس کا مال اس کے حوالے کبھی نہیں کیا جائے گا، وہ سفیہ شمار ہوگا، البتہ اس کی ضروریات اور دوسرے حقوق اس کے مال سے ادا کیے جاتے

رہیں گے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۲، ص ۲۵۲) ہدایہ ج ۴ ص ۳۳۸

ولیوں کی ترتیب

حجر کے سلسلہ میں ولیوں کی ترتیب یہ ہوگی، سب سے پہلے ولایت کا حق دار باپ ہے، باپ کے بعد وہ شخص جس کو باپ نے اپنی زندگی میں **وصی** یعنی اس کا مربی و نگراں مقرر کردیا ہو وہ ولی ہوگا، اور باپ کے مرجانے کے بعد اس کا مقرر کردہ وصی جس کو مربی مقرر کردے، اب وہ ولی ہوجائے گا، اگر باپ نے ولی مقرر نہ کیا ہو یا باپ کا مقرر کردہ ولی مرجائے تو اگر دادا زندہ ہے تو وہ ولی ہوگا، اگر دادا چاہے تو باپ کی طرح اپنی زندگی میں دوسرے کو ولی مقرر کردے، جس کو وہ ولی مقرر کرے گا وہ اسکے بعد ولی ہوگا، اب اگر باپ یا دادا یا ان کا مقرر کردہ کوئی ولی نہ ہو تو پھر حکومت اس کی ولی ہوگی، دوسرے جتنے اقربار اور اعزہ ہیں حجر میں ولی نہیں ہوسکتے، البتہ اگر باپ دادا یا حکومت ان کو وصی یعنی ولی مقرر کردے تو وہ ولی ہوجائیں گے[1]

سفیہ اور مدیون کے بعض اور ضروری مسائل

(۱) سفیہ اور مدیون بھی تصرف مالی میں نابالغ کی طرح ہیں، مگران کی ولایت بجز حکومت کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے، سفیہ کے بارے میں کچھ رائیں یہاں نقل کی جاتی ہیں جس سے اندازہ ہوجائے گا کہ اس میں وہ تمام لوگ آجاتے ہیں جن میں رشد یعنی مال و دولت کو صحیح طور پر خرچ کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔

سفیہ (نادان) کے بارے میں قرطبی نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی یہ رائے نقل کی ہے:

السفہاء کل من یستحق الحجر۔	سفہاء سے وہ تمام لوگ مراد ہیں جن پر حجر کیا جانا ضروری ہے۔

---

[1] المجلۃ ص ۱۶۵۔ ائمۂ ثلاثہ بھی باپ اور وصی کے سلسلہ میں متفق ہیں، دوسرے لوگوں کے بارے میں تھوڑا سا اختلاف ہے، اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ صبی (بچہ) اور مجنون میں ان لوگوں کو ولایت حاصل ہے، بقیہ سفیہ اور مدیون وغیرہ پر حجر کرنے کا اختیار حکومت کو ہے۔

پھر آگے لکھتے ہیں:

وأمّا الجاهل بالاحكام فلا يدفع المال لجهله بفاسد البياعات وصحيحها وما يحل ويحرم (قرطبی ج ۵ ص ۲۸)	جو شخص احکام دنییہ سے ناواقف ہو اس کو اس کا مال سپرد نہیں کیا جائے گا اس لیے کہ وہ اس کا علم نہیں رکھتا کہ کیا چیز حلال ہے اور کیا چیز حرام ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ سفیہ ہر وہ شخص ہے جو معاملات میں شریعت کا پابند نہیں ہے، اور اپنا مال بے ضرورت فضول خرچی میں اڑا رہا ہو، جس کو نہ معاملہ کرنے کا سلیقہ ہو اور نہ نفع و نقصان کی پرواہ ہو، وہ سب سفہار میں داخل ہیں۔

الدر المختار میں ہے:

السفه تبذير المال وتضييعه على خلاف مقتضى الشرع و العقل ولو في الخير كان يصرفه في بناء المساجد ونحو ذلك، فيحجر عليه عند هما۔ (بحوالہ شرح المجلہ ص ۵۳۵)	سفہ (بیوقوفی) نام ہے فضول خرچی اور عقل و شریعت کے منشا کے خلاف مال خرچ کرنے کا اگرچہ یہ فضول خرچی کار خیر ہی میں کیوں نہ ہو، مثلاً اگر مسجدوں کی تعمیر میں بھی فضول خرچی کی جائے تو صاحبین کے نزدیک اس پر اسلامی حکومت کی طرف سے پابندی عائد کی جائے گی۔

یہی تعریف قریب قریب تمام ائمہ نے کی ہے۔

(۲) حکومت ان کا اور ان کے بال بچوں کا خرچ ان کی جائداد یا ان کے مال سے پورا کرے گی۔

(۳) دوسرے جن لوگوں کے حق ان پر ہوں گے سب کے حقوق ان کے مال سے پورے کیے جائیں گے۔

(۴) مدیون کا وہی مال اور وہی جائداد حجر کی جائے گی جو حجر کے وقت تک موجود تھی، اس کے بعد وہ جو کچھ حاصل کرے گا اس میں حکومت کو مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

(۵) مدیون کی جو جائداد یا مال حجر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے تو اس سے اس کا اور اس کے بال بچوں کا خرچ پورا کیا جائے گا۔

(۶) اگر حجر کی حالت میں سفیہ قرض لے لے تو اس کی جائداد سے ادا کیا جائے گا، البتہ اگر اس نے کسی فضول خرچی کے لیے لیا ہے تو پھر حکومت اس کی ذمہ دار نہیں ہے۔

شفعہ

اگر کوئی شخص اپنی غیر منقولہ جائداد مثلاً زمین یا مکان بیچتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ جائداد کئی آدمیوں کے درمیان مشترک ہو، یا اس سے کئی آدمیوں کا فائدہ وابستہ ہو یا اس کے پڑوس میں ایک دوسرا شخص ہے تو ہو سکتا ہے کہ بائع سے ان لوگوں کے تعلقات اچھے رہے ہوں اور ہر ایک دوسرے کے نفع و نقصان اور تکلیف و آرام کا خیال کرتا رہا ہو، لیکن ایک بالکل اجنبی شخص جو اس کو خرید رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس سے ان لوگوں کے تعلقات استوار نہ رہیں، یا بے مروت ہو، یا کسی پڑوسی کے نفع و نقصان یا تکلیف و آرام کا خیال نہ کرتا ہو تو اس سے دونوں کو تکلیف ہوگی، جس سے معاشرہ میں ایک بگاڑ اور خرابی پیدا ہوگی[له] اس مصلحت کے پیش نظر شریعت نے شفعہ کرنے کی اجازت دی ہے، یعنی یہ اجازت دی ہے کہ بائع جتنی قیمت میں یہ جائداد بیچتا ہے اگر شفیع چاہے تو اتنی ہی قیمت پر وہ جائداد دعویٰ کر کے لے سکتا ہے۔

حدیث نبویؐ

آپؐ سے متعدد حدیثیں مروی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ نے مشترک جائدادوں میں شفعہ کا فیصلہ فرمایا، ایک حدیث میں ہے:

قضیٰ بالشفعة فی کل شرکة	ہر مشترک جائداد میں خواہ مکان ہو یا
لم تقسم ربعةٍ او حائط	باغ و زمین آپؐ نے شفعہ کا فیصلہ
لایحل له ان یبیع حتی	فرمایا، اور فرمایا کہ یہ جائز نہیں ہے کہ
یؤذن شریکه، فإن شاء	جب تک اس کا شریک اجازت نہ
أخذ وإن شاء ترك،	دے وہ اسے فروخت کرے، اگر
فإن باعه ولم یؤذنه	وہ شریک چاہے تو خود لے لے ورنہ

له اما سبب مشروعیتها فدفع الضرر ای ضرر المشتری عن الشفیع بسبب سوء المعاشرة والمعاملة (شرح المجلة ص ۵۶۴)

فهو أحق به۔ چھوڑ دے، اگر اس نے بغیر اجازت فروخت کردیا تو شریک زیادہ حقدار ہے۔ (مسلم بحوالہ مشکوٰۃ والمنتقی ج ۲ ص ۴۱۶)

شفعہ کے معنی اور اس کی تعریف

شفعہ کے لفظی معنی ملانے کے ہیں، اور شریعت میں دوسرے کی خریدی ہوئی جائداد کو اس کی قیمت ادا کر کے اپنی جائداد سے ملانے یا علٰحدہ نہ ہونے دینے کو حق شفعہ کہتے ہیں، اس کا رواج جاہلیت میں بھی تھا، تھوڑے سے تغیر کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے باقی رکھا۔ (الافصاح ابن ہبیرہ ج ۱ ص ۳۴)

چند اصطلاحیں

۱۔ شفیع: شفعہ کرنے والا ۲۔ مشفوع: جس زمین کا شفعہ کیا جائے ۳۔ مشفوع بہ: شفیع کی وہ زمین، مکان یا زمین ومکان کا وہ حصہ جس کی وجہ سے اس کو یہ حق ملا ہے ۴۔ جار: پڑوسی، جار ملاصق: جس کا مکان بالکل ملا ہوا ہو۔

شفعہ کے اسباب

تین اسباب کی بنا پر شفعہ کیا جا سکتا ہے، ایک تو وہ شخص شفعہ کر سکتا ہے جو اس جائداد میں حصہ دار ہو، دوسرے وہ شخص جو اس کے نفع میں شریک ہو، مثلاً دونوں کا راستہ ایک ہے، یا دونوں ایک کنویں یا نہر سے آب پاشی کرتے ہیں، یا دونوں کا صحن ایک ہے، تیسرے پڑوسی، یعنی جس کا مکان اس کے مکان سے ملا ہوا ہو، یا زمین اس کی زمین سے ملی ہوئی ہو، پڑوسی کے بارے میں یہ رائے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، مگر ائمہ ثلاثہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک پڑوسی کو شفعہ کی اجازت نہیں ہے[1]

---

[1] حق شفعہ کے بارے میں تمام ائمہ متفق ہیں مگر پڑوسی کے بارے میں تھوڑا اختلاف ہے قال أبو حنيفة تجب الشفعة وقال مالك والشافعي وأحمد لا شفعة بالجوار (الافصاح ج ۲ ص ۳۴) بعض حدیثوں میں صرف شریک کا ذکر ہے اسلیے ائمہ ثلثہ نے یہ رائے قائم کی ہے لیکن متعدد احادیث میں جار کا بھی ذکر ہے اس لیے امام صاحب نے اسے بھی شفعہ کا حق دیا ہے مثلاً آپ نے فرمایا جار الدار أحق بالدار من غيره، یہ روایت الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ سب نے نقل کی ہے۔

حق شفعہ میں ترتیب

اور سب سے پہلے شریک جائداد کو شفعہ کا حق ہے، اگر وہ شفعہ نہ کرے تو پھر جس کا نفع مشترک ہو، اگر وہ بھی نہ کرے تو پھر پڑوسی کو، اگر پڑوسی نفع میں بھی شریک ہو تو پھر اس پڑوسی پر اس کو فوقیت حاصل ہوگی جس کا مکان یا زمین ملی ہوئی تو ہے مگر نفع میں شریک نہیں ہے[1]

۲۔ اگر دو منزلہ مکان ہو مگر اوپر کی منزل دوسرے کی ہو اور نیچے کی دوسرے کی، تو دونوں ایک دوسرے کے جار ملاصق ہیں۔

۳۔ اگر دو پڑوسیوں کے مکان کی ایک دیوار مشترک ہو تو دونوں مکان میں شریک سمجھے جائیں گے، یعنی سب سے پہلے ان ہی کو شفعہ کا حق ہوگا، لیکن اگر کسی پڑوسی نے پڑوسی کی دیوار پر اپنے مکان کی کڑی یا بلا رکھ لیا یا اس کی دیوار پر سلاپ لگا لیا اور پڑوسی نے اعتراض نہیں کیا تو اس سے وہ شریک نہیں پڑوسی ہی سمجھا جائے گا[2]

۴۔ اگر کسی زمین یا مکان کے دو یا کئی شفیع ہوں اور ان سب کے حصے برابر نہ ہوں تو بھی شفعہ کرنے کے اعتبار سے سب کو برابر حق ہوگا، مثلاً ایک مکان یا زمین میں تین شریک ہیں، ایک کا آدھا حصہ ہے، اور آدھے میں دو آدمی شریک ہیں، ان میں ایک کا تیسرا اور ایک کا چوتھا حصہ ہے، تو اگر آدھے حصہ والا شریک اپنا حصہ بیچ دے تو ان دونوں کو برابر کے شفعہ کا حق ہوگا، اور جب وہ مکان یا زمین ملے گی تو برابر قیمت دے کر برابر تقسیم کر لیں گے، ان کے حصہ کی

---

[1] حق الشفعة اولا للمشارك فی نفس المبیع وثانیا للخلیط فی حق المبیع ثالثا للجار الملاصق (المجلة ص ۱۶) [2] إذا كانت الدرجة العلیا من البناء ملك أحد والسفلی ملك آخر یعد احدهما للآخر جاراً ملاصقا، (المجلة ص ۱۵۷) [3] المشارك فی حائط الدار هو فی حكم المشارك فی نفس الدار، ولكن أخشاب سقفه ممتدة علی حائط جاره، فیعد جارا ملاصقا۔ (ص ۱۶ المجلة)

کمی بیشی کا کوئی اثر حق شفعہ پر نہیں پڑے گا[1]

شفعہ کے صحیح ہونے کے شرائط اور بعض ضروری مسائل

۱۔ جوں ہی شفیع کو معلوم ہو کہ فلاں شرکت یا جوار کی زمین بکی یا کسی نے ہبہ کر دی ہے، اسی وقت اس کو یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ میں شفعہ کروں گا یا اسے کوئی ایسا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے جس سے اس کی ناراضگی یا شفعہ کرنے کے رجحان کا پتہ چلے، اگر اس نے اس وقت نہ کچھ کہا اور نہ شفعہ کا ارادہ ظاہر کیا تو پھر شفعہ کرنے کا حق نہیں[2] ہوگا بشرطیکہ اس کو مشتری اور حتمیت کا پتہ چل جائے، صرف خبر سے اس کا حق باطل نہیں ہوگا، (شرح المجلہ ص ۷۷۵ بحوالہ قاضی خان)۔

۲۔ جب تک کوئی چیز فروخت نہ ہو جائے یا ہبہ نہ کر دی جائے اس وقت تک محض بائع کے ارادہ پر شفعہ نہیں ہوگا۔

۳۔ شفعہ صرف غیر منقولہ جائداد زمین، باغ، مکان وغیرہ میں جائز ہے، منقولہ اموال میں یا وقف اور حکومت کی جائداد میں شفعہ کا حق نہیں ہوگا[3]۔

۴۔ جس جائداد کے بیچنے یا ہبہ کرنے میں شفیع کی رضامندی شامل ہو اس میں اس کو شفعہ کا حق نہیں ہے، مثلاً اس نے بیچنے کا مشورہ دیا، یا جب اس کو بیع کا علم ہوا تو اس نے کہا اچھا ہوا، تو اب اس کو شفعہ کرنے کا حق نہیں ہے[4]۔

۵۔ اگر کسی شفیع نے خریدار سے کہا کہ اتنی رقم دے دو تو میں حق شفعہ سے باز آجاؤں تو اس کہنے سے اب اس کو شفعہ کا حق باقی نہیں رہا، اور اپنے حق کا دباؤ ڈال کر جو روپیہ وہ خریدار یا بائع

---

[1] إذا تعددت الشفعاء يعتبر عدد الرؤس ولا يعتبر مقدار السهام يعني لا إعتبار لمقدار الحصص (المجلة ص ١٦٢) [2] يلزم على الشفيع أن يقول كلاما يدل على طلب الشفعة (المجلة ص ١٦٤).

[3] لا تجري الشفعة في السفينة وسائر المنقولات (المجلة ص ١٦٢)

[4] يشترط أن لا يكون للشفيع رضى في عقد البيع الواقع صراحة أو دلالة (المجلة ص ١٦٣)

سے لے گا، وہ اس کے لیے رشوت اور حرام ہوگا[1]

۶۔ اگر خریدار نے بتایا کہ میں نے فلاں مکان دو ہزار یا دس ہزار میں لیا ہے اور شفیع نے رقم کی زیادتی کی وجہ سے شفعہ نہیں کیا، لیکن بعد میں اس کو معلوم ہوا کہ اس نے غلط بتایا تھا، اس سے کم قیمت میں بکا ہے تو اس کو دوبارہ شفعہ کرنے کا حق باقی رہے گا[2]

(۷) اگر خریدار نے مبیع میں کوئی اضافہ کر دیا ہے، مثلاً مکان میں کوئی ترمیم کر دی ہے یا زمین میں مکان بنا لیا ہے، یا درخت لگا لیا ہے تو شفیع یا تو تمام کی قیمت دے کر اس کو لیلے یا اپنے حق سے باز آجائے[3]

۸۔ جس زمین کا شفعہ کرنا ہے وہ پوری زمین کرے یا چھوڑ دے، آدھے، پونے، یا چوتھائی کا شفعہ جائز نہیں (المجلہ ص ۱۶۰ دفعہ ۱۰۴۱)

۹۔ شفیع نے جس مکان یا باغ کا شفعہ کر دیا ہے، وہ شفعہ کرنے کے بعد گر گیا، یا باغ کے درخت سوکھ گئے، تب بھی اس کو پوری قیمت دینی پڑے گی، بشرطیکہ مشتری نے قصداً ایسا نہ کیا ہو

۱۰۔ اگر شفیع نے حق شفعہ کا دعویٰ کر دیا تھا، مگر فیصلہ سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا تو اس کا حق شفعہ جاتا رہا، اب اس کے ورثہ کو اس کا حق نہیں ہے۔

۱۱۔ اگر وہ شفعہ کرنے کا ارادہ تو ظاہر کر چکا ہے لیکن ابھی اس نے دعویٰ نہیں کیا تو اس تاخیر سے اس کے حق شفعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا حق شفعہ شفیع دو طرح سے حاصل کر سکتا ہے:

۱۔ اسلامی حکومت کے سامنے دعویٰ کر کے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ خریدار قیمت لے کر اس کو یہ جائداد دینے پر راضی ہو جائے[4]

---

[1] بہشتی زیور حصہ گیارہ ص ۱۱۶ بحوالہ شرح البدایۃ [2] فإذا بلغ الشفیع أنها بیعت بألف درهم فسلم ثم علم أنها بیعت بأقل ... فتسلیمه باطل وله الشفعة، (ہدایہ ج ص ۳۹۱) [3] لو زاد المشتری علی البناء المشفوع شیئا من ماله فشفیعه مخیر، إن شاء ترکه وإن شاء تملکه بإعطاء ثمن البناء (المجلہ ص ۱۶۶ دفعہ ۱۰۴۴) [4] یکون الشفیع مالکا للمشفوع بتسلیمه، بالتراضی مع المشتری أو بحکم الحاکم (المجلہ ۱۶۵ دفعہ ۱۰۳۶)

اگر شفیع کہیں دور رہتا ہے اور بروقت وہ شفعہ نہیں کر سکا تو جب اسے اطلاع ملے وہ خود آ کر یا کسی کو اپنا وکیل بنا کر یا تحریر بھیج کر وہ شفعہ کر سکتا ہے۔ (شرح المجلۃ ص ۵۸۰)

مسلم اور غیر مسلم اس میں برابر ہیں

جس طرح ایک مسلمان ایک مسلمان سے شفعہ کر کے کوئی جائداد لے سکتا ہے، اسی طرح اسلامی مملکت کے غیر مسلم پڑوسی کو بھی یہ حق ہے کہ وہ شفعہ کر کے کسی مسلمان سے کوئی جائداد حاصل کر لے، صاحب ہدایہ عقلی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب شفعہ کا حق دفع ضرر کے لیے ہے اور اس سبب وحکمت میں مسلم اور غیر مسلم، باغی اور عادل سب برابر ہیں تو استحقاق میں بھی ان سب کو برابر ہونا چاہیے۔

غصب

زبردستی، ناحق، بلا اجازت اور بغیر رضامندی کے کسی کی کوئی چیز لینا بہت بڑا گناہ ہے قرآن وحدیث میں اس کی سخت مذمت آئی ہے، یہاں تک کہ باپ کو بیٹے کی چیز اور بیٹے کو باپ کی چیز، بیوی کو شوہر کی چیز اور شوہر کو بیوی کی چیز بھی بلا اجازت لینی اور استعمال کرنی صحیح نہیں ہے اگر کسی نے کسی کی چیز بلا اجازت لے لی یا استعمال کر لی تو وہ غاصب کہا جائے گا، اس کی سزا اس کو دنیا میں بھی دی جا سکتی ہے اور آخرت میں بھی اس کو عذاب بھگتنا پڑے گا، غصب ظلم کی ایک بدترین قسم ہے، قرآن میں کہا گیا ہے کہ:

"جو لوگ یتیموں کا مال ناحق اور بلا ضرورت کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں"

آگ بھرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم کو بنا رہے ہیں، قرآن نے یہاں ظلم کا لفظ استعمال کیا ہے، جس میں ہر طرح کی زیادتی، زبردستی اور ناحق طلبی شامل ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک یتیم جو ابھی عقل وتمیز نہیں رکھتا، اس کا مال اس انداز سے خرچ کرنا جس انداز سے وہ اپنا مال خرچ کرنا پسند نہیں کرتا، یا اس کے مال کی نگرانی کی اجرت اتنی

وصول کرنا جتنی کہ وہ خود دوسروں کو اپنے کام پر نہیں دیتا تو یہ طرزِ عمل ظلم ہے غصب تو ظلم اس حیثیت سے بھی ہے کہ یہ غاصب ایک کمزور کا مال ناحق کھا رہا ہے، اور اس حیثیت سے بھی کہ وہ یتیم اگر بالغ ہوتا تو اپنی دولت کو اس طرح برباد کرنے کی اجازت نہ دیتا۔

فقہاء نے قرآن پاک کی آیت وَكَانَ وَرَآءَهُم مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا اور ذیل کی حدیثوں سے غصب کے مسائل مستنبط کیے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار ارشادات ہیں جن سے اس کی مذمت معلوم ہوتی ہے، اور ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غصب ایک بدترین ظلم ہے، آپؐ نے نہایت تاکید اور تنبیہ کے انداز میں فرمایا کہ:

ألا لاتظلموا لايحل مال امرأٍ إلّا بطيب نفسه (مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی و دار قطنی)	ہوشیار خبردار کسی پر ظلم نہ کرنا، ہوشیار خبردار کسی آدمی کا مال اس کی مرضی کے بغیر لینا حرام ہے۔

آپؐ نے فرمایا کہ بلا اجازت کسی کی چیز نہ تو سنجیدگی سے لینا درست ہے، نہ مذاق اور تفریح میں لینا درست ہے:

لايأخذن احدكم متاع أخيه جادًّا ولا لاعبًا. (احمد، ابوداؤد، ترمذی، المنتقی ج۲ ص۳۴۶)	تم میں سے کوئی ہرگز اپنے بھائی کا مال نہ لے، نہ تو سنجیدگی سے، نہ تفریحًا اور مذاقًا۔

آپؐ نے فرمایا ہے کہ "کسی کی چھڑی بھی بغیر اجازت نہ اٹھانی چاہیے"! آپؐ نے فرمایا کہ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی کا دودھ دینے والا جانور پا جائے اور بغیر اجازت اس کا دودھ دوہ لے، آپؐ نے اس بات کو ایک تمثیل سے سمجھایا، فرمایا کہ کیا تم پسند کروگے کہ تمھاری الماری یا برتن میں کھانے پینے کی کوئی چیز رکھی ہوئی ہو اور اس کو توڑ دیا جائے اور وہ کھانے کی چیز گر جائے تو جس طرح تم اس کو پسند نہیں کروگے کہ تمھارے کھانے پینے کی چیز کوئی اس طرح برباد کردے، اسی طرح جانوروں کے

---

۵ سورۂ نساء

تھن بھی غذا کے خزانے ہیں، ان کو بھی مالک کی اجازت کے بغیر خالی کرلینا درست نہیں ہے (مسلم، مشکوٰۃ ص ۲۵۴)

زمین کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ "اگر کوئی شخص ایک بالشت زمین بھی کسی کی ناحق اور ظلم وغصب سے دبالے تو قیامت کے دن اس کی سات گنی زمین اس کے گلے میں طوق مذلت بنا کر ڈال دی جائے گی، آپ نے فرمایا کہ اگر کسی کی زمین میں بغیر اس کی اجازت کے کھیتی کرلی تو قانوناً اس کھیتی سے اس کو کچھ نہ ملے گا، البتہ اس کی محنت مزدوری دے دی جائیگی (بخاری ومسلم) المنتقیٰ ص ۴۰۸۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت میں حق مارنے والے سے کہا جائے گا کہ وہ غصب کردہ چیز واپس کردے، ظاہر ہے کہ وہ چیز تو وہاں وہ لا نہیں سکتا، اس لیے اس چیز کے بدلے اسکی نیکی کا کچھ حصہ اس شخص کو دے دیا جائے گا جس کا حق اس نے دبالیا تھا، اگر اس کے نامۂ اعمال میں کوئی نیکی نہ ہوگی تو پھر اہل حقوق کے گناہوں کا کچھ بوجھ اس کے سر پر اور رکھ دیا جائے گا یعنی اس کی زیادتی کا بدلہ اس کو اس طرح ملے گا، اور جن کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو ان کو اس کا اجر ملے گا"

لیکن جن لوگوں پر زیادتی ہوئی ہے ان کو یہ اجر وثواب اسی وقت ملے گا جب انھوں نے بھی ظلم کے بدلے میں ظلم نہ کیا ہو، اور زیادتی کے بدلے میں دوسری زیادتی نہ کی ہو، اور غصب کے بدلے غصب نہ کیا ہو، اگر انھوں نے بھی ایسا کیا ہے تو پھر ان کا اجر وثواب تو جائے گا ہی ممکن ہے کہ وہ الٹے عذاب میں بھی ڈالے جائیں۔

یہ تو آخرت کا عذاب تھا، دنیا میں غصب وظلم کی کیا سزا اور بدلہ ہے، اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آرہی ہے،

چند اصطلاحیں

۱۔ غاصب: غصب کرنے والا ۲۔ مغصوب: وہ مال جو غاصب نے غصب کیا ہے ۳۔ مغصوب منہ: وہ شخص جس کا مال غصب کیا گیا ہے۔

غصب کی تعریف

غصب کے لغوی معنی ہیں کسی کے مال کو زبردستی سے لینا اور شریعت میں اس کی تعریف یہ ہے: کسی حلال

مال کو مال والے کی اجازت کے بغیر آنکھوں کے سامنے زبردستی اس طرح سے لے لینا کہ وہ مغصوب منہ کے قبضہ سے نکل کر غاصب کے قبضہ میں آجائے، اگر چپکے سے کوئی مال لے لے تو اسے سرقہ کہیں گے، غصب نہیں۔[1]

غصب کا حکم

۱۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ کسی کی چیز بلا اجازت لینا سخت گناہ ہے، لیکن اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ قصداً ایسا کیا ہو، اور دوسرے یہ کہ قصداً ایسا نہ کیا ہو، بلکہ غلطی سے اس نے لے لیا ہو، قصد سے لینے کی صورت میں تو وہ گناہ گار بھی ہوگا اور مغصوب چیز اس کو واپس بھی کرنی ہوگی، یا اس کا تاوان دینا پڑے گا، اور اگر غلطی سے یا اپنی چیز سمجھ کر کسی کی کوئی چیز لے لی تو اس کو گناہ نہیں ہوگا، صرف وہ چیز واپس کرنی ہوگی یا اس کا تاوان دینا پڑے گا، گناہ اس لیے نہیں ہوگا کہ غلطی اور چوک کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے۔

۲۔ غاصب کے پاس اگر مغصوب چیز یا مال موجود ہے تو بعینہٖ وہی اس سے واپس لیا جائے گا، لیکن اگر وہ موجود نہ ہو بلکہ اس نے خرچ کر دیا ہو یا ضائع کر دیا ہو تو اگر یہ ایسی چیز تھی جو عام طور پر ملتی نہیں ہے، یا بالکل اسی طرح کی نہیں ملتی تو پھر اس کو غصب کے دن جو اس کی قیمت تھی وہی قیمت دینی پڑے گی۔[2]

۳۔ اگر غاصب مال مغصوب کی قیمت واپس کرے اور مغصوب منہ قبول نہ کرے تو حکومت اس کو اس کے لینے پر مجبور کرے گی۔[3]

---

[1] هو إزالة يد محققة بإثبات يد مبطلة فى مال متقوم محترم قابل للنقل بغير إذن مالكه لا يخفيه، یہ تعریف شرح المجلۃ کے مصنف سے التنویر سے نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ تعریف انتہائی جامع ہے (شرح المجلۃ ص ۴۸۵) [2] ويجب على الغاصب رد عينه إلى المالك وإن عجز عن رد عينه بهلاكه فى يده بفعله او بغير فعله مثله إن كان مثليا فان لم يقدر على مثله فعليه قيمته، وإن غصب مالا له مثله فعليه قيمة يوم الغصب (فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۱۱۶) [3] إذا ادى الغاصب قيمة المال المغصوب الذى تلف إلى صاحبه ولم يقبله راجع الحاكم فيأمره بالقبول۔

۴۔ اگر مغصوب چیز میں کوئی کمی آگئی ہے یا خرابی آگئی ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں اگر اس میں معمولی خرابی آئی ہے تو پھر وہ چیز بھی واپس کرنی ہوگی، اور جتنی خرابی آئی ہے اس کے بقدر تاوان بھی دینا پڑے گا، لیکن اگر زیادہ خرابی آگئی ہے تو مالک کو اختیار ہوگا کہ چاہے وہ چیز واپس لے لے اور نقصان کے بقدر اس کا تاوان لے لے، یا چیز واپس نہ لے، بلکہ پوری قیمت وصول کرے [1]

۵۔ اگر غاصب نے مغصوب چیز میں ایسی تبدیلی کر دی ہے کہ اب اس کا نام بدل گیا ہے، تو اس کو اس کی پوری قیمت دینی پڑے گی، مثلاً کسی نے کسی کی بکری بلا اجازت یا زبردستی لے لی اور اس کو ذبح کر دیا، یا غلہ لے لیا اور اس کو پسا کر آٹا بنا دیا تو اب یہ سمجھا جائیگا یہ چیز غاصب کی ملکیت میں آگئی، اس صورت میں اس کو ان دونوں چیزوں کی قیمت دینی پڑے گی، اور جب تک قیمت نہ دے گا اس کو استعمال کا حق نہیں ہوگا، اسی طرح اگر کسی نے کپڑا غصب کیا اور اس کو رنگ دیا تو مالک کو رنگا ہوا کپڑا لینے یا پوری قیمت لینے دونوں باتوں کا حق ہوگا، کپڑا لینے کی صورت میں رنگائی کی قیمت مالک کو دینی پڑے گی [2]

غصب کردہ روپئے سے کسی نے تجارت کی تو اس سے جو کچھ نفع ہوگا وہ صدقہ کر دے، اور اصل روپیہ مالک کو واپس کر دے [3] اس کے لیے نفع لینا جائز نہیں، ورنہ دُہرا گناہ کار ہوگا، ایک غصب کا، دوسرا حرام مال سے نفع کھانے کا۔

اسی طرح کسی نے سونا یا چاندی غصب کی اور اس کا زیور بنوالیا تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مالک کو وہی چیز واپس کر دی جائے گی، مگر صاحبین فرماتے ہیں کہ مالک کو زیور نہیں

---

[1] ومن خرق ثوب غیرہ خرقا یسیرا ضمن نقصانہ والثوب لمالکہ، وإن خرق خرقا کثیرا یبطل عامة منفعتہ فلمالکہ أن یضمنہ جمیع قیمتہ (قدوری ص ۱۲۲) [2] إذا غیر الغاصب المال المغصوب بصورة یتبدل اسمہ یکون ضامنًا ویبقی المال المغصوب لہ (المجلة ص ۱۴۳) [3] ومن غصب ألفًا فاشتری بہا جاریة فباعہا بالعین فانہ یتصدق بجمیع الربح (ہدایہ ج ۳، ص ۳۵۹)

بلکہ اس کی قیمت دلائی جائے گی[1]

۶۔ مغصوب چیز میں غاصب کے پاس خود بخود جو زیادتی ہوگی وہ سب مالک یعنی مغصوب منہ کی ہوگی، مثلاً جانور نے بچہ دیا یا باغ میں پھل آیا تو یہ سب مالک کا حق ہوگا، اگر غاصب نے اسے بیچ دیا یا ضائع کر دیا تو تاوان دینا پڑے گا[2]

۷۔ اگر غاصب نے غصب کی ہوئی چیز میں خود کچھ اضافہ کر دیا ہے، مثلاً مکان بنالیا ہے یا اس میں باغ لگا دیا ہے تو غاصب کو حکم دیا جائے گا وہ اپنا مکان ڈھادے یا باغ کے درخت کاٹ لے جائے، لیکن اگر اس کے مکان کے گرانے یا درخت کے کاٹنے میں زمین کو کوئی نقصان ہوتا ہو تو مالک اس کی قیمت دے کر اس کو خود لے لے، غرض یہ کہ اس کی زیادتی کے بدلہ میں اخلاقاً یا قانوناً اس پر کوئی زیادتی نہ کی جائے گی[3] حدیث میں ہے:

من زرع في أرض قوم بغير	کسی نے کسی کی زمین بغیر اجازت کھیتی کرلی
إذنهم فليس له من الزرع	تو کھیتی کرنے والے کو کچھ نہیں ملے گا، وہ
شيئ (بخاری، مسلم، ترمذی، المنتقی ۴۰۸)	سب مالک کا ہوگا۔

غصب کے سلسلہ میں تھوڑے سے جزئی اختلاف کے علاوہ تمام ائمہ متفق ہیں۔

---

[1] وإن غصب فضة أو ذهبًا فضربها دراهم أو دنانير أو آنية لم يزل ملك مالكها عنها عند أبي حنيفة فيأخذها ولاشيئ للغاصب، وقالا لايملكها الغاصب وعليه مثلها (هداية ج ۳ ص ۳۶۲) [2] زوائد المغصوب لصاحبه، وإذا استهلك الغاصب يضمنها (المجلة ص ۱۴۳) [3] إن كان المغصوب أرضًا وكان الغاصب أنشأ عليها بناءً أو غرس فيها شجرا يؤمر الغاصب بقلعهما (ص ۱۴۴ المجلة دفعه ۹۰۶)

اِتلاف

(یعنی نقصان کر دینا)

جس طرح کسی کی چیز کا بلا اجازت لے لینا سخت گناہ ہے اسی طرح کسی کی چیز کا نقصان کر دینا یا قصداً نقصان کا سبب بننا بہت بڑا گناہ ہے۔ ایک بار حضرت عائشہ رضؓ نے حضرت صفیہ رضؓ کی ایک طشتری توڑ دی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا تاوان دلوایا[1] اگر کوئی شخص کسی کی چیز قصداً یا بغیر قصد کے ضائع کرتا ہے تو اس کو اس کا تاوان دینا پڑے گا۔ البتہ قصداً ضائع کرنے میں اس کو تاوان کے ساتھ گناہ بھی ہوگا، اور بغیر قصد ضائع کرنے میں گناہ تو نہیں ہوگا، مگر تاوان دینا پڑے گا۔

اتلاف کی ایک قسم جانی نقصان یعنی قتل کر دینا یا کسی کا کوئی عضو بیکار کر دینا ہے، لیکن اس کا تعلق سراسر اسلامی حکومت سے ہے، اس کا ذکر کچھ آچکا ہے اور کچھ ذکر حدود و تعزیر کے بیان میں آئے گا، یہاں صرف مالی نقصانات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کسی چیز کو نقصان پہونچانا یا ضائع کرنا دو طرح سے ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ اس نے براہ راست کوئی چیز ضائع یا نقصان کر دی ہے، دوسرے یہ کہ اس کا کوئی فعل نقصان یا ضائع کرنے کا سبب بنا ہے، مثلاً کسی نے کسی کی ایک چیز زمین پر پٹک دی اور وہ ٹوٹ گئی، یا قصداً اس نے گلاس کو ایسی جگہ رکھ دیا جہاں گر کر ٹوٹنے کا امکان تھا، یا نا سمجھ بچے کے ہاتھ میں دے دیا اور وہ ٹوٹ گیا، تو پہلی صورت کو براہ راست نقصان قرار دیا جائے گا، اور دوسری صورت میں اسکو نقصان کا سبب قرار دیا جائے گا، تاوان دونوں صورتوں میں دینا پڑے گا۔ پہلی اور دوسری صورت میں فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں اگر کوئی دوسرا اس نقصان میں شامل ہو جائے گا تو

---

[1] آپ نے فرمایا إناء کإناء وطعام کطعام (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، المنتقیٰ ج ۲ ص ۴۱۰)

پہلے شخص پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، مثلاً کسی نے راستہ میں ایک کنواں کھود دیا تو اگر کوئی آدمی خود گر پڑے تو اس کا خون بہا کنواں کھودنے والے کو دینا پڑے گا، لیکن اگر کوئی دوسرا آدمی کسی آدمی یا جانور کو اس میں گرا دے تو پھر اس کی ذمہ داری گرانے والے پر ہوگی، کنواں کھودنے والے پر نہیں۔

دونوں صورتوں کے کچھ مسائل یہاں بیان کیے جاتے ہیں۔

(۱) براہ راست نقصان کرنا

براہ راست نقصان قصداً کرے یا بغیر قصد کے اس کو تاوان دینا پڑے گا، مثلاً:

۱۔ کسی نے کوئی چیز عاریۃً لی یا بطور کرایہ لی، یا بطور امانت رکھی اور اس نے اس کو قصداً توڑ دیا، یا اس کو غلط طریقہ پر استعمال کیا، یا اس کی جتنی حفاظت کرنی چاہیے تھی، نہیں کی تو اس نقصان کا تاوان دینا پڑے گا۔ مثلاً سائیکل لی اور خراب راستہ یا مجمع میں تیز چلائی، اور کوئی پُرزہ ٹوٹ گیا، یا لڑ گئی تو اس کا تاوان دینا پڑے گا، یا مثلاً کسی سے کتاب لی اور اس کو ایسی جگہ رکھ دیا جہاں چوہے نے اس کا کچھ حصہ کاٹ دیا، یا اس کے بچے نے پھاڑ دیا تو اس کو نقصان کے بقدر تاوان دینا پڑے گا، اگر وہ بالکل بیکار ہوگئی تو پوری قیمت دینی پڑے گی[1]

۲۔ کوئی پھسل کر گر پڑے اور ہاتھ میں دوسرے کی کوئی چیز تھی اور وہ ٹوٹ گئی، یا کسی چیز کے اوپر گر پڑا اور وہ ٹوٹ گئی تو دونوں صورتوں میں تاوان دینا پڑے گا[2]

۳۔ کسی دوسرے کی چیز کو اپنی سمجھ کر توڑ دی یا ضائع کر دی یا خرچ کر دی تو اس کا بھی تاوان دینا پڑے گا[3] اس پر گناہ تو نہیں ہوگا لیکن تاوان اس لیے لیا جائے گا کہ یہ بندہ کا حق ہے جس میں علم وقصد نہیں دیکھا جائے گا۔ (مجمع الانہر بحوالہ شرح المجلۃ ص ۵۰۶)

۴۔ کسی نے کسی کا کپڑا پکڑ کر کھینچ لیا اور وہ پھٹ گیا تو پوری قیمت دینی پڑے گی، لیکن اگر

---

[1] إذا أتلف أحد مال غيره الذي في يده أو في يد امينه قصداً أو من غير قصد يضمن (شرح المجلة دفعہ ۹۱۳ ص ۵۰۸) [2] إذا زلق واحد وسقط فأتلف مال آخر ضمنه أيضًا (ص ۵۰۶) [3] لو أتلف واحد مال غيره على زعمه أنه ماله يضمن (المجلة ص ۱۴۶) دفعہ ۹۱۴

اس نے کسی کا دامن پکڑا، مگر کھینچا نہیں، بلکہ جس کا کپڑا پکڑا تھا اس نے جھٹکا دیا، بھاگا، اور کپڑا پھٹ گیا تو نصف قیمت دینی پڑے گی، کیونکہ پہلی صورت میں براہ راست اس نے نقصان کیا، اور دوسری صورت میں دونوں کے فعل سے کپڑا پھٹا تھا اس لیے آدھی آدھی ذمہ داری دونوں پر ڈالی جائے گی[1] اسی طرح اگر وہ کسی کی چادر پر یا کرتے کے دامن پر بیٹھ گیا اور وہ اٹھا اور چادر یا دامن پھٹ گیا تو نصف قیمت دینی پڑے گی۔

۵۔ اگر کسی کا بچہ کسی کی کوئی چیز نقصان کر دے تو اس کا تاوان اس کے وارث سے نہیں لیا جا سکتا، اگر اس بچے کے نام کوئی مال یا جائداد ہے تو اس سے اس کی قیمت ادا کی جائے گی، ورنہ پھر اس وقت کا انتظار کیا جائے گا جب وہ اس کی ادائیگی کے قابل ہو جائے[2] تو لی جائے گی۔

۶۔ اگر کسی نے مکان کا کوئی حصہ گرا دیا یا کوئی درخت کاٹ دیا، یا درخت کا پھل توڑ کر گرا دیا تو ان صورتوں میں نقصان کرنے والے کو تاوان دینا پڑے گا، گرے ہوئے مکان کا جو ملبہ ہے اگر اس کی کوئی قیمت ہے تو اس کی قیمت وضع کر کے مالک مکان اس سے بقیہ کا تاوان لے، یا ملبہ گرانے والے کو دے دے اور پورے نقصان کا معاوضہ لے، اس کو دونوں کا اختیار ہے اسی طرح درخت کی لکڑی اور پھل کی قیمت وضع کر کے تاوان لے یا پوری قیمت، دونوں کا اختیار[3] ہے

۷۔ اگر محلہ میں آگ لگ گئی اور لوگوں نے مالک سے پوچھے بغیر بغل کا مکان گرا دیا، پیٹ پاٹ دیا، یا اس کی کوئی چیز آگ بجھانے میں نقصان ہو گئی تو اس کا تاوان لوگوں کو دینا پڑے گا جن لوگوں نے نقصان کیا ہے، البتہ اگر حکومت کے ذمہ داروں کے حکم سے وہ مکان گرایا گیا ہے یا اس کو نقصان پہونچایا گیا ہے تو گرانے والے سے کوئی تاوان نہیں لیا جا سکتا، اس کی ذمہ داری

---

[1] لو سحب واحد ثیاب غیرہ وشقہا ضمن جمیع قیمتہا، أما لو تشبث بہا وانشقت یجر صاحبہا فانہ نصف القیمۃ [2] اذا أتلف صبی مال غیرہ یلزم الضمان من مالہ، وإن لم یکن مال ینتظر إلی حال یسارہ ولا یضمن ولیہ (شرح المجلۃ ص ۵۱۰) دفعہ ۹۱۶ [3] إذا ھدم واحد بغیر حق عقار غیرہ کالحانوت فصاحبہ بالخیار (شرح المجلۃ ص ۵۱۱ دفعہ ۹۱۸)

حکومت پر ہوگی۔[1]

۸۔ اگر کسی نے اپنے کھیت میں سنچائی کی، اور بے احتیاطی سے پانی بغل والے کھیت میں بھر گیا اور فصل کا نقصان ہوگیا تو اس کو نقصان کا حرجانہ دینا ہوگا۔[2]

نقصان کے بدلے نقصان کرنا جائز نہیں

اگر زید نے عمرو کا کوئی مال یا چیز نقصان کر دی تو عمرو اس سے تاوان تو لے سکتا ہے لیکن اس کو یہ حق شریعت نے نہیں دیا ہے کہ زید کی کوئی چیز ضائع یا نقصان کر دے، اگر ایسا کرے گا تو گنہگار بھی ہوگا اور زید کی چیز کے نقصان کا معاوضہ دینا پڑے گا، غرض یہ کہ اس وجہ سے وہ گناہ اور تاوان سے نہیں بچ سکتا کہ اس نے نقصان کے بدلہ میں ایسا کیا ہے، بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کے نقصان کا تاوان دینا پڑے گا۔[3]

تاوان کرنیوالے پر ہوگا حکم دینے پر نہیں

احمد نے خالد سے کہا کہ طارق کی فلاں چیز توڑ دو یا پھینک دو، یا فلاں آدمی کو مار دو تو اس کی سزا اور تاوان توڑنے والے، پھینکنے والے اور مارنے والے پر ہوگا، حکم دینے والے پر نہیں، البتہ اگر یہ حکم اسلامی حکومت کا ذمہ دار دے یا اس کو اس کے کرنے پر مجبور کر دیا جائے تو پھر ان دونوں صورتوں میں کرنے والے پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔

نقصان کا سبب بننا

نقصان کا سبب بننے کی صورت میں یہ کلیہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ اسی وقت ذمہ دار قرار دیا جائیگا، جب اس میں قصد یا تعدی پائی جائے۔

---

[1] لوهدم أحد دارا بلا إذن صاحبها لأجل وقوع حريق فى المحلة فإن كان الهادم هدمها بأمر أولى الأمر لاضمان عليه وان كان هدمها من عند نفسه كان ضامنا [2] فلوسقى أرضه سقيا لاتحتمله فتعدى الماء إلى أرض جاره ضمن لأنه مباشر لا متسبب (التنویر بحوالہ شرح المجلۃ ص ۵۱۰) دفعہ ۹۱۷ [3] ليس للمظلوم صلاحية أن يظلم 'ابما انه ظلم (المجلة ص ۱۴۷)

المسبّب لا يُضمن إلّا بالتعمّد أو بالتعدی (شرح المجلہ دفعہ ۹۳) — کسی نقصان کا سبب بننے والا قصد و ارادہ ہی سے ضامن قرار دیا جائیگا۔

مثلاً کسی نے کسی کے کمرے یا بکس کا تالا کھول دیا اور اس سے کوئی چیز چوری ہوگئی، تو اس کا تاوان کمرہ اور بکس کھولنے والے پر ہوگا، اسی طرح کسی نے کسی کی کھیتی یا باغ میں پانی نہیں جانے دیا، اور غلہ اور پھل سوکھ ساکھ گئے، یا اس نے اپنے کھیت کا زیادہ پانی دوسرے کے کھیت میں کاٹ دیا اور اس کی کھیتی کو نقصان پہونچ گیا تو پانی روکنے والے اور کاٹ دینے والے سے اس کا تاوان لیا جائے گا، کیونکہ ان تمام صورتوں میں قصداً وہ اس نقصان کا سبب بنا ہے[1]

کوئی شخص راستہ جارہا ہے، اور کوئی جانور اس کو دیکھ کر بھڑکا اور رسی تڑا کر بھاگ گیا، اور وہ ضائع ہوگیا تو اس پر کوئی ذمہ داری نہیں، لیکن اگر اس نے بھڑکا دیا یا چھتری دکھا کر ڈرادیا اور وہ بھاگا اور ضائع ہوگیا تو اس کو اس کی قیمت دینی پڑے گی، کسی نے شکار کرنے کے لیے بندوق چلائی اور اس کی آواز سے ڈر کر کوئی لڑکا گر پڑا اور اس کی موت ہوگئی، یا کوئی جانور رسی تڑا کر بھاگا اور گم ہوگیا تو بندوق چلانے والے پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اگر اس نے قصداً ڈرانے ہی کیلئے چھوڑی تو وہ ذمہ دار ہوگا[2]

کسی نے عام راستے پر کوئی کنواں حکومت کے حکم سے کھودا اور کوئی اس میں گر کر مر گیا تو اس پر اس کا خوں بہا نہیں ہے، بلکہ حکومت کے اوپر ہے، لیکن اگر اس نے خود اپنی طبیعت سے ایسا کیا ہے تو اس کو خوں بہا دینا پڑے گا، اگر اس نے اپنی ذاتی زمین میں کوئی کنواں کھودا، اور کوئی گر کر مر گیا تو اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے[3]

---

[1] لوسد أحد ماء ارض لآخر أو روضته ويبست مزروعاته ومغروساته وتلفت أو أفاض الماء بزيادة وغرقت المزروعات وتلفت يكون ضامنا (شرح المجلہ ص ۵۱۳)

[2] لوخافت دابة أحد من الآخر وفرت وضاعت لا يلزم الضمان وأما إذا خوفها قصداً يضمن (المجلہ ص ۱۴۷، دفعہ ۹۲۳) [3] لوحفر أحد فی الطريق بئرا بلا إذن أولی الأمر وسقطت فيه دابة الآخر وتلفت يضمن وأما لوسقطت الدابة فی بئر كان فی ملكه وتلفت لا يضمن۔

مزدوروں اور پیشہ وروں کے نقصان کرنے کی تلافی اور تاوان کا بیان اجارہ کے بیان میں آچکا ہے۔

جانوروں کے نقصان کا تاوان

اگر کسی کا جانور رات میں یا دن میں اتفاق سے کھل گیا اور اس نے کسی کا کھیت کھا لیا تو اس نقصان کا تاوان جانور کے مالک سے نہیں لیا جا سکتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے[۱]:

العجماء جرحها جبار. (بخاری و مسلم) — جانور کے نقصان کا کوئی تاوان نہیں ہے۔

لیکن اگر قصداً اس نے کھول دیا، یا اس کو کھلنے کا علم ہوا اور اس نے باندھنے کی کوشش نہیں کی، یا چرواہا ساتھ تھا مگر اس کے باوجود کھیت میں جانور پڑ گیا تو ان تمام صورتوں میں خواہ رات ہو یا دن تاوان لیا جائے گا[۲]

۲۔ اگر کوئی شخص اپنے جانور عام راستے سے لے جا رہا ہے، اور جانوروں نے کسی کا کھیت چر لیا، یا کچل دیا، یا اس میں بیٹھ گیا اور بہت سے پودے ضائع ہو گئے، تو اسکو تاوان دینا پڑے گا، البتہ اگر اس نے پیر جھاڑا یا لتّی چلائی یا دم ہلائی اور اس سے کوئی نقصان ہو گیا تو تاوان نہیں ہوگا، کیونکہ یہ حیوان کی فطرت ہے، اس سے کوئی مالک اس کو باز نہیں رکھ سکتا[۳]

سواری کھڑی کر دی اس وقت اس سے جو نقصان ہوگا وہ اس کا ضامن ہوگا، لیکن اگر اس نے اس کو پیشاب کرنے یا لید کرنے کے لیے کھڑا کیا تو وہ ضامن نہیں ہوگا، یا موٹر کو

---

[۱] الضرر الذی نشأ من تلقاء الحیوان لا یضمنه (المجلۃ ص ۱۴۷)

[۲] ومن أرسل بهیمۃ وکان لها سائقاً فاصابت فی فورها یضمنه (هدایۃ ج ۴ ص ۵۹۸) [۳] هدایه ج ۴ ص ۵۹۴

ہوا لینے یا پٹرول یا موبل کے لیے کھڑا کیا تو ضامن نہیں ہوگا۔

۳۔ سواری کے جانوروں کا بھی یہی حکم ہے جو عام جانوروں کا ہے، لیکن اگر راستہ میں کوئی گھوڑے یا اونٹ پر سوار ہو کر جا رہا تھا کسی نے اسے بھڑکا دیا اور وہ بھاگا تو اس صورت میں جتنا نقصان ہوگا اس کا تاوان بھڑکانے والے کے ذمہ ہوگا، سوار پر نہیں ہوگا، اگر بھڑکانے والے کو اس نے لتی ماردی اور وہ مرجائے تو اس کا خوں بہا جانور کے مالک سے نہیں دلایا جائے گا، کیونکہ مقتول نے جانور کو خود چھیڑا تھا[1]

۴۔ اگر کوئی جانور لوگوں کو سینگ مارتا ہے، یا کسی نے کتا پالا وہ کاٹتا ہے، اور لوگوں نے مالک سے کہا کہ تم اپنے جانور یا کتے کو قابو میں رکھو اور اس نے ایسا نہیں کیا تو جانور کے مارنے اور کتے کے کاٹنے سے جو نقصان ہوگا وہ مالک کو دینا ہوگا[2]

اگر دو چرواہے ہیں، ایک جانوروں کے آگے ہے دوسرا ان کے پیچھے سے ہانک رہا ہے تو جو کچھ نقصان ہوگا دونوں سے اس کا تاوان لیا جائے گا[3]

بے جان سواریوں کا حکم

بے جان سواریوں مثلاً سائیکل، موٹر، ریل، ہوائی جہاز وغیرہ کا حکم بھی یہی ہے کہ خواہ قصداً اس سے کوئی مالی نقصان پہونچے یا غفلت کی وجہ سے بغیر قصد کے، اس کا تاوان سواری

---

[1] ومن سار على دابة فى الطريق فضربها رجل ونخسها فنفحت رجلا أوضربته أونفرت فصدمت فقتلته كان ذلك على الناخس دون الراكب (ہدایہ ج۴ ص۵۹۹) [2] ويضمن صاحب الثور النطوح والكلب العقور ما أتلفاه (المجلة ص ۱۴۹) [3] ومن ساق دابة فوقع السرج على رجل فقتله ضمن وكذا على سائر أدواته ومن قاد قطارا فهو ضامن لما أوطأ، فإن وطئ بعير إنسانا ضمن به الدية على العاقلة (هدايه ج ۴ ص ۵۹۷ ۔

.....

کے مالک سے نہیں بلکہ ڈرائیور، کنڈکٹر یا گارڈ سے لیا جائے گا، مثلاً سگنل کے بغیر گاڑی اسٹیشن پر لے آیا اور گاڑی لڑ گئی، یا کار یا بس کو ڈرائیور غلط سائڈ سے لے جا رہا تھا یا جو اسپیڈ مقرر ہے اس سے تیز چلا رہا تھا تو ان صورتوں میں اسی پر مالی نقصان کی ذمہ داری ہوگی، البتہ کوئی دوسرا شخص سواری کے آگے کوئی اینٹا پتھر ڈال دے اور وہ اسے نہ دیکھ سکے اور حادثہ پیش آجائے یا کوئی پیدل آدمی غلط راستہ چل رہا تھا اور اس کو موٹر، سائیکل سے دھکا لگ گیا، یا اچانک سواری کے سامنے کوئی لیٹ جائے تو ایسی صورت میں ڈرائیور یا مالک یا حکومت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اگر موٹر، ریل اتفاق سے لڑ جائے، یا ہوائی جہاز حادثہ کا شکار ہو جائے اور کسی انسان یا بہت سے انسانوں کی جان چلی جائے تو اس جانی نقصان کی ذمہ داری ڈرائیور یا پائلٹ پر نہیں ہوگی بلکہ وہ کمپنی یا حکومت پر ہوگی، اس لیے ایسے اتفاقی حادثات کی دیت (خوں بہا) کی ذمہ داری فقہاء "عاقلہ" پر ڈالتے ہیں، جیسا کہ حاشیہ کی عبارت سے اندازہ ہوگا، ابتدائے اسلام میں اہل دیوان یعنی ایک صنف کے لوگوں کے لیے جو رجسٹر ہوتا تھا وہ سب ایک دوسرے کے عاقلہ تھے، پھر اس کے بعد خاندان اور قبیلہ و برادری وغیرہ پر اس کی ذمہ داری ڈالی گئی، لیکن اب یہ صورت بھی بدل گئی ہے، اب کمپنی، کارخانہ اور حکومت پر یہ ذمہ داری ہونی چاہیے، فقہاء نے اسے قتل خطا پر محمول کیا ہے، کمپنی یا کارخانہ دار یا حکومت، ڈرائیور اور پائلٹ کو سزا تو دے سکتی ہے، لیکن ان پر دیت یعنی خوں بہا کی ذمہ داری نہیں ڈال سکتی، بہرحال یہ نئے مسائل ہیں، ان پر علماء کو مزید غور کرنے کی ضرورت ہے[1]

---

[1] ہدایہ میں دوسری جگہ ہے: وإذا اصطدم فارسان فماتا فعلی عاقلة كل واحد منهما دية الآخر (هدايہ ج ۴ ص ۴۹۵)

وکالت

وکالت کی ضرورت

آدمی کو زندگی میں بے شمار کام ایسے پیش آتے ہیں جنکو وہ خود انجام نہیں دیتا یا نہیں دے پاتا، بلکہ دوسروں سے انجام دلاتا ہے، کسی کام کے انجام دینے یا نہ دے سکنے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، کبھی یہ ہوتا ہے کہ کسی کام کی آدمی کو ضرورت تو ہوتی ہے لیکن اس کام کو پورا کرنے کی خود اس میں اہلیت اور صلاحیت نہیں ہوتی، اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک کام میں مشغول ہوتا ہے اور کوئی دوسرا کام پیش آجاتا ہے اس لیے کسی دوسرے سے مدد لینے پر مجبور ہوتا ہے، یا یہ کہ وہ کام اتنا وسیع اور پھیلا ہوا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے بس کا کام نہیں ہوتا، اس لیے اس میں دوسروں کو شریک کرنا پڑتا ہے، غرض یہ کہ جو کام آدمی خود کرلیتا ہے یا کرسکتا ہے اس کو دوسروں سے بھی کرا سکتا ہے، شریعت میں اس کی اجازت ہے، اور اسی کو وکالت کہتے ہیں۔ ہدایہ ج ۳ ص ۱۶۲

وکالت کے معنی

وکالت کے لفظی معنی نگرانی، حفاظت، چارہ سازی و کارسازی کے ہیں، اسی لیے خدا کی ایک صفت وکیل بھی ہے کیونکہ وہ ہمارے تمام کاموں کا نگراں، محافظ اور کارساز ہے، اسی سے توکیل کا لفظ نکلا ہے جس کے معنی بھی نگراں مقرر کرنا یا کوئی کام کسی کے سپرد کردینا ہیں، وکالت کا لفظ توکیل کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے، یعنی یہ لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔

جو شخص کسی دوسرے کو اپنا کام سپرد کرتا ہے یا ذمہ دار بناتا ہے (۱) اس کو مؤکّل اور جو یہ ذمہ داری قبول کرتا ہے (۲) اس کو وکیل اور جس کام کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے (۳) اس کو موکل بہ کہتے ہیں، مثلاً احمد کو ایک گھڑی خریدنے کی ضرورت ہے، لیکن وہ گھڑی کی اچھائی برائی کو نہیں جانتا، اس لیے وہ خالد سے جو گھڑی کے پُرزوں وغیرہ سے واقف ہے یہ کہتا ہے کہ میرے لیے آپ ایک گھڑی اتنے روپیے میں خرید دیجیے، خالد اس کے لیے

گھڑی خریدنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، تو احمد مؤکّل ہوا اور خالد وکیل، اور گھڑی موکّل بہ ہوئی، اسی طرح ایسے تمام کاموں کے لیے آدمی کسی کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے جس کو وہ خود انجام تو دے سکتا ہے مگر کسی وجہ سے نہیں دے پاتا ہے، مثلاً خرید و فروخت، مضاربت، شرکت، ہبہ، رہن، صلح، اپنے دعوی کی پیروی اور نکاح وغیرہ امور میں وہ اپنا وکیل بنا سکتا ہے، ایک مسلمان غیر مسلم کو وکیل بنا سکتا ہے۔[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بہت سے کاموں کے لیے دوسروں کو وکیل بنایا ہے حضرت عروہ ابن ابوجعد البارقی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک دینار دیا کہ میں ان کے لیے ایک بکری خریدوں، چنانچہ میں نے ایک دینار میں دو بکریاں خریدیں اور پھر ان میں سے ایک بکری ایک دینار میں فروخت کر دی، اور ایک بکری اور ایک دینار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لاکر حاضر کیا تو آپؐ نے میرے لیے دعا فرمائی[2] کہ اگر یہ مٹی بھی خریدیں گے تو اس میں فائدہ ہوگا، اسی طرح آپؐ نے حضرت حکیم بن حزام کو اپنے لیے قربانی کا جانور خریدنے کے لیے فرمایا تھا اور وہ خرید کر لائے[3] اسی طرح ایک بار صدقۂ فطر کا غلّہ کافی جمع ہوگیا تو آپؐ نے حضرت ابوہریرہؓ کو اس کی نگرانی کا کام سپرد کیا[4]

حضرت میمونہ سے آپؐ کا نکاح بھی وکالت کے ذریعہ ہی ہوا تھا، آپؐ اس وقت مدینہ منورہ میں تھے اور حضرت میمونہ بنت حارث مکہ میں تھیں، آپؐ نے مدینہ سے اپنے خادم ابورافع اور ایک انصاری کو بھیجا، انھوں نے ایجاب و قبول کرایا[5]

وکالت کی تعریف اور وکیل کی حیثیت

وکالت کا لفظ عموماً ہماری زبان میں اس پیشہ کے لیے بولا جاتا ہے جس کے ذریعہ حق ناحق، سچ یا جھوٹ جس طریقے سے بھی ہو، کسی کا حق ہو یا نہ ہو اسکو

---

[1] إذا وكّل المسلم حربيًّا في دار الحرب أو دار الإسلام جاز۔
[2] بخاری، ابوداؤد، مسند احمد بحوالہ المنتقی ج ۲ ص ۳۷۷ [3] ترمذی، المنتقی ج ۲ ص ۳۷۷
[4] المنتقی ج ۲ ص ۳۷۶ [5] مؤطا امام مالک، المنتقی ج ۲ ص ۳۷۶۔

دلانے اور قاتلوں اور ڈاکوؤں کو چھڑانے کی کوشش کی جاتی ہے، اور وکیل اس شخص کو کہتے ہیں جو غیر اسلامی قانون کے ذریعہ غیر اسلامی عدالت کے سامنے لوگوں کے جھوٹے سچے مقدمات کی پیروی اور نمائندگی کرتا ہے، جس کی وجہ سے جرائم پیشہ افراد کو شہ ملتی ہے، اور روز بروز اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، لیکن اسلامی شریعت میں وکالت کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع اور بلند ہے، اور وکیل حق و ناحق کی تمیز کے بغیر پیسہ کمانے والے اور جرائم کو شہ دینے والے کو نہیں کہتے، بلکہ اس کی حیثیت اس سے بہت زیادہ وسیع اور بلند ہوتی ہے، اوپر ذکر آ چکا ہے کہ جو جائز ذمہ داری بھی انسان کے سپرد کی جاتی ہے اس کے لیے شریعت میں امانت کا لفظ بولا جاتا ہے، یعنی وہ شخص اس ذمہ داری کو اسی طرح ادا کرے جس طرح ایک امین اپنی امانت کو ادا کرتا ہے، وکالت بھی ایک ذمہ داری ہے اس لیے ضرورت ہے کہ جس کو بھی کسی کام کا وکیل بنایا جائے وہ اس کو اسی طرح پورا کرے جس طرح ایک امین امانت کی ذمہ داری کو پورا کرتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خازن اور امین وہ شخص ہے جو خوشی سے اس کام کو پورا کرے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔[1]

اس بنا پر فقہا نے وکالت کی تعریف یہ کی ہے:

تفویض أحد أمره لآخر	کسی شخص کا کسی کام کو دوسرے کے سپرد
وإقامته مقامه[2]	کر دینا اور اس کو اپنا قائم مقام بنا دینا

ائمہ ثلاثہ بھی قریب قریب ان ہی الفاظ میں اس کی تعریف کرتے ہیں، البتہ اس میں وہ یہ قید لگاتے ہیں کہ یہ موت سے پہلے تک کا معاہدہ ہوتا ہے، تاکہ وصیت اس سے خارج ہو جائے کیونکہ اس کا نفاذ موت کے بعد ہوتا ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۳ ص ۱۶۷)

ظاہر ہے کہ جس طرح تمام معاملات میں آدمی کے لیے خود دو چیزوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے، اسی طرح وکیل بنانے میں بھی ان کا لحاظ ضروری ہے، ایک یہ کہ تراضی ہو، دوسرے یہ کہ

---

[1] المنتقی ج ۲ ص ۳۷۶ [2] شرح المجلۃ، دفعہ ۱۴۴۹ ص ۷۶۹ [3] الإذن والاجازۃ ایضاً توکیل ـ ایضاً ص ۷۷۱۔

معاملہ باطل، حرام اور ناحق نہ ہو، مقصد یہ کہ موکل اور وکیل دونوں ذمہ داری سونپنے اور قبول کرنے کے لیے راضی بھی ہوں، اور یہ رضامندی کسی باطل معاملہ میں نہ ہو، یعنی اگر دونوں کسی غیر اسلامی قانون وعدالت میں اپنا فیصلہ لے جائیں تو اسلامی شریعت اس کو باطل قرار دے گی، اور اگر دونوں اس پر اصرار کریں گے تو ان کو سزا بھی دی جائے گی، کیونکہ باطل میں رضامندی ایک جرم ہے۔

اس تفصیل سے غالباً موجودہ پیشۂ وکالت کی محدود، غلط اور غیر ذمہ دارانہ حیثیت بھی معلوم ہو گئی ہو گی، اور اسلامی شریعت میں اس کا جو وسیع اور ذمہ دارانہ مفہوم ہے وہ بھی اچھی طرح واضح ہو گیا ہو گا۔

اگر کوئی آدمی کسی کو کسی کام کے کرنے کی اجازت دے تو یہ بھی وکالت ہے، اب کام کی اجازت دینے والا موکل اور کام کی ذمہ داری لینے والا وکیل قرار پائے گا۔

وکالت دو قسم کی ہوتی ہے

وکالت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک خاص دوسرے عام، خاص کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے کسی سے کہا کہ آپ اتنے روپئے میں میرے لیے موٹر خرید دیجیے، یا فلاں مقدمہ کی پیروی کر دیجیے، اور عام کا مطلب یہ ہے کہ میرے فلاں کاروبار کی آپ پوری نگرانی کیجیے، یا میرے سارے مقدمات کی پیروی کیجیے، پھر ان دونوں کی دو دو قسمیں ہیں، ایک بااجرت، دوسرے بے اجرت، دونوں کے احکام یکساں ہیں، صرف ایک معاملہ میں بے اجرت وکیل کی ذمہ داری کم ہو جاتی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

بااجرت وکیل میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو اجرت لے کر یا کمیشن پر کوئی کام کرتے ہیں، کسی حکومت کے تمام ملازمین اس کے وکیل ہوتے ہیں، اس لیے ان کو اپنی حکومت کی مرضی کے مطابق کام کرنا چاہیے۔

آپ اپنے ذاتی ملازم سے کوئی کام کرائیں تو یہ آپ کا وکیل سمجھا جائے گا، اسی طرح اگر آپ کمیشن ایجنٹ مقرر کریں تو یہ آپ کا وکیل سمجھا جائے گا، یعنی اس کو آپ کی ہدایت کے مطابق کام کرنا چاہیے۔[1]

---

[1] الإذن والإجازة توكيل أيضاً (شرح المجلة ص ۱۱۷)

پیغام پہونچانے والا وکیل نہیں ہوتا

اگر کوئی شخص نیابۃً کسی کام کو انجام دے تو یہ وکالت ہے، لیکن اگر وہ صرف درمیان کا واسطہ ہے تو اسے رسالت یعنی پیغام پہونچانا کہیں گے، وکالت نہیں کہیں گے، مثلاً کسی نے اپنے خادم سے کہا کہ فلاں چیز بازار سے خرید لاؤ، تو یہ وکالت ہوئی، اور اگر آپ نے کوئی چیز خریدی اور خادم سے کہا جاؤ یہ چیز اٹھا لاؤ تو اسے وکالت نہیں بلکہ رسالت کہیں گے [۱]

وکالت کے ارکان و شرائط

۱۔ دوسرے معاملات کی طرح وکالت میں بھی موکل و وکیل کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ زبانی یا تحریری طور پر دونوں ایجاب وقبول کریں، مثلاً آپ نے کسی سے کہا یا کسی کو لکھا کہ میرا فلاں کام آپ کر دیجیے، اور اس نے کہہ دیا یا لکھ دیا کہ ہاں میں کر دونگا تو ایجاب وقبول ہو گیا، یا اس نے زبانی یا تحریری کوئی جواب آپ کو نہیں دیا، مگر آپ کا کام اس نے کر دیا یا کرنا شروع کر دیا تو اب وہ وکیل ہو گیا، اگر اس نے زبانی یا تحریری طور پر رد کر دیا تو اس کو اس کا حق ہے [۲]

۲۔ ایجاب وقبول کے بعد دوسری شرط یہ ہے کہ وکیل وہ کام موکل کی رائے ومرضی کے مطابق کرے، اگر وہ اپنی رائے سے کوئی کام کرے گا تو اس کی ذمہ داری اس کے اوپر ہوگی مثلاً آپ نے ملازم سے کہا کہ آدھ سیر گوشت لے آؤ، وہ ایک سیر لایا، آپ نے کہا کہ سیب لیتے آؤ اور وہ ناشپاتی لے آیا، یا آپ نے کہا کہ منقی لے آؤ اور وہ کشمش لایا، یا آپ نے کہا ایک تھان چھالٹی لیتے آؤ اور وہ مارکین خرید لایا تو آپ اس کو واپس کر سکتے ہیں، اگر دوکان دار واپس نہ کرے اور آپ بھی اس چیز کو نہ رکھنا چاہیں تو ملازم اس کو اپنے استعمال میں لائے یا بیچ دے، آپ اپنا دام اس سے وصول کر سکتے ہیں، اسی طرح حکومت کے کارکن اور ملازمین اگر حکومت کی ہدایت کے خلاف کوئی کام کریں اور کوئی نقصان ہو تو اس کی ذمہ داری کارکنوں اور ملازموں پر ہوگی، البتہ اگر کسی نے ملازم سے یوں کہا کہ گوشت لیتے آؤ اور

---

[۱] الرسالۃ لیست من قبل الوکالۃ دفعہ ۱۴۵۴ شرح المجلہ ص ۲، [۲] رکن التوکیل

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

وزن نہیں بتایا، یا دس گز کپڑا لیتے آؤ، اور کپڑے کی قسم نہیں بتائی تو وہ جیسا کپڑا یا گوشت لائیگا اس کو لینا پڑے گا۔[1]

۳۔ تیسری شرط یہ ہے کہ موکل اور وکیل دونوں عقل و تمیز رکھتے ہوں، یعنی بالکل ناسمجھ بچّے اور پاگل نہ ہوں، بچّے اور پاگل کا نہ تو وکیل بنانا درست ہے اور نہ وکیل بنانا۔[2]

عقل و سمجھ کا مطلب یہ ہے کہ وکیل وہ کام پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

جو کام آدمی خود کر سکتا ہے اس میں وکیل بنانا صحیح ہے۔[3]

۴۔ وکیل کی حیثیت ایک امین اور نمایندہ کی ہے، اس لیے اس کے لیے ضروری ہے کہ جس کام کے لیے وہ وکیل بنایا گیا ہے اس کام کی نسبت اپنی طرف نہ کرے، بلکہ موکل کی طرف کرے البتہ خرید و فروخت میں یا کسی چیز کے کرایہ پر لینے یا دینے میں یا مزدوروں کے تقرر میں یہ شرط ضروری نہیں ہے، لیکن ہبہ کرنے، عاریت دینے، رہن رکھنے، امانت رکھنے، قرض دینے یا شرکت و مضاربت کرنے میں موکل کی طرف نسبت کرنا ضروری ہے، مثلاً اگر کسی نے کسی کو اپنے تمام کاروباری امور کا وکیل بنا دیا تو اگر وکیل موکل کی کوئی چیز ہبہ کرے یا اس کے لیے ہبہ و ہدیہ قبول کرے، یا اس کے لیے کوئی چیز عاریۃً لے یا دے، یا کسی معاملہ میں شرکت کرے، یا بطور مضاربت موکل کے روپے کسی کو دے، یا اس کے نام سے بطور مضاربت روپیے لے یا اس کے نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح کرے، یا اس کے مقدمہ کی پیروی کرے تو ان تمام صورتوں میں وکیل کو معاملہ کرنے والوں سے واضح کر دینا ضروری ہے کہ میں فلاں کی طرف سے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) ... الإیجاب والقبول وھو أن یقول: وکلتك بھٰذا الأمر، فیقول الوکیل قبلت أو کلامًا آخر یشعر بالقبول و کذلك لم یقل شیئًا، بل شرع فی إجراء ذلك الأمر ایضًا ص ۷۷

[1] لو قال الموکل اشتر لی ارزا فللوکیل ان یشتری من الأرز الذی یباع فی السوق ایًّا کان نوعہ (شرح المجلۃ ص ۹۲، رقعہ ۱۴۷۴)

[2] یشترط ان یکون الوکیل عاقلا ممیزا (ص ۷۵)

[3] یصح ان یؤکل واحد غیرہ فی الأمور التی یجوز لہ ان یباشرھا بنفسہ (ایضًا ص ۷۶)

بحیثیت وکیل کام کر رہا ہوں، لیکن اگر خرید و فروخت یا اجارہ و کرایہ کا وکیل بنایا گیا ہے تو موکل کا نام لیے بغیر بھی وہ خرید و فروخت کر سکتا ہے[1] کوئی چیز کرایہ پر دے یا لے سکتا ہے، اس کا کوئی کام مزدور سے لے سکتا ہے[2] ان دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ جن معاملات میں اس کو اپنی طرف نسبت کرنے کی اجازت ہے اور اس نے وہ کام اپنے نام سے کیا ہے، اس کام سے جتنے مطالبے متعلق ہوں گے اس کا ذمہ دار وہی ہوگا، اور جن معاملات میں اس کو اس کی اجازت نہیں ہے اس میں اُس سے کوئی مطالبہ نہیں ہے بلکہ موکل سے مطالبہ ہوگا، مثلاً آپ کے ملازم نے کوئی چیز ادھار خریدی اور یہ نہیں بتایا کہ وہ کس کے لیے خرید رہا ہے، تو اب دوکان دار اس سے مطالبہ کرے گا موکل سے نہیں کر سکتا، اسی طرح اس نے کوئی چیز ادھار بیچی تو اس کی قیمت کی وصولی بھی اس کے ذمہ ہوگی، البتہ اگر خریدار وہ چیز آپ کو دے جائے تو پھر ملازم سے تقاضا نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اگر ملازم نے یہ کہہ کر کوئی چیز اُدھار خریدی یا بیچی کہ یہ فلاں صاحب کی ہے یا فلاں صاحب کے لیے ہے تو پھر اس کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اس کی حیثیت ایک قاصد اور پیامبر کی ہوگی، جن معاملات کی نسبت اپنی طرف کرنے کی اجازت اس کو نہیں ہے، اگر ان کی نسبت وہ اپنی طرف کرتا ہے تو اس کی وکالت صحیح نہیں ہے، لیکن اگر اس نے اپنی طرف نسبت کر دی تو اسے صحیح تسلیم کر لیا جائیگا، مگر دونوں صورتوں میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ ملکیت موکل ہی کی رہے گی[3] البتہ نسبت نہ کرنے کی

---

[1] یلزم ان یضیف الوکیل العقد إلی موکلہ فی الہبۃ والإعارۃ والرہن والایداع و الاقراض والشرکۃ والمضاربۃ والصلح عن انکار وإن لم یضف الی المؤکل لایصح لایشترط إضافۃ العقد الی الموکل فی البیع والشراء والإجارۃ (المجلۃ ص ۲۳۸)

[2] العقد الذی یعقدہ الوکلاء علی ضربین، کل عقد یضیفہ الوکیل إلی نفسہ کالبیع والإجارۃ، فإن حقوقہ تتعلق بالموکل دون الوکیل، وکل عقد یضیفہ الی الموکل کالنکاح والخلع والصلح عن دم العمد، فان حقوقہ تتعلق بالموکل دون الوکیل (ہدایہ ج ۳، ص ۱۶۴) [3] وعلی کلتا الصورتین لاتثبت الملکیۃ إلا لموکلہ ولکن ان لم یضف العقد إلی الموکل تعود حقوق العقد الی العاقد یعنی الوکیل (المجلۃ ص ۲۳۸)

صورت میں عقد کی ذمہ داری وکیل ہی پر رہے گی، اور جب اس نے موکل کے نام سے وہ کام کر دیا تو تمام مطالبات موکل سے ہوں گے، اس کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، مثلاً اگر کسی نے کسی کا نکاح بحیثیت وکیل کر دیا تو عورت مہر کا مطالبہ وکیل سے نہیں، موکل سے کرے گی، کسی مقدمہ کا فیصلہ اس کے خلاف ہوا تو اس کا جو جرمانہ ہوا یا جو جائداد اور مال ادا کرنا ہوگا وہ سب موکل ادا کرے گا، وکیل سے کوئی مطلب نہیں ہے۔

اسی طرح اگر موکل نے کوئی فوجداری کا جرم کیا ہے تو اس کی سزا بھی موکل ہی کو بھگتنی پڑے گی، مثلاً کسی نے قتل کر دیا تو قتل کے الزام میں اسی کو پھانسی دی جائے گی، یا اس کا خوں بہا اسی کو ادا کرنا پڑے گا، نہ تو وکیل سے مطلب ہوگا اور نہ کسی دوسرے آدمی کو اس کے بدلہ میں سزا دی جا سکتی ہے۔

۵۔ وکیل نے موکل کے لیے کوئی چیز خریدی یا کسی سے اس کا قرض وصول کیا اور اتفاق سے خریدی ہوئی چیز اس کے ہاتھ سے ٹوٹ گئی یا ضائع ہوگئی، یا روپیہ گم ہوگیا تو اگر بے توجہی غفلت یا قصد و ارادہ سے اس نے ضائع نہیں کیا ہے تو اس کا تاوان اس سے نہیں لیا جا سکتا، کیونکہ اس کی حیثیت امین کی ہے، اور امانت کے گم ہو جانے پر تاوان نہیں ہے، وہ چینی کا برتن خرید کر لا رہا تھا اور راستہ میں دھکا لگا اور گر کر ٹوٹ گیا، یا روپیہ تھا، کسی نے جیب کاٹ لی تو اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اگر وہ پٹری پر چلنے کے بجائے بیچ سڑک سے جا رہا تھا، یا اوپر کی جیب ہوتے ہوئے اس نے نیچے کی جیب میں روپیہ رکھ دیا تھا اور کسی نے کاٹ لیا یا نکال لیا تو دونوں صورتوں میں اس پر ذمہ داری ہوگی، کیونکہ اس میں بے قاعدگی اور غفلت پائی گئی ہے، یا اس نے اپنے گھر رکھ لیا اور وہاں وہ ٹوٹ گئی تو اسے اس کی قیمت دینی ہوگی[1]

---

[1] اذا تلف مال المشتری فی ید الوکیل بالشراء او ضاع قضاءً ا یتلف من مال الموکل ولکن لو حبسہ الوکیل لاستیفاء الثمن فہلک کان مضمونا (شرح المجلۃ ص ۴۰۴) ہدایہ ج ۳ ص ۱۶۷۔

۶۔ وکیل کو یہ حق نہیں ہے کہ جس مال کو موکل نے اپنے لیے خریدنے کے لیے کہا ہے اسے وہ خود خرید لے، مثلاً آپ نے اپنے ملازم سے کہا کہ فلاں مال فلاں کے یہاں سے خرید لاؤ، تو اب اس کو یہ حق نہیں ہے کہ اسے اپنے لیے خرید لے[۱] اگر آپ نے اس کی جو قیمت بتائی تھی اس قیمت پر وہ مال نہیں مل رہا تھا تو اس کو حق ہے کہ وہ زیادہ دام پر وہ چیز اپنے لیے خرید لے، لیکن اگر موکل نے قیمت کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا تو پھر اس کو اپنے لیے کسی قیمت پر خریدنے کا حق نہیں ہے[۲]

۷۔ اگر کسی نے بغیر قید کے کسی کو اپنے کسی معاملہ کا وکیل بنا دیا تو وکیل اپنی صواب دید سے جس طرح چاہے معاملہ کرے، مثلاً آپ نے اس سے کہا کہ میں روپیہ دیتا ہوں، تجارت کرو، تو اب وکیل چاہے مال اُدھار خریدے یا ادھار بیچے اس کو اختیار ہے، البتہ اتنی مدت کے لیے ادھار نہ دے جتنی مدت کا تاجروں میں عموماً رواج نہیں ہے[۳] اگر نقد کی قید لگا دی ہے تو اس کے خلاف وہ نہیں کر سکتا۔

اگر ملازم کوئی چیز گراں خرید کر لایا تو اگر تھوڑا فرق ہے تو کوئی حرج نہیں، لیکن اگر زیادہ فرق ہے تو اس کا لینا ضروری نہیں ہے۔

۸۔ اگر کوئی اپنا مقدمہ خواہ دیوانی معاملہ ہو یا فوجداری، اسلامی حکومت کے سامنے

---

[۱] لو وکلہ بشراء شیئ بعینہ لایشتریہ لنفسہ (ھدایہ ج ۳ ص ۱۶۷) کنز الدقائق ص ۳۰۳ [۲] الا ان یکون قد اشتراہ بثمن ازید من الثمن الذی عند الموکل او بغبن فاحش ان لم یکن الموکل قد عین الثمن، فحینئذٍ یکون ذلک المال للوکیل (المجلۃ ص ۲۴۲ دفعہ ۱۴۸۵)۔
[۳] للوکیل المطلق بالبیع أن یبیع مال موکلہ نقدًا أو نسیئۃ لمدۃ معروفۃ بین التجار فی حق ذلک المال ولیس لہ ان یبیعہ بمدۃ طویلۃ مخالفۃ للعرف والعادۃ ان کان قد وکل بالبیع بالنقد صراحۃ اودلالۃ فلیس ان یبیع نسیئۃ (شرح المجلۃ ص ۸۰۸)

پیش کرنا چاہتا ہو اور وہ اصالۃً یعنی خود براہ راست اس کو پیش کرنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو دوسرے کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے، لیکن یہ یاد رہنا چاہیے کہ کسی غیر اسلامی عدالت میں غیر اسلامی قانون کے مطابق حتی الامکان نہ تو اپنا فیصلہ کرانا چاہیے اور نہ غیر اسلامی قانون کی توجیہ کے لیے غیر اسلامی عدالتوں میں کسی مسلمان کو وکیل ہی بننا چاہیے، قرآن پاک میں غیر اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کرانے والے اور کرنے والے اور اس کو پیش کرنے والوں کو ظالم، فاسق بلکہ کافر تک کہا گیا ہے: وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْكَٰفِرُونَ (مائدہ)

(۹) اگر دو یا اس سے زیادہ آدمیوں کو وکیل بنانا ہو تو دونوں کو موجود رہنا چاہیے[۱]

(۱۰) وکیل کو موکل کی مرضی کے بغیر دوسرے کو وکیل بنانے کا حق نہیں ہے، مثلاً آپ نے ملازم سے کوئی چیز منگائی اس نے پیسہ کسی دوسرے کو دے دیا کہ یہ چیز لیتے آنا تو دوسرے کی لائی ہوئی چیز کے بارے میں آپ کو حق ہے کہ آپ اس چیز کو لیں یا واپس کر دیں[۲]

(۱۱) آپ نے جنس یا اور کوئی چیز ملازم یا کسی دوسرے آدمی سے منگائی تو اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے پاس سے وہ چیز چپکے سے آپ کو دے دے، اگر اسی کو دینا ہے تو بتا دے کہ یہ چیز میرے پاس ہے، اگر اجازت ہو تو میں ہی دے دوں[۳]

غیر مسلم کا حکم

کوئی غیر مسلم موکل اگر مسلمان کو وکیل بنائے تو یہ جائز ہے، لیکن مسلمان کے لیے کسی غیر مسلم کو وکیل بنانا صحیح نہیں، یہ حکم کسی تنگ نظری کی بنا پر نہیں بلکہ اس لیے دیا گیا ہے کہ غیر مسلم وکیل اسلامی شریعت کے احکام حرام و حلال سے واقف

---

[۱] وإذا وكل وكيلين فليس لأحدهما أن يتصرف فيما وكلا دون الآخر۔ (فتاوی عالمگیری ج ۳ ص ۶۳۲، شامی ج ۴ ص ۵۶۱) [۲] ليس للوكيل أن يؤكل فيما وكل به إلا أن يأذن له الموكل (قدوری ص ۹۸) [۳] الوكيل بالبيع لا يملك شراءه لنفسه، لان الواحد لا يكون بائعا ومشتريا ولو أمره أن يبيع بنفسه أو يشتري لم يجز (عالمگیری ج ۳ ص ۵۰۹ بحوالہ بہشتی زیور ج ۵ ص ۳۵)

نہیں ہوتا اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ کوئی ناجائز معاملہ کرلے اور مسلمان کو حرام کے ارتکاب میں مبتلا کردے (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۳ ص ۱۷۶)۔

۱۲۔ اگر موکل نے کسی چیز کو بیچنے کے لیے کہا تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ چیز خود خریدے اگر اسے وہ چیز لینا منظور ہو تو وہ پہلے ہی موکل کو بتا دے۔

۱۳۔ بدنی عبادات میں وکالت جائز نہیں، البتہ مالی عبادات میں جائز ہے، مثلاً نماز روزہ میں کوئی دوسرا اس کی طرف سے ادا نہیں کرسکتا، البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے رقم کسی دوسرے کو دی جاسکتی ہے کہ وہ مستحقین تک پہونچا دے، مثلاً مدرسہ میں جو لوگ زکوٰۃ بھیجتے ہیں تو مدرسہ زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل ہوتا ہے، اسی طرح حج میں بھی نیابت جائز ہے۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۲ ص ۱۷۷)۔

۱۴۔ اگر وکیل بغیر اجرت رضاکارانہ کسی کا کوئی کام کررہا ہے تو اس کی اجازت ہے، اگر اس نے کوئی مال اس کا فروخت کیا ہے تو اس کی قیمت کی وصولی کی کوئی ذمہ داری اس پر نہیں ہے، البتہ اگر آسانی سے وہ نہ وصول ہو تو اسے اس کی وصولی کے لیے موکل کی مدد ضرور کرنی چاہیے لیکن اگر وکیل نے اجرت لی ہے، جیسے دلال یا ایجنٹ وغیرہ تو اس پر قیمت کی وصولی ضروری ہے
(شرح المجلۃ ص ۸۱۲ دفعہ ۱۵۰۴)

وکیل کی برطرفی

۱۔ کسی کام کے کرنے سے پہلے یا کرنے کے بعد موکل کو حق ہے کہ وہ جب چاہے وکیل کو وکالت سے علیٰحدہ کردے، مثلاً آپ نے کسی سے کہا کہ میرے لیے ایک تھان کپڑا خرید دو، پھر خریدنے سے پہلے آپ نے منع کردیا تو اب اس کو خریدنے کا حق نہیں ہے، اسی طرح آپ نے کسی سے کہا کہ بحیثیت وکیل میرے لڑکے کا نکاح پڑھا دو، پھر پڑھانے سے پہلے آپ نے منع کردیا تو آپ کو حق ہے، اسی طرح کام سے پہلے وکیل نے معذوری ظاہر کی تو اس کو بھی اس کا حق ہے، لیکن اگر وکیل نے کوئی کام ادھورا کیا ہے تو اگر یہ کام ایسا ہو کہ اس سے کسی کا حق مارا جاتا ہو یا نقصان ہو تو پھر علیٰحدگی کا حق نہیں ہے، لیکن اگر کوئی حق وابستہ نہ ہو یا کسی کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو پھر وکیل کے علیٰحدہ ہوجانے یا موکل کے علیٰحدہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[1]

---

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۲۔ وکیل کی علیحدگی کی اطلاع اس کو خواہ زبانی دی جائے یا آدمی کے ذریعہ یا تحریر کے ذریعہ تمام صورتیں صحیح ہیں، مثلاً موکل نے وکیل کو کسی آدمی کے ذریعہ یا تحریر کے ذریعہ علیحدہ کرنے کی اطلاع دے دی، یا وکیل نے زبانی نہیں کہا آدمی کے ذریعہ یا تحریر کے ذریعہ موکل کو اپنی معذوری کی اطلاع دی تو یہ بھی صحیح ہے، یعنی وکالت سے علیحدگی ہو جائے گی[۱]۔

وقف

وقف کے لفظی معنی روک لینے اور خاص کرنے کے ہیں، اور شریعت میں اپنی کوئی چیز یا اس کا فائدہ رفاہ عام کے لیے خاص کر دینے کو وقف کہتے ہیں، جس طرح صدقہ کر دینے سے ایک چیز آپ کی ملکیت سے نکل کر دوسرے کی ملکیت میں چلی جاتی ہے اور آپ کو اس کا ثواب بھی ملتا ہے، اسی طرح کسی چیز کو رفاہ عام کے لیے وقف کر دینے میں بھی وہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے، اور اگر اس نے ثواب کی نیت سے اچھے کام کے لیے اس کو وقف کیا ہے تو اس چیز سے جب تک لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں گے صدقہ سے بھی زیادہ ثواب اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا رہے گا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "موت کے بعد انسان کے تمام اعمال اس سے منقطع ہو جاتے ہیں، مگر اس کے تین اعمال ایسے ہیں جن کا ثواب اس کو برابر ملتا رہے گا۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) للموكل أن يعزل وكيله عن الوكالة ولكن إن تعلق به حق الغير فليس له عزله۔ [۱] كذلك للوكيل أن يعزل نفسه من الوكالة، ولكن لو تعلق به حق الغير يكون مجبورا بالغاية (شرح المجلة ص ۸۲۲ ـ ۸۲۳ دفعه ۱۵۲۱)

إلّا من ثلاثة، صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له	صدقۂ جاریہ اور علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں اور نیک و صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔

(مسلم، ابوداؤد، المنتقی ج ص ۴۳۷)

صدقۂ جاریہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی کوئی چیز وقف کر دے جس سے ہر کس و ناکس مادی فائدہ اٹھاتا رہے، یا اس کے ذریعہ کوئی نیک کام انجام پا رہا ہو تو جب تک لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں گے اور وہ نیک کام انجام پاتا رہے گا اس کو اس کا ثواب ملتا رہے گا، اور علم سے فائدہ اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے کوئی کتاب اسی جذبہ سے لکھ دی یا کوئی کتاب رفاہ عام کے لیے وقف کر دی، یا کچھ طلبہ کو علم دین پڑھا دیا تو جب تک اس کتاب اور طلبہ سے فائدہ پہونچتا رہے گا آپ کو ثواب ملتا رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں میٹھے پانی کی بڑی کمی تھی، اور جس حصہ میں آپؐ اور مہاجرین آباد تھے اس میں صرف ایک کنواں بئر رومہ تھا جو ایک شخص خاص کی ملکیت تھا اور اس کا پانی وہ قیمت لے کر دیتا تھا، آپؐ نے اس سے کہا کہ اس کو تم رفاہ عام کے لیے وقف کر دو، خدا اس کا بدلہ تمھیں جنت میں دے گا، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے اور میرے اہل و عیال کی پرورش کے لیے اس کے علاوہ کوئی سامان نہیں ہے، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو خرید کر عامۃ المسلمین کے لیے وقف کر دے خدا اس کا بدلہ اس کو جنت میں دیگا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جب منشائے نبویؐ کی اطلاع ملی تو انھوں نے ۳۵ ہزار درہم دے کر اس کے مالک سے کنواں خرید لیا، اور آپ کی خدمت میں آکر یہ خوشخبری سنائی تو آپؐ نے فرمایا کہ جعلتها للمسلمین (میں نے اس کو عام مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا) امام بغوی نے بشر بن بشر الاسلمی سے یہ پوری روایت نقل کی ہے۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے خیبر میں اپنا جو حصہ پایا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا کہ مجھے یہ زمین بہت پسند ہے، میرا ارادہ ہے کہ میں اسے صدقہ کر دوں، آپ جیسا ارشاد

ارشاد فرمائیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو کسی ایک آدمی کو صدقہ کر دینے کے بجائے اس کو اپنے قبضہ میں رکھو اور اس کا پھل غرباء، مساکین اور حاجتمندوں کے لیے مخصوص کر دو، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، اور یہ اعلان کر دیا کہ اب نہ تو یہ باغ بیچا جا سکتا ہے نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے، نہ اسے کوئی وراثت میں پا سکتا ہے، یعنی آپؐ نے اس کی نگرانی کی ذمہ داری حضرت عمرؓ ہی پر ڈالی، لیکن اس کا فائدہ رفاہ عام کے لیے مخصوص کرا دیا،

(المنتقی ج ۲ ص ۴۳۸)

ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص ایک گھوڑا خدا کی راہ میں ایمان واحتساب کے ساتھ وقف کر دے تو اس کا کھانا پینا اس کا بول وبراز ہر چیز اس کے حق میں نیکی ہے۔

(بخاری، مسند احمد)

جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (آل عمران)	تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک کہ اس چیز کو خدا کے لیے خرچ نہ کرو جو تم کو محبوب ہے

تو حضرت ابو طلحہ انصاریؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ مجھے بیرحا[1] کی زمین سب سے زیادہ پسند ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے فی سبیل اللہ وقف کر دوں آپؐ نے فرمایا کہ اس کے بجائے تمھارے خاندان میں جو لوگ نادار ہیں ان کے لیے اس کو وقف کر دو، چنانچہ حسانؓ بن ثابت، ابیؓ بن کعب اور بعض دوسرے غریب اہل خاندان کیلئے انھوں نے وہ زمین وقف کر دی (بخاری ومسلم، المنتقی ج ۲ ص ۴۴۱)

شیخ ابن قدامہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں لکھتے ہیں: لم یکن من أصحاب النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم ذو القدرة إلا وقف[2]

ان ارشادات نبویؐ سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

---

[1] ایک مقام کا نام ہے۔ [2] المغنی ج ۵ ص ۵۹۸ - ۵۹۹ -

(۱) انفرادی طور پر دو چار دس روپے سے جو کسی کی مدد کی جاتی ہے اس کا ثواب بھی ہوتا ہے مگر محدود ہوتا ہے، لیکن رفاہ عام کا کوئی ایسا کام کرنا جس کا فائدہ دو چار افراد کو نہیں بلکہ بے شمار افراد کو پہونچتا ہے اس کا ثواب اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک وہ چیز قائم رہتی ہے، مثلاً کسی نے مدرسہ قائم کر دیا، کتب خانہ کھول دیا، تو جب تک لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے اس کو ثواب پہونچتا رہے گا، لیکن اس ثواب کے حاصل کرنے کے لیے دو[۲] شرطیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ خالص رضائے الٰہی کے لیے ایسا کیا جائے، دل میں نام و نمود اور شہرت کی خواہش نہ چھپی ہوئی ہو، اگر یہ چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں تو اور بات ہے، دوسرے یہ کہ موقوفہ چیز مفید اور فائدہ بخش بھی ہو، فائدہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی اس سے کوئی اپنی ناگزیر مادی، دنیاوی یا کوئی علمی و اخلاقی ضرورت پوری کرے، یعنی وہ چیز آدمیوں کے اخلاق و کردار کو بنانے کے بجائے بگاڑنے کا سبب نہ ہو، اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں گی تو وہ موقوفہ چیز جب تک رہے گی ثواب کے بجائے عذاب کا اضافہ اس کے نامۂ اعمال میں ہوتا رہے گا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کوئی اچھا طریقہ رائج کر جائے گا تو جو لوگ اس پر چلیں گے اس کا ثواب اس کو ملتا رہے گا، اور جو لوگ کوئی بری راہ دکھا جائیں گے ان کی گردن پر ان لوگوں کا عذاب بھی ڈال دیا جائے گا جو اس پر چلیں گے، مثلاً آپ نے مسجد کے بجائے مندر بنا دیا، مدرسہ کے بجائے سینما ہاؤس، فحش کتابوں کی لائبریری بنا کر اس کو وقف کر دیا، آپ نے بچے کو صحیح تعلیم دینے کے بجائے مشرکانہ و ملحدانہ تعلیم دے دی تو ان تمام صورتوں میں جتنا عذاب مندر میں پوجا کرنے والوں کو، سینما دیکھنے والوں کو اور بچے کے مشرکانہ و ملحدانہ خیال سے اس کو پہونچے گا، اسی کے بقدر عذاب آپ کی گردن پر بھی ہوگا۔

۲۔ ان ارشادات سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آدمی جو چیز صدقہ کرے یا وقف کرے وہ ردی یا گھٹیا نہ ہو، بلکہ وہ چیز ہونی چاہیے جس سے اسے دلی لگاؤ اور محبت ہو، اگر آپ کے پاس کئی مکان ہیں اور آپ ایک مکان وقف کرنا چاہتے ہیں یا کئی زمینیں ہیں اور ان میں سے ایک کو آپ وقف کرنا چاہتے ہیں تو وہ مکان اور زمین وقف کیجیے جو

سب سے اچھی اور آپ کو پسند ہو، البتہ اگر آپ کے پاس ایک ہی مکان ہے تو وہ اچھا ہو یا بُرا آپ اسے وقف کر سکتے ہیں، اور اس کا ثواب وہی ملے گا جو اچھے اور محبوب کا ملتا۔

اسی طرح اگر آپ کے ایک ہی بچہ ہے اور آپ کو اس سے شدید محبت ہے، تو آپ کی دینداری اور آپ کے اسلامی احساس کا تقاضا ہے کہ آپ اس کو غیر دینی اور غلط تعلیم میں لگانے کے بجائے خالص دینی تعلیم میں لگائیں، ایسے ہی بچے کی دعاء اور اس کا ہر عمل آپ کے لیے صدقۂ جاریہ ہوگا، ورنہ اگر آپ نے غلط تعلیم و تربیت دے کر اس کو بگاڑنے کی پوری کوشش کی اور اتفاق سے وہ اچھا بن گیا تو اسکے نیک اعمال کا ثواب آپ کو نہیں ملے گا۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ جو چیز آپ وقف کریں، اس کی حفاظت و نگرانی کا کام ایسے لوگوں کے سپرد کر جائیں جو اس کا فائدہ ہڑپ کرنے کے بجائے رفاہِ عام میں خرچ کریں، اس میں دو باتیں دیکھنے کی ہیں، ایک یہ کہ جو شخص اس کی نگرانی کا خواہاں ہو اس کو یہ امانت نہ سونپی جائے، دوسرے یہ کہ وہ شخص فاسق نہ ہو، یعنی احکام اسلامی کا پابند ہو، اگر کسی میں یہ دونوں باتیں یا ایک بات بھی پائی جائے گی تو پھر اس کو اس کا متولی بنانا صحیح نہ ہوگا۔

وقف کی تعریف

امام ابوحنیفہؒ وقف کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

هو حبس العين على ملك الواقف والتصدق بالمنفعة كالعارية.	کسی جائز مال کو اپنی ملکیت باقی رکھتے ہوئے اس کے فائدہ کو صدقہ کر دینا جیسے عاریت ہے۔

اور صاحبین اور دوسرے ائمہ اس کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

هو حبس العين على ملك الله. (شرح وقاية ج ۴ ص ۴۰۶)	کسی جائز مال کو اپنی ملکیت سے نکال کر خدا کے لیے وقف کر دینا یعنی ملکیت اور اس کا فائدہ دونوں رفاہ عام کیلئے وقف کر دینا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ موقوفہ چیز اس کی ملکیت سے دو طرح سے نکل سکتی ہے، ایک یہ کہ حکومت اسے اس کی ملکیت سے نکال لینے کا حکم دے دے یا پھر اس کی موت کے بعد وہ چیز اس کی ملکیت سے نکل جائے گی جیسے وصیت میں ہوتا ہے اور صاحبین اور ائمۂ ثلٰثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمدؒ بن حنبل کہتے ہیں کہ مذکورہ دونوں شرطوں کے بغیر اس کے وقف کرتے ہی اس کی ملکیت سے وہ چیز نکل کر وقفِ باری تعالیٰ ہو جاتی ہے، اور اگر اس نے کسی شخص کو وقف کیا ہے تو وہ اس کی ملکیت میں چلی جائے گی (الافصاح ج ۲ ص ۵۲، المغنی ج ۵ ص ۵۹۸)

امام ابو یوسف، امام محمد اور دوسرے ائمہ کی رایوں میں تھوڑا سا فرق ہے، امام ابو یوسف یہ کہتے ہیں کہ مسجد بن گئی تو اب وہ وقف ہوگئی، امام محمد کہتے ہیں کہ وقف اس وقت مکمل ہوگا جب اس میں نماز باجماعت ہونے لگے، یا اگر دوسری کوئی چیز ہے تو واقف اس کا کسی کو متولی بھی بنا دے۔

وقف کا حکم

۱۔ جب آدمی نے اپنی زبان سے کہہ دیا کہ فلاں چیز میں نے وقف کر دی تو اب وقف ہوگئی، یا اس نے کوئی زمین قبرستان کے لیے دے دی اور اس میں کوئی مردہ دفن کر دیا گیا تو یہ زمین وقف ہوگئی یا مسجد بنا دی تو زبان سے کہے یا نہ کہے وہ مسجد وقف ہوگئی۔[1]

وقف دو طرح کا ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ آدمی اس کو خدا کے لیے وقف کر دے، اور اس کے بعد اس سے خود کوئی فائدہ نہ اٹھائے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ یہ شرط لگا دے کہ میں اپنی زندگی بھر اس سے فائدہ اٹھاؤں گا، یا میرے بعد میری اولاد اس کے کچھ حصہ سے فائدہ اٹھائے گی، اور بقیہ رفاہ عام کے لیے ہوگا، تو دونوں صورتوں میں موقوف چیز پر اب واقف کا کوئی حق نہیں رہتا، بلکہ اب یہ اللہ تعالیٰ کی ہوگی، نہ اب وہ اس کو

---

[1] اذا استسقی الناس من السقایة وسکنوا الخان والرباط ودفنوا فی المقبرة زال الملك (هدایة ج ۲ ص ۶۲۶)

بیچ سکتا ہے، اور نہ ہبہ کرسکتا ہے، نہ رہن کرسکتا ہے، اور نہ وراثت میں اس کی ملکیت کسی کو مل سکتی ہے، البتہ اگر اپنے یا اپنی اولاد کے لیے اس سے فائدہ اٹھانے کی قید لگا دی ہے تو اس کے بقدر وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اسی طرح اگر وقف کرنے کے بعد وہ خود متولی ہو جائے تو یہ جائز ہے[1]

ضروری مسائل

١۔ اگر وقف کی چیز خراب ہو رہی ہو تو اس کے متولی کا فرض ہے کہ وہ اس کو درست کرائے، اگر اس کی آمدنی میں اتنی گنجائش نہ ہو، یا وہ ایسی چیز ہو جس سے کوئی آمدنی نہ ہوتی ہو تو پھر اگر اسلامی حکومت نہ ہو تو عام مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس کو درست کرائیں۔

٢۔ اگر کسی نے مسجد بنا دی تو اب اس کی کوئی چیز مثلاً اینٹ گارا، چٹائی، لوٹا، مسجد بنانے والا یا کوئی اور اپنے ذاتی استعمال میں نہیں لا سکتا، اگر اس کی کوئی چیز بیکار ہو گئی یا سڑ گل گئی تو اس کو بیچ کر پھر مسجد کے کام میں لگا دینا چاہیے۔

٣۔ اگر کسی نے مسجد بنوائی یا مدرسہ بنوا کر وقف کر دیا مگر مسجد کے دروازے سے ہٹ کر یا مدرسہ کے بغل میں کچھ دکانیں اس خیال سے بنوا دیں کہ اس کے کرایے سے وہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی پرورش کرلے گا تو یہ جائز ہے، ان دکانوں کو مسجد یا موقوفہ مدرسہ کے قریب یا ان کے نیچے ہونے کی وجہ سے وقف نہیں سمجھا جائے گا[2] لیکن مسجد بن جانے یا قبرستان میں مردہ دفن ہو جانے کے بعد مسجد کو یا قبرستان کو وقف کرنے والا نہ ہبہ کرسکتا ہے اور نہ بیچ سکتا ہے۔

٤۔ امام ابو یوسف رحؒ مسجد کے نیچے ذاتی مکان بنانے اور اوپر مسجد بنانے یا اوپر مکان بنانے اور نیچے مسجد بنانے کے قائل ہیں اور امام محمدؒ اوپر مکان بنانے اور نیچے مسجد بنانے کے قائل نہیں ہیں لیکن بعد میں انھوں نے جب رَی میں مکانوں کی تنگی کا مشاہدہ کیا تو انھوں نے بھی مسجد کے اوپر مکان بنانے کی اجازت دیدی، اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ بڑے بڑے شہروں میں لگایا جا سکتا ہے[3]

---

[1] وجعل غلة الوقف أو الولاية لنفسه (شرح وقایہ ج ٢ ص ٤٠٩) [2] كما إذا بنى خانا أو سقاية أو جعل أرضه مقبرة وشرط أن ينزله أو يشرب منه أو يدفن فيه هذا اجائز، من جعل مسجدا تحته سرداب أو فوقه بيت وجعل باب المسجد إلى الطريق وعزله عن الملك فله أن يبيعه وأن مات يورث عنه (ہدایہ ج ٢ ص ٦٢٣-٦٢٤) [3] ایضاً ص ٦٢٤۔

القسمۃ والمہایاۃ

(اشیاء اور منافع کی تقسیم)

جب کوئی منقولہ یا غیر منقولہ جائز چیز مثلاً مکان، زمین یا جانور، غلّہ سامان وغیرہ دو آدمیوں میں مشترک ہو اور اس کو آپس میں تقسیم کر لینے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ کس طرح تقسیم کی جائے کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو، اسی کو شریعت میں القسمۃ اور مقاسمۃ کہتے ہیں، اور اگر تقسیم کسی جائز مال اور ٹھوس چیزوں کی (یعنی اعیان) کی نہ ہو، بلکہ چیزوں کی منفعت یعنی فائدہ کو تقسیم کرنا ہو تو اس کو مہایاۃ اور تہایؤ کہتے ہیں[1]، مثلاً ایک کمرہ دو آدمیوں میں مشترک ہے، یہ دونوں آدمی یہ طے کریں کہ ایک ماہ ایک آدمی اس میں رہے گا، دوسرے ماہ دوسرا رہے گا، یا ایک ٹیوب وِل دو آدمیوں نے لگوایا، اب آپس میں طے کر لیا دو گھنٹے آپ پانی لیں گے، اور دو گھنٹے ہم یا کم و بیش، تقسیم خواہ متعیّن اشیاء کی ہو یا منافع کی سنّتِ نبوی اجماع امت سے یہ ثابت ہے، اسی اصول کے تحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت اور مال فیے وغیرہ تقسیم فرمایا، اسی اصولِ قسمۃ کے تحت وراثت تقسیم ہوتی ہے، ایک بار حضرت زبیر اور ایک انصاری میں آبپاشی کے بارے میں اختلاف ہوا تو آپ نے فرمایا کہ

---

[1] فقہاء کہتے ہیں کہ قیاساً اس کو صحیح نہ ہونا چاہئے اس لئے کہ منفعت کا منفعت سے تبادلہ صحیح نہیں ہے، لیکن قرآن پاک میں حضرت صالح کی اونٹنی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ لَهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَعْلُومٍ اس لئے استحساناً اسے صحیح قرار دیا گیا ہے۔

زبیر اپنا باغ سینچ لیں، پھر انصاری کو اس کا موقع دیں۔ (بخاری)

قسمہ اور مقاسمہ کی تعریف

قسمۃ اور مقاسمۃ کے لفظی معنی ہیں کسی چیز یا حصہ کو تقسیم کرنا، الگ الگ کرنا اور شریعت میں اس کے معنی یہ ہیں۔

عبارۃ عن افراز بعض الانصباء عن بعض ومبادلۃ بعض عن بعض۔ (بدائع الصنائع ج۷، ص۱۷)	قسمۃ نام ہے کسی مشترک چیز میں حصہ داروں کے حصہ کو علیحدہ کرنے یا کسی مشترک چیز کو ایک دوسرے سے بدل لینے کا۔

تقسیم کا حق

مشترک چیز کی تقسیم یا تو آپس کی رضامندی سے ہوتی ہے یا پھر حکومت کے ذریعہ۔ (بدائع الصنائع ج، ص۱۹)

تقسیم کی قسمیں

تقسیم دو طرح سے ہوتی ہے، ایک جبری، دوسرے رضامندی سے، جبری تقسیم حکومت کے ذریعہ ہوتی ہے، پھر ان دونوں کی دو قسمیں ہیں، ایک تقسیم تفریق دوسرے تقسیم جمع۔

تقسیم تفریق

تقسیم تفریق کی کئی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ جو چیز تقسیم کی جارہی ہے، اس کی تقسیم سے کسی فریق کا نقصان نہیں ہے بلکہ تمام شرکاء کا فائدہ ہے، جیسے ناپ کر یا وزن کر کے یا گن کر دینے والی چیزیں ہیں، تو اس کی جبری تقسیم بھی جائز ہے اور رضامندی سے بھی اب تول کر بکنے والی چیز تول کر اور ناپ کر بکنے والی چیز ناپ کر اور گن کر بکنے والی چیز گن کر تقسیم کی جائے گی، زمین، مکان وغیرہ کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس کی تقسیم میں نقصان کا پہلو ہے، تو اگر دونوں کے لئے نقصان دہ ہے تو اس میں جبری تقسیم نہیں ہو سکتی، یعنی حکومت اس میں مداخلت کا حق نہیں رکھتی، اس لئے کہ حکومت کو نقصان پہونچانے کا حق نہیں ہے، البتہ اگر دونوں فریق اپنی رضامندی سے نقصان پر راضی ہو جائیں تو پھر جائز ہے، مثلاً ایک ہیرہ یا موتی ہو، یا ایک کپڑا ہو یا ایک کنواں ہو، ایک ٹیوب ول ہو، ایک مشین ہو تو اس کو حکومت جبراً تقسیم نہیں کرا سکتی،

البتہ دونوں رضامندی سے تقسیم کریں، یا ایک فریق معاوضہ لے کر دوسرے کے حق میں دست بردار ہو جائے تو جائز ہے، البتہ اگر ایک کے لئے نقصان دہ ہو، مثلاً ایک گھر مشترک ہو، اور اس میں ایک کا حصّہ زیادہ ہو اور دوسرے کا بہت کم ہو تو جس کا حصہ زیادہ ہے، وہ اگر تقسیم کا مطالبہ کرے گا تو تقسیم کر دیا جائے گا، اس لئے کہ کم حصّہ والے کے حصّہ سے اس مکان سے فائدہ اٹھانے میں اس کو رُکاوٹ پیدا ہو رہی ہے، البتہ یہ مطالبہ اگر کم حصہ والا کرے، اور زیادہ حصّہ والا نہ چاہے تو بعض فقہاء جبری تقسیم کو جائز کہتے ہیں اور صاحب قدوری کہتے ہیں کہ اس کی جبری تقسیم نہیں ہونی چاہیئے، اس لئے کہ اس میں اس کا نقصان ہے، اور حکومت نقصان کی صورت میں جبر نہیں کر سکتی، البتہ رضامندی سے ہر طرح کی تقسیم ہو سکتی ہے، اسی طرح راستہ اگر ایک ہی ہے، تو راستہ تقسیم نہیں ہو سکتا، البتہ دوسرے فریق کو دوسرا راستہ بنانے کی شکل ہے تو پھر جائز ہے [۱]

تقسیم جمع تقسیم جمع کا مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں میں یکسانیت ہوتی ہے یا وہ ایک جنس کی ہیں، ان میں سب کے حصہ کو اس مخصوص چیز میں جمع کر کے تقسیم کریں گے، یعنی ان میں سے ہر فرد کی علیحدہ علیحدہ تقسیم نہیں ہوگی، مثلاً بہت سی گائیں، بکریاں، اور ایک ہی قسم کے بہت سے کپڑے ہیں، ایک ہی قسم کا اناج ہے، تو ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے، مگر اس فرق کا کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا، بلکہ مجموعی حیثیت سے ان کی تقسیم ہوگی، لیکن اگر بکریاں اور گائیں دونوں ہوں تو ان کی تقسیم الگ الگ ہوگی، اس لئے یہ دو جنس کی ہیں، جن چیزوں میں معمولی فرق ہوتا ہے، جیسے گھی، تیل، انڈے، گیہوں، سونا، چاندی، لوہا، پیتل وغیرہ تو ان کی تقسیم کے وقت اگر ایک شریک موجود نہ ہو، جب بھی تقسیم ہو جائے گی، اور اگر ان میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہو تو ان کی تقسیم کے وقت ہر فریق کا موجود ہونا ضروری ہے، جیسے زمین، مکان وغیرہ۔ (فتاوی عالمگیری ج ۵ ص ۲۰۶)

---

[۱] اوپر گذرنے کا حق عنوان کے تحت تفصیل آچکی ہے، وہاں المجلہ کا حوالہ دیا گیا تھا، یہاں یہ تفصیل بدائع الصنائع ج، سے لی گئی ہے۔

مکان وزمین کی تقسیم

زمین اور مکان کی مختلف طریقہ سے تقسیم ہوگی۔ (۱) اگر زمین زرعی ہے، خواہ کھیت ہو یا مکان کا صحن ہو تو وہ گز فٹ یا جریب سے ناپ کر تقسیم کی جائے گی، لیکن اگر زمین میں مکان یا درخت ہوں تو پھر قیمت لگا کر اس کی تقسیم ہوگی۔[1]

اگر زمین کچھ اچھی اور کچھ خراب ہو تو دونوں طرح کی زمینوں کو ملا جلا کر تقسیم کی جائے گی، مثلاً ایک کو دس گز اور دوسرے کو بیس گز یا اس کے برعکس ظاہری طور پر گو مساوات نہیں ہے مگر معنوی طور پر یہ تقسیم درست ہے۔[2]

(۲) اگر کسی مکان کی تقسیم میں ایک حصہ کی قیمت زیادہ ہو تو اگر خالی زمین دے کر یا کسی اور طریقہ سے ان کے حصے برابر کئے جاسکیں تو کر دیئے جائیں گے، ورنہ پھر زیادہ حصہ والے سے اتنی قیمت کم حصہ والے کو[3] دلائی جائے گی۔

(۳) اگر دو منزلہ مکان تقسیم ہو تو دونوں کی قیمت لگا کر پھر تقسیم ہوگی، اس لئے کہ نیچے والے کو جو سہولت حاصل ہوگی، وہ اوپر والے کو نہیں ہوگی، اس لئے نیچے کی قیمت زیادہ رکھی

---

[1] شرح المجلہ ص۶۳۵ حیث کانت العرصۃ والاراضی من المزدعیات فتقسم بالذراع واما ما علیہا من الاثمار والابنیۃ فتقسم بتقدیر القیمۃ۔

[2] وان جرایبھا متفاوتۃ فی الجودۃ والرداءۃ فاقتسما علی ان یکون لاحدھما ھذہ العشرۃ والآخر عشرون فھذہ القسمۃ جائزۃ ویکتفی فیہا المعادلۃ من حیث المعنی۔ شرح المجلہ بحوالہ حامدیہ من ذخیرۃ العقبیٰ ص۶۳۵۔ اس سلسلہ میں ائمہ ثلثہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کی رایوں میں تھوڑا سا اختلاف ہے، ان تینوں رایوں کو سامنے رکھ کر المجلہ کے مرتبین نے یہ رائے دی ہے۔

[3] مہایاۃ عقد غیر لازم ہے، اگر کوئی ایک شریک کسی متعین (عین) چیز کی تقسیم کا مطالبہ کرے تو آپس میں جو فائدہ اٹھانے یعنی مہایاۃ کا معاہدہ ہوا تھا، حکومت اسے فسخ کر دے گی اور اسے تقسیم کر دے گی، اس لئے کہ عین میں اصل قسمت ہے۔ قسمۃ العین کالاصل بدائع الصنائع ج، ص۳۲۔

جائے گی [1]

(۴) اگر راستہ یا نابدان کے اوپر کا حصہ مشترک ہے تو اگر ایک فریق اس کی تقسیم کا مطالبہ کرے تو دیکھا جائے گا کہ تقسیم کے بعد دونوں کے لئے راستہ اور پانی نکلنے کے لئے نابدان کی جگہ ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو تقسیم کر دیا جائے گا، ورنہ حکومت ایسی تقسیم کو روک دے گی۔

(۵) ایسی تمام چیزیں جن کی تقسیم میں توڑ پھوڑ یا ٹکڑے ٹکرے کرنے کی ضرورت ہو، اس کی تقسیم نہیں ہوگی، اس لئے کہ اس میں دونوں کا نقصان ہے، مثلاً ایک موٹر ہے، ایک سائیکل ہے، ایک مشین ہے، یا ایک جانور ہے تو ان کی جبری تقسیم نہیں ہوگی، یعنی حکومت تقسیم نہیں کرے گی، البتہ اپنی رضامندی سے اس کی قیمت لے کر یا کسی اور طریقے سے یا نقصان اٹھا کر تقسیم کریں تو وہ کر سکتے ہیں، وہ اپنے نقصان کے ذمہ دار ہیں، حکومت حتی الامکان نقصان سے بچائے گی۔

(۶) اگر ایک شخص کو مکان ملا اور دوسرے کو خالی زمین تو وہ اپنی خالی زمین میں جو چاہے بنائے اور جتنے دروازے، کھڑکیاں چاہے لگائے اور جتنا اونچا مکان چاہے بنائے، دوسرے حصہ دار کو روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

(۷) اگر زمین کے اندر درخت ہیں، تو بغیر تصریح کے وہ اس حصہ دار کے ہوں گے جس میں وہ پڑے ہیں۔

مہایاۃ اوپر ذکر آچکا ہے کہ انتفاع یعنی فائدہ اٹھانے کو مہایاۃ کہتے ہیں، یعنی جس چیز کے تقسیم کرنے میں دونوں کا نقصان ہے، تو اس چیز کو باقی رکھ کر اس سے تمام شرکاء فائدہ اٹھاتے رہیں۔

مہایاۃ کی تعریف

المهاياة عبارة عن قسمة المنافع (المجلہ ۱۱۷۴)	مہایاۃ کہتے ہیں، کسی مشترکہ چیز سے باری باری فائدہ اٹھانے کو۔

---

[1] الفرق بينها وبين القسمة ان فى القسمة تجمع المنافع فى زمان واحد وفى المهاياة تجمع على التعاقب۔ (مجمع الانہر بحوالہ شرح المجلہ ص۶۴۸ دفعہ ۱۱۷۴)۔

مہایاۃ دو قسم سے ہوتا ہے، ایک جگہ (مکان) کے اعتبار سے، دوسرے مدّت (زمان) کے لحاظ سے، مثلاً دو منزلہ مکان ہے، ایک نے کہا کہ ہم نیچے رہیں گے، اور دوسرے نے کہا کہ ہم اوپر رہیں گے، زمان کی مثال آگے آرہی ہے۔

تقسیم اور مہایاۃ میں فرق یہ ہے کہ تقسیم میں ایک ہی زمانہ میں شرکا، فائدہ اٹھاتے ہیں، اور مہایاۃ میں یکے بعد دیگرے، مثلاً ایک کمرہ ہے جس میں بیک وقت دونوں تنہا، یا بال بچوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے تو آپس میں اس طرح تقسیم کر سکتے ہیں کہ ایک ماہ یا ایک سال ایک شریک رہے، اور دوسرے ماہ یا دوسرے سال دوسرا، ایک موٹر ہے، یا ایک گھوڑا ہے یا ایک مشین ہے، ایک ٹیوب ول ہے، تو اگر وہ آپس میں رضامندی سے توڑ پھوڑ کر تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو کر سکتے ہیں، لیکن چونکہ اس میں دونوں کا نقصان ہے اس لئے اس کی تلافی کے لئے مہایاۃ کا طریقہ شریعت نے مقرر کر دیا ہے کہ اس چیز کو باقی رکھتے ہوئے دونوں یکے بعد دیگرے اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ (بدائع الصنائع ج، ص۳۲)

(۱) اگر کوئی شریک غائب تھا، اور مشترکہ کمرہ میں دوسرا بغیر اجازت شریک رہنے لگا، تو دوسرا شریک جب آئے گا تو اسے بھی اتنی مدت رہنے کا حق ہوگا، یا سواری یا مشین کے استعمال کا حق ہوگا، جس مدت میں دوسرا شریک رہ رہا تھا، اس مدت میں کوئی نقصان ہوگا تو اس کا تاوان اس کو دینا پڑے گا[1]

(۲) اگر مکان تقسیم ہو گیا ہے، اور خالی پڑا ہے تو ایک شریک کو دوسرے کی غیر موجودگی میں اس کے حصہ میں رہنے کا حق نہیں ہے، البتہ اگر اس کے خالی رہنے کی وجہ سے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر حکومت اسے کرایہ پر دے گی، اور اس کا کرایہ غیر موجود کو دے دے گی[2]

(۳) مہایاۃ پر عمل کسی ایک شریک کے مطالبہ کے بعد ہی ہوگا[3]

---

[1] شرح المجلہ ص۶۰۶۔

[2] شرح المجلہ ص۶۰۶، اس سے اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں کے وسیع دائرہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

[3] المهاياة تعتبر وتجری بعد الخصومة، شرح المجلہ ص۶۰۶۔

(۴) اگر کوئی ایک شریک موجود نہیں ہے، اور دوسرا شریک مشترک چیز استعمال کر رہا ہے اور اس کے استعمال سے کوئی نقصان نہیں ہے تو اس کا استعمال غیر موجود کی طرف سے دلالۃً اجازت سمجھا جائے گا[1]

(۵) مشترک مکان ہے یا سواری اور مشین ہے، اور ابھی آپس میں تقسیم کا معاملہ نہیں ہوا ہے، تو اپنے حصّہ کے بقدر وہ استعمال کر سکتا ہے۔

(۶) اگر مشترک زمین ہے، اور ایک شریک غائب ہے تو دوسرے فریق کو حق ہے کہ اس پوری زمین میں کھیتی کر لے، بشرطیکہ وہ کھیتی زمین کے لئے مفید ہو، اب دوسرا شریک آنے کے بعد اتنی مدت تک تنہا اس میں فصل بونے کا حق دار ہوگا، لیکن اگر پہلے شریک کی کھیتی سے زمین کو نقصان کا اندیشہ ہو تو دوسرے شریک کے حصّہ کی زمین کو بے کار چھوڑ دینا بہتر ہے جیسے بعض چیزوں کو بونے کے لئے کچھ دن کھیت خالی چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ اچھی فصل ہو[2]

(۷) زمین کی تقسیم میں درخت جو جس کے حصّہ میں ہوں گے، وہ اس کے ہوں گے، لیکن پھل اور جو کھیتی لگی ہے، وہ مشترک سمجھی جائے گی، البتہ اگر صراحۃً یہ کہہ دیا اور لکھ دیا ہو کہ پھل اور کھیتی جس کے حصّہ میں پڑے گی وہ اس کی ہوگی، تو پھر وہ اس کی ہوگی[3]

خیار جس طرح بیع و شراء میں خیار شرط، خیار عیب اور خیار رؤیت کی آسانی و اجازت دی گئی ہے، اسی طرح مختلف اجناس کی تقسیم میں بھی یہ اجازت ہے، اگر کوئی چیز ایک ہی قسم کی ہو تو پھر یہ اجازت نہیں ہے، مثلاً اگر گیہوں اور جَو دو آدمیوں میں بانٹا گیا ہے۔ یا بکریاں اور گائیں تقسیم کی گئی ہیں، یا کار اور ٹرک کی تقسیم ہوئی ہے تو جس کو

---

[1] شرح المجلہ ص۶۰۴۔

[2] واذا علم ان ترکها بدون زرع نافع لها و مود الی قوتها وان زراعتها توجب نقصانها۔ (شرح المجلہ ص۶۰۷)۔

[3] الزرع والفاکهة لا یدخلان فی قسمة الارض والضیعة الا بصریح الذکر بل یبقیان مشترکین کما کانا سواء (ایضاً ص۶۶۲)

گیہوں کے مقابلہ میں جو ملا ہے، یا کار کے مقابلہ میں ٹرک ملا ہے، وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں دو چار دن غور کر لوں تو فیصلہ کروں گا، اسی طرح ایک فریق نے اس چیز کو جو اسکے حصّہ میں آئی ہے، دیکھا نہیں تو دیکھنے کے بعد اسے قبول کرنے یا رَد کر دینے کا اختیار ہوگا[1]، اسی طرح اس چیز میں اس کو قدیم عیب یعنی تقسیم سے پہلے کا کوئی عیب نظر آیا، تو اسے قبول کرنے اور رد کر دینے کا اختیار ہوگا۔

ہم جنس چیزوں میں خیار نہیں ہے

لیکن اگر یہ چیزیں ہم جنس ہیں تو خیار شرط اور خیار رویت کا اختیار نہیں ہے، البتہ خیار عیب حاصل ہوگا، مثلاً ہیرو سائیکل، امبیسڈر کار، یا بہت سی گائیں یا بیل اسی طرح دوسری ہم جنس چیزیں آپس میں تقسیم کی جائیں تو ان میں خیار شرط اور خیار رویت حاصل نہیں ہے البتہ اگر کوئی تقسیم کے بعد کوئی عیب دکھائی دے تو اسے قبول کرنے اور رَد کر دینے کا اختیار ہے[2] یعنی خیار عیب حاصل ہوگا۔

---

[1] کما یثبت خیار الشرط وخیار الرویۃ وخیار العیب فی البیع یثبت ایضاً فی تقسیم الاجناس المختلفۃ الجنس۔ (شرح المجلہ ص۶۳۸)

[2] خیار الشرط والرویۃ لا یثبت فی قسمۃ المثلیات المتحدۃ الجنس وانما یثبت فیھا خیار العیب۔ (شرح المجلہ ص۶۳۹)

وراثت و وصیّت

اوپر ذکر آچکا ہے کہ مال و جائیداد یا کسی اور چیز پر آدمی کی ملکیت تین طریقے سے قائم ہوتی ہے، ایک خرید و فروخت و تبادلۂ اشیاء کے ذریعہ، دوسرے ذاتی محنت و مشقت کے ذریعہ، اور تیسرے وصیت و وراثت کے ذریعہ۔

خرید و فروخت، تبادلۂ اشیاء، اور ذاتی محنت و اجرت سے جو دولت آدمی حاصل کرتا ہے، اس کے حاصل کرنے اور پھر انصاف کے ساتھ اس کے تقسیم کرنے کا ذکر آچکا ہے اب اس دولت کی تقسیم کے طریقے کی تفصیل کی جارہی ہے، جو آدمی اپنے کسی مورث سے وراثت، یا وصیت کے ذریعہ حاصل کرتا ہے، اس کے احکام کے جاننے کو علم الفرائض کہتے ہیں۔

وراثت و وصیت کے سلسلہ میں قرآن پاک کی حسب ذیل آیتیں اور احادیث نبویہ ہماری رہنمائی کرتی ہیں:۔

۱۔ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ	اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے باب میں، لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر ہے اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں گی تو دو سے زائد ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا، اس مال کا جو مورث چھوڑ کر مرا ہے، اور اگر ایک ہی

اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ
وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ
الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ
السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
يُّوْصِيْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ، اٰبَآؤُكُمْ
وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ
اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً
مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔

(النساء)

لڑکی ہو تو اس کو نصف ملے گا اور ماں باپ
کے لئے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لئے
میت کے حصہ میں چھٹا چھٹا حصہ ہے اگر میت
کے کچھ اولاد ہوں، اور اگر اس میت کے
کچھ اولاد نہ ہوں اور اس کے ماں باپ
ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا
ایک تہائی حصہ ہے، اور اگر میت کے ایک
یا ایک سے زائد بہن یا بھائی ہوں تو اس
کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا (اور باقی باپ کو)
اس وصیت کا حصہ نکال لینے کے بعد میت جس کی وصیت کر جائے یا قرض ادا کرنے کے بعد تمہارے اصول
و فروع جو ہیں تم پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ ان میں کون شخص تم کو نفع پہونچانے میں
نزدیک تر ہے، یہ حکم من جانب اللہ مقرر کر دیا گیا ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا علم و حکمت
والا ہے۔

۲- وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ
اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ
لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ
مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ
اَوْ دَيْنٍ ...... وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا
تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ
فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ
مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ وَاِنْ كَانَ
رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ

اور تم کو آدھا ملے گا اس ترکہ کا جو تمہاری
بیبیاں چھوڑ جائیں اگر ان کے کچھ اولاد
نہ ہوں، اگر ان بیبیوں کے کچھ اولاد ہوں
تو تم کو ان کے ترکہ سے چوتھائی حصہ ملے گا،
وصیت نکالنے کے بعد کہ وہ اس کی وصیت
کر جائیں یا دین کے بعد اور بیبیوں کو
چوتھائی حصہ ملے گا اس ترکہ کا جو تم چھوڑ
جاؤ، اگر تمہارے کچھ اولاد نہ ہو اور اگر
تمہارے اولاد ہو تو تمہارے ترکہ سے
آٹھواں حصہ ملے گا، وصیت نکال لینے کے

وَلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ۔

(النساء ۱۱-۱۲)

بعد جو تم وصیت کر جاؤ یا دین کے بعد۔ اور اگر کوئی میت جس کی میراث دوسروں کو ملے گی (خواہ وہ میت مرد یا عورت) ایسی ہو جس کے نہ اصول ہوں نہ فروع اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر یہ لوگ اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب تہائی میں شریک ہوں گے، وصیت نکال لینے کے بعد جس کی وصیت کر دی جائے یا دین کے بعد۔ بشرطیکہ کسی کو ضرر نہ پہونچائے، یہ حکم کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے اور حلیم ہیں۔

۳۔ يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (النساء)

لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اللہ تم کو کلالہ کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے جس کے اولاد نہ ہو (نہ ماں باپ) اور اس کے ایک عینی یا علاتی بہن ہو، تو اس کو تمام ترکہ کا نصف ملے گا اور وہ شخص اپنی بہن کا وارث ہو گا اور اگر وہ بہن مر جائے اور اس کے اولاد نہ ہو، (اور والدین بھی نہ ہوں) اور اگر بہنیں دو ہوں (یا زیادہ) تو ان کو اس کے کل ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا، اور اگر چند وارث بھائی بہن ہوں مرد اور عورت تو ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہو گا، اللہ تعالیٰ تم سے (دین کی باتیں) اس لئے بیان کرتا ہے کہ تم گمراہی میں نہ پڑو، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

قرآن پاک کا یہ معجزہ ہے کہ ان چند آیات کے اندر وراثت اور وصیت کے پورے نظام کو پرو دیا ہے، دنیا کا بڑا سے بڑا زبان دان اور فصاحت و بلاغت کا ماہر بھی اس طرح دریا کو کوزے میں بند نہیں کر سکتا، قرآن پاک کے یہ آیات بھی کلام الٰہی ہونے کا بیّن ثبوت ہیں، ان آیات کی اہمیت کے بارے میں علّامہ قرطبی لکھتے ہیں :-

۱- هذه الآيات ركن من اركان الدين وعمدة من عمد الأحكام وأم من امهات الآيات فان علم الفرائض عظيمة القدر حتى يقال انها نصف العلم وقد قال النبي صلى الله عليه وسلم تعلموا القرآن وعلموه الناس وتعلموا الفرائض وعلموها الناس فاني امرأ مقبوض وان هذا العلم سيقبض وتظهر الفتن حتى يختلف الاثنان في الفريضة فلا يجدان من يفصل بينهما۔

یہ آیات علم الفرائض کے احکام کی بنیاد ہیں اور ان میں فرائض کے سارے گوشے کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ علم فرائض ایسا عظیم الشان علم ہے کہ اسے نصف علم کہا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قرآن سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، اور علم فرائض کو سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ اس لئے کہ میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا تو یہ علم مٹ جائے گا اور ہر طرح کے فتنے ظاہر ہوں گے، یہاں تک کہ میراث کے سلسلہ میں دو آدمی کے درمیان اختلاف ہو جائے گا، مگر وہ ایسا آدمی نہیں پائیں گے جو ان کے درمیان فیصلہ کر دے۔

پھر لکھتے ہیں :-

۲- واذا ثبت هذا فاعلم ان الفرائض كان جل علم الصحابة وعظيم مناظرتهم ولكن الناس قد ضيعوه۔

(تفسیر القرطبی ج ۵ ص ۵۶)

اور جب یہ ثابت ہو گیا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ فرائض کا علم صحابہ کے علوم میں سے ہے اور جن علوم پر ان کی نگاہ ہوتی تھی، ان میں سب سے زیادہ توجہ کا یہ مرکز رہا ہے لیکن بعد کے لوگوں نے اسے ضائع کر دیا ہے۔

ان آیات کی وضاحت ذیل کی احادیث سے بھی ہوتی ہے :-

۱۔ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلموا الفرائض وعلموھا فانہ نصف العلم وھو ینسی وھو اول شئ ینزع من امتی۔ (ابن ماجہ، دار قطنی)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرائض کو سیکھو اور سکھلاؤ اس لئے کہ یہ نصف علم ہے اور یہ بھلا دیا جائے اور یہ پہلی شئے ہے جو میری امت سے اٹھالی جائے گی۔

۲۔ وعن عبد اللہ بن عمرو ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال العلم ثلاثۃ وما سوی ذٰلک فضل (۱) اٰیۃ محکمۃ (۲) وسنۃ قائمۃ (۳) وفریضۃ عادلۃ۔ (مشکوٰۃ)

عبد اللہ بن عمرو سے مروی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم کی تین قسمیں ہیں، (۱) آیت محکمہ (۲) سنت قائمہ (۳) فریضہ عادلہ یعنی وراثت کی منصفانہ تقسیم۔ ان کے علاوہ تطوع اور فضیلت کی چیزیں ہیں۔

۳۔ عن الاحوص عن ابی مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلموا الفرائض وعلموھا الناس فانی امرؤ مقبوض والعلم مرفوع ویوشک ان یختلف اثنان فی الفریضۃ والمسألۃ فلا یجدان احدًا یخبرھما۔ (مشکوٰۃ)

احوص ابن مسعود سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ علم فرائض سیکھو، اور لوگوں کو سکھاؤ۔ اس لئے کہ میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں اور علم اٹھالیا جائے گا۔ وہ وقت قریب ہے کہ لوگ فرائض و مسائل میں اختلاف کریں گے اور وہ کسی کو نہیں پائیں گے، جو ان کو فیصلہ کن بات بتادے۔

اوپر قرآن کی جو آیات نقل کی گئی ہیں ان میں ورثہ کی قسموں اور ان کے حصوں کی پوری تفصیل ہے۔ مگر مجملاً دوسری آیات میں بھی وراثت کے احکام کا ذکر ہے۔ مثلاً حسب ذیل آیتیں اس سلسلہ میں ہماری مزید رہنمائی کرتی ہیں مگر ان آیات کو آیت توریث کی روشنی

ئیں دیکھنا چاہیئے۔ گویا یہ آیات مجمل ہیں اور آیت وراثت مفصل ہے:۔

۱۔ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ۔

اور جو لوگ رشتہ دار ہیں کتاب اللہ میں ایک دوسرے کی (میراث) کے زیادہ حقدار ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

۲۔ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا وَكَانَ ذٰلِكَ فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا۔

اور رشتہ دار کتاب اللہ کے مطابق ایک دوسرے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ بہ نسبت دوسرے مومنین و مہاجرین کے۔ مگر تم اپنے دوستوں سے کچھ اچھا سلوک کرنا چاہو تو وہ جائز ہے یہ بات لوح محفوظ میں لکھی جا چکی تھی۔

(الأطفال)

۳۔ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا۔

(نساء)

مردوں کے لئے بھی حصہ ہے اس چیز میں جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لئے بھی حصّہ ہے اس چیز میں جس کو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر حصہ قطعی ہے۔

ان ہی آیات اور احادیث کی روشنی میں فقہائے کرام نے فرائض کے سارے احکام مستنبط کئے ہیں اور انہی کی روشنی میں اس موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف ہوئی ہیں جن میں علامہ سراج الدین بن محمود حنفی سجاوندی کی کتاب "السراجی" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ جس کی بے شمار شرحیں لکھی گئی ہیں جو ابتدائے تصنیف سے اب تک عرب و ہند کے عربی مدارس کے نصاب کا ہمیشہ جزو بنی رہی ہے۔

اوپر قرآن کی جو آیتیں نقل کی گئی ہیں ان میں حسب ذیل ورثہ اور قرض و وصیّت کا ذکر ہے۔ (۱) لڑکے، لڑکیاں (۲) ماں باپ (۳) بیوی (۴) شوہر (۵) بھائی بہن (۶) قرض

(۷) وصیّت۔ قرآن پاک میں پہلے وصیّت کا ذکر ہے پھر قرض کا۔ مگر پہلے قرض کی ادائیگی کی جائے گی، پھر وصیّت کا نفاذ ہوگا، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یہی تھا، حضرت علی سے روایت ہے کہ:۔

انکم لتقرؤن ھذہ الآیۃ من بعد وصیۃ توصون بھا أو دین و ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضی بالدین قبل الوصیۃ۔ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

تم لوگ یہ آیت تلاوت کرتے ہو جس میں پہلے وصیت کا پھر قرض کا ذکر ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یہ تھا کہ آپ پہلے قرض کے ادا کرنے کا حکم دیتے تھے پھر وصیت کا۔

اس کی وجہ فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ دین کی ادائیگی مرنے والے کے ذمہ زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی واجب ہے۔ اور دائن یعنی جس کا قرض ہے، اس کو مطالبہ کا حق ہے، اب مدیون مرگیا تو اس کے ورثہ پر اس کی ادائیگی واجب ہے۔ بر خلاف اس کے وصیت ایک تبرع ہے، اس میں کسی کو وصی کی زندگی میں مطالبہ کا حق نہیں ہے۔

اس بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے کہ اگر دین حقوق اللہ سے متعلق ہے تو وہ ادا کیا جائے یا نہیں، امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ اس کی موت کے بعد یہ ساقط ہو گئے، اس کے ترکہ سے ادا کرنے کی ضرورت نہیں، مگر دوسرے ائمہ اس کی ادائیگی کے بھی قائل ہیں۔ مثلاً اس کے ذمہ زکوٰۃ باقی تھی یا روزہ کا کفّارہ باقی تھا تو امام ابو حنیفہؒ کے یہاں موت کے بعد یہ ساقط ہو گئے اور دوسرے ائمہ کے یہاں ترکہ سے ادا کئے جائیں گے۔

کلالہ کلالہ وہ شخص ہے جس کے اصول و فروع میں کوئی زندہ نہ ہو۔ مثلاً اصول میں ماں باپ یا ان کے اوپر اور فروع میں لڑکا لڑکی یا ان کے نیچے کے لوگ موجود نہ ہوں۔

کلالہ کے سلسلہ میں سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا ذکر سورۃ نساء کی دو آیتوں میں ہے۔ پہلی آیت میں اخیافی بھائی بہنوں کا ذکر ہے، یعنی وہ سوتیلے بھائی بہن جن کی ماں ایک ہو، اور باپ دو، یعنی پہلے شوہر کی طلاق یا موت کے بعد دوسرے سے نکاح کرلے، اور دوسری آیت میں علاتی اور عینی بھائی بہنوں کا ذکر ہے، اخیافی بھائی بہنوں کا ذکر اس آیت میں ہے:۔

وَاِنْ کَانَ رَجُلٌ یُّوْرَثُ کَلٰلَۃً

ایسا مورث خواہ عورت ہو یا مرد جس کے

أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ۔ (نساء)

اصول و فروع میں کوئی نہ ہو، یا ایک بھائی یا ایک بہن زندہ ہو تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اگر ایک سے زیادہ ہوں تو یہ سب تہائی حصّہ میں برابر کے شریک ہوں گے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

ولہ أخ او اخت من أم[1] (تفسیر قرطبی، روح المعانی وغیرہ)

یعنی انھوں نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ بھائی بہن ہیں جو ماں میں شریک ہیں یعنی اخیافی بھائی بہن۔

اخیافی بھائی بہن کا تعلق ماں کی نسبت سے ہوتا ہے، اس لئے ماں کا جو حصہ ہے، وہ ان کا بھی ہے۔ البتہ ورثہ میں صرف اخیافی بھائی بہن ایسے ہیں جن میں حصّہ کی تقسیم برابر ہوگی، یعنی مرد کو دو حصّہ اور عورت کو ایک حصہ نہیں ملے گا، بلکہ دونوں برابر میراث تقسیم کریں گے، قرآن کے اشارۃ النص سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

ایک سوال

یہاں ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر جگہ مرد کو دوہرا حصّہ اور عورت کو اکہرا حصہ ملتا ہے، پھر یہاں مساوی حصّہ کیسے ملا؟ تو اس میں بات یہ ہے کہ اخیافی بھائی بہن کا حصّہ ماں کی نسبت سے ہے۔ اور ماں کبھی عصبہ نہیں ہوتی۔ یعنی مقررہ حصّہ سے وہ کبھی زیادہ نہیں پاتی، بلکہ وہ ہمیشہ ذوی الفروض ہی رہتی ہے۔ اور اخیافی بھائی بہن اس کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ مرد کو دوہرا حصّہ اور عورت کو اکہرا حصّہ عصبات میں دیا جاتا ہے۔ ذوی الفروض میں ضروری نہیں، جیسے ماں باپ ذوی الفروض میں ہیں اور دونوں کو برابر حصّہ ملتا ہے

۶۔ علّتی یعنی حقیقی اور علاتی بھائی بہن

علاتی بھائی بہن وہ ہوتے ہیں، جن کی مائیں دو ہوں اور باپ ایک۔ علّتی بھائی

---

[1] بعض حضرات اسے ان کی قرآت کہتے ہیں، مگر یہ تفسیر ہے اسی طرح اکثر جگہ تفسیر کو قرآت کہہ دیا جاتا ہے۔

بہن کی موجودگی میں علاتی بھائی بہن محروم ہوتے ہیں۔ مثلاً احمد کا انتقال ہوا، اس کے نہ کوئی اولاد ہے اور نہ ماں باپ، اس کا ایک عینی یعنی حقیقی بھائی اور ایک بہن زندہ ہے، اور اس کے دو علاتی بھائی بہن بھی زندہ ہیں تو عینی یعنی حقیقی بھائی بہن کو پوری جائداد مل جائے گی اور علاتی بھائی بہن محروم رہیں گے۔ ان سب کے حصّہ کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

ذوی الفروض کی تعداد

ذوی الفروض کی کل تعداد ۱۳ ہے، ذوی الفروض وہ لوگ ہیں جن کا حصہ شریعت نے مقرر کر دیا ہے، مگر ان میں سے ہر ایک کو بیک وقت حصہ نہیں ملے گا، بلکہ ان میں بہت سے ورثہ ایسے ہیں جن کو دوسرے وارث کی غیر موجودگی میں حصہ ملے گا، ورنہ محروم رہیں گے۔ مثلاً باپ زندہ ہو تو پوتے پوتیوں کو حصہ نہیں ملے گا، بیٹا موجود ہو تو بیٹی اس کے ساتھ عصبہ ہو جائے گی، حقیقی بہن موجود ہوگی تو علاتی بہن کو کچھ نہیں ملے گا، ان کے حصوں کی تفصیل آگے آرہی ہے،

قرآن کی جو آیات اور احادیث و اقوال صحابہ اوپر نقل کئے گئے ہیں ان سے وراثت، اور وصیت کی اہمیت ذہن نشین ہو گئی ہوگی اور چند ورثہ کا ذکر بھی آگیا ہے، اور ساتھ ہی کلالہ کی وراثت کا مسئلہ ذرا اہم تھا، اس لئے ابتدا ہی میں اس کا ذکر کر دیا گیا ہے، آگے اس کے حصّوں کی تفصیل آتے گی۔

قرآن پاک میں عموماً بیشتر احکام کا ذکر اجمالاً ہوتا ہے اور اس کی تفصیل حدیث نبوی ؐ سے ہوتی ہے مگر وراثت اور وصیت کی تقسیم میں عموماً ناانصافی ہوتی ہے۔ اس لئے وراثت کے احکام کے ہر گوشے کی قرآن سے تفصیل کر دی ہے۔ مگر وراثت اور وصیت کے احکام کی تفصیل سے پہلے انفرادی ملکیت اور تقسیم دولت کے اسلامی تصور کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے، اوپر بیع و شرا، تبادلۂ اشیاء، اور اجرت و محنت کے بیان میں بھی، اس کا ذکر آچکا ہے مگر یہاں اس کے بعض مزید پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

اسلام میں انفرادی ملکیت کے حدود

ایک آدمی تبادلۂ اشیاء کے ذریعے جتنی دولت چاہے پیدا کرے، اپنی محنت و مشقت سے جتنی دولت چاہے کمائے، اس کو وراثت، وصیت کے ذریعہ جس قدر دولت بھی ملجائے

اس پر اسلامی شریعت اس کی ملکیت تسلیم کرتی ہے، اور اس کی حاصل کی ہوئی دولت میں اسوقت تک کوئی مداخلت نہیں کرتی، جب تک اس کے ذریعے دوسرے بندگانِ خدا کی حق تلفی یا ایذا رسانی ثابت نہ ہو جائے، یا وہ ان ذرائع سے حاصل کی گئی یا کی جا رہی ہو، جن کو اسلامی شریعت نے مستقلاً حرام قرار دیا ہے۔ یا پھر حلال ذریعے سے کمائی ہوئی دولت کو کمانے والا اسراف اور فضول خرچی میں نہ اڑا رہا ہو، ان میں سے کوئی بات بھی پائی جائے گی تو اسلامی شریعت حق ملکیت کے استعمال میں مداخلت بھی کر سکتی ہے، اور بعض ناگزیر صورتوں میں اس کو حق ملکیت سے محروم بھی کر سکتی ہے، جیسا کہ الحجر کے بیان میں ذکر آچکا ہے۔ مگر اسلامی شریعت بغیر ان وجوہ کے کسی انسان کی ملکیت میں مداخلت نہیں کرتی، خواہ وہ انسان اسلامی شریعت کا ماننے والا ہو یعنی مسلمان ہو، یا اس کا منکر یعنی غیر مسلم ہو، وہ نہ تو کمیونزم کے اس موہوم اور غیر فطری نظریے کو تسلیم کرتی ہے کہ دولت کی نابرابری کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تقسیم دولت اور ذرائع پر حکومت کا مکمل کنٹرول ہو، اور نہ وہ موجودہ دور کی بے اخلاق جمہوریت کی طرح انفرادی ملکیت کو آزاد و بے لگام چھوڑ دیتی ہے، اور اس کی گردش اور تقسیم کا کوئی پائیدار انتظام نہیں کرتی، اس کی راہ دونوں کے درمیان میں ہے، وہ ایک طرف دولت کے کمانے کے سلسلہ میں کچھ اخلاقی اور قانونی ہدایتیں دیتی ہے، تو دوسری طرف دولت کی تقسیم کے لئے کچھ پائدار اخلاقی اور قانونی احکام اور اصول دیتی ہے، تاکہ آدمی نہ تو شتر بے مہار کی طرح دولت کمانے میں دیوانہ ہو جائے، اور نہ کمانے کے بعد اس کے اوپر وہ سانپ بن کر بیٹھ جائے، یا اپنی کمائی دولت کو پانی کی طرح بہا ڈالے۔

تقسیم دولت اس سلسلہ میں سب سے پہلے اسلامی شریعت یہ بات ہر انسان کے ذہن نشین کرتی ہے کہ دنیا میں کسی زمانے میں نہ ذرائع رزق کی کمی رہی ہے، اور نہ مستقل معاشی بدحالی کسی کی قسمت میں لکھی ہوئی ہے، بلکہ جو بات ہر زمانے میں پائی جاتی رہی ہے وہ تقسیم دولت میں بے انصافی ہے، اسی بے انصافی کی وجہ سے کسی بھی ملک کی اکثریت کے لئے تو ذرائع رزق کی کمی اور معاشی آسودگی خواب نظر آتی ہے، اور کچھ لوگ دن رات دادِ عیش دیتے رہتے ہیں۔ اگر یہ بے انصافی نہ ہو تو پروردگارِ عالم کا خوان یغما ہر جاندار کے لئے عام ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (ہود) — زمین کے ہر جان دار کا رزق خدا کے ذمے ہے۔

ادیم زمیں سفرۂ عام اوست — بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

یعنی اس نے ایسے ذرائع رزق اور سامانِ زندگی فراہم کر دیئے ہیں کہ ہر شخص چل پھر کر اپنی روزی حاصل کر سکتا ہے، اور اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکتا ہے، لیکن تقسیم دولت میں زیادہ سے زیادہ انصاف اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے، جب لوگ ان حدود و ضوابط کو اچھی طرح جانیں، جن پر اس کی صحیح اور منصفانہ تقسیم کا مدار ہے، اسی وجہ سے قرآن و حدیث میں اس کا مفصل حکم آیا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس کی تاکید کی ہے، اوپر قرآن کی آیات اور احادیث نبوی کا ذکر آچکا ہے۔

اوپر یہ حدیث نبوی آچکی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ علم تین باتوں کے جاننے کا نام ہے، یا تو آدمی قرآن کی واضح آیات کو سیکھے یا ثابت شدہ سنّتوں کا علم حاصل کرے، یا منصفانہ تقسیم دولت کا علم رکھتا ہو۔ (ابو داؤد)

دولت کی تقسیم میں ناانصافی سے بچنے ہی کے لئے آپ نے وصیت پر پابندی عائد کی۔ آپ نے مورثوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے ان ورثہ کے لئے وصیت نہ کریں جو اس کے ترکے سے حصہ پانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اپنا یہ حق استعمال کرنا ہی ہے، تو غیر وارث کے لئے استعمال کرنا چاہیئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ تو دوہرا تہرا حصہ پا جائیں، اور کچھ بالکل محروم رہ جائیں، پھر آپ نے وصیت کرنے پر یہ پابندی عائد کی کہ ایک ثلث یعنی ۱/۳ سے زیادہ مال و جائداد کی وصیت نہ کی جائے، تاکہ قریبی لوگوں کا حق بالکل مارا نہ جائے۔ مقصد یہ ہے کہ تقسیم دولت میں ضرورت کا خیال ضرور کیا جائے گا، مگر ضرورت کو حق تلفی کا سبب نہ بننے دینا چاہیئے۔ اس حق تلفی ہی سے بچانے کے لئے کسی باپ کو یہ حق نہیں دیا گیا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنی زندگی میں وراثت سے محروم کر کے عاق کر دے، اگر وہ کرے گا، جب بھی بیٹے کو اس کا ترکہ ملے گا، اس کے محروم کرنے سے وہ محروم نہیں ہو سکتا، اس کی نافرمانی اور نالائقی کی وجہ سے اس کے حق سے اس کو محروم نہیں کیا جا سکتا۔

عورت کا حصہ کم کیوں ہے؟

وراثت کے ذریعہ تقسیم دولت کا جو اصول اسلامی شریعت نے دیا ہے، اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ عورت کو مرد کا آدھا حصہ ملے گا۔[1] ایسا کیوں ہے، اس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے معاشرتی نظام اور اس کے حقوق کا مکمل مطالعہ کیا جائے، جب تک اس کو اچھی طرح سمجھ نہ لیا جائے گا، اس طریقے کی خوبی واضح نہ ہوگی، اس سلسلہ میں یہاں چند باتیں ذہن نشین کر لینی ضروری ہیں،

(۱) اسلامی شریعت میں عورت اپنی معاشی ضروریات کی طرف سے بے نیاز رکھی گئی ہے اس کی ذمہ داری یا تو باپ پر ہوگی یا دوسرے قریبی اعزہ پر یا شوہر پر اسکی تفصیل نفقات کے بیان میں آچکی ہے۔

(۲) دوسرے اس کے بچوں کی اور اعزہ واقارب کی کفالت کی اصل ذمہ داری مرد کے اوپر رکھی گئی ہے اور بعض حالات کے علاوہ عام طور پر عورت کو اس سے آزاد رکھا گیا ہے۔

(۳) اسی طرح شوہر عورت کو مہر دیتا ہے، اس کے علاوہ رہنے کی جگہ دیتا ہے اسکے کھانے پینے، اور علاج ومعالجہ کے انتظام کی ساری ذمہ داری شوہر کے اوپر ہے۔

(۴) بچوں کی معاشی کفالت کے ساتھ ان کی تعلیم وتربیت کا سارا خرچ برداشت کرنا بھی اسلامی شریعت نے مرد کے اوپر ڈالا ہے، ظاہر ہے ان وجوہ کی بنا پر اگر اسلامی شریعت اسے دوہرا حصہ نہ دیتی تو اس پر ایک ظلم ہوتا اور اسلامی شریعت نہ تو مرد کے اوپر کسی طرح کے ظلم کو برداشت کرتی ہے، اور نہ عورت کے اوپر کسی زیادتی کو پسند کرتی ہے بمقصد یہ ہے کہ مرد کو اگر دوہرا حصہ ملتا ہے تو اس کی معاشی ذمہ داری بھی عورت کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہے۔ اور عورت کو جو کچھ ملتا ہے اس میں اس کی ذات کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اس پر نہ بچوں کا خرچ ہے اور نہ اپنا خرچ، زیادہ سے زیادہ اپنا صدقہ اور زکوٰۃ ادا کرے، یا اپنے آرام وآسائش پر خرچ کرے۔ گویا اس کو جو کچھ ملتا ہے وہ ذمہ داری کے بوجھ سے خالی ہوتا ہے،

---

[1] اس میں بعض اسباب کی بنا پر صرف اخیافی بھائی بہن اس سے مستثنیٰ ہیں۔

فرائض وراثت کی تقسیم یا موت کے بعد ملکیت کی تقسیم کے جو احکام دیئے گئے ہیں۔ ان کو شریعت میں فرائض کہا جاتا ہے۔ فرائض کے لفظی معنی ہیں وہ احکام جو ضروری اور مقرر ہوں، یعنی اس کے قواعد عام انسانوں کی مرضی پر نہیں چھوڑے گئے ہیں، بلکہ خود خدا اور اس کے رسول نے اس کے قواعد اور ضوابط مقرر فرما دیئے ہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ معاش وغیرہ کے سلسلے میں جو اسلامی احکام قرآن وسنّت میں دیئے گئے ہیں، ان کی حیثیت مشورے کی ہے، حکم کی نہیں ہے، یا وہ تعبدی نہیں، غیر تعبدی ہیں، ان کو قرآن کے لفظ فریضۃً من اللہ وصیت اور حدود اللہ پر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ فرائض، اور فریضہ عادلہ وغیرہ پر غور کرنا چاہیئے، قرآن نے وصیت کے احکام بیان کرتے ہوئے کئی بار یہ کہا ہے، فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ، وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ، يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ، تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ، یہ فریضہ خداوندی ہے، یہ خدا کی تاکید ہے، خدا تاکید کرتا ہے، یہ اللہ کے مقرر کردہ قواعد وضوابط ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

فرائض کے ذریعے جو چیز تقسیم ہوتی ہے، اس کو میراث اور ترکہ کہتے ہیں، اور ترکہ پانے والوں کو وارث اور ترکہ چھوڑنے والے کو مُورث کہتے ہیں۔

تجہیز وتکفین قرض اور وصیّت کوئی میراث یا ترکہ اس وقت تک تقسیم نہیں ہوسکتا، جب تک تین چیزوں کا خرچ اس کے ترکہ سے نہ پورا کر لیا جائے، اگر ان تینوں چیزوں میں خرچ کے بعد کچھ نہ بچے تو وارثوں کو کچھ نہ ملے گا، یہ تین چیزیں یہ ہیں (۱) تجہیز وتکفین (۲) قرض اور (۳) وصیت چونکہ ترکے کی تقسیم پر یہ چیزیں مقدم ہیں، اس لئے پہلے ہم ان ہی کا بیان کرتے ہیں۔

(۱) تجہیز وتکفین مُردے نے جو کچھ چھوڑا ہے، سب سے پہلے اس کے کفن دفن کا خرچ اس سے پورا کیا جائے گا، لیکن کفن دفن کے خرچ میں فضول خرچی کرنی جائز نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں فضول خرچی کرنے والوں کو اس کا تاوان دینا پڑے گا۔

جنازے کے بیان کے سلسلے میں اس کا مسنون طریقہ بتادیا گیا ہے، اسی کے مطابق تجہیز وتکفین کرنی چاہیئے۔ یہاں چند مسائل اور لکھ دیئے جاتے ہیں۔

کفن (۱) مُردے کو کفن اسی حیثیت کا دینا چاہیئے، جس حیثیت کا کپڑا وہ اپنی زندگی میں عام طور پر استعمال کرتا تھا، بہت کم قیمت کفن دینا بھی اچھا نہیں ہے، مگر اس کی حیثیت سے زیادہ بہت بیش قیمت کفن دینا بھی اسراف اور گناہ ہے۔

قبر (۲) ہر حال میں کچّی قبر بنانی چاہیئے۔ مرنے والا چاہے غریب ہو یا مال دار اور اس کی کھدائی کا خرچ ترکے سے لے لینا چاہیئے۔ اگر قبر کی زمین خریدنے کی ضرورت پیش آجائے، تو اس کی قیمت بھی ترکے سے لی جاسکتی ہے۔ مگر عام حالت میں اس سے زیادہ اس پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

قبر کے تختوں کی قیمت بھی ترکے سے لینی چاہیئے۔ اگر کہیں ضرورت ہو تو نہلانے والوں اور قبر تک پہنچانے والوں کی مزدوری بھی ترکے سے دی جاسکتی ہے۔

ضروری ہدایت غرض یہ کہ تجہیز و تکفین کے سلسلے میں دو باتوں کا خیال خاص طور پر رہنا چاہیئے۔ ایک یہ کہ حتی الامکان تجہیز و تکفین کا خرچ مردے ہی کے ترکے سے لیا جائے، اگر دوسرے اعزہ و اقارب اپنی خوشی سے اس کا خرچ برداشت کرلیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، دوسرے یہ کہ اس میں فضول خرچی بالکل نہ کی جائے ورنہ دوہرا گناہ ہوگا، ایک سنتِ نبوی کی مخالفت کا دوسرے وارثوں کی حق تلفی کا کیونکہ ترکہ ورثہ کا حق ہے۔

(۳) مردہ کا ترکہ اس کے ورثہ کا حق ہے، اس لئے اس کی تجہیز و تکفین میں جس قدر فضول خرچی کی جائے گی، اتنی ہی ان کی حق تلفی ہوگی۔ شریعت میں اس کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر خود مرنے والا یعنی مورث اس سے زیادہ خرچ کرنے کی وصیّت کرجائے، جب بھی نہ کیا جائے گا۔

ورثہ کی فضول خرچی (۴) اگر خود ورثہ تجہیز و تکفین میں فضول خرچی کریں تو ان کے لئے بھی ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر ورثہ ایسا کریں گے تو اسلامی حکومت ان سے اس کا تاوان بھی لے سکتی ہے۔

(۵) مردوں کے لئے تین کفن اور عورتوں کے لئے پانچ کفن کے علاوہ جو چادر اور جائے نماز وغیرہ بنائی جاتی ہے، ترکے سے اس کی قیمت لینی جائز نہیں ہے۔

صدقہ (۶) عام طور پر قبرستان میں تدفین کے وقت جو صدقہ کیا جاتا ہے، یا کپڑا وغیرہ تقسیم

کیا جاتا ہے، یا آنے والوں کی خاطر مدارات میں خرچ کیا جاتا ہے، اگر بالغ ورثہ اپنے ترکے سے اپنی خوشی سے ایسا کرتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر اس سلسلے میں دو تین باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

ایک تو یہ کہ اگر ورثہ میں کوئی نابالغ وارث بھی ہو تو پھر اس کے ترکے سے صدقہ خیرات کرنا جائز نہیں ہے، اگر بالغ ورثہ کریں گے تو ان کو اس کا تاوان دینا پڑے گا۔

دوسرے یہ کہ عموماً ایسا نام و نمود کے لئے کیا جاتا ہے، اس لئے اگر صدقہ و خیرات کرنا ہے، تو قبرستان کے بجائے اپنے گھر پر چھپا کر کرنا چاہیئے۔

تیسرے یہ کہ جو لوگ تیجہ چہلم اور برسی وغیرہ میں کھانے وغیرہ پر خرچ کرتے ہیں خواہ وہ ترکے سے کریں، یا اپنے پاس سے دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔ یہ چیز نہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اور نہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین سے، اس لئے اس سے سخت پرہیز کرنا چاہیئے۔

اگر کوئی دوسرا کفن دفن کا خرچ دے

(۷) اگر کوئی دوسرا شخص ثواب کی نیت یا محبت میں تجہیز و تکفین کا خرچ دینا چاہتا ہے تو یہ ورثہ کی مرضی پر ہے، اسے قبول کریں یا نہ کریں۔

بیوی کی تجہیز و تکفین کا خرچ

(۸) بیوی کی تجہیز و تکفین کا خرچ سب سے پہلے شوہر کے اوپر ہے۔ اگر شوہر موجود نہ ہو تو پھر بیوی کے ترکے سے لیا جائے گا۔

جس نے ترکہ نہ چھوڑا ہو

(۹) اگر میت نے کوئی ترکہ چھوڑا ہی نہ ہو، تو اس کی تجہیز و تکفین کا خرچ وہ لوگ برداشت کریں گے، جو ترکہ چھوڑنے کی صورت میں اس کے وارث ہوتے، ان میں سے ہر ایک وارث کو اسی حساب سے خرچ دینا واجب ہے، جس حساب سے وہ وراثت میں حصہ پاتے مثلاً ایک وارث آدھا ترکہ پاتا، اور دو آدھے میں نصف نصف پاتے تو اگر تجہیز و تکفین میں سو روپے خرچ ہوں گے تو پچاس روپے پہلا وارث دے اور ۲۵، ۲۵ روپے دونوں وارث دیں۔

لاوارث کی تجہیز و تکفین

اگر کسی کے کوئی وارث اور رشتے دار نہ ہوں تو اس کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر ہے، اور جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے وہاں اس بستی یا محلہ کے لوگوں کے اوپر اس کی تجہیز و تکفین کا خرچ واجب ہے، وہ چندہ کر کے پورا کریں۔

(۲) قرض

تجہیز و تکفین کے بعد اور ترکے کی تقسیم سے پہلے دوسرا ضروری خرچ قرض ہے یعنی اگر وہ مقروض مرا ہے تو تجہیز و تکفین کے بعد جو کچھ بچے گا اس سے پہلے اس کا قرض ادا کیا جائے گا، قرض کا بیان معاملات کے سلسلے میں آچکا ہے۔ یہاں چند ضروری مسائل اور لکھ دیتے جاتے ہیں۔

قرض کی قسمیں

قرض دو طرح کا ہوتا ہے، ایک وہ قرض جو اس نے اپنی صحت کی حالت میں کسی سے نقد لیا ہو، یا کسی سے کوئی چیز صحت کی حالت میں خریدی ہو، اور اس کی قیمت باقی رہ گئی ہو اور صحت ہی کی حالت میں اس نے اپنا مقروض ہونا ظاہر کر دیا ہو، یا دوسروں کو خود بخود اس کا علم ہو گیا ہو، دوسرے وہ قرض جس کا اقرار اس نے مرض الموت میں کیا ہو، نہ تو کسی اور کو اس کا علم ہو اور نہ کوئی گواہ موجود ہو۔ مرض موت سے مراد وہ بیماری جس میں اس کا انتقال ہوا ہو۔

دونوں قسموں کا حکم

ان دونوں قسموں کے قرض کے احکام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اگر اس کے اوپر ایک طرح کا یا دونوں طرح کے قرضے ہیں تو تجہیز و تکفین کے بعد دونوں طرح کے قرضے ادا کر کے پھر ترکہ وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

(۲) اگر ترکہ کم ہو، اور قرض زیادہ ہو، تو اگر یہ ایک ہی طرح کا قرض ہو اور ایک ہی آدمی کا قرض ہے، تو پھر جو کچھ تجہیز و تکفین کے بعد بچا ہے، اس کو دے دیا جائے۔ بقیہ قرض، قرض خواہ کو معاف کر دینا چاہیے۔ اگر وہ معاف نہ کرے تو اس کا بھی اس کو اختیار ہے مگر قانونی طور پر اس کی ادائیگی وارثوں کے اوپر نہیں ہے۔ البتہ اخلاقاً ان کا فرض ہے کہ اگر وہ صاحب حیثیت ہیں تو ادا کریں، کیونکہ اگر مال زیادہ ہوتا تو وہی پاتے، جہاں اسلامی حکومت ہوگی، وہاں اس کی

ادائیگی کی ذمہ داری اس کے اوپر ہوگی، اوپر اس کا ذکر آچکا ہے۔

(۳) یہ تو اس صورت کا حکم تھا، جب قرض ایک ہی طرح کا ہو، اور قرض خواہ بھی ایک ہو، لیکن اگر قرض تو ایک ہی طرح کا ہو مگر قرض خواہ کئی ہوں اور اس کا چھوڑا ہوا مال کافی نہ ہو، تو وہ سب اپنے قرض کی مقدار کے حساب سے حصّہ پائیں گے۔ مثلاً مرنے والے کی تجہیز و تکفین کے بعد صرف سو روپے بچے اور مرنے والا دو سو روپے کا مقروض ہے، ایک آدمی کا سو روپے، اور دو آدمیوں کا پچاس پچاس ہے تو اب پچاس روپے تو وہ پائے گا، جس کے سو باقی ہیں اور پچیس پچیس باقی دونوں پائیں گے۔

(۴) اگر اس کے اوپر دونوں طرح کا قرض ہے اور ترکہ کافی نہیں ہے، تو پہلے پہلے قسم کا قرض یعنی وہ قرض جس کا اقرار اس نے صحت میں کیا ہے۔ ادا کیا جائے گا، پھر اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ دوسرے قسم کے قرض کی ادائیگی کے لئے کچھ بچتا ہے یا نہیں، اگر نہیں بچا تو وہ کچھ نہیں پائیں گے، اگر کچھ بچ جاتا ہے تو وہ اپنے قرض کی مقدار کے اعتبار سے پائیں گے۔ نہ پانے کی صورت میں قرض خواہ وارثوں کو قرض کی ادائیگی پر مجبور نہیں کر سکتے، اخلاقاً وہ دے دیں تو ان کو ثواب ہوگا۔

مہر بیوی کا مہر بھی ایک قسم کا قرض ہے، اس لئے اگر کوئی شوہر اس کو ادا کئے بغیر مر جائے، اور اپنے پیچھے کوئی جائداد یا مال چھوڑ جائے تو تجہیز و تکفین کے بعد جس طرح دوسرے قرض خواہوں کا قرض ادا کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح بیوی کا مہر ادا کرنا بھی ضروری ہے اس کی ادائیگی کے بغیر ورثہ مرنے والے کی جائداد یا مال آپس میں تقسیم نہیں کر سکتے، یہ قرض بھی پہلی قسم کا قرض شمار ہوگا، یعنی وہ قرض جو اس نے صحت کی حالت میں لیا ہو اور صحت ہی کی حالت میں جس کا اقرار کیا ہو۔

تاوان بھی قرض ہے اگر مرنے والے نے کسی کی کوئی چیز نقصان کر دی تھی اور اس کا تاوان اس کے اوپر واجب تھا تو اس کی حیثیت بھی قرض ہی کی ہے یعنی اس کی ادائیگی کے بعد ہی میراث تقسیم ہوگی۔

عبادات کا فدیہ اسی طرح اگر کسی کے اوپر بندوں کا حق مثلاً قرض یا مہر یا تاوان وغیرہ تو باقی نہ ہو، مگر خدا کا کوئی حق اس کے اوپر باقی ہو تو یہ بھی ایک طرح کا قرض ہے۔ اگر اس کی ادائیگی کے لئے وہ کہہ گیا ہے تو اس کی ادائیگی بھی ضروری ہے مثلاً کسی کے روزے چھوٹے تھے، یا نمازیں قضا ہو گئی تھیں، تو تجہیز و تکفین اور بندوں کے ہر طرح کے قرض ادا کرنے کے بعد اس کے مال سے قرض نمازوں کا فدیہ دے دینا چاہیئے، اسی طرح اس کے ذمے زکوٰۃ واجب تھی اور مر گیا تو واجب زکوٰۃ اس کے مال سے دے دینی چاہیئے، لیکن اس قرض کی ادائیگی میں دوسرے قرضوں کے مقابلے میں دو شرطیں زیادہ ہیں۔ اگر یہ نہ پائی جائیں گی تو ادا کرنا واجب نہ ہوگا۔

پہلی شرط یہ ہے کہ مرنے والے نے اس فدیے یا کفارے کے ادا کرنے کی خود وصیّت کر دی ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ تجہیز و تکفین اور قرض کی ادائیگی کے بعد جو کچھ بچ رہے، اس میں سے صرف ⅓ کے اندر وہ کفارہ یا فدیہ ادا کیا جائے، اگر فدیہ یا کفارے کی مقدار ⅓ سے زیادہ ہو تو پھر ورثہ کی مرضی پر ہے کہ وہ ادا کریں یا نہ کریں، مگر ⅓ کے اندر جتنا کفارہ یا فدیہ ہو، اگر وہ وصیت کر گیا تو اس کا ادا کرنا واجب ہے۔

(۳) وصیت وصیت کے لفظی معنی جانشین بنانے اور تاکید کرنے کے ہیں اور شریعت میں بھی وصیت کے دو معنی ہیں۔ ایک تو کسی کو اپنی زندگی ہی میں اپنے مرنے کے بعد کسی کام کے کرنے کی ذمہ داری سونپنا جس کو یہ ذمہ داری سونپی جائے گی، وہ مرنے والے کا وصی کہلائے گا، دوسرے کسی غیر وارث کو اپنی جائداد ⅓ یا اس سے کم پانے کی ہدایت و تاکید کر جانا، یہاں پر دوسری قسم کی وصیت کا ذکر کیا جائے گا، پہلی قسم کی وصیت کا بیان معاملات کے سلسلے میں ضمناً آچکا ہے۔

ابتدائے اسلام میں وصیت فرض تھی جاہلیت میں وراثت ان ہی مردوں کو ملتی تھی، جو جوان بھی ہوں اور جنگ میں جانے کے قابل بھی ہوں۔ بوڑھے مردوں، عورتوں، بچوں، یتیموں، بیواؤں کو ترکے میں سے کچھ بھی نہیں ملتا تھا، ابتدائے اسلام میں جب تک کہ ایک اسلامی حکومت نہیں قائم ہو گئی،

اس وقت تک میراث کی تقسیم کا مفصل حکم نہیں دیا گیا، کیونکہ یہ حکم اسی وقت زیادہ موثر ہو سکتا تھا جب ایک قوت نافذہ اس کے نفاذ کے لئے موجود ہو، ابتداءً وصیت کے سلسلے میں نظامِ جاہلیت میں صرف اتنی تبدیلی کی گئی کہ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے والدین یتیموں، بیواؤں، اور اپنے غریب اعزہ کو اپنے مال و جائداد سے کچھ دینے کی وصیت کر جایا کریں تاکہ جوان قوی اعزہ و اقارب ان بے سہارا لوگوں پر ظلم اور ان کی حق تلفی نہ کر سکیں، قرآن نے اس حکم کا بڑے پُر زور انداز میں ذکر کیا ہے:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ٥ (بقرہ)

جب موت کا وقت قریب ہو جائے[1] تو تمہارے اوپر یہ فرض کیا گیا ہے کہ اگر تم نے کچھ مال چھوڑا ہے تو اپنے والدین اور اعزہ و اقارب کے لئے معقول طریقے پر وصیت کر جاؤ یہ ضروری ہے خدا سے ڈرنے والوں پر۔

لیکن جب لوگوں کے دلوں میں اسلام کی حقانیت بیٹھ گئی، اور ایک حکومت بھی وجود میں آگئی، تو ۴ھ و ۵ھ کے درمیان میراث کی تقسیم کا مفصل حکم نازل ہوا، اور وصیت کی فرضیت کو استحباب سے بدل دیا گیا اور اس کی وسعت کو ۱/۳ کے اندر محدود کر دیا گیا، یعنی اب وصیت فرض نہیں مستحب قرار پائی، اور وصیت کے لئے یہ حد مقرر کر دی گئی ہے کہ مرنے والا اپنی جائداد اور مال میں صرف ۱/۳ کے اندر وصیت کر سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں، اب اس سے ایک طرف ورثہ کا حصہ بھی محفوظ ہو گیا، اور دوسری طرف ہر شخص کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ اگر اس کے اعمال میں کوئی کمی یا خامی رہ گئی ہے تو وہ اپنے مال کو کسی کارِ خیر میں لگا کر اس کمی و خامی کی کوئی تلافی کر سکے، اور پھر اسی کے ساتھ یہ موقع بھی دیا گیا ہے کہ اس کے اعزّہ

---

[1] موت کا وقت قریب آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے وصیت نہ کی جائے، بلکہ یہ قید اس لئے لگا دی گئی ہے کہ عموماً آدمی اسی موقع پر لوگوں کو دیتا لیتا ہے اور وصیت وغیرہ کرتا ہے۔

واقارب میں جو لوگ کسی وجہ سے وراثت میں حصہ نہ پا سکتے ہوں یا حصہ تو پا سکتے ہوں، مگر وہ ان کی ضرورت بھر نہ ہو اور وہ اس قابل بھی نہ ہوں کہ وہ اپنے یا اہل وعیال کے لئے مزید کوئی ذریعہ معاش پیدا کر سکتے ہوں، مثلاً مریض، کمزور یا بوڑھے ہوں، بیوہ عورت یا یتیم بچے ہوں، ایسے لوگوں کی روزی کا کچھ سہارا مرنے والا اگر چاہے تو وصیت کے ذریعہ کر سکتا ہے، اور بعض صورتوں میں تو ایسا کرنا اخلاقاً ضروری ہے۔

وصیت کے شرائط

وصیت کے سلسلے میں شریعت نے چند ایسی شرطیں لگا دی ہیں کہ اگر ان کی رعایت کی جائے تو نہ تو ورثہ پر کوئی ظلم ہو سکتا ہے، اور نہ حد سے زیادہ ایک ہی یا چند آدمیوں کے پاس دولت جمع ہو سکتی ہے اور نہ کسی حق دار کا حق مارا جا سکتا ہے، جس وصیت میں یہ شرطیں نہ پائی جائیں گی وہ قانوناً نافذ نہیں ہوگی۔

(۱) سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وصیت، تجہیز وتکفین کا خرچ اور قرض وغیرہ ادا کرنے کے بعد پوری کی جائے گی۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ اپنے مال یا جائداد میں تہائی سے زیادہ کی وصیت نہ کی جائے اگر کوئی ⅓ سے زیادہ وصیت کرے گا، تو ⅓ ہی کے اندر اس کی وصیت پوری کی جائے گی، خواہ وہ پوری ہو یا نہ ہو، کیونکہ اس سے زیادہ وصیت کرنے کا اس کو حق ہی نہیں ہے اور پھر اس میں ورثہ کی حق تلفی بھی ہے۔ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ ایک بار سخت بیمار پڑے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو تشریف لے گئے، انھوں نے آپؐ سے عرض کی کہ یارسول اللہ! میرے پاس مال وجائداد کافی ہے، اور میری ایک ہی لڑکی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنے ترکے کا دو حصہ راہِ خدا میں صدقہ کردوں، آپؐ نے فرمایا کہ ایسا کرنا صحیح نہیں ہے، پھر انھوں نے کہا کہ اچھا تو آدھا صدقہ کردوں، آپ نے پھر منع فرمایا، انھوں نے تیسری بار کہا کہ اچھا تو ایک تہائی (⅓) صدقہ کر جاؤں، آپ نے فرمایا کہ:-

اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ کَثِیْرٌ۔ ہاں تہائی تو کر سکتے ہیں مگر یہ بھی زیادہ ہے

پھر اس کے بعد آپؐ نے ایک انتہائی حکیمانہ بات فرمائی:-

اِنَّكَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ اَنْ تَدَعَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُوْا النَّاسَ۔ (المنتقی بحوالہ بخاری ومسلم)

اپنے وارثوں کو خوش حال چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ ان کو بالکل تنگ دست بنا کر جاؤ کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

حضرت ابن عباس فرمایا کرتے تھے کہ اگر لوگ ⅓ کے بجائے صرف ¼ ہی میں وصیت کیا کرتے تو زیادہ بہتر تھا، کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تہائی کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا کہ تہائی بھی زیادہ ہے۔ (المنتقی)

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ وصیت کرنے والا (مُوصی) عاقل بالغ ہو اور ہوش وحواس کی حالت میں وصیت کرے، اگر کوئی بچہ یا پاگل وصیت کرے گا، تو اس کی وصیت بے کار ہوگی،

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ موصی جس کو وصیت کر رہا ہے وہ (وَصی) اس کے ترکے کا وارث نہ ہو کیونکہ وہ تو ترکے سے حصّہ پاتے گا ہی۔ اس کو دوہرا حصّہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

اِنَّ اللهَ قَدْ اَعْطٰى كُلَّ ذِىْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ۔ (بخاری)

اللہ تعالیٰ نے تو ہر حق دار (وارث) کا حق دے ہی دیا ہے، اس لئے کسی وارث کے لئے وصیت نہ کی جائے۔

وصیت سے وارث کے حصّہ پانے کی صورتیں

وصیت کے ذریعے جائداد یا روپیہ وغیرہ میں وارث کے حصہ پانے کی صرف دو صورتیں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ دوسرے ورثہ اس پر راضی ہو جائیں، خواہ وہ موصی کی زندگی ہی میں راضی ہو جائیں یا مرنے کے بعد، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کسی وارث کے لئے وصیّت جائز نہیں ہے، البتہ اگر دوسرے ورثہ اس کی اجازت دے دیں تو جائز ہوگی۔ (دار قطنی)

(۲) دوسرے یہ کہ کوئی استحقاق کے اعتبار سے تو وراثت کے پانے کا حق دار تھا لیکن کسی دوسرے سبب کی وجہ سے وہ محروم ہوگیا ہے، مثلاً دادا کی موجودگی میں کسی کا باپ مر جائے، تو

وہ پوتا شرعی اعتبار سے محجوب ہو جاتا ہے، یعنی اس کو دادا کے ترکے سے حصہ نہیں ملے گا لیکن دادا وصیت کر جائے تو اس کو حصہ ملے گا، بلکہ ایسے محروم ورثہ کو وصیت کر جانا بڑا کارِ ثواب ہوگا۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

مکروہ وحرام وصیت

جس طرح تہائی مال سے زیادہ وصیت کرنا جائز نہیں ہے، یا عام حالت میں ورثہ کو وصیت کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص ناجائز، مکروہ، حرام کام کرنے کی وصیت کر جائے تو وہ وصیت بھی پوری نہیں کی جائے گی، مثلاً کسی نے کہا کہ میرے مرنے کے بعد مجھے ریشمی کفن دیا جائے، میری قبر پختہ بنائی جائے، یا میری قبر پر روزانہ ایک حافظ آکر قرآن پڑھے اور اس کا خرچ دیا جائے، یا خوب دھوم دھام سے چہلم یا تیجہ کیا جائے، تو یہ وصیتیں پوری نہیں کی جائیں گی، کیونکہ ان میں سے کوئی چیز بھی شریعت کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

غرض یہ کہ جو چیزیں شریعت میں ناجائز یا مکروہ ہیں یا غیر ضروری اور فضول خرچی ہے، ان کی اگر وصیت کر بھی دی جائے، تو وہ پوری نہیں کی جائے گی۔

(۲) اگر قرض ادا کرنے کے بعد کچھ نہ بچے تو وصیت پوری نہیں کی جائے گی۔

(۳) کسی نے وصیت کی کہ مجھے میرے مکان میں دفن کرنا یا استطاعت کے باوجود اس نے کہا کہ مجھے صرف ایک کفن دینا، تو اس کی وصیت پوری نہیں کی جائے گی، بلکہ اس کو عام قبرستان میں دفن کیا جائے گا، اور تین کفن دیا جائے گا۔

(۴) اگر کوئی شخص یہ وصیت کر جائے فلاں شخص میری نماز پڑھائے، یا فلاں جگہ میں دفن کیا جاؤں تو ان وصیتوں کا پورا کرنا ضروری تو نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شرعی عذر مانع نہ ہو، تو پورا کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

جائز وصیتیں

اگر کوئی نیک اور جائز کام کی وصیت کر جائے، تو وہ پوری کی جائے گی، مثلاً (۱) کسی پر حج فرض تھا اور اس نے اس کے لئے روپے بھی جمع کیا تھا مگر حج سے پہلے انتقال ہو گیا، اور انتقال کے وقت اس نے حج بدل کی وصیت کی تو اس کی یہ وصیت پوری کی جائے گی، لیکن ایک ثلث سے زیادہ مال ورثہ کی اجازت کے بغیر اس

وصیت کے پورا کرنے میں خرچ نہیں کیا جائے گا، اگر اس کے وطن سے جانے میں ثلث مال سے زیادہ خرچ ہوتا ہے تو حاجی کے کسی آدمی کے ذریعے حج کرا دیا جائے، تاکہ اس کی وصیت بھی پوری ہو جائے، اور ایک ثلث سے زیادہ مال بھی خرچ نہ ہو۔

(۲) اگر کسی نے کوئی چیز صدقہ کرنے یا غلہ صدقہ کرنے کی وصیت کی ہے تو اس چیز یا اس غلے کی قیمت بھی دی جا سکتی ہے، اس چیز کا دینا یا اتنا غلہ ہی دینا ضروری نہیں ہے۔

(۳) اگر کسی نے وصیت کی کہ میرا فلاں دوست یا فلاں عزیز میرے مکان میں بغیر کرایہ ادا کئے رہے تو یہ وصیت جائز ہے، لیکن اگر اس نے ایک ہی مکان چھوڑا ہے تو اس کی وصیّت صرف ⅓ میں نافذ ہوگی، یعنی اس کے دوست کو صرف ⅓ مکان رہنے کے لئے دیا جائے گا، بقیہ ورثہ کا ہوگا۔

دوسروں کی حق تلفی یا نقصان پہنچانے والی وصیتیں

جس طرح ناجائز وصیتیں کرنا گناہ ہے، اسی طرح وہ وصیتیں کرنا بھی گناہ ہے جن سے کسی وارث کی حق تلفی یا نقصان ہوتا ہو، بعض صورتوں میں ایسی وصیتیں نافذ ہی نہیں ہوں گی اور بعض میں نافذ تو ہو جائیں گی مگر اس کو سخت گناہ ہوگا، قرآن میں وصیت اور قرض کی ادائیگی کا حکم بیان کرتے ہوئے کہا گیا۔

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ۔ (نساء)	میراث کی تقسیم میت کی کی ہوئی وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد کی جائے، بشرطیکہ یہ وصیت اور قرض ورثہ کو نقصان پہونچانے والا نہ ہو۔

اس کی تفسیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو الفاظ ارشاد فرمائے ہیں وہ بہت قابلِ غور ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کتنے مرد عورت ایسے ہوتے ہیں کہ ساٹھ برس تک یعنی پوری عمر خدا کی اطاعت کرتے رہتے ہیں اور جب موت کا وقت قریب آتا ہے تو وہ اپنی وصیت کے ذریعے (ورثہ کو) نقصان پہنچا جاتے ہیں (یا مستحقین کو وصیت نہیں کرتے)، جس کی وجہ سے وہ دوزخ کے مستحق ٹھہر جاتے ہیں۔ (ابوداؤد)

ورثہ کی حق تلفی اور نقصان پہونچانے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

(۱) اگر کوئی ثلث مال سے زیادہ وصیت کرے گا، تو اس کے بارے میں یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے ورثہ کی حق تلفی کے لئے ایسا کیا ہے، اس لئے یہ وصیت پوری نہیں کی جائے گی اور اس کو حق سے زیادہ وصیت کرنے کی وجہ سے گناہ بھی ہوگا۔

(۲) مرنے والے کے ذمے کسی کا کوئی قرض یا کسی کی امانت نہ رہی ہو، لیکن ورثہ کو نقصان پہونچانے کے لئے وہ اقرار کر گیا ہو کہ میرے ذمے فلاں کا اتنا قرض یا اتنی امانت ہے، تو اگر اس کا غلط اور جھوٹ ہونا ثابت ہو جائے، تو یہ وصیت اگر ثلث مال میں پوری ہو جاتی ہو تو پوری تو کی جائے گی، مگر وصیت کرنے والے کو سخت گناہ ہوگا، اس لئے کہ اس سے ورثہ کو نقصان پہونچے گا۔

(۳) اس کا قرض کسی دوسرے کے اوپر تھا یا اس کی امانت کسی کے یہاں رکھی ہوئی تھی اور اس کا علم سب کو تھا مگر وہ جھوٹ یہ کہے کہ میں اپنا قرض یا امانت پا چکا ہوں تو گو اس کا اقرار قانوناً تسلیم کر لیا جائے گا، مگر وہ سخت گنہ گار ہوگا، اس لئے کہ اس میں ورثہ کی حق تلفی ہے۔

وصیت سے رجوع کر لینا

جب تک کوئی شخص زندہ ہے، اس کو اپنی وصیت سے رجوع کر لینے کا حق باقی ہے۔ مثلاً کسی نے ایک مکان کسی کو دینے کی وصیّت کی، لیکن کچھ دنوں کے بعد اس نے کہا کہ میں اس سے رجوع کرتا ہوں یا اپنی وصیت واپس لیتا ہوں، تو اس کو اس کا حق ہے، اگر اس نے زبان سے نہیں کہا مگر اس نے کوئی ایسا طرز عمل اختیار کیا، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اس نے وصیت سے رجوع کر لیا، تو بھی وصیت کا انعدام ہو جائے گی، مثلاً ایک زمین وصیت کی، پھر اس میں اپنے لئے مکان بنا لیا یا اس میں خود کھیتی کرنے لگا، یا جانور وصیت کیا اور اس کو فروخت کر دیا تو اس کے طرزِ عمل سے اب یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے اپنی وصیت سے رجوع کر لیا۔

وصی کی حیثیت

اگر کوئی شخص زندگی میں اپنی موت کے بعد اپنے کاموں کی انجام دہی کے لئے کسی کو ذمے دار بنا جائے تو جس کو اس نے ذمے دار بنایا ہے، اس کو شریعت میں وصی کہتے ہیں، اور جس نے وصی بنایا ہے وہ "موصیٰ" ہے، وصی، موصی کی زندگی

میں تو اس وصیت سے انکار کر سکتا ہے، لیکن اگر اس نے موصی کی زندگی میں اس سے انکار نہیں کیا تو پھر اس کی موت کے بعد اس کو اس ذمے داری سے علیحدہ ہونے کا حق نہیں ہے۔

وصی کی حیثیت امین کی ہوتی ہے، اس لئے اسے موصی کے مال اور جائداد میں اسی طرح تصرّف کرنا چاہئے، جس طرح وہ کہہ گیا ہے یا جس طرح وہ اپنے مال و جائداد میں کرتا تھا۔

وراثت

وراثت کی اصطلاحیں قرض اور وصیت کی تفصیل کے بعد اب ہم وراثت کی تقسیم کے طریقے اور ورثہ کے حصوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں مگر اس بیان سے پہلے چند اصطلاحوں کو ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

میّت مرنے والا جس نے ترکہ چھوڑا ہے۔

ترکہ میت جو کچھ چھوڑے اس کو ترکہ کہتے ہیں، ترکے کو وراثت اور میراث بھی کہتے ہیں۔

وارث ترکہ پانے والا، وارث کی جمع ورثہ ہے۔

مورث ترکہ چھوڑنے والا۔ عام طور پر میت اور مورث ایک ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ذوی الفروض وہ لوگ جن سے میت کا نسبی تعلق ہو، اور ان کا حصہ شریعت نے مقرر کر دیا ہو۔ یہ کل تیرہ ہیں۔

عصبہ جن کا نسبی تعلق میّت کے ساتھ کسی مرد کے واسطے سے ہو، اور ان کا حصہ شریعت نے مقرر نہ کیا ہو، بلکہ ذوی الفروض کو دے کر جو کچھ بچ جاتے، وہ سب ان کا ہے، ان میں سب سے مقدم بیٹا ہے۔

ذوی الارحام وہ رشتے دار جن سے میت کا تعلق کسی عورت کے واسطے سے ہو، یا وہ خود عورت ہوں، مثلاً خالہ، بھتیجی، نواسی وغیرہ۔

حقیقی بھائی بہن جن کے ماں باپ دونوں ایک ہوں، ان کو شریعت میں عینی کہتے ہیں۔

سوتیلے بھائی | سوتیلے بھائی دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک اخیافی، دوسرے علاتی۔

اخیافی بھائی بہن | جن کے باپ تو دو یا اس سے زیادہ ہوں مگر ماں ایک ہو، یعنی ان کی ماں نے ایک شوہر کے انتقال یا طلاق کے بعد دوسری شادی کرلی ہو اور دونوں شوہروں سے اولاد ہو تو یہ تمام آپس میں اخیافی بھائی بہن کہے جائیں گے۔

علاتی بھائی بہن | جن کی مائیں دو یا اس سے زیادہ ہوں اور باپ ایک ہی ہو، یعنی باپ نے کئی شادیاں کی ہوں اور ان بیویوں سے اولاد ہو تو یہ تمام آپس میں علاتی بھائی بہن کہے جائیں گے، اور ان میں سے ہر ماں کے بچے آپس میں حقیقی کہلائیں گے۔

محروم | وہ شخص جو اپنے کسی غلط فعل کی وجہ سے ترکہ نہ پائے، مثلاً باپ کو قتل کر دے یا مرتد ہو جائے۔

محجوب | جو کسی دوسرے وارث کی وجہ سے حصہ نہ پائے یا کم پائے۔

حجبِ نقصان | جو حصہ کم پائے۔

حجب حرمان | جو بالکل حصہ نہ پائے۔

اصول | باپ دادا، پردادا وغیرہ۔

فروع | بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی وغیرہ۔

جو چیزیں ترکے سے محروم کر دیتی ہیں | اوپر ذکر آچکا ہے کہ قرض کی ادائگی اور وصیت کی تکمیل کے بعد ترکے سے جو کچھ بچے گا، شریعت کے مقرر کردہ حصّے کے مطابق وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا، لیکن بسا اوقات کچھ ایسے موانع اور ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے ایک وارث شرعی حصے کے مطابق ترکہ پانے سے یا تو بالکل محروم ہو جاتا ہے، یا کم حصہ پاتا ہے۔ جو لوگ کسی عارضی سبب سے ترکہ نہیں پاتے ان کو محروم اور جو کم پاتے ہیں ان کو محجوب کہا جاتا ہے، وراثت کی تقسیم کے طریقے اور وارثوں کے حصّوں کے تعین سے پہلے ترکے سے محروم و محجوب ہونے کے موانع و اسباب کو بیان کر دیا جاتا ہے اس لئے کہ ان کا ذکر بار بار آئے گا۔

محروم ہونے کے اسباب

جن اسباب کی بنا پر کوئی وارث اپنے مورث کی وراثت سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ وہ دو ہیں قتلِ مورث، اختلافِ دین،

(۱) قتل

قتل کا مطلب یہ ہے کہ کسی بالغ وارث نے اپنے مورث کو ناحق یا ظلم سے قتل کر ڈالا، تو وہ اب اس مورث کے ترکے سے بالکل محروم ہو جائے گا، خواہ وہ قتل قصداً ہوا ہو، یا غلطی سے ہوا ہو، دونوں کا حکم ایک ہی ہے، گویا قاتل کے مقتول کی میراث سے محروم ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں، ایک یہ کہ عقل و ہوش رکھتا ہو، دوسرے یہ کہ بالغ ہو، تیسرے یہ کہ مورث کو ظلم سے قتل کیا ہو، اب اگر کسی پاگل نے یا کسی نابالغ نے اپنے مورث کو قتل کر دیا تو چونکہ یہ لوگ شرعی پابندیوں سے بڑی حد تک آزاد ہیں، اس لئے ان کے قتل کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، اسی طرح اگر وارث نے ظلم سے قتل نہیں کیا بلکہ مورث اس پر حملہ کر رہا تھا، اس نے اپنے بچاؤ کے لئے اس پر حملہ کیا، اور وہ مر گیا تو اس قتل سے وہ وراثت سے محروم نہیں ہوگا، کیونکہ یہ قتل ظلم سے نہیں، بلکہ ظلم سے بچاؤ کے سلسلے میں واقع ہوا ہے، اسی طرح اگر مورث کو اسلامی حکومت کی طرف سے قتل یا پھانسی کی سزا کا حکم ہو، اور اس کے وارث ہی کو حکومت اس کے قتل کرنے یا پھانسی دینے پر مامور کرے تو اس قتل سے بھی وہ محروم نہیں ہوگا، کیونکہ یہ قتل ناحق نہیں بلکہ ایک حق کے لئے ہوا ہے۔ حدیث میں ہے القاتل لایرث (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ ص ۲۶۳)

(۲) اختلافِ دین

کوئی مسلمان نہ کسی غیر مسلم کا وارث ہو سکتا ہے، اور نہ کوئی غیر مسلم کسی مسلمان مورث کی وراثت پا سکتا ہے، یعنی دین و مذہب کے اختلاف کی وجہ سے ان میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی، غیر مسلم ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں یا نہیں، اس کا دارومدار ان کے "پرسنل لاء" پر ہے، یعنی اگر ان کے یہاں اجازت ہوگی، تو ہوں گے اور نہ ہوگی تو نہ ہوں گے، مگر اسلام کا ماننے والا نہ تو کسی غیر مسلم کا وارث ہو سکتا ہے اور نہ مورث، یہی حکم مرتد کا بھی ہے، وہ بھی مسلمان کی وراثت سے محروم رہے گا، حدیث میں ہے" لایتاورث اھل ملتین شیٔ" (ابو داؤد، ترمذی وغیرہ)

غلامی اور اختلافِ وطن کی بعض صورتیں بھی وراثت سے محروم کر دیتی ہیں مگر یہ نادر الوقوع ہیں، اس لئے ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

محجوب ہونے والے وارث

محجوب کا لفظ حجاب سے نکلا ہے، جس کے معنی پردہ کے ہیں، یعنی ایسے وارث جن کی وراثت میں کوئی دوسرا وارث حجاب بن جاتا ہے، اوپر ان لوگوں کا بیان ہوا ہے، جو اپنے کسی غلط فعل کی وجہ سے وراثت سے بالکل محروم کر دیئے گئے ہیں، اب ان لوگوں کا بیان کیا جاتا ہے، جو اپنے کسی ذاتی فعل کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسرے وارثوں کے بیچ میں آجانے کی وجہ سے ان کی میراث میں یا تو کمی آجاتی ہے، یا وہ بالکل محروم ہو جاتے ہیں۔ پہلی صورت کو شریعت میں حجب نقصان اور دوسری صورت کو حجب حرمان کہتے ہیں۔

دو وارثوں کا حصہ کبھی کم نہیں ہوتا

یہاں یہ باور رکھنا چاہیئے کہ صرف دو وارث بیٹا اور بیٹی ایسی ہیں، جو نہ تو کسی وارث کی وراثت سے محروم ہو سکتے ہیں اور نہ ان کا حصہ کسی وارث کی وجہ سے کم ہو سکتا ہے، ان کے علاوہ جتنے وارث ہیں، ان کا حصّہ دوسرے وارثوں کی وجہ سے کم بھی ہو سکتا ہے' اور وہ بالکل محروم بھی ہو سکتے ہیں، بیٹے اور بیٹی کی وراثت سے محرومی کے اسباب صرف دو ہی ہو سکتے ہیں، جن کا ذکر اوپر ہوا، یعنی قتل اور اختلافِ دین۔

حُجب نقصان کا بیان

جن وارثوں کا حصّہ دوسرے وارثوں کی وجہ سے کم ہو جاتا ہے' وہ یہ ہیں:۔

(۱) اگر میت کے وارث یعنی ذوی الفروض میں صرف اس کے ماں باپ ہوں تو ان کو تہائی حصہ ⅓ ملتا ہے، لیکن اگر میت کے بیٹا بیٹی وغیرہ بھی ہوں تو پھر ان کا حصہ ⅓ سے گھٹ کر چھٹا ⅙ رہ جاتا ہے۔

(۲) میت کی ماں کا حصّہ ⅓ ہے لیکن جس طرح میت کے لڑکوں کی موجودگی میں اس کا حصہ ⅙ ہوتا ہے، اسی طرح میت کے اگر بھائی بہن ہیں، یا میت کی بیوی زندہ ہے، تو بھی اس کا حصّہ ⅓ کے بجائے ⅙ ہو جائے گا۔

(۳) شوہر کے ترکے میں بیوی کا حصّہ چوتھائی ہے۔ لیکن اگر شوہر نے اولاد چھوڑی ہے، تو ان کی موجودگی میں بیوی کا حصہ آٹھواں ہو جائے گا۔

(۴) بیوی کی جائداد میں شوہر کا حق ½ ہوتا ہے، لیکن اگر بیوی کے بطن سے کوئی اولاد ہے، تو پھر شوہر کو صرف ¼ ملے گا۔

اسی طرح پوتی کا حصہ حقیقی بیٹی کی موجودگی میں علاتی بہن کا حقیقی بہن کی موجودگی میں، دادا کا اولاد کی موجودگی میں حصہ کم ہو جاتا ہے۔

حجب حرمان

وہ وارث جو بعض وارثوں کی موجودگی میں بالکل محروم ہو جاتے ہیں، وہ یہ ہیں:-

حقیقی اور اخیافی بھائی بہن

(۱) اگر میت کے ورثہ میں بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی یا باپ، دادا میں کوئی موجود ہو، تو حقیقی اور اخیافی یعنی ماں شریک بھائی بہن محروم ہو جاتے ہیں۔

(۲) پوتی، پوتا، اگر میت کے بیٹے موجود ہوں تو پوتا پوتی کو وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا، مثلاً خالد کے تین لڑکے ہیں حامد، طارق اور عامر، عامر کا ایک لڑکا فرید ہے، اب اگر عامر اپنے باپ خالد کی موجودگی انتقال کر جائے، تو خالد کے مرنے کے بعد پوری جائداد اس کے دونوں زندہ لڑکے حامد اور طارق کو مل جائے گی، عامر کے لڑکے فرید کو کچھ نہ ملے گا، کیونکہ جائداد کی تقسیم کی جو ترتیب شریعت نے قائم کی ہے، اس میں فرید نہیں آتا، ترتیب یہ ہے کہ پہلے قریب تر کو ملے، پھر اس سے دور کو، یعنی بیٹے پھر پوتے پھر پرپوتے، اور ان سے نیچے جو لوگ ہوں، اسی طرح باپ، دادا پھر پردادا اور ان سے اوپر جو لوگ ہوں، غرض یہ کہ جو لوگ بھی اس نسبی تعلق اور ترتیب کے اعتبار سے جتنے زیادہ دور ہوں گے، وہ محروم ہوتے چلے جائیں گے۔ مثلاً باپ کی موجودگی میں دادا محروم ہوگا، دادا کی موجودگی میں پردادا محروم ہوگا، کیونکہ باپ دادا کے مقابلے میں اور دادا پردادا کے مقابلے میں قریب تر ہیں، اسی طرح لڑکوں کی موجودگی میں ان کے لڑکے یعنی پوتے محروم ہوں گے، اور پوتوں کی موجودگی میں ان کے لڑکے وراثت نہیں پائیں گے، کیونکہ بیٹے کے مقابلے میں پوتے، اور پوتے کے مقابلے میں پرپوتے دور ہیں، اسی طرح ماں کی موجودگی میں نانیاں اور دادیاں حصہ نہیں پائیں گی، کیونکہ یہ ماں کے مقابلہ میں دور ہیں۔

(۳) سارے ذوی الارحام، ذوی الفروض اور عصبات کی موجودگی میں وراثت سے محروم رہتے ہیں، مثلاً نانی، نانا، بھانجی، بھانجا، خالہ، ماموں، پھوپھی وغیرہ یہ سب بیٹے، بیٹی، ماں باپ اور بھائی کی موجودگی میں محروم رہیں گے۔

محجوب پوتوں کا مسئلہ

جو ورثہ کسی دوسرے سے وراثت کی وجہ سے وراثت سے محروم یا محجوب ہوجاتے ہیں، ان میں خاص طور پر یتیم پوتوں کی محرومی پر لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ شریعت کا یہ بڑا ظلم ہے کہ وہ ایسے بے سہارا پوتوں کو جو باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوچکے ہیں، ان کو اپنے دادا کی وراثت سے بھی بالکل محروم کردیتی ہے۔

یہ جذباتی اعتراض بظاہر بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے، لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اگر تقسیم وراثت کی اس ترتیب کو جو اس نے رکھی ہے، اگر بدل دیا جائے، تو پھر اس میں کوئی ترتیب قائم نہیں رہ سکتی، پھر پوتے ہی پر کیا منحصر ہے، جتنے ورثہ دوسرے ورثہ کی وجہ سے محروم ہوتے ہیں، ان سب کو حصّہ ملنا چاہیئے، اگر یتیم پوتے کسی محرومی کی وجہ سے قابلِ رحم ہیں، تو پھر یتیم نواسے، یتیم بھانجے اور یتیم بھائی بہن کو کیوں نہ حصہ دیا جائے، غرض یہ کہ اس ترتیب کو نظر انداز کرنے میں وراثت کا پورا نظام بے ترتیب ہو کر رہ جائے گا، اگر کوئی دادا اپنے صاحبزادے کو جائداد سے محروم کرکے پوتوں کو ان کا حصّہ دے دے تو پھر ان کی پیشانی پر بل آجائے گا، اور اس کو شرعی خلاف ورزی قرار دیں گے، اس لئے کہ شریعت نے ترکہ کی جو ترتیب قائم کی ہے وہ اس کے خلاف ہے، شریعت اسی ترتیب کو قائم رکھنے کے لئے تو اس نے پوتوں کو محروم رکھا ہے، اس سے بہتر کوئی دوسری ترتیب قائم ہی نہیں کی جاسکتی، کیا کوئی دوسری ترتیب قائم کرسکتا ہے۔؟

حجب کی تلافی کی صورتیں

یہ تو اس کی قانونی حیثیت ہوتی، مگر ہر اسلامی قانون کے پہلو بہ پہلو کچھ اخلاقی تقاضے بھی ہوتے ہیں، اور اسلامی معاشرے کی بے شمار ضرورتیں ان اخلاقی تقاضوں ہی کی وجہ سے پوری ہوتی ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں اسلامی شریعت نے کچھ اخلاقی ہدایتیں ایسی دی ہیں، جن کی تعمیل سے ایک پوتے ہی پر کیا موقوف ہے، خاندان اور معاشرے کے ہر یتیم اور بے سہارے لوگوں کے لئے وہ ہدایتیں سایۂ رحمت بن سکتی ہیں۔

اوپر وصیّت کے سلسلے میں یہ ذکر آچکا ہے کہ ہر مورث کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی جائداد میں ⅓ کو جس کارِ خیر میں چاہے لگا دے۔ تو اگر ایک دادا چاہے تو اپنے یتیم پوتے کے لئے ⅓ کی وصیت کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی زندگی میں دوسری صورتیں بھی نکال سکتا ہے، پھر اسی کے ساتھ معاشرے اور حکومت کی ذمہ داریاں بھی ہیں کہ وہ ایسے لوگوں کی دیکھ بھال کریں، مگر یہ قانون کے اوپر بھی بڑا ظلم ہوگا کہ ایک فرد کی وجہ سے اس کے پورے نظام کو درہم برہم کر دیا جائے، اور اس کے ساتھ ورثہ پر بھی ظلم ہوگا کہ ان میں قُرب و بُعد کا کوئی فرق نہ کیا جائے۔

یتیموں اور بے سہارا لوگوں کے سلسلے میں قرآن و حدیث کی ہدایات

یتیموں اور بے سہارا لوگوں کے سلسلے میں سرپرستوں اور معاشرے کی خاندان اور حکومت کی کیا ذمے داریاں ہیں ان کو قرآن کی ان آیات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ملاحظہ فرمایا جائے۔

قرآن میں ابتدائے نزول ہی سے جہاں حقوق اللہ کی بنیادی باتوں پر زور دیا جاتا تھا، وہیں بندوں کے مساوی حقوق کی ادائیگی کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی، قرآن میں حقوق عباد کے سلسلے میں ماں باپ کے بعد یتیموں اور بے سہارا لوگوں کی دیکھ بھال کو نیکی کی سب سے بڑی علامت بتایا گیا ہے۔ سورۃ قیامۃ قرآن کی ابتدائی سورتوں میں ہے اس میں بتایا گیا ہے:۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ۔ (قیامۃ)	تو اس شخص نے گھاٹی پار نہیں کی اور جانتے ہو وہ گھاٹی کیا ہے؟ وہ کسی گردن کو آزاد کرنا اور تکلیف و فاقے کے دن میں کسی رشتے دار یتیم کو کھانا کھلانا، یا کسی زمین سے لگے ہوئے محتاج کی مدد کرنا۔

مقصد یہ ہے کہ جو خاندان و معاشرے کے ان بے سہارا لوگوں کی امداد و اعانت کی گھاٹی نہ پار کر سکا، وہ دین اور خلقِ خدا کے فائدے کے دوسرے بڑے کام کیا کر سکے گا، سورۃ ضحیٰ میں ہے:۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (الضحیٰ)

تم یتیم پر کوئی سختی و زیادتی نہ کرو، اور نہ سائل کو جھڑکو۔

جاہلیت میں توانا اور قوی لوگ مورث کا سارا مال سمیٹ لیتے تھے، اس سلسلے میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی کہ انسان کا حال یہ ہے کہ وہ خود ذرا سی تکلیف پر خدا کی شکایت کرتا ہے، لیکن خود اپنے کو نہیں دیکھتا کہ اس کی بداعمالی کا حال یہ ہے کہ :۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحَاضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا۔ (فجر)

ہرگز ایسا نہیں ہے (کہ خدا نے تمہاری قدر گھٹا دی ہے)، بلکہ تم لوگ یتیم کی قدر نہیں کرتے اور نہ دوسروں کو محتاجوں کے کھلانے پر ابھارتے ہو اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر خود کھا جاتے ہو۔

ان آیات کی تفسیر حدیث نبوی میں ملاحظہ کیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ :۔

"جس نے خدا کے لئے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس یتیم کے سر کے ہر بال کے بدلے اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھی جائے گی۔" (ترمذی)

آپ نے فرمایا کہ "یتیم کی کفالت کرنے والا اور میں جنت میں اس طرح قریب قریب ہوں گے، جس طرح ہاتھ کی دو انگلیاں ایک دوسرے کے قریب ہوتی ہیں۔" (بخاری)

آپ نے فرمایا کہ جو شخص یتیم کو اپنے کھانے پینے میں شریک کرلے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت واجب کردے گا۔

آپ نے ان کے ساتھ حسن سلوک کو بھلائی کا معیار اور ان کے ساتھ برائی کو، برائی کا سب سے بڑا نشان بتایا۔ فرمایا :۔

خَيْرُ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ بَيْتٌ فِيْهِ يَتِيْمٌ يُّحْسَنُ اِلَيْهِ وَشَرُّ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِيْنَ بَيْتٌ فِيْهِ يَتِيْمٌ

مسلمانوں میں اس مسلمان کا گھر بہترین گھر ہے، جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو اور مسلمانوں میں سب سے برا گھر اس مسلمان کا ہے،

يُسَاءُ اِلَيہِ۔ (ابن ماجہ) جس میں کوئی یتیم ہو، اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جاتے۔

آپؐ نے کمزوروں کے حقوق کی نگہداشت کی تاکید کرتے ہوتے فرمایا:۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُحَرِّجُ حَقَّ الضَّعِیْفَیْنِ الْیَتِیْمِ وَالْمَرْاَۃِ۔ (نسائی) میں تم کو دو کمزوروں کے حقوق کی تاکید کرتا ہوں یعنی یتیم اور عورت۔ اگر نہ کروگے تو گناہ ہوگا۔

ان ہدایات کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی قانون میں یتیم پوتوں پر ظلم کیا گیا ہے، شریعت کا ظلم تو جب ہوتا کہ وہ نہ تو وراثت کا کوئی پختہ اور پائدار قانون بناتی اور نہ اس کی ترتیب باقی رکھتی، اور نہ اس قانون کے پیچھے کوئی اخلاقی محرک پیدا کرتی، لیکن اس نے ایک طرف تو قانونی ترتیب اور پائداری کو بھی باقی رکھا، دوسری طرف اخلاقی ہدایات کے ذریعہ معاشرے کے افراد میں ایک ایسا زبردست محرک پیدا کر دیا کہ جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی ایمان ہو وہ کبھی اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا، یہ بات ہر وقت ذہن میں تازہ رکھنی چاہیئے کہ اسلامی شریعت کی ہر قانونی دفعہ کے پیچھے ایک اخلاقی محرک بھی ہوتا ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان اخلاقی ہدایتوں کا خیال کون کرتا ہے۔ تو عرض ہے کہ جو لوگ اخلاقی ہدایتوں کی پروا نہیں کر سکتے، ان سے یہ توقع بھی رکھنی چاہیئے کہ وہ قانون کو بھی توڑ سکتے ہیں، اور جو لوگ قانون کی پابندی کریں گے، وہ اس کے اخلاقی تقاضوں کو کبھی چھوڑ نہیں سکتے، کیونکہ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اور پھر اسلام کی اخلاقی ہدایات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی عدم ادائیگی پر کوئی قانونی گرفت بھی نہیں کی جا سکتی، بلکہ بعض صورتوں میں اخلاقی ہدایتیں قانونی دفعات بھی بن جاتی ہیں۔

وہ باتیں جن کی وجہ سے کوئی شخص میراث سے محروم نہیں کیا جا سکتا

(۱) **کم عمری:۔** اگر ایک لڑکا بالغ ہو اور ایک نابالغ، تو نابالغ ہونے کی وجہ سے اس کا حصّہ بالکل لڑکے سے کم نہیں ہوگا۔ بلکہ دونوں کو برابر حصہ ملے گا، حدیث میں آتا ہے کہ:۔

اذا استهل الصبی صلی علیہ وورث۔ جو بچہ زندہ پیدا ہو جائے تو اس پر نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی اور وہ وارث بھی ہوگا۔ (ابن ماجہ، دارمی، مشکوٰۃ ص۲۶۳)

(۲) بیوہ اگر کوئی بیوہ عورت کسی دوسرے شوہر سے نکاح کر لے تو پہلے شوہر کی میراث سے اس کو شرعی حصہ ملے گا، مسلمانوں میں عام طور پر رواج ہے کہ بیوہ عورت اگر نکاح نہ کرے تو اس کو حصہ دیتے ہیں، اور اگر وہ نکاح کر لے تو پھر اس کو شوہر کے ترکے سے محروم کر دیتے ہیں، ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔ اور قرآن وحدیث کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ بیوہ عورت نے نکاح کر کے ایک ثواب کا کام کیا، کوئی جرم تو نہیں کیا کہ اس کی پاداش میں اس کا حق مار لیا جائے۔

(۳) نافرمان لڑکا اگر کسی کا لڑکا نافرمان ہے۔ یا بدکردار ہے، تو اس کی اس نافرمانی اور بدکرداری کی وجہ سے اس کو وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا عام طور پر لوگ اپنی نالائق اولاد کو عاق کر دیتے ہیں، عاق کرنے سے کوئی شخص عاق نہیں ہوتا، اس کو اس کے مورث کے مرنے کے بعد شرعی حصہ ملے گا، ایسے لڑکے کے سلسلے میں حجر (وارڈ) کا قانون جاری ہو سکتا ہے، اس کی تفصیل معاملات کے سلسلے میں آچکی ہے، مختصر یوں سمجھئے کہ اس کو اپنی جائداد اور مال کے تصرف سے عارضی طور پر روکا جا سکتا ہے، مگر بالکل محروم نہیں کیا جا سکتا، حدیث میں ہے:۔

من قطع میراث وارثہ قطع اللہ میراثہ من الجنۃ۔ جو شخص اپنے وارث کو میراث سے محروم کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے جنت کی میراث سے محروم کر دے گا۔ (ابن ماجہ، بیہقی، مشکوٰۃ ص۲۶۶)

مورث کے وہ رشتے دار جو اس کے وارث نہیں ہو سکتے

بعض ایسے اعزہ اور رشتے دار بھی ہوتے ہیں جو وارث نہیں ہوتے مگر عام طور پر لوگ ان کو وارث سمجھتے ہیں، اس لئے ان کی تفصیل یہاں بیان کر دی جاتی ہے،

سوتیلی اولاد ۱۔ سوتیلے باپ کے لڑکے، اپنے سوتیلے باپ کے وارث نہیں ہو سکتے، اسی طرح سوتیلے باپ اپنی سوتیلی اولاد کے وارث نہیں ہو سکتے، مثلاً زاہدہ

نے عمر سے نکاح کیا اور اس کے صلب سے دو لڑکے یا لڑکیاں ہوئیں، پھر عمر کا انتقال ہو گیا، اور زاہدہ نے دوسرا نکاح احمد سے کیا، تو اب عمر کی صلب سے زاہدہ کے جو لڑکے پیدا ہوتے ہیں، وہ احمد کی جائداد سے حصّہ نہیں پائیں گے، اور نہ عمر کے لڑکوں کی کسی جائداد سے احمد حصّہ پائے گا۔

(۲) اسی طرح دو بیویوں کی اولاد اپنے باپ کے ترکے میں سے تو حصّہ پائے گی مگر اپنی سوتیلی ماں کے حصّے سے ترکہ نہیں پائے گی۔ مثلاً خالد نے دو شادیاں طاہرہ اور ذکیہ سے کیں، اور دونوں سے اولاد ہوئیں تو طاہرہ اور ذکیہ دونوں کی اولاد خالد کی جائداد سے تو حصّہ پائیں گی مگر طاہرہ کے بطن کے لڑکے ذکیہ کی جائداد سے حصہ نہیں پائیں گے، اور ذکیہ کے بطن کے لڑکے طاہرہ کی جائداد سے حصہ نہیں پائیں گے، اسی طرح دونوں سوتیلی مائیں اپنی سوتیلی اولاد کی میراث سے بھی حصّہ نہیں پائیں گی۔

شوہر اور بیوی کے اعزّہ وراثت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں —

(۳) شوہر کے ماں باپ، دادا بھائی بہن وراثت پانے کے اعتبار سے بیوی کے لئے اجنبی اور غیر ہیں، اور اسی طرح بیوی کے ماں باپ، بھائی بہن، شوہر کے لئے بالکل اجنبی ہیں، یعنی نہ تو بیوی اپنے ساس سسر اور دیور نند کی میراث سے حصہ پا سکتی ہے، اور نہ شوہر اپنے ساس سسر، سالے اور سالیوں کا ترکہ پا سکتا ہے، مگر یہ حکم اس صورت میں ہے جب میاں بیوی کے اعزّہ میں پہلے سے کوئی خونی رشتہ نہ رہا ہو، وہ بالکل غیر ہوں، اگر ان میں کوئی خونی رشتہ ہوگا، تو وہ ورثہ کی تینوں قسموں میں سے جس قسم میں داخل ہوں گے، اس کے مطابق وہ حصّہ پائیں گے۔

خدمت واحسان کی بنا پر میراث نہیں مل سکتی

حامد زندگی بھر خالد کی دیکھ بھال کرتا، اور اس کی ساری ضروریات پوری کرتا رہا، تو اس خدمت واحسان کے بدلے وہ خالد کی میراث کا حقدار نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کی میراث خالد کے ورثہ کو ملے گی۔ خالد حامد کے لئے وصیّت کر سکتا ہے۔

شریعت کے اس قانون کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کے افراد میں صرف کاروباری تعلقات نہ قائم ہوں اور نہ ان کے افراد ایک دوسرے کی خدمت محض خود غرضی اور نفع اندوزی کی بنیاد پر کریں، بلکہ ان کا مطمح نظر یہ ہو کہ "نیکی کر دریا میں ڈال"۔

اسی طرح اگر کسی مورث کے دو وارث ہیں، ایک اس کا فرماں بردار اور خدمت گذار ہے، اور دوسرا نافرمان اور بے توجہ تو اس کی نافرمانی کی وجہ سے اس کا ترکہ کم نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کی فرماں برداری کی وجہ سے اس کو زیادہ دیا جاسکتا ہے اگر وہ وارث نہیں ہے تو وصیت اور ہبہ کے ذریعہ اسے جو چاہے دے سکتا ہے۔

متبنّیٰ میراث کا مستحق نہیں ہوتا اگر کوئی شخص کسی کے بچے کو اپنا منہ بولا بیٹا، یا کسی بچی کو بیٹی بنالے تو محض متبنّیٰ اور لے پالک بنالینے سے وہ اس کے ترکے کا مستحق نہیں ہو سکے گا اگر کچھ دینا ہے تو اپنی زندگی میں کچھ دے دلا دے مگر مستحق ورثہ کو بالکل محروم کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔

زنا سے رشتۂ وراثت قائم نہیں ہوسکتا زنا سے جو لڑکے لڑکی پیدا ہوں، وہ زانی کے ترکے سے حصّہ نہیں پاسکتے اور نہ زانیہ زانی کی میراث میں حصّہ پائے گی، البتہ یہ لڑکے اور لڑکیاں اپنی زانیہ ماں کے ترکہ سے حصّہ پائیں گے، حدیث میں ہے "الولد للفراش (مشکوٰۃ ص۲۵۶)

جب کوئی وارث نہ ہو اگر کسی آدمی کا کوئی وارث کسی قسم کا نہ ہو تو اس کا مال جہاں اسلامی حکومت ہے اس کے قبضے میں چلا جائے گا، اور جہاں اسلامی حکومت نہ ہو وہاں اس کا مال فقراء اور مساکین پر تقسیم کیا جائے گا یا کسی کار خیر میں لگا دیا جائے گا اور فقراء و مساکین میں مقدم وہ لوگ ہوں گے جو میت کے عزیز و اقارب ہیں مگر ان کا کوئی شرعی حق اس کے ترکے میں نہیں ہے۔

میراث کی تقسیم کا طریقہ اس تمہید کے بعد وراثت کی تقسیم کے مختلف طریقے اور ورثہ کے حصّوں کی مقدار کی تفصیل کی جاتی ہے،

ورثہ کی قسمیں

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ورثہ کی تین قسمیں ہیں، پہلے ذوی الفروض، جن کا حصہ قرآن پاک میں متعین ہے۔ دوسرے عصبہ جو مورث سے اپنے نسبی تعلق کی بنا پر حصہ پاتے ہیں، ان کا حصّہ مقرر نہیں ہے، بلکہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو بچے گا وہ ان کا ہوگا، ان کی تین قسمیں ہیں، تیسرے ذوی الارحام جو نہ ذوی الفروض میں ہوں اور نہ عصبہ ہوں۔ ان کے علاوہ بعض اور ضمنی ورثہ بھی ہیں، مثلاً مولی العتاقہ، مولی الموالاۃ، مقر لہ بالنسب وغیرہ، مگر مذکورہ بالا تین ورثہ ہی اصل ہیں اس لئے انہی کا بیان کیا جاتا ہے۔

ذوی الفروض

ذوی الفروض ان ورثہ کو کہتے ہیں، جن کے حصے کی مقدار قرآن و حدیث میں مقرر کر دی گئی ہے، جب تک ان لوگوں کو حصّہ نہ ملجائے اس وقت تک دوسرے قسم کے ورثہ کو کچھ نہیں ملے گا، سورہ نساء کے دوسرے رکوع میں ان تمام ذوی الفروض کا ذکر ہے، یہ کل تیرہ ہیں، باپ، دادا، ماں، بیٹی، پوتی، شوہر، بیوی، حقیقی بہن، اخیافی بھائی، اخیافی بہن، علاتی بہن، جدہ یعنی دادی، نانی۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ وراثت کا بیان قرآن میں بڑی تاکید کے ساتھ شروع کیا گیا ہے، اور بڑی تاکید و عید پر ختم ہوا ہے، پہلی اور آخری آیتیں ملاحظہ ہوں۔

يُوصِيكُمُ اللهُ..... تِلْكَ حُدُودُ اللهِ خدا تعالیٰ تاکید کے ساتھ تقسیم وراثت کا حکم کرتا ہے، اور یہ خدا کے حدود ہیں، آگے حدود کے توڑنے والے کے حق میں سخت وعید آئی ہے، پوری آیتیں نقل کی جاچکی ہیں۔

(۱) باپ کی حیثیت اور اس کا حصّہ

باپ اصل ہے تو ذوی الفروض میں لیکن بعض وارثوں کے موجود نہ ہونے کی صورت میں وہ عصبہ بھی ہو جاتا ہے، ذوی الفروض ہونے کی حیثیت سے اس کا حصہ ⅙ سے کبھی کم نہیں ہوتا، مگر اسی کے ساتھ جب وہ عصبہ بھی ہو جاتا ہے، تو کبھی ⅙ اور کبھی اس سے زائد حصہ بھی وہ پا جاتا ہے، اس اعتبار سے اس کے ترکے پانے کی تین صورتیں ہوتی ہیں،

(۱) چھٹا حصہ ⅙ اس کو اس صورت میں ملتا ہے جب میّت نے اپنی کوئی نرینہ اولاد یا نرینہ

اولاد کی کوئی اولاد چھوڑی ہو، مثلاً احمد ایک بیوی، والد اور ایک لڑکا چھوڑ کر مرا۔ اب اگر اس کی کل جائداد کو ۲۴ حصے میں تقسیم کر لیا جائے، تو اس میں سے ⅛ یعنی ۳ حصے بیوی کو اور ⅙ یعنی ۴ حصے باپ کو اور بقیہ ۱۷ حصے لڑکے کو ملیں گے۔

احمد مورث

ورثہ

لڑکا	باپ	بیوی
۱۷	۴	۳
بقیہ	چھٹا	آٹھواں

گویا جب میت کے کوئی نرینہ اولاد ہو گی، تو باپ کو ⅙ ہی ملے گا اس سے زیادہ نہیں مل سکتا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ میت نے کوئی نرینہ اولاد تو نہ چھوڑی، لیکن کوئی مؤنث اولاد بیٹی، پوتی، یا پرپوتی چھوڑی ہو تو اس صورت میں بھی باپ کا اصل حصہ تو ⅙ ہی رہے گا، لیکن مؤنث اولاد کی موجودگی میں وہ ذوی الفروض کے ساتھ عصبہ بھی بن جاتا ہے، اس لئے جتنے ذوی الفروض ہیں ان کو دینے کے بعد جو کچھ باقی رہ جائے گا وہ بھی باپ ہی پائے گا۔ مثلاً اوپر کی مثال میں اگر لڑکے کی جگہ لڑکی ہوتی تو یہ تقسیم اس طرح ہوتی۔

احمد مورث

ورثہ

بیٹی	باپ	بیوی

۲۴ حصوں میں سے ⅛ یعنی ۳ حصے بیوی کو اور ½ یعنی ۱۲ حصے بیٹی کو اور ⅙ یعنی ۴ حصے باپ کو ملتے۔ اب جو پانچ حصے بچ گئے ہیں وہ بھی باپ کو بحیثیت عصبہ مل جائیں گے اور اگر بیٹی نہ ہوتی تو بقیہ ۱۲ حصے بھی باپ ہی مل جاتے۔ ۴ تو بحیثیت ذوی الفروض اور بقیہ بحیثیت عصبہ کے۔ قرآن میں ان دونوں صورتوں کا ذکر ہے:۔

وَلِاَبَوَیۡهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ اگر میت نے کوئی اولاد چھوڑی ہے تو

مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ (نساء) اس کے ترکے سے والدین کو چھٹا حصہ ملے گا۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ میّت کے نہ نرینہ اولاد ہو اور نہ بیٹی پوتی وغیرہ ہو تو اس صورت میں باپ کا کوئی خاص حصہ مقرر نہیں ہے بلکہ دوسرے ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچ جائے گا وہ سب باپ کو ملے گا، مثلاً خالد نے تین وارث چھوڑے ماں باپ اور بیوی تو اگر اس کی جائداد کو ۴ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا تو اس میں سے ¼ بیوی کو اور بقیہ ۳ حصے میں سے ⅓ یعنی ایک حصہ ماں کو اور باقی دو حصے باپ کو ملیں گے۔

غرض یہ کہ اس کی تین حیثیتیں ہوئیں کبھی وہ صرف ذوی الفروض رہتا ہے، جیسا کہ پہلی صورت میں ذکر کیا گیا، اور کبھی ذوی الفروض بھی ہوتا ہے اور عصبہ بھی ہوتا ہے جیسا کہ دوسری صورت میں تھا، اور کبھی صرف عصبہ ہی رہتا ہے جیسا کہ تیسری صورت میں تھا۔

دادا کی حیثیت اور اس کا حصّہ

دوسرا ذوی الفروض دادا ہے، جس طرح باپ ذوی الفروض میں بھی ہے اور بعض ورثہ کی غیر موجودگی میں عصبہ بھی ہو جاتا ہے، اسی طرح دادا بھی، گویا دادا کی وہی تین حیثیتیں ہیں، جو باپ کی ہیں، لیکن یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ میّت کے دادا کو اسی وقت حصّہ ملے گا، جب باپ زندہ نہ ہو، اگر باپ زندہ ہوگا تو دادا کو ترکے میں کچھ بھی حصّہ نہیں ملے گا، برخلاف باپ کے کہ اس کے حصے پر کسی کے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی اثر نہیں ہوتا، البتہ کم و بیش ہو جاتا ہے، باپ اور دادا میں اتنا فرق اور بھی ہے کہ میّت جب دوسرے ذوی الفروض کے ساتھ ماں اور باپ دونوں چھوڑے گا، تو دوسرے ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے گا، اس میں سے ⅓ ماں کو ملے گا، اس کے بعد جو کچھ بچے گا وہ سب باپ کو مل جائے گا، جس کی وجہ سے باپ کا حصّہ کچھ زیادہ ہو جائے گا اور اگر میّت نے دادا اور ماں کو ساتھ چھوڑا ہے، تو اس صورت میں ماں کُل جائداد کا ⅓ پائے گی، اس لئے دادا کو کچھ کم ملے گا، یہی حکم پردادا اور اس کے اوپر والوں کا ہے، یعنی میت کے باپ کا حصّہ ماں کی موجودگی میں تو کم نہیں ہوتا مگر دادا کا حصہ کم ہو جاتا ہے۔

قرآن پاک میں باپ (آباء) کا ذکر ہے، دادا کا ذکر نہیں ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادا کو باپ کی غیر موجودگی میں وارث بنایا ہے۔ اس سے قرآن کے لفظ آباء کی تفسیر ہوگئی، اب کسی کو اس میں تبدیلی کا حق نہیں ہے۔ اس پر امت کا اجماع ہو چکا ہے۔

(۳) ماں کی حیثیت اور اس کا حصّہ

تیسری ذوی الفروض ماں ہے، باپ کی طرح ماں بھی نہ تو کبھی ترکہ سے محروم ہوتی ہے اور نہ باپ کی طرح اس کا حصّہ کبھی ۱/۶ سے کم ہوتا ہے۔ حصّے کے اعتبار سے ماں کی بھی تین حیثیتیں ہیں :-

(۱) اگر میّت کے ورثہ میں دو طرح کے ورثہ میں سے ایک قسم کے بھی وارث ہوں گے، تو اس کی ماں کو ترکے کا ۱/۶ ملے گا، وہ دو یہ ہیں۔

(الف) ایک یہ کہ میت کے کوئی لڑکا، لڑکی، یا پوتا، پوتی، یا پرپوتا، پرپوتی موجود ہو۔

(ب) دوسرے یہ کہ میت کے مذکورہ ورثہ تو نہ ہوں مگر دو بھائی یا دو بھائی بہن یا صرف دو بہنیں ہوں تو ان دونوں صورتوں میں ماں کو صرف ۱/۶ ملے گا، بھائی بہن خواہ حقیقی یا اخیافی ہوں یا علّاتی سب کا ایک ہی حکم ہے۔

(۲) اگر میت مرد ہے اور اس نے اپنے ورثہ میں ماں کے ساتھ بیوی اور باپ دونوں چھوڑے ہیں یا میت عورت ہے اور اس نے ماں کے ساتھ شوہر اور باپ دونوں چھوڑے ہیں تو میت کے مرد ہونے کی صورت میں بیوی کا حصہ اور میّت کے عورت ہونے کی صورت میں شوہر کا حصّہ نکال لینے کے بعد جو کچھ باقی رہے گا اس میں ماں کو تہائی یعنی ۱/۳ ملے گا۔

(۳) اگر ان مذکورہ بالا ورثہ میں سے کوئی موجود نہ ہو تو پھر میت کی ماں کو اس کے کل ترکے کا ۱/۳ ملے گا۔

غرض یہ کہ پورے ترکے کا ۱/۳ ماں کو اس وقت ملے گا جب تین شرطیں پائی جائیں۔

ایک یہ کہ میّت کے بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی یا پرپوتی وغیرہ کوئی نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ میت کے دو یا دو سے زیادہ بھائی بہن موجود نہ ہوں، اگر بھائی بہن دو کے بجائے ایک ہو، تو پھر ماں کا حصّہ کم نہ ہوگا۔

تیسرے یہ کہ مورث عورت کا شوہر اور اس کا باپ یا مرد مورث کی بیوی اور باپ دونوں ساتھ ساتھ موجود نہ ہوں، اگر ان میں سے ایک ہوگا تو پھر ماں کو کل ترکے کا ⅓ ہی ملے گا، قرآن میں ماں کے حصّے کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

وَلِاَبَوَیۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ۔

(نساء)

اگر میت کی کوئی اولاد زندہ ہے تو ماں باپ دونوں کے لئے ترکے میں چھٹا چھٹا حصہ ہے اور اگر کوئی اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کا حصہ ایک تہائی ہے (اس سے خود معلوم ہوگیا کہ باپ کو دو تہائی ⅔ ملے گا)

(۴) بیٹی کی حیثیت اور اس کا حصّہ

چوتھی ذوی الفروض بیٹی ہے، ماں باپ کی طرح بیٹی بھی ذوی الفروض میں ہے اور وہ کبھی محروم نہیں ہوتی، البتہ اگر اس کا بھائی یعنی میت کا لڑکا زندہ ہوتا تو وہ عصبہ بن جاتی ہے، اس کے حصے پانے کی تین صورتیں ہیں اور تینوں صورتوں میں اس کا حصّہ کم و بیش ہوتا ہے۔

(۱) اگر میت نے صرف ایک لڑکی چھوڑی ہو، اور لڑکا نہ چھوڑا ہو تو لڑکی کو ترکے کا نصف ½ ملے گا۔ اگر اس کے علاوہ دوسرے وارث ہوں تو ½ ان میں تقسیم ہوگا، اگر کوئی دوسرا وارث نہ ہو تو پھر وہ نصف بھی لڑکی ہی کو ملے گا۔

(۲) یہ تو اس صورت میں تھا جب ایک لڑکی چھوڑی ہو اور کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو، اگر اس نے دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں چھوڑی ہوں اور ان کے ساتھ کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو، تو پھر ان لڑکیوں کو کل ترکے کا دو تہائی ⅔ ملے گا، اس دوثلث کو تمام لڑکیاں برابر تقسیم کرلیں گی، اگر کوئی دوسرا وارث موجود نہ ہو تو بقیہ ⅓ بھی لڑکیوں کو مل جائے گا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ میّت نے لڑکی اور لڑکے دونوں چھوڑے ہیں، اس صورت میں بھائی بہن دونوں عصبہ ہو جائیں گے، ان کا کوئی حصّہ مقرر نہیں ہے، بلکہ دوسرے ذوی الفروض ورثہ کو دے کر جو کچھ بچ جائے گا، وہ سب یہ دونوں تقسیم کرلیں گے، اس میں لڑکی کو لڑکے کا

آدھا حصّہ ملے گا۔

قرآن میں بیٹی کے حصّے کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِی اَولَادِکُم لِلذَّکَرِ مِثلُ حَظِّ الاُنثَیَینِ فَاِن کُنَّ نِسَاءً فَوقَ اثنَتَینِ فَلَھُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ وَاِن کَانَت وَاحِدَۃً فَلَھَا النِّصفُ۔	اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ اگر صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں تو دو یا دو سے زیادہ ان کو دوہرا ملے گا ایک ہی ہو اور کوئی لڑکا نہ ہو تو پھر آدھا۔

(یہاں لڑکے کا حکم بیان کیا ہے، اور لڑکے کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ اس کو دوہرا حصّہ ملے گا، تو اس سے خود لڑکی کا حکم معلوم ہوگیا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی)

ہدایت اوپر لڑکی کے حصے کی جو تفصیل بیان ہوتی ہے۔ یہ حکم حقیقی لڑکیوں اور لڑکوں کا بھی ہے اور اخیافی اور علاتی لڑکے لڑکیوں کا بھی ہے۔

۵۔ پوتی اور پرپوتی کے حصّے کا بیان

پانچویں ذوی الفروض پوتی ہے، اگر میت کے لڑکے اور لڑکیاں زندہ نہ ہوں اور ایک یا کئی پوتیاں زندہ ہوں تو اپنے دادا کی میراث کی وہی مستحق ہوں گی، پوتی سے مراد صرف لڑکے کی بیٹیاں ہی نہیں ہیں بلکہ اس میں پوتے کی بیٹی اور پوتی بھی شامل ہے، ان کے میراث پانے کی متعدد صورتیں ہیں اور اسی اعتبار سے ان کا حصہ کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتا ہے۔

(۱) اگر میّت کے کوئی لڑکا یا لڑکی زندہ نہ ہو بلکہ صرف ایک پوتی ہو تو بیٹی کی طرح اس کو بھی نصف یعنی ½ ملے گا اور اگر کوئی دوسرا وارث نہ ہو، تو بقیہ ½ کو بھی اسی کو مل جائے گا۔

(۲) یہ تو ایک پوتی کا حکم تھا، اگر میت کے کوئی لڑکا یا لڑکی زندہ نہ ہو اور صرف دو پوتیاں زندہ ہوں تو دو لڑکیاں جس طرح دو ثلث کی وارث ہوتی ہیں، اسی طرح یہ بھی ہو جائیں گی اور آپس میں برابر تقسیم کرلیں گی۔

(۳) اگر میت کے کوئی لڑکا یا لڑکی تو موجود نہ ہو، مگر پوتا اور پوتی دونوں موجود ہوں، تو

اس کا حکم بھی وہی ہے، جو لڑکی کے سلسلے میں تیسری صورت میں بیان کیا گیا ہے یعنی ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے پوتے پوتیاں آپس میں تقسیم کرلیں گی، مگر تقسیم میں بات ملحوظ رہے گی کہ پوتی، پوتے کا آدھا حصہ پائے گی۔

ہدایت اوپر کی دو صورتوں میں تو پوتی اور پرپوتی دونوں کی حیثیت ایک ہی تھی لیکن تیسری صورت میں پرپوتی حصہ نہیں پائے گی، کیونکہ پوتے کی موجودگی میں وہ محروم قرار دی جائے گی۔

(۴) اگر میت کے بیٹا یا پوتا موجود نہ ہو صرف ایک بیٹی اور پوتیاں ہوں تو پوتیوں کو صرف ۱/۶ ملے گا، خواہ ایک ہو یا کئی ہوں۔ لیکن اگر دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو پھر پوتیاں بالکل محروم رہیں گی۔

ہدایت یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتیاں اور پوتیوں کی موجودگی میں پرپوتیاں محروم رہیں گی۔

ہدایت اوپر پوتیوں کا جو حال بیان ہوا ہے، اس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ سب ایک ہی بیٹے کی اولاد ہوں، اگر وہ کئی باپ کی اولاد ہوں گی، جب بھی سب کو برابر حصہ ملے گا، مثلاً اگر کسی کے ایک لڑکی اور کسی کے دو لڑکیاں ہیں تو یہ نہیں ہوسکتا کہ دو ثلث میں ایک ایک لڑکی لے لے، اور دوسرے باپ کی دو لڑکیاں آدھے میں سے آدھا لیں بلکہ تینوں کو برابر حصہ ملے گا، جس طرح دادا باپ کی غیر موجودگی میں باپ کا جانشین ہوتا ہے اسی طرح پوتی بیٹی کی جانشین ہوتی ہے۔

۶۔ شوہر کی حیثیت اور اس کا حصہ چھٹا ذوی الفروض وارث شوہر ہے، یعنی اگر کسی کی بیوی مرجائے اور وہ کچھ ترکہ چھوڑ جائے، تو اس میں سے شوہر کو بھی حصہ ملے گا، ماں، باپ اور بیٹے بیٹیوں کی طرح یہ بھی کبھی محروم نہیں ہوتا، میراث پانے کے اعتبار سے اس کی دو حالتیں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ بیوی کا انتقال ہوگیا اور اس نے کچھ ترکہ چھوڑا ہے، تو اگر اس کے کوئی لڑکا لڑکی، پوتا، پوتی وغیرہ زندہ نہیں ہے، تو اس صورت میں شوہر کو بیوی کے ترکے کا آدھا حصہ

ملے گا، اور بقیہ ترکہ دوسرے ورثہ میں تقسیم ہوگا، مثلاً زاہدہ کا انتقال ہوا، اور اس نے اپنے بعد شوہر اور ماں باپ چھوڑے تو اس کی جائداد کے چھ حصے کئے جائیں گے، اور اس چھ میں سے آدھا یعنی تین حصے شوہر کو مل جائیں گے، اور بقیہ تین میں ۱/۳ یعنی ایک حصہ ماں کو اور بقیہ دو حصے یعنی ۲/۳ باپ کو ملے گا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ بیوی نے کوئی نرینہ اولاد یا بیٹی پوتی وغیرہ چھوڑی ہو تو اس صورت میں شوہر کو چوتھائی ملے گا، مثلاً اوپر کی مثال میں اگر زاہدہ نے لڑکا بھی چھوڑا ہوتا تو اس کے شوہر کو ۱/۲ کے بجائے ۱/۴ ملتا۔

ہدایت اگر بیوی کی اولاد کسی دوسرے شوہر سے ہو جب بھی موجودہ شوہر کو ۱/۴ ہی ملے گا، شوہر کے حصے کا ذکر قرآن میں تفصیل سے ہے:۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ۔	اور بیوی کے ترکے کا تم کو آدھا اس صورت میں ملے گا جب کوئی اولاد نہ چھوڑ جائیں، اگر انھوں نے کوئی اولاد چھوڑی ہو تو پھر تم کو چوتھائی ۱/۴ ملے گا۔

(۷) بیوی کا حصہ ساتویں ذوی الفروض بیوی ہے، جس طرح شوہر اپنی بیوی کے ترکے محروم نہیں ہو سکتا، اسی طرح بیوی بھی شوہر کے ترکے سے محروم نہیں ہو سکتی، اور جس طرح ترکہ پانے کے اعتبار سے شوہر کی دو حیثیتیں ہیں اسی طرح بیوی کی بھی دو حیثیتیں ہیں۔

(۱) اگر شوہر نے کوئی لڑکا لڑکی یا پوتا پوتی نہ چھوڑی ہو تو بیوی کو اس کے کل ترکے کا چوتھائی یعنی ۱/۴ ملے گا۔

(۲) اگر شوہر نے کوئی مذکر یا مونث اولاد یا پوتے پوتیاں چھوڑی ہوں تو پھر بیوی کو چوتھائی کے بجائے آٹھواں حصہ ۱/۸ ملے گا۔

ہدایت شوہر کی اولاد سے مراد صرف موجودہ بیوی کے بطن ہی کی اولاد نہیں ہے، بلکہ اگر دوسری بیوی سے بھی اس کے کوئی اولاد ہوگی تو اس صورت میں بھی بیوی

کو ¼ ہی ملے گا، قرآن میں دونوں صورتوں کا ذکر ہے :۔

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ۔ (نساء)	اور بیویوں کو تمہارے ترکے کا چوتھائی ¼ اس صورت میں ملے گا جب تمہاری کوئی اولاد موجود نہ ہو اور اگر کوئی اولاد ہوگی تو پھر ان کو آٹھواں حصّہ ⅛ ملے گا۔

عدّت کے اندر میراث

اگر کسی شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق رجعی یا بائن دے دی ہو اور ابھی طلاق کی عدت نہ گذری ہو کہ اس کا انتقال ہو جائے تو یہ بیوی اس کی میراث سے اپنا شرعی حصہ پانے کی مستحق ہوگی، البتہ اگر عورت نے خود شوہر کو کچھ دے دلا کر طلاق لی ہو، یا خلع و تفریق کرائی ہو، تو پھر وہ عدت میں میراث کی مستحق نہیں ہوگی، اسی طرح اگر عدت گذر گئی، اس کے بعد اس کا انتقال ہوا جب بھی وہ میراث نہیں پائے گی۔

(۸) اخیافی بھائی

آٹھویں ذوی الفروض میں اخیافی بھائی ہیں، یعنی میت کے وہ بھائی جن کی ماں ایک ہو، مگر باپ ان کے جدا جدا ہوں ان کا حال ماں باپ اور لڑکے لڑکیوں کی طرح نہیں ہے، بلکہ یہ کبھی تو حصہ پاتے ہیں اور کبھی محروم ہو جاتے ہیں، ان کے حصہ پانے کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) اگر میت کے کوئی لڑکا لڑکی یا باپ دادا یا پوتا پرپوتا کوئی بھی موجود ہوگا تو یہ ترکے سے محروم رہیں۔ ان کے علاوہ کوئی وارث ہو، تو یہ محروم نہیں ہوں گے، مثلاً خالد نے اگر باپ اور دو اخیافی بھائی چھوڑے ہیں، تو اس کے اخیافی بھائی محروم رہیں گے، اسی طرح اگر لڑکے یا لڑکی کے ساتھ اخیافی بھائی چھوڑے ہوں تب بھی اخیافی بھائی محروم رہیں گے، کیونکہ پہلی صورت میں باپ اور دوسری صورت میں لڑکے لڑکی موجود ہیں اور ان کی موجودگی میں یہ محروم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی موجود نہ ہو اور صرف اخیافی بھائی ہوں تو پھر اخیافی بھائی کو حصہ ملے گا، ان کے حصہ پانے کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ اگر اخیافی بھائی صرف ایک ہو تو اس کو صرف چھٹا حصہ ⅙ ملے گا، قرآن میں ہے :-

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ۔ (نساء)

اگر کوئی میت خواہ مرد ہو یا عورت ایسے ہیں جن کی میراث دوسروں کو ملنے والی ہے اور اس کے اصول و فروع میں کوئی زندہ ہے اور اس کے ایک اخیافی بھائی یا بہن ہے، تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

(۲) دوسرے یہ کہ دو یا دو سے زیادہ بھائی یا بھائی بہن مل کر ہوں تو یہ جتنے زیادہ بھی ہوں ان کو ترکہ کا ⅓ تہائی ملے گا، اور یہ آپس میں برابر برابر تقسیم کر لیں گے، جیسا کہ قرآن میں ہے :-

فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ۔ (نساء)

اگر یہ ایک سے زیادہ ہوں تو پھر ایک تہائی ⅓ میں سب برابر کے شریک رہیں گے۔

ضروری ہدایت اوپر جتنے ورثہ کا ذکر کیا گیا ہے اور آئندہ جتنے ورثہ کا ذکر ہوگا، ان میں ہر جگہ یہ قاعدہ ملے گا کہ بھائی کو بہن سے دوگنا حصہ ملے گا، یہ صرف اخیافی بھائی بہنوں ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ جب دو یا اس سے زیادہ ہوں گے، تو بھائی بہن دونوں کا حصہ برابر ہوگا۔ اس کی وجہ اوپر بیان کر دی گئی ہے۔

(۹) اخیافی بہن نویں ذوی الفروض اخیافی بہن ہے۔ جس طرح اخیافی بھائی کے حصہ پانے یا نہ پانے کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں، اسی طرح اخیافی بہنوں کے حصہ پانے یا نہ پانے کی بھی تین صورتیں ہیں، ان میں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے اخیافی بھائی کے حصے کے لئے جو مثالیں دی گئی ہیں ان کی جگہ اگر اخیافی بہنوں کا نام لکھ دیا جائے تو ان کے حصے کی تفصیل بالکل ذہن میں آجائے گی، قرآن کی آیت جو اوپر نقل کی گئی ہے، اس میں بھی بھائی کے ساتھ بہن کا ذکر ہے۔

(۱۰) حقیقی بہنیں اخیافی بھائی بہنوں کے بعد اب حقیقی بہنوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ حقیقی اور علاتی بھائی ذوی الفروض میں نہیں بلکہ عصبہ میں ہیں، اس لئے ان کا بیان عصبات میں کیا جائے گا، البتہ حقیقی اور علاتی بہنیں ذوی الفروض میں ہیں اس لئے ان کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

حقیقی بہنیں دسویں ذوی الفروض ہیں، اخیافی بھائی بہنوں کی طرح یہ بھی ہر حال میں نہ تو حصہ پاتی ہیں اور نہ ہر حال میں ان کے حصے کی مقدار ایک ہی ہوتی ہے، ان کے حصہ پانے، یا نہ پانے کی کل پانچ صورتیں ہیں۔

(۱) جس طرح اوپر اخیافی بھائی بہنوں کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر میّت کے باپ دادا یا بیٹا پوتا وغیرہ موجود ہوں گے، تو ان کو حصہ نہیں ملے گا، بالکل اسی طرح ان کی موجودگی میں حقیقی بہنوں کو بھی کچھ نہیں ملے گا، وہ ترکے سے بالکل محروم رہیں گی۔

اگر میت کے مذکورۂ بالا ورثہ میں سے کوئی موجود نہ ہو تو اس صورت میں بہنوں کو حصہ ملنے کی چار صورتیں ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ میت کی تنہا ایک حقیقی بہن ہو تو اس صورت میں اس کو کل ترکے کا نصف یعنی $\frac{1}{2}$ ملے گا۔

۲۔ دوسرے یہ کہ دو بہنیں یا ان سے زیادہ ہیں تو ان کو ترکے کا دوثلث یعنی $\frac{2}{3}$ ملے گا اس دوثلث کو یہ سب آپس میں برابر تقسیم کرلیں گی۔

۳۔ میّت کے باپ دادا، لڑکے اور پوتے میں سے کوئی زندہ نہ ہو، مگر بیٹی یا پوتی یا پرپوتی میں سے کوئی موجود ہو تو بہن عصبہ ہوجائے گی، یعنی تمام ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے گا، وہ حقیقی بہن کو ملے گا، مثلاً کسی نے ایک بیٹی، ایک بیوی اور ایک حقیقی بہن چھوڑی تو اگر اس کے ترکے کو آٹھ حصّوں میں تقسیم کریں گے تو نصف یعنی $\frac{1}{2}$ یعنی ۴ حصّے لڑکی کو اور آٹھواں حصہ یعنی $\frac{1}{8}$ ۲ حصے بیوی کو اور بقیہ $\frac{3}{8}$ یعنی تین حصے بہن کو ملیں گے۔

۴۔ اگر میت نے بہن کے ساتھ ایک یا کئی بھائی بھی چھوڑے ہیں تو اب بہن براہِ راست نہیں بلکہ بھائی کے ساتھ عصبہ ہوجائے گی، یعنی ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے گا،

یہ بھائی بہن بطور عصبہ تقسیم کرلیں گے، بھائی کو دوگنا اور بہن کو ایک گنا ملے گا، مثلاً سلمیٰ نے ایک بھائی، ایک بہن، شوہر، والدہ اور ایک لڑکی چھوڑی تو اس کے ترکے کو ۳۶ حصوں میں تقسیم کیا جائے، اور اس کی تقسیم اس طرح کی جائے۔ شوہر کو $\frac{1}{4}$ والدہ کو $\frac{1}{6}$ لڑکی $\frac{1}{2}$، اب باقی تین حصے بچے جس میں ایک بہن کو اور دو بھائی کو۔

سلمیٰ میت، کل ترکہ ۳۶ حصے

شوہر	والدہ	لڑکی	باقی بچے تین حصے ، ایک بہن کو اور دو بھائی کو	
چوتھائی	چھٹا	آدھا	۱	۲
۴	۶	۱۸		

ہدایت حقیقی بہن، حقیقی بھائی کی موجوگی میں عصبہ ہوکر اپنے بھائی سے کم حصہ پائے گی، لیکن اگر حقیقی بھائی زندہ نہ ہوں، بلکہ علاتی بھائی زندہ ہوں تو پھر وہ حقیقی بہن کی موجودگی میں محروم رہیں گے، قرآن میں ہے:۔

اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ۔

(نساء)

اگر کوئی ایسا شخص مرجائے جس کے اولاد نہ ہو (نہ ماں باپ ہوں) اور اس کے ایک (حقیقی یا علاتی) بہن ہو تو اس بہن کو اس کے کل ترکے کا نصف $\frac{1}{2}$ ملے گا اور اگر بہن مرجائے تو وہ بھائی اس کے (کل) ترکے کا وارث ہوگا، اگر بہن کے کوئی اولا د نہ ہو (اور نہ والدین زندہ ہوں) اگر ایسی بہنیں دو (یا دو سے زیادہ) ہوں تو ان کو کل ترکے کا دو تہائی $\frac{2}{3}$ ملے گا اور (ایسی میت کے) اگر چند بھائی بہن ہیں، مرد اور عورت کو ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔

(۱) علاتی بہنیں گیارہویں ذوی الفروض علاتی بہنیں ہیں، اگر حقیقی بہنیں نہ ہوں تو علاتی بہنیں ان کے قائم مقام ہوں گی، اور ان کا حکم وہی ہوگا جو

حقیقی بہن کا ہوتا ہے، البتہ جس طرح حقیقی بہن حقیقی بھائی کے ساتھ عصبہ ہو جاتی ہے علاتی بہن حقیقی بھائی کی موجودگی میں عصبہ نہیں ہوگی، بلکہ محروم ہو جائے گی، اور حقیقی بہن موجود ہو تو وہ محروم تو نہیں ہوگی مگر حصہ کم ہو جائے گا، پوری تفصیل ذیل میں ہے۔

۱۔ اگر میت کے اصول یعنی باپ دادا زندہ ہیں، یا فروع لڑکا، پوتا، یا پرپوتا میں سے کوئی زندہ ہے تو پھر حقیقی بھائی بہنوں کی طرح علاتی بھائی اور بہن بھی محروم رہیں گی۔

۲۔ اگر میت کے بیٹی، پوتی، یا پرپوتی میں سے کوئی زندہ ہو، مگر اس کی کوئی حقیقی بہن زندہ نہ ہو، بلکہ صرف علاتی ہی بہنیں ہوں تو ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچ جائے گا، وہ علاتی بہنوں کو مل جائے گا۔

۳۔ اگر میت کے بیٹی، پوتی میں سے کوئی موجود نہ ہو، لیکن حقیقی بہن زندہ ہو تو علاتی بہن کو چھٹا حصہ ملے گا، اگر ایک ہوگی تو اکیلے چھٹے حصے کی مالک ہوگی، اور اگر کئی ہوں گی تو برابر برابر تقسیم کرلیں گی۔

۴۔ میت کے بیٹی، پوتی حقیقی بہن میں سے کوئی نہ ہو اور علاتی بہن صرف ایک ہو تو حقیقی بہن کی طرح اس کو بھی کل ترکے کا نصف ½ ملے گا۔

۵۔ میت کے بیٹی، پوتی اور حقیقی بہن تو زندہ نہ ہوں مگر علاتی بہن ایک کے بجائے کئی ہوں، تو اس صورت میں بھی حقیقی بہنوں کی طرح ترکے کا دو ثلث ⅔ ان کو ملے گا، یہ آپس میں برابر تقسیم کرلیں گی۔

یہ اس صورت کا حکم تھا، جب صرف علاتی بہنیں ہوں، اگر علاتی بہنوں کے ساتھ علاتی بھائی بھی زندہ ہوں تو پھر علاتی بہن اس کے ساتھ عصبہ ہو جائے گی اور ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے گا، آپس میں تقسیم کرلیں گے یعنی بھائی کو دو اور بہن کو ایک حصہ مذکورۂ بالا چار صورتوں میں علاتی بہن کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے، لیکن پہلی صورت کی طرح بعض صورتوں میں ان کو کچھ بھی نہیں ملتا، وہ صورتیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اگر میت کے ایک حقیقی بھائی یا کئی حقیقی بھائی بہن موجود ہوں، تو علاتی بہن ترکے سے محروم رہے گی۔

۲ - میت کے بیٹی یا حقیقی یا علاتی بھائی تو موجود نہ ہوں مگر دو یا دو سے زیادہ حقیقی بہنیں موجود ہوں تو علاتی بہنیں محروم رہیں گی. البتہ اگر ان کا کوئی علاتی بھائی زندہ ہوتا تو پھر یہ عصبہ ہو کر حصہ پاتیں محروم نہ ہوتیں، جیساکہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن میں رہنی چاہیئے کہ دو حقیقی بہنوں کی موجودگی میں علاتی بہنیں محروم رہیں گی، لیکن اگر ایک ہی حقیقی بہن ہوگی تو اوپر ذکر آچکا ہے کہ ان کو ⅙ ملے گا، لیکن ایک بہن کی موجودگی میں وہ اسی وقت حصہ پائے گی، جب میت کے کوئی لڑکی پوتی وغیرہ موجود نہ ہوں، اگر بیٹی یا پوتی کے ساتھ ایک حقیقی بہن بھی موجود ہوگی تو علاتی بہن بالکل محروم ہو جائے گی، کیونکہ بیٹی پوتی وغیرہ کی موجودگی میں حقیقی بہن عصبہ ہو کر پورے حصے کی حق دار ہو جاتی ہے، قرآن کی جو آیت حقیقی بہن کے سلسلے میں نقل کی گئی ہے اس میں علاتی بہن کا حکم بھی موجود ہے۔

(۱۲ و ۱۳) جدّہ یعنی دادی اور نانی کا حصّہ

بارہویں ذوی الفروض جدّہ ہے، عربی زبان میں دادی اور نانی دونوں کو جدّہ کہتے ہیں، چونکہ دونوں کے احکام یکساں ہیں، اسی لئے دونوں کے احکام فقہ کی کتابوں میں ساتھ ہی ساتھ بیان کئے جاتے ہیں، اور اسی لئے ذوی الفروض کی تعداد فقہاء کرام بارہ ہی لکھتے ہیں، لیکن اردو میں چونکہ دونوں کے دو نام ہیں، اس لئے یہاں دونوں کے احکام الگ الگ بیان کئے گئے ہیں اور ذوی الفروض کی تعداد بارہ کے بجائے ۱۳ لکھی گئی ہے۔

ہدایت دادی اور نانی کے مسائل قریب قریب یکساں ہیں، اس لئے دونوں کے حصے کی تفصیل ساتھ ہی ساتھ بیان کی جائے گی۔

۱ - دادیوں اور نانیوں کے حصے کی تقسیم اور ان کا حال سب سے مشکل ہے، اس لئے اسے غور سے پڑھنا چاہیئے۔

۲ - سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ دادی سے مراد صرف باپ کی ماں ہی نہیں ہے بلکہ دادا کی ماں اور دادی کی ماں بھی مراد ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ کسی وقت حصہ پانے کے اعتبار سے کئی دادیاں ہوں، مثلاً ہو سکتا ہے کہ باپ کی ماں بھی زندہ ہو اور دادا اور دادی کی ماں بھی۔

۳ - دادی کی طرح نانی سے بھی مراد صرف ماں کی ماں ہی نہیں ہے، بلکہ ماں کی نانی، اور نانی کی نانی کو بھی عربی میں جدّہ کہتے ہیں اور یہ سب حصہ پاسکتی ہیں۔

۴ - دادیاں اور نانیاں دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک جدّۂ صحیحہ یعنی قریب کی دادیاں نانیاں، دوسرے جدّۂ فاسدہ یعنی دور کی دادیاں اور نانیاں۔

دور کی دادیاں اور نانیاں

جدّۂ فاسدہ یعنی دور کی دادیوں اور نانیوں کا شمار ذوی الفروض میں نہیں بلکہ ذوی الارحام میں ہے، اس لئے ان کے حصوں کا بیان وہاں آئے گا۔

نانیوں میں قریب کی نانیاں وہ ہیں جن کے رشتے میں کوئی مرد درمیان میں نہ آئے بلکہ محض عورت ہی کا رشتہ رہے، مثلاً ماں کے باپ کی ماں بھی نانی ہے۔ مگر وہ دور کی نانی ہے، کیونکہ اس میں مرد کا رشتہ آگیا، برخلاف ماں کی ماں یا نانی کی ماں۔ یہ سب قریب کی نانی یعنی جدّۂ صحیحہ ہیں، کیونکہ اس میں مرد کا رشتہ نہیں ہے۔

جدّۂ صحیحہ کا حکم

(۱) جدّۂ صحیحہ یعنی قریب کی دادیوں اور قریب کی نانیوں کی موجودگی میں جدّۂ فاسدہ کو ترکے سے کوئی حصہ نہیں ملے گا وہ محروم رہے گی۔

(۲) اگر میت کے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہو، تو پھر دادیاں اس کے ترکے سے حصہ نہیں پائیں گی، اسی طرح اگر ماں زندہ ہو تو نانی حصہ نہیں پاتے گی۔

(۳) اسی طرح اگر میت کا دادا زندہ ہو تو دوسری تمام دادیاں محروم رہیں گی، البتہ اگر باپ کی ماں زندہ ہے تو وہ حصہ پائے گی۔

(۴) اگر مذکورۂ بالا ورثہ نہ ہوں تو دادی اور نانی کو ترکے کا ۱/۶ حصّہ ملے گا، اگر قریب کی دادی اور قریب کی نانی دونوں زندہ ہوں تو اسی ۱/۶ میں سب شریک ہوجائیں گی خواہ ایک ہوں یا کئی ہوں۔

(۵) اگر قریب کی نانی اور دور کی دادی دونوں زندہ ہوں تو دور کی دادی قریب کی نانی کے سامنے محروم رہے گی، اسی طرح اگر دور کی نانی کے ساتھ قریب کی دادی زندہ ہو، تو پھر دور کی نانی محروم رہے گی۔

چند ضروری ہدایتیں

(۱) اوپر لکھا گیا ہے کہ باپ اور دادا کی موجودگی میں دادی حصّہ نہیں پائے گی۔ یہ بات صرف دادی کے لئے ہے، نانی اس کے باپ یا دادا کی وجہ سے محروم نہیں ہو گی، وہ صرف میت کی ماں یعنی اپنی بیٹی ہی کی وجہ سے محروم ہو سکتی ہے۔

(۲) اوپر یہ کہا گیا ہے کہ اگر قریب کی نانی اور قریب کی دادی دونوں موجود ہوں، تو یہ سب ۱/۶ میں برابر حصہ پائیں گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنی بھی قریبی نانیاں یا دادیاں ہونگی سب کا حصّہ برابر ملے گا، یہ نہیں ہو سکتا کہ اگر دادی ایک ہو اور نانیاں کئی ہوں تو آدھا دادی کو دے دیا جائے گا، اور آدھے میں تمام نانیاں شریک ہوں گی، بلکہ ان سب کو سامنے رکھ کر برابر حصہ لگایا جائے گا۔

(۳) قریب درجے کی نانی کی موجودگی میں دور کی دادی اور قریب کی دادی کی موجودگی میں دور کی نانی محروم رہے گی۔

ذوی الفروض کے حصوں کی تقسیم ختم ہوئی اب عصبات کے حصوں کی تفصیل کی جاتی ہے۔

عصبات کا بیان

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچ جائے گا وہ عصبات کو ملے گا، عصبات دو طرح کے ہوتے ہیں ایک عصبہ بالغیر یعنی وہ وارث جو دوسروں کے ساتھ عصبہ ہوتے ہیں۔ دوسرے عصبہ بنفسہٖ یعنی جو بجائے خود عصبہ ہوں۔ عصبہ بنفسہٖ ان ورثہ کو کہتے ہیں جو یا تو خود مرد ہوں یا کسی دوسرے مرد کے واسطے سے میت سے رشتہ رکھتے ہوں، جیسے بیٹا، باپ، دادا، پوتا، چچا، بھتیجا وغیرہ، اور عصبہ بالغیر ان کو کہا جاتا ہے جو یا تو خود عورت ہوں، یا کسی عورت کے واسطے سے میّت سے رشتہ رکھتے ہوں۔ مثلاً میت کے بیٹے کے ساتھ بیٹی اور بیٹی کے ساتھ بہن عصبہ بالغیر ہوتی ہے۔

ترکہ پانے کے اعتبار سے عصبات کے چار درجے ہیں

ترکہ میں حصہ پانے کے لحاظ سے عصبات کے چار درجے ہیں، ان ہی کے اعتبار سے یکے بعد دیگرے ان کو حصّہ ملتا ہے۔ اگر پہلے درجے کے

عصبات موجود ہوں گے تو دوسرے درجے کے عصبہ کو عصبہ ہونے کی حیثیت سے کوئی حصّہ نہیں ملے گا، اسی طرح پہلے درجے کے عصبات نہ ہوں تو دوسرے درجے کے عصبات کو حصہ ملے گا، اور تیسرے اور چوتھے درجے کے عصبات محروم رہیں گے۔

ہدایت ایک عصبہ کی موجودگی میں دوسرے عصبہ کے محروم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بحیثیت عصبہ ہونے کے یہ حصہ نہیں پائیں گے، لیکن اگر ان میں سے کوئی عصبہ ذوی الفروض بھی ہے تو پھر اس کو اس حیثیت سے حصہ ملے گا، مثلاً بیٹے کی موجودگی میں باپ کو ذوی الفروض کی حیثیت سے ⅙ ملے گا، لیکن اگر بیٹا نہ ہوتا تو باپ ذوی الفروض کی حیثیت سے بھی حصہ پاتا اور ذوی الفروض کو دینے کے بعد اگر کچھ بچ جاتا تو بحیثیت عصبہ بھی اس کو ملتا مگر بیٹے کی موجودگی میں اس کی ایک ہی حیثیت رہ جاتی ہے۔

پہلے درجے کے عصبات پہلے درجے کے عصبات سے مراد وہ لوگ ہیں جو میت کی نسل سے ہوں، ان میں سب سے مقدم لڑکا ہے، پھر پوتا اور پھر اس کے نیچے کے لوگ، ان کی موجودگی میں عصبہ کی حیثیت سے دوسرے درجے کے ورثہ کو کچھ نہ ملے گا، لیکن ذوی الفروض کی حیثیت سے ان کا جو حصہ ہے وہ ملے گا۔

دوسرے درجے کے عصبات دوسرے درجے کے عصبات میں وہ لوگ ہیں جن کی نسل سے خود مورث ہو، مثلاً باپ، دادا، پردادا وغیرہ، ان کی موجودگی میں تیسرے درجے کے عصبات کو کچھ نہ ملے گا۔

تیسرے درجے کے عصبات تیسرے درجے کے عصبات میں وہ وارث ہیں، جو میت کے علاوہ اس کے باپ کی نسل سے ہوں مثلاً میت کے بھائی، بھتیجے، بھائی کے پوتے وغیرہ۔

چوتھے درجے کے عصبات چوتھے درجے کے عصبات وہ لوگ ہیں جو میت کے دادا کی نسل سے ہوں. مثلاً میت کے چچا، چچا کے لڑکے، چچا کے پوتے وغیرہ۔

ہدایت یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ جس طرح اول درجے کے عصبات کے ہوتے ہوئے

دوسرے درجہ کے عصبات کو اور دوسرے درجے کے عصبات کے ہوتے ہوئے تیسرے اور چوتھے درجے کے عصبات کو حصہ نہیں ملتا۔ اسی طرح ہر درجے کے وارثوں میں بھی کچھ فرق ہے مثلاً اگر پہلے درجے کے عصبات میں تین وارث زندہ ہوں، اور تینوں برابر کے نہ ہوں تو تینوں کو حصہّ نہیں ملے گا، بلکہ ان میں بھی مختلف درجے ہیں۔ مثلاً اگر پہلے درجے کے عصبات میں بیٹا بھی زندہ ہو اور پوتا بھی تو پوتے کو کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ بیٹا میت کا سب سے قریبی ہے اور یہ اصول ہے کہ قریب کی موجودگی میں دور کے لوگوں کو حصہ نہیں ملے گا، کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے، تو تقسیم وراثت میں کوئی نظم قائم ہی نہیں رہ سکتا، اسی اصول کی بنا پر یتیم پوتوں کو بھی محروم ہونا پڑتا ہے، گو اس کی تلافی کے لئے شریعت نے دوسری صورتیں پیدا کی ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ البتہ اگر پہلے درجے کے عصبات کئی ہوں مگر وہ سب کے سب برابر درجے کے ہوں تو پھر ان سب کو برابر حصہّ ملے گا، کیونکہ حق کے اعتبار سے سب لڑکے ایک ہی درجے کے ہیں۔ یہی حال دوسرے درجے کے عصبات کا ہے، مثلاً باپ کی موجودگی میں دادا کو اور دادا کی موجودگی میں پردادا کو حصہ نہیں ملے گا، کیونکہ باپ، دادا سے زیادہ میت کا قریبی ہے

پہلے درجے کے عصبات کے حصہ پانے کی صورتیں

پہلے درجے کے عصبات کے حصہ پانے کی کئی صورتیں ہیں ان میں سے ہر ایک کے حصےّ کی الگ الگ تفصیل کی جاتی ہے۔

بیٹے

(۱) عصبات میں سب سے مقدم میت کے بیٹے ہیں، بیٹوں کی موجودگی میں کوئی عصبہ وارث حصہّ نہیں پا سکتا، البتہ میت کی بیٹیاں عصبہ بالغیر ہو کر حصہّ پاتی ہیں، بیٹوں کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے، اس لئے وہ ذوی الفروض میں نہیں ہیں، لیکن ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ بیٹوں اور ان کے ساتھ بیٹیوں کو مل جائے گا، اسی لئے ان کا حصہ کبھی کم اور کبھی زیادہ ہو جاتا ہے، اگر کوئی ذوی الفروض وارث نہ ہو اور صرف ایک لڑکی اور لڑکا ہو، تو ترکے کا دو تہائی لڑکے کو اور ایک تہائی لڑکی کو مل جائے گا، اگر لڑکی بھی نہ ہو تو کل مال لڑکے کو مل جائے گا، جس قدر ذوی الفروض زیادہ ہوں گے، لڑکے کا حصہ اتنا ہی کم ہوتا جائے گا، مگر کبھی ایسا موقع نہیں آسکتا کہ وہ بالکل محروم

ہو جائے، بلکہ اس کی موجودگی میں ذوی الفروض کا حصہ بہت کم ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو لامحالہ حصہ ملے گا۔

(۲) اگر ایک کے بجائے میت کے کئی لڑکے ہوں تو وہ سب برابر کے حصہ دار ہوں گے۔

(۳) اگر لڑکوں کے ساتھ میت کی لڑکیاں بھی ہوں تو عصبہ بالغیر کہلائیں گی، اور ان کو لڑکوں کا آدھا ملے گا، مثلاً شاہد نے دو لڑکے اور تین لڑکیاں چھوڑیں تو اس کے ترکے کو سات حصّوں میں تقسیم کیا جائے گا اور ان میں سے دو دو حصے دونوں لڑکوں کو اور ایک ایک حصہ لڑکیوں کو دے دیا جائے گا۔ مثلاً

شاہد مورث		کل حصے سات		
لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۲	۲	۱	۱	۱

(۴) اوپر ذکر آچکا ہے کہ پوتے بیٹوں کے سامنے محروم ہو جاتے ہیں، لیکن یہ اسی صورت میں ہے جب دادا نے کوئی جائداد یا مال چھوڑا ہو، اور اس لڑکے کے چچا زندہ ہوں تو وہ دادا کے ترکے سے حصہ نہیں پائے گا، لیکن اگر اس کے باپ نے کوئی جائداد چھوڑی ہے، تو پھر ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے گا، اس کا تنہا وہ مالک ہوگا، اس میں سے ان کے چچا حصہ نہیں لے سکتے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ ایسے پوتوں کے دادا کو ترکے میں کچھ وصیت کر کے ان کے قبضے میں دے دینا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا، تو ان تمام وعیدوں کا مستحق ہوگا، جو یتیم کی پرورش کے سلسلے میں وارد ہوئیں۔

ہدایت بیٹوں کے سلسلے میں نمبر ۲ میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اگر میت کے کئی لڑکے ہوں، تو وہ سب آپس میں برابر تقسیم کر لیں گے تو اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اگر میت کی کئی سوتیلی اولادیں ہوں گی تو ان سب کو بھی برابر حصہ ملے گا، مثلاً فاطمہ کے یکے بعد دیگرے دو نکاح ہوتے تھے، اور دونوں شوہروں سے اس کی اولاد ہوئی تو اس کی موت کے بعد دونوں شوہروں کی اولاد کو اس کی جائداد میں برابر حصہ ملے گا، خواہ ایک شوہر سے ایک ہی اولاد ہو اور دوسرے شوہر سے کئی ہوں، یہ نہیں ہو سکتا کہ دونوں

شوہروں کی اولاد کو ترکے کا آدھا آدھا دے دیا جائے۔

اسی طرح اگر میت عورت نہیں مرد ہے، تو اس کی جتنی بیویوں سے اولاد ہوگی وہ سب برابر حصہ پائیں گی، مثلاً رحمت اللہ نے دو شادیاں کیں، ایک بیوی سے ایک لڑکا، دوسری سے دو لڑکے ہوئے، تو اس کی کل جائداد کے تین حصے کئے جائیں گے، اور ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچ جائے گا وہ تین حصوں میں برابر تقسیم کرکے تینوں لڑکوں کو دے دیا جائے گا یہ نہیں کیا جائے گا، کہ ایک کو تو آدھا دے دیا جائے گا، اور دوسرے دونوں کو آدھے میں سے آدھا آدھا دیا جائے۔

پوتے کا حصہ

(۱) پہلے درجے کے عصبات میں سب سے مقدم بیٹا ہے اور بیٹے کے بعد دوسرا درجہ پوتوں کا ہے، یعنی اگر میت کے کوئی بیٹا زندہ نہ ہو، مگر پوتے زندہ ہوں تو وہ باپ کے قائم مقام ہوں گے۔ یعنی ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ باقی بچے گا وہ سب پوتے کا ہوگا، اور اگر کوئی ذوی الفروض وارث نہ ہو تو کل ترکہ پوتے کو مل جائے گا، اگر ایک کے بجائے کئی پوتے ہوں، خواہ ایک ہی باپ کی صلب سے لڑکے ہوں سب آپس میں برابر تقسیم کرلیں گے۔

(۲) اگر میت کے پوتے بھی ہوں اور ان کے ساتھ پوتیاں بھی ہوں تو پوتیاں پوتوں کے ساتھ عصبہ بالغیر بن کر حصہ پائیں گی، یعنی جس طرح بیٹے کے ساتھ بیٹی حصہ پاتی ہے، اسی طرح پوتے کے ساتھ پوتی حصہ پائے گی۔

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اگر بیٹا زندہ نہ ہو تو پوتا بالکل اس کے قائم مقام ہوتا ہے، صرف دو باتوں میں بیٹے اور پوتے میں فرق ہے۔

(الف) ایک یہ کہ میت کے بیٹوں کی موجودگی میں بیٹیاں ذوی الفروض نہیں رہتیں، بلکہ عصبہ بالغیر ہوکر بیٹوں کا آدھا حصہ پاتی ہیں، لیکن پوتوں کے ساتھ میت کی بیٹیاں یعنی پوتوں کی پھوپھیاں عصبہ نہیں رہیں گی، بلکہ وہ ذوی الفروض ہی رہتی ہیں، یعنی اگر ایک بیٹی ہوگی تو آدھا ترکہ وہ پائے گی، بقیہ دوسرے ذوی الفروض اور پوتا پائیں گے، اور اگر دو یا اس سے زیادہ بیٹیاں ہوں گی، تو دو ثلث وہ سب لے لیں گی، اور باقی میں ذوی الفروض اور پوتے

پائیں گے۔

(ب) دوسرے یہ کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتیاں محروم رہتی ہیں، لیکن پوتے کے ساتھ پوتیاں عصبہ ہو جاتی ہیں اور جس قدر پوتے کو ملتا ہے اس کا آدھا پوتیوں کو ملتا ہے۔

(۳) پوتے کی موجودگی میں پرپوتے اور پرپوتیاں محروم رہتی ہیں۔

پرپوتے جس طرح بیٹے کے زندہ نہ رہنے کی صورت میں پوتا وارث ہوتا ہے، اسی طرح پوتا نہ رہنے کی صورت میں پرپوتے اسی طرح وارث ہوتے ہیں جن کا ذکر پوتے کے سلسلے میں ہوا۔

دوسرے درجے کے عصبات پہلے درجے کے عصبات میں کوئی ذوی الفروض نہیں تھا، مگر دوسرے درجے کے عصبات کی حیثیت دوگونہ ہے، یعنی ان کی اصل حیثیت تو ذوی الفروض ورثہ کی ہے، لیکن اگر درجۂ اول کے عصبات اور بیٹی پوتی وغیرہ زندہ نہ ہوں تو ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ ترکہ بچ جائے گا وہ دوسرے درجے کے عصبات لے لیں گے، دوسرے درجے کے عصبات میں باپ دادا اور پردادا وغیرہ ہیں، ان میں سے ہر ایک کے حصے کی تفصیل بحیثیت ذوی الفروض اوپر بیان کی جاچکی ہے۔ اب یہاں عصبہ کی حیثیت سے ان کو جو حصہ ملے گا، اس کی تفصیل یہ ہے۔

باپ (۱) اگر درجۂ اول کے عصبات موجود نہ ہوں اور نہ میت کی کوئی بیٹی یا پوتی ہو تو ذوی الفروض کے دینے کے بعد جو کچھ بچ جاتے گا، وہ سب باپ کو مل جائے گا، اس صورت میں باپ صرف عصبہ ہی رہ جاتا ہے۔

(۲) اگر اول درجے کے عصبات میں بیٹا، پوتا وغیرہ زندہ نہ ہوں، مگر بیٹی یا پوتی میں سے کوئی زندہ ہو، تو پھر اس صورت میں ذوی الفروض کی حیثیت سے باپ کو چھٹا حصہ ۱/۶ ملے گا اور دوسرے ذوی الفروض کے دینے کے بعد جو کچھ بچ جائے گا، بحیثیت عصبہ وہ بھی اس کو مل جائے گا۔

(۳) درجہ اول کے عصبات یعنی بیٹے یا پوتے کی موجودگی میں باپ عصبہ تو نہیں ہوگا، مگر وہ محروم بھی نہیں ہوگا، بلکہ ۱/۶ ترکہ پائے گا۔

دادا جس طرح اوپر ذوی الفروض کے سلسلے میں ذکر آچکا ہے کہ باپ کی موجودگی میں دادا محروم رہتا ہے، اور جب باپ زندہ نہ ہو تو دادا اس کا قائم مقام ہوتا ہے، بالکل یہی حیثیت دادا کی عصبہ ہونے کی حیثیت سے بھی ہے یعنی اگر باپ زندہ ہوگا تو وہ محروم رہے گا، اور اگر باپ زندہ نہ ہوگا تو دادا اسی طرح حصہ پائے گا، جس طرح باپ کے حصے کی تفصیل اوپر کی گئی ہے، یہی حال پردادا وغیرہ کا بھی ہے۔

باپ اور دادا کی میراث میں دو فرق ہے، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، مختصراً یہاں بھی لکھ دیا جاتا ہے۔

ایک یہ کہ میت کے باپ اور بیوی کی موجودگی میں ماں کا حصہ کچھ کم ہو جاتا ہے یعنی بیوی کو دینے کے بعد پھر ماں کو ⅓ ملتا ہے اور اگر میت کی بیوی کے ساتھ دادا زندہ ہو تو اس صورت میں ماں کو ترکے میں ⅓ ملے گا۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ باپ کی موجودگی میں دادی محروم رہتی ہے مگر دادا کی موجودگی میں دادی محروم نہیں ہوگی۔

تیسرے درجے کے عصبات اگر اول و دوم درجے کے عصبات زندہ نہ ہوں تو پھر ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ باقی رہے وہ تیسرے درجے کے عصبات آپس میں تقسیم کرلیں گے، تیسرے درجے کے عصبات میں بھائی بھتیجے اور بھتیجے کے بیٹے پوتے شامل ہیں، جس طرح اول اور دوم درجے کے عصبات کے درمیان کوئی مقدم اور کوئی موخر ہے، اسی طرح تیسرے درجے کے عصبات میں کوئی مقدم اور کوئی موخر ہے اس میں سب میں سب سے مقدم حقیقی بھائی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس کی میراث کا حال لکھا جاتا ہے۔

(۱) حقیقی بھائی اگر اول اور دوم درجے کے عصبات نہ ہوں تو ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ باقی رہے گا، وہ کل حقیقی بھائی کو مل جائے گا اور اگر کوئی ذوی الفروض نہ ہو تو کل مال بھائی کو مل جائے گا۔

(۲) اگر حقیقی بھائی دو چار ہوں تو وہ سب برابر حصہ پائیں گے۔

(۳) اگر بھائی کے ساتھ حقیقی بہنیں بھی زندہ ہوں تو اب یہ ذوی الفروض نہیں رہیں گی بلکہ بھائیوں کے ساتھ عصبہ ہو جائیں گی اور بھائی کا نصف حصہ پائیں گی۔

(۴) حقیقی بھائی کی موجودگی میں علاتی بھائی اور علاتی بہنیں محروم رہیں گی۔

علاتی بھائی

(۱) اول و دوم درجے کے عصبات بھی نہ ہوں اور حقیقی بھائی بھی زندہ نہ ہو تو پھر میت کا علاتی بھائی اس کا وارث ہو گا، اگر یہ کئی ہوں گے، تو سب برابر تقسیم کر لیں گے۔

(۲) اگر علاتی بھائی کے ساتھ علاتی بہنیں بھی ہوں تو وہ سب اس کے ساتھ عصبہ ہو کر بھائی کا آدھا حصہ لیں گی۔

(۳) جس طرح حقیقی بھائی کی موجودگی میں علاتی بھائی اور بہنیں محروم رہتی ہیں اسی طرح اگر میت کی حقیقی لڑکی موجود ہو جب بھی علاتی بھائی بہن محروم رہیں گے۔

حقیقی بھتیجا

(۱) جب میت کا کوئی حقیقی یا علاتی بھائی موجود نہ ہو تو تیسرے درجے کے عصبات میں بھتیجا وارث ہو گا۔

(۲) اگر بھتیجے کے ساتھ میت کی حقیقی یا علاتی بہنیں بھی زندہ ہوں تو وہ بھائی کے ساتھ تو عصبہ ہو جاتی ہیں، لیکن یہ صورت بھتیجوں کے ساتھ نہیں ہوتی، یعنی وہ بھتیجوں کے ساتھ عصبہ نہیں ہوتیں، بلکہ اپنی اصلی حالت میں ذوی الفروض ہی رہتی ہیں۔

(۳) بھتیجیاں خواہ سوتیلی ہوں یا سگی وہ نہ عصبات میں ہیں اور نہ ذوی الفروض میں، بلکہ ان کا شمار ذوی الارحام کے تیسرے درجے میں ہے۔

(۴) حقیقی بھتیجے کے ساتھ علاتی بھائی کے لڑکے محروم رہیں گے۔

علاتی بھتیجے

علاتی بھتیجوں کا حال بھی قریب قریب وہی ہے جو حقیقی بھتیجے کا ہے۔

حقیقی اور علاتی بھائی کے پوتے

(۱) اگر میت کے کوئی حقیقی یا علاتی بھائی یا ان کے لڑکے زندہ نہ ہوں تو پھر حقیقی بھائی کے پوتے، اور یہ نہ ہوں تو علاتی بھائی کے پوتے میت کی میراث کے وارث ہوں گے۔

(۲) میت کی بہنیں بھائی کے پوتوں کے سامنے بھی عصبہ نہ ہوں گی، بلکہ اپنی اصلی حالت پر ذوی الفروض رہیں گی۔

(۳) حقیقی بھائی کا پوتا نہ ہو تو پھر علاتی بھائی کے پوتے ان ہی شرائط کے ساتھ حصہ پائیں گے۔

چوتھے درجے کے عصبات

(۱) اول و دوم اور سوم درجے کے عصبات میں کوئی نہ ہو تو چوتھے درجے کے عصبات حصہ پائیں گے، چوتھے درجے کے عصبات کی ترتیب یہ ہوگی، سب سے مقدم میت کے چچا، پھر چچا کے بیٹے، پھر اس کے پوتے، پھر باپ کے چچا، پھر ان کے لڑکے اور پوتے۔

چچا کا حصّہ

(۱) باپ کا بڑا بھائی ہو یا چھوٹا، عربی میں اس کو عم کہتے ہیں، مگر اردو میں عموماً باپ کے چھوٹے بھائی کو چچا اور بڑے بھائی کو بڑے ابا، بابا اور تایا وغیرہ کہتے ہیں۔ بہر حال چچا اور تایا دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔ ان کے یہاں چچا کا لفظ کہا جائے گا، وہاں دونوں مراد ہوں گے۔

(۲) پہلے، دوسرے اور تیسرے درجے کے عصبات نہ ہوں گے، تو چوتھے درجے کے عصبات میں سب سے مقدم چچا ہوگا، یعنی ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے گا، وہ چچا کو مل جائے گا، اگر اتفاق سے کوئی ذوی الفروض نہ ہو تو پھر تمام ترکے کا مستحق چچا ہوگا، اگر کئی چچا ہونگے تو جتنا ترکہ ملے گا سب آپس میں برابر برابر تقسیم کرلیں گے۔

(۳) چچا کی موجودگی میں اس کی بہن یعنی میت کی پھوپھی محروم رہے گی۔

(۴) چچا کی بیوی یعنی میت کی چچی کو، چچی ہونے کی وجہ سے اس کی میراث سے کوئی حصہ نہیں ملے گا، البتہ اگر اس میت کا کوئی دوسرا رشتہ یا نسبی تعلق ہو تو اس کی وجہ سے میراث پاسکتی ہے۔

(۵) چچا کی بیٹیاں اپنے بھائیوں کے ساتھ عصبہ نہیں ہوتیں بلکہ وہ محروم رہتی ہیں، ان کا شمار ذوی الارحام میں ہے۔

علاتی چچا

علاتی چچا کے حصہ پانے کی صورتیں بھی وہی ہیں جو حقیقی چچا کے پانے کی ہیں، البتہ حقیقی چچا کی موجودگی میں اس کو کوئی حصّہ نہیں ملے گا، اسی طرح اس کی

موجودگی میں حقیقی چچا کے لڑکے حصہ نہیں پائیں گے، جیسا کہ بھائی کی موجودگی میں بھائی کے لڑکے حصہ نہیں پاتے۔

حقیقی اور علاتی چچا کے لڑکے اور پوتے

(۱) حقیقی اور علاتی چچا کی موجودگی میں ان کے لڑکے محروم رہیں گے، اگر یہ نہ ہوں تو پہلے حقیقی چچا کے لڑکوں کو، اگر وہ نہ ہوں تو پھر علاتی چچا کے لڑکوں کو ترکہ ملے گا، اگر یہ بھی نہ ہوں تو پھر حقیقی چچا کے پوتوں کو، اگر وہ بھی نہ ہوں تو علاتی چچا کے پوتوں کو حصہ ملے گا۔

باپ کے حقیقی اور علاتی چچا

اگر میت کا کوئی مذکورۂ بالا عصبہ وارث موجود نہ ہو تو پھر باپ کے چچا کو یعنی میت کے دادا کے حقیقی بھائی کو ترکہ ملے گا، اگر وہ نہ ہوں تو پھر علاتی چچا کو، اگر یہ بھی نہ ہوں تو ان کے حقیقی لڑکوں کو اور اگر وہ بھی نہ ہوں تو پوتوں کو ملے گا۔

ذوی الارحام کے حصوں کا بیان

اوپر یہ ذکر کئی جگہ آچکا ہے کہ وارث تین طرح کے ہوتے ہیں، ذوی الفروض، عصبہ اور ذوی الارحام اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ سب سے پہلے ذوی الفروض کو حصہ دیا جائے گا، اس کے بعد عصبہ کو، اگر عصبات میں کوئی نہ ہو، تو ذوی الارحام کو دیا جائے گا۔

ذوی الارحام کے معنی

ذوی الارحام ان لوگوں کو کہتے ہیں، جو میت سے کسی عورت کے واسطے سے نسبی تعلق رکھتے ہوں یا وہ خود عورت ہوں، چونکہ رحم کا تعلق عورت سے ہی ہوتا ہے، اسی لئے وہی لوگ ذوی الارحام ہوں گے، جو عورت کے واسطے سے رشتہ رکھتے ہوں، مثلاً نواسے نواسیاں، خالہ، پھوپھی اور ان کی لڑکیاں وغیرہ، سب نانی اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے، وہ ذوی الفروض میں ہے، حالانکہ اس کا تعلق بھی عورت کی وجہ سے ہے۔

ذوی الارحام کی وراثت کے بارے میں ائمہ کرامؒ کی رائے

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو ورثہ کی تین قسمیں کرتے ہیں، اور تیسرے درجے میں وہ ذوی الارحام کو رکھتے ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو پھر

میت کا پورا ترکہ بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا، اور جہاں بیت المال نہ ہوں وہاں غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے گا، مگر امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم صرف دو ہی طرح کے ورثہ کو تسلیم کرتے ہیں، یعنی ذوی الفروض اور عصبہ، اگر ان دونوں میں سے کوئی وارث نہ ہو تو پھر ذوی الارحام کو کچھ نہیں ملے گا، بلکہ سارا ترکہ اسلامی حکومت کے بیت المال کے حوالے کر دیا جائے گا، لیکن چونکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک ہی کے مطابق عام طور پر اسلامی ملکوں میں عمل درآمد ہے اور یہ مسلک دلیل کے اعتبار سے بھی وزنی ہے۔ اوپر قرآن پاک کی آیت گزر چکی ہے، وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (انفال)

اس لئے ہم یہاں اس کو اختصار کے ساتھ لکھتے ہیں، اختصار اس لئے کہ اس کی بہت ہی کم ضرورت پڑتی ہے، مشکل ہی سے کوئی مورث ایسا نکلتا ہوگا، جس کا کوئی نہ کوئی دوری یا قریبی عصبہ وارث نہ نکل آئے۔

بیوی اور شوہر کی موجودگی میں ذوی الارحام کا حصّہ

اوپر کئی بار ذکر آچکا ہے کہ ذوی الفروض اور عصبہ کی موجودگی میں ذوی الارحام کو کچھ نہیں ملے گا، عام طور پر اس قاعدۂ کلیہ کے خلاف نہیں ہوتا مگر تیرہ ذوی الفروض میں سے صرف دو وارث ایسے ہیں کہ اگر ان کے علاوہ کوئی دوسرا ذوی الفروض اور عصبہ وارث نہ ہو تو ان کی موجودگی میں بھی ذوی الارحام حصہ پائیں گے، وہ دو شوہر اور بیوی ہیں، یعنی اگر کسی مرد میت نے صرف بیوی چھوڑی یا کسی عورت میت نے صرف شوہر چھوڑا تو ان کا شرعی حصہ دینے کے بعد باقی ذوی الارحام کو دے دیا جائے گا، برخلاف دوسرے ذوی الفروض کے کہ اگر دوسرا کوئی وارث نہ ہوگا تو مقررہ حصّہ لینے کے بعد بقیہ ترکہ بھی وہی لے لیں گے، مگر بیوی اور شوہر کو مقررہ حصے سے زیادہ نہیں ملے گا۔

ذوی الارحام کی قسمیں

عصبات کی طرح ذوی الارحام بھی چار قسم کے ہوتے ہیں اور جب تک پہلی قسم کے ذوی الارحام موجود ہوں گے، دوسرے

تیسرے درجے کے ذوی الارحام کو کچھ نہیں ملے گا، ہر ایک قسم کے ذوی الارحام کے حصے کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

پہلی قسم کے ذوی الارحام اول قسم کے ذوی الارحام میں نواسے، نواسیاں اور ان کی اولاد شامل ہے، مگر ان میں سب سے مقدم نواسے اور پھر نواسیاں ہیں، اس لئے پہلے ان کا بیان کیا جاتا ہے۔

نواسے اور نواسیاں ذوی الارحام میں سب سے مقدم نواسے اور نواسیاں ہیں، اگر ذوی الفروض اور عصبات میں کوئی زندہ نہ ہو تو میت کے نواسے اور نواسی میں اگر کوئی زندہ ہوگا تو تمام ترکہ ان ہی کو ملے گا، اگر ایک نواسہ یا نواسی ہوگی تو کل مال اس کو مل جائے گا، اور کئی ہوں تو نواسے کو دوہرا اور نواسی کو اکہرا حصہ ملے گا۔

ہدایت ذوی الفروض کے نہ ہونے سے مراد یہاں وہی تیرہ میں گیارہ ذوی الفروض ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ ورنہ دو ذوی الفروض یعنی بیوی اور شوہر کی موجودگی میں بھی ذوی الارحام حصہ پاتے ہیں۔

پوتی کی اولاد پہلی قسم کے ذوی الارحام میں دوسرے درجے کے وارث پوتی کی اولاد ہے، یعنی اگر میت کے نواسے یا نواسی نہ ہوں تو پھر میت کے لڑکوں میں سے کسی کے کوئی نواسہ یا نواسی ہو تو وہ میت کے ترکے کا مالک ہوگا۔

نواسہ اور نواسہ کی اولاد اگر اوپر کے دونوں قسم کے ذوی الارحام نہ ہوں تو پھر نواسوں اور نواسیوں کی اولاد کو حصہ ملے گا، گو پوتی کی اولاد اور نواسہ نواسیوں کی اولاد، اپنے رشتے کے اعتبار سے یکساں ہیں لیکن چونکہ میراث میں بیٹے کی اولاد مقدم ہے، اس لئے یہاں بھی اولاد کی موجودگی میں نواسے اور نواسوں کی اولاد کو حصہ نہیں ملے گا۔

یہاں بھی تقسیم کا اصول وہی رہے گا، جو پوتی کی اولاد کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے، اگر بفرض محال نواسے اور نواسی کی اولاد بھی نہ ہو تو پھر پوتے کے نواسے اور اگر وہ بھی نہ ہوں تو پھر پوتی کے پوتے پوتی وغیرہ وارث ہوں گے۔

دوسری قسم کے ذوی الارحام

اوپر ذکر آچکا ہے کہ دادا، دادی اور نانی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک قریبی، دوسرے دوری۔ یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ قریبی دادا، دادی کی موجودگی میں دوری دادا دادی اور نانی کو کچھ نہیں ملتا، قریبی دادا اور دادی تو ذوی الفروض میں شامل ہیں، ان کے حصے کا بیان ہو چکا۔ مگر دوری دادا اور دادی اور نانی ذوی الارحام میں داخل ہیں، ان کے حصے کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ اوپر یہ لکھا گیا ہے کہ وہ دادا دادی اور نانی جن کے رشتے میں عورت کا واسطہ آجائے، وہ جدّہ فاسدہ یعنی دوری ہیں، اسی طرح نانا جس کے رشتے میں عورت واسطہ ہوتی ہے، وہ بھی ذوی الارحام میں ہے۔ دادا، دادی اور نانی تو کبھی صرف ذوی الفروض کی حیثیت سے حصہ پاتے ہیں، اور کبھی عصبہ اور کبھی ذوی الارحام کی حیثیت سے لیکن نانا ہمیشہ ذوی الارحام ہی رہتا ہے، وہ کبھی ذوی الفروض اور عصبہ کے حدود میں داخل نہیں ہوتا، اس لئے اس کی دو قسمیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی قسم ہے، گویا دوسرے درجے کے ذوی الارحام کی یوں تو بہت سی قسمیں ہیں، لیکن یہ تمام چار اشخاص کے ذریعے حصے پاتے ہیں۔ ایک نانا، دوسرے نانی فاسدہ، تیسرے دادا فاسدہ، چوتھے دادی فاسدہ۔

نانا

(۱) ذوی الفروض، عصبات یا پہلی قسم کے ذوی الارحام میں سے کوئی موجود ہوگا، تو نانا کو کچھ نہیں ملے گا۔

(۲) لیکن مذکورہ بالا ورثہ میں سے کوئی نہ ہو تو پھر میت کے تمام ترکے کا مستحق۔ اگر اس کا نانا زندہ ہے تو وہ ہوگا۔

(۳) یہاں وہ قاعدہ یاد رکھئے کہ ذوی الفروض سے مراد صرف گیارہ ذوی الفروض ہیں، وہی ذوی الارحام کا حصہ روک سکتے ہیں۔ بیوی اور شوہر کی موجودگی میں بھی ذوی الارحام کو حصہ ملے گا۔

(۴) نانا کی موجودگی میں دوسرے قسم کے ذوی الارحام میں اور جو لوگ ہیں وہ سب محروم ہوں گے۔

(۵) اگر میت کے نانا نہ ہوں تو پھر میت کے باپ کا نانا، اگر یہ نہ ہوں تو ماں کے دادا۔ اگر

یہ نہ ہوں تو ماں کے نانا اور ماں کی دادی ترکے کی مستحق ہوں گی۔

(۶) اسی طرح اگر ماں باپ کے نانا، دادا یا دادی وغیرہ زندہ نہ ہوں تو پھر میت کے دادا کے سلسلے کے ذوی الارحام کو حصہ ملے گا۔

تیسری قسم کے ذوی الارحام

(۱) تیسری قسم کے ذوی الارحام میں بہن کی تمام اولاد اور بھائی کی غیر عصبہ اولاد شامل ہے۔

بہن کی تمام اولاد سے مراد میت کے ہر طرح کے بھانجے اور بھانجیاں ہیں اور بھائی کی وہ اولاد جو عصبہ نہیں ہے، ان سے مراد بھائی کی بیٹی یعنی میت کی بھتیجیاں وغیرہ ہیں' ان کی کل تعداد دس ہوتی ہے، حقیقی بہن کے لڑکے، لڑکیاں، علاتی بہن کے لڑکے لڑکیاں' اخیافی بہن کے لڑکے، لڑکیاں، حقیقی بھائی کی لڑکی، علاتی بھائی کی لڑکی، اخیافی بھائی کے لڑکے لڑکی۔

(۲) ان دسوں میں سے کوئی مقدم اور موخر نہیں ہے، بلکہ اگر یہ سب ایک ساتھ موجود ہوں تب بھی ان سب کو حصہ ملے گا، صرف مرد اور عورت کا فرق ہوگا، یعنی مرد کو جتنا ملے گا، عورت کو اس کا آدھا ملے گا۔

(۳) اگر ان دس میں سے صرف ایک ہی موجود ہو اور اوپر کے مذکورہ ورثہ میں سے کوئی موجود نہ ہو تو پھر پورا ترکہ اسی ایک آدمی کو مل جائے گا۔

(۴) یہ کئی ہوں تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ایک ہی بھائی بہن کی اولاد ہوں تو پھر چاہے یہ جتنے ہوں سب کو مساوی حصہ ملے گا، یعنی مردوں کو جتنا ملے گا اس کا نصف عورتوں کو ملے گا، مثلاً اگر چار بھانجے بھانجیاں ہوں تو پورا ترکہ ان میں مساوی طور پر تقسیم کر دیا جائے گا۔

دوسری صورت یہ کہ بہن اور بھائی کے ملے جلے لڑکے ہوں تو ان کا حصہ مساوی تقسیم نہیں ہوگا، مثلاً اگر دو بھانجیاں اور دو بھتیجیاں ہوں تو ان کو ترکہ ان کے لحاظ سے نہیں ملے گا، بلکہ ان کے والدین یعنی میت کے بھائی بہن کے لحاظ سے ملے گا، یعنی بھائی کو بہن کے مقابلے میں دوگنا ملتا ہے، اس لئے اب ان کے لڑکوں یعنی میت کی بھتیجیوں کو بھی وہی

دوگنا ملے گا، اور بہن کی لڑکیوں یعنی میت کی بھانجیوں کو ان کا آدھا ملے گا، کیوں کہ بہن کا حصّہ بھائی سے آدھا ہوتا ہے، مثلاً دو بھتیجیاں اور دو بھانجیاں ہوں تو ترکے کو چھ حصوں میں تقسیم کریں گے، دو دو حصے دونوں بھتیجیوں کو دیں گے، اور ایک ایک حصّہ بھانجیوں کو۔ البتہ اگر بھانجیوں کے ساتھ بھانجے بھی ہوں تو ان کو بھانجیوں کا دہرا ملے گا، اور بھتیجیوں سے کم ملے گا۔

(۵) اگر کوئی بھتیجا زندہ ہو تو بھتیجے کے سامنے تمام بھانجیاں اور بھتیجیاں محروم رہیں گی، کیونکہ بھتیجا عصبہ میں ہے اور عصبہ کی موجودگی میں ذوی الارحام کو کچھ نہیں ملتا۔

(۶) اگر بھانجے، بھانجیاں یا بھتیجیاں نہ ہوں تو پھر ان کی اولاد حصہ پائے گی۔

چوتھی قسم کے ذوی الارحام

چوتھی قسم کے ذوی الارحام میں میت کی پھوپھیاں، خالائیں، ماموں اور اخیافی چچا ہیں، اور جب یہ نہ ہوں تو ان کی اولاد اور یہ نہ ہوں تو حقیقی اور علاتی چچا کی اولاد۔ اگر یہ بھی نہ ہوں تو پھر ماں یا باپ کی پھوپھیاں خالائیں اور ماموں وغیرہ مستحق ہوں گے۔

ذوی الفروض کے حصّوں کا مختصر نقشہ

اوپر تمام ورثہ کے حصوں کی تفصیل بیان کردی گئی، اور یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ ذوی الفروض کا حصہ تو شریعت نے مقرر کر دیا ہے، مگر عصبہ اور ذوی الارحام کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے، بلکہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ باقی بچے گا، وہ عصبہ کو اور اگر وہ نہ ہوں تو بقیہ ذوی الارحام کو دے دیا جائے گا، ذوی الفروض کے چھ حصے مقرر ہیں ان کی مختصر تفصیل پھر کر دی جاتی ہے۔

تہائی $\frac{1}{3}$، دو تہائی $\frac{2}{3}$، نصف $\frac{1}{2}$، چوتھائی $\frac{1}{4}$، چھٹا $\frac{1}{6}$، آٹھواں $\frac{1}{8}$۔

$\frac{2}{3}$ دو ثلث چار وارثوں کو ملتا ہے

میت کے جب نرینہ اولاد نہ ہو اور دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں۔

(۲) میت کے نہ بیٹا ہو نہ پوتا ہو اور نہ بیٹی ہو اور پوتیاں دو یا دو سے زیادہ ہوں۔

(۳) میت کے نہ بیٹا ہو نہ پوتا ہو اور نہ بیٹی ہو اور دو یا دو سے زیادہ بہنیں ہوں۔

(۴) میت کے اگر حقیقی بہنیں نہ ہوں تو پھر علاتی بہنوں کو دو ثلث ملتا ہے۔

½ نصف پانچ وارثوں کو ملتا ہے | شوہر کو جب بیوی کے اولاد نہ ہو۔

(۲) بیٹی کو جب وہ تنہا ہو اس کا بھائی زندہ نہ ہو
(۳) پوتی کو جب میت کا بیٹا بیٹی، پوتا زندہ نہ ہو۔
(۴) بہن کو جب اکیلی ہو اور میت کے بیٹا بیٹی اور باپ نہ ہو۔
(۵) علاتی بہن کو جب حقیقی بہن نہ ہو۔

⅓ تہائی (ثلث) دو وارثوں کو ملتا ہے | (۱) والدہ کو جب میت کے نہ اولاد ہو اور نہ دو بھائی بہن ہوں۔

(۲) اخیافی بھائی بہن کو جب وہ ایک سے زیادہ ہوں۔

¼ چوتھائی (ربع) دو وارثوں کو ملتا ہے | (۱) بیوی کو جب شوہر کی اولاد نہ ہو،

(۲) شوہر کو جب بیوی کی اولاد ہو۔

⅙ چھٹا (سدس) چار وارث پاتے ہیں | (۱) باپ کو جب میت کی اولاد ہو۔

(۲) ماں کو جب میت کی اولاد ہو یا بھائی بہن ہوں۔
(۳) اخیافی بھائی کو جب تنہا ہو۔
(۴) اخیافی بہن کو جب تنہا ہو۔

⅛ آٹھواں (ثمن) ایک وارث کو ملتا ہے | بیوی کو جب شوہر کے بیٹا، بیٹی یا پوتی ہو۔

غرض ان چھ حصوں کے علاوہ ذوی الفروض کا اور کوئی حصہ نہیں لگایا جا سکتا، نہ تو کوئی ذوی الفروض ⅗ پا سکتا ہے اور نہ ⅖ اور نہ ⅑ اور نہ ⅘ وغیرہ، البتہ یہ ہوتا ہے کہ جب دوسرے ذوی الفروض نہیں ہوتے تو بعض ذوی الفروض کو عصبہ ہونے کی وجہ سے بقیہ

حصّہ بھی مل جاتا ہے، مگر وہ بے حساب ہوتا ہے، اس صورت میں کوئی حصّہ مقرر نہیں ہے، اسی دوبارہ حصہ ملنے کو شریعت میں رَد کہتے ہیں، اس کا بیان آگے آتا ہے۔

حصّہ نکالنے کا طریقہ

یہاں یہ بات جان لینی چاہیئے کہ ورثہ کے حصّہ نکالنے کا ایک خاص طریقہ شریعت نے مقرر کیا ہے، اسی طرح سے نکالنا چاہیئے اگر ایک ہی وارث یا ایک ہی طرح کے کئی وارث ہوں تو پھر کوئی دقت نہیں ہے مثلاً اگر ایک لڑکا ہو یا کئی لڑکے ہوں یا ایک بیٹی یا کئی بیٹیاں ہوں تو پھر ان کا حصہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہے، لیکن اگر کئی وارث ہوں، مثلاً والدہ بھی ہو، بیٹا ہو، باپ بھی ہو، پھر ان کا حصّہ لگانے میں خیال رکھنا چاہیئے کہ ترکے کے اتنے حصے بنانے چاہئیں کہ حصہ ٹوٹنے نہ پائے، مثلاً اگر کسی عورت نے چار وارث شوہر، والد، بیٹی، پوتی چھوڑے تو اگر اس کے ترکے کو تین حصے کر کے آدھا والدہ، آدھا پوتی، ڈیڑھ ۱½ بیٹی کو اور ¾ یعنی پون شوہر کو دیں تو میراث تقسیم ہو جائے گی، مگر اس طرح شریعت میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ترکے کے اتنے حصے بنائے جائیں کہ کوئی حصہ ٹوٹنے نہ پائے، یعنی آدھا پونا نہ ہونے پائے، ایک دو چار وغیرہ کی اکائی باقی رہے، اس سلسلے میں یہ ممکن ہے کہ زیادہ پانے والے وارث کا حصّہ کچھ کم ہو جائے گا، مگر اس سے کوئی ہرج نہیں ہے، مثلاً اوپر کی مثال میں اگر ترکے کو ۱۳ حصوں میں تقسیم کر دیا جاتے تو بارہ سے اس کا حساب کریں گے، کیونکہ ایک عدد صرف عَول کے لئے بڑھا دیا گیا ہے تو اس طرح بارہ میں ¼ یعنی ۳ حصے شوہر کو، چھٹا یعنی ۲ حصے والدہ کو، اور نصف یعنی ۶ لڑکی کو اور دو حصے پوتی کو مل جائیں گے۔ اب سب کا حصہ لگ گیا اور حصّے ٹوٹے نہیں، البتہ اتنا ہوا کہ حصے تو بارہ ۱۲ کئے گئے تھے، مگر بعد میں ان کو بڑھا کر تیرہ کر دیا جس سے حساب بالکل ٹھیک ہو گیا۔

عَول کا بیان

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ورثہ کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے، یا پھر ان کا حصّہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ ترکے کو اگر تقسیم کریں تو بعض وارث یا تو محروم رہ جائیں گے، یا ان کو اپنے شرعی حصے سے بہت کم ملے گا، یا پھر ترکے کے حصوں کو توڑنا پڑے گا، اور یہ دونوں صورتیں صحیح نہیں ہیں، مثلاً عورت میت نے دو حقیقی بہنیں، دو اخیافی بہنیں اور

شوہر چھوڑے تو اب شرعی حصے کے مطابق شوہر کو آدھا ترکہ ملنا چاہیئے، کیونکہ زوجہ نے کوئی بیٹا نہیں چھوڑا ہے، اور دو حقیقی بہنیں ہیں، اس لئے ان کو دو ثلث ملنا چاہیئے اور حقیقی بہنوں کی موجودگی میں اخیافی بہنیں جب دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ان کو ایک ثلث ملنا چاہیئے، تو اب اگر اخیافی بہنوں کو ایک ثلث ⅓ اور حقیقی بہنوں کو ⅔ دے دیا جائے تو شوہر بالکل محروم رہ جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد کچھ بچتا ہی نہیں، یا پہلے اگر شوہر کو اور حقیقی بہنوں کو دیا جائے تو دونوں میں سے کسی کا حصّہ پورا نہیں کیا جا سکتا اور شوہر بالکل ہی محروم رہ جاتا ہے، اس دقّت کو حل کرنے کے لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے مشورے سے عول کا طریقہ رائج کیا، اب جہاں حصے کی تقسیم میں ایسی دقت پیش آئے یا حصہ توڑنے کی ضرورت محسوس ہو، وہاں عول کریں گے۔

عول کے معنیٰ

عول کے لفظی معنیٰ بہت سے ہیں۔ ان ہی میں ایک معنیٰ زیادتی کے بھی ہیں اور شریعت میں اس زیادتی کو عول کہتے ہیں، جو ترکے کی تنگی کی وجہ سے حصّوں میں کی جاتی ہے۔ صاحب درمختار نے لکھا ہے:

هُوَ زِيَادَةُ السِّهَامِ إِذَا كَثُرَتِ الْفُرُوضُ عَلَىٰ مَخْرَجِ الْفَرِيضَةِ لِيَدْخُلَ النَّقْصُ عَلَىٰ كُلٍّ مِنْهُمْ بِقَدْرِ فَرِيضَتِهِ (درمختار باب عول)	اگر مخرج فرض (وہ عدد جس سے ورثاء کے حصے نکل رہے ہیں) ورثاء کے حصوں کے لئے کافی نہ ہو تو ایسی صورت میں اس میں مزید اضافہ کر کے اس کو بڑھا لیا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام ورثاء کے حصوں میں بقدر ان کے حقوق کے کمی ہو جاتی ہے۔

عول کا طریقہ

عول کا طریقہ یہ ہے کہ ترکے کے ناکافی ہونے کا خیال ترک کر کے پہلے تمام وارثوں کا حصہ مقرر کر دیتے ہیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ایک ایسا چھوٹا عدد تلاش کرنا چاہیئے کہ اس سے پہلے وارث کو ٹھیک حصّہ مل جائے پھر دوسرے وارثوں کے حصے پورا کرنے کے لئے عدد بڑھاتے جائیں۔ مثلاً ایک عورت نے شوہر اور دو حقیقی بہنوں کو وارث چھوڑا تو اب اس ترکے کی تقسیم کے لئے سب سے چھوٹا

عدد چھ نظر آیا، چھ کا آدھا تین ہوا، اب تین حصّے شوہر کو دے دیئے گئے۔ اب باقی رہے تین حصّے تو دو حقیقی بہنوں کا حصّہ دو ثلث ہوتا ہے، یعنی چھ حصّوں میں چار، لیکن اب باقی صرف تین ہی حصّے ہیں، اس لئے ہم نے ایک عدد کا اضافہ کر کے چار حصّے بہنوں کو دے دیئے تو اب کل حصّوں کی تعداد ۷ ہوگئی، اور ترکہ تقسیم ہوگیا، جہاں عول ہوتا ہے وہاں وہ چھوٹا عدد جس سے ابتداء میں تقسیم کیا تھا، لکھنے کے بعد عول کیا ہوا عدد ع بنا کر لکھ دیتے ہیں، جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں عول ہوا ہے۔ مثلاً:

چھوٹا عدد ۶ ع کے بعد ۷ ہوگیا

شوہر	حقیقی بہنیں
۳	۴

ایک سوال اور اس کا جواب ایک سوال یہاں ہو سکتا ہے کہ شروع ہی سے کیوں نہ ۷ سے تقسیم کیا جائے، تو ایسا اس لئے نہیں کرتے کہ اس عدد کو توڑنا پڑے گا، اور پھر بھی حصہ پورا نہیں ہوگا، مثلاً اگر سات میں ۳½ شوہر کو دے دیا جائے تو ثلث بہنوں کو کیسے پورا کریں گے، وہی دقّت پھر پیش آئے گی۔

خلاصہ عول کا طریقہ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، دو باتوں کی وجہ سے اختیار کرتے ہیں، ایک یہ کہ تمام وارثوں کو حصہ مل جائے، دوسرے یہ کہ حصّوں کے اعداد کو توڑنا یعنی ان کی کسر نہ کرنا پڑے۔

عول کا نتیجہ عول کی صورت میں حصّوں کے عدد میں جتنی زیادتی ہوتی ہے اسی نسبت سے تمام وارثوں کے حصّوں میں ذرا ذرا کمی ہو جاتی ہے۔ اوپر کی مثال کو لیجئے شوہر کو جب ۳ حصے دیئے اور پھر چار حصّے بہنوں کو، تو اب حساب میں شوہر کے حصّے سے ½ کی کمی ہوگی، اسی طرح بہنوں کے حصّے سے ½ کی کمی ہوگی، اور ان دونوں کمیوں کی وجہ سے حصے کی تقسیم آسانی سے ہوگئی، ورنہ عدد کی کسر بھی کرنی پڑتی اور پھر بھی بعض وارث یا تو بالکل محروم رہ جاتے، یا پھر ایک تو پورا حصّہ پالیتا اور دوسرا بہت کم پاتا، کمی اس صورت میں بھی ہوتی ہے، مگر بہت کم اور پھر حصے کی کسر بھی نہیں کرنی پڑتی۔

لڑکے کی موجودگی میں عول نہیں ہوتا یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ میّت کے لڑکے کی موجودگی میں عول کی ضرورت کبھی نہیں پڑتی، شریعت نے لڑکے کی موجودگی میں دوسرے ورثہ کے حصّے یا تو کم کردیئے، یا ان کو محروم کردیا ہے۔

رد کا بیان عول میں تو ہر وارث کے حصّے سے کچھ کمی کرکے تمام ورثہ کے حصے پورے کئے جاتے ہیں اور رد میں ایک وارث کو اپنے مقرّرہ حصے سے بھی کچھ زیادہ ملتا ہے۔

رد کی تعریف رد کے لفظی معنی لوٹا دینے کے ہیں اور شریعت میں ایک یا کئی ذوی الفروض وارثوں کو مقررہ حصہ دینے کے بعد عصبہ کی غیر موجودگی میں باقی ترکے کو ان ہی میں لوٹا دینے یا تقسیم کردینے کو رد کہتے ہیں، جس طرح عول کا طریقہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کے مشورے سے رائج فرمایا تھا، اسی طرح رد کا طریقہ حضرت علیؓ نے صحابہ کے مشورے تجویز فرمایا۔ عول میں تو تمام صحابہ اور ائمہ متفق الرائے ہیں۔ مگر رد میں حضرت زید بن ثابت نے اختلاف کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ باقی ترکہ بیت المال کا ہے، ان ہی کی رائے کو امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے اختیار ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ نے حضرت علیؓ کی رائے کو ترجیح دی ہے، اور اسی پر ان کا عمل ہے، امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ذوی الفروض کو دینے کے بعد کچھ میراث بچ جائے، اور کوئی عصبہ نہ ہو تو پھر وہ ترکہ بیت المال میں داخل کردینا چاہیئے۔ البتہ اگر کہیں بیت المال کا نظام نہ ہو، تو پھر ذوی الفروض پر تقسیم کرنا چاہیئے۔

گویا حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ نے اجتماعی مفاد کو شخصی مفاد کے مقابلے میں ترجیح دی ہے اور حضرت علی اور ان کی رائے ماننے والوں کی رائے ہے کہ وارث چونکہ رشتہ وتعلق نسب کی بنا پر تقسیم کی جاتی ہے، اس لئے جب تک وہ موجود ہے اس کو مقدم رکھنا چاہیئے، قرآن میں صاف صاف ارشاد ہے:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ — حکم خداوندی میں رشتے دار آپس میں

اُولٰی بِبَعۡضٍ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ ۔ ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔

بیوی اور شوہر میں رد نہیں ہے اگر کسی میت کے ذوی الفروض وارثوں میں صرف بیوی ہو، یا بیوی کے ذوی الفروض ورثہ میں صرف شوہر ہو تو ان کا جتنا حصہ مقرر ہے اتنا ہی ملے گا اور باقی ترکہ اگر عصبہ ہیں تو عصبہ پائیں گے ورنہ ذوی الارحام پائیں گے۔ قرآنی حکم کے مطابق ان کے درمیان چونکہ رشتہ نسب وخون قائم نہیں ہے، اس لئے ان کو اتنا ہی ملے گا جتنا اس نئے رشتے کی وجہ سے ان کے لئے مقرر ہے۔ اگر ان دونوں میں کوئی رشتۂ رحم پہلے سے ایسا ہے جس سے ترکہ مل سکتا ہے تو ان پر رد ہوگا، مگر یہ رد رشتۂ زوجیت کی وجہ سے نہیں بلکہ رشتۂ رحم کی وجہ سے ہوگا۔

ہدایت رد میں باقی ترکہ اسی اعتبار سے دوبارہ تقسیم کیا جائے گا جس اعتبار سے انہوں نے حصہ پایا ہے، یعنی جس کو پہلے زیادہ ملا تھا، رد کی صورت میں بھی زیادہ ملے گا، اور جس کو پہلے کم ملا تھا، رد کی حالت میں بھی کم ملے گا۔[2]

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اسلامی فقہ کی تالیف کی توفیق عطا فرمائی اور پھر اس نے اس کو اتمام تک پہنچایا، اب اس کی بارگاہِ قدس میں یہ دعا ہے کہ وہ اسے قبول کرلے اور اپنے بندوں کے لئے مفید بنائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ۔

---

[1] یہ آیۃ سورۃ انفال کی ہے، اور ان مہاجرین مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی جو بہت بعد میں اسلام لائے اور اسلام لانے کے بعد مدینہ کو ہجرت کی اور ان کے بارے میں کہا گیا کہ اس تاخیر کی وجہ سے ان کا وہ حق نہیں جا سکتا جو رشتے کی وجہ سے ان کو پہنچتا ہے، مقصد یہ ہے کہ جس حد تک ہو سکے پہلے قریب تر رشتے داروں میں وراثت تقسیم کی جائے۔

[2] وراثت اور وصیت بیشتر یہاں مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب مفید الوارثین سے ماخوذ ہے۔ اردو میں اس سے بہتر اور مفصل کتاب دوسری موجود نہیں ہے۔